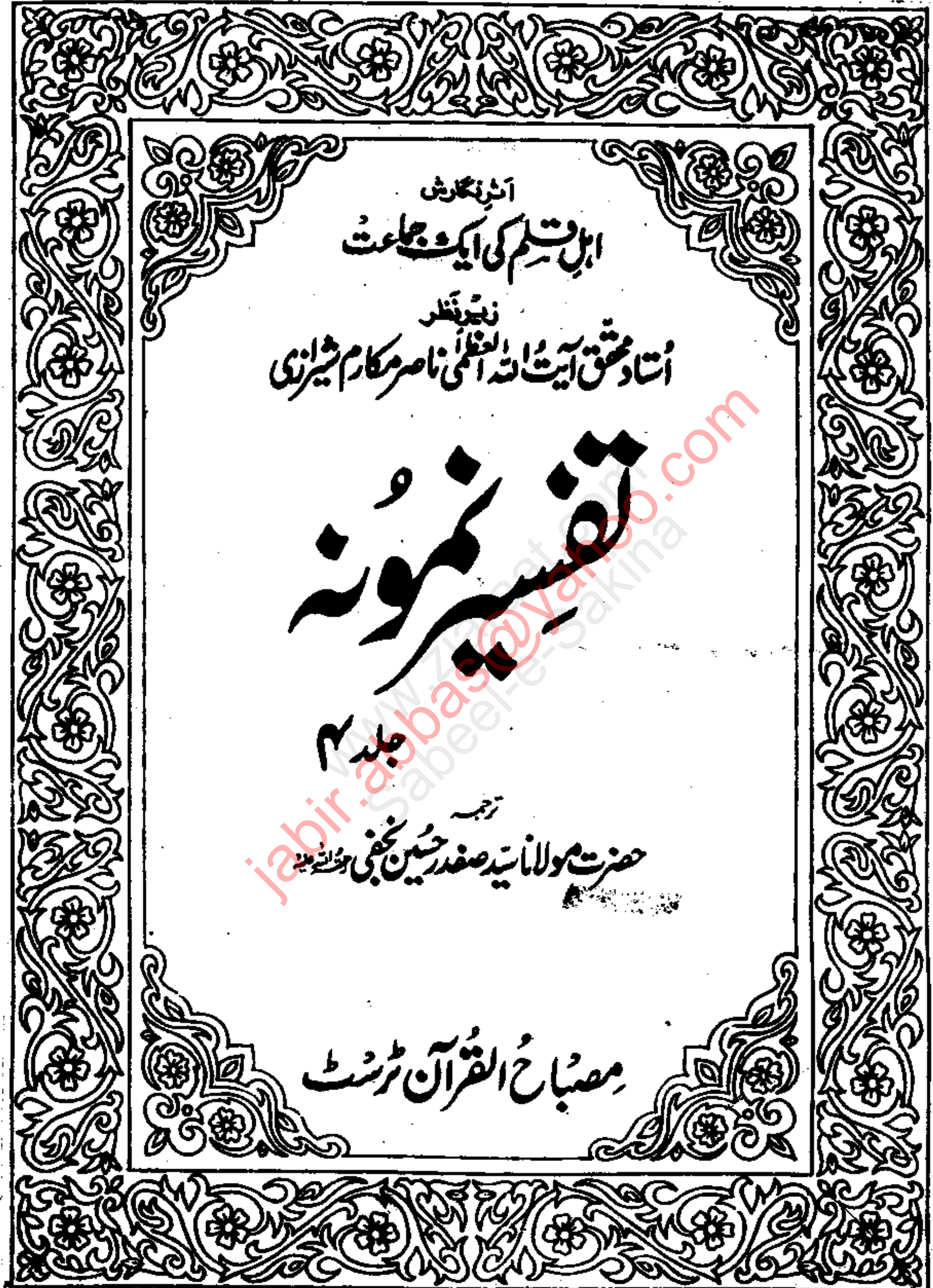


آثرِ نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت
زیرِ نظر
اُستاد محقق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی
تفسیر نمونہ
جلد ۴
ترجمہ
حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی
مصباح القرآن ٹرسٹ



نام کتاب ـــــــــــ تفسیر نمونہ

جلد نمبر ـــــــــــ ۴

زیر نظر ـــــــــــ آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

مترجم ـــــــــــ حضرت مولانا سید صفدر حسین نجفی

نظر ثانی ـــــــــــ ثاقب اکبر نقوی

ناشر ـــــــــــ مصباح القرآن ٹرسٹ

ہدیہ ـــــــــــ [redacted]

ملنے کا پتہ:

قرآن سنٹر

۱/۲۴ الفضل مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

فون نمبر: ۴۷۳۶۴۳۱۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

قارئین محترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔

الحمد للہ! مصباح القرآن ٹرسٹ ــــ کلام حکیم اور عہدِ حاضر کی بعض عظیم تفاسیر و تالیفات کی نشر و اشاعت کے ایک عظیم مرکز کی حیثیت سے اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی یہ شہرت حق تعالیٰ کے فضل و کرم اور آپ حضرات کی تائید و اعانت کا ثمرہ ہے۔

اس ٹرسٹ نے اپنے آغازِ کار میں موجودہ دور کی شہرۂ آفاق تفسیر ــــ تفسیر نمونہ ــــ کو فارسی سے اُردو زبان میں ترجمہ کروا کے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا اور حجۃ الملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی قبلہ اعلی اللہ مقامہ، کی غیر معمولی مساعی، مالی معاونین کی فراخدلانہ اعانت اور کارکنان کی شبانہ روز محنت کی بدولت پانچ ہی سال کے قلیل عرصے میں کم و بیش دس ہزار صفحات پر محیط یہ تفسیر صوری و معنوی خوبیوں سے آراستہ ستائیس جلدوں میں شائع کرنے کی سعادت حاصل کر لی۔ شکراً للہ۔

اس ادارے نے نہ صرف تفسیر نمونہ کے عظیم منصوبے کو حیرت انگیز سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بیسیوں علمی کتب کے علاوہ سید العلماء السید علی نقی النقوی اعلی اللہ مقامہ، کی سات جلدوں پر مشتمل تفسیر فصل الخطاب شائع کی۔ اُردو زبان کو پہلی مرتبہ تفسیر قرآن کے جدید اسلوب سے روشناس کراتے ہوئے تفسیر موضوعی کے دو طویل سلسلوں یعنی "پیامِ قرآن" از آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی اور "قرآن کا دائمی منشور" از آیت اللہ جعفر سبحانی کی اشاعت کو بھی تیزی سے آگے بڑھا رہا ہے۔

تفسیری حواشی پر مشتمل یک جلدی قرآن پاک عہدِ حاضر کے مقبول اُردو تراجم کے ساتھ زیر طباعت ہیں۔ اس سلسلے میں روشن فکر اور جید عالمِ دین حضرت علامہ ذیشان حیدر جوادی مدظلہٗ کا ترجمہ "انوار القرآن" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

تفسیر نمونہ چونکہ بلا امتیاز پوری اُمتِ مسلمہ کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے بیدار و تیار کرنے کے لیے لکھی گئی ہے لہٰذا سبھی مسلمانوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود اس کی

طلب میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آپ کا یہ ادارہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہا ہے۔ بعض باذوق اہل علم کی تجویز پر ہم تفسیر نمونہ کی طباعت کے ضمن میں ایک مفید تبدیلی کر رہے ہیں، چنانچہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اسے موجودہ ستائیس جلدوں کی بجائے پندرہ جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا جائے تاکہ قارئین محترم کے لیے مزید آسانیاں پیدا کی جا سکیں۔

تفسیر نمونہ کی اس ترتیب نو کا ایک عام طریقہ تو یہ تھا کہ ہر جلد میں دو دو پاروں کی تفسیر ہو اور یوں اس کی پندرہ جلدیں مکمل ہو جائیں لیکن اس میں یہ سُقم رہ جاتا ہے کہ بہت سی قرآنی سُورتوں کا کچھ حصّہ ایک جلد میں اور بقایا حصّہ اس سے اگلی جلد میں چلا جاتا ہے جس سے مطالعے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنے قارئین کو اس زحمت سے بچانے کی خاطر اس تفسیر کو سُورتوں کی بنیاد پر ترتیب دیا ہے۔ اس طرح کوئی قرآنی سُورت دو حصّوں میں تقسیم نہیں ہونے پائی اور ہر جلد کسی نہ کسی سُورت کی کامل تفسیر پر ختم ہوگئی۔ اس طرح پُوری تفسیر نمونہ پندرہ جلدوں میں آگئی ہے۔

اس جدید اشاعت کے سلسلے میں تفسیر نمونہ جلد چہارم اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں سابقہ جلد ششم میں سے صفحہ ۵ تا ۳۷۶، پُوری جلد ہفتم اور جلد ہشتم میں سے صفحہ ۲۷ تا ۱۹۹ شامل کیے گئے ہیں، چنانچہ یہ جلد سُورہ اعراف، سُورہ انفال اور سُورہ توبہ کی تفسیر کا مجموعہ ہے۔

ہم نے زیر نظر کتاب کو بہتر انداز میں پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے تاہم اس بارے میں آپ کی آراء ہمارے لیے بہترین رہنما ہوا کرتی ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم اپنی مطبوعات کو مزید بہتر بنا کر پیش کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ہماری اس پیشکش کا بغور مطالعہ فرمانے کے بعد اس کا معیار مزید بلند کرنے کے سلسلے میں اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے۔ ہم مفید تنقید اور آراء کے لیے منتظر رہتے ہیں۔

آخر میں ہم لاہور کے ایک مخلص و مخیّر مردِ مومن الحاج شیخ ظہور علی منگلا سے اظہارِ تشکر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ جن کے تعاون سے تفسیر نمونہ کی یہ جدید اشاعت تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے، ہم دعاگو ہیں کہ خدا تعالیٰ بحق معصومینؑ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔ والسّلام

اراکین
مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اِھداء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش

تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہل مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور تازہ معلومات حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم



یہ تفسیر

حسب ذیل علما و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبد الرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ تفسیر مجمع البیان از مشہور مفسر علامہ طبرسی
۲۔ تفسیر تبیان از دانشمند فقیہ بزرگ شیخ طوسی
۳۔ تفسیر المیزان از علامہ طباطبائی
۴۔ تفسیر صافی از علامہ محسن فیض کاشانی
۵۔ تفسیر نور الثقلین از مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
۶۔ تفسیر برہان از مرحوم سید ہاشم بحرینی
۷۔ تفسیر روح المعانی از علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸۔ تفسیر المنار از محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہ
۹۔ تفسیر فی ظلال القرآن از سید قطب مصری
۱۰۔ تفسیر قرطبی از محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱۔ اسباب النزول از واحدی (ابو الحسن علی بن مقویہ نیشاپوری)
۱۲۔ تفسیر مراغی از احمد مصطفیٰ مراغی
۱۳۔ تفسیر مفاتیح الغیب از فخر رازی
۱۴۔ تفسیر روح الجنان از ابو الفتوح رازی



گذارش

تفسیر نمونہ (فارسی) ستائیس جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کے اُردو ترجمے کے متعدد ایڈیشن بھی ستائیس جلدوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ محسنِ ملت حضرت علامہ سید صفدر حسین نجفی اعلی اللہ مقامہٗ کا اختتامی نوٹ اسی ترتیب کے مطابق جلد کے آخر میں تحریر کیا گیا تھا۔ نئی ترتیب میں بھی اسے تبدیل نہیں کیا گیا۔ خداوندِ کریم مولانا مرحوم کو جوارِ معصومینؑ میں بلند درجات عطا فرمائے۔

(ادارہ)

اس تفسیر کو لکھنے کا بنیادی مقصد

تمام (معبر) سطح فکر کے لوگوں میں بیداری اور آگاہی کی لہر دوڑ جانے اور ان میں جستجو اور مسائل اسلامی کو سمجھنے کا جذبہ بیدار ہونے اور تعلیمات اسلامی کے حقائق پر دسترس کی شدید طلب جو آج مختلف وجوہات کی بناء پر پیدا ہو چکی ہے، پیدا ہونے کے نتیجے میں تمام لوگوں اور بالخصوص نوجوان نسل کے درمیان یہ سوال پیدا ہو چکا ہے کہ اگر ہم اسلام کو بہتر اور مدلل انداز میں سمجھنا چاہتے ہیں اور اس کی تعلیمات سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

اس سوال کے جواب میں اُن لوگوں سے یہ کہا جائے گا کہ تعلیمات اسلامی کا سب سے بنیادی منبع قرآن ہے جو تمام حوادث زمانہ سے محفوظ اور بغیر کسی قسم کی تحریف کے صحیح سے ہم تک پہنچا ہے اور زبان وحی الٰہی میں گفتگو کرتا ہے اس لیے ہمیں کوئی بھی قدم اُٹھانے سے پہلے اسے پڑھنا اور اس میں غور و فکر کرنا چاہیے۔

پس فوراً سوال ہوتا ہے۔ کہ فارسی زبان بولنے والے حضرات کے لیے کونسی تفسیر کا مطالعہ کرنا بہتر ہے؛ اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان فارسی میں بڑے اعلیٰ پائے کی قدیم و جدید تفاسیر موجود ہیں۔ مگر ان کی عبارت سے عدم آشنائی کی بناء پر یا ان کے مطالب انتہائی مشکل ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں کے لیے اُن تفاسیر کو سمجھنا مشکل ہو گیا۔ (مگر چند تفاسیر میں ان مسائل کو حل کیا گیا ہے)۔

یہ چیز اس بات کا سبب ہوئی کہ علماء عظام کی ایک جماعت کی معاونت سے اس کام کا بیڑا اٹھایا جائے اور پیچیدہ علمی اصطلاحات اور مفسرین کرام کے باہمی اختلافات کی وضاحتوں سے خالی ہو مگر آسان فہم مطالب سے بھرپور اور دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے والی ایک تفسیر عوام الناس کے سامنے پیش کی جائے۔

ایک دوسرے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ خواص اور اہل علم حضرات بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ مختلف علمی مباحث (کبھی متن میں اور کبھی حاشیہ میں) بیان کرنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے تاکہ یہ تفسیر دونوں طرح کے افراد کے لیے مفید ثابت ہو۔

اس کے علاوہ چونکہ قرآن اور اس کی مطالب و معانی سے بھرپور آیات تمام مسلمانوں کی حیات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ ان تمام سوالات کا جو تعلیمات اسلام کے پیش کردہ دورِ حاضر کے طرز زندگی کے بارے میں کیے جاتے ہیں، جواب دیا جائے اور اس کے مباحث کو بطور کلی ذہنی مسائل کو آشکار کرتے ہوئے اور دورِ حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بیان کیے جائیں۔

الحمد للہ ان تمام مسائل کا پیش کردہ حل کافی مؤثر ثابت ہوا اور ہماری توقعات سے کہیں بڑھ کر ہر مقام پر اس تفسیر کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہاں تک کہ دنیا کو روس میں اسے ایک درسی کتاب کے طور پر استعمال کیا گیا۔

اس تفسیر کی یہ پذیرائی اس قدر شاندار تھی کہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس وقت جب یہ سطور لکھی جا رہی ہیں اس کی جلد اول دس مرتبہ چھپ چکی ہے (اسی انداز میں دوسری جلدیں بھی)۔

اس لیے ہم نے اپنی کوششوں اور زحمتوں کو تیز تر کر دیا اور اس کی کوشش کو مزید ہم آہنگ بنانے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ تمام عبارت کی تحریر میرے قلم سے ہو اور دوسرے علماء کرام مطالب کے جمع کرنے میں معاونت فرمائیں اور اس چیز کا اعتراف کرنا انتہائی ضروری ہے کہ علماء عظام نے مطالب کو جمع کرنے میں بہت زحمت کی اور ان کے بہت اچھے نتائج مرتب ہوئے۔

اس تفسیر کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر مقامات پر سابقہ اور دور حاضر کے مفسرین کے افکار سے استفادہ کرنے کے علاوہ نئے اور تازہ مطالب پیش کیے گئے ہیں۔

خاص طور پر اس جلد کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہ پوری جلد مہاباد اور انارک میں جلاوطنی کے دوران لکھی گئی اور دوستوں نے ان مقامات پر معاونت فرمائی اور یہ زیادہ فرصت، حوصلہ و فکری یکسوئی سے لکھی گئی۔

بہرحال میں امید رکھتا ہوں کہ اس طریق سے ہم اس قابل ہیں کہ اپنا اور اپنے معاشرے کا خاص طور پر نوجوان نسل کا قرآن سے رابطہ مضبوط اور محکم بنائیں۔ اور قرآن و اسلام کی شناخت کے راستے میں مکمل آگاہی اور انتہائی فہم و فراست سے قدم بڑھائیں۔

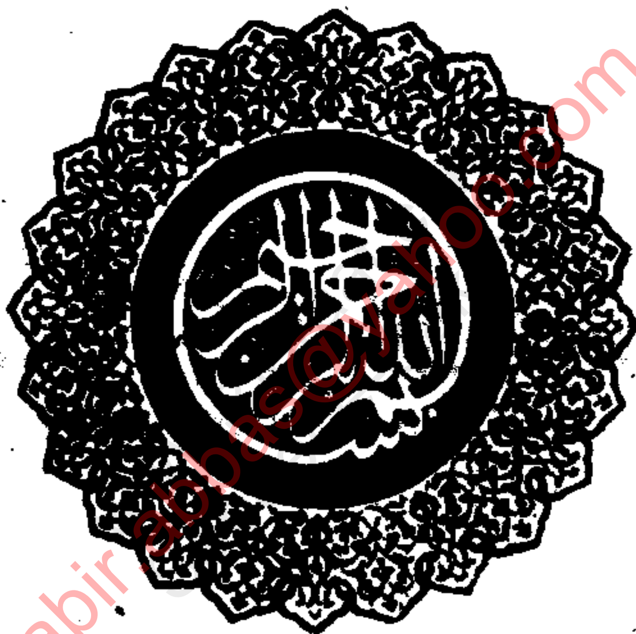
قم ـــــ ناصر مکارم شیرازی

۲۴ ذیقعدہ ۱۳۹۸ھ ـــ مطابق ۵۷/۸/۴

تفسیر نمونہ جلد ۴

فہرست

سورہ انفال


بسم الله الرحمن الرحیم

اللهم صل علی محمد و آل محمد و عجل فرجهم

تفسیر نمونہ جلد۴

اس میں مندرجہ ذیل سورتیں شامل ہیں

۱۔ سورہ اعراف ۲۔ سورہ انفال ۳۔ سورہ توبہ

سورۂ اعراف : مکی سورت ہے اور اس کی ۲۰۶ آیات ہیں ۔

پارہ ۸ ـــــ ۱ تا ۸۷ پارہ ۹ ـــــ ۸۸ تا ۲۰۶

سورۂ انفال : مدنی سورت ہے اور اس کی ۷۵ آیات ہیں ۔

پارہ ۹ ـــــ ۱ تا ۴۰ پارہ ۱۰ ـــــ ۴۱ تا ۷۵

سورۂ توبہ ، مدنی سورت ہے اور اس کی ۱۲۹ آیات ہیں ۔

پارہ ۱۰ ـــــ ۱ تا ۹۳ پارہ ۱۱ ـــــ ۹۴ تا ۱۲۹

سورۃ اعراف



یہ سورہ مکی سورتوں میں سے ہے سوائے ایک آیت کے جس کی ابتدا "واسئلھم عن القریة" اور انتہا "بما کانوا یفسقون" ہے صرف یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی۔

اس سورہ کی آیتوں کی تعداد ۲۰۶ اور بعض کے نزدیک ۲۰۵ ہے

اس سورہ پر ایک طائرانہ نظر

جیسا کہ ہم جانتے ہیں اکثر قرآنی سورتیں (۸۰ سے لے کر ۹۰ سورتوں تک) مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہیں، اگر مکہ کے اس وقت کے ماحول، ان تیرہ سالوں میں وہاں کے مسلمانوں کی حالت، اسی طرح تاریخ اسلام بعد از ہجرت پر نظر ڈالی جائے تو خوب اچھی طرح سے معلوم ہو جائے گا کہ مکی سورتوں کا لحن اور اندازِ سخن مدنی سورتوں سے کس لیے مختلف ہے۔

مکی سورتوں میں جو چیزیں زیادہ تر بحث میں آئی ہیں وہ یہ ہیں:

مبداء و معاد (ابتدائے آفرینش اور قیامت)، اثباتِ توحید، قیامت کے روز عدالت الٰہی، شرک اور بُت پرستی سے مقابلہ اور دنیائے آفرینش میں مقامِ انسانی کو استوار کرنا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مکہ کا زمانہ ایک ایسا زمانہ تھا جس میں مسلمانوں کو عقیدہ اور تقویت مبانیٔ ایمان کی رو سے سنوارنا منظور تھا تاکہ یہ تعلیمات ایک مستحکم اُٹھان کی جڑ بن سکیں۔

دوران مکہ میں پیغمبر اسلامؐ کے ذمہ یہ فرض تھا کہ بُت پرستوں کے خرافاتی افکار کو ان کے ذہنوں سے دھوئیں اور اس کی جگہ روحِ توحید، خدا پرستی اور احساسِ فرائض کے موتی پرو دیں۔

ان انسانوں کو جن کی دورانِ بُت پرستی میں تحقیر کی گئی ہے اور انہوں نے زندگی کی دوڑ میں شکست کھائی ہے انہیں ان کے حقیقی مقام و منزلت سے آگاہ کریں، جس کے نتیجے میں اس پست و بدکار اور خرافاتی و منفی قوم سے ایک ایسی قوم جنم دیں جو باوقار، باعزم، باایمان اور مثبت ہو۔ مدینہ میں اسلام کی تیز اور برق آسا ترقی کا یہی راز تھا کہ اسلام کی وہ بنیاد بہت مستحکم تھی جو مکہ میں آیاتِ قرآنی کی روشنی میں رکھی گئی تھی۔

سورہ ہائے مکی کی آیتیں بھی اسی نظریہ سے میل کھاتی ہیں۔

لیکن دورانِ مدینہ ایک ایسا دَور تھا جس میں حکومتِ اسلامی، دشمنوں کے مقابلے میں جہاد، ایک سالم و صحیح ماحول جو نوعِ بشر کی واقعی قدر و قیمت پر استوار ہو اور عدالت اجتماعی کی تشکیل کی گئی تھی۔ لہٰذا مدنی سورتوں کی اکثر آیتوں میں مسائل و حقوق، اخلاق، اقتصاد، تعزیرات کے جزئیات اور تمام فردی و اجتماعی ضروریات و لوازم کو بیان کیا گیا ہے۔

آج کل کا مسلمان یہ چاہتا ہے کہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرے تو اسے چاہیئے کہ اسی لائحہ عمل کا حرف بحرف عملی طور سے اجراء کرے، اور ان دونوں ادوار کو بطورِ کامل طے کرے۔ تا وقتیکہ عقیدہ کی بنیاد مستحکم ہو

قوی نہ ہو اُس کے اوپر ٹھہرنے والے مسائل استقامت اور مضبوطی کے حامل نہ ہوں گے۔

بہر حال، چونکہ سورۂ اعراف میں اس بنا پر مکی سورہ ہونے کے حوالے سے جو خصوصیات ہونا چاہئیں اس میں جھلک رہی ہیں۔

لہٰذا اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ:

شروع میں ایک مختصر لیکن مضبوط اشارہ مسئلہ مبدأ و معاد کی طرف کیا گیا ہے۔ بعد ازاں شخصیت انسانی کو حیات ثانیہ دینے کے لیے حضرت آدمؑ کی خلقت کے واقعہ کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اللہ نے ان عہدوں کو ایک ایک کرکے گنوایا ہے جو اس نے اولادِ آدم سے راہِ راست پر چلنے کے سلسلہ میں لیے ہیں۔ اس کے بعد ان قوموں کی ناکامی و شکست دکھلانے کے لیے جو توحید و عدالت و پرہیزگاری کے راستہ سے ہٹ گئیں، نیز ان قوموں کی کامیابی دکھلانے کے لیے جنہوں نے ایمان کا جادہ کسی حال میں نہیں چھوڑا، بہت سی گزشتہ قوموں اور انبیاء سابقین مثلاً حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کی سرگذشتیں بیان کی ہیں۔ پھر بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰؑ و فرعون کے مقابلے کو تفصیلاً بیان کرکے اس بحث کا خاتمہ کیا ہے۔

اُس سورہ کے آخر میں دوبارہ مسئلہ مبدأ و معاد کا ذکر کیا گیا ہے اور اس طرح اس سورہ کے انجام کو اس کے آغاز سے ملا دیا گیا ہے۔

اس سورہ کی اہمیت

تفسیر عیاشی میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

جو شخص سورۂ اعراف کو مہینہ میں کم از کم ایک مرتبہ پڑھے گا وہ بروز قیامت ان لوگوں میں سے ہوگا جنہیں کوئی خوف ہوگا نہ غم، (من الذین لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون) اور اگر اسے اللہ یہ توفیق دے کہ وہ سورہ اعراف کو ہر جمعہ کو پڑھے، تو وہ قیامت کے روز ان لوگوں میں محشور ہوگا جو بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

نیز حضرتؑ نے فرمایا کہ اُس سورہ میں کچھ آیات محکمہ ہیں جن کا پڑھنا، تلاوت کرنا اور ان پر عمل کرنا کبھی نہ بھولنا، کیونکہ یہ آیات بروز محشر خدائے ذوالجلال کی پیش میں اپنے پڑھنے والے کی گواہی دیں گی۔ؒ

روایت مذکورہ سے جو نکتہ بخوبی سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ جن روایات میں سورتوں کی فضیلت بیان ہوئی ہے، اُس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی سورۃ کا پڑھ لینا اتنے بڑے نتائج و آثار کا سبب بنے گا بلکہ جو چیز اُس قرائت کو روح بخشنے والی ہے وہ اس سورہ کے مضمون و مطالب پر ایمان کا رکھنا ہے اور اس کے بعد اس پر عمل کرنا بھی ہے۔ اسی بنا پر روایات مذکورہ بالا میں ہم پڑھتے ہیں:

ؒ تفسیر برہان جلد دوم صفحہ ۲ و نور الثقلین جلد دوم صفحہ ۲۔

قرائتها وتلاوتها والقیام بها۔

نیز اسی روایت میں ہم دیکھتے ہیں کہ فرمایا:

جو شخص اس سورہ کو پڑھے گا قیامت میں وہ "الذین لا خوف علیهم ولا هم یحزنون" کا مصداق بنے گا۔ اور یہ درحقیقت اسی سورہ کی آیت نمبر ۳۵ کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے جس میں خدا نے فرمایا ہے:

فمن اتقی واصلح فلا خوف علیهم ولا هم یحزنون۔

جن لوگوں نے تقویٰ اختیار کیا اور (اپنی اور انسانی معاشرے کی) اصلاح کی انہیں (قیامت کے دن) کوئی خوف ہوگا نہ غم۔

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ مقام خاص طور سے ان لوگوں کا ہے جنوں نے تقویٰ اختیار کیا اور اصلاح کے راستے پر اپنے قدم اٹھائے۔ علاوہ بریں اصولی طور سے بھی قرآن "عقیدہ" اور "عمل" کی کتاب ہے۔ اس لیے قرأت و تلاوت اس سلسلے میں ایک مقدمہ ہے نہ کہ اصل مقصد۔

راغب اپنی کتاب "مفردات" میں لفظ "تلاوت" کے ذیل میں لکھتے ہیں:

آیہ۔ یتلونہ حق تلاوتہ[1] سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے علم و عمل کے ذریعے قرآن کی پیروی کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ "تلاوت" کے معنی "قرأت" سے بالاتر ہونے کیونکہ "تلاوت" کے مفہوم میں تدبر، تفکر اور عمل بھی شامل ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۱۲۱۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱ الٓمٓصٓ ۝

۲ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِىْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ

بِهٖ وَ ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝

۳ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ

اَوْلِيَآءَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے

۱ المص

۲ یہ وہ کتاب ہے جو تم پر نازل ہوئی، اس کی وجہ سے تمہارے سینے میں کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیئے، غرض یہ ہے کہ تم اس کے ذریعے (تمام لوگوں کو عقائدِ بد اوراعمالِ ناشائستہ کے بُرے انجام سے) ڈراؤ، اور یہ ایک یاددہانی ہے مومنوں کے لیے۔

۳ (اس بناء پر) وہ چیز جو تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہاری طرف نازل ہوئی اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں اورخداؤں کی پیروی مت کرو، لیکن کم ایسا ہوتا ہے کہ تم پر یاددہانی اثر کرے (اور تم ہوش میں آؤ)۔

تفسیر

اس سورہ کے آغاز میں ایک مرتبہ پھر ہمیں قرآن کے حروف مقطعات سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہاں چار حرف ہیں، الف۔ لام۔ میم۔ صاد۔

ان حروف کے بارے میں سورہ بقرہ اور آلِ عمران کے آغاز میں ہم نے مفصّل طور پر بحث کی ہے۔ اس جگہ ان حروف کی ایک اور تفسیر جو قابلِ توجہ ہے اس بحث کی تکمیل کی غرض سے بیان کی جاتی ہے اور وہ یہ کہ ممکن ہے ان حروف کے اغراض و مقاصد میں سے ایک بات یہ ہو کہ تلاوتِ قرآنی سے سننے والوں کی توجہ حاصل کی جاتے اور انہیں خاموش رہنے کی دعوت دی جائے کیونکہ آغازِ کلام میں ان حروف کا ذکر کرنا عربوں کی نظر میں ایک عجیب اور نئی چیز تھی جو اُن میں جستجو کا جذبہ ابھارتی تھی اور غالباً ایسا ہوتا تھا کہ ان حروف کو سننے کے بعد وہ بعد والے مطالب کو بھی دھیان کے ساتھ سنتے تھے، اس نظریہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اکثر سورتیں جو حروفِ مقطعات سے شروع ہوتی ہیں وہ مکی ہیں اور ہمیں معلوم ہے کہ اس وقت مکہ میں مسلمان بہت تھوڑے تھے اور دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو اپنی ضد کے پکے تھے وہ اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے آمادہ نہ تھے کہ پیغمبرؐ کی کسی بات پر کان دھریں بلکہ کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم انہیں خدا کا کوئی پیغام سنانا چاہتے تھے تو وہ اتنا شور و غل مچاتے جس سے آنحضرتؐ کی آواز گم ہو کر رہ جاتی تھی، جیسا کہ قرآن کی بعض آیات میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے (ملاحظہ ہو آیت ۲۶ سورہ فصّلت)۔

نیز بعض روایاتِ اہلبیت علیہم السلام میں وارد ہوا ہے کہ یہ حروف رموز و اشارہ ہیں اللہ کے اسماءِ حسنیٰ کا، مثلاً (المٓصٓ) اس سورہ میں اشارہ ہے (انا اللہ المقتدر الصادق) کی طرف، یعنی مَیں سچا اور قوی خدا ہوں، اسی طرح سے ان چار حروف میں سے ہر ایک خدا کے ناموں کا اختصار و خلاصہ ہے۔

مختصر الفاظ کو مفصّل الفاظ کی جگہ استعمال کرنا پہلے سے چلا آرہا ہے، اگرچہ ہمارے عصرِ جدید میں تو اس طرح کے استعمال کا دامن بہت وسیع ہو گیا ہے، بہت سی طولانی عبارتوں یا اداروں یا انجمنوں کے ناموں کو ایک مختصر لفظ میں سمیٹ دیتے ہیں۔

اس نکتہ کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ان حروفِ مقطعہ کی جو مختلف تفسیریں بیان کی گئی ہیں ان میں آپس میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں ہے کیونکہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں ان تمام تفسیروں کو قرآن کے مختلف بطون کے لحاظ سے مراد لیا جائے۔

اس کے بعد کی آیت میں فرماتا ہے: یہ وہ کتاب ہے جو تم پر نازل ہوئی ہے، اس کی وجہ سے کسی قسم کی فکر یا اذیت کو اختیار نہ کرو (کتاب انزل الیک فلا یکن فی صدرك حرج منه)۔

"حرج" کے معنی لغت میں تنگی، مصیبت اور ہر طرح کی اذیت کے ہیں اس کے اصلی معنی ہیں۔ درختوں کا جھنڈ۔ جن کی شاخیں آپس میں گتھی ہوئی ہوں۔ بعد میں اس معنی میں وسعت پیدا ہو گئی اور یہ لفظ ہر قسم کی دلتنگی اور ناراحتی کے معنی میں بولا جانے لگا۔

مذکورہ بالا جملہ پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تسلیِ خاطر کے لیے فرمایا ہے چونکہ یہ آیتیں خدا کی جانب سے ہیں لہٰذا کسی قسم کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، نہ اس رسالت کے سنگین بار کو اپنے دوش پر اٹھانے

کی فکر، نہ اس کے ردِ عمل اور جوابی کارروائیوں کی فکر جو نہایت جاہل اور ضدی دشمنوں کی طرف سے پیش آسکتی ہیں، نہ اس نتیجہ کی فکر جو اس تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں برآمد ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ تمام فکروں اور اندیشوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور وہی اس کو منزلِ عمل تک پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔

چونکہ یہ سورہ مکی ہے لہٰذا اس میں مشکلات کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ راہِ تبلیغ دین میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو درپیش تھیں۔ اگرچہ آج ہمارے لیے ان زحمتوں اور مصائب کا اپنے ذہن میں پوری طرح سے تصور کرنا مشکل ہے جو رسول اللہؐ اور ان کے باوفا ساتھیوں کو ابتداء میں دینِ اسلام پھیلانے کے سلسلے میں پیش آئی تھیں۔ لیکن اگر اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ رسول اللہؐ یہ چاہتے تھے کہ اس انتہائی درماندہ و پستی میں ڈوبے ہوئے معاشرے میں انقلاب کی ایسی روح پھونکیں جس کی وجہ سے انسانیت کا یہ پژمردہ و نیم جان پیکر یک بیک اٹھ کر کھڑا ہو جائے اور ترقی کی ہر وادی میں دوڑنے لگے اور یہ سب کچھ ایک تھوڑے سے عرصے میں ہو جائے، تو پھر ان مشکلات کا اجمالی طور سے کچھ اندازہ ہو سکے گا جو آنحضرتؐ کو اس راہ میں پیش ہوں گی۔

اس بنا پر یہ بات برمحل ہے کہ خداوندِ کریم آنحضرتؐ کو تسلی دے کہ پریشان نہ ہونا، دلتنگ نہ ہونا، اپنے کام کا درست نتیجہ نکلنے کے پوری طرح سے امید وار رہنا۔

اس کے بعد کے جملے میں مزید فرماتا ہے، اس کتاب کو نازل کرنے کا مقصد لوگوں کو ان کے افکار و اعمال کے انجام سے ڈرانا ہے، اسی طرح یہ تنبیہ اور یاد دہانی ہے سچے مومنین کے لیے (لتنذر بہ وذکرٰی للمؤمنین)[1]

اس آیت میں ایک بات جو ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "انذار" بطور ایک عمومی فرمان کے وارد ہوا ہے اور "تذکر" کو مومنین کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حق کی طرف دعوت اور بے راہ روی کا مقابلہ اجتماعی طور سے ہونا چاہیئے جس میں سب شریک ہیں لیکن ظاہر ہے کہ صرف ایمان لانے والوں ہی کو اس کا فائدہ پہنچے گا اور وہ وہی لوگ ہیں جن کے ذہن حق بات قبول کرنے کو تیار ہیں، انہوں نے ہر قسم کی ضد اور ہٹ دھرمی اپنے سے دور کر دی ہے اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ بالکل یہی تعبیر سورہ بقرہ کے آغاز میں بھی گذر چکی ہے جہاں فرمایا ہے: ذالک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین، یہ کتاب وہ ہے جس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں اور یہ پرہیزگاروں کے لیے سرمایۂ ہدایت ہے (مزید توضیح کیلئے تفسیر نمونہ جلد اوّل ملاحظہ ہو)۔

اس کے بعد عام انسانوں کی طرف روئے سخن کرکے ارشاد ہوتا ہے، جو چیز تمہارے پروردگار کی طرف

---

[1] جو بات اوپر کہی گئی ہے اس کی بناء پر "لتنذر" "انزل" سے متعلق ہے نہ کہ "فلا یکن" سے شاید اس (لتنذر) کا جملہ (فلا یکن فی صدرک حرج) کے بعد واقع ہونا اس بناء پر ہے کہ ابتداء میں پیغمبرؐ کو دعوت الی الحق کیلئے آمادہ کیا جانا چاہیئے بعد ازاں جو اس کا مقصد ہے (یعنی انذار) اسکو انکے سامنے بیان کرنا چاہیئے

سے تمہارے اوپر نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو (اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم)۔ اور اس طرح پیغمبر اور ان کی ماموریت و رسالت سے بات شروع ہو کر تمام لوگوں کے فرض منصبی پر ختم ہو جاتی ہے۔

مزید تاکید کے لیے ارشاد فرماتا ہے، غیر خدا کے فرمان کی پیروی نہ کرو، اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنا والی و سرپرست نہ بناؤ (ولا تتبعوا من دونہ اولیاء)۔

لیکن چونکہ ایسے بندے جو پورے طور سے حق کے سامنے اپنا سر خم کرتے ہیں اور یاد دہانیوں کا اثر لیتے ہیں کم ہیں اس بنا پر آیت کے آخر میں فرماتا ہے، تم یاد دہانیوں کا اثر بہت کم لیتے ہو (قلیلاً ما تذکرون)۔

ضمنی طور پر یہ آیت یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان ایک دوراہے پر کھڑا ہے، ایک تو خدا کی سرپرستی و رہبری کا راستہ ہے اور دوسرا غیروں کی سرپرستی میں داخل ہونے کا راستہ۔ اگر پہلی راہ اختیار کرے تو اس کا سرپرست و والی صرف خدا ہے اور دوسروں کی سرپرستی قبول کرے تو اسے ہر روز کسی نہ کسی کا بار اپنے کاندھے پر اٹھانا پڑے گا اور ہر روز ایک نئے مالک و سرپرست کا انتخاب کرنا پڑے گا۔ لفظ "اولیاء" جو "ولی" کی جمع ہے اسی مطلب کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

۴ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۝

۵ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ

۴ اور کتنے ہی شہر اور آبادیاں ایسی ہیں جنہیں ہم نے (ان کے گناہوں کی وجہ سے) تباہ کر دیا اور ہمارے عذاب نے جبکہ وہ رات کو سوئے ہوئے تھے یا دوپہر کو استراحت کی حالت میں تھے انہیں جا لیا۔

۵ پس جس موقع پر ہمارا عذاب ان پر آیا تو وہ اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکے کہ ہم ظالم تھے (لیکن اس اعترافِ گناہ میں دیر ہو چکی تھی کیونکہ اس نے انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچایا)۔

تفسیر

وہ قومیں جو نابود ہوگئیں

ان دونوں آیتوں میں ان عبرت ناک سزاؤں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو سابقہ آیات میں مذکورہ فرمانوں کی مخالفت کی وجہ سے دی گئیں۔

نیز یہ فی الواقع متعدد قوموں کی سرگزشت کی ایک اجمالی فہرست ہے جیسے قوم نوح، قوم فرعون، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم لوط جن کا ذکر بعد میں آنے والا ہے۔

اس مقام پر قرآن ان لوگوں کو جو انبیائے الٰہی کی تعلیمات سے روگردانی کرتے ہیں اور بجائے اپنی اور دوسرے افراد کی اصلاح کے، فساد کے بیج بوتے ہیں، انہیں شدت سے تنبیہ کرتا ہے کہ وہ ذرا پچھلی قوموں کی زندگی پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں: ہم نے کس قدر شہر اور آبادیاں تباہ و برباد کردیں اور ان میں رہنے والے لوگوں کو نابود کردیا (وکم من قریة اهلکناها)۔

اس کے بعد ان کی ہلاکت کی کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے: ہمارا دردناک عذاب، رات (کی تاریکی) میں جبکہ وہ خوابِ راحت میں ڈوبے ہوئے تھے یا دن کے درمیانی حصہ میں اس وقت جبکہ وہ دن کے کاموں کے بعد استراحت کر رہے تھے انہیں آپہنچا (فجآءها بأسنا بياتا او هم قائلون)۔

اس کے بعد کی آیت میں بات کو آگے یوں بڑھاتا ہے: وہ لوگ جب گردابِ بلا میں گرفتار ہوتے تھے اور پاداشِ عمل کا طوفان ان کی زندگی کے آشیانہ کو اجاڑ رہا ہوتا تھا تو وہ نخوت و غرور کی بلندی سے نیچے آتے تھے اور یوں کہتے تھے: ہم ستمگر تھے اور اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ ظلم و ستم نے ان کا دامن تھام رکھا تھا (فما کان دعواهم اذ جآءهم بأسنا الا آن قالوآ انا کنا ظالمین)۔

چند اہم نکات

۱۔ "قریہ" در اصل مادۂ "قری" (بروزن "نھی") سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں "اکٹھا ہونا"۔ چونکہ "قریہ" (آبادی) لوگوں کے اکٹھا ہونے کی جگہ ہے اس لیے یہ لفظ اس پر بولا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "قریہ" صرف دیہات ہی کو نہیں کہتے بلکہ یہ ہر قسم کی آبادی اور انسانوں کے اجتماع کے مرکز پر بولا جاتا ہے، چاہے کوئی دیہات ہو یا شہر۔ نیز قرآن کریم میں بھی یہ لفظ دیہات اور شہر دونوں کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

"قائلون" مادۂ "قیلولہ" سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں "خوابِ نیم روز" (دوپہر کی نیند) یا "دوپہر کی استراحت"۔ اس کے اصل معنی ہیں "راحت"، اسی لیے بیچنے کے بعد کسی جنس کو "واپس لے لینا" بھی اس کے معنی میں داخل ہو جاتا ہے کیونکہ اس سے طرفین معاملہ کو راحت ہو جاتی ہے۔ "بیات" کے معنی "وقتِ شب" کے ہیں۔

۲- یہ جو ہم نے مذکورہ آیت میں پڑھا ہے کہ اللہ کا عذاب رات کے درمیانی حصے میں یا دوپہر کے آرام کے وقت ان لوگوں کے دامنگیر ہوا یہ اس لیے تھا تاکہ وہ اپنے عمل بد کی پاداش کا مزہ اچھی طرح سے چکھیں اور ان کی آسائش و آرام بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے، جس طرح ان ظالموں نے دوسرے لوگوں کے آرام و آسائش کو ملیامیٹ کر دیا تھا، اس طرح ان کا کیفر کردار ان کے عمل بد کے حسب حال تھا۔

۳- اس آیت سے یہ بات بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ تمام مجرم اور گنہگار قوموں کی یہ حالت تھی کہ جب ان کے افراد عذاب الٰہی کے پنجے میں جکڑ جاتے اور غفلت و غرور کے پردے ان کی گناہوں سے اٹھ جاتے تو سب کے سب اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے لگ جاتے لیکن ایسا اعتراف ان کے لیے کسی طرح فائدہ بخش نہ تھا کیونکہ یہ تو ایک طرح کا " اجباری و اضطراری " اعتراف تھا۔ اس وقت حالت ہی ایسی ہو جاتی تھی کہ متکبر سے متکبر تر انسان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح کی بیداری، ایک جھوٹی بیداری تھی جو زود گزر اور بے اثر ہوتی ہے۔ جس میں کسی روحانی انقلاب کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا اور نہ اس کا ان کے اوپر کوئی اثر مرتب ہوتا ہے۔ ہاں اگر یہی اعتراف گناہ بحالت اختیار عذاب آنے سے پہلے ہوتا تو ان کے روحانی انقلاب کی دلیل بن کر ان کی نجات کا باعث بن جاتا۔

۴- یہاں پر مفسرین کے درمیان ایک بحث یہ بھی ہے کہ قرآن نے پہلے " اھلکناھا " (ہم نے انہیں ہلاک کر دیا) فرمایا، اس کے بعد " ف " کے ذریعے جسے فائے تفریع کہتے ہیں اور یہ ترتیب زمانی کے لیے آتی ہے، دوسرا جملہ فرمایا " فجآء ھا بأسنا بیاتا " (یعنی پھر رات کے وقت ہمارے عذاب نے انہیں آلیا) حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ عذاب تو ان پر ان کی ہلاکت سے قبل آیا تھا نہ کہ بعد میں؟

اس امر کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ " ف " ہمیشہ ترتیب زمانی ہی کے لیے نہیں آتی بلکہ اس سے کبھی پہلے مختصر جملے کی تفصیل بیان کرنا مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں پر بھی پہلے تو " اھلکناھا " کہہ کر مختصراً اس کا انجام بیان کیا گیا، اس کے بعد اس کی تفصیل اس طرح سے بیان کی :- ہمارے عذاب نے رات کے وقت یا دوپہر کو جبکہ وہ محو استراحت تھے ان کا دامن تھام لیا، اور جس گھڑی انہوں نے خود کو ہلاکت کے دروازے پر دیکھا تب انہوں نے اپنے ظلم وستم کا اعتراف کیا، اس طرح کا کلام، کلام عرب میں کم نہیں ہے۔

۵- اس طرح کی آیتوں کو، اقوام گذشتہ کی تاریخ ہی نہیں سمجھنا چاہیئے اور نہ اسے اقوام گذشتہ سے مخصوص کرنا چاہیئے کہ یہ بات آئی گئی ہو گئی بلکہ یہ آیتیں آج کے انسانوں کے لیے اور آئندہ آنے والوں کے لیے زبردست تنبیہیں اور خطرے کے الارم ہیں، یہ ہمارے لیے بھی ہیں اور تمام آئندہ آنے والی قوموں کے لیے بھی کیونکہ سنت الٰہیہ میں تبعیض و ترجیح کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

آج کا انسان جسے ایک صنعتی و میکانیکی انسان کہا جاتا ہے اپنی تمام قدرتوں اور قوتوں کے باوجود جو اس نے بڑی کد و کاوش کے بعد حاصل کر رکھی ہیں، زلزلے کے ایک جھٹکے، طوفان کے ایک جھونکے، بارش کے ایک

تھپیڑے اور اسی طرح کی دیگر آسمانی بلاؤں کے آگے اسی طرح کمزور و ناتواں ہے جس طرح ماقبل تاریخ کے دور میں تھا۔ بنا بریں وہ درد ناک عذاب اور انجام بد جس کا سامنا گزشتہ امتوں کے ستمگاروں اور مغرور و ہوس رانی میں مست انسانوں کو کرنا پڑتا تھا آج کے انسان سے بھی بعید نہیں ہے بلکہ اس وقت انسان کو جو قدرت و طاقت حاصل ہوگئی ہے اس کی بنا پر وہ خود اپنی تباہی و عذاب کا سبب بن سکتا ہے اور یہی علم اور طاقت اسے آخرکار ایک ایسی عظیم جنگ کی طرف لے جا رہی ہے جس کی وجہ سے نسل انسانی کے نابود ہونے کا اندیشہ ہے۔
آیا انسان کو ان حوادث سے عبرت نہیں لینا چاہیئے اور بیدار نہیں ہونا چاہیئے؟

۶ فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

۷ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝

۸ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ﹰالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

۹ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۶ ہم یقیناً ان لوگوں سے سوال کریں گے جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے تھے، نیز ان پیغمبروں سے بھی سوال کریں گے۔

۷ اور یقیناً (سب کے اعمال کو حرف بہ حرف) ان کے سامنے اپنے (وسیع) علم کی رُو سے بیان کریں گے، اور ہم (اصولی طور پر) غائب نہ تھے (بلکہ ہم ہر جگہ حاضر و ناظر تھے)۔

۸ اور اس روز (اعمال کا) وزن کرنا (اور ان کی قیمت معین کرنا) برحق ہے، وہ

لوگ جن کی میزان (عمل) بھاری ہے وہ فلاح یافتہ ہیں۔

۹ اور وہ لوگ جن کی میزان (عمل) سبک ہے وہ ہیں جنہوں نے اپنے اُس ظلم وستم کی وجہ سے جو وہ ہماری آیتوں پر روا رکھتے تھے، اپنے سرمایۂ وجود سے ہاتھ دھو لیا ہے۔

تفسیر

ایک عام باز پرس

گذشتہ آیات میں خدا شناسی اور نزولِ قرآن کی طرف اشارہ کیا گیا تھا لیکن زیرِ نظر آیات جن میں معاد کی بابت گفتگو کی گئی ہے، فی الواقع یہ ان آیات کی تکمیل کنندہ ہیں۔ علاوہ ازیں گذشتہ آیات میں دنیا میں ظالموں کے ظلم کے نتائج کے بارے میں گفتگو تھی اور ان آیات میں ان لوگوں کی اُخروی سزاؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح سے ان تمام آیات کے درمیان واضح ربط موجود ہے۔

ابتدا میں ایک عام قانون کے طور سے فرماتا ہے: ان تمام لوگوں سے، جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا ہے ہم یقینی طور سے بروزِ قیامت سوال کریں گے (فلنسئلن الذین ارسل الیھم)۔

صرف ان سے ہی سوال نہیں کریں گے بلکہ ان کے رسولوں سے بھی سوال کریں گے کہ تم نے ہمارا پیغام ان تک کس طرح پہنچایا (ولنسئلن المرسلین)۔

بنا بریں رہبر بھی مسئول ہیں اور پیرو بھی، پیشوا بھی جوابدہ ہیں مرید بھی اگرچہ ان دونوں گروہوں کی مسئولیت جداگانہ ہے۔ اس سلسلے میں حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے جو اس مطلب کی تائید کرتی ہے حضرت فرماتے ہیں:

فیقام الرسل فیسئلون عن تأدیة الرسالات التی حملوھا الی اممھم فاخبروا انھم قد ادوا ذٰلک الی اممھم ...

پیغمبروں کو بروزِ قیامت روکا جائے گا اور ان سے سوال کیا جائے گا کہ آیا تم نے اللہ کا پیغام اپنی امتوں کو پہنچایا تھا یا نہیں؟ وہ جواب دیں گے کہ ہاں ہم نے پیغام پہنچا دیا تھا[1]

ایک اور روایت جو تفسیر علی بن ابراہیم میں مذکور ہے وہ بھی اس کی مؤید ہے[2]

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ خدا کے علم سے کچھ چیزیں مخفی ہیں اسی لیے وہ بروزِ قیامت اس طرح کے سوالات کرے گا، اس توہم کو دُور کرنے کے لیے بعد والی آیت میں خدا یقینی طور پر، قسمیہ تاکید کے ساتھ فرماتا ہے: ہم اپنے

[1] و [2] تفسیر نور الثقلین ج دوم ص

علم و آگاہی کی بناء پر ان کے تمام اعمال کی شرح ان سے بیان کریں گے، کیونکہ ہم ہرگز ان سے غائب نہ تھے ہر جگہ ان کے ساتھ تھے اور ہر حال میں ان کے ہمراہ تھے (فلنقصن علیھم بعلم وما کنّا غآئبین)۔

"فلنقصن" جو مادہ "قصّہ" سے ماخوذ ہے، اس کے اصلی معنی ہیں "ایک دوسرے کے پیچھے قطار کی طرح کھڑے ہونا" اور چونکہ سرگذشت بیان کرنے میں مطالب و مضامین ایک دوسرے کے پیچھے مسلسل طور پر آتے جاتے ہیں اس لیے اسے "قصّہ" کہتے ہیں، اسی طرح سے وہ تعزیرات جو جرائم کے بعد مرتب ہوتی ہیں انہیں "قصاص" کہا جاتا ہے۔ اسی لیے قینچی کو بھی "مقص" (بروزن "پسر") کہتے ہیں کیونکہ وہ پے در پے بالوں کو کاٹتی ہے نیز کسی چیز کی جستجو کو "قص" (بروزن مس) کہتے ہیں کیونکہ جستجو اور تفتیش کرنے والا شخص حوادث کی مسلسل تعقیب کرتا ہے۔

چونکہ آیت میں چار قسم کی تاکید ہے (لام قسم، نون تاکید، کلمہ علم جو نکرہ کی صورت میں ذکر ہوا ہے اور اس سے بیان عظمت مقام ہے اور جملہ "ماکنا غآئبین" ہم کبھی بھی غائب نہ تھے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقصد یہ ہے کہ ہم تمہارے اعمال کی تمام جزئیات کو "حرف بہ حرف" اور "سلسلہ وار" ان سے بیان کریں گے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ چھوٹی سے چھوٹی نیت یا عمل ہمارے علم سے پوشیدہ نہیں ہے[1]

سوال کس لیے؟

پہلی بحث جو ہمیں درپیش ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہے کہ خدا ہر چیز کو جانتا ہے اور اصولی طور سے ہر جگہ حاضر و ناظر بھی ہے اس صورت میں اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ وہ تمام انبیاء اور امتوں سے بغیر کسی استثناء کے باز پرس کرے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے کیونکہ اگر سوال کرنا اطلاع حاصل کرنے کے لیے اور واقعہ معلوم کرنے کیلئے ہو تو جسے معلوم ہے اس کے لیے ایسا سوال کرنا بے فائدہ ہوگا لیکن اگر سوال کا مقصد یہ ہو کہ مخاطب کو متوجہ کیا جائے یا اس سے اتمام حجت کی جائے یا اس کے علاوہ کوئی اور غرض ہو تو اس موقع پر سوال بے جا نہیں ہے۔ اس کی ٹھیک مثال اس طرح ہے کہ ایک شخص کثیر النسیان ہو اور ہم نے بہت زیادہ اس کی خدمت کی ہو پھر اس نے بجائے خدمت کے طرح طرح کی خیانتوں سے بدلہ دیا ہو، یہ تمام باتیں ہم پر روشن ہیں لیکن اس کے باوجود ہم اس شخص سے باز پرس کرتے ہوئے اس سے پوچھتے ہیں کہ آیا ہم نے تمہاری طرح طرح کی خدمتیں نہیں کیں؟ کیا تم نے ان خدمتوں کا حق ادا کیا؟

اس طرح کے سوالات تحصیل علم کے لیے نہیں ہوا کرتے بلکہ دوسرے کی تفہیم کے لیے ہوتے ہیں یا یہ کہ کسی

---

[1] تفسیر "مجمع البیان" و "تبیان" میں بحث مذکورہ بالا کو "قصّہ" کے عنوان کے تحت آیت کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

خدمت گزار شخص کی قدردانی اور تشویق کے لیے ہم اس سے پوچھتے ہیں: اس سفر میں جو ڈیوٹی تمہارے سپرد کی گئی تھی اس کی بابت تم نے کیا کیا؟ درانحالیکہ ہمیں اس کی تمام جزئیات معلوم ہوتی ہیں۔

وہ آیات جن میں سوال کیا گیا ہے

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ آیت مورد بحث میں جس صراحت کے ساتھ اور بڑی تاکید و قسم کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ قیامت کے روز سب سے سوال کیا جائے گا، یہ دوسری بعض آیات سے اختلاف رکھتا ہے۔ مثلاً سورۂ رحمان میں یہ آیت ہے:

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ... يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ ...

اُس روز کسی شخص سے نہ انسانوں سے نہ جنوں سے کوئی سوال کیا جائے گا بلکہ گنہگاروں کو ان کی علامتوں سے پہچان لیا جائے گا۔[1]

اسی طرح کی دیگر آیات بھی ہیں جو بروزِ قیامت سوال کی نفی کرتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کی آیات سوال کا اثبات کرنے والی آیات مثلاً زیرِ نظر آیت سے کیسے میل کھاتی ہیں۔

لیکن اگر ہم ان آیات میں غور و فکر سے کام لیں تو ہر طرح کا ابہام دُور ہو جائے گا کیونکہ جن آیتوں میں بروزِ قیامت سوال و جواب کا ذکر ہے اگر ہم ان سب کو ملا کر دیکھیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس روز لوگ چند مرحلوں کو طے کریں گے۔ ان میں سے کچھ مرحلے تو ایسے ہوں گے جہاں ان سے کسی قسم کا سوال نہیں کیا جائے گا، حتیٰ کہ ان کے منہ پر مُہر لگا دی جائے گی، صرف ان کے اعضاء و جوارح جنہوں نے ان کے اعمال کے اثرات کو اپنے میں محفوظ کر لیا ہے، ایک بولنے والے اور ناقابلِ تردید گواہ کی حیثیت سے ان کے تمام اعمال کی تفاصیل بیان کریں گے۔

اس کے بعد والے مرحلے میں ان کے منہ سے مُہر ہٹا دی جائے گی جس کی وجہ سے وہ دوبارہ بول سکیں گے اور ان سے سوال کیا جائے گا۔ چونکہ وہ اپنے اعضاء کی گواہی دیکھ چکے ہوں گے لہٰذا انہیں اپنے اعمال کا اعتراف کرنا پڑے گا، بالکل ان مجرموں کی طرح جن کو اپنے جرائم کے چشم دید آثار کو دیکھنے کے بعد سوائے اعتراف کر لینے کے کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔

بعض مفسّرین نے ان آیات میں یہ بھی احتمال دیا ہے کہ جن آیات میں سوال کی نفی کی گئی ہے اس سے مراد زبانی سوال و جواب ہے، جن آیات میں سوال کا اثبات کیا گیا ہے اس سے مراد اعضاء و جوارح سے سوال کیا جانا ہے۔ چنانچہ جیسے رنگِ رخسار رازِ دل کو آشکار کر دیتا ہے انسانی اعضاء و جوارح حقائق کو ظاہر کر دیں گے۔

ان میں سے کسی صورت میں ان دو طرح کی آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

---

[1] سورۂ رحمان آیت ۳۹ - ۴۱

اس کے بعد والی آیت میں بحث حشر و نشر کی تکمیل کے لیے مسئلہ "اچھے بُرے اعمال کی پرکھ" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی مثال قرآن کی دوسری سورتوں میں بھی موجود ہے جیسے سورہ مومنون آیات ۱۰۲ - ۱۰۳ اور سورہ قارعہ آیات ۶ - ۸ ۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے کہ : اعمال کے تولے جانے کا مسئلہ اس روز برحق ہے (والوزن یومئذ الحق)۔[1]

قیامت کے روز اچھے بُرے اعمال کی پرکھ کیلئے ترازو سے کیا مراد ہے

بروزِ محشر اعمال کے تولے جانے کی کیفیت کے بارے میں مفسرین و متکلمین کے درمیان بڑی بحث ہے چونکہ بعض افراد نے یہ خیال کیا ہے کہ وزن و ترازو اُس جہان میں بالکل اِس جہان کے وزن و ترازو کی طرح ہے ۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ انسانوں کے اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوتا ، اس طرح ناچار ہو کر انہوں نے تجسّمِ اعمال کے ذریعے یا یہ کہ اس روز خود انسانوں کا وزن کیا جائے گا اس مشکل کا حل ڈھونڈا ہے ۔ یہاں تک کہ انہوں نے عبید بن عمیر سے ایک عبارت نقل کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں :

"یؤتی بالرجل الطویل العظیم فلا یزن جناح بعوضۃ"

یعنی بروزِ قیامت طویل القامت عظیم الجثہ افراد لائے جائیں گے جو ترازو میں مچھر کے پر جتنا وزن بھی نہ رکھتے ہوں گے"[2]

اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ وہ لوگ اگرچہ بظاہر بڑے لوگ ہوں گے لیکن فی الحقیقت ان کی کوئی قیمت نہ ہوگی ۔

اگر ہم اُس جہان کی زندگی کا اِس دنیا کی زندگی سے موازنہ کریں اور یہ دیکھیں کہ وہاں کی ہر چیز اِس دُنیا سے بالکل الگ ہے جیسے ایک جنین کی شکم مادر کے اندر کی زندگی دنیاوی زندگی سے مختلف ہے ، نیز اس بات کی طرف بھی توجہ رکھیں کہ کسی لفظ کے معنی سمجھنے کے لیے ہمیشہ مصداق موجود کے پیچھے نہیں جانا چاہیئے بلکہ نتیجہ کی رُو سے مفہوم کو پرکھنا چاہیئے ، تو قیامت کے روز جو میزان نصب کی جائے گی اس کے معنی بالکل سمجھ میں آجائیں گے ۔

اس کی توضیح اس طرح پر ہے کہ سابقہ زمانے میں جبکہ بھی "چراغ" کا نام لیا جاتا تھا ، تو ایک برتن سمجھ میں آتا تھا جس میں تھوڑا تیل پڑا ہو اور ایک فتیلہ (بتی) اس میں موجود ہو ، نیز اس بات کا بھی احتمال ہوتا تھا کہ شاید اس پر ایک چمنی بھی موجود ہو جو چراغ کی ہوا سے حفاظت کرے گی جبکہ فی زمانہ اس لفظ "چراغ" سے دوسری چیز سمجھ میں آتی ہے ، ایک ایسی شے جس میں نہ تو تیل کا کوئی برتن ہے نہ فتیلہ ہے ، نہ ہوا کو روکنے کے لیے پہلے کی طرح کا

---

[1] بنا برین "وزن" بہ معنائے مصدری ہے ، یعنی وزن کرنا ، اور یہ کلمہ مبتدا ہے "الحق" اس کی خبر ہے اگرچہ اس میں دیگر احتمالات بھی ہیں مگر جو ہم نے کہا ہے سب سے زیادہ قرینِ عقل ہے ۔

[2] اس روایت کو تفسیر مجمع البیان اور تفسیر طبری میں عبید بن عمیر سے نقل کیا گیا ہے ظاہر عبارت یہ ہے کہ یہ خود عبید کے الفاظ ہیں نہ کہ پیغمبرؐ کے ۔

فانوس سے، لیکن اس کے باوجود جو چیز آج کے چراغ کو قدیمی چراغ سے ملاتی ہے وہ اس کا نتیجہ ہے یعنی ایک ایسی شے جو تاریکی کو دُور کر دے۔

مسئلہ "میزان" بھی بالکل اسی طرح ہے، اسی جہان میں ہم دیکھتے ہیں کہ جتنا زمانہ آگے بڑھتا جاتا ہے ترازو کی شکلیں کس طرح بدلتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ لفظ "میزان" دوسری چیزوں کے جانچنے کے آلات کے لیے بھی استعمال ہونے لگا، جیسے "میزان الحرارۃ" (ڈگری جانچنے کا آلہ)۔ "میزان الھوا" (ہوا جانچنے کا آلہ) وغیرہ وغیرہ۔

اس بنا پر جو چیز مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ بروز قیامت لوگوں کے اعمال ایک خاص وسیلے سے جانچے جائیں گے، یہ ضروری نہیں کہ وہ وسیلہ دنیا کے ترازو کی طرح ہو۔ ممکن ہے کہ وہ وسیلہ انبیاء، آئمہ اور افراد صالح کا وجود ہو۔ اس مطلب کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جو اہلبیت طاہرین علیہم السلام سے ہم تک پہنچی ہیں۔

چنانچہ بحار الانوار میں ہے کہ امام جعفر صادق علیہ السلام سے جب آیت ونضع الموازین القسط[1] کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

"والموازین الانبیاء والاوصیاء ومن الخلق من یدخل الجنۃ بغیر حساب:

بروز قیامت میزان سے مراد پیغمبران کرام اور ان کے اوصیائے عظام ہیں اور لوگوں میں سے وہ افراد ہیں جو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہوں گے (یعنی وہ لوگ جن کے نامۂ اعمال میں تاریکی کا کوئی گوشہ نہ ہوگا)۔[2]

اور دوسری روایت میں اس طرح وارد ہوا ہے:

"ان امیرالمؤمنین والائمۃ من ذریتہ ھم الموازین"

یعنی امیرالمومنینؑ اور ان کے فرزند آئمۂ طاہرین میزان اعمال ہیں۔[3]

نیز حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کی زیارت مطلقہ میں وارد ہوا ہے:

السلام علی میزان الاعمال۔

"سلام ہو اس پر جو اعمال کی میزان ہے۔"

واقعہ یہ ہے کہ اس جہان میں جو مرد اور عورت عمل کی رُو سے دوسروں کے لیے نمونہ ہیں وہ فی الحقیقت دوسروں کے اعمال کا ایک ترازو ہیں اور جو شخص جس قدر بھی ان سے مشابہت رکھتا ہے وہ اتنا ہی وزن رکھتا ہے اور وہ افراد جو ان سے کم مشابہت رکھتے ہیں یا بالکل مشابہ نہیں ہیں وہ "کم وزن" یا بالکل "بے وزن" اور ہلکے افراد ہیں۔

یہاں تک کہ اس جہان میں بھی دوستانِ خدا دوسروں کے اعمال کی مقیاس ہیں، لیکن چونکہ اس دنیا میں

---

[1] سورۂ انبیاء، آیت ۴۷۔

[2] و [3] بحار الانوار طبع جدید جلد ۷، ص ۲۵۱ - ۲۵۲۔

بہت سے حقائق پردۂ خفا میں رہ جاتے ہیں اور روزِ قیامت بمقتضائے آیہ شریفہ "وبرزوا للہ الواحد القھار (ابراہیم۔ ۴۸) روزِ انکشاف وظہور ہے اس لیے اُس دن یہ واقعیت ظاہر و آشکارا ہو جاتے گی۔

اور یہیں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ "موازین" جمع کا صیغہ کیوں آیا ہے، کیونکہ اولیائے حق جو ترازوئے اعمال ہیں وہ متعدد ہیں۔

نیز یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ ان میں سے ہرایک کسی نہ کسی صفت میں ممتاز تھا، بنا بریں ان میں سے ہر ایک انسانوں کی کسی ایک صفت کی مقیاس ہے اور چونکہ انسانوں کے اعمال وصفات مختلف ہیں لہٰذا کسوٹی اور ترازو بھی مختلف ہونا چاہیئے۔

اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ بعض روایات میں اس کا مفہوم "عدل" کیوں بیان کیا گیا ہے، جیسے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ کسی نے حضرت سے پوچھا:

"ما معنی المیزان قال العدل:

میزان کے معنی کیا ہیں؟ حضرت نے فرمایا عدل[1]

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کا مفہوم اس کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ دوستانِ خدا اور وہ مرد اور عورتیں جو نمونۂ عمل ہیں وہ عدل کا مظہر ہیں، یعنی عدل از روئے فکر، عدل از روئے عقیدہ، عدل از روئے صفات و اعمال (ذرا غور کیجیے گا)۔

اس کے بعد کے جملے میں ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جن کا پلہ میزانِ عمل سے بھاری ہے نجات یافتہ ہیں اور وہ لوگ جن کا پلّہ ہلکا ہے وہ، وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس ظلم وستم کی وجہ سے جو انہوں نے ہماری آیات کے بارے میں کیا ہے، اپنے سرمایۂ وجود کو کھو دیا ہے (فمن ثقلت موازینہ فاولٰئک ھم المفلحون ومن خفت موازینہ فاولٰئک الذین خسروا انفسھم بما کانوا بایٰتنا یظلمون)۔

یہ بات بھی بدیہی ہے کہ میزان کے بھاری اور ہلکے پنے سے خود ترازو کے پلہ کا بھاری اور ہلکا ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد وہ اعمال ہیں جو ان ترازوؤں میں تولے جائیں گے۔

اسی ضمن میں "خسروا انفسھم" (انہوں نے اپنے سرمایۂ وجود کو کھو دیا) سے اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے افراد بہت بڑے خسارے اور گھاٹے میں مبتلا ہوں گے، کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان یوں گھاٹا اٹھاتا ہے کہ اس کا مال یا مقام ہاتھ سے چلا جاتا ہے، لیکن کبھی ایسا گھاٹا اٹھاتا ہے کہ وہ اپنے سرمایۂ ہستی کو کھو بیٹھتا ہے اس طرح کہ اس کے بدلے میں اسے کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ یقیناً یہ سب سے بڑا اور بُرا خسارہ ہے۔

آخر آیت میں جو یہ آیا ہے کہ "کانوا بایٰتنا یظلمون" ہماری آیتوں کے بارے میں ظلم کرتے تھے

---

[1] تفسیر نور الثقلین۔ جلد ۲۔ ص ۵۔

اس تعبیر سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اس طرح کے لوگ صرف اپنی ہی جانوں پر ظلم نہیں کرتے بلکہ خدا نے ہدایت خلق کے لیے جو نظام قائم کیے ہیں ان پر بھی ستم کرتے ہیں کیونکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ اللہ کے بنائے ہوئے یہ نظام خلق کی ہدایت و نجات کا وسیلہ بنیں، لیکن جب ان سے بے اعتنائی برتی جائے گی تو ان سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکے گا اور اس طرح ان پر ظلم ہوگا۔

بعض روایات میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ اس مقام پر "آیات" سے مراد دین کے عظیم رہبر اور آئمہ ھدیٰ ہیں، لیکن جیسا کہ ہم نے کئی بار کہا ہے کہ اس طرح کی تفسیروں کا یہ منشا نہیں ہے کہ آیت صرف اسی تفسیر کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ جائے بلکہ یہ معنی آیت کے ایک روشن مصداق کی حیثیت رکھتا ہے۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں آیت پر ظلم کے معنی یہ لیے ہیں کہ آیت کا انکار کیا جائے یا اس کے ساتھ کفر کیا جائے، یقیناً یہ معنی بھی ظلم کے مفہوم سے بعید نہیں، قرآن کی بعض دیگر آیات میں بھی "ظلم" اسی معنی میں آیا ہے۔

۱۰ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۠

ترجمہ

۱۰ ہم نے زمین پر تسلط، مالکیت اور حکومت تمہارے لیے قرار دی ہے اور زندگی کے لیے طرح طرح کے وسائل تمہارے لیے فراہم کیے ہیں لیکن تم بہت کم شکر کرتے ہو (اور خدا کی ان تمام نعمتوں کو برمحل صرف نہیں کرتے)۔

تفسیر

جہان ہستی میں انسان کا عظیم الشان مقام

جن آیات میں مبدأ و معاد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ان کے بعد اس آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں موضوع گفتگو یہ امور ہیں: "انسان" اور اس کے مقام کی عظمت و اہمیت، اس طرح کے افتخارات کی کیفیت جو اللہ نے اسے عطا کیے ہیں اور وہ عہد و پیمان جو ان نعمتوں کے بارے میں اللہ نے اس سے لیے ہیں یہ اس لیے ہے تاکہ تربیت انسانی کی بنیاد مستحکم ہو اور اس کی ترقی کی راہ ہموار ہو۔

سب سے پہلے ایک آیت میں ان تمام مطالب کو بطور خلاصہ بیان فرمایا گیا ہے۔ پھر بعد والی آیات میں اس کی تشریح و تفصیل بیان کی گئی ہے۔

شروع میں فرماتا ہے: ہم نے زمین پر تمہیں مالکیت، حکومت اور تسلط عطا کیا ہے (ولقد مکناکم فی الارض)۔

اور اس میں تمہارے لیے زندگی کے طرح طرح کے وسائل پیدا کیے ہیں (وجعلنا لکم فیھا معایش)۔

لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم نعمتوں اور عطیوں کا بہت کم شکر کرتے ہو (قلیلاً ما تشکرون)۔

"تمکین" کے صرف یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی شخص کو کسی جگہ ٹھہرا دیا جائے، بلکہ اس کے معنی میں ہے کہ اسے وہاں کام کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہو وہ بھی اس کے لیے فراہم کیے جائیں، اسے قوت و توانائی دی جائے، کام کرنے کے تمام آلات فراہم کیے جائیں اور رکاوٹیں دور کی جائیں۔ ان تمام امور پر لفظ "تمکین" بولا جاتا ہے۔ حضرت یوسف کے بارے میں قرآن مجید میں ہے:

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْاَرْضِ:

ہم نے اس طرح یوسف کو زمین پر قبضہ عطا کیا (اور ہر طرح کی قدرت ان کے اختیار میں دی)۔ (یوسف۔ ۵۶)

اس آیت میں بھی دیگر آیات کی مانند پروردگار کی نعمتوں کے ذکر کے بعد بندوں کو شکرگذاری کی دعوت دی گئی ہے اور ان کی ناسپاسی اور کفران نعمت کی مذمت کی گئی ہے۔

یہ امر بدیہی ہے کہ لوگوں میں خدا کی نعمتوں کے مقابلے میں شکرگزاری اور قدر دانی کا جذبہ بیدار کرنا صرف اس لیے ہے کہ بندہ فرمانِ فطرت کے مطابق ان تمام نعمتوں کے عطا کرنے والے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے، اسے پہچانے اور اس کے ہر فرمان کو جان و دل سے قبول کرے اور یوں اس کی ہدایت و تربیت کا سامان ہو جائے، نہ یہ کہ شکرگزاری کا کوئی فائدہ پروردگار عالم کو پہنچتا ہے۔ بلکہ اس کا جو کچھ بھی اثر اور فائدہ ہے وہ دیگر عبادتوں کی طرح خود انسان ہی کو پہنچتا ہے۔

(۱۱) وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ لَمْ يَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝

(۱۲) قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۭ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝

۱۳ قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ
اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝

۱۴ قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝

۱۵ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۝

۱۶ قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝

۱۷ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ
وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ۭ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ۝

۱۸ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ۭ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ
لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۱ ہم نے تمہیں پیدا کیا، پھر ہم نے تمہاری شکل و صورت بنائی، اس کے بعد ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے لیے سجدہ کرو، انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ ہوا۔

۱۲ (خدا نے اس سے) فرمایا: تجھے کس چیز نے سجدے سے روکا جبکہ میں نے تجھے حکم دیا؟ اُس نے کہا کہ مَیں اس سے بہتر ہوں، مجھے تُو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے خاک سے۔

۱۳ کہا اس (مقام و مرتبہ) سے اتر جا! تجھے اس مقام و مرتبہ ہوں یہ حق نہیں پہنچتا کہ تو تکبر کرے، تو یہاں سے نکل جا، تو پست و حقیر افراد میں سے ہے۔

۱۴ اس (شیطان) نے کہا مجھے روزِ محشر تک کے لیے مہلت دے (اور زندہ رہنے دے)۔

۱۵ (اللہ نے) فرمایا: تُو مہلت یافتہ افراد میں سے ہے۔

۱۶ اس نے کہا: اب جبکہ تُو نے مجھے گمراہ کیا ہے، مَیں تیرے سیدھے راستے پر ان لوگوں کی تاک میں رہوں گا۔

۱۷ اس کے بعد ان کے آگے سے، پیچھے سے، داہنی طرف سے، بائیں طرف سے ان کی طرف آؤں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکرگزار نہ پائے گا۔

۱۸ (اللہ نے) فرمایا: اس (مقام) سے ذلّت و خواری کے ساتھ باہر نکل جا، جو شخص بھی ان میں سے تیری پیروی کرے گا، مَیں ان سے اور تجھ سے جہنم کو بھر دُوں گا۔

تفسیر

ابلیس کی سرکشی اور عصیان کا ماجرا

قرآن کریم کی سات سورتوں میں انسان کی پیدائش اور اس کی خلقت کی کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے، اور جیساکہ سابقاً بیان کیا گیا ہے اس موضوع کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی شخصیت اور موجوداتِ عالم میں اس کا مقام و مرتبہ بیان کیا جائے اور اس کے وجود میں جذبۂ شکرگزاری بیدار کیا جائے۔

اس سورہ میں مختلف تعبیروں سے خاک سے انسان کی خلقت، اس کے لیے فرشتوں کا سجدہ کرنا اور شیطان کی سرکشی نیز اس کے بعد نوعِ انسانی کو تباہ کرنے کے لیے اس کے گھات میں رہنے کا ذکر کیا گیا ہے۔

پہلی موردِ بحث آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: ہم نے تمہیں پیدا کیا، اس کے بعد تمہیں شکل و صورت دی اس کے بعد ہم نے فرشتوں کو (اور ان کے درمیان ابلیس کو بھی جو اگرچہ فرشتوں میں سے نہ تھا لیکن ان کے درمیان تھا) حکم دیا کہ آدم (جو تمہارا جدِّ اوّل تھا) کے لیے سجدہ کریں (ولقد خلقناکم ثم صورناکم ثم قلنا للملآئکة اسجدوا لاٰدم)۔

سب نے جان و دل سے اس فرمان کو قبول کیا اور انہوں نے آدم کے لیے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ ہوا (فسجدوا الآ ابلیس لم یکن من الساجدین)۔

آیت مذکورہ بالا میں "خلقت" کا ذکر "صورت بندی" سے پہلے کیا گیا ہے۔ ممکن ہے اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہو کہ ہم نے سب سے پہلے خلقتِ انسانی کے مادّۂ اوّل کو پیدا کیا اور پھر ہم نے اسے انسانی

شکل عطا کی، جیسا کہ ہم نے سورہ بقرہ آیت ۳۴ کے ضمن میں بیان کیا ہے، یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ فرشتوں کا آدمؑ کو سجدہ کرنا "سجدۂ عبادت" نہ تھا، کیونکہ پرستش صرف خدا کے لیے مخصوص ہے، بلکہ یہاں پر سجدہ برائے خضوع و احترام تھا (یعنی انہوں نے آدمؑ کے آگے اظہار فروتنی کیا تھا) یا یہ کہ یہ سجدہ خدا کے لیے شکرانہ کے طور پر تھا کہ اس نے ایک ایسی موزوں، مناسب اور باعظمت مخلوق پیدا کی ہے۔

نیز ہم اُسی آیت کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں کہ "ابلیس" فرشتوں میں سے نہ تھا، بلکہ آیات قرآنی نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ وہ ایک اور قسم کی مخلوق تھا جن کا نام "جن" ہے (مزید توضیح کے لیے براہ مہربانی تفسیر نمونہ جلد اوّل صفحہ ۱۵۶ اُردو ترجمہ میں ملاحظہ فرمائیں)۔

اس کے بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: خدا نے "ابلیس" کی سرکشی اور طغیان کی وجہ اس کا مواخذہ کیا اور کہا، اس بات کا کیا سبب ہے کہ تو نے آدم کو سجدہ نہیں کیا اور میرے فرمان کو نظر انداز کر دیا ہے؟ (قال ما منعك ان لا تسجد اذ امرتك)۔

اس نے جواب میں ایک نادرست بہانے کا سہارا لیا اور کہا: میں اس سے بہتر ہوں کیونکہ تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آدم کو آب و گل سے (قال انا خير منه خلقتني من نار وخلقته من طين)۔

گویا اسے خیال تھا کہ آگ، خاک سے بہتر و افضل ہے، یہ ابلیس کی ایک بڑی غلط فہمی تھی۔ شاید اسے غلط فہمی بھی نہ تھی بلکہ جان بوجھ کر جھوٹ بول رہا تھا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ خاک طرح طرح کی برکتوں کا سرچشمہ، تمام مواد حیاتی کا منبع اور زندہ موجودات کی بقائے حیات کا ایک اہم ترین وسیلہ ہے، جبکہ آگ میں یہ خصوصیات موجود نہیں ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ آگ موجودات جہان کے تجزیہ و ترکیب کی شرطوں میں سے ایک شرط ہے لیکن زندہ موجودات کی ہستی میں بنیادی حیثیت ان مواد کو حاصل ہے جو خاک کے اندر موجود ہیں۔ آگ تو صرف ان کی تکمیل کا ایک وسیلہ ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ کرۂ زمین اپنی آفرینش میں سورج سے جدا ہوا تھا، وہ آگ کے ایک گولے کی طرح تھا جو بعد میں تدریجاً ٹھنڈا ہوتا گیا لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ زمین جب تک گرم اور شعلہ ور تھی اس میں کوئی زندہ مخلوق نہیں پائی جاتی تھی اس میں زندگی اس وقت پیدا ہوئی جب آگ کی جگہ خاک و گل نے لے لی۔

علاوہ بریں ہر آگ جو زمین میں پیدا ہوتی ہے انہی مواد سے ظاہر ہوتی ہے جو خاک سے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ خاک سے درخت اُگتے ہیں اور درخت سے آگ نکلتی ہے، حتیٰ کہ تیل کے اجزاء یا جلنے والی چربیاں ان سب کی بازگشت خاک کی طرف ہے یا ان حیوانات کی طرف جو نباتات سے خوراک حاصل کرتے ہیں۔

ان تمام باتوں سے ہٹ کر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ امتیاز و خصوصیت صرف یہ نہ تھی کہ ان کی خلقت

خاک سے ہوئی ہے بلکہ آدم کا امتیاز اس بات میں تھا کہ ان میں روح انسانیت پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے وہ مقام خلافت الٰہی اور خدا کی نمائندگی کے مرتبے پر فائز تھے۔ اس بنا پر یہ مان بھی لیا جائے کہ شیطان کی خلقت کا مادۂ اول افضل تھا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حضرت آدم جنہیں اللہ نے روح و عظمت عطا کی اور اپنی نمائندگی کے مرتبے پر فائز کیا، کے سامنے سجدہ و فروتنی نہ کرے۔ ظاہر یہ ہے کہ شیطان ان تمام باتوں کو جانتا تھا، صرف اس کی نخوت و تکبر نے اسے ایسا کرنے سے روکا۔ باقی یہ سب باتیں بہانہ تراشیاں تھیں۔

سب سے پہلا قیاس کرنے والا شیطان تھا

اہل بیت طاہرین علیہم السلام کی متعدد حدیثوں میں اس بات کی شدت سے مذمت کی گئی ہے کہ احکام دین میں "قیاس" سے کام لیا جائے۔ اب ان روایات میں ہم پڑھیں گے کہ جس شخص نے سب سے پہلے قیاس کیا وہ ابلیس تھا۔[1]

مدارک وکتب اہل سنت میں بھی جیسے تفسیر المنار اور تفسیر طبری میں یہی بات ابن عباس اور حسن بصری سے نقل کی گئی ہے۔[2]

"قیاس" سے مراد یہ ہے کہ دو موضوع جو بعض جہات میں ایک دوسرے سے مشابہ ہوں ان میں سے ایک کا دوسرے پر قیاس کیا جائے اور وہی حکم جو پہلے موضوع کا ہے دوسرے موضوع میں بھی اسے جاری کیا جائے، بغیر اس کے کہ پہلے حکم کے اسرار اور فلسفے کا ہمیں علم ہو مثلاً یہ کہ ہمیں معلوم ہے کہ انسان کا "پیشاب" نجس و ناپاک ہے، اور اس سے پرہیز کرنا چاہیئے، اس کے بعد ہم انسان کے "پسینہ" کا بھی اس پر قیاس کریں اور یہ کہیں کہ چونکہ یہ دونوں سیال بعض حیثیتوں سے اور اپنے بعض اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں لہٰذا دونوں ناپاک و نجس ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں سیال اگرچہ بعض جہات سے ایکدوسرے کے مشابہ ہیں لیکن دیگر جہات سے مختلف بھی ہیں، ایک رقیق ہے دوسرا قدرے گاڑھا ہے۔ ایک سے اجتناب کرنا آسان ہے، دوسرے سے بہت مشکل ہے۔ علاوہ بریں پیشاب سے اجتناب کرنے کا فلسفہ پورے طور سے ہمیں نہیں معلوم، لہٰذا یہ مقایسہ ایک اندازے کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اسی وجہ سے ہمارے پیشواؤں نے جن کے ارشادات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین سے ماخوذ ہیں، قیاس کی سخت مذمت کی ہے اور اسے بالکل باطل جانا ہے کیونکہ اگر "قیاس" کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھل جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر شخص اپنے محدود مطالعے اور کوتاہ فکر کے باوجود احکام شریعت میں قیاس سے کام لینے لگے گا اور جہاں بھی دو چیزوں میں تھوڑی شباہت دیکھی ایک کا حکم دوسری پر لگا دے گا اور اس طرح قوانین اسلام اور شریعت کے احکام میں ہرج مرج واقع ہو جائے گا۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد دوم ص ۹۔

[2] تفسیر المنار جلد ۸ ص ۳۴۱، تفسیر طبری جلد ۸ ص ۹۸، تفسیر قرطبی جلد ۴ ص ۲۶۰۷۔

عقل کی رُو سے بھی قیاس کا ممنوع ہونا صرف دینی قوانین پر موقوف نہیں ہے، بلکہ ڈاکٹر بھی کہتے ہیں کہ ایک بیمار کا نسخہ دوسرے بیمار کو ہرگز نہ استعمال کرایا جائے چاہے دونوں کی بیماری ظاہری طور پر ایک جیسی ہو۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ دونوں بیمار ممکن ہے ہماری نظر میں آپس میں مشابہ ہوں، لیکن بہت سی چیزوں میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ جیسے دوا کے لیے قوت برداشت، خون کا گروپ اور خون میں شکر اور چربی کی مقدار۔ ایک عام شخص ہرگز ان چیزوں کو نہیں سمجھ سکتا اور نہ ان کی تشخیص کر سکتا ہے انہیں تو ایک ماہر طبیب ہی سمجھ سکتا ہے۔ اگر ان خصوصیات پر نظر رکھے بغیر ایک مریض کی دوا دوسرے مریض کو دے دی جائے تو بجائے فائدہ پہنچانے کے ہو سکتا ہے اسے الٹا نقصان پہنچ جائے، نقصان بھی ایسا جس کا کوئی تدارک اور علاج نہ ہو سکے۔

یہ ایک مثال تھی، ورنہ احکام الٰہی اس سے بھی زیادہ پیچیدہ اور نازک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روایات میں آیا ہے کہ اگر احکام خدا کے بارے میں قیاس کیا جائے تو دین خدا مٹ جائے گا یا یہ کہ قیاس کی خرابیاں اس کے فائدے سے زیادہ ہیں۔[1]

علاوہ بریں احکام الٰہی معلوم کرنے کے لیے قیاس کا سہارا لینا اس بات کی نشانی ہے کہ دین اسلام ناقص ہے کیونکہ اگر ہم یہ مان لیں کہ ہمارے دین میں ہر موضوع کے متعلق کوئی نہ کوئی حکم ضرور موجود ہے اور زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر قرآن و حدیث نے روشنی نہ ڈالی ہو تو پھر قیاس کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ مکتب کے ماننے والے قیاس پر عمل نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنے تمام ضروری احکام دین اہلبیت طاہرینؑ سے حاصل کرتے ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حقیقی نائب اور وارث ہیں۔ لیکن فقہائے اہلسنت نے چونکہ مکتب اہل بیت (جن کے متعلق پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان تھا کہ وہ قرآن کے بعد مسلمانوں کی پناہ گاہ ہے) کو نذر طاق نسیان کر دیا ہے اور اس بنا پر احکام اسلامی کے مدارک کی ان کے پاس کمی ہو گئی ہے، لہٰذا ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ وہ "قیاس" کی طرف دست سوال دراز کریں۔

اب رہا شیطان کا معاملہ جس کے متعلق روایات میں ملتا ہے کہ وہ پہلا فرد ہے جس نے قیاس سے کام لیا۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اس نے اپنی مادی خلقت کو آدمؑ کی خلقت پر قیاس کیا اور بعض جہات سے خاک پر آگ کی برتری کو، آگ کی کلی برتری کی دلیل قرار دیا۔ اُس نے خاک کے دیگر امتیازات پر نظر نہ کی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس نے خود آدمؑ کے روحانی و معنوی امتیازات پر توجہ نہیں کی۔ اصطلاحاً اس قیاس کو "قیاس اولویت" کہا جاتا ہے۔ اس نے اس قیاس کے ذریعے جو محض تخمین و گمان اور سطحی مطالعے پر مبنی تھا، اپنے کو آدمؑ سے بہتر و برتر سمجھ لیا۔ حتیٰ کہ اس نے اسی باطل قیاس کے بل بوتے پر فرمان الٰہی کو ٹھکرانے کی جرأت کی۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۸ باب قیاس کی طرف رجوع کریں۔

قابل توجہ امر یہ ہے کہ شیعہ اور سنی دونوں طریقوں سے امام جعفر صادق علیہ السلام سے جو روایات منقول ہیں ان میں سے ہے کہ :

"من قاس امرالدین برأیہ قرنہ اللہ تعالیٰ یوم القیامۃ بابلیس"

جو شخص دین کے امور میں اپنے قیاس کو کام میں لائے گا، اسے خدا بروز قیامت ابلیس کے ساتھ ملائے گا۔[1]

خلاصہ یہ کہ ایک موضوع کا دوسرے موضوع پر قیاس کرنا، بغیر اس کے کہ اس کے تمام اسرار و رموز سے آگاہی ہو ان دونوں موضوعوں کے لیے ایک جیسے حکم کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اگر مسائل مذہبی میں قیاس کا راستہ کھل جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ احکام الٰہی کا کوئی ضابطہ باقی نہ رہے گا کیونکہ اس امر کا امکان ہوگا کہ ایک شخص کسی موضوع میں اپنی سمجھ کے مطابق قیاس کرے اور اس سے تحریم کا حکم اخذ کرے جبکہ کوئی دوسرا شخص اسی موضوع کو دوسرے موضوع پر قیاس کرے اور اس سے حلال ہونے کا نتیجہ نکالے۔

ایک استثناء

صرف ایک موضوع ایسا ہے جس کا استثناء کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ قانون بنانے والا مثلاً طبیب اپنے حکم کا فلسفہ و دلیل بیان کر دے۔ بس اس صورت میں ممکن ہے کہ جہاں بھی وہ دلیل اور فلسفہ پایا جائے وہاں اس حکم کو جاری کیا جائے۔ اسے اصطلاح میں "قیاس منصوص العلۃ" کہتے ہیں۔ مثلاً اگر طبیب بیمار سے یہ کہے کہ فلاں میوہ سے پرہیز کرنا کیونکہ وہ ترش ہے۔ اس سے بیمار یہ سمجھے گا کہ اس کے لیے ترشی مضر ہے اس سے پرہیز کرنا چاہیئے چاہے وہ کسی اور میوہ میں پائی جائے۔ بالکل اسی طرح قرآن یا سنت میں اس بات کی تصریح موجود ہو کہ شراب سے پرہیز کرو کیونکہ وہ نشہ آور ہے، اس سے ہم یہ سمجھیں گے کہ ہر نشہ آور مایع (چاہے وہ شراب نہ بھی ہو) حرام ہے۔ اس طرح کا قیاس ممنوع نہیں ہے کیونکہ اس کی دلیل قطعی کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ قیاس صرف اس جگہ ممنوع ہے جہاں ہم حکم کے فلسفہ و دلیل کو تمام جہات سے از روئے یقین نہ جان سکیں۔

"قیاس" کا موضوع ایک طویل الذیل موضوع ہے، سطور بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ مختصراً اور خلاصے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مزید توضیح کے لیے اصول فقہ اور احادیث کی کتابوں میں باب قیاس کی طرف رجوع کیا جائے۔ ہم یہاں پر ایک حدیث نقل کر کے اس بحث کو ختم کرتے ہیں :

کتاب علل الشرایع میں منقول ہے :

ایک دفعہ ابوحنیفہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس آئے۔ امام علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم احکام خدا میں اپنے قیاس سے کام لیتے ہو!

ابوحنیفہ نے جواب دیا : جی ہاں ایسا ہی ہے، میں قیاس کرتا ہوں :

---

[1] تفسیر المنار - جلد ۸ ص ۳۳۱، تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۷۔

امام نے فرمایا : آئندہ ایسا نہ کرنا کیونکہ سب سے پہلے جس نے قیاس کیا وہ ابلیس تھا جب اس نے کہا تھا ، خلقتنی من نار وخلقتہ من طین ، اس نے آگ اور مٹی کا باہم قیاس کیا حالانکہ وہ آدم کی نورانیت و روحانیت کا آگ سے قیاس کرتا تو اسے ان دونوں کے درمیان بڑا فرق معلوم ہو جاتا ، اور نورانیت و روحانیت کو آگ پر جو فوقیت حاصل ہے اسے پہچان لیتا۔[1]

ایک سوال کا جواب

یہاں پر ایک سوال باقی رہ جاتا ہے ، اور وہ یہ کہ شیطان نے خدا سے کس طرح گفتگو کی ، کیا اس پر بھی وحی نازل ہوتی تھی ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا کا بات کرنا ہمیشہ وحی کا پہلو نہیں رکھتا ، کیونکہ وحی کا مفہوم ہے۔ پیام رسالت و نبوت ۔ اس امر میں کوئی مانع نہیں ہے کہ خدا کسی شخص سے ، نہ بہ عنوان وحی و رسالت ، بلکہ بطریق الہام درونی ، کسی فرشتے کے ذریعے بات کرے ، چاہے یہ شخص صالح افراد میں سے ہو جیسے مریمؑ و مادرِ حضرت موسیٰؑ یا غیر صالح ہو جیسے شیطان ۔

اب ہم باقی آیات کی تفسیر کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔

چونکہ شیطان کا آدم کو سجدہ کرنے سے انکار ، ایک عام اور معمولی انکار نہ تھا اور نہ ہی ایک عام گناہ شمار ہو سکتا تھا بلکہ یہ ایک سرکشی اور اعتراض تھا جس میں مقام پروردگار کا انکار چھپا ہوا تھا ، کیونکہ وہ جو یہ کہتا ہے کہ "میں آدم سے بہتر ہوں" درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ آدم کو سجدہ کرنے کے بارے میں تیرا حکم حکمت و عدالت کے خلاف ہے اور "مرجوح" (پست) کو "راجح" (بلند) پر مقدم کرنے کا باعث ہے ، اس وجہ سے اس کے اس انکار کا رشتہ کفر سے اور پروردگار کی حکمت اور علم کے انکار سے ملا ہوا ہے اور اسی وجہ سے وہ اس مقام اور مرتبے سے گر گیا جو اسے بارگاہِ احدیت میں حاصل تھا ، یہی وجہ تھی کہ خدا نے اسے اس بلند مرتبہ سے نکال دیا ۔ جو اس نے فرشتوں کی صفوں کے درمیان حاصل کیا تھا اور اس سے فرمایا : اس مقام و مرتبہ سے گر جا (قال فاھبط منھا) ۔

اس آیت میں "منھا" میں جو ضمیر ہے اس کے بارے میں کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آسمان یا بہشت کی طرف پلٹتی ہے جبکہ بعض مفسرین نے اس سے مراد "مقام و مرتبہ" لیا ہے ، اگرچہ نتیجے کے لحاظ سے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے ۔

بعد ازاں اس جملے کے ذریعے اس کے سقوط و تنزل کی اصل وجہ بیان فرمائی ہے : تجھے اس بات کا حق نہیں کہ تو اس مقام و مرتبے میں تکبر کا راستہ اختیار کرے (فما یکون لک ان تتکبر فیھا) ۔

ایک مرتبہ مزید تاکید کے لیے فرمایا : "باہر نکل جا کہ تو پست و ذلیل افراد میں سے ہے (یعنی تو اپنے اس عمل

---

[1] تفسیر نور الثقلین ، جلد ۲ ص ۹ ۔

کی وجہ سے نہ صرف کسی بزرگی کو حاصل نہ کرسکا بلکہ پستی و خواری کے گڑھے میں جا گرا (فاخرج انک من الصاغرین)۔

اس جملے سے بخوبی واضح ہوگیا کہ شیطان کی تمام بدبختی اس کے تکبر کی وجہ سے تھی۔ اس کی یہ خود پسندی اور غرور کہ اس نے خود کو اس مرتبے پر قرار دیا جس کا وہ حقیقت میں مستحق نہ تھا، اس امر کا سبب بنا کہ اس نے نہ صرف آدم کے لیے سجدہ نہ کیا بلکہ اس نے خدا کے علم و حکمت کا بھی انکار کردیا اور اس کے فرمان پر نکتہ چینی کی جس کے نتیجے میں اس نے اپنا مقام و مرتبہ کھو دیا اور بجائے بزرگی کے ابدی پستی و ذلت کو خرید لیا۔ یعنی نہ صرف یہ کہ وہ اپنے مقصد و مراد کو نہ پاسکا بلکہ اس کے بالکل برعکس دوسری سمت میں نکل گیا۔

حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے نہج البلاغۃ کے خطبہ - قاصعہ - میں تکبر، خود پسندی اور غرور کی مذمت میں یوں فرمایا ہے:

فاعتبروا بما کان من فعل اللہ بابلیس اذا حبط عملہ الطویل وجھدہ الجھید، وکان قد عبد اللہ ستۃ آلاف .. عن کبر ساعۃ واحدۃ فمن ذا بعد ابلیس یسلم علی اللہ بمثل معصیتہ؟! کلا ما کان اللہ سبحانہ لیدخل الجنۃ بشراً بامر اخرج بہ منھا ملکا ان حکمہ فی اھل السماء واھل الارض لواحد[1]

عبرت حاصل کرو اس بات سے جو اللہ نے ابلیس کے بارے میں کی، اس وقت جبکہ شیطان کے تمام اعمال اس کی، طول و طویل عبادتیں، پیہم زحمتیں جو اس نے چھ ہزار سال کی طویل مدت میں خدا کی بندگی کی راہ میں انجام دی تھیں ... ایک گھڑی کے تکبر کی وجہ سے اللہ نے ان سب کو برباد کردیا۔ جب یہ کیفیت ہو تو ابلیس کے اس انجام کے بعد کس کی مجال ہے کہ وہی معصیت کرکے جو اس نے کی تھی عذاب الٰہی سے نجات حاصل کرے؟ نہیں، ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے کہ خدا کسی انسان کو اس عمل کے ساتھ جنت عطا کرے جس کی وجہ سے ایک فرشتے[2] کو جنت سے باہر نکال دیا۔ اللہ کا حکم اہلِ آسمان و اہلِ زمین کے لیے ایک ہے۔

نیز ایک حدیث میں امام زین العابدین علیہ السلام سے اس طرح مروی ہے:

گناہوں کی کئی قسمیں اور کئی اسباب ہیں، لیکن معصیت پروردگار کا سب سے بڑا سبب تکبر ہے، جو ابلیس کا گناہ تھا، جس کی وجہ سے اس نے خدا کے فرمان سے انکار کیا اور تکبر کیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔ اس کے بعد دوسرا گناہ - حرص - بنا۔ جس کی بنا پر حضرت آدم و حوا سے گناہ (اور ترک اولیٰ) سرزد ہوا۔ اس کے بعد - حسد - ہے، جو اُن کے بیٹے (قابیل) کے گناہ کا سبب بنا،

---

[1] نہج البلاغۃ خطبہ ۱۹۲ مطابق نہج البلاغۃ صبحی صالح۔

[2] یہاں شیطان پر لفظ - فرشتہ - کا اطلاق اس بنا پر کیا گیا کہ وہ فرشتوں کی صفوں میں شامل تھا نہ کہ وہ خود فرشتہ تھا جیسا کہ اس سے قبل بھی اسی طرف اشارہ ہو چکا ہے۔

جس نے اپنے بھائی (ہابیل) سے حسد کیا اور اسے قتل کر دیا[1]

امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

اصول الکفر ثلاثۃ الحرص والاستکبار والحسد، فاما الحرص فان آدم حین نھی عن الشجرۃ، حملہ الحرص علی ان اکل منھا، و اما الاستکبار فابلیس حیث امر بالسجود لآدم فأبی، و اما الحسد فابنا آدم حیث قتل احدھما صاحبہ[2]

کفر و معصیت کی جڑیں تین ہیں: حرص، تکبّر اور حسد۔ حرص اس بات کا سبب بنا کہ آدم نے شجرِ ممنوعہ سے کھایا، تکبر کی وجہ سے ابلیس نے خدا کے فرمان کو ماننے سے انکار کیا۔ اب رہا حسد تو اس کی وجہ سے آدم کے ایک بیٹے نے دوسرے کو قتل کیا۔

لیکن شیطان کی داستان اسی جگہ پر ختم نہیں ہوتی، کیونکہ اس نے جب یہ دیکھا کہ وہ درگاہِ خداوندی سے نکال دیا گیا ہے تو اس کی سرکشی اور ہٹ دھرمی میں اور اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے بجائے شرمندگی اور توبہ کے اور بجائے اس کے کہ وہ خدا کی طرف پلٹے اور اپنی غلطی کی اعتراف کرے، اس نے خدا سے صرف اس بات کی درخواست کی کہ: "خدایا! مجھے دُنیا کے اختتام تک کے لیے مہلت عطا فرما دے اور زندگی عطا کر (قال انظرنی الی یوم یبعثون)۔

اس کی یہ درخواست قبول ہو گئی اور اللہ تعالٰے نے فرمایا: تجھے مہلت دی جاتی ہے (قال انک من المنظرین)۔

اگرچہ اس آیت میں اس بات کی صراحت نہیں کی گئی کہ ابلیس کی درخواست کس حد تک منظور ہوئی لیکن سورہ حجر کی آیت ۳۸ میں ہے:

"اِنَّکَ مِنَ الْمُنْظَرِیْنَ ۙ اِلٰی یَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ"

تجھ کو ایک روزِ معین تک کے لیے مہلت دی گئی یعنی اس کی پوری درخواست منظور نہیں ہوئی بلکہ جس مقدار میں خدا نے چاہا اتنی مہلت عطا کی۔

انشاء اللہ ہم اس آیت کے ذیل میں اس بارے میں بحث کریں گے۔

لیکن اس نے جو یہ مہلت حاصل کی وہ اس لیے نہیں تھی کہ وہ اپنی غلطی کا تدارک کرے بلکہ اس نے اس طولانی عمر کے حاصل کرنے کا مقصد اس طرح بیان کیا: اب جبکہ تُو نے مجھے گمراہ کر دیا ہے، تو میں بھی تیرے سیدھے راستے پر تاک لگا کر بیٹھوں گا (مورچہ بناؤں گا) اور ان (اولادِ آدم) کو راستے سے ہٹا دوں گا (قال

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۵۰۸ (مادۂ کبر)۔

[2] اصول کافی جلد ۲ ص ۲۱۹ باب اصول الکفر

فبمآ اغویتنی لاقعدن لهم صراطك المستقیم ۔
تاکہ جس طرح میں گمراہ ہوا ہوں اسی طرح وہ بھی گمراہ ہو جائیں ۔

مسلک جبر کا بانی بھی ابلیس تھا

مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس نے اپنی برائت بیان کرنے کے لیے جبر کی نسبت خدا کی طرف دی اور کہا : "چونکہ تُو نے مجھے گمراہ کیا ہے اس لیے میں بھی نسل آدم کی گمراہی کے لیے پوری کوشش کروں گا "

اگرچہ کچھ مفسرین کا اس بات پر اصرار ہے کہ جملہ " فبمآ اغویتنی " کی اس طرح سے تفسیر کریں کہ اس سے " جبر " نہ نکلے ، لیکن بظاہر اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے ، کیونکہ اس جملہ کا ظاہر " جبر " کے معنی دیتا ہے اور شیطان سے بھی یہ کوئی بعید بات نہیں ہے ۔

اس امر کی گواہ حضرت امیرالمومنینؑ کی وہ حدیث ہے جو آپ نے اس وقت ارشاد فرمائی جبکہ آپ جنگ صفین سے پلٹ رہے تھے اور ایک بوڑھے شخص نے آپ سے " قضا و قدر " کے متعلق سوال کیا حضرتؑ نے اس کے جواب میں فرمایا :

" ہم نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ سب قضاء و قدر الٰہی تھا "

اس سے وہ بوڑھا شخص یہ سمجھا کہ اس سے مراد وہی " مسئلہ جبر " ہے ، حضرتؑ نے اس وقت اس کو بڑی شدت کے ساتھ اس خیال باطل سے روکا اور ایک طویل گفتگو کے ضمن میں اس سے فرمایا :

" تلك مقالة اخوان عبدة الاوثان وخصماء الرحمان و حزب الشیطان "

یہ بت پرستوں اور دشمنان خدا اور شیطانی گروہ کا مقولہ ہے [1]

اس کے بعد آپؑ نے " قضاء و قدر " کے معنی قضاء و قدر تشریعی کے لیے یعنی اس سے مراد خدا کے فرامین اور تکالیف شرعیہ ہیں ، بہرحال اس سے معلوم ہوگیا کہ سب سے پہلے جس نے " مسلک جبریہ " کی حمایت کی وہ شیطان ہی تھا ۔

اس کے بعد شیطان نے اپنی بات کی مزید تائید و تاکید کے لیے یوں کہا : میں نہ صرف یہ کہ ان کے راستہ پر اپنا مورچہ قائم کروں گا بلکہ ان کے سامنے سے ، پیچھے سے ، داہنی جانب سے ، بائیں جانب سے گویا چاروں طرف سے ان کے پاس آؤں گا جس کے نتیجے میں تُو ان کی اکثریت کو شکر گزار نہ پائے گا (ثم لاٰتینهم من بین ایدیهم ومن خلفهم وعن ایمانهم وعن شمآئلهم ولا تجد اکثرهم شاکرین) ۔

---

[1] اصول کافی جلد ۱ باب جبر و قدر ص ۱۲۰ ۔

مذکورہ بالا تعبیر سے ممکن ہے مراد یہ ہو کہ شیطان ہر طرف سے انسان کا محاصرہ کرے گا اور اسے گمراہ کرنے کے لیے ہر وسیلہ اختیار کرے گا اور یہ تعبیر ہماری روزمرہ کی گفتگو میں بھی ملتی ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص چاروں طرف سے قرض میں یا مرض میں گھر گیا ہے۔

اوپر اور نیچے کا ذکر نہیں ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی زیادہ تر اور عموماً فعالیت ان چار طرف ہوتی ہے۔

لیکن ایک روایت جو امام محمد باقر علیہ السلام سے وارد ہوئی ہے، اس میں ان "چار جہت" کی ایک گہری تفسیر ملتی ہے۔ اس میں ایک جگہ پر حضرت فرماتے ہیں:

> شیطان جو "آگے سے" آتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ آخرت کو جو انسان کے آگے ہے اس کی نظر میں سبک کر دیتا ہے، اور "پیچھے سے" آنے کے معنی یہ ہیں کہ: شیطان انسان کو مال جمع کرنے اور اولاد کی خاطر بخل کرنے کے لیے ورغلاتا ہے، اور "داہنی طرف" سے آنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ انسان کے دل میں شک و شبہ ڈال کر اس کے امور معنوی کو ضائع کر دیتا ہے اور "بائیں طرف" سے آنے سے مراد یہ ہے کہ شیطان انسان کی نگاہ میں لذات مادی و شہوات دنیوی کو حسین بنا کر پیش کرتا ہے[1]

زیر بحث آیت کے آخر میں ایک مرتبہ اور شیطان کو یہ فرمان دیا جاتا ہے کہ وہ مقام قرب الٰہی اور اپنی سابقہ منزلت اور درجے سے نکل جائے۔ بس اتنا فرق ہے کہ یہاں پر اس کے باہر نکل جانے کا فرمان شدید تر اور زیادہ تحقیر آمیز لہجے میں صادر ہوا ہے۔ یہ شاید شیطان کی جرأت و جسارت اور اس ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہے جس کا اظہار اس نے افراد انسانی کو گمراہ کرنے کے سلسلے میں کیا تھا یعنی شروع میں اس کا گناہ صرف یہ تھا کہ اس نے خدا کا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا، اسی لیے اس کے خروج کا حکم صادر ہوا، اس کے بعد اس نے ایک اور بڑا گناہ یہ کیا کہ خدا کے سامنے بنی آدم کو بہکانے کا عہد کیا اور ایسی بات کہی گویا وہ خدا کو دھمکی دے رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کونسا گناہ ہو سکتا ہے، لہٰذا خدا نے اس سے فرمایا: اس مقام سے بدترین ننگ و عار کے ساتھ نکل جا اور ذلت و خواری کے ساتھ نیچے اتر جا (قال اخرج منها مذءوما مدحورا)[2]

اور فرمایا: میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ جو بھی تیری پیروی کرے گا میں جہنم کو تجھ سے اور اس سے بھر

---

[1] تفسیر مجمع البیان۔ جلد ۴ ص ۴۰۳۔

[2] "مذءوم" مادہ "ذأم" (بر وزن "ظلم") سے ہے جس کے معنی ہیں عیب شدید۔ "مدحور" مادہ "دحر" (بر وزن "دہر") سے ہے جس کے معنی ہیں ذلت و خواری کے ساتھ باہر نکال دینا۔

دوں گا (لمن تبعك منهم لاملئن جهنم منكم اجمعين)۔

شیطان کی پیدائش اور اسے مہلت دینے کا فلسفہ

اس طرح کی بحثوں میں بالعموم مختلف سوال ذہن میں آتے ہیں جن میں سب سے اہم دو سوال ہیں:

۱۔ خدا نے شیطان کو کس لیے پیدا کیا؟ جبکہ اُسے علم تھا کہ وہ ہر طرح کی گمراہی اور وسوسہ انگیزی کا سرچشمہ ہے۔

۲۔ جبکہ شیطان اتنے بڑے گناہ کا مرتکب ہوا تو اس کے بعد اللہ نے اُس کی درخواست کو کیوں منظور کیا کہ اسے ایک طولانی عمر دی جائے؟

پہلے سوال کا جواب ہم نے تفسیر نمونہ کی پہلی جلد میں دیا ہے کہ:

اوّلاً۔ شروع میں شیطان کی خلقت پاک اور بے عیب تھی۔ اسی لیے وہ سالہاسال دراز تک فرشتوں کی صفوں میں رہ کر عبادت کرتا رہا اور مقام قرب الٰہی پر فائز تھا۔ اگرچہ اپنی آفرینش کے لحاظ سے ان میں سے نہ تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنی آزادی سے سوء استفادہ کیا اور اپنی سرکشی و طغیان کی وجہ سے راندۂ بارگاہِ الٰہی ہوگیا اور اس نے "شیطان" کا لقب حاصل کیا۔

ثانیاً۔ شیطان کا وجود راہِ حق پر چلنے والوں کے لیے نہ صرف یہ کہ ضرر رساں نہیں بلکہ یہ ان کی ترقی و کمال کا ایک امتیاز ہے کیونکہ انسان کے مقابلے میں ایک قوی دشمن کا وجود درحقیقت انسان کی قوت اور پنپنے کا ایک سبب ہے۔ آپ دیکھیں کہ جہاں بھی کوئی ترقی کرتا ہے وہاں اس کے سامنے کوئی متضاد چیز ضرور موجود ہوتی ہے۔ کوئی موجود راہِ کمال میں اُس وقت تک آگے نہیں بڑھتا جب تک اس کے سامنے کوئی زبردست مخالف موجود نہ ہو۔

نتیجہ یہ نکلا کہ شیطان اگرچہ اپنی آزادیٔ ارادہ کی وجہ سے اپنی بداعمالیوں کا جواب دہ ہے لیکن اس کی وسوسہ انگیزیاں بندگانِ خدا کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو راہِ حق پر گامزن ہونا چاہتے ہیں ضرر رساں نہیں بلکہ بالواسطہ ان کے لیے مفید ہیں۔

دوسرے سوال کا جواب بھی اس بات سے ظاہر ہو جائے گا جو ہم نے پہلے سوال کے جواب میں کہی ہے کیونکہ ایک منفی نقطے کے طور پر اس کی زندگی کا اس لیے باقی رہنا تاکہ مثبت نقاط کو تقویت پہنچے نہ صرف اس میں کوئی ضرر نہیں بلکہ یہ مؤثر بھی ہے۔ حتیٰ کہ شیطان سے اگر قطع نظر بھی کر لی جائے تب بھی خود ہمارے اندر بھی ایسے مختلف غرائز (طبائع) پائے جاتے ہیں جو عقلائی و روحانی قوتوں کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے ایک تضاد و اختلاف کا میدان کارزار بن جاتا ہے اور اس میدان میں انسان کی ترقی اور آگے بڑھنے کا راز مضمر ہوتا ہے۔ شیطان کی زندگی کا باقی رہنا بھی دراصل اسی تضاد کی بنیادوں کو تقویت پہنچانے کے لیے ہے۔ دوسرے لفظوں

میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ راہِ راست ہمیشہ اُس وقت پہچانی جاتی ہے جب اس کے پہلو میں بہت سی ٹیڑھی اور کج راہیں ہوں، جب تک ایسا نہ ہوگا راہِ راست کا اندازہ نہ ہو سکے گا۔

اس کے علاوہ، بہت سی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ چونکہ اتنے عظیم گناہ کے بعد شیطان نے جہانِ آخرت میں اپنی نجات و سعادت کو پورے طور سے خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اور اسے اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی لہٰذا اُس نے اپنی ان عبادتوں کے بدلے میں جو اس نے دار دنیا میں ادا کی تھیں، خدا سے طویل عمر کی خواہش کی، جو خدا کے قانونِ عدالت کی بنا پر قبول کر لی گئی۔

نیز اس نکتے کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیئے کہ اگرچہ شیطان کو خدا نے گمراہ کرنے اور وسوسہ انگیزی کی پوری آزادی دے دی لیکن اس کے مقابلے میں انسان کو بھی بالکل نہتا اور بے دفاع نہیں رکھا کیونکہ اولاً، اسے عقل و خرد کی عظیم طاقت عطا کی جس کی وجہ سے اس کے امکان میں ہے کہ اس کی وجہ سے وسوسہ ہائے شیطانی کے سیلاب کو روکنے کے لیے ایک مضبوط بند قائم کر سکے (خصوصاً اگر اس کی صحیح طور سے تربیت کی جائے تو یہ طاقت اور بڑھ جاتی ہے)۔

دوم، یہ کہ انسان کی پاک فطرت اور اس کی نہاد میں چھپا ہوا ترقی کرنے کا عشق یہ بھی خدا کا عطیہ ہے جو انسان کو سعادتِ ابدی کی طرف بڑھنے میں مدد دیتا ہے۔

سوم، یہ کہ جب شیطان بہکاتا ہے اور انسان اس سے بچنا چاہتا ہے لیکن کمزور پڑتا ہے تو ایسے موقع پر خداوندکریم اس کی مدد کرنے کے لیے ایسے فرشتوں کو بھیجتا ہے جو اسے نیکی کا الہام کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن کریم میں وارد ہوا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ.

وہ بندے جو یہ کہتے ہیں کہ ہمارا پروردگار خدائے یگانہ ہے، اس کے بعد اس قول پر باقی بھی رہتے ہیں، ان پر فرشتے نازل ہوتے رہتے ہیں (اور ان کے دلوں کو قوت بخشنے کے لیے بذریعہ الہام طرح طرح کی بشارتیں دیتے ہیں)۔ (حٰم السجدہ۔ ۳۰)

اور ایک اور جگہ وارد ہوا ہے:

اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا.

تیرا پروردگار فرشتوں کی طرف وحی کرتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تمہاری مدد کرتا ہوں تاکہ باایمان بندوں کی راہِ حق پر مدد کرو اور انہیں ثابت قدم رکھو۔ (انفال۔ ۱۲)

نظریہ تکامل انواع و پیدائش آدم

یہاں پر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ آیا آدم کی خلقت اُس نظریہ تکامل سے مطابقت رکھتی ہے جسے علوم

طبعی (سائنس) میں بیان کیا جاتا ہے، یا نہیں؟ نیز یہ کہ اصولی طور پر نظریہ تکامل سائنسدانوں کی نظر میں مرحلۂ یقین پر پہنچا ہے یا نہیں؟ یہ بحثیں ضروری ہیں جنہیں انشاء اللہ ہم متعلقہ آیات کے ذیل (جیسے آیات ۲۶ تا ۳۳ سورۂ حجر) میں بیان کریں گے۔

۱۹ وَيَا آدَمُ اسْكُنْ أَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ ○

۲۰ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْآتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَٰذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ ○

۲۱ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ ○

۲۲ فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ وَنَادَاهُمَا رَبُّهُمَا أَلَمْ أَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَأَقُلْ لَكُمَا إِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُبِينٌ ○

ترجمہ

۱۹ اور اے آدم! تم، اور تمہاری زوجہ بہشت میں مقیم رہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ، لیکن اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ ستم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

۲۰ اس کے بعد شیطان نے انہیں پھسلایا تاکہ وہ چیز جو ان کے اندام میں پوشیدہ ہے ظاہر ہو جائے، اور اس نے کہا کہ تمہارے پروردگار نے تم کو اس درخت سے نہیں روکا

ہے لیکن اس لیے کہ (اگر اس سے کھا لو گے تو) فرشتہ بن جاؤ گے یا ہمیشہ کے لیے (بہشت میں) باقی رہو گے۔

۲۱ اور اس نے ان کے سامنے یہ قسم کھائی کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔

۲۲ اور اس طرح سے ان کو دھوکا دے کر (ان کے مقام و درجہ سے) نیچے گرا دیا، اور جس وقت انہوں نے اس درخت سے چکھا، ان کا اندام (شرم گاہ) ان کے لیے نمایاں ہو گیا، اور انہوں نے درخت کے پتوں کو ایک دوسرے پر رکھنا شروع کیا تاکہ اس کو چھپائیں؛ ان کے پروردگار نے ان کو ندا کی کہ آیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا، اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟!

تفسیر

دلفریب انداز میں شیطانی وسوسے

ان آیات میں سرگزشت آدم کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے۔ پہلے فرماتا ہے: خدا نے آدم اور ان کی زوجہ (حوا) کو یہ حکم دیا کہ بہشت میں سکونت اختیار کریں (و یا آدم اسکن انت وزوجک الجنة)۔

اس جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدم و حوا اپنی پیدائش کے وقت بہشت میں نہ تھے۔ خلقت کے بعد انہیں بہشت کی طرف بھیجا گیا۔ ہم نے سورۂ بقرہ کی اُن آیات میں بھی جو پیدائشِ آدم سے متعلق ہیں توجہ دلائی ہے، کہ قرائن بتلاتے ہیں کہ یہ بہشت وہ جنت نہ تھی جس کا قیامت میں وعدہ کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ احادیث اہلبیت طاہرین علیہم السلام میں بھی وارد ہوا ہے یہ اسی دُنیا کا ایک سرسبز و شاداب باغ تھا، جس میں خدا کی طرح طرح کی نعمتیں مہیا کی گئی تھیں۔[1]

اس موقع پر پہلی ذمہ داری اور امر و نہیٔ الٰہی اس شکل میں ظاہر ہوئی:

تم بہشت کے ہر درخت سے کھا سکتے ہو، لیکن خبردار اس مخصوص درخت کے پاس بھی نہ جانا ورنہ ستم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے (فکلا من حیث شئتما ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظٰلمین)۔

[1] تفسیر نمونہ جلد اول ص ۱۵۹۔ اُردو ترجمہ کی طرف رجوع فرمائیں۔

اس کے بعد شیطان، جو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے مردود بارگاہِ الٰہی ہوگیا تھا اور اس نے یہ پکا ارادہ کرلیا تھا کہ جس طرح بھی ہوگا آدم اور ان کی اولاد سے اس شکست کا انتقام لے گا اور انہیں راہِ راست سے بھکانے کی کوشش کرے گا، نیز اس کو یہ بھی علم تھا کہ اگر آدم نے اس ممنوع درخت سے کھایا تو وہ بہشت سے نکال دیئے جائیں گے۔ اس نے آدم کے دل میں وسوسہ ڈالنا چاہا اور اپنے اس ناپاک مقصد تک پہنچنے کے لیے اس نے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔

اس نے سب سے پہلے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے: انہیں پھسلانا شروع کیا، تاکہ اطاعت و بندگی کی خلعت ان کے بدن سے اتار دے اور ان کی شرمگاہ کو جو پوشیدہ تھی ظاہر کردے (فوسوس لهما الشیطان لیبدی لهما ماوری عنهما من سواٰتهما)۔

مقصد تک پہنچنے کے لیے اس نے بہترین طریقہ یہ پایا کہ انسان میں تکامل و ترقی کا جو جذبہ پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے وہ زندگی جاودانی حاصل کرنا چاہتا ہے، اس سے استفادہ کرے، اور اسے مخالفت خدا کا ایک عذر و بہانہ بنلائے۔ لہٰذا اس نے سب سے پہلے آدم و حوا سے یہ کہا: خدا نے تمہیں اس درخت صرف اس لیے روکا ہے کہ اگر تم اس سے کھا لو گے تو یا فرشتے بن جاؤ گے اور یا عمر جاودانی حاصل کر لو گے (و قال ما نهاکما ربکما عن هٰذه الشجرة الا ان تکونا ملکین او تکونا من الخالدین)۔

اس طرح اس نے فرمانِ خدا کو ان کی نظر میں ایک دوسرے رنگ میں پیش کیا اور انہیں یہ تصور دلانے کی کوشش کی کہ اس "شجرۂ ممنوعہ" سے کھا لینا نہ صرف یہ کہ ضرر رساں نہیں بلکہ عمر جاوداں یا ملائکہ کا مقام و مرتبہ پالینے کا موجب ہے۔

اس بات کی تائید اس جملے سے بھی ہوتی ہے جو سورہ طٰہٰ کی آیت ۱۲۰ میں شیطان کی زبانی وارد ہوا ہے:

یاآدم هل ادلك علی شجرة الخلد وملك لا یبلیٰ۔

اے آدم! کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہیں زندگانی جاودانی اور ایسی سلطنت کی رہنمائی کروں جو کہنہ نہ ہوگی؟!

ایک روایت جو "تفسیر قمی" میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے اور "عیون اخبار الرضا" میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے مروی ہے میں وارد ہوا ہے:

شیطان نے آدم سے کہا کہ اگر تم نے اس شجرۂ ممنوعہ سے کھا لیا تو تم دونوں فرشتے بن جاؤ گے اور پھر ہمیشہ کے لیے بہشت میں رہو گے، ورنہ تمہیں بہشت سے باہر نکال دیا جائے گا۔[1]

آدم نے جب یہ سنا تو فکر میں ڈوب گئے، لیکن شیطان نے اپنا حربہ مزید کارگر کرنے کے لیے سخت قسم کھائی کہ میں تم دونوں کا ہی خواہ ہوں"! (وقاسمهما انی لکما

[1] تفسیر نورالثقلین، جلد دوم ص ۱۳۔

لمن الناصحین)۔

آدم، جنہیں زندگی کا ابھی کافی تجربہ نہ تھا، نہ ہی وہ ابھی تک شیطان کے دھوکے، جھوٹ اور نیرنگ میں گرفتار ہوئے تھے، انہیں یہ یقین نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اتنی بڑی جھوٹی قسم بھی کھا سکتا ہے اور اس طرح کے جال دوسرے کو گرفتار کرنے کے لیے پھیلا سکتا ہے، آخرکار وہ شیطان کے فریب میں آگئے اور آبِ حیات و سلطنت جاودانی حاصل کرنے کے شوق میں مکرِ ابلیسی کی بوسیدہ رسی کو پکڑ کے اس کے وسوسہ کے کنویں میں اتر گئے، رسی ٹوٹ گئی اور انہیں نہ صرف آبِ حیات ہاتھ نہ آیا بلکہ خدا کی نافرمانی کے گرداب میں گرفتار ہو گئے۔

اس تمام مطلب کو قرآن کریم نے اپنے ایک جملے میں خلاصہ کر دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: اس طرح سے شیطان نے انہیں دھوکا دیا اور اس نے اپنی رسی سے انہیں کنویں میں اتار دیا (فدلّٰهما بغرور)[ل]۔

شیطان کی سابقہ دشمنی اور خدا کی وسیع حکمت و رحمت اور اس کی محبت و مہربانی سے آگاہ ہوتے ہوئے آدم کو چاہیئے تو یہ تھا کہ شیطان کے تمام فریب و وسوسہ کے جال کو پارہ پارہ کر دیتے اور اس کے کہنے میں نہ آتے لیکن جو کچھ نہ ہونا چاہیئے تھا وہ ہو گیا۔

بس چکھتے ہی آدم و حوا نے اس ممنوعہ درخت سے چکھا، فوراً ہی ان کے کپڑے ان کے بدنوں سے نیچے گر گئے اور ان کے اندام ظاہر ہو گئے (فلما ذاقا الشجرة بدت لهما سواٰتهما)۔

مذکورہ بالا جملے سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ درختِ ممنوع سے چکھنے کے ساتھ ہی فوراً اس کا اثر بد ظاہر ہو گیا اور وہ اپنے بہشتی لباس سے جو فی الحقیقت خدا کی کرامت و احترام کا لباس تھا، محروم ہو کر برہنہ ہو گئے۔

اس آیت سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ آدم و حوا یہ مخالفت کرنے سے پہلے برہنہ نہ تھے بلکہ کپڑے پہنے ہوئے تھے، اگرچہ قرآن میں ان کپڑوں کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی گئی لیکن جو کچھ بھی تھا وہ آدم و حوا کے وقار کے مطابق اور ان کے احترام کے لیے تھا جو اُن کی نافرمانی کے باعث ان سے واپس لے لیا گیا۔

لیکن خود ساختہ توریت میں اس طرح سے ہے:

> آدم و حوا اس موقع پر بالکل برہنہ تھے لیکن اس برہنگی کی زشتی کو نہیں سمجھتے تھے، لیکن جس وقت انہوں نے اس درخت سے کھایا جو درحقیقت "علم و دانش" کا درخت تھا تو ان کی عقل کی آنکھیں کھل گئیں اور اب وہ اپنے کو برہنہ محسوس کرنے لگے اور اس حالت کی زشتی سے آگاہ ہو گئے۔

ل ۔ دلّٰی ۔ مادہ ۔ تدلیتہ سے ہے جس کے معنی ہیں کنویں میں ڈول ڈالنا جسے رسی میں باندھ کر تدریجاً کنویں میں اتارا جائے یہ درحقیقت اس لطیف معنی سے کنایہ ہے کہ شیطان نے اپنے مکر و فریب کی رسی سے انہیں باندھ کر ان کے بلند مرتبہ سے نیچے اتار دیا اور یوں شقاوت اور غضبِ خداوندی سے دوری کے کنویں میں گرا دیا۔

جس "آدم" کا حال اس خود ساختہ توریت میں بیان کیا گیا ہے، وہ فی الحقیقت آدم واقعی نہ تھا بلکہ وہ تو کوئی ایسا نادان شخص تھا جو علم و دانش سے اس قدر دُور تھا کہ اسے اپنے ننگا ہونے کا بھی احساس نہ تھا لیکن جس "آدم" کا قرآن تعارف کراتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اپنی حالت سے باخبر تھا بلکہ اسرار آفرینش (علم اسمآ) سے بھی آگاہ تھا اور اسکا شمار معلّم ملکوت میں ہوتا تھا، اگر شیطان اس پر اثر انداز بھی ہوا تو یہ اس کی نادانی کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ اس نے ان کی پاکی اور صفائے نیّت سے سوئے استفادہ کیا۔

اس بات کی تائید اسی سورۂ اعراف کی آیت ۲۷ سے بھی ہوتی ہے جہاں ارشاد ہوتا ہے:

"یا بنیٓ اٰدم لا یفتننکم الشیطان کمآ اخرج ابویکم من الجنة ینزع عنھما لباسھما"

اے اولادِ آدم! کہیں شیطان تمہیں اس طرح فریب نہ دے جس طرح تمہارے والدین (آدم و حوّا) کو دھوکا دے کر بہشت سے باہر نکال دیا اور ان کا لباس ان سے جُدا کر دیا۔

اگر بعض مفسّرینِ اسلام نے یہ لکھا ہے کہ آغاز میں حضرت آدم برہنہ تھے تو واقعاً یہ ایک واضح اشتباہ ہے جو توریت کی تحریر کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

بہرحال اس کے بعد قرآن کہتا ہے: "جس وقت آدم و حوّا نے یہ دیکھا فوراً بہشت کے درختوں کے پتوں سے اپنی شرم گاہ چھپانے لگے (وطفقا یخصفان علیھما من ورق الجنة)[1]۔

اس موقع پر خدا کی طرف سے یہ ندا آئی: "کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا، کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، تم نے کس لیے میرے حکم کو بھلا دیا اور اس پست گرداب میں گھر گئے؟" (ونادٰھما ربھمآ الم انھکما عن تلکما الشجرة واقل لکما ان الشیطان لکما عدو مبین)۔

یہ آیت اور وہ پہلی آیت جس میں آدم و حوّا کو بہشت میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دی گئی تھی دونوں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں اس نافرمانی کے بعد مقام قربِ الٰہی سے کس قدر دور ہو گئے تھے حتیٰ کہ بہشت کے درختوں سے بھی دور ہو گئے کیونکہ اس سے قبل کی آیت میں "ھٰذہ الشجرة" (یہ درخت) کہا گیا ہے جو نزدیک کے لیے اشارہ ہے۔ اس کے بعد اس آیت میں جملہ "نادیٰ" (ندا کی) آیا ہے جو دُور کے لیے خطاب ہے، نیز کلمہ "تلکما" بھی دُوری کے لیے ہے۔

---

[1] "یخصفان" مادّہ "خصف" (بروزن خشم) سے ہے جس کے معنی ہیں ایک شئے کو دوسری شئے سے ملانا اور جمع کرنا، بعد میں یہ لفظ جُوتا یا کپڑا سینے کے لیے یا پیوند لگانے کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا، کیونکہ سینے میں مختلف ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا جاتا ہے۔

چند نکات

۱۔ شیطانی وسوسے اور انسانی آزادی

"وسوس لہ" (کہ جس میں کلمہ لام بھی استعمال ہوا ہے جو عام طور سے فائدے اور نفع کے لیے آتا ہے) سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے وسوسہ ڈالنے میں آدم کی خیر خواہی اور دوستی کا روپ بھرا تھا، جبکہ "وسوس الیہ" سے یہ معنی برآمد نہیں ہوتا بلکہ اس کے معنی صرف کسی کے دل میں مخفی طور سے اثر ڈالنے کے ہیں۔ لیکن ہر حال میں، یہ تصور نہ ہو کہ شیطانی وسوسے چاہے وہ جتنے بھی قوی اور مضبوط کیوں نہ ہوں انسان سے اس کی خود مختاری اور ارادہ سلب کر لیتے ہیں، بلکہ اس کے بعد بھی انسان اپنی عقل اور ایمان کی طاقت سے اس کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ شیطانی وسوسے انسان کو برے کاموں پر مجبور نہیں کر دیتے بلکہ اختیار و ارادہ کی قوت اپنے حال پر باقی رہتی ہے، تاہم ان کا مقابلہ کرنے کے لیے پامردی واستقامت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس میں کبھی بڑے رنج والم کا بھی سامنا ہوتا ہے لیکن ان تمام حالات میں اس طرح کے وسوسے کسی کی ذمہ داری اور مسئولیت ختم نہیں کر دیتے، جس طرح آدم سے نہیں کی۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ ان تمام تحریکوں اور ترغیبوں کے باوجود جو آدم کے بہکانے کے لیے شیطان نے انجام دیں، خدا تعالےٰ نے آدم کو ان کے عمل کا ذمہ دار ٹھہرایا اور اسی بنا پر جیسا کہ آگے آئے گا انہیں اس کی پاداش بھی دی۔

۲۔ شجرۂ ممنوعہ کونسا درخت تھا؟

قرآن کریم میں بلا تفصیل اور بغیر نام کے چھ مقام پر "شجرۂ ممنوعہ" کا ذکر ہوا ہے لیکن کتب اسلامی میں اس کی تفسیر دو قسم کی ملتی ہے۔ ایک تو اس کی تفسیر مادی ہے جو حسب روایات "گندم" ہے[1]

اس بات کی طرف توجہ رہنا چاہیئے کہ عرب لفظ "شجرہ" کا اطلاق صرف درخت پر نہیں کرتے، بلکہ مختلف نباتات کو بھی "شجرہ" کہتے ہیں، چاہے وہ جھاڑی کی شکل میں ہوں یا بیل کی صورت میں۔ اسی بنا پر قرآن میں "کدو" کی بیل کو بھی شجرہ کہا گیا ہے۔

وَاَنۡۢبَتۡنَا عَلَیۡہِ شَجَرَۃً مِّنۡ یَّقۡطِیۡنٍ (صافات ۱۴۶)

دوسری تفسیر معنوی ہے جس کی تعبیر روایات اہلبیت علیہم السلام میں "شجرۂ حسد" سے کی گئی ہے۔ ان روایات کا مفہوم یہ ہے کہ آدم نے جب اپنا مقام بلند و درجہ رفیع دیکھا تو یہ تصور کیا کہ ان کا مقام بہت بلند ہے اس سے بلند کوئی مخلوق اللہ نے نہیں پیدا کی۔ اس پر اللہ نے انہیں بتلایا کہ ان کی اولاد میں کچھ ایسے اولیاء الٰہی (پیغمبر اسلام اور ان کے اہلبیت کرام علیہم السلام) بھی ہیں جن کا درجہ ان سے بھی بلند و بالا ہے۔ اس وقت آدم

---

[1] تفسیر "نور الثقلین" جلد اوّل ص ۵۹ - ۶۰ و جلد دوم ص ۱۱ تفسیر سورۂ بقرہ و اعراف۔

میں ایک حالت حسد سے مشابہ پیدا ہوئی[1] اور یہی وہ "شجرۂ ممنوعہ" تھا جس کے نزدیک جانے سے آدم کو روکا گیا تھا[2]

حقیقت امر یہ ہے کہ آدم نے (ان روایات کی بنا پر) دو درختوں سے تناول کیا۔ ایک درخت تو وہ تھا جو ان کے مقام سے نیچے تھا۔ اور انہیں مادی دُنیا میں لے جاتا تھا اور وہ "گندم" کا پودا تھا۔ دوسرا درخت معنوی تھا، جو مخصوص اولیائے الٰہی کا درجہ تھا اور یہ آدم کے مقام و مرتبہ سے بالاتر تھا۔ آدم نے دونوں پہلوؤں سے اپنی حد سے تجاوز کیا اس لیے ایسے انجام میں گرفتار ہوتے۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رہے کہ یہ "حسد" حسد حرام کی قسم سے نہ تھا، یہ صرف ایک نفسانی احساس تھا جبکہ انہوں نے اس طرف قطعاً کوئی اقدام نہیں کیا تھا جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے آیات قرآنی چونکہ متعدد معانی کی حامل ہیں لہٰذا اس امر میں کوئی مانع نہیں کہ "شجرہ" سے دونوں معنی مراد لے لیے جائیں۔

اتفاقاً کلمۂ "شجرہ" قرآن مجید میں دونوں معنی میں آیا ہے، کبھی تو انہی عام درختوں کے معنی میں، جیسے:

وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُورِ سَيْنَاءَ تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ (مومنون۔ ۲۰)۔

جس سے مراد زیتون کا درخت ہے، اور کبھی شجرۂ معنوی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے:

وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُونَةَ فِي الْقُرْآنِ (اسراء۔ ۶۰)۔

جس سے مراد مشرکین یا یہودی یا دوسری باغی قومیں (جیسے بنی امیہ) ہیں۔ اگرچہ بعض مفسرین نے اس کے اور معنی بھی بیان کیے ہیں مگر سب سے واضح تو وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔

لیکن یہاں پر ایک نکتہ ہے جس کی طرف توجہ دلانا مناسب ہے (اگرچہ جلد اوّل میں بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے) اور وہ یہ ہے کہ موجودہ خود ساختہ توریت میں، جو اس وقت کے تمام یہود و نصاریٰ کی قبول شدہ ہے اس شجرہ ممنوعہ کی تفسیر "شجرہ علم و دانش اور شجرہ حیات و زندگی" کی گئی ہے توریت کہتی ہے:

"قبل اس کے کہ آدم شجرۂ علم و دانش سے تناول کریں، وہ علم و دانش سے بے بہرہ تھے حتیٰ کہ انہیں اپنی برہنگی کا بھی احساس نہ تھا۔ جب انہوں نے اس درخت سے کھایا اس وقت وہ واقعی آدم بنے اور بہشت سے نکال دیئے گئے، کہ مبادا درخت حیات و زندگی سے بھی کھالیں اور خداؤں کی طرح حیات جاودانی حاصل کرلیں"[3]

یہ عبارت اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ موجودہ توریت آسمانی کتاب نہیں بلکہ کسی ایسے کم اطلاع

---

[1] یہاں پر حسد سے مراد رشک ہے جو مستحسن ہے، لیکن درباب محمد و آل محمد علیہم السلام رشک بھی ممنوع ہے، جیسا کہ قصۂ آدم سے ظاہر ہے۔ عربی میں حسد کا اطلاق رشک پر بھی ہوا ہے۔ (مترجم)

[2] تفسیر نور الثقلین۔ جلد اوّل ص ۵۹ - ۶۰ و جلد دوم ص ۱۱ تفسیر سورۂ بقرہ و اعراف۔

[3] سفر تکوین فصل دوم نمبر ۱۷۔

انسان کی ساختہ ہے جو علم و دانش کو آدم کے لیے معیوب سمجھتا تھا اور آدم کو علم و دانش حاصل کرنے کے جرم میں خدا کی بہشت سے نکالے جانے کا مستحق سمجھتا تھا گویا بہشت فہمیدہ انسانوں کے لیے نہیں ہے۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ولیم میلر (جسے عہدین خصوصاً انجیل کا ایک مقتدر مفسر مانا گیا ہے) اپنی کتاب "مسیحیت چیست" (مسیحیت کیا ہے؟) میں رقمطراز ہے :

شیطان ایک سانپ کی شکل میں باغ کے اندر داخل ہوا اور اس نے حوا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اس درخت کے میوہ میں سے کھالیں۔ چنانچہ حوا نے خود بھی کھایا اور آدم کو کھانے کو دیا اور انہوں نے بھی کھایا۔ ہمارے اولین والدین کا یہ عمل ایک معمولی اشتباہ پر مبنی نہ تھا یا ایک بے سوچی سمجھی خطا بھی نہ تھی بلکہ اپنے خالق کے برخلاف ایک جانا بوجھا عصیان تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ خود "خدا" بن جائیں۔ وہ اس بات کے لیے آمادہ نہ تھے کہ خدا کے ارادہ کے مطیع بنیں بلکہ یہ چاہتے تھے کہ اپنی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ نتیجہ کیا ہوا؟ خدا نے ان کی شدت سے سرزنش کی اور باغ (فردوس) سے باہر نکال دیا تاکہ درد و رنج سے بھری دنیا میں زندگی بسر کریں۔[1]

توریت و انجیل کے اس مفسر نے درحقیقت یہ چاہا ہے کہ "شجرۂ ممنوعہ" کی توجیہ کرے لیکن اس کی بجائے عظیم ترین گناہ یعنی خدا سے جنگ کی نسبت آدم کی طرف دے دی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ بجائے اس طرح کی پوچ تفسیروں کے کم از کم اپنی "کتب مقدسہ" میں تحریف کے قائل ہو جاتے۔

۲۔ آیا آدم نے گناہ کیا تھا؟

یہود و نصاریٰ کی کتب مقدسہ سے ہم نے جو مذکورہ بالا عبارت پیش کی اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اس بات کے معتقد ہیں کہ آدم گناہ و معصیت کے مرتکب ہوئے تھے بلکہ ان کا گناہ کوئی معمولی گناہ نہیں تھا۔ ان سے ایک سنگین گناہ سرزد ہوا تھا۔ حتیٰ کہ انہوں نے مقام ربوبیت سے جنگ کی ٹھان لی لیکن مدارک اسلامی چاہے وہ عقل کی رو سے ہوں یا آیات و روایات ہوں، ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ کوئی پیغمبر گناہ کا مرتکب نہیں ہوتا اور نہ ہی پیشوائی خلق کا منصب کسی گناہگار کو سونپا جاتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ حضرت آدمؑ انبیائے الٰہی میں سے تھے۔ اس بنا پر یہ آیت یا دیگر آیات جن میں عصیان کی نسبت دیگر انبیاء کی طرف دی گئی ہے، سب سے مراد "عصیان نسبی" اور "ترک اولیٰ" ہے نہ کہ مطلق گناہ۔

جاننا چاہیئے کہ گناہ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک "گناہ مطلق" دوسرے "گناہ نسبی"۔ گناہ مطلق کے مفہوم میں نہی تحریمی کی مخالفت اور خدا کے فرمان قطعی اور ہر طرح کے واجب کو ترک کرنا یا کوئی حرام کام

---

[1] کتاب "مسیحیت چیست؟" ص ۱۹۔

انجام دینا شامل ہے۔

لیکن گناہ نسبی یہ ہے کہ کسی بلند پایہ شخص سے کوئی ایسا غیر حرام عمل انجام پائے جو اس کی شان اور مقام کے مناسب نہ ہو کیونکہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی عمل مباح و جائز، بلکہ عمل مستحب ایک بڑے درجہ کے انسان کے مناسب نہ ہو، ایسی صورت میں اس عمل کو "گناہ نسبی" کہا جائے گا، مثلاً اگر کوئی باایمان اور ثروتمند شخص کسی فقیر کو فقر و افلاس کے پنجے سے نجات دینے کے لیے اس کی بہت معمولی سی مدد کرے۔ بلاشبہ یہ مدد چاہے جتنی بھی کم ہو حرام تو نہیں ہے، بلکہ مستحب ہے، لیکن جو بھی سُنے گا مذمت کرے گا، گویا اس نے کوئی گناہ کیا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اس صاحب ایمان ثروت مند سے زیادہ مدد کی توقع کی جاتی تھی۔

اسی نسبت سے جو اعمال مقربان بارگاہ الٰہی سے سرزد ہوتے ہیں، وہ ان کے مقام کے لحاظ سے پرکھے جاتے ہیں اگر وہ ان کے معیار پر پورے نہ اتریں تو اس کے لیے بھی کبھی عصیان یا ذنب (گناہ) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے[1] مثال کے طور پر ایک نماز (جس میں حضور قلب نہ ہو) ایک عام شخص کے لحاظ سے ایک نماز محسوب کی جاتے گی لیکن یہی نماز اولیائے حق کے لحاظ سے "گناہ" شمار ہوگی، کیونکہ ان کے مقام کے لحاظ سے حالت نماز میں ایک لحظہ کی غفلت مناسب و شائستہ نہیں ہے بلکہ انہیں اپنے علم و تقویٰ کی بناء پر ہنگام عبادت میں اس کے جمال و جلال میں غرق ہو جانا چاہیئے۔

عبادت کے علاوہ ان کے دیگر اعمال کا حال بھی یہی ہے۔ انہیں بھی ان کے مقام کے لحاظ سے جانچا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اگر ایک "ترک اولیٰ" ان سے سرزد ہو جائے تو وہ پروردگار عالم کے عتاب و سرزنش کا باعث بنے گا (ترکِ اولیٰ سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی کام کو ترک کرکے کارِ خوب یا عمل مباح بجا لائے)۔

روایات اسلامی میں ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ کے مصائب اور فراقِ فرزند کے سلسلے میں انہیں جو زحمتیں اٹھانا پڑیں اس وجہ سے تھیں کہ ایک محتاج روزہ دار مغرب کے وقت ان کے دروازہ پر آیا اور انہوں نے اس کی مدد سے غفلت کی جس کی وجہ سے وہ فقیر بھوکا اور دل شکستہ واپس چلا گیا۔

یہ عمل اگر ایک عام فرد سے سرزد ہوا ہوتا تو شاید اس کی اس قدر اہمیت نہ ہوتی لیکن خدا کے ایک عظیم پیغمبر اور رہبر امت سے جب یہ عمل ظاہر ہوا تو خدا نے اسے اتنی اہمیت دی کہ ان کیلئے نہایت شدید پاداش مقرر کی[2]

آدم کو "شجرۂ ممنوعہ" سے جو نہی کی گئی تھی وہ بھی "نہی تحریمی" نہ تھی، بلکہ "ترک اولیٰ" تھا لیکن آدم کے

---

[1] جیسا کہ کہا گیا ہے کہ "حسنات الابرار سیئات المقربین" یعنی کبھی نیک افراد کے لحاظ سے جو عمل حسنہ شمار ہوتا ہے، وہی عمل مقربان بارگاہ الٰہی کے لحاظ سے گناہ شمار ہوتا ہے۔ (مترجم)

[2] تفسیر "نور الثقلین" جلد دوم ص ۴۱۱ نقل از کتاب "علل الشرایع"۔

مقام و درجہ کے لحاظ سے اسے اہمیت دی گئی اور اس کی مخالفت کو (اگرچہ وہ نہی کراہتی تھی) خدا کی جانب سے مجازات و مواخذہ کا سبب قرار دیا گیا۔

ایک احتمال یہ بھی بعض مفسرین نے دیا ہے کہ آدم کو "شجرۂ ممنوعہ" سے نہی کیا جانا "نہی ارشادی" تھا، نہ کہ "نہی مولوی"۔ اس کی توضیح یوں ہے کہ کبھی تو خدا کسی بندے کو کسی کام سے نہی اس لیے کرتا ہے کہ وہ اس بچے کا صاحب اختیار اور اس کا مولا و آقا ہے، اس کے فرمان کی اطاعت ہر انسان پر واجب و لازم ہے اس طرح کی نہی کو "نہی مولوی" کہتے ہیں لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح کسی عمل سے نہی کی جاتی ہے کہ اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ اس کام کو اگر کرو گے تو اس کا بُرا نتیجہ برآمد ہوگا۔ جیسے طبیب مضر غذاؤں سے نہی کرتا ہے۔ بلاشبہ اگر مریض نے طبیب کی مخالفت کی تو اس نے نہ تو طبیب کی توہین کی اور نہ ہی اسے اس کی مخالفت منظور تھی بلکہ اس نے طبیب کے ارشاد و رہنمائی کا لحاظ نہیں کیا جس کی وجہ سے اسے تکلیف اٹھانا پڑی۔

آدم کے معاملے میں بھی خدا نے ان سے یہی کہا تھا کہ "شجرۂ ممنوعہ" سے کھانے کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ جنت سے باہر نکل جاؤ گے اور زحمت و رنج میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ یہ ایک ارشاد و رہنمائی ہے نہ کہ فرمان و حکم۔ لہٰذا آدم نے ایک نہی ارشادی کی مخالفت کی، یہ کوئی عصیان یا گناہ واقعی نہ تھا۔

لیکن پہلی تفسیر صحیح تر معلوم ہوتی ہے، کیونکہ "نہی ارشادی" کے لیے بخشے جانے اور مغفرت مانگنے کی ضرورت نہیں ہے جبکہ آدم نے (جیسا کہ آگے معلوم ہوگا) خدا سے اپنی مغفرت طلب کی۔

اس کے علاوہ، جیسا کہ ہم نے سابقاً جلد اوّل (ص ۱۹۰ اُردو ترجمہ) میں قصۂ آدم سے متعلق آیت کے ذیل میں بھی بیان کیا کہ بہشت کا زمانہ آدم کے لیے ایک تعلیم و تعلّم کا زمانہ شمار ہوتا تھا، یہی وہ زمانہ تھا جس میں آدم کو امر و نہی پروردگار کی شرعی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا گیا، دوست و دشمن کی پہچان بتائی گئی، عصیان کے نتیجے سے باخبر کیا گیا، مخالفت فرمانِ خدا و وسوسۂ شیطان کو قبول کرنے کے عواقب بتلائے گئے جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ "نہی ارشادی" فی الحقیقت کوئی تکلیف شرعی نہیں ہے اور نہ ہی اس کی وجہ سے کوئی مسئولیت عائد ہوتی ہے۔

اس بحث کے آخر میں اس بات کی طرف توجہ رہے کہ نہی، عصیان، غفران اور ظلم یہ سب الفاظ اگرچہ گناہ مطلق میں حقیقت رکھتے ہیں اور اسی کے آثار و توابع میں سے ہیں لیکن جب عصمت انبیاء کرام کا لحاظ کیا جائے تو ادلۂ عقلیہ و نقلیہ سے ثابت و مبرھن ہے تو ان تمام الفاظ کو "گناہ نسبی" قرار دیا جائے گا اور حضرت آدم اور دیگر انبیاء کی عظمت کو دیکھتے ہوئے یہ مفہوم کوئی بعید نہیں۔

۲۳ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○

۲۴ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

۲۵ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝

ع ۹

ترجمہ

۲۳ ان دونوں نے کہا، پروردگارا ! ہم نے اپنی جانوں پر ستم کیا، اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

۲۴ (خدا نے) فرمایا : (اپنے مقام سے) نیچے اتر جاؤ اس حال میں کہ ایک دوسرے کے دشمن ہو گے (شیطان تم دونوں کا دشمن اور تم دونوں اس کے دشمن) اور تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک مدت تک کے لیے وسائل زندگی مہیا ہیں۔

۲۵ (خدا نے) فرمایا : اسی (زمین) میں جیو گے، اسی میں مرو گے، اور اسی سے (بروز محشر) باہر نکلو گے۔

تفسیر

آدمؑ کی بازگشت خدا کی طرف

آخر کار جب آدم و حوا نے شیطان کی چال کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا اور مخالفت کرنے کا نتیجہ ان کے سامنے آگیا تو انہیں اپنے گذشتہ نقصان کی تلافی کی فکر لاحق ہوئی. چنانچہ انہوں نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ اپنے اوپر جو ظلم و ستم کیا تھا اس کا خدا کی بارگاہ میں اعتراف کیا اور کہا : اے پروردگارا ! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم و ستم کیا (قالا ربنا ظلمنا انفسنا)۔

اور اگر تو ہم کو نہ بخشے گا اور اپنی رحمت ہمارے شامل حال نہ کرے گا تو ہم نقصان اٹھانے والوں

میں سے ہو جائیں گے (وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین)۔

خدا کی طرف پلٹنے کے سلسلہ میں اور اصلاح مفاسد کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ آدمی غرور اور ہٹ دھرمی کی سواری سے نیچے اتر آئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرے، ایک ایسا اعتراف جو اس کی اصلاح کرنے والا ہو اور اسے ترقی کی راہ پر گامزن ہونے میں مدد کرے۔

یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ آدمؑ و حواؑ نے توبہ اور طلب عفو میں یہ ادب ملحوظ رکھا کہ یہ بھی نہ کہا کہ خدایا! ہمیں بخش دے (اغفرلنا) بلکہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر تُو ہمیں نہ بخشے گا تو ہم گھاٹا اٹھائیں گے!

اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ ہر گناہ اور اس کی ہر نافرمانی اپنے اوپر ظلم و ستم کا کرنا ہے کیونکہ جتنے بھی احکام و قوانین ہیں سب کے سب سعادت انسانی اور اس کے تکامل کے لیے بنائے گئے ہیں۔ بنابریں ان قوانین کی جو بھی خلاف ورزی ہوگی وہ تکامل کی راہ میں حائل ہو کر انسان کے تنزل کا باعث بنے گی۔

آدم و حوا نے بھی اگرچہ گناہ واقعی نہیں کیا تھا لیکن یہی ترک اولیٰ ان کے لیے اپنے بلند و بالا مقام سے نیچے اتر آنے کا باعث بن گیا۔

اگرچہ آدم و حوا کی خالص توبہ خدا کی بارگاہ میں درجۂ قبولیت پر فائز ہوگئی، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۳۷ میں ہم نے پڑھا کہ - فتاب علیه - (خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی) لیکن اس ترک اولیٰ کا جو لازمی نتیجہ تھا وہ ظاہر ہو کر رہا کیونکہ انہیں یہ حکم ملا کہ بہشت سے باہر نکل جائیں فرمایا: نیچے اتر جاؤ اس طرح سے تم (یعنی انسان اور شیطان) ایک دوسرے کے دشمن ہوگے (قال اهبطوا بعضکم لبعض عدو)۔

اور زمین ایک مدت تک تمہاری قرارگاہ اور زندگی کے دن پورے کرنے کے لیے ایک وسیلہ بنے گی (ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین)۔

نیز یہ بات بھی ان کے کان میں ڈال دی کہ تم زمین میں زندگی کے دن پورے کرو گے، اسی میں مرو گے اور بروز محشر حساب کتاب کے لیے اسی سے برآمد بھی ہو گے (قال فیها تحیون و فیها تموتون ومنها تخرجون)۔

اس آیت - قال اهبطوا بعضکم لبعض عدو - سے ظاہر تو یہ ہوتا ہے کہ اس سے آدم و حوا اور شیطان سب مراد ہیں لیکن بعد والی آیت اس بات کا قرینہ ہے کہ اس سے صرف آدم و حوا مراد ہیں کیونکہ انہی کا حشر و نشر زمین سے ہوگا۔

آدمؑ کا ماجرا اور اس جہان پر ایک طائرانہ نظر

اگرچہ بعض ایسے مفسرین نے جو افکارِ مغرب سے بہت زیادہ متاثر ہیں، اس بات کی کوشش کی ہے کہ حضرت آدم اور ان کی زوجہ کی داستان کو اوّل سے لے کر آخر تک تشبیہ، مجاز اور کنایہ کا رنگ دیں اور آج کی اصطلاح میں یوں کہیں کہ یہ ایک سمبولک (simbolic) تھا لہٰذا انہوں نے اس پوری بحث کو ظاہری مفہوم کے خلاف لیتے ہوئے مسائل معنوی سے کنایہ مراد لیا ہے لیکن اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ان آیات کا ظاہر ایک ایسے واقعی اور حقیقی ـ قصّہ ـ پر مشتمل ہے جو ہمارے اوّلین ماں باپ کو پیش آیا تھا۔ چونکہ اس پوری داستان میں ایک مقام بھی ایسا نہیں ہے جو ظاہری عبارت سے میل نہ کھاتا ہو یا عقل کے خلاف ہو، اس لیے اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس کے ظاہری مفہوم پر یقین نہ کیا جائے یا جو اس کے حقیقی معنی ہیں ان سے پہلو تہی کی جائے۔

لیکن در این حال اس حسّی و عینی واقعہ میں کچھ انسان کی آئندہ زندگی کے متعلق بھی ہو سکتے ہیں۔

یعنی: انسان کو اس پُر جنجال زندگی میں بہت سے ایسے واقعات پیش آ سکتے ہیں جو قصّۂ آدم و حوّا سے مشابہت رکھتے ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھنا چاہیئے کہ ایک طرف تو وہ انسان ہے جو قوت، عقل اور ہوا و ہوس سے مرکب ہے، یہ دونوں طاقتیں اسے مختلف جہتوں میں کھینچ رہی ہیں۔ دوسری طرف کچھ ایسے جھوٹے رہبر ہیں جن کا ماضی شیطان کی طرح جانا پہچانا ہے اور وہ انسان کو اس بات پر اکسا رہے ہیں کہ عقل پر پردہ ڈال کر ہوا و ہوس کو اختیار کر لو تاکہ یہ بے چارہ انسان پانی کی امید میں "سراب" کو آب سمجھ کر ریگستانوں میں بھٹک کر اپنی جان گنوا بیٹھے۔

ایسے شیطانوں کے بہکانے میں آجانے کا پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کے جسم سے ـ لباسِ تقویٰ ـ گر جاتا ہے اور اس کے اندرونی عیوب عیاں و آشکارا ہو جاتے ہیں۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مقام قربِ الٰہی سے دُور ہو جاتا ہے اور انسان کا جو بلند مقام ہے اس سے گر جاتا ہے اور سکون و اطمینان کی بہشت سے نکل کر حیاتِ مادی کی مشکلات و آفات کے جنگلوں میں گھِر جاتا ہے۔

اس موقع پر بھی عقل کی طاقت اس کی مدد کر سکتی ہے اور اسے اس نقصان کی تلافی کا موقع فراہم کر سکتی ہے اور اسے خدا کی بارگاہ میں دوبارہ بھیج سکتی ہے تاکہ جرأت و صراحت کے ساتھ اپنے گناہ کا اعتراف کرے۔ ایسا اعتراف جو اس کی زندگی کی تعمیرِ نو کا ضامن ہو اور اس کی زندگی کا ایک نیا موڑ بن جائے۔

یہی وہ موقع ہوتا ہے جبکہ دستِ رحمتِ الٰہی بار دیگر اس کی طرف دراز ہوتا ہے تاکہ اسے ہمیشہ کے انحطاط اور تنزل سے نجات دے۔ اگرچہ اپنے گذشتہ گناہ کا تلخ مزا اس کے کام و دہن میں باقی رہ جاتا ہے جو اس کا اثر وضعی ہے۔ لیکن یہ ماجرا، اس کے لیے درسِ عبرت بن جاتا ہے کیونکہ وہ اس شکست کے تجربہ سے

اپنی حیات ثانیہ کی بنیاد مستحکم کر سکتا ہے اور اس نقصان و زیاں کے ذریعے سرورِ آئندہ فراہم کر سکتا ہے۔

۲۶ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ
وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ○

۲۷ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ
الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ
يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا
الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○

۲۸ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ
اَمَرَنَا بِهَا ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ؕ اَتَقُوْلُوْنَ
عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۲۶ اے آدم کی اولاد! ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا تاکہ تمہارے اندام کو ڈھانپ لے اور تمہارے لیے زینت بنے، اور تقوے کا لباس اُس سے بہتر ہے۔ یہ (سب) خدا کی آیتوں (نشانیوں) میں سے ہے شاید[1] تم اس کی نعمتوں کو یاد کرنے والے ہو۔

۲۷ اے اولادِ آدم! شیطان تمہیں دھوکا نہ دے، جس طرح تمہارے ماں باپ کو دھوکا

---

[1] لفظ شاید پر ہمارا نوٹ پہلے ہی گزر چکا ہے جو "لعل" کا ترجمہ ہے، یہ لفظ جب اللہ اپنے لیے استعمال کرتا ہے تو اس کے معنی "تاکہ" کے ہوتے ہیں، نہ کہ "شاید" کے۔ کیونکہ "شاید" وہ کہتا ہے جس کو نتیجہ کا علم نہ ہو (مترجم)۔

ڈے کر بہشت سے باہر نکال دیا اور ان کے لباس کو ان کے جسموں سے اتار دیا تاکہ ان کی شرمگاہیں انہیں دکھا دے، کیونکہ وہ (شیطان) اور اس کے کارندے تمہیں دیکھتے ہیں اور تم انہیں نہیں دیکھتے" (لیکن یہ جان لو) ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا ولی قرار دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔

۲۸ اور جس وقت وہ کوئی کارِ بد کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپوں کو یہی کرتے دیکھا ہے اور خدا نے ہمیں یہی حکم دیا ہے (اے ہمارے رسول!) ان سے کہہ دو کہ خدا (ہرگز) کبھی کسی کو بُرے کام کا حکم نہیں دیتا، آیا خدا کی طرف اس بات کی نسبت دیتے ہو جو نہیں جانتے؟!

تفسیر

بنی آدم کے لیے خطرے کی گھنٹی

جیسا کہ ہم نے آیات گزشتہ کی آخری بحث میں بیان کیا کہ آدم کی سرگزشت اور ان کی شیطان سے کشمکش روئے زمین پر آنے والے تمام انسانوں کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا ایک عکس ہے یہی وجہ ہے کہ خدا نے ان آیات کے بعد تمام بنی آدم کے لیے کچھ ایسے تعمیری فرامین بیان کیے گئے درحقیقت بہشت میں آدم کو دیئے جانے والے احکام کا تتمہ ہیں۔

سب سے پہلے اسی مسئلہ لباس اور جسم ڈھانپنے کی بات کا ذکر کیا ہے جو واقعۂ آدم میں بھی اہمیت کا حامل ہے فرماتا ہے: اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا تاکہ (تمہارے اندام کو ڈھانپ لے اور) تمہارے بدن کے بدنما حصّوں کو چھپالے (یبنی ادم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سواٰتکم)۔

لیکن اس لباس کا یہی فائدہ نہیں ہے کہ تمہارے بدن کو چھپالے اور اس کی بُرائی کو پوشیدہ کر دے بلکہ ہم نے اسے تمہارے بدن کی زینت کے لیے بھی بھیجا ہے تاکہ یہ جیسا ہے اسے اس سے خوش نما تر دکھائے (وریشا)۔

عربی میں "ریش" دراصل پرندے کے پَر کو کہتے ہیں، چونکہ پرندوں کے لیے پَر بھی لباس کا کام انجام

دیتے ہیں اس بنا پر ہر لباس کو "ریش" کہا جانے لگا، علاوہ بریں پرندوں کے پر خوبصورت بھی ہوتے ہیں اس لیے لفظ "ریش" میں زینت کا مفہوم بھی شامل ہو گیا۔ نیز جو کپڑا گھوڑے کی زین سر یا اونٹ کی پشت پر ڈالا جاتا ہے اسے بھی "ریش" کہا جاتا ہے۔

بعض مفسرین اور اہل لغت نے "ریش" کے اس سے بھی وسیع معنی بیان کیے ہیں، یعنی ہر وہ سامان جس کی انسان کو ضرورت ہو، لیکن اس آیت میں مناسب معنی لباس اور زینت کے ہیں۔

اس جملے میں لباس ظاہری کے بیان کرنے کے فوراً بعد قرآن نے لباس معنوی کی بحث کو بھی چھیڑا ہے جیسا کہ دیگر مواقع پر قرآن کا طریقہ ہے، اگر کسی چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں تو دونوں کو بیان فرماتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: پرہیزگاری اور تقویٰ کا لباس اس سے بہتر ہے (ولباس التقوٰی ذالک خیر)۔

تقویٰ اور پرہیزگاری کے لیے لباس کی تشبیہ نہایت بلیغ اور معنی خیز ہے۔ کیونکہ جس طرح لباس انسان کے بدن کو سردی اور گرمی سے بچاتا ہے، بہت سے خطروں میں ڈھال کا کام بھی کرتا ہے، جسمانی عیوب کو پوشیدہ رکھتا ہے اور انسان کے لیے ایک قسم کی زینت بھی ہے، اسی طرح تقویٰ و پرہیزگاری کا جذبہ علاوہ اس کے کہ وہ انسان کو گناہوں کے برے اثرات سے بچاتا ہے، اور بہت سی انفرادی واجتماعی خطروں سے محفوظ رکھتا ہے بلکہ انسان کے لیے ایک بڑی زینت بھی بن جاتا ہے۔ تقویٰ ایک ایسی جاذب نظر زینت ہے جو انسان کی شخصیت میں اہمیت پیدا کر دیتی ہے۔

"لباس تقویٰ" سے کیا مراد ہے؟ اس امر میں بھی مفسرین کے درمیان بڑی گفتگو ہوئی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا معنی "عمل صالح" ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد "حیا" ہے۔ بعض نے اس سے "لباس عبادت" مراد لیا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ اس سے مراد "لباس جنگ" ہے جیسے زرہ، خود اور سپر وغیرہ کیونکہ "تقویٰ" کی اصل "وقایۃ" ہے جس کا معنی ہے "حفاظت"۔ قرآن کریم میں بھی "تقویٰ" اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ سورہ نحل کی آیت ۸۱ میں ہے:

(وَجَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِیْلَ تَقِیْکُمْ بَاْسَکُمْ ...)۔

تمہارے لیے ایسے پیراہن بنائے گئے ہیں جو تمہیں گرمی سے حفاظت کرتے ہیں اور کچھ پیراہن وہ ہیں جو میدان جنگ میں تمہاری حفاظت کرتے ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ آیات قرآنی غالباً وسیع معنی کی حامل ہوتی ہیں جن کے مختلف مصداق ہوتے ہیں۔ لہٰذا آیت مورد بحث میں بھی یہ تمام معنی مراد لیے جا سکتے ہیں۔

اور چونکہ "لباس تقویٰ" کا لباس جسمانی کے مقابلے میں ذکر کیا گیا ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد وہی "روح تقویٰ و پرہیزگاری" ہے جس کی وجہ سے انسان کی جان محفوظ رہتی ہے اور "حیاء" و "عمل صالح" بھی اس میں داخل ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : یہ لباس جو خدا نے تمہیں عطا کیے ہیں، چاہے وہ مادی ہوں یا معنوی، لباس جسمانی ہوں یا لباس تقویٰ، یہ سب خدا کی آیات و نشانیاں ہیں تاکہ بندگان خدا، خدا کی نعمتوں کو یاد کریں (ذالک من اٰیات اللّٰہ لعلھم یذکرون)۔

لباس کا نازل ہونا

قرآن کریم کی متعدد آیات میں لفظ "انزلنا" (ہم نے اتارا) ملتا ہے، جو بظاہر اوپر سے نیچے کی طرف بھیجنے کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا، جیسے زیر بحث آیت میں ہے۔ کیونکہ خدا اس آیت میں فرماتا ہے : ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا تاکہ تمہارے اندام کو چھپائے۔ باوجود اس کے کہ ہمیں معلوم ہے کہ عام طور سے جو لباس تیار ہوتا ہے وہ یا تو جانوروں کی اُون سے بنتا ہے، یا نباتات سے۔ یہ سب چیزیں زمین سے تعلق رکھتی ہیں۔

سورہ زمر کی آیت ۶ میں بھی ہے :

وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ

اللہ نے تمہارے لیے نازل کیے چوپایوں میں سے آٹھ جوڑے۔

اور سورہ حدید آیت ۲۵ میں ہے :

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ ......

اور ہم نے لوہا اتارا ......

بہت سے مفسّروں کو اس بات پر اصرار ہے کہ اس قسم کی آیات سے "نزول مکانی" یعنی اوپر سے نیچے کی طرف آنا مراد لیا جائے اور اسی طرح ان کی تفسیر بھی کی جائے مثلاً وہ کہتے ہیں کہ چونکہ بارش اوپر سے نازل ہوتی ہے جس سے نباتات روئیدہ ہوتے ہیں، حیوانات سیراب ہوتے ہیں بنا بریں لباس کا مراد اس معنی سے آسمان سے نازل ہوتا ہے، لوہے کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ آسمان سے جو پتھر برستے ہیں (شہابیے) ان کے اجزاء میں لوہے کی آمیزش ہوتی ہے۔

لیکن اگر اس بات کی طرف توجہ کی جائے کہ لفظ "نزول" سے کبھی "نزول مقامی" مراد ہوتا ہے جس کا استعمال روزمرہ میں داخل ہے جیسے کہتے ہیں کہ "مقام بالا سے یہ حکم صادر ہوا ہے" یا یہ کہ "رفعت شکوای الی القاضی" (میں نے اپنی شکایت قاضی کی طرف اٹھائی) تو اس بات کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ان آیات کی تفسیر میں نزول مکانی پر اصرار کیا جائے۔ کیونکہ اللہ کی تمام نعمتیں اس کی بلند و بالا بارگاہ سے بندوں کے لیے آتی ہیں۔ لہٰذا ان کے لیے لفظ "نزول" کا استعمال حسب حال اور عین مناسب ہے۔

اس موضوع کی نظیر و مثال ان الفاظ میں بھی ملتی ہے جن سے قریب اور دُور کے لیے اشارہ کیا جاتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز مکانی حیثیت سے ہم سے بالکل قریب ہوتی ہے، لیکن اپنے مقام و درجہ کے لحاظ سے ہم سے بلند ہوتی ہے تو ایسی چیز کے لیے اشارہ کرنے کے لیے ہم وہ لفظ استعمال کرتے ہیں جو دُور کے لیے وضع ہوئی ہے۔ جیسے بجائے "آپ" کے کہتے ہیں: آنجناب کی خدمت میں عرض ہے (حالانکہ بسا اوقات "آنجناب" بالکل پہلو میں بیٹھے ہوتے ہیں) قرآن میں بھی ہم پڑھتے ہیں۔ ذالک الکتاب لا ریب فیہ۔ (وہ کتاب پُرعظمت و بلند پایہ (یعنی قرآن) ایسی ہے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں)۔

گذشتہ اور موجودہ زمانے میں لباس

جہاں تک تاریخ کی دسترس ہے ہمیں انسان ہمیشہ لباس میں ملتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تاریخ جتنی دُور ہوتی جاتی ہے اور مقامات بدلتے جاتے ہیں تو لباسوں میں بھی بڑا فرق ہوتا جاتا ہے۔ گزشتہ زمانے میں لباس صرف جاڑے اور گرمی سے بچنے کے لیے یا بدن کی زینت کے لیے پہنا جاتا تھا۔ لیکن بدن کی حفاظت کے پہلو سے غفلت تھی۔ آج کی زندگی میں یہ پہلو بھی سامنے آگیا ہے جیسا کہ بعض شعبوں میں اس کی طرف خاص نظر ہے۔ جیسے فضا نوردوں، آگ بجھانے والوں، کان کنوں، سمندر میں غوطہ لگانے والوں اور اسی طرح کے دیگر کام کرنے والوں کے خصوصی لباس تو ان کی جان و بدن کی حفاظت کے لیے ہوتے ہیں۔

عصرِ حاضر میں صنعت لباس بافی کے مواد خام میں اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ جس کا گزشتہ دور میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔

تفسیر۔ المنار۔ کا مؤلف آٹھویں جلد میں اس آیت کے ذیل میں اس طرح رقمطراز ہے:

ایک دن کا واقعہ ہے کہ جرمنی کا صدر ایک کپڑے کی مل کا معائنہ کر رہا تھا۔ جب وہ اس عظیم کارخانے میں داخل ہوا تو شروع میں اس نے کچھ بھیڑوں کو دیکھا جن سے اُون اتاری جا رہی تھی۔ اس کے بعد جب وہ اس کارخانے سے باہر نکلنے لگا تو کارخانے کے مہتمم نے اسے ایک خوبصورت کپڑا پیش کیا اور کہا کہ یہ اسی اُون سے تیار ہوا ہے جو ابھی تھوڑی دیر پیشتر آپ کے سامنے بھیڑوں سے حاصل کی جا رہی تھی یعنی دو گھنٹے سے بھی کم کی مدت میں بھیڑ کے بدن سے اتری ہوئی اُون صدر مملکت کے پہننے کے لیے ایک خوبصورت کپڑا بن گیا۔

لیکن ہمارے دور میں کپڑے کے استعمال کا ایک ناپسندیدہ اور افسوسناک پہلو اس طرح سامنے آیا ہے کہ اس کا اصلی فائدہ تحت الشعاع ہو گیا ہے، اور وہ پہلو یہ ہے کہ لباس حسن پرستی، فساد، شہوت انگیزی، خود نمائی اور تکبر، اسراف اور فضول خرچی وغیرہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض افراد کے بدن پر ایسا لباس دیکھا گیا ہے (خاص کر مغرب زدہ جوانوں کے بدن پر) جس کا جنونی پہلو عقلی پہلو پر غالب نظر آتا

ہے۔ وہ لباس ایسا ہے جو دنیا کی ہر چیز ہو سکتا ہے لیکن اسے لباس نہیں کہا جا سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں جو ذہنی نقص ہے اس کا اظہار وہ اس طرح کے عجیب و غریب لباس پہن کر کرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے کسی کار نمایاں سے لوگوں کی نظر اپنی طرف نہیں موڑ سکتے وہ عجیب و غریب اور حیران کن لباس کے ذریعے معاشرے میں اپنے وجود کا اظہار چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو بردبار ہیں اور ان میں کسی قسم کا نقص یا احساس کمتری نہیں ہے وہ ایسے لباس سے اجتناب کرتے ہیں۔

علاوہ بریں کتنا کثیر مال اور سرمایہ ان گوناں گوں لباسوں، فیشن پرستیوں اور لباس پہننے کے مقابلوں میں خرچ ہو جاتا ہے۔ اگر اس مبلغ کثیر کو ان فضول خرچیوں سے بچا لیا جائے تو اس سے نہ معلوم کتنی اجتماعی اور معاشرتی مشکلیں حل ہو سکتی ہیں اور اس کے ذریعے اس دکھی معاشرے کے کتنے زخموں پر مؤثر طور پر مرہم رکھا جا سکتا ہے۔

لباس کے بارے میں فیشن پرستی سے صرف یہی نہیں ہوتا کہ زر کثیر بیکار خرچ ہو جاتا ہے بلکہ اس سے وقت اور انسانی توانائی بھی بہت تلف ہوتی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ کی زندگی کے حالات پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر آئمہ طاہرین علیہم السلام لباس کے معاملہ میں تجمل پرستی کے سخت مخالف تھے۔ جیسا کہ روایات میں ملتا ہے کہ نصاریٰ بنی نجران کا ایک وفد آنحضرتؐ سے ملنے آیا۔ وہ لوگ اپنے بدنوں پر ریشم سے بنا ہوا ایسا خوب صورت لباس پہنے ہوئے تھے جو اس وقت عرب عام طور پر نہیں پہنتے تھے۔ جب یہ لوگ رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے سلام کیا تو آنحضرتؐ نے انہیں سلام کا جواب نہیں دیا۔ حتیٰ کہ ان سے بات تک کرنے کے روادار نہ ہوئے۔ جب حضرت علی علیہ السلام سے اس مشکل کا حل پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ یہ لباس فاخرہ اتار دیں اور قیمتی انگوٹھیاں بھی اپنی انگلیوں سے اتار دیں اس کے بعد پیغمبرؐ کی خدمت میں جائیں تو انہیں شرف ملاقات حاصل ہو جائے گا۔ چنانچہ ان لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کی ہدایت پر عمل کیا تو آنحضرتؐ نے ان کے سلام کا جواب بھی دیا اور ان سے بات بھی کی بعد ازاں جناب رسالت مآبؐ نے فرمایا:

والذی بعثنی بالحق لقد أتونی المرة الاولی وان ابلیس لمعهم.

اس ہستی کی قسم جس نے مجھے مبعوث برسالت کیا، جب یہ لوگ پہلی دفعہ آئے تھے تو ان کے ساتھ شیطان بھی آیا تھا۔ [1]

اس کے بعد والی آیت میں خداوند کریم تمام افراد بشر اور اولاد آدم کو خبردار کرتا ہے کہ شیطان کے ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہیں۔ کیونکہ شیطان نے اپنی پرانی دشمنی کا اظہار انسانوں کے پدر و مادر اوّل سے کر

[1] سفینۃ البحار جلد دوم صفحہ ۴۹۲ مادۂ لبس۔

دیا ہے کہ انہیں فریب دے کر ان کا لباس جنت ان کے بدنوں سے اتروا دیا۔ اسی طرح ممکن ہے کہ وہ انسانوں کے لباس تقویٰ کو بھی اتروا لے، اس لیے فرمایا گیا ہے: اے آدم کی اولاد! شیطان تمہیں دھوکا نہ دے جیسا کہ اس نے تمہارے باپ آدم اور ماں حوا کو (دھوکا دے کر) بہشت سے نکال دیا اور ان کا لباس ان کے تن سے الگ کر دیا تاکہ ان کی شرمگاہ ان کو دکھلا دے (یا بنیٓ آدم لا یفتننکم الشیطان کما آخرج ابویکم من الجنة ینزع عنھما لباسھما لیریھما سوأتھما)۔

درحقیقت جو چیز اس آیت کو گذشتہ آیت سے مربوط کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہاں ظاہری اور معنوی لباس (لباس تقویٰ) کا تذکرہ تھا اور اس آیت میں خبردار کیا جا رہا ہے کہ ہوشیار رہنا کہیں شیطان تمہارے اس لباس تقویٰ کو بھی نہ اتروا دے۔

بیشک ظاہری عبارت میں تو یہ نہی کا حکم شیطان کے لیے ہے، لیکن اس طرح کی عبارتوں میں ایک لطیف کنایہ مخاطب کو نہی کرنے کے لیے مضمر ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم اپنے کسی دوست سے کہیں کہ خبردار فلاں دشمن تم کو نقصان نہ پہنچا دے، مقصد یہ ہے کہ تم ہشیار رہنا اور اس سے مار نہ کھانا۔

اس کے بعد تاکید فرماتا ہے کہ شیطان اور اس کے کارندوں کا حساب کتاب دیگر دشمنوں سے بالکل الگ ہے کیونکہ وہ اور اس کے کارندے تمہیں دیکھتے ہیں اس عالم میں کہ تم انہیں نہیں دیکھتے لہٰذا ایسے دشمن سے بہت ہشیار رہنے کی ضرورت ہے (انہٗ یراکم ھو وقبیلہ من حیث لا ترونھم)۔

درحقیقت جس مقام پر تمہیں یہ گمان گزرے کہ یہاں پر بس تم ہی تم ہو، ممکن ہے کہ شیطان اور اس کا گروہ بھی وہاں موجود ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ دشمن اگر ایسا چھپا ہوا ہو کہ اس کے متعلق ہر آن یہ خطرہ ہو کہ نہ معلوم کب حملہ کر بیٹھے، ایسے خطرناک دشمن کے مقابلہ میں ہمیشہ آمادہ جنگ رہنا چاہیے۔

آیت کے آخر میں ایک جملہ ہے جو درحقیقت ایک اہم اعتراض کا جواب ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ: خدائے مہربان و عادل نے کس لیے ایسے موذی اور قوی دشمن کو انسان پر مسلط کر دیا، دشمن ایسا جو اپنی طاقتوں میں انسان سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، جہاں چاہے چلا جائے بغیر اس کے کہ کوئی اس کے پاؤں کی آہٹ سن سکے، بلکہ بعض روایات میں ہے کہ وہ انسان کے اندر اس طرح دوڑ جاتا ہے جس طرح خون بدن کی رگوں کے اندر دوڑتا ہے، آیا یہ عمل عدالت الٰہی سے مطابقت رکھتا ہے؟!

مذکورہ آیت اس احتمالی سوال کے جواب میں کہتی ہے: ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا دل دسرپرست قرار دیا ہے جو بے ایمان ہیں (انا جعلنا الشیاطین اولیآء للذین لا یؤمنون)۔

یعنی ان شیاطین کو اس کی اجازت نہیں دی گئی کہ ان بندوں کی جان و روح میں داخل ہو سکیں جنہوں نے ان شیاطین کو قبول کرنے کا اعلان نہیں کیا ہے، اور وہ صاحبان ایمان ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ شیطان کی طرف ابتدائی قدم خود انسان کی طرف سے اٹھتے ہیں اور خود اس کی جانب سے شیطان

کو یہ اجازت ملتی ہے کہ سلطنت بدن میں داخل ہو جاتے۔ لہٰذا انسان کی اجازت سے شیطان اس کے بدن میں داخل ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ بنا بریں جو افراد اپنے بدن کی کھڑکیاں شیطان کے لیے بند رکھتے ہیں، شیطان کو بھی یہ جرأت نہیں ہوتی کہ ان کے بدن کی قلمرو میں داخل ہو سکے۔

قرآن کریم کی بعض دیگر آیات بھی اس حقیقت کی شہادت دیتی ہیں جیسا کہ سورۂ نحل کی آیت ۱۰۰ میں ہے:

اِنَّمَا سُلْطَانُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ۔

شیطان کا قبضہ ان لوگوں پر ہے جو اسے چاہتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔

نیز سورۂ حجر کی آیت ۴۲ میں ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِيْنَ۔

میرے بندوں پر تیرا قبضہ نہ ہو سکے گا سوا ان گمراہوں کے جو تیری اتباع کریں گے۔

دیگر لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ درست ہے کہ ہم ان ظاہری آنکھوں سے خود شیطان اور اس کے ساتھیوں کو نہیں دیکھتے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے نقش پا کو تو دیکھتے ہیں۔ جس جگہ محفل گناہ برپا ہو، اسباب معصیت فراہم ہوں، دنیا اپنے زرق برق لباس میں محو رقص ہو، تجمل پرستی موجزن ہو اور جس وقت غرائز طبعی میں طوفان بھی اٹھ رہا ہو، یا آتش غیظ و غضب بھڑک رہی ہو، یہ سمجھو کہ یہ سب شیطان کے نقش پا ہیں کیونکہ ان خطرناک مواقع پر شیطان کی موجودگی لازمی ہے گویا ان مقامات پر انسان شیطانی وسوسوں کو اپنے دل کے کانوں سے سن رہا ہوتا ہے اور اس کے منحوس قدموں کے نشانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔

اس بارے میں ایک جاذب نظر حدیث امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے آپ نے فرمایا:

لما دعا نوح ربه عزوجل على قومه اتاه ابليس لعنه الله فقال يا نوح ان لك عندي يدا اريد ان اكافيك عليها، فقال نوح انه ليبغض الي ان يكون لك عندي يد فما هي؟ قال بلى دعوت الله على قومك فاغرقتهم فلم يبق احد اغويه، فانا مستريح حتى ينشق قرن آخر واغويهم، فقال له نوح ما الذى تريد ان تكافئني به؟ قال اذكرني في ثلاث مواطن فاني اقرب ما اكون الى العبد اذا كان في احداهن:

اذكرني اذا غضبت؟

واذكرني اذا حكمت بين اثنين!

"واذکرنی اذا کنت مع امراۃ خالیًا لیس معکما احد" [1]

جس وقت حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے لیے بددعا کی اور خدا سے یہ چاہا کہ وہ اسے ہلاک کردے (اور ان سب کو غرق کردے) تو طوفان کے بعد ابلیس ان کے پاس آیا اور اس نے کہا: اے نوح! میری گردن پر تمہارا ایک حق ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کا بدلہ چکا دوں!

یہ سُن کر نوحؑ کو تعجب ہوا کہ کیا احسان! کہا یہ امر مجھے بہت شاق ہے کہ میرا کوئی حق تیرے ذمہ ہو ذرا بتلا کہ وہ حق کیا ہے؟

ابلیس نے کہا وہی بددعا جو تم نے اپنی قوم کے لیے کی ہے جس کی وجہ سے سب ہلاک ہو گئے اور کوئی ایسا شخص نہ بچا جس کو میں گمراہ کرنے کی زحمت گوارا کروں اس وجہ سے مجھے ایک عرصہ تک کے لیے چھٹی مل گئی کہ آرام کروں یہاں تک کہ دوسری نسل بڑی ہو اور میں نئے سرے سے انہیں گمراہ کرنے میں مشغول ہوں۔

نوحؑ نے اگرچہ اپنی قوم کی ہدایت کی بڑی کوشش کی تھی اور جب کسی طرح وہ ٹھیک نہ ہوئی اس وقت انہوں نے بددعا کی تھی اس لیے شیطان کا یہ طعنہ درست نہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ ناراحت ہوئے، انہوں نے ابلیس سے کہا: اب تُو کس طرح تلافی کرنا چاہتا ہے؟

اس نے کہا: تین مواقع ایسے ہیں جہاں مجھے یاد کرلیں، کیونکہ ان مواقع پر میں بندگان خدا سے سب سے زیادہ نزدیک ہوجاتا ہوں۔

یاد رکھو مجھے، جب تم غصّہ میں ہو۔

اور یاد رکھو مجھے جب تم دو شخصوں کے درمیان فیصلہ کرو۔

اور یاد رکھو مجھے اس وقت جبکہ تم کسی نامحرم عورت کے ساتھ اکیلے ہو!

ایک اور قابلِ توجہ نکتہ یہاں پر یہ ہے کہ کچھ مفسّرین نے آیہ مذکورہ سے یہ استفادہ کیا ہے کہ شیطان کسی حال میں انسان کے لیے قابلِ دید نہیں ہے جبکہ بعض روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا ہوسکتا ہے۔ لیکن بظاہر ان دونوں باتوں میں اختلاف نہیں ہے کیونکہ بمقتضائے اصل شیطان قابلِ رویت نہیں ہے لیکن مثل دیگر کلیات کے یہ کلیہ بھی قابلِ استثناء ہے لہٰذا وہ بعض مواقع پر دیکھا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں شیطان کے ایک اہم وسوسہ کا ذکر کیا گیا ہے جو بعض شیطان صفت انسانوں کی زبان پر بھی جاری ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ جب بھی وہ کوئی عمل قبیح بجا لاتے ہیں اور ان سے اس کے

---

[1] بحار الانوار طبع جدید جلد ۱۱ ص ۳۱۸۔

متعلق جواب طلب کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں: یہ وہ طریقہ ہے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو گامزن پایا ہے
(واذا فعلوا فاحشة قالوا وجدنا علیها اٰبآءنا)۔

اس کے بعد وہ مزید کہتے ہیں: خدا نے بھی ہمیں اس طریقہ پر چلنے کا حکم دیا ہے (واللّٰه امرنا بها)۔

بزرگوں کی کورانہ تقلید اور بارگاہِ خداوندی کو کسی بارے میں متہم کرنا یہ دو ناقابلِ قبول عذر ہیں جو بعض شیطان صفت افراد پیش کرتے ہیں۔

یہاں پر ایک جاذبِ نظر بات یہ ہے کہ خدا نے ان کی پہلی دلیل کا کوئی جواب نہیں دیا گویا یہ ایسی پوچ اور کمزور ہے جس کے جواب کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس دلیل کے بطلان کو ہر عقلِ سلیم سمجھ سکتی ہے، علاوہ بریں قرآن کریم میں متعدد بار اس کا جواب دہرایا گیا ہے، لہٰذا صرف دوسرے جواب پر اکتفا کی ہے، فرمایا گیا ہے، خدا کبھی بُرے کاموں کا حکم نہیں دیتا، کیونکہ اس کا حکم عقل کے حکم سے جدا نہیں ہے
(قل ان اللّٰه لا یأمر بالفحشآء)۔

بُرے کاموں کا حکم دینا نصِ قرآنی کے مطابق ایک شیطانی کام ہے نہ کہ خدا کا کام، خدا تو صرف نیکی اور اچھے کاموں کا حکم دیتا ہے[1]

بعد ازاں اس جملہ پر آیت کا خاتمہ ہوتا ہے: کیا تم خدا کی جانب ایسی باتوں کی نسبت دیتے ہو جنہیں تم نہیں جانتے (أتقولون علی اللّٰه ما لا تعلمون)۔

اگرچہ بظاہر زیادہ مناسب تو یہ تھا کہ فرمایا جاتا: تم کیوں اس بات کی خدا کی طرف نسبت دیتے ہو جو جھوٹ ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے؟ لیکن اس کی بجائے فرمایا: جس چیز کو تم نہیں جانتے اس کی نسبت خدا کی طرف کیوں دیتے ہو؟ یہ دراصل اس وجہ سے ہے کہ وہ مطالب جو طرفین کیلئے قابلِ قبول اور مسلّم ہیں ان کا سہارا لیا جائے۔ گویا ان سے کہا جا رہا ہے کہ تمہیں اگر ان باتوں کے جھوٹ ہونے کا یقین نہیں ہے تو کم از کم اتنا تو ہے کہ ان کے صحیح ہونے پر بھی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، لہٰذا بغیر دلیل کے کیوں تہمت لگاتے ہو اور جس چیز کو نہیں جانتے اسے خدا کی طرف کیوں منسوب کرتے ہو۔

"فحشآء" سے کیا مراد ہے؟

لفظ "فاحشہ" (عمل قبیح) کے متعلق بہت سے مفسرین کا قول ہے کہ اس سے زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی اس رسم کی طرف اشارہ ہے کہ وہ خانۂ کعبہ کے گرد مادر زاد برہنہ طواف کرتے تھے، اس میں مرد و عورت کا بھی کوئی فرق نہ تھا، اس بارے میں ان کی دلیل یہ تھی کہ جن کپڑوں سے خدا کا گناہ کیا ہے انہیں وقتِ طواف بدن سے الگ کر دینا چاہیئے۔

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۶۸-۲۶۹ ملاحظہ ہو۔

بے شک یہ تفسیر ان آیات سے ضرور مناسبت رکھتی ہے جو اس سے قبل گذر چکی ہیں اور ان میں لباس اور اس کے پہننے کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ لیکن متعدد روایات میں ملتا ہے کہ "فاحشۃ" سے مراد یہاں پر ظالم پیشواؤں کا لوگوں سے یہ کہنا ہے کہ وہ ان کی پیروی کریں کیونکہ (بقول ان کے) خدا نے ان کی اطاعت کو لوگوں پر فرض کیا ہے۔

لیکن بعض مفسرین جیسے "المنار" اور "المیزان" کے مؤلف نے اس کے ایک وسیع معنی بیان کیے ہیں جس کے دائرے میں ہر بُرا کام آجاتا ہے۔ اگر آیت کے وسیع معنی پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ "فاحشۃ" کے معنی میں وسیع و عام ہونا چاہیئے برہنگی کے عالم میں طواف کرنا، پیشوایان ظلم وستم کی پیروی اس کے واضح مصداقوں میں سے ہوگا، اور یہ روایات کے خلاف بھی نہیں ہوگا۔

تفسیر نمونہ کی جلد اول سورۂ بقرہ آیۂ ۱۷۰ کے ذیل میں بزرگوں کے طریقہ اور رسوم پر بغیر کسی قید وشرط کے عمل کرنے کے بارے میں مفصل بحث کی گئی ہے ملاحظہ ہو۔

۲۹ قُلْ اَمَرَ رَبِّیْ بِالْقِسْطِ وَاَقِیْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۬ؕ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ ۝

۳۰ فَرِیْقًا هَدٰی وَفَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّیٰطِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَیَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

ترجمہ

۲۹ (اے میرے رسول!) کہہ دو کہ میرے پروردگار نے عدالت کا حکم دیا ہے اور ہر مسجد میں (اور وقتِ عبادت) اپنی توجہ اس کی طرف رکھو، اسے پکارو اور اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرو (اور یہ جان لو کہ) جس طرح اس نے تم کو آغاز میں پیدا کیا ہے (اسی طرح) تم حشر کے روز اس کی طرف) پلٹو گے۔

(۳۰) (خدا نے) کچھ لوگوں کی ہدایت کی اور کچھ لوگ (جن میں لیاقت نہیں ہے) ان کی گمراہی مسلم الثبوت ہے، (یہ وہ لوگ ہیں کہ) انھوں نے بجائے خدا کے شیطانوں کو اپنا ولی و سرپرست بنایا ہے، اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہدایت یافتہ ہیں۔

تفسیر

چونکہ گزشتہ آیت میں لفظ "فحشاء" (جس کے معنی ہر قسم کے بُرے کام کے ہیں) سے بحث کی گئی تھی، اور یہ تاکید کی گئی تھی کہ خدا ہرگز بُرے کام کا حکم نہیں دیتا لہٰذا اب اس آیت میں ایک مختصر جملے کے ذریعے پروردگارِ عالم کے ان فرائض بنیادی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن کا تعلق عملی ذمہ داری سے ہے۔ اس کے بعد اصول عقائد کی دو بنیادوں یعنی مبداء و معاد کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

ابتدا میں فرمایا گیا ہے: اے پیغمبر! ان سے کہہ دو کہ میرے پروردگار نے مجھے عدالت کا حکم دیا ہے (قل امر ربی بالقسط)۔

ہم جانتے ہیں کہ عدالت کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں تمام اعمال نیک آجاتے ہیں۔ کیونکہ عدالت کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کو اس کے محل و مقام پر رکھا جائے اور وہ جس لیے ہے اسے وہاں استعمال کیا جائے اگرچہ لفظ "عدالت" اور لفظ "قسط" میں فرق ہے۔ عدالت اسے کہتے ہیں کہ انسان ہر ایک کا حق ادا کر دے اس کے مدِمقابل دوسروں پر ظلم و ستم کرنا اور ان کے حقوق کا غصب کرنا ہے، لیکن "قسط" کے معنی یہ ہیں کہ کسی کا حق دوسرے کو نہ دے، یعنی تقسیم کرنے میں ایک دوسرے پر ترجیح نہ دے اور کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہ برتے، اس کے مدِمقابل یہ ہے کہ ایک کا حق دوسرے کو دے دے۔

لیکن ان دونوں کلموں کا وسیع مفہوم، خصوصاً جبکہ یہ الگ الگ استعمال کیے جائیں تقریباً بالکل مساوی ہے جس کے معنی ہر چیز اور ہر کام میں اعتدال برتنے اور ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھنے کے ہیں۔

اس کے بعد توحید پرستی اختیار کرنے اور ہر طرح کے شرک کے خلاف جنگ کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے: اپنے دل کو ہر عبادت میں اسی کی طرف متوجہ رکھنا اور اس کی ذات پاک سے منہ موڑ کر اور کسی طرف نہ مڑنا (و اقیموا وجوھکم عند کل مسجد)۔

اسے پکارو، اور اپنے دین و آئین کو اسی کے لیے خالص اور مخصوص کر دو (وادعوہ مخلصین له الدین)۔

توحید کے ستون کو مستحکم کرنے کے بعد مسئلہ معاد و محشر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے، "جس طرح تمہیں آغاز میں پیدا کیا، اسی طرح دوبارہ بروزِ قیامت تم پلٹ کر آؤ گے (کما بداکم تعودون)۔

راہِ اعتدال سے بھٹکنے کی روک تھام بھی کر دیتا ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ذرا تند لہجہ میں ان لوگوں کو جواب دیا گیا ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ زہد کے معنی یہ ہیں کہ زینتوں کو اپنے اوپر حرام کر دیا جائے، اور پاک وحلال رزق و روزی کو ترک کر دیا جاتے۔ تو یہ زہد و پارسائی کی نشانی اور مقرب بارگاہِ الٰہی ہونے کی علامت ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے: اے پیغمبر! پوچھو کس نے خدا کی ان زینتوں کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں اور کس نے اس کی نعمتوں اور پاک روزیوں کو حرام کیا ہے (قل من حرم زینة اللّٰہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق)۔

اگر یہ چیزیں بُری تھیں تو سرے سے اللہ انہیں پیدا ہی نہ کرتا، اور اب جبکہ اس نے ان چیزوں کو بندوں کے فائدہ کے لیے پیدا کیا ہے، کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں حرام کر دے؟ کیا خلقت کی فطرت اور شریعت کے احکام میں تضاد ممکن ہے؟

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے: ان سے یہ کہہ دو کہ یہ نعتیں باایمان لوگوں کے لیے اس دنیا میں خلق ہوئی ہیں، اگرچہ دوسرے افراد بھی لیاقت نہ ہونے کے باوجود ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن بروزِ آخرت اور اعلیٰ زندگی کے موقع پر جبکہ انسانوں کی صفوں کو چھانٹ کر کھوٹا کھرا الگ کیا جائے گا تب یہ سب نعمتیں اور لذتیں صرف باایمان اور نجات یافتہ افراد کو دی جائیں گی، دوسرے لوگ ان سے بالکل محروم ہو جائیں گے (قل ھی للذین اٰمنوا فی الحیٰوۃ الدنیا خالصة یوم القیامة)۔

بنا بریں وہ نعمتیں اور لذتیں جو دنیا میں بھی ان کے لیے پیدا کی گئی ہیں اور آخرت میں تو صرف انہی کے لیے ہیں کیونکر ممکن ہے کہ خدا انہیں حرام قرار دے دے، حرام وہ چیز ہوتی ہے جس میں کوئی ضرر ہو نہ کہ نعمت و مرحمت۔

اس آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ قدرت کے یہ عطیے اور نعمتیں اگرچہ دارِ دنیا میں رنج وتکلیف کے ساتھ مخلوط ہیں لیکن آخرت میں یہ نعمتیں ہر قسم کے رنج و اذیت سے خالص ہو کر مؤمنین کو ملیں گی (لیکن پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے)۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: ہم اپنی ان آیتوں اور احکام کی ان لوگوں کے لیے جو آگاہ ہیں اور سمجھتے ہیں تشریح کرتے ہیں (کذالک نفصل الاٰیات لقوم یعلمون)۔

اسلام کی نظر میں زیب و زینت کی حیثیت

ہر طرح کی زینتوں سے استفادہ کے بارے میں اسلام نے جیسا کہ اس کا رویّہ دوسری چیزوں میں ہے

راہِ اعتدال کو اختیار کیا ہے۔ نہ تو بعض لوگوں کی طرح یہ کہا ہے کہ زینت کرنا اور اپنے کو آراستہ کرنا چاہیے وہ حدِ اعتدال میں ہو، زہد و پارسائی کے خلاف ہے اور نہ ہی ان لوگوں کی تائید کی ہے جو جذبۂ تجمل پرستی کی وجہ سے طرح طرح کی زینتوں میں غرق ہیں اور اس غیر معقول امر کے لیے ہر ناشائستہ عمل بجا لاتے ہیں۔

اگر ہم انسان کے جسم و روح کی عمارت پر نظر کریں اور اس کے بعد ان تعلیمات کو دیکھیں جو ہمیں دی گئی ہیں تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام تعلیمات ہماری روح و جسم سے ہم آہنگ ہیں۔

اس امر کی توضیح اس طرح ہے کہ علمائے علم نفس کی یہ تحقیق ہے کہ ہر انسان کی روح میں چار احساس پائے جاتے ہیں: حسِ زیبائی، حسِ نیکی، حسِ دانائی اور حسِ مذہبی۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تمام ادبی محاسن، شعر و سخن میں حسن کی مدح، لطیف و حسین صنعتیں یہ سب اسی حسِ زیبائی کے نتیجے میں نمودار ہوئی ہیں۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک صحیح قانون اس فطری احساس کا گلا گھونٹ دے اور اس کے جو نتائج بد برآمد ہوں انہیں نظر انداز کر دے۔

یہی وجہ ہے کہ دینِ اسلام میں فطرت کے حسن و جمال، خوبصورت و مناسب لباس، طرح طرح کی خوشبوئیں اور اسی طرح کے دیگر جمالیات سے لطف اندوز ہونا نہ صرف جائز و مباح قرار دیا گیا ہے بلکہ ان امور کی ترغیب بھی دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں کثیر روایات کتب معتبرہ میں وارد ہوئی ہیں۔ چند ایک ہم بطورِ نمونہ ذکر کرتے ہیں:

امام حسن علیہ السلام کے حالات میں ہے کہ آپ جس وقت نماز کے لیے سجادہ پر کھڑے ہوتے تھے اپنا بہترین لباس زیب تن فرماتے تھے۔ جب حضرتؑ سے اس کے متعلق سوال کیا گیا تو فرمایا:

ان اللّٰہ جمیل یحب الجمال فاتجمل لربی و ھو یقول خذوا زینتکم عند کل مسجد۔

خدا جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے۔ اسی لیے میں حسین لباس اپنے پروردگار سے راز و نیاز کرنے کے لیے پہنتا ہوں اور خود اس نے یہ حکم دیا ہے کہ مسجد جاتے وقت اپنی زینت اختیار کر و۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک ریاکار زاہد جس کا نام عباد بن کثیر تھا راستے میں امام جعفر صادقؑ کو ملا۔ اس وقت امامؑ نسبتاً خوبصورت لباس پہنے ہوئے تھے۔ اس نے امامؑ سے کہا: آپ خاندانِ نبوت سے ہیں، آپ کے جد (حضرت علی علیہ السلام) تو بہت معمولی لباس پہنا کرتے تھے، آپ کے بدن پر یہ عمدہ لباس کیوں ہے؟ کیا بہتر نہ تھا کہ اس سے کم قیمت لباس پہنتے!

حضرت نے فرمایا: افسوس ہے تجھ پر اے عباد! کیا تُو نے قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی من حرم زینۃ اللّٰہ

---

[1] وسائل جلد سوم ابواب احکام الملابس۔

التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق (کس نے حرام کیا ہے ان زینتوں کو جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، اور پاکیزہ روزیوں کو)۔

اس سلسلہ میں دیگر روایات بھی وارد ہوئی ہیں۔

یہ تعبیر کہ خدا جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے، یا یہ کہ خدا نے اچھی چیزوں کو پیدا کیا ہے ان سب سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ہر طرح کے جمال سے استفادہ کرنا ممنوع ہوتا تو خدا ہرگز ان کو پیدا نہ کرتا۔ اس جہان میں ہر طرف حُسنِ فطرت کا پایا جانا خود اس بات کی دلیل ہے کہ حتالق حُسن، حُسن کو پسند کرتا ہے۔

اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ ایسے امور میں عام طور سے لوگ راہِ افراط اختیار کرتے ہیں اور مختلف بہانوں سے تجمل پرستی اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا قرآن اس حکم اسلامی کو بیان کرنے کے بعد بلا فاصلہ اسراف و زیادہ روی اور حد سے تجاوز کرنے سے مسلمانوں کو خبردار کرتا ہے۔ قرآن میں بیس مقامات سے زیادہ مسئلہ اسراف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اس کی مذمت کی گئی ہے (اسراف کے متعلق ہم آئندہ آنے والی آیات میں تفصیلاً گفتگو کریں گے)۔

بہرحال اسلام و قرآن کا ردیّہ اس معاملہ میں موزوں اور اعتدال پسندانہ ہے۔ نہ تو جمود ہے نہ ہی حُسن پرستی کا ایسا میلان ہے جس کی وجہ سے روحِ انسانی ضائع ہو جائے، نہ ہی اسراف کرنے والوں اور تجمل پرستوں اور زیادہ کھانے والوں کے عمل کی تائید و تصدیق کی گئی ہے۔ خاص طور پر ان معاشروں میں جہاں محروم اور غریب طبقہ موجود ہو وہاں معتدل زینتوں سے بھی روکا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض روایات میں ملتا ہے کہ جب بعض آئمہ سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ لباس فاخر کیوں پہنتے ہیں جبکہ آپ کے جد حضرت علی علیہ السلام ایسا لباس نہیں پہنتے تھے؟ تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا:

اس زمانہ میں لوگ مالی سختی میں مبتلا تھے لہٰذا ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا لیکن ہمارے زمانہ میں لوگوں کی مالی حالت بہتر ہے لہٰذا اس زمانہ میں ان زینتوں سے (ایک معقول حد تک) استفادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

تندرستی کے بارے میں ایک اہم فرمان

مذکورہ بالا آیت میں۔ کلوا واشربوا ولا تسرفوا۔ اور کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو۔ یہ جملہ جو آیا ہے اگرچہ بادی النظر میں ایک سادہ جملہ معلوم ہوتا ہے، لیکن آج کی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ حفظانِ صحت کے اہم اصولوں میں سے ایک زبردست اصول ہے۔ کیونکہ آج کل کے اطبا، تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۳ ابواب احکام ملابس باب ، حدیث ۴۔

پہنچے ہیں کہ بہت سی بیماریوں کی جڑ وہ اضافی غذائیں ہیں جو بدن انسانی میں جذب نہ ہونے کی وجہ سے باقی رہ جاتی ہیں۔ یہ غیر ضروری مادّے قلب کے لیے بھی بار سنگین بن جاتے ہیں اور دوسرے اعضاء پر بھی اپنا بُرا اثر چھوڑتے ہیں۔ بہت سی بیماریوں اور گندگیوں سے جسم کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ لہٰذا اس کے تدارک کے لیے پہلا قدم یہی ہے کہ یہ غیر ضروری مادّے (جو فی الحقیقت جسم کے کارخانہ میں کوڑا کرکٹ کی حیثیت رکھتے ہیں) جلا دیئے جائیں اور اس طرح جسم کے اندرونی حصّے کی صفائی عمل میں آجائے۔

اس ضرر رساں مواد کے جمع ہونے کا اصلی سبب یہی کھانے میں زیادتی ہے جسے "پُرخوری" کہا جاتا ہے۔ اسے روکنے کے لیے سوائے خوراک میں میانہ روی کے اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔ بالخصوص ہمارے زمانہ میں جبکہ طرح طرح کی بیماریاں پھیل گئی ہیں جیسے "ذیابیطس"۔ "چربی خون" و "تصلب شرائین" (رگوں کا سخت ہو جانا) خرابی جگر، طرح طرح کے سکتے (فالج) اور اسی طرح کی دیگر بیماریاں بہت زیادہ ہو گئی ہیں ان سب کو اگر ہم دیکھیں تو ان کی تہ میں عدم نقل و حرکت کے ساتھ "پُرخوری" کا ہاتھ نظر آئے گا جس کا علاج صرف یہی ہے کہ کافی حرکت کی جائے اور خوراک کے معاملہ میں اعتدال برتا جائے۔

ہمارے ایک بزرگ مفسّر علامہ طبرسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر مجمع البیان میں ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ہارون رشید کے دربار میں ایک عیسائی طبیب تھا جس کی بڑی شہرت تھی۔ ایک روز اس طبیب نے ایک عالم سے یہ کہا کہ تمہاری آسمانی کتاب میں مجھے طب کا کوئی ذکر نہیں ملتا جبکہ مفید علم دو ہی ہیں، علم ادیان اور علم ابدان۔ عالم نے اس کے جواب میں کہا کہ خدا وند کریم نے تمام احکام طبی کو آدھی آیت میں سمو دیا ہے جہاں فرمایا ہے: "کلوا واشربوا ولا تسرفوا": "کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو" نیز ہمارے پیغمبرؐ نے بھی طب کو اپنے اس ارشاد میں مختصراً بیان کر دیا ہے:
>
> المعدة بیت الادوآء والحمیة رأس کل دوآء واعط کل بدن ما عودة۔
>
> "یعنی معدہ تمام بیماریوں کا گھر ہے اور پرہیز ہر دوا کی بنیاد ہے، اور بدن کو جو (مناسب) عادت ڈالی ہے اسے اس سے مت روکو۔"
>
> عیسائی طبیب نے جب یہ سنا تو کہا:
>
> ما ترک کتابکم ولا نبیکم لجالینوس طبا۔
>
> یعنی تمہارے قرآن اور تمہارے پیغمبر نے جالینوس (مشہور طبیب) کیلئے کچھ نہیں چھوڑا۔

جو لوگ اس حکم کو ایک معمولی حکم خیال کرتے ہیں، بہتر ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اسے آزمائیں تاکہ اس کی اہمیت و گہرائی کا انہیں اندازہ ہو جائے اور اس قانون پر عمل کرنے کا معجزنما اثر ان کے سامنے ظاہر ہو جائے۔

(۳۳) قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ
الْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ
بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

(۳۳) کہہ دو کہ میرے پروردگار نے صرف بُرے کاموں کو، چاہے وہ آشکارا ہوں یا پنہاں، حرام کیا ہے' اور (اسی طرح) گناہ و ناحق ستم کو (حرام کیا ہے)، اور یہ کہ اس چیز کو خدا کا شریک ٹھہراؤ جس کی کوئی دلیل خدا نے نازل نہیں کی، اور خدا کے متعلق وہ بات کہو جو نہیں جانتے (ان تمام باتوں کو اس نے حرام کیا ہے)۔

تفسیر

محرّماتِ الٰہی

قرآنی اسلوب میں ہم نے متعدد بار یہ دیکھا کہ جب بھی قرآن نے کسی امر مباح یا امر لازم کے متعلق گفتگو کی ہے تو فوراً اس کے بعد اس کے نقطۂ مقابل یعنی بد اعمالیوں اور محرمات کا بھی ذکر چھیڑ دیا ہے۔ تاکہ دونوں بحثیں آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ بنیں۔ چنانچہ اس مقام پر بھی عنایات الٰہی اور زینتوں کے استعمال کی اجازت اور ان کی نفیٔ تحریم کے بعد محرمات کا ذکر شروع کر دیا ہے۔ پہلے حرمت کی عمومی بات ہے اور اس کے بعد خاص طور سے چند اہم نکتوں کی نشاندہی کی ہے۔ ابتداء میں "فواحش" کی تحریم کو بیان کیا گیا ہے، فرماتا ہے: اے پیغمبر! کہہ دو میرے پروردگار نے صرف بُرے کاموں کو حرام کیا ہے چاہے وہ آشکارا ہوں یا پنہاں (قل انما حرم ربی الفواحش ما ظهر منها وما بطن)۔

"فواحش" جمع ہے "فاحشۃ" کی جس کے معنی ہیں "انتہائی بُرا کام" اور ہر بُرے کام کو "فاحشۃ" نہیں کہتے۔ اس بات کی تاکید کہ وہ گناہ چاہے آشکارا ہو یا پنہاں شاید اس وجہ سے کی گئی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا یہ دستور تھا کہ اگر وہ کوئی بُرا کام خلوت میں کرتے تو اس میں کوئی عیب خیال نہیں کرتے تھے لیکن وہ ظاہر ہو جاتا تو اس کو بُرا جانتے تھے۔

اس کے بعد موضوع کو عام کرکے تمام گناہوں کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا (والاثم)۔

"اثم" اصل میں ہر اس کام کو کہتے ہیں جو نقصان دہ ہو اور انسان کو اس کی حیثیت سے گرانے کا سبب بنے اور اسے ثواب اور جزائے خیر تک پہنچنے سے روکے۔ اس بنا پر ہر طرح کا گناہ "اثم" کے وسیع مفہوم میں داخل ہے۔

لیکن بعض مفسرین نے "اثم" کے معنی اس مقام پر صرف "شراب" کے لیے ہیں اور شاہد میں یہ شعر پیش کیا ہے:

شربت الاثم حتی ضل عقلی کذاک الاثم یصنع بالعقول[1]

میں نے اس قدر اثم (شراب) پی کہ میری عقل زائل ہوگئی، اور شراب عقلوں کے ساتھ یہی سلوک کرتی ہے۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ معنی مفہوم "اثم" کا تمام مفہوم نہیں ہے بلکہ اس کا ایک اہم مصداق ہے۔

بعد ازاں ایک مرتبہ پھر چند بڑے گناہوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے: اور ہر طرح کا ستم اور دوسروں کے حقوق پر ناحق تجاوز کرنا (حرام ہے) (والبغی بغیر الحق)۔

"بغی" کے معنی کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنے کے ہیں لیکن عام طور پر اس کا استعمال کسی دوسرے کی چیز ناجائز طور پر چھیننے کے لیے ہوتا ہے لہٰذا اس کا مفہوم غالباً ظلم و ستم کے مفہوم کے مساوی ہوتا ہے۔ لہٰذا "بغی" کے بعد "غیر الحق" مزید تاکید و توضیح کے لیے ہے۔

اس کے بعد مسئلہ شرک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: اے رسول! کہہ دو میرے پروردگار نے یہ بھی حرام کیا ہے کہ کسی چیز کو بغیر دلیل کے اس کا شریک بناؤ (وان تشرکوا باللہ مالم ینزل بہ سلطاناً)۔

یہاں بھی یہ بات واضح ہے کہ "مالم ینزل بہ سلطاناً" اس بات کی تاکید اور توضیح کے لیے ہے کہ مشرکین نے جو خدا کے شریک بنائے ہیں ان پر کوئی دلیل منطقی یا تائید عقلی قائم نہیں ہے۔ "سلطان" کے معنی ہر قسم کی دلیل اور گواہ کے ہیں جس کی وجہ سے انسان کو اپنے مخالف پر کامیابی حاصل ہو۔

محرمات میں سے آخری چیز جس کا آیت نے ذکر کیا ہے وہ ہے "بغیر جانے بوجھے خدا کی طرف کسی بات کی نسبت دینا" (وان تقولوا علی اللہ مالا تعلمون)۔

بغیر علم کے کوئی بات کہنا، اس کے متعلق ہم نے اسی سورہ کی آیت ۲۸ میں گفتگو کی ہے۔ آیات قرآنی اور روایات اسلامی میں اس بات کی بڑی تاکید کی ہے کہ مسلمان کو ایسی بات نہیں کہنا چاہیئے جس کا علم نہ ہو۔ یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی گئی ہے آپ نے فرمایا:

من افتی بغیر علم لعنتہ ملآئکۃ السموات والارض۔

---

[1] تفسیر تبیان در ذیل آیت مورد بحث و تاج العروس مادہ "اثم"۔

جو شخص بغیر علم کے فتویٰ دیتا ہے اس پر آسمان و زمین کے فرشتے لعنت بھیجتے ہیں [1]

اگر ہم انسانی معاشروں کی وضعیت اور ان بدبختیوں کا بنظرِ غائر مطالعہ کریں جو بشریت کا دامن پکڑے ہوئے ہیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان بدبختیوں کا زیادہ حصہ افواہ سازی، بغیر علم کے بات کہنے، ناحق گواہی دینے، بغیر مدرک و دلیل کے اظہار رائے کا مرہونِ منت ہے۔

۳۴ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ○

ترجمہ

۳۴ ہر قوم و ملت کے لیے ایک (معین) مدت اور زمانہ ہے، جب بھی ان کی مدت ختم ہو جائے گی تو وہ لوگ نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹ سکیں گے نہ آگے بڑھ سکیں گے۔

تفسیر

ہر گروہ کا ایک انجام ہے

اس آیت میں خداوند کریم قوانینِ آفرینش میں سے ایک اہم قانون، فنا و نیستی کا ذکر فرماتا ہے۔ فرزندانِ آدم کی روئے زمین پر زندگی سے متعلق جو بحثیں ہوتی ہیں پھر آخرِ امر میں گنہگاروں کا جو انجامِ بد گزشتہ آیات میں دکھلایا گیا ہے یہ سب اس بحث سے واضح ہو جائے گا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ہر امت کے لیے ایک زمانہ و مدتِ معین مقرر کی گئی ہے (ولکل امة اجل)۔

اور جس وقت یہ مدت پوری ہو جائے گی تو پھر ایک لحظہ کے لیے وہ اس سے بڑھ سکیں گے نہ پیچھے ہٹ سکیں گے (فاذا جآء اجلھم لا یستأخرون ساعة ولا یستقدمون)۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تمام قومیں بھی افراد کی طرح قانونِ موت و حیات سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ کچھ قومیں توصفحۂ ہستی سے نابود ہو جاتی ہیں پھر ان کے بجائے دوسری قومیں آجاتی ہیں۔ لہٰذا قانونِ فنا سے نہ افراد الگ ہیں نہ قومیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ قوموں کی موت زیادہ تر اس وجہ سے واقع ہوتی ہے کہ وہ لوگ راہِ حق و عدالت سے منحرف ہو جاتے ہیں، ظلم و ستم کا راستہ اختیار کرتے ہیں، شہوت رانی و خواہشات کے دریا میں غرق ہو جاتے

[1] عیون اخبار الرضا نقل از تفسیر نور الثقلین، جلد دوم ص ۲۹۔

ہیں، تجمل پرستی، تن پروری کی موجوں میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

جب دُنیا کی کوئی قوم ان راستوں پر آنکھیں بند کرکے چل پڑے اور مسلم الثبوت قوانین فطرت کو پس پشت ڈال دے تو اس کا قہری نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ وہ اپنے سرمایۂ ہستی کو کھو بیٹھے گی اور تباہی کے گڑھے میں ہمیشہ کے لیے جا گرے گی۔ اگر مختلف قوموں کے تمدنوں کا مطالعہ کیا جائے جیسے بابل، فراعنۂ مصر، قوم سبا، کلدانی، آشوری، مسلمانانِ اُندلس اور اسی طرح کی دوسری قومیں تو معلوم ہوگا کہ جب ان کی کج رویاں اور سرکشیاں حد سے بڑھ گئیں تو ان کی نابودی کا فرمان آسمان سے نازل ہوگیا۔ پھر ایک گھڑی کے لیے بھی وہ اپنی حکومت کے لرزاں ستونوں کو باقی نہ رکھ سکے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ عربی میں لفظ "ساعت" کم ازکم وقت کے لیے بولا جاتا ہے، کبھی ایک "پل" کے لیے اور کبھی زمانہ کی ایک کم مقدار کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ آج کل شب و روز کے چوبیسویں حصّہ (ایک گھنٹہ) کو "ساعت" کہتے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

بعض خود ساختہ مذہب جو اس زمانہ میں رونما ہوئے ہیں، انہوں نے اپنے مقاصدِ شوم تک پہنچنے کیلئے یہ ضروری خیال کیا ہے کہ سب سے پہلے پیغمبرِ اسلامؐ کی خاتمیت پر بخیال خود ضرب کاری لگا کر اسے متزلزل کردیا جائے بنا بریں انہوں نے قرآن کریم کی بعض آیتوں کو مغالطے اور تفسیر بالرائے کے ذریعہ اپنے مقصد پر منطبق کرنے کی ناکام کوشش کی ہے چنانچہ آیت موردِ بحث سے بھی انہوں نے اپنا مطلب نکالنا چاہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے کہا ہے کہ ہر اُمّت کا ایک اختتام اور انجام ہوتا ہے اور امت سے مراد مذہب ہے، بنا بریں مذہب اسلام کا بھی خاتمہ ہونا چاہیئے۔

اس غلط استدلال کی حقیقت سمجھنے کے لیے بہتر ہے کہ لفظ "اُمّت" کے معنی پہلے لُغت میں اس کے بعد قرآن میں تلاش کیے جائیں۔

جس وقت لُغت کی کتابوں کو دیکھا گیا، نیز قرآن میں اس لفظ "اُمّت" کے استعمال کو دیکھا گیا جو ۶۴ مرتبہ آیا ہے تو معلوم ہوا کہ دونوں میں اس کے معنی مجمع اور گروہ کے ہیں۔

مثلاً حضرت موسیٰؑ کی داستان میں ہے:

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ۔

جب وہ مدین کے گھاٹ پر پہنچے تو وہاں انہوں نے ایک مجمع کو دیکھا کہ وہ (اپنے لیے اور اپنے جانوروں کے لیے) پانی کھینچنے میں مشغول ہے۔[1]

---

[1] سورہ قصص آیت ۲۳۔

نیز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں یہ آیت ملتی ہے :

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ ۔

تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے جو (لوگوں) کو خیر کی دعوت دے۔[1]

نیز یہ آیت بھی ہے :

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۔

ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ قبیلوں اور گروہوں میں تقسیم کیا۔[2]

یہ آیت بھی قرآن میں ہے :

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ ۔

ایک گروہ (جو بنی اسرائیل میں سے تھا اور شہر ایلہ میں سکونت رکھتا تھا اس) نے کہا: ان لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو خدا (ان کے گناہوں کی وجہ سے) ہلاک کرنے والا ہے ...[3]

ان تمام آیتوں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "امۃ" قرآن کریم میں جہاں بھی آیا ہے وہ گروہ اور مجمع کے معنی میں آیا ہے، نہ کہ مذہب یا پیروانِ مذہب کے معنی میں اور کہیں پیروانِ مذہب پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے تو وہ بھی اس وجہ سے ہے کہ وہ بھی ایک گروہ ہوتا ہے۔ بنا بریں مورد زیر بحث آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہر گروہ کا ایک وقت میں خاتمہ ہو گا یعنی صرف افراد ہی الگ الگ نہیں مریں گے بلکہ "من حیث القوم" بھی ان کے لیے موت و فنا برحق ہے۔ ان کی جمعیت بھی ایک وقت میں پراگندہ ہو جائے گی۔ بہر حال اصولی طور پر کہیں بھی لفظ "اُمّت" کا اطلاق مذہب پر نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا زیر بحث آیت کسی لحاظ سے بھی مسئلہ خاتمیت سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔[4]

---

[1] سورہ آل عمران آیت ۱۰۴۔

[2] سورہ اعراف آیت ۱۶۰۔

[3] سورہ اعراف آیت ۱۶۴۔

[4] بلکہ قرآن و حدیث میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم نبوت ہونے کی ناقابلِ تردید نصوص موجود ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے :

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۔

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں وہ تو اللہ کے رسول ہیں اور انبیاء کا اختتام کرنے والے ہیں (احزاب ۴۰)۔

نیز رسول اللہؐ کی حدیث متواتر کہ آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام سے خطاب کر کے فرمایا :

"انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی"

اے علی! تمہاری نسبت مجھ سے وہی ہے جو ہارون کی نسبت موسیٰ سے تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

(صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب غزوۂ تبوک، و صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابۃ)۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

(۳۵) يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○

(۳۶) وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

ترجمہ

(۳۵) اے آدم کی اولاد! اگر تمہارے پاس تم میں سے رسول آئیں اور وہ میری آیتیں تمہارے لیے پڑھیں (تو ان کی پیروی کرنا) کیونکہ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں اور عمل صالح بجا لائیں، (اور اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی کوشش کریں)، تو ان کے لیے نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(۳۶) اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں تکبر کریں گے وہ دوزخی ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

بقیہ گذشتہ حاشیہ: علاوہ بریں یہ حدیث بھی صحیح بخاری میں موجود ہے:

ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنیٰ بیتا فاحسنہ واجملہ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ ویعجبون لہ ویقولون: ھلا وضعت ھذہ اللبنۃ فقال: فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین۔

میری اور دیگر انبیاء کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک بہت اچھا اور عمدہ مکان بنایا ہو لیکن اس میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی ہو تو لوگ اس کے چاروں طرف پھر کر دیکھیں گے اور تعجب سے کہیں گے کہ یہ ایک اینٹ کیوں نہ لگائی۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا میں وہ آخری اینٹ ہوں اور نبیوں کا آخری ہوں۔

(صحیح بخاری کتاب بدء الخلق باب خاتم النبیین) (مترجم)

ﮯ "اِمّا" دراصل "ان" و "ما" سے مرکب ہے۔ "ان" حرف شرط ہے اور "ما" برائے تاکید شرط ہے۔

تفسیر

فرزندانِ آدم کیلئے ایک اور فرمان

بار دیگر خدا وندِ عالم فرزندانِ آدم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے اولادِ آدم! اگر تم میں سے کچھ رسول (ہماری طرف سے)، تمہارے پاس آئیں، جو ہماری آیتوں کو تمہارے سامنے پیش کریں تو ان کی پیروی کرنا، کیونکہ جو لوگ تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرتے ہیں اور اپنی اور دوسروں کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں انہیں الٰہی عتاب و سزا کا نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی کوئی غم و اندوہ ہوگا (یا بنی آدم اما یأتینکم رسل منکم یقصون علیکم اٰیاتی فمن اتقیٰ واصلح فلا خوف علیهم ولا هم یحزنون)۔

اس کے بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں اور ان کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے وہ اصحاب دوزخ ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے (والذین کذبوا باٰیاتنا واستکبروا عنها اولٰئك اصحاب النار هم فیها خالدون)۔

ایک اور سازش کا جواب

جیسا کہ ہم نے سابقہ سطور میں بیان کیا کہ قرونِ آخر کے کچھ دین ساز گروہ، اپنی غلط کاریوں کیلئے راہ ہموار کرنے کے لیے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ قرآن کی کچھ آیتوں کے غلط معنی کرکے مسئلہ خاتمیت پر اپنے مدعیٰ کے مطابق استدلال کریں حالانکہ ان آیات کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ان آیات میں ایک آیت وہ ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے۔ بغیر اس کے کہ آیت کا سیاق و سباق دیکھیں وہ کہتے ہیں: اس آیت میں لفظ "یأتینکم" جو فعل مضارع ہے اور جس کے معنی ہیں "تمہارے پاس آئے گا" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آئندہ بھی کچھ پیغمبر آسکتے ہیں ان کا سلسلہ منقطع نہیں ہوا ہے۔

لیکن اگر ہم تھوڑا پلٹ کر دیکھیں اور ان آیات پر نظر کریں جن میں خلقتِ آدم، ان کی بہشت میں سکونت پھر بہشت سے ان کا اور ان کی زوجہ کا نکالا جانا بیان کیا گیا ہے، اور اس کا بھی لحاظ کریں کہ ان آیات میں مسلمان مخاطب نہیں ہیں بلکہ یہاں تمام انسانی معاشرے سے خطاب ہے، تو اس شبہ کا جواب واضح ہو جائے گا۔ کیونکہ اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ تمام فرزندانِ آدم کے لیے بہت رسول آئے جن میں سے بہت سوں کا نام قرآنِ کریم میں لیا گیا ہے اور بہتوں کا نام کتبِ تاریخ میں ثبت ہے۔

لیکن ان نیا مذہب گھڑنے والے افراد نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے پچھلی آیات کو نظر انداز کر دیا

ہے اور اس آیت کا مخاطب صرف مسلمانوں کو قرار دیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ دوسرے رسولوں کے آنے کا ابھی امکان پایا جاتا ہے۔

اس طرح مغالطے سابقاً بھی بہت ہوتے ہیں خصوصاً ان لوگوں کے درمیان جو کسی آیت یا اس کے ایک حصّہ کو بقیہ سے جدا کرکے من مانے معنی نکالتے ہیں، اور اس سے قبل و بعد سے ان کو کوئی غرض نہیں ہوتی چاہے مفہوم برعکس ہو جائے۔

(۳۷) فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ

(۳۷) ان لوگوں سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو خدا پر بہتان باندھیں، یا اس کی آیتوں کی تکذیب کریں! یہ لوگ جو کچھ ان کے مقدر میں ہے (اس جہان کی نعمتوں میں سے) اس سے اپنا نصیبہ پائیں گے، یہاں تک کہ ہمارے فرستادہ (قبض ارواح کے فرشتے) انہیں لینے آ جائیں گے اور جانوں کو قبض کریں گے اور ان سے پوچھیں گے: کہاں ہیں تمہارے وہ معبود جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے؟ (وہ آج تمہاری مدد کو کیوں نہیں آتے؟) وہ کہیں گے کہ وہ (سب آج) گم ہو گئے (اور ہم سے دُور ہو گئے) اور وہ اپنے برخلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔

تفسیر

اس آیت اور اس کے بعد والی آیات میں ان لوگوں کے انجام بد کے کچھ حالات بیان کیے گئے

ہیں جو خدا پر افترا و بہتان باندھتے ہیں اور خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ مرنے کے بعد ان کی کیا حالت ہوگی، کون شخص ان لوگوں سے زیادہ ظالم ہے جو خدا پر بہتان لگاتے ہیں، یا اس کی آیتوں کو جھٹلاتے ہیں (فمن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذبا او کذب بآیاتہ)۔

جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت ۲۱ کی تفسیر میں ہم نے اشارہ کیا کہ قرآن کی متعدد آیتوں میں۔ ظالم ترین افراد۔ کا مختلف طریقوں سے ذکر کیا گیا ہے لیکن جب ان کی ان صفات کو دیکھا جاتا ہے جو بیان کی گئی ہیں تو سب کی اصل ایک نظر آتی ہے اور وہ ہے شرک و بُت پرستی اور پروردگار کی آیتوں کی تکذیب۔ زیر بحث آیت میں ان کے علاوہ خدا پر تہمت و افتراء کا بھی اضافہ کیا گیا ہے جس کا ان لوگوں کی ایک نمایاں صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

اگر اس نکتہ کی طرف توجہ کی جائے کہ تمام بدبختیوں کی جڑ شرک ہے اور تمام سعادتوں کی اصل توحید ہے، تو اس سے واضح ہو جائے گا کہ یہ لوگ جو گمراہ و گمراہ کنندہ ہیں، کس بنا پر ظالم ترین افراد ہیں۔ یہ اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور اس معاشرہ پر بھی ظلم کرتے ہیں جس کا یہ حصہ ہیں، کیونکہ یہ ان میں نفاق و افتراق کا بیج بو کر وحدت، ترقی اور اصلاحِ بشر کے راستہ پر ایک بہت بڑا سنگِ راہ بن جاتے ہیں[1]

بعد ازاں، وقت مرگ ان کی حالت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے: یہ لوگ چند روز کے لیے جتنا ان کے مقدر میں ہے اس سے اپنا حصہ حاصل کرتے ہیں اور اللہ کی مختلف نعمتوں سے اپنے نصیب بھر بہرہ ور ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان کی عمر کا جام لبریز ہو جاتا ہے اور اجل آ جاتی ہے ایسے موقع پر موت کے فرشتے جو ان کی روحیں لے جانے کے لیے مقرر ہیں وہ ان کے سر پر نازل ہو جاتے ہیں (اولئک ینالھم نصیبھم من الکتاب حتّٰی اذا جآئتھم رسلنا یتوفونھم)۔

جملۂ بالا میں لفظ "کتاب" سے مراد اللہ کی وہ نعمتیں ہیں جو اس نے اپنے بندوں کے لیے مقرر فرمائی ہیں اگرچہ بعض مفسرین نے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد "الٰہی پاداشِ عمل" ہے یا ان دونوں سے اعم معنی مراد ہیں۔ لیکن اگر لفظ "حتّٰی" پر توجہ کی جائے جو عام طور سے وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کسی چیز کے اختتام کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو تو معلوم ہوگا کہ "کتاب" سے مراد یہی دنیا کی گوناگوں نعمتیں ہیں جن میں نیکوکار و بدکار دونوں طرح کے افراد کا حصہ مقرر ہے مرتے وقت جن کا خاتمہ ہو جاتا ہے نہ کہ مجازاتِ الٰہی جن کا خاتمہ مرتے وقت نہیں ہوتا، ان نعمتوں کی تعبیر لفظ "کتاب" سے اس لیے کی گئی ہے کہ ان کو ان مسائل سے شباہت حاصل ہے جن کا حصہ رسد مقرر ہوتا ہے اور رجسٹر ریکارڈ بک میں اس کا اندراج کیا جاتا ہے۔

بہر حال مرنے کے ساتھ ہی ان کی پاداشِ عمل شروع ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے موت کے فرشتے

---

[1] مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ ملاحظہ فرمائیں (صفحہ ۳ اردو ترجمہ)

ان کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں اور - ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہارے وہ معبود کہاں ہیں خدا کو چھوڑ کر تم جن کی پرستش کرتے تھے - اور تمام عمر ان کی پرستش کا دم بھرتے تھے اور اپنی تمام چیزوں کو ان پر قربان کرتے تھے (قالوآاین ماکنتم تدعون من دون اللہ)۔

وہ جب یہ دیکھیں گے کہ جو کچھ ان کے پاس تھا وہ ختم ہو گیا ہے اور جو امیدیں ان خودساختہ خداؤں سے باندھ رکھی تھیں وہ سب خاک ہو گئی ہیں تو وہ جواب میں کہیں گے : - وہ سب گم ہو گئے اور ہم سے دُور ہو گئے - اب ہمیں ان کا کوئی نشان نہیں ملتا ، نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ وہ یہ عذاب ہم سے دُور کر سکیں اور ہماری تمام عبادتیں جو ان کے لیے تھیں وہ سب بے سود ثابت ہوئیں (قالوا ضلوا عنا)۔

اور " اس طرح وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے (و شہدوا علیٰ انفسہم انہم کانوا کافرین)۔

اگرچہ اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فرشتے ان سے صرف سوال کریں گے اور وہ جواب دیں گے ، لیکن فی الحقیقت یہ ان کی ایک نفسیاتی کیفیت ہو گی مقصد یہ ہے کہ ان کی جو خراب حالت مرنے کے بعد ہونے والی ہے وہ انہیں یاد دلائی جائے کہ کس طرح انہوں نے ایک عمر غلط راستہ پر گزار دی اور اپنا تمام سرمایۂ وجود تباہ کر دیا اس کے عوض انہیں کچھ بھی نہ ملا ۔ پلٹنے کا راستہ بھی ان کے لیے بند ہو گیا اور یہ ان کے کیفرِ اعمال کا پہلا تازیانہ ہے جو اللہ کی طرف سے ان کی روح پر لگایا جائے گا۔

۳۸ قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ
فِي النَّارِ ۖ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا ۖ حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا
جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرَاهُمْ لِأُولَاهُمْ رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَآتِهِمْ
عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ۖ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا تَعْلَمُونَ ۝
۳۹ وَقَالَتْ أُولَاهُمْ لِأُخْرَاهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ ۝ع

ترجمہ

۳۸ (خداوند کریم ان سے) کہے گا : جنوں اور انسانوں میں سے جو تم سے پہلے تھے (اور

وہ بد اعمالی میں تم جیسے تھے) ان کے ہمراہ تم بھی آگ میں داخل ہو جاؤ، جب بھی ایک گروہ (آگ میں) داخل ہوگا تو وہ دوسرے گروہ پر لعنت بھیجے گا تاکہ سب ذلت کے ساتھ اس میں باقی رہیں۔ (اس ہنگام) پیروی کرنے والا گروہ اپنے پیشواؤں کے متعلق کہے گا: خدایا! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا لہٰذا آگ کے عذاب کو ان کے لیے دوگنا قرار دے (ایک عذاب خود ان کی گمراہی کے بدلہ میں دوسرا عذاب ہم کو گمراہ کرنے کے بدلہ میں۔ خدا) کہے گا کہ تم میں سے ہر ایک کے لیے دوگنا عذاب ہے لیکن تم نہیں جانتے (کیونکہ پیروی کرنے والے اگر پیشواؤں کے چاروں طرف اکٹھا نہ ہوتے تو وہ دوسروں کو گمراہ نہ کر پاتے)۔

۳۹ پیشوا اپنے پیروؤں سے کہیں گے تمہیں ہم پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے پس عذاب (الٰہی) کا مزہ (اس عمل) کے بدلے میں چکھو جو تم نے انجام دیا ہے۔

تفسیر

دوزخ میں پیشواؤں اور پیروؤں کا جھگڑا

ان آیتوں میں بھی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام بد ہونے والا ہے اسے بیان کیا گیا ہے۔ پچھلی آیتوں میں وقتِ مرگ ان لوگوں کو جو کچھ پیش آنے والا ہے اسے بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں گمراہ کرنے والوں اور گمراہ ہونے والوں میں جو جھگڑا ہوگا اسے بیان کیا گیا ہے: قیامت کے روز خدا ان سے کہے گا کہ جنّوں اور انسانوں کا جو گروہ تم جیسا تم سے پہلے گزرا ہے ان کے ساتھ آتشِ جہنم میں داخل ہو جاؤ (قال ادخلوا فی امم قد خلت من قبلکم من الجن والانس فی النار)۔

ہو سکتا ہے کہ یہ فرمان ایک فرمانِ تکوینی ہو۔ یعنی خدا ان دونوں گروہوں کو آتشِ جہنم میں جگہ ٹھہرائے گا، یا یہ کہ یہ فرمان تشریعی کے مشابہ ہو جسے وہ اپنے کانوں سے سنیں گے اور مجبوراً اس کی اطاعت کریں گے۔

جس وقت وہ دوزخ میں داخل ہوں گے تو جو لوگ ان کے ہم کیش اور ہم مسلک ہیں ان سے ان کا جھگڑا شروع ہوگا۔ ایک عجیب و عبرت انگیز جھگڑا۔ ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو دوسرے گروہ پر

لعنت کرے گا اور اسے اس بدبختی کا ذمہ دار ٹھہرائے گا" (کلما دخلت امة لعنت اختها)۔

ہم نے یہ بات پہلے بھی کئی بار کہی ہے کہ قیامت کا منظر اس دُنیا کی عکاسی کرے گا۔ اس دنیا میں بھی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک گروہ اپنے برخلاف گروہ سے برسرپیکار ہوجاتا ہے اور ایک دوسرے سے اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے برعکس پیغمبرانِ الٰہی اور اللہ کے نیک اور مصلح بندے جب بھی آئے انہوں نے ایک دوسرے کی تائید کی اور یہ بتلایا کہ ہم سب کا مقصد ایک ہی ہے۔

مطلب یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ جب سب کے سب بڑی ذلت و خواری کے ساتھ دوزخ کے شرر بار شعلوں میں پہنچ جائیں گے تو ایک دوسرے کی شکایت خدا کی بارگاہ میں کرنے لگ جائیں گے۔ سب سے پہلے فریب خوردہ افراد جب اپنے لیے راہ نجات ہر طرف سے بند پائیں گے تو یہ شکایت کریں گے: پروردگارا! ان گمراہ کرنے والوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، خدایا! ان کے عذاب کو دوگنا کردے، ایک عذاب خود گمراہ ہونے کی وجہ سے، دوسرا عذاب ہمیں گمراہ کرنے کی وجہ سے" (حتّٰی اذا ادارکوا فیها جمیعًا قالت اخرٰىهم لاولٰىهم ربنا هٰؤلاء اضلونا فاٰتهم عذابًا ضعفًا من النار)۔

اس میں شک نہیں کہ ان کی یہ درخواست بالکل صحیح و منطقی ہے، بلکہ اگر ان کی یہ درخواست نہ بھی ہو تب بھی گمراہ کرنے والے دوسرے عذاب کے مستحق ہیں کیونکہ وہ ان کا بار بھی اپنے کاندھے پر اٹھائیں گے جن کو انہوں نے گمراہ کیا تھا اور ان کے اپنے عمل کا عذاب بھی کم نہ ہوگا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کے جواب میں یہ کہا جائے گا: تم دونوں گروہوں کا عذاب دوگنا ہے لیکن تم نہیں جانتے کہ ایسا کیوں ہے" (قال لکل ضعف ولٰکن لا تعلمون)۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اتباع کرنے والوں کا عذاب کیوں دوگنا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیشوایانِ ظلم و ستم اور سردارانِ بے راہ روی و گمراہی اپنی اکیلوں کو اکیلے عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔ یہ ضدی و ہٹ دھرم پیروکار ہیں جو ان کے باطل مقصد تک پہنچنے میں مدد کرتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ یہ پیروکار ہیں جو ان کا تنور گرم کرتے ہیں اور ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں دوسروں کو گمراہ کرنے کا موقع ملتا ہے، لہٰذا اس گروہ کو بھی دوگنا عذاب ملنا چاہیئے۔ ایک سزا تو ان کی اپنی گمراہی کی وجہ سے، دوسری سزا ظالم، ستمگر اور گمراہ پیشواؤں کی حمایت کی وجہ سے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مشہور حدیث میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے اپنے ایک دوست جس کا نام صفوان تھا کو ظالم ہارون رشید کے کاموں میں کسی طرح کی شرکت کرنے سے روکا اور فرمایا:

اگر لوگ ان ظالموں کی مدد نہ کریں اور ان کی حمایت نہ کریں تو یہ عادل پیشواؤں کا

---

۱ چونکہ لفظ "امة" مؤنث ہے اس لیے اس کی مناسبت سے لفظ "اخت" آیا ہے جس کے معنی بہن کے ہیں جو ان گمراہ گروہوں کے ارتباط باہمی پر دلالت کرتا ہے۔

حق کس طرح غصب کر سکتے ہیں۔

بعد کی آیت میں ان گمراہ پیشواؤں کا جواب اس طرح نقل کیا گیا ہے، وہ اپنے پیروکاروں سے کہیں گے ہم میں اور تم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی اگر ہم نے کوئی غلط بات کہی تو تم نے تائید کی اور اگر ہم نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو تم نے ہمارا ساتھ دیا اور اگر ہم نے ستم کیا تو تم ہمارے یار و مددگار تھے لہٰذا تم بھی اپنے کرتوتوں کے بدلے خدا کا دردناک عذاب چکھو (وقالت اولٰهم لاخرٰهم فما كان لكم علينا من فضل فذوقوا العذاب بما كنتم تكسبون)۔

یہاں پر لفظ "اولیٰ" سے مراد پہلے لوگ یعنی پیشوا گروہ اور لفظ "اخریٰ" سے مراد پیروی کرنے والا گروہ ہے۔

(۴۰) اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ
السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ
وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُجْرِمِيْنَ ۝
(۴۱) لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَكَذٰلِكَ
نَجْزِى الظّٰلِمِيْنَ ۝

ترجمہ

(۴۰) وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور ان کے مقابلے میں تکبر کیا، آسمان کے دروازے ان کے لیے نہیں کھولے جائیں گے (اور وہ کبھی) بہشت میں داخل نہ ہوں گے الا یہ کہ اُونٹ سُوئی کے ناکے سے گزر جائے (یعنی ایسا کبھی نہیں ہو سکتا)، مجرموں کو ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔

(۴۱) ان کے لیے دوزخ (کی آگ) کے بستر ہوں گے اور ان کے اوپر اوڑھنا بھی (اسی کا)

ہے اور ظالموں کو ہم اسی طرح سزا دیتے ہیں :

تفسیر

ایک مرتبہ پھر قرآن نے ان متکبر اور ضدی افراد کا انجام بیان کیا ہے جو پروردگار کی آیتوں کو تسلیم نہیں کرتے اور حق کو نہیں مانتے۔ کہا گیا ہے : وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے مقابلے میں تکبر اختیار کیا آسمان کے دروازے ان کے لیے نہیں کھولے جائیں گے (ان الذین کذبوا بایاتنا واستکبروا عنہا لا تفتح لھم ابواب السماء)۔

ایک حدیث امام محمد باقر علیہ السلام سے اس طرح وارد ہوئی ہے :

اما المؤمنون فترفع اعمالھم وارواحھم الی السماء فتفتح لھم ابوابھا واما الکافر فیصعد بعملہ وروحہ حتی اذا بلغ الی السماء نادی مناد اھبطوا بہ الی سجین۔

مؤمنین کے اعمال و ارواح آسمان کی طرف لے جائے جائیں گے اور آسمان کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے جائیں گے اور کافر کا عمل اور روح بھی آسمان کی طرف لے جائی جائے گی جب یہ آسمان کے پاس پہنچے گی تو آواز آئے گی اسے سجین (دوزخ) کی طرف نیچے لے جاؤ۔[1]

اسی مضمون کی دیگر روایات بھی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تفسیر طبری وغیرہ میں اس آیت کے ذیل میں وارد ہوئی ہیں۔

یہاں پر آسمان سے مراد ممکن ہے کہ اس کے ظاہری معنی ہوں۔ نیز ممکن ہے اس سے مراد مقام قرب الٰہی ہو جیسا کہ سورہ فاطر کی آیت ۱۰ میں ہے :

اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ

پاکیزہ کلمے اسی کی طرف اوپر جاتے ہیں اور عمل صالح ان کو اوپر اٹھاتا ہے :

اس کے بعد مزید اشارہ ہوتا ہے : وہ بہشت میں داخل نہیں ہوں گے مگر اس وقت جبکہ اونٹ سوئی کے ناکے سے گزر جائے (ولا یدخلون الجنۃ حتی یلج الجمل فی سم الخیاط)۔

یہ ایک لطیف کنایہ ہے اس امر کے محال ہونے کی طرف۔ مقصد یہ ہے کہ ان افراد کے جنت میں جانے کا غیر ممکن ہونا حسی طور سے لوگوں کے سامنے آ جائے کیونکہ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اونٹ اپنے عظیم جثہ کے ساتھ سوئی کے ناکے میں نہیں گھس سکتا اسی طرح ان بے ایمان و متکبر افراد کا بہشت میں داخلہ ناممکن ہے۔

لغت میں "جمل" اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کے حال ہی میں دانت نکلے ہوں۔ لیکن "جمل" کے ایک معنی اس مضبوط رسی کے بھی ہیں۔ جس سے کشتی کو باندھتے ہیں[2] چونکہ رسی اور سوئی آپس میں مناسبت رکھتے ہیں

---

[1] تفسیر مجمع البیان در ذیل آیت مذکورہ۔

[2] کتاب "تاج العروس" اور "قاموس" ملاحظہ فرمائیں۔

اس لیے بعض مفسرین نے اس معنی کو بہتر جانا ہے۔ لیکن اکثر مفسرین نے پہلے معنی کو اختیار کیا ہے اور حق پہلا معنی اختیار کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے، کیونکہ :

(۱) پیشوایانِ اسلام کی روایات میں پہلے ہی معنی وارد ہوتے ہیں۔

(۲) اس تفسیر کی نظیر خود پسند و متکبر ثروت مندوں کے بارے میں بھی موجودہ انجیل میں ملتی ہے۔ انجیل لوقا باب ۱۸ جملہ ۲۴، ۲۵ میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا :

کس قدر مشکل ہے ان لوگوں کے لیے جو صاحبانِ دولت ہیں کہ وہ داخل ہوں خدا کی ملکوت و سلطنت میں، کیونکہ یہ بات زیادہ آسان ہے کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو بہ نسبت اس کے کہ دولت والا[1] خدا کی ملکوت و سلطنت میں داخل ہو۔

کم از کم اس جملہ سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ یہ محاورہ قدیم زمانہ سے عربوں میں مستعمل تھا۔ آج کل بھی یہ محاورہ ہمارے درمیان ایسے شخص کے بارے میں جو کبھی تو بہت سخت گیری کرتا ہو اور کبھی بہت نرمی سے پیش آتا ہو رائج ہے کہ - فلاں شخص کبھی تو دروازہ میں داخل نہیں ہوتا اور کبھی سوئی کے ناکہ سے گزر جاتا ہے :

(۳) لفظ - جمل - کا استعمال زیادہ تر پہلے معنی (اونٹ) میں کیا جاتا ہے۔ جبکہ موٹی رسّی کے لیے اس کا استعمال بہت کم ہے لہٰذا پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔

آیت کے آخر میں مزید تاکید و توضیح کے لیے فرماتا ہے : ہم اس طرح کے گنہگاروں کو سزا دیتے ہیں (و کذالک نجزی المجرمین)۔

اس کے بعد کی آیت میں ان لوگوں کے دردناک عذاب کے ایک اور حصے کی طرف اشارہ فرماتا ہے، ایسے لوگوں کے لیے جہنم اور بھڑکتی ہوئی آگ کا بچھونا ہے اور اسی کا اوڑھنا ہے (لہم من جہنم مہاد ومن فوقہم غواش)[2]

پھر دوبارہ تاکید کے لیے فرماتا ہے : ہم اس طرح سے ظالموں اور ستمگاروں کو سزا دیں گے (وکذالک نجزی الظالمین)۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ کبھی انہیں - مجرم - کبھی - ظالم - کبھی - آیاتِ الٰہی کا جھٹلانے والا - اور کبھی - متکبر - کے لقب سے تعبیر کیا گیا ہے درحقیقت ان سب کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہے۔

---

[1] یہاں پر - دولت والے - سے مراد فاسق و فاجر دولت مند مراد ہیں نہ کہ مطلقاً ہر دولت والا۔ (مترجم)

[2] - مہاد - جمع ہے - مہد - (بروزن عہد) کی جس کے معنی بستر کے ہیں۔ - غواش - جو دراصل - غواشی - تھا جمع ہے - غاشیہ - کی جس کے معنی ہر طرح کی پوشش کے ہیں خیمہ پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ اس آیت میں ممکن ہے خیمہ کے معنی میں ہو یا اس کا معنی پوشش ہو۔

(۴۲) وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ز
اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○
(۴۳) وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ
وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۣ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ
اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ
الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

(۴۲) وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے عمل صالح انجام دیا ہے کسی پر ہم اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری عائد نہیں کرتے، وہ اہل بہشت ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

(۴۳) اور ان کے دلوں میں جو کینہ اور حسد ہے اسے ہم باہر نکال دیں گے (تاکہ صلح و صفائی کے ساتھ باہم زندگی بسر کریں) اور ان کے (محلوں اور درختوں کے) نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ (اس وقت) وہ کہیں گے ساری تعریفیں اس خدا کے لیے مخصوص ہیں جس نے ان (نعمتوں) کی طرف ہماری ہدایت کی اور اگر اللہ ہماری ہدایت نہ کرتا تو ہمیں (ان کی) راہ نہ ملتی، بے شک ہمارے رب کے سارے رسول حق کے ساتھ آئے اور (اس وقت) انہیں یہ ندا سنائی دے گی کہ یہ ہے وہ جنت جس کے تم وارث بنائے گئے ہو، ان اعمال کے بدلے جو تم نے انجام دیئے ہیں۔

تفسیر

سکون کامل و سعادت جاودانی

جیسا کہ ہم نے سابقاً بھی اشارہ کیا ہے کہ روشِ قرآنی یہ ہے کہ کسی مطلب کی تاکید کے لیے وہ مختلف گروہوں اور ان کے انجاموں کا برابر سے ذکر کرتا ہے، اور ان کا آپس میں موازنہ کرکے ان کی وضعیت و حیثیت کی تشریح کرتا ہے۔ گذشتہ آیات میں منکرین آیات خدا متکبر و ظالم افراد کے انجام کو دکھایا گیا تھا۔ اب ان آیات میں با ایمان لوگوں کے تابناک انجام کی اس طرح شرح کرتا ہے: اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح انجام دیا وہ اہل بہشت ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے (والذین اٰمنوا و عملوا الصالحات ... اولٰٓئک اصحاب الجنة ھم فیھا خالدون)۔

لیکن اس جملہ کے درمیان میں (یعنی مبتدا و خبر کے درمیان میں) ایک جملہ معترضہ[1] آیا ہے جو فی الحقیقت بہت سے سوالات کا جواب ہے اور وہ یہ ہے: ہم کسی شخص پر اس کی قوت سے زیادہ ذمہ داری عائد نہیں کرتے (لا نکلف نفسًا الا وسعھا)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ با ایمان اور صالح افراد کی صف میں داخل ہونا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے، سوائے گنے چنے افراد کے اور کوئی ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ پروردگار عالم کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریاں (احکام) افراد کی قوت و صلاحیت کے لحاظ سے ہوتی ہیں اور اس طرح وہ عالم، جاہل، چھوٹے بڑے اور ہر عمر کے انسانوں کے لیے راستہ کھول دیتا ہے اور ہر ایک کو صالحین کی صف میں داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ خدا کو ہر شخص سے اتنی ہی توقع ہے جتنی اس کی ذہنی و جسمانی صلاحیت ہے۔

یہ آیت مثل کثیر دیگر آیات کے بیان کرتی ہے کہ نجات و سعادت ابدی کا ذریعہ صرف ایمان و عمل صالح ہے۔ اس طرح عیسائیوں کے اس خرافاتی عقیدہ کی رد ہو جاتی ہے جس کے مطابق آج کل کے مسیحی لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی قربانی بشر کے تمام گناہوں کے مقابلے میں وسیلۂ نجات ہے۔ آیۂ مذکورہ اس عقیدہ پر خطِ تنسیخ کھینچتی ہے۔ قرآن کریم نے جو بار بار ایمان و عمل صالح پر زور دیا ہے وہ اسی قسم کے عقیدوں کو باطل کرنے کے لیے ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ایک انتہائی اہم نعمت جو اللہ جنت والوں کو عطا کرے گا اور وہ نعمت ان

---

[1] یہ اشتباہ نہ ہو کہ "جملہ معترضہ" کے یہ معنی ہیں کہ وہ مطلب سے بالکل بے ربط ہے۔ بلکہ وہ بھی مطلب سے ایک طرح کا ربط رکھتا ہے اگرچہ جملہ بندی کی رُو سے دوسری عبارت کے درمیان اسے جگہ دی جاتی ہے۔ بنا بریں ۔ جملہ معترضہ ۔ صرف جملہ بندی کے لحاظ سے الگ دکھائی دیتا ہے نہ کہ معنی کے لحاظ سے۔

کی روح کے آرام کا باعث ہوگی اسے اس طرح بیان فرمایا ہے : ان کے دلوں سے ہم ہر طرح کے کینے، حسد اور دشمنی کو دُور کر دیں گے (ونزعنا ما فی صدورھم من غل)۔

"غل" کے اصل معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز کسی چیز میں مخفی طور سے اُتر جائے۔ اسی وجہ سے حسد، کینہ اور دشمنی کیلئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ جذبے چپکے سے انسان میں نفوذ کر جاتے ہیں اور کبھی رشوت کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے کیونکہ وہ بھی کسی خیانت کے لیے خفیہ طور سے دی جاتی ہے [1]

حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کی زندگی میں انسان کی ناراضی و پریشانی کا ایک بڑا سبب جس کی وجہ سے عالمی جنگیں بھی چھڑ چکی ہیں، جانی و مالی نقصانات مرتب ہوتے ہیں لہٰذا انسانی سکون رخصت ہوگیا ہے' وہ یہی کینہ و حسد ہے۔

ہم بہت سے ایسے افراد کو جانتے ہیں جن کی اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود دوسرں سے حسد ان کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا ہے یہ کینہ پروری ہے جو اُن کی راحت و آرام کی زندگی کو تاراج کر دیتی ہے اور تھکا دینے والی بیکار کدوکاوش میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اہلِ بہشت اس طرح کی بدبختیوں سے بالکل آسودہ ہوں گے۔ ان کے دلوں میں نہ کینہ ہوگا نہ حسد ہوگا اور نہ ان کے بُرے نتائج ہوں گے۔ وہ لوگ آپس میں نہایت دوستی اور مہر و محبت کے ساتھ زندگی بسر کریں گے اور سب کے سب اپنی حالت پر راضی ہوں گے۔ حتیٰ کہ جن کا مرتبہ نیچا ہوگا وہ بھی اعلیٰ درجہ والوں پر حسد نہیں کریں گے اس طرح ان کی باہم زندگی کی سب سے بڑی مشکل حل ہو جائے گی۔

بعض مفسّرین نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جس وقت اہلِ بہشت، بہشت کی طرف روانہ ہوں گے تو جنت کے دروازہ پر ایک درخت دیکھیں گے جس کے نیچے سے دو چشمے جاری ہوں گے۔ اہلِ بہشت ان میں سے جب ایک چشمہ سے پانی پئیں گے تو ان کے دلوں سے ہر قسم کے کینے اور حسد دُھل جائیں گے، یہ وہی "شرابِ طہور" ہے جس کا ذکر سورۂ دھر میں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے چشمے میں جب وہ نہائیں گے تو جسم کے تمام عیوب اور تھکاوٹ سُستی وغیرہ زائل ہو جائے گی اس کے بدلے ان کے بدن میں تازگی اور خوبصورتی آجائے گی اس طرح کہ اس کے بعد پھر وہ کبھی نہ بوڑھے ہوں گے نہ متغیّر [2]

اس حدیث کی سند اگرچہ پیغمبرِ اکرمؐ یا آئمہؑ تک نہیں پہنچی ہے کیونکہ اسے صرف ایک مفسّر "سدی" نے نقل کیا ہے لیکن بعید نہیں کہ یہ روایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہو کیونکہ یہ ایسے مسائل نہیں ہیں جن سے "سدی" یا ان کی طرح کے دوسرے افراد مطلع ہوں۔ بہر حال اس میں اس بات کی طرف لطیف اشارہ موجود ہے کہ اہلِ بہشت اندر اور باہر دونوں طرف سے دُھل جانے کے بعد جنت میں داخل ہوں گے۔ خدا تعالیٰ انہیں حُسنِ ظاہری عطا فرمائے گا اور جمالِ باطنی بھی، اُس عالم میں وہ کینہ اور حسد سے بچے رہیں گے۔

---

[1] مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۲۴۹ ملاحظہ ہو (اردو ترجمہ)۔

[2] تفسیر المنار جلد ۸ ص ۴۲۱۔

کیا کہنا ان لوگوں کا جو اس دنیا میں بھی اپنے لیے جنّت بنالیں اور اپنے سینوں کو کینہ اور حسد سے پاک کرلیں اور اس کے نتیجہ میں جو تکلیفیں پیدا ہوتی ہیں اُن سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو بچالیں۔

قرآن کریم اس روحانی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد، ان کی مادّی اور جسمانی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے، ان کے محلوں کے نیچے پانی کی نہریں جاری ہوں گی (تجری من تحتہم الانہار)۔

اس کے بعد اہل بہشت کی پوری رضامندی اور کامل خوشنودی کو یوں بیان فرمایا گیا ہے، جبکہ وہ یہ کہیں گے، ساری تعریفیں اور شکرانے اس خدا کے لیے مخصوص ہیں جس نے ان تمام نعمتوں کی طرف ہماری ہدایت کی' اگر وہ ہماری ہدایت نہ کرتا تو ہم ہرگز ہدایت نہ پاتے، یہ اس کی توفیق تھی جس نے ہمارا ہاتھ تھام کر زندگی کی سخت گذرگاہوں میں سے ہمیں گزار دیا اور سعادت کی منزل تک پہنچا دیا" (وقالوا الحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ)۔

بے شک ہمارے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول سچ کہتے تھے اور ہم اب اپنی آنکھوں سے ان کی سچائی کا نتیجہ دیکھ رہے ہیں (لقد جاءت رسل ربنا بالحق)۔

اسی اثناء میں خدا کی طرف سے ایک ندا بلند ہوگی جو ان کے دل و جان میں سما جائے گی اور وہ اسے سُن کر خوش ہو جائیں گے اور وہ ندا یہ ہوگی، یہ جنت تم نے اپنے پاک اور نیک اعمال کے بدلے میراث میں پائی ہے (ونودوا ان تلکم الجنۃ اورثتموھا بما کنتم تعملون)۔

ہم ایک مرتبہ پھر اس حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں کہ نجاتِ ابدی عمل صالح کے سایہ میں ہے، نہ کہ بے بنیاد توہمات و مزعومات کی بناء پر۔

۔ ارث ۔ کے معنی یہ ہیں کہ کوئی مال یا ثروت ایک شخص سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جائے بغیر اس کے کہ ان کے درمیان کوئی قرار داد یا معاہدہ طے پائے (یعنی ایک طبیعی طریقے سے نہ کہ خرید و فروخت وغیرہ کے ذریعے سے)، میت سے اس کے اعزاء کو جو مال پہنچتا ہے اسے بھی ۔ ارث ۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

ارث کیوں کہا گیا

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس لیے اہل بہشت سے یہ کہا جائے گا کہ تم نے ان نعمتوں کو اپنے اعمال کی وجہ سے میراث کے طور پر پایا ہے؟

اس سوال کا جواب ایک حدیث میں ملتا ہے جو سُنّی اور شیعہ دونوں طریقوں سے مروی ہے۔ یہ حدیث حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے جس میں آنحضرت فرماتے ہیں:

ما من احد الا ولہ منزل فی الجنۃ ومنزل فی النار فاما الکافر فیرث المؤمن منزلہ من النار، والمؤمن یرث الکافر منزلہ من الجنۃ فذالک قولہ، اورثتموھا بما کنتم تعملون۔

ہر شخص بغیر کسی استثناء کے، ایک منزل جنت میں اور ایک منزل دوزخ میں رکھتا ہے، کافر مؤمنین کی ان منزلوں کو میراث میں پائیں گے جو جہنم میں ہیں اور مؤمنین کافروں کی جنت میں منزلوں کو میراث میں پائیں گے اور یہی ہیں معنی خدا کے اس قول کے: اورثتموھا بما کنتم تعملون [1]

اس حدیث میں دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خوش قسمتی اور بدبختی کے دروازے ہر ایک شخص کے لیے کھلے ہوئے ہیں، اپنے آغاز میں کوئی شخص نہ جنتی ہے نہ جہنمی، بلکہ ہر شخص دونوں کی استعداد رکھتا ہے یہ خود انسان کا ارادہ ہے جو اس کی قسمت کو معین کرتا ہے۔ یہ بات بدیہی ہے کہ جب مؤمنین اپنے نیک عمل کی وجہ سے جنت میں جائیں گے اور ناپاک اور بے ایمان دوزخ میں جگہ پائیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک کی خالی جگہ دوسرے کو مل جائے گی۔

بہرحال یہ آیت اور یہ حدیث ان واضح دلیلوں میں سے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مسئلہ جبر باطل ہے اور انسان اپنے ارادہ میں کامل آزاد ہے۔

(۴۴) وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ؕ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَیْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِیْنَ ۙ

(۴۵) الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ۘ

ترجمہ

(۴۴) اور بہشت والے دوزخ والوں سے پکار کر کہیں گے کہ ہم نے اس وعدہ کو حق پایا جو ہمارے اللہ نے ہم سے کیا تھا۔ کیا تم نے بھی حق پایا اس وعدہ کو جو اللہ نے تم سے کیا تھا؟ وہ جواب دیں گے کہ ہاں! (ہم نے تمام باتیں حقیقت کی صورت میں دیکھ لیں) اسی اثناء میں ایک ندا کرنے والا ان کے درمیان یہ ندا کرے گا کہ خدا کی لعنت ہو ظالموں پر۔

[1] نور الثقلین جلد دوم ص ۳۱، تفسیر قرطبی جلد ۴ ص ۲۰۲۵ اور دیگر تفاسیر۔

(۴۵) (ایسے ظالم) جو لوگوں کو خدا کے راستے سے روکتے ہیں اور (ان کے دلوں میں شبہات ڈال کر) اس (راستے) کو ٹیڑھا دکھلاتے ہیں اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔

تفسیر

گذشتہ بحث کے بعد جس میں جنتیوں اور دوزخیوں کا انجام بیان کیا گیا ہے، ان آیات میں دونوں گروہوں کی آخرت میں جو گفتگو ہوگی اسے بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جنتی لوگ دوزخ والوں کو مخاطب کرکے آواز دیں گے کہ ہم نے اپنے پروردگار کا وعدہ برحق پایا، کیا تم نے بھی اپنے اس انجام کو پایا ہے جس کا وعدہ اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ کیا تھا (ونادیٰ اصحاب الجنة اصحاب النار ان قد وجدنا ما وعدنا ربنا حقًا فهل وجدتم ما وعد ربكم حقًا)۔

وہ لوگ جواب میں کہیں گے ہاں ہم نے تمام باتیں حقیقت کی صورت میں دیکھ لیں (قالوا نعم)۔

اس بات کی طرف توجہ ہونا چاہیے کہ لفظ "نادیٰ" اگرچہ ماضی کا صیغہ ہے لیکن اس جگہ اس کے معنی مستقبل کے نکلیں گے۔ اس طرح کی تعبیریں قرآن میں بہت استعمال ہوتی ہیں جن میں آئندہ ہونے والے یقینی واقعات و حوادث کو فعل ماضی کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور اس میں ایک طرح کی تاکید منظور ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آئندہ ہونے والی بات اس طرح یقینی ہے جیسے زمانۂ ماضی میں ہو چکی ہو۔

ضمنی طور سے یہ مطلب بھی اس میں مضمر ہے کہ دونوں گروہوں کے درمیان مقامی و مکانی طور سے کافی فاصلہ ہوگا کیونکہ "ندا" دُور سے کی جاتی ہے۔

ممکن ہے کوئی شخص یہاں پر یہ سوال کرے کہ ان دو گروہوں کی مذکورہ گفتگو کا کیا فائدہ؟ جبکہ دونوں کو ایک دوسرے کا جواب معلوم ہے۔

اس بات کا جواب بھی معلوم ہے کیونکہ سوال ہمیشہ معلومات بڑھانے کے لیے نہیں کیا جاتا، بلکہ کبھی سرزنش و توبیخ کے لیے بھی سوال کیا جاتا ہے۔ اس مقام پر یہ سوال اسی مقصد کے ماتحت کیا جائے گا۔ حقیقت میں گنہگاروں اور ستمگاروں کے لیے یہ سوال بھی ایک طرح کی سخت سزا ہوگی، کیونکہ جب یہ لوگ دار دنیا میں تھے تو اپنی ملامت اور سرزنش سے با ایمان افراد کو روحانی اذیت دیتے تھے لہٰذا آج (بروز قیامت) انہیں اس کی سزا ضرور ملنا چاہیے اس کی نظیر قرآن میں کئی جگہ ملتی ہے۔ جیسے آخر سورۂ مطففین میں [1]

---

[1] آخر سورۂ مطففین جیسے:

هل ثوب الكفار ما كانوا يفعلون۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اس کے بعد فرمایا گیا ہے : اسی اثناء میں ایک بولنے والا یہ ندا کرے گا (ایسی ندا جو ہر ایک کے کان میں پہنچے گی) کہ لعنت ہو خدا کی ستم کرنے والوں پر ! (فاذن مؤذن بینھم ان لعنة اللہ علی الظالمین)۔

بعد ازاں ان ستمگاروں کی پہچان یوں کرواتا ہے : یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کو راہ راست سے روکتے تھے اور اپنی زہریلی تبلیغات سے لوگوں کے عقائد کی جڑوں کو کمزور کر کے ان کے دلوں میں شک و شبہ ڈالتے تھے اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے (الذین یصدون عن سبیل اللہ ویبغونھا عوجا وھم بالاٰخرة کافرون)[1]

مذکورہ بالا آیت سے ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہر قسم کی بے راہ رویاں اور مفسدے "ظلم وستم" کے مفہوم میں جمع ہیں اور لفظ "ظالم" کا ایک ایسا وسیع مفہوم ہے جو اپنے دامن میں تمام گنہگاروں کو خصوصاً ان گمراہوں کو جو دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں، لیے ہوئے ہے۔

یہ ندا کرنے والا کون ہے؟

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "مؤذن" (ندا کرنے والا) جو اس طرح سے ندا کرے گا کہ اس کی آواز سب اہل محشر سن لیں گے اور اس طرح تمام اہل محشر پر اس کا تفوق و برتری ظاہر ہوگی، کون ہے؟ آیت سے تو کچھ نہیں کھلتا، لیکن اسلامی روایات میں مذکورہ آیت کی تفسیر میں زیادہ یہ وارد ہوا ہے کہ اس سے مراد حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام ہیں۔

چنانچہ ابو القاسم حسکانی جو اہل سنت کے علماء میں سے ہیں اپنی سند کے ساتھ محمد حنفیہ سے اور وہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا :

انا ذالک المؤذن ؛

وہ ندا کرنے والا میں ہی ہوں۔

نیز اسی طرح اپنی سند سے ابن عباس سے نقل کرتے ہیں :

(بقیہ گذشتہ صفحہ کا حاشیہ) : یا اوّل سورہ قمر جیسے :

اقترب الساعة وانشق القمر۔

ثرب اور اقتربت اور انشق یہ سب ماضی کے صیغے ہیں جو بمعنی مستقبل کے استعمال ہوئے ہیں۔ (مترجم)

[1] "یبغونھا عوجا" کا معنی ہے "یطلبونھا عوجا" یعنی وہ چاہتے ہیں اور سعی و جستجو کرتے ہیں کہ شبہات پیدا کر کے اور زہریلے پراپیگنڈا سے حقیقی راستے کو دگرگوں کر دیں۔

ضمناً راغب مفردات میں کہتا ہے "عوج" (بروزن "کرج") حسی ٹیڑھے پن کو کہتے ہیں، لیکن "عوج" (بروزن "پدر") فکری ٹیڑھے پن کو کہا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کی کچھ آیات مثلاً سورہ طٰہٰ آیت ۱۰۷ اس سے مناسبت نہیں رکھتی (غور کیجئے گا)۔

قرآن میں حضرت علیؑ کے کچھ نام ہیں جن کو لوگ نہیں جانتے، ان میں سے ایک نام آپ کا "مؤذن" بھی ہے، جو اس آیت "فاذن مؤذن بینھم" میں آیا ہے، علیؑ ہیں جو یہ ندا کریں گے اور کہیں گے: "الا لعنة اللہ علی الذین کذبوا بولایتی واستخفوا بحقی"؛ اللہ کی لعنت ہو ان لوگوں پر جنھوں نے میری ولایت کو جھٹلایا اور میرے حق کو سبک سمجھا۔[1]

شیعہ طریقوں سے بھی اس بارے میں متعدد حدیثیں وارد ہوئی ہیں، جیساکہ جناب صدوق علیہ الرحمۃ نے اپنی سند کے ساتھ امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے:

حضرت امیرالمؤمنینؑ کو جنگ نہروان سے واپسی کے موقع پر معلوم ہوا کہ معاویہ آپ کو کھلے بندوں گالیاں دیتا ہے اور آپ کے دوستوں کو قتل کر رہا ہے اس وقت حضرت نے ایک خطبہ دیا جس میں ارشاد فرمایا:

دنیا و آخرت میں ندا کرنے والا میں ہوں جس کا خدا نے اپنی کتاب میں ذکر فرمایا ہے کہ: فاذن مؤذن بینھم ان لعنة اللہ علی الظالمین، مَیں وہ روزِ قیامت کا مؤذن ہوں، نیز اللہ نے فرمایا ہے: واذان من اللہ ورسولہ (حج کے موقع پر یہ ندا اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہر ایک کے کان میں پہنچ جائے) یہ ندا کرنے والا بھی میرے علاوہ کوئی دوسرا نہ تھا۔[2]

ہم نے جہاں تک سوچا کہ بروزِ قیامت حضرت علی علیہ السلام ندا کیوں کریں گے تو سمجھ میں آیا کہ:

اولاً۔ یہ کہ دنیا میں بھی خدا اور اس کے رسول کی طرف سے یہ منصب آپ کو ملا ہوا تھا کیونکہ فتح مکّہ کے بعد آپ کو یہ حکم ملا تھا کہ موسم حج میں سورۂ برأت کو تمام حاجیوں کے سامنے پڑھ کر اس طرح سنا دیں کہ اسے سب سُن لیں اور ان سے یہ کہہ دیں: وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖٓ اِلَی النَّاسِ یَوْمَ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ اَنَّ اللّٰہَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ (یہ ندا ہے خدا اور اس کے رسول کی طرف سے تمام لوگوں کی طرف حج اکبر کے دن کہ خدا اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہیں)۔[3]

دوسرے۔ یہ کہ اپنی تمام زندگی میں حضرت علی علیہ السلام کا جو مؤقف تھا وہ ظلم وستم سے مبارزہ اور جنگ کا مؤقف تھا۔ ایک ایسا مؤقف جس میں آپ ظالموں اور ستمگاروں کے برخلاف مصروف پیکار رہے۔ کیونکہ آپ کی پوری زندگی میں یہ پہلو بہت درخشاں نظر آتا ہے کہ آپ کی زندگی ہمیشہ مظلوم کی حمایت اور ظالم سے عداوت میں صرف ہوئی ہے لیکن ان شرائط کے ساتھ جو اس عصر کا تقاضا تھا۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان در ذیل آیت مذکور۔

[2] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۷۔

[3] سورۂ توبہ آیت ۳۔

کیا ایسا نہیں ہے کہ آخرت کی زندگی، اسی دنیا میں انسانوں کی جو زندگی ہے اس کا ایک ترقی یافتہ نمونہ ہوگی۔ اسی لیے کیا جائے تعجب ہے کہ اس دن کا مؤذن جو جنت اور دوزخ کے درمیان خدا اور رسول کی طرف سے ظالموں پر لعنت کی ندا کرے گا۔ وہ حضرت علی علیہ السلام ہی ہوں گے۔!

ہماری بات سے مؤلف "المنار" کے اعتراض کا جواب معلوم ہو جائے گا جنہیں حضرت علی علیہ السلام کی اس فضیلت میں شک ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اس بات کا حضرت علیؑ کے لیے فضیلت ہونا یقینی نہیں ہے۔

اس کے جواب میں ہمیں یہ کہنا ہے کہ جس طرح حج اکبر کے موقع پر حضرت علیؑ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت میں سورۂ برأت کا تلاوت کرنا ان کے لیے عظیم فضیلت اور بڑے فخر کا سبب ہے اور جس طرح ظالموں اور سرکشوں سے نبرد آزما ہونا آپ کی نمایاں منقبت ہے، بالکل اسی طرح قیامت کے روز آپ کا اس منصب جلیل پر فائز ہونا جو فی الحقیقت آپ کے دنیاوی عہدوں کا تتمہ ہوگا آپ کے لیے عظیم منقبت اور فضیلت کا باعث ہے۔

نیز گذشتہ سطور سے آلوسی مؤلف تفسیر "روح المعانی" کی بات کا جواب بھی معلوم ہو جائے گا جنہوں نے کہا ہے کہ ان احادیث کا اہل سنت کی سندوں سے روایت ہونا ثابت نہیں ہے، کیونکہ ہم نے تحریر کیا ہے کہ ان احادیث کو شیعہ اور سُنی عالموں نے اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے۔

(۴۶) وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ○

(۴۷) وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحَابِ النَّارِ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ○

(۴۸) وَنَادَىٰ أَصْحَابُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمَاهُمْ قَالُوا مَا أَغْنَىٰ عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ○

(۴۹) أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللَّهُ بِرَحْمَةٍ ۚ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ

لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ○

ترجمہ

۴۶ اور ان دونوں (جنت والوں اور دوزخ والوں) کے درمیان ایک پردہ ہوگا اور اعراف پر کچھ مرد ہوں گے جو ان دونوں کو ان کی علامتوں سے پہچانیں گے۔ وہ بہشت والوں کو آواز دیں گے کہ تم پر سلام ہو لیکن وہ بہشت کے اندر داخل نہ ہو سکے ہوں گے جبکہ اس کے امیدوار ہوں گے۔

۴۷ اور جس وقت ان کی نظر دوزخیوں پر پڑے گی تو کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! ہمیں ستمگاروں کے ساتھ نہ رکھنا۔

۴۸ اور اعراف والے (مرد) کچھ مردوں کو (دوزخیوں میں سے) جنہیں وہ ان کی علامتوں سے پہچانتے ہوں گے، پکاریں گے اور کہیں گے کہ (دیکھا) تم نے جن چیزوں کو اکٹھا کیا تھا (یعنی مال و دولت اور زوجہ و اولاد) اور جو تم تکبر کیا کرتے تھے (آج) یہ سب کچھ تمہارے کچھ کام نہ آیا۔

۴۹ کیا یہ (وہ پسماندہ افراد جو اعراف میں ہوں گے)، وہی لوگ نہیں ہیں جن کے متعلق تم قسم کھایا کرتے تھے کہ خدا کی رحمت ہرگز ان کے شامل حال نہ ہوگی (لیکن ان کے ایمان اور ان کے بعض اعمال خیر کی وجہ سے خدا انہیں اپنی رحمت کے دامن میں پناہ دے گا، اب ان سے کہا جائے گا) بہشت کے اندر داخل ہو جاؤ، نہ تو تم کو کوئی خوف ہوگا، اور نہ تم غمگین ہو گے۔

تفسیر

اعراف، جنت کی طرف ایک اہم گزرگاہ

پچھلی آیات میں دوزخیوں اور جنتیوں کی مختصر سرگزشت بیان کرنے کے بعد ان آیات میں "اعراف" کا

ذکر فرمایا گیا ہے۔ "اعراف" جنت اور دوزخ کے درمیان کا وہ علاقہ ہے جو دونوں مقاموں کے درمیان حد فاصل کا کام کرتا ہے۔ اس مقام کی خصوصیات بیان فرمائی گئی ہیں۔

سب سے پہلے جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان جو پردہ ہوگا اس کا ذکر کیا گیا ہے، فرماتا ہے: ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک پردہ ہوگا (وبینھما حجاب)۔

بعد والی آیتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حجاب "اعراف" ہی ہے جو ایک بلند جگہ ہوگی ان دونوں گروہوں کے درمیان، جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں گے۔ لیکن یہ جگہ ایک دوسرے کی آواز سننے سے مانع نہ ہوگی جیسا کہ گذشتہ آیات میں گذرا ہے، کیونکہ ہم نے بہت دیکھا ہے کہ ہمسایہ کے لوگ ایک دوسرے سے پسِ دیوار بات کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کا حال دریافت کرتے ہیں؛ جبکہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے۔ البتہ وہ افراد جو اعراف کے اوپر ہیں یعنی اس بلند مانع کے اوپر والے حصّہ پر واقع ہیں، وہ دونوں گروہوں کو دیکھ سکتے ہیں (اچھی طرح سے غور کریں)۔

اگرچہ بعض آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض اہل جنت کو اتنا موقع ملے گا کہ وہ گاہ بگاہ اپنے مقام سے اپنا سر باہر نکال کر دوزخیوں کو دیکھیں گے (جیسا کہ سورۂ صافات کی آیت ۵۵ میں ہے) لیکن اس طرح کا استثناء دوزخ و جنت کی اصلی وضعیت کے منافی نہیں ہے۔ اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس میں جنت اور دوزخ کی اصلی وضعیت کو بیان کیا گیا ہے اگرچہ یہ قانون استثناء پذیر ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حالات میں بعض بہشتی افراد دوزخیوں کو دیکھ سکیں۔

"اعراف" کی کیفیت بیان کرنے سے پہلے جو بات تاکیدی طور پر یہاں بیان کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ روزِ قیامت اور جہانِ آخرت کے متعلق جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور جس طرح کی تعبیریں استعمال کی گئی ہیں ان میں اس کی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ حقائقِ اُخروی کا پورے طور پر اور تمام خصوصیات کے ساتھ نقشہ کھینچ سکیں، اس لیے بعض اوقات ان الفاظ میں صرف تشبیہ اور مثال کا رنگ ہوتا ہے اور کبھی اس کا صرف ایک سایہ اور خاکہ پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کیونکہ آخرت کے جہان کی زندگی بہت بلند ہے اور وہ اس دنیا کی نسبت بہت وسیع ہے۔ جیسے اس دنیا کی زندگی رحم مادر اور عالم جنین کی نسبت سے بہت زیادہ وسیع ہے، لہٰذا جو الفاظ و معانی اس دُنیا کے لیے وضع کیے گئے ہیں اگر ان سے جہانِ آخرت کے حقائق کی ترجمانی نہ ہو تو یہ کوئی جائے تعجب نہ ہوگی۔

بعد ازاں قرآن بیان کرتا ہے کہ: اعراف پر کچھ مرد کھڑے ہوں گے جو دوزخ والوں اور جنت والوں میں سے ہر ایک کو ان کے ٹھکانوں میں دیکھ رہے ہوں گے اور ان کی علامتوں سے انہیں پہچانیں گے (وعلی

الاعراف رجال یعرفون کلا بسیماھم)۔

• اعراف • لغت میں جمع ہے • عرف • (بروزن گفت) کی، جس کے معنی اونچی جگہ کے ہیں۔ اسی وجہ سے گھوڑے کی گردن کے بالوں کو اور مرغے کی گردن کے پروں کو بھی • عرف الفرس • یا • عرف الدیک • کہتے ہیں کیونکہ یہ بال و پر ان کے جسم کی اونچی جگہ پر ہوتے ہیں (سرزمین اعراف کی خصوصیات کے بارے میں اس آیت کی تفسیر کے بعد روشنی ڈالی جائے گی)۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ • جو مرد اعراف پر کھڑے ہوں گے وہ اہل بہشت کو ندا کریں گے اور کہیں گے کہ تم پر سلام ہو لیکن وہ خود جنت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے، اگرچہ ان کا دل بہت چاہتا ہوگا (ونادوا اصحاب الجنة ان سلام علیکم لم یدخلوھا وھم یطمعون)۔

لیکن جس وقت وہ دوسری طرف نظر ڈالیں گے اور دوزخیوں کو دوزخ کے اندر دیکھیں گے تو خدا کی بارگاہ میں التماس کریں گے کہ پروردگارا! ہم کو ستمگاروں کی جماعت میں قرار نہ دینا (واذا صرفت ابصارھم تلقآء اصحاب النار قالوا ربنا لا تجعلنا مع القوم الظالمین)۔ [1]

یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ دوزخیوں کے دیکھنے کے متعلق مذکورہ بالا آیت میں • اذا صرفت ابصارھم • کا جملہ آیا ہے، یعنی جب ان کی نگاہیں دوزخیوں کی طرف پلٹائی جائیں گی۔ یہ فی الحقیقت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اعراف والوں کو دوزخیوں کے دیکھنے سے نفرت ہوگی اور وہ انہیں ایک طرح کی مجبوری کی بنا پر دیکھیں گے۔

اس کے بعد کی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: اصحاب اعراف بعض دوزخیوں کو ان کے چہرے مہرے سے پہچان کر انہیں پکاریں گے اور انہیں اپنی ملامت اور سرزنش کا نشانہ بنائیں گے کہ آخر تم نے دیکھا کہ دنیا میں تمہارے مال جمع کرنے، افرادی قوت جمع کرنے اور تکبر کے باعث قبول حق سے گریز کرنے کا کیا نتیجہ نکلا۔ وہ سب مال کہاں گیا اور وہ لوگ کیا ہوئے جو تمہارے چاروں طرف اکٹھے تھے اور جو تکبر اور خود پرستی تم نے اختیار کی تھی اس سے تمہیں سوائے جہنم کے کیا حاصل ہوا؟ (ونادیٰ اصحاب الاعراف رجالاً یعرفونھم بسیماھم قالوا مآ اغنیٰ عنکم جمعکم وماکنتم تستکبرون)۔

دوبارہ اسی ملامت و سرزنش کے بارے میں جبکہ وہ ان ضعیف الحال مومنین کی طرف اشارہ کریں گے

---

[1] بعض مفسرین اور اہل ادب کے نزدیک • تلقاء • در اصل مصدر لقاء اور مقابلہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، لیکن بعد میں ظرف مکان کے معنی میں بھی استعمال کیا جانے لگا، یعنی مقابلہ کی جگہ اور سامنے کی سمت۔

ہوں گے جو اعراف پر ہوں گے، یہ کہیں گے، آیا یہ وہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم قسم کھاتے تھے کہ خدا ان پر کبھی رحمت نہ کرے گا (أهٰؤلآء الذین اقسمتم لا ینالهم الله برحمة)۔

آخرکار اللہ کی رحمت ان لوگوں کے بھی شامل حال ہوگی اور ان سے خطاب ہوگا کہ جنت میں چلے جاؤ نہ تمہارے لیے کوئی خوف ہے اور نہ وہاں تمہیں کوئی غم و اندوہ ہوگا (ادخلوا الجنة لاخوف علیکم ولآ انتم تحزنون)۔

جو کچھ ہم نے کہا اس سے یہ معلوم ہوا کہ ضعیف الحال مؤمنین سے مراد وہ افراد ہیں جو ایمان رکھتے تھے اور نیک اعمال بھی بجا لاتے تھے، لیکن بعض گناہوں اور بد اعمالیوں کی وجہ سے دشمنوں کی جانب سے ہمیشہ ان کی تحقیر و توہین ہوا کرتی تھی اور وہ ان کو دیکھ کر یہ کہا کرتے تھے کہ ایسے لوگ (بھلا جنت میں کیا جائیں گے اور) رحمت الٰہی کے سایہ میں کیسے آئیں گے! لیکن آخرکار اپنی روح ایمانی اور نیکیوں کی وجہ سے اللہ کی رحمت ان کے شامل حال ہو جائے گی اور ان کا انجام بخیر ہوگا۔

اصحاب اعراف کون لوگ ہیں؟

جیسا کہ ہم نے سابقاً کہا کہ "اعراف" نمایاں اور اٹھی ہوئی زمین کو کہتے ہیں، اگر ان قرائن پر نظر کی جائے جو آیہ مذکورہ بالا میں پائے جاتے ہیں، نیز روایات کا مطالعہ کیا جائے تو ان سے پتہ چلتا ہے کہ خوش قسمتی اور بدقسمتی کے دو مراکز (جنت و دوزخ) کے درمیان ایک اونچا مقام ہوگا جو دونوں مقاموں کے درمیان مانع، فاصل اور پردے کا کام دے گا۔ اس کی وجہ سے جنت و دوزخ کے درمیان فاصلہ ہوگا، اس کا نام "اعراف" ہے جس پر سے یہ لوگ دونوں طرف کے افراد کا مشاہدہ کریں گے اور ان کے نورانی یا سیاہ چہروں کی وجہ سے انہیں پہچان لیں گے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ "اصحاب اعراف" کون لوگ ہیں اور اس مقام پر کن افراد کو جگہ ملے گی؟

اوپر کی چار آیتوں کو اگر پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ ان افراد کے لیے دو طرح کی مختلف و متضاد صفتیں ذکر کی گئی ہیں:

پہلی اور دوسری آیت میں اعراف والوں کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ انہیں آرزو ہے کہ جنت میں جائیں لیکن کچھ موانع ایسے درپیش ہیں جن کی وجہ سے وہ جنت میں نہیں جا سکتے جب وہ بہشت والوں کو دیکھیں گے تو انہیں سلام کریں گے اور اس بات کی تمنا کریں گے کہ کاش وہ بھی ان کے ساتھ ہوتے لیکن وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہو سکتے اور جب ان کی نظر دوزخیوں پر پڑے گی تو ان کے دردناک انجام کو دیکھ کر وحشت زدہ ہوں گے اور خدا سے پناہ مانگیں گے۔

لیکن تیسری اور چوتھی آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بااثر اور قدرت مند افراد ہیں جو دوزخ والوں کی سرزنش کریں گے اور جو بندے مقام اعراف میں رہ گئے ہیں ان کی مدد کریں گے تاکہ وہ اس سے گزر کر منزل سعادت تک پہنچ جائیں۔

اعراف اور اصحاب اعراف کے متعلق جو روایتیں ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی دو متضاد گروہوں کی مظہر ہیں اور بہت سی روایات جو اہلبیت طاہرینؑ سے منقول ہیں ان میں ہمیں ملتا ہے:

"نحن الاعراف"

ہم اعراف ہیں۔[1]

یا یہ کہ:

"آل محمد هم الاعراف"

آل محمدؐ اعراف ہیں[2]

اسی طرح کی دوسری حدیثیں بھی ہیں۔

دیگر روایات میں ہے:

"هم اکرم الخلق علی الله تبارک وتعالیٰ"

وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محترم بندے ہیں[3]

یا یہ کہ:

"هم الشهداء علی الناس والنبیون شهداؤهم"

وہ لوگوں پر گواہ ہیں اور پیغمبران خدا ان کے اوپر گواہ ہیں[4]

نیز اسی طرح کی دیگر روایات ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ یہ افراد انبیاء، آئمہ اور صالحین ہیں۔

لیکن اس کے مقابلے میں دیگر روایات ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ پسماندہ بندے ہوں گے جن کی نیکیاں اور بدیاں برابر ہوں گی یا وہ گنہگار ہوں گے جنہوں نے اعمال نیک بھی کیے ہوں گے۔ جیسے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث ہے:

هم قوم استوت حسناتهم وسیئاتهم فان ادخلهم النار فبذنوبهم وان ادخلهم الجنة فبرحمته۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے حسنات و سیئات مساوی ہیں، اگر خدا نے انہیں دوزخ میں بھیج دیا تو ان کے گناہوں کی وجہ سے، اور اگر جنت میں داخل کر دیا تو اپنی رحمت کی وجہ سے۔[5]

---

[1] تفسیر برہان جلد دوم ص ۱۶، ۱۸، ۱۹

[2] نورالثقلین جلد دوم صفحہ ۳۳، ۳۴

[3] تفسیر برہان جلد دوم صفحہ ۱۷

اس طرح کی متعدد روایات اہل سنّت کی تفاسیر میں حذیفہ، عبداللہ بن عباس اور سعید بن جبیر وغیرہ سے مروی ہیں جن کا مضمون بھی یہی کچھ ہے۔[1]

انہی تفاسیر میں کچھ مدارک اس بات پر بھی دلالت کرتے ہیں کہ اہل اعراف صلحاء، فقہاء اور علماء ہوں گے یا اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہوں گے۔

ان آیات و روایات کا ظاہری مفہوم ابتدائی نظر میں متضاد معلوم ہوتا ہے۔ شاید یہی بات باعث بنی کہ مختلف مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان آیات و روایات میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے بلکہ یہ سب ایک ہی حقیقت کا اظہار کر رہی ہیں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ جس طرح ہم نے سابقاً بھی کہا ہے کہ تمام آیات و روایات کو دیکھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعراف ایک سخت و صعب العبور راستہ ہے، جو محل سعادتِ جاودانی یعنی بہشت سے پہلے پڑتا ہے یہ بات فطری ہے کہ قوی لوگ یعنی صالح و پاک افراد تو بہت جلدی سے اس گذرگاہ سے گزر جائیں گے لیکن کچھ کمزور بندے، یعنی جنہوں نے نیک و بد دونوں طرح کے اعمال کو آپس میں ملا دیا ہے وہ اس راستہ پر تھک کر بیٹھ جائیں گے۔

نیز یہ بات بھی قرینِ قیاس ہے کہ گروہوں کے سرپرست اور پیشوایانِ قوم، ان قائدینِ لشکر کی طرح جو سخت و خطرناک راستوں پر لشکر کے آخر میں چلتے ہیں تاکہ کوئی سپاہی اگر آگے بڑھنے سے رہ جائے تو اس کی مدد کر کے اسے خطرے سے باہر نکال دیں، بالکل اسی طرح یہ پیشوا اور امام اعراف میں ٹھہر جائیں گے تاکہ مؤمنین میں جو ضعیف افراد ہیں ان کی مدد کر سکیں اور وہ بندے جن میں نجات حاصل کرنے کی صلاحیت ہے وہ ان کی مدد کے زیرِ سایہ نجات پا سکیں۔

بنا بریں "اعراف" میں دو طرح کے لوگ پائے جائیں گے، ایک گروہ ضعیف گنہگار افراد جو رحمتِ الٰہی میں جگہ پائیں گے، دوسرے وہ رہبرانِ قوم اور عظیم پیشوا جو ہر جگہ اپنے ضعیف الحال تابعین کی مدد کریں گے، اس بنا پر ان آیات کے اگلے حصّہ میں انہی ضعیف الحال بندوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جبکہ بعد والے حصّہ میں بزرگانِ قوم، انبیاء، ائمہ و صلحا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بعض روایات میں بھی اس مطلب کی تائید ملتی ہے جیسے تفسیر علی بن ابراہیم میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

الاعراف کثبان بین الجنة والنار، والرجال الائمة، یقفون علی الاعراف مع شیعتھم وقد سبق المؤمنون الی الجنة بلا حساب...

اعراف جنت اور دوزخ کے درمیان میں کچھ ٹیلے ہوں گے، اور "رجال" سے مراد آئمہ طاہرین ہیں جو اپنے شیعوں کے ساتھ اعراف پر کھڑے ہوں گے اس حالت میں کہ مؤمنین

---

[1] تفسیر طبری جلد ۸ صفحہ ۱۳۶ و ۱۴۰ مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

بغیر کسی حساب کتاب کے جنت میں داخل کیے جا چکے ہوں گے۔

اس کے بعد مزید یہ بھی ہے کہ: آئمہ طاہرین اور پیشوایانِ برحق اس موقع پر اپنے گنہگار پیروکاروں سے کہیں گے کہ ابھی طرح سے دیکھو کر تمہارے نیک اعمال بھائی کس طرح جنت میں بغیر حساب کتاب کے جلدی سے چلے گئے ہیں اور یہ وہی موقع ہے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے: سلام علیکم لم یدخلوھا وھم یطمعون (یعنی وہ بہشتیوں پر سلام کریں گے درانحالیکہ ابھی خود بہشت میں داخل نہ ہوئے ہوں گے اگرچہ اس کے آرزو مند ہوں گے)۔

بعد ازاں ان سے کہا جائے گا کہ ذرا دشمنانِ حق کو بھی دیکھ لو کہ کس طرح آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جل رہے ہیں اور یہ وہی حال ہے جس کا اللہ نے اظہار فرمایا ہے:- واذا صرفت ابصارھم تلقآء اصحاب النار قالوا ربنا لا تجعلنا مع القوم الظالمین ...۔ اس کے بعد دوزخیوں سے کہیں گے کہ دیکھو یہ بندے (یعنی یہ پیروکار اور شیعہ جو گنہگار ہیں) وہی لوگ ہیں جن کے متعلق تم دنیا میں کہا کرتے تھے کہ ان پر اللہ کی رحمت ہرگز نہ ہوگی (حالانکہ اب اللہ کی رحمت ان کے شاملِ حال ہو چکی ہے) اس کے بعد ان بندوں کو جو گنہگار تو ہیں لیکن اپنے ایمان اور بعض اعمالِ نیک کی وجہ سے اس بات کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ انہیں بخش دیا جائے، آئمہ ہُدیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا جائے گا کہ تم بھی بہشت کی طرف روانہ ہو جاؤ کسی قسم کے خوف اور غم کی ضرورت نہیں ہے[1]

اسی طرح کا مضمون اہلِ سنّت کی تفسیروں میں بھی حذیفہ کی روایت سے حضرت پیغمبرؐ سے منقول ہوا ہے[2]

ہم ایک مرتبہ اور تکرار کرتے ہیں کہ حشر و نشر کی تمام جزئیات و تفاصیل جو احادیث و آیات میں بیان ہوئی ہیں وہ بعینہٖ اس طرح سے ہیں جیسے ہم دُور سے ایک سایہ دیکھیں اور پھر اس کی کیفیت بیان کریں حالانکہ وہ سایہ ہماری زندگی سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور ہم اپنے نارسا اور کوتاہ الفاظ کے ذریعے اس کی حکایت کرتے ہیں۔

ایک قابلِ توجہ نکتہ یہاں پر یہ ہے کہ جہانِ آخرت کی زندگی ان نمونوں اور معیاروں کی بنیاد ہے جو اسی دنیا میں پائے جاتے ہیں، اعراف کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہے کیونکہ اس دنیا میں لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہیں:

ایک تو وہ پکے مومن بندے جو اپنے ایمان و عمل کی وجہ سے اَبدی سکون کی منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

دوسرے وہ معاند اور ضدی دشمنانِ حق جو کسی طرح سے راہِ حق پر آنا گوارا نہیں کرتے۔

تیسرا وہ گروہ ہے جو ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک سخت گزرگاہ پر ہے۔ پیشوایانِ حق کی زیادہ تر

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۹، ۲۰۔

[2] تفسیر طبری جلد ۸ صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳۔

توجہ انہی پر ہے وہ ان کے پہلو میں رہیں گے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر اعراف کے مرحلہ سے انہیں نجات دے دیں گے اور مؤمنین کی صف میں لا کر کھڑا کر دیں گے۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قیامت کے روز انبیاء کرام اور ائمہ طاہرینؑ کا ان بندوں کے معاملات میں دخل دینا اور انہیں اس طرح سے جنت میں لے جانا خداوند کریم کی قدرت مطلقہ اور اس کی حاکمیت کے منافی نہیں ہے، کیونکہ یہ حضرات جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ خدا ہی کے اذن اور فرمان سے کرتے ہیں۔

۵۰ وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا
عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ
حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ
۵۱ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا
بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۞

ترجمہ

۵۰ دوزخ والے جنت والوں سے پکار کر کہیں گے کہ تھوڑا پانی، یا خدا نے تمہیں جو روزی بخشی ہے اس میں سے کچھ ہمیں بھی دے دو۔ تو وہ (جنت والے اس کے جواب میں) کہیں گے کہ خدا نے اس کو کافروں پر حرام قرار دیا ہے۔

۵۱ (ایسے کافر) جو خدا کے دین اور قانون کو کھیل تماشا سمجھتے تھے اور دنیاوی زندگی نے انہیں دھوکا دیا تھا۔ پس آج کے روز ہم انہیں اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح انہوں نے آج کے دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا اور ہماری نشانیوں کا انکار کرتے تھے۔

تفسیر

جنت کی نعمتیں دوزخیوں پر حرام ہیں

جب جنتی اور دوزخی لوگ سب کے سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں گے تو ان کے درمیان گفتگو شروع ہو گی جس کا مقصد یہ ہو گا کہ اہلِ دوزخ کو ان کے اعمال کی وجہ سے روحانی اور معنوی سزا دی جائے۔

پہلے دوزخی لوگ جو بہت بُری حالت میں ہوں گے جنت والوں سے پکار کر جنت کے پانی اور کھانے کی تمنا کریں گے۔ تاکہ ان کی جلا دینے والی تشنگی اور دیگر آلام میں کچھ کمی واقع ہو (ونادٰی اصحاب النار اصحاب الجنۃ ان افیضوا علینا من المآء او مما رزقکم اللہ)۔

لیکن فوراً اہلِ بہشت ان کے اس سوال کو یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ: یہ چیزیں اللہ نے کافروں پر حرام کر دی ہیں (قالوآ ان اللہ حرمھما علی الکٰفرین)۔

چند اہم نکات

۱۔ قرآن نے یہاں پر لفظ "نادٰی" استعمال کیا ہے جو دُور سے پکارنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان کافی فاصلہ ہو گا۔ ساتھ ہی یہ بات بھی بعید نہیں کہ یہ فاصلہ لاکھوں میل دُوری کا ہو لیکن بقدرتِ الٰہی دونوں گروہ ایک دوسرے کی بات سن سکیں گے بلکہ بعض اوقات ایک دوسرے کو اتنے فاصلہ کے باوجود دیکھ بھی سکیں گے۔ اگرچہ یہ بات گذشتہ زمانے میں بعض لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھیں لیکن اب تو وہ زمانہ آگیا ہے جس میں دُور کی صدا سننا یا دُور سے کسی کو دیکھنا ممکن ہو گیا ہے لہٰذا اس زمانہ میں اس بات پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔

۲۔ اہلِ دوزخ کی سب سے پہلی تمنا یہ بیان کی گئی ہے کہ انہوں نے پانی طلب کیا۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ جو شخص بھی آگ میں جلتا ہے اسے سب سے پہلے پانی کی طلب ہوتی ہے تاکہ اپنی سوزش کو تسکین پہنچا سکے۔

۳۔ مما رزقکم اللہ (جو کچھ اللہ نے تم کو روزی دی ہے اس میں سے) یہ جملہ ایک سربستہ جملہ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخیوں کو یہ تک پتہ نہ چلے گا کہ اہلِ جنت کو کیا کیا نعمتیں ملی ہیں اور ان کی ماہیت کیا ہے۔ یہ مطلب بعض احادیث کے بالکل مطابق ہے جن میں وارد ہوا ہے کہ جنت میں ایسی نعمتیں ہوں گی جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہو گا اور نہ کسی کان نے سنا ہو گا۔ بلکہ کسی کے ذہن میں بھی ایسی نعمتیں نہ آئی ہوں گی۔

ضمنی طور سے ایک مطلب اور بھی لفظ "او" میں مضمر ہے اور وہ یہ ہے کہ جنت کی دیگر نعمتیں خاص طور پر جنت کے میوے پانی کا بدل ہو سکتے ہیں اور ان سے انسان کی بھڑکتی ہوئی پیاس بھی بجھ سکتی ہے۔

۴۔ ان اللہ حرمھما علی الکافرین (خدا نے انہیں کافروں کے لیے حرام قرار دیا ہے) یہ جملہ اس امر

کی طرف اشارہ ہے کہ اہل بہشت کو یہ چیزیں دینے میں تو کوئی عذر نہ ہوگا کیونکہ ان کے دینے سے نہ تو کوئی کمی واقع ہوگی اور نہ ہی ان کے دلوں میں کسی کی طرف سے کینہ ہوگا یہاں تک کہ اپنے دشمنوں سے بھی وہ کوئی بغض و حسد نہ رکھتے ہوں گے لیکن دوزخیوں کی وضعیت کچھ ایسی ہے کہ وہ ان نعمات الٰہی سے بہرہ ور نہیں ہو سکتے یہ تحریم فی الحقیقت ایک طرح کی "تحریم تکوینی" ہے جیسے بہت سے بیمار لذیذ اور رنگا رنگ کھانوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اس کے بعد کی آیت ان کی محرومی کا سبب بیان کر رہی ہے اور اہل دوزخ کے صفات کو بیان کرنے کے ساتھ ہی اس امر کی وضاحت کر رہی ہے کہ ان لوگوں نے یہ اپنا انجام بد خود اپنے ہاتھوں فراہم کیا ہے پہلے فرمایا گیا ہے: یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے دین و مذہب کو کھیل تماشا بنا رکھا تھا (الذین اتخذوا دینهم لهوًا و لعبًا)۔

اور دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکا دیا تھا (وغرتهم الحیاة الدنیا)۔

یہ امور اس بات کا سبب بنے کہ وہ اپنی خواہشات کی دلدل میں اتر جائیں اور تمام چیزوں کو یہاں تک کہ روز معاد کو بھی بھلا بیٹھیں اور انبیاء کے فرامین اور اللہ کی آیتوں کا انکار کر دیں لہٰذا اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے جس طرح انہوں نے آج کے دن کو بھلا دیا تھا اور جس طرح انہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کر دیا تھا (فالیوم ننساهم کما نسوا لقآء یومهم هٰذا و ما کانوا بایاتنا یجحدون)۔

یہ بات بدیہی ہے کہ یہاں پر "نسیان اور فراموشی" کی نسبت جو اللہ کی طرف دی گئی ہے اس سے اس کے حقیقی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرے گا جیسا معاملہ کوئی فراموش کر دینے والا کرتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی نہ بھولنے والا شخص اپنے بھول جانے والے دوست سے یہ کہتا ہے کہ اب جبکہ تم نے مجھے بھلا دیا ہے تو میں بھی تمہیں بھلا دوں گا، مطلب یہ ہے کہ تمہارے ساتھ وہ طرز عمل اختیار کروں گا جو بھول جانے والا کرتا ہے۔

ضمنی طور سے یہ بھی معلوم ہوا کہ گمراہی اور بھٹکنے کا پہلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی قسمت بنانے والے مسائل کو کوئی اہمیت نہ دے اور انہیں کھیل تماشہ سمجھ کر ٹال دے۔ یہ حرکت اس بات کا سبب بنتی ہے کہ آخر کار اس سے کفر مطلق سرزد ہوتا ہے اور وہ تمام حقائق کا انکار کر بیٹھتا ہے۔

(۵۲) وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

(۵۳) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

ترجمہ

(۵۲) ہم ان کے لیے ایک ایسی کتاب لائے جس کی ہم نے علم کے ساتھ شرح کی (ایک ایسی کتاب) جو ان لوگوں کے لیے سرمایۂ ہدایت و رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔

(۵۳) کیا انہیں اس بات کا انتظار ہے کہ وہ آخر میں اللہ کی تہدیدوں کو دیکھیں گے[1] جب یہ امر ظاہر ہوگا تو اس وقت (عبرت حاصل کرنے کا وقت گزر چکا ہوگا) وہ لوگ جو اس سے قبل اسے بھول چکے ہوں گے کہیں گے کہ ہمارے رب کے فرستادہ رسول برحق آئے تھے، آیا آج کے روز ہمارے لیے کچھ ایسے شفاعت کرنے والے ہیں جو ہماری شفاعت کریں؟ یا (اس بات کا امکان ہے کہ) ہم دوبارہ پلٹا دیے جائیں؟ اور وہ اعمال بجا

---

[1] یہاں پر تاویل کے معنی مترجم نے "تہدید" سے کیے ہیں، حالانکہ "تاویل" کے معنی "مفاتحے عام" کے ہیں یہ لفظ "تنزیل" کے مقابلہ میں ہے جس کے معنی "مفاتحے خاص" کے ہیں، اسی سے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے کہ اے علی: تم قرآن کی تاویل پر جنگ کرو گے جس طرح میں نے اس کی تنزیل پر جنگ کی ہے، یہاں پر مراد یہ ہے کہ ایک روز ایسا آئے گا جب قرآن کا مفہوم عام ظاہر ہوگا تفسیر قمی میں ہے کہ ایسا حضرت حجت کے ظہور کے وقت اور قیامت کے روز ہوگا۔ (مترجم)

لائیں جو ہم بجا نہ لاتے تھے (لیکن) انہوں نے اپنے وجود کا سرمایہ اپنے ہاتھ سے کھو دیا ہے اور جو جھوٹے معبود انہوں نے بنائے تھے وہ سب گم ہوگئے ہیں (اب نہ توان کیلئے پلٹنے کی کوئی راہ ہے، اور نہ کوئی ان کی شفاعت کرنے والا موجود ہے)۔

تفسیر

پہلی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کفار کی محرومیت اور ان کا انجام بد، خود انہی کی کوتاہیوں اور ان کی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ ورنہ خدا وند کریم کی جانب سے ان کی ہدایت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی تھی۔ اسی بنا پر خدا فرماتا ہے: ہم نے ان کی ہدایت کے لیے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، ان کے لیے ایک ایسی کتاب بھیجی جس کے تمام اسرار و رموز کی پوری آگاہی کے ساتھ تشریح کر دی (ولقد جئناهم بکتاب فصّلناه علیٰ علم)۔

ایسی کتاب جو سرمایۂ ہدایت اور موجب رحمت ہے ایمان لانے والوں کے لیے۔ اگرچہ ہٹ دھرم اور ضدی انسان اس سے بے بہرہ رہ گئے (ھدی ورحمة لقوم یؤمنون)۔

اس کے بعد کی آیت میں تباہ کاروں اور بے راہ رووں کے ہدایت الٰہی کے بارے میں غلط طرز تفکر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: گویا ان لوگوں کو اس بات کا انتظار ہے کہ خدا کے وعدوں اور تہدیدوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں (جنتیوں کو جنت میں اور دوزخیوں کو دوزخ میں اپنی آنکھ سے دیکھ لیں) تاکہ اس وقت ایمان قبول کریں (ھل ینظرون الا تأویلہ)۔

لیکن یہ کیسا غلط انتظار اور کیسی بے جا توقع ہے کیونکہ جب وہ وقت آپہنچے گا کہ وہ اپنی آنکھوں سے ان الٰہی وعدوں کے نتیجوں کو دیکھیں گے تو فرصت کا موقع ہاتھ سے نکل چکا ہوگا اور پلٹنے کا راستہ بند ہو چکا ہوگا۔ یہ وہ وقت ہوگا کہ وہ لوگ جنہوں نے کتاب خدا اور آسمانی قوانین کو دنیا میں پس پشت ڈال دیا تھا اعتراف کریں گے کہ خدا کے تمام فرستادہ بندے (رسول) حق کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے اور ان کی تمام باتیں بھی برحق تھیں (یوم یأتی تأویلہ یقول الذین نسوہ من قبل قد جآءت رسل ربنا بالحق)۔

لیکن اس وقت وہ خوف اور اضطراب کے دریا میں ڈوب جائیں گے اور اپنی نجات کی فکر میں پڑ جائیں گے اور کہیں گے: آیا کچھ شفاعت کرنے والے ہیں جو ہماری شفاعت کریں (فھل لنا من شفعآء فیشفعوا لنا)۔

یا اگر ہماری قسمت میں شفیع (بخشوانے والے) نہیں، اور اصولی طور سے ہم قابلِ شفاعت نہیں ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم دنیا میں دوبارہ پلٹا دیئے جائیں اور جو اعمال ہم بجا لاتے ہیں ان سے مختلف دوسرے اعمال بجا لائیں اور حق و حقیقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرلیں" (او نرد فنعمل غیر الذی کنا نعمل)۔

لیکن افسوس کہ یہ بیداری بہت دیر میں اور بعد از وقت ہوگی۔ نہ تو اس وقت کوئی لوٹ آنے کی راہ ہو گی اور نہ کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا کیونکہ انہوں نے اپنی ہستی کا سرمایہ اپنے ہاتھ سے کھو دیا ہوگا اور وہ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہوں گے، ایسا گھاٹا جو ان کے وجود کو ہر طرف سے گھیرے گا (قد خسروا انفسھم)

اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ بت اور ان کے خود ساختہ معبود اس عالم میں ان کے کچھ کام نہ آئیں گے اور درحقیقت سب کے سب ان کی نظروں سے گم ہو جائیں گے" (وضل عنھم ما کانوا یفترون)۔

گویا آخرِ آیت کے دو جملے ان کی درخواست کا جواب ہے' یعنی اگر وہ شفاعت چاہتے ہیں تو انہی بتوں کے دامن کو تھامیں جن کے آگے دنیا میں سجدہ کرتے تھے۔

یہ اس صورت میں دُنیا میں پلٹ سکتے تھے کہ ان کے پاس سرمایہ موجود ہو لیکن اسے تو انہوں نے دنیا میں تلف کر دیا۔

اس آیت سے پہلے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے اعمال میں آزاد و خود مختار ہے، ورنہ دوبارہ دنیا میں جانے کی تمنا نہ کرتا تاکہ اپنے اعمالِ بد کی تلافی اور تدارک کرے۔

دوسری یہ بات معلوم ہوئی کہ جہانِ آخرت جائے عمل اور فضیلت حاصل کرنے کا مقام نہیں ہے۔

(۵۴) اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِیۡ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ۟ یُغۡشِی الَّیۡلَ النَّہَارَ یَطۡلُبُہٗ حَثِیۡثًا ۙ وَّالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ وَالنُّجُوۡمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمۡرِہٖ ؕ اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ ؕ تَبٰرَکَ اللّٰہُ رَبُّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝

ترجمہ

(۵۴) تمہارا پروردگار وہ خدا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز (چھ دوروں) میں پیدا کیا، اس کے بعد وہ جہان کے انتظام کی طرف متوجہ ہوا، وہ رات (کے تاریک

پردہ) سے دن کو ڈھانپ لیتا ہے اور رات دن کے پیچھے پیچھے رواں دواں ہے اور اس نے سورج، چاند اور ستاروں کو پیدا کیا اس حال میں کہ یہ سب اس کے تابع فرمان ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ (جہان کا) پیدا کرنا اور اس کا انتظام کرنا اللہ کے لیے اور اسی کے حکم سے ہے۔ برکت والا (اور لازوال) ہے وہ خدا جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

تفسیر

ہم نے پچھلی آیتوں میں پڑھا کہ قیامت کے روز مشرکوں کو پتہ چلے گا کہ انہوں نے اپنے معبود کے انتخاب میں سخت دھوکا کھایا تھا۔ اب اس آیت میں حقیقی معبود اور اس کی خاص صفات سے متعلق بحث ہے تاکہ وہ لوگ جو حق کے متلاشی ہیں قبل اس کے کہ قیامت کا دن آپہنچے اسی دنیا میں اچھی طرح سے پہچان لیں۔ ابتدا میں فرمایا گیا ہے: تمہارا پروردگار وہ معبود ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ روز میں پیدا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ "معبود" سوائے "پیدا کرنے والے" کے اور کوئی نہیں ہو سکتا (ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام)۔

کیا جہان چھ روز میں پیدا ہوا ہے؟

یہ بحث کہ جہان کو اللہ نے چھ روز میں خلق کیا، قرآن کریم میں سات جگہ پر آئی ہے[1] لیکن ان میں سے تین مقامات پر "آسمانوں اور زمین" کے علاوہ "ما بینہما" بھی ہے (جس کے معنی یہ ہیں۔ اور جو کچھ بھی ان دونوں کے درمیان ہے) یہ اضافہ فی الحقیقت مزید توضیح کے لیے ہے ورنہ فی الحقیقت زمین اور آسمان کے درمیان جو کچھ بھی ہے وہ اگر اوپر کی جہت میں ہے تو لفظ "آسمان" میں داخل ہے، اور اگر نیچے کی جہت میں ہے تو "زمین" کے مفہوم میں داخل ہے۔

یہاں پر سب سے پہلے جو سوال ذہن انسانی میں آسکتا ہے وہ یہ ہے کہ زمین و آسمان کی خلقت سے پہلے دن اور رات کا تو کوئی وجود نہ تھا لہٰذا چھ روز کیسے بنے؟ کیونکہ دن رات تو اپنے محور پر زمین کی گردش کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

علاوہ بریں تمام کائنات میں چھ روز میں یعنی ایک ہفتہ سے بھی کم عرصے میں پیدا ہونا بھی قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کیونکہ آج کا علم یہ کہتا ہے کہ، لاکھوں سال گزرے جب جا کے زمین و آسمان نے یہ موجودہ

---

[1] ایک تو یہی آیت، اس کے علاوہ سورۂ یونس ۳، ہود ۷، فرقان ۵۹، سجدہ ۴، ق ۳۸ اور حدید ۴ میں اس بات کا تذکرہ ہے۔

شکل اختیار کی۔

ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت ظاہر ہوگا جب لفظ "یوم" اور اس کے ہم معنی الفاظ جو دوسری زبانوں میں رائج ہیں، پر توجہ کی جائے۔ کیونکہ بسا اوقات "یوم" ایک دوران اور زمانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، چاہے یہ دوران ایک سال کا ہو، ایک ملین سال کا، یا کئی کروڑ سال کا۔ اس امر کے کئی شواہد ہیں کہ "یوم" دوران کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہوں:

۱۔ قرآن میں لفظ "یوم" بارہا استعمال ہوا ہے۔ اس میں سے بہت سے مقامات پر عام شب و روز کے معنی میں نہیں آیا مثلاً عالم محشر کو "یوم القیامۃ" سے تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ روز قیامت ایک طولانی مدت ہوگی جو بعض قرآنی پچاس ہزار سال کے برابر ہوگی (سورۃ معارج آیت ۴)۔

۲۔ کتب لغت میں بھی اس کی تائید ملتی ہے کہ "یوم" کبھی تو آفتاب کے طلوع اور غروب کی درمیانی مدت کو کہتے ہیں اور کبھی زمانے کے ایک حصے کو کہتے ہیں۔ اس کی مقدار جتنی بھی ہو۔[1]

۳۔ روایات اور ہادیان دین کے ارشادات میں بھی لفظ "یوم" "دوران" کے معنی میں بہت آیا ہے جیسا کہ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"الدھر یومان یوم لک ویوم علیک"

تیری دنیا کے دو روز ہیں ایک روز وہ جو تیرے لیے فائدہ بخش ہے، دوسرا روز وہ جو تیرے لیے زیان بخش ہے۔

تفسیر برہان میں بھی اسی آیت کے ذیل میں تفسیر علی بن ابراہیم قمی سے نقل کیا گیا ہے کہ امامؑ نے فرمایا:

"فی ستۃ ایام یعنی فی ستۃ اوقات"

چھ روز یعنی چھ دوران۔

۴۔ روزمرہ کی گفتگو اور شعراء کے اشعار میں بھی لفظ "یوم" "دوران" کے معنی میں بولا جاتا ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ایک روز وہ تھا جب کرۂ زمین آگ کا ایک گولہ تھا پھر ایک روز وہ آیا جب وہ ٹھنڈا ہوگیا اور اس میں زندگی کے آثار پیدا ہوتے، جبکہ زمین کی شعلہ ور حالت کئی کروڑ سالوں تک باقی رہی۔

یا یہ کہ ہم کہتے ہیں کہ ایک روز بنی امیہ نے خلافت اسلام کو غصب کیا، دوسرے روز بنی عباس نے بھی یہی عمل کیا، حالانکہ ان دونوں کا دوران حکومت بیسیوں یا سینکڑوں سال کا تھا۔

یہاں پر کلیم کاشانی کے دو پُر لطف اور پُر معنی شعر بھی ملاحظہ ہوں:

بدنامی حیات دو روزی نبود بیش   آن ہم کلیم با تو بگویم چسان گذشت

---

[1] راغب نے اپنی کتاب مفردات میں کہا ہے کہ لفظ "یوم" کا اطلاق کبھی تو طلوع آفتاب سے غروب کی درمیانی مدت پر ہوتا ہے اور کبھی زمانہ کی ایک مدت پر یہ لفظ بولا جاتا ہے، وہ مدت جتنی بھی ہو۔

یک روز صرف بستن دل شد باین و آن روز دگر بہ کندن دل زین و آن گذشت

یعنی زندگی کی بدنامی صرف دو روز کے لیے تھی، وہ بھی اے کلیم تجھ سے کیا بیان ہو کہ کس طرح گذرے ایک دن تو دنیا کی لذتوں کے ساتھ دل باندھنے میں گزر گیا اور دوسرا دن دنیا کی لذتوں سے دل توڑنے میں کٹ گیا۔

اس تمام بحث کا یہ نتیجہ نکلا کہ خداوند عالم نے زمین و آسمان کو چھ ادوار میں پیدا کیا۔ ہو سکتا ہے کہ ان ادوار میں سے ہر دَور کئی ملین سال کا ہو اور اس طرح سے ہونا آج کے علم سے کسی طرح نہیں ٹکراتا۔

یہ چھ ادوار ہو سکتا ہے کہ اس طرح پر ہوں :

۱- وہ روز جس میں سارا جہان گیس کے ایک مجموعہ کی شکل میں تھا، جو سُرعت کے ساتھ گھومنے کے سبب سرگرداں ہو گیا اور اس سے یہ الگ الگ کُرّے وجود میں آتے۔

۲- یہ کُرّے تدریجی طور پر پگھلے ہوتے اور نورانی یا ٹھنڈے اور قابلِ سکونت کُرّوں کی شکل میں بن گئے۔

۳- پھر ایک دن نظامِ شمسی بنا، اور زمین سورج سے الگ ہو گئی۔

۴- پھر ایک دن زمین ٹھنڈی ہو کر قابلِ سکونت بنی اور اس لائق ہوئی کہ اس میں جاندار رہ سکیں۔

۵- پھر ایک دن سبزہ اور درخت اس میں نمودار ہوتے۔

۶- پھر ایک دن وہ آیا کہ حیوان اور حضرت انسان بھی اس میں نمودار ہوتے۔

یہاں پر جو کچھ اس جہان کے چھ ادوار کے متعلق بیان کیا گیا ہے وہ سورۂ فصلت کی آیات ۸ تا ۱۱ سے قابلِ تطبیق ہے جس کی مفصل شرح انشاء اللہ انہی آیات کے ذیل میں پیش کی جائے گی۔

اللہ نے دُنیا کو ایک لحظہ میں کیوں پیدا نہ کیا ؟

یہاں پر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ خداوند کریم اپنی بے انتہا قدرت کی وجہ سے سارے آسمانوں اور زمینوں کو ایک لحظہ میں پیدا کر سکتا تھا۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ اس نے اس جہان کو ایک طولانی مدت میں پیدا کیا ؟۔

اس سوال کا جواب صرف ایک نکتہ کے سمجھنے سے مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ خلقتِ جہاں اگر ایک لحظہ میں ہو جاتی تو پروردگار کی عظمت، قدرت اور علم کی کمتر حکایت کرتی لیکن اگر یہ خلقت مختلف مرحلوں میں، مختلف شکلوں میں بچے تُلے حساب شدہ پروگرام کے ماتحت عمل میں آئی ہے تو اس طرح پر خالقِ اکبر کے وجود کی واضح تر دلیل بنتی ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ اگر انسان کا نطفہ ایک سیکنڈ میں ایک مکمل بچہ بن جاتا، تو وہ اس قدر اس خلقت کی عظمت کا مظہر نہ بنتا لیکن جس وقت اس کی خلقت نو مہینوں میں ہوئی ہر دن اس نے ایک ایک مرحلہ طے کیا، اور ہر مہینہ ایک نئی شکل اختیار کی تو اس طرح سے ان مراحل کی تعداد کے مطابق پیدا کرنے

والے کی عظمت و قدرت کی تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو نشانیاں ملتی چلی گئیں۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ خدا تعالٰی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے کے بعد ان کی رہبری اپنے دستِ قدرت میں سنبھالی، یعنی یہ کہ نہ صرف سارے جہانوں کی خلقت اس نے کی بلکہ ان کا نظام اور ان کی رہبری بھی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے (ثم استوٰی علی العرش)۔

یہ فی الحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے جو اللہ کو صرف خلقتِ کائنات کی علت جانتے ہیں اور اس کی بقاء کی علت نہیں جانتے۔

عرش کیا ہے؟

لغت میں "عرش" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس میں چھت لگی ہوئی ہو اور بعض اوقات خود چھت کو بھی عرش کہتے ہیں جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

"اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ وَّھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا"

یا اس شخص کی طرح جو ایک آبادی کے پاس سے گزرا جبکہ وہ آبادی برباد پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل۔ (بقرہ-۲۵۹)۔

کبھی یہ لفظ اونچے تخت پر بھی بولا جاتا ہے جیسے بادشاہوں کے تخت، جس طرح ہم حضرت سلیمانؑ کے قصہ میں پڑھتے ہیں:

"اَیُّکُمْ یَاْتِیْنِیْ بِعَرْشِھَا"

تم میں سے کون اس (بلقیس) کا تخت یہاں لا سکتا ہے (النمل-۳۸)۔

نیز ان پاڑوں کو بھی "عرش" کہتے ہیں جو درختوں کی بیلوں کو اوپر چڑھانے کے لیے باندھی جاتی ہیں، قرآن کریم میں "عرش" کا یہ استعمال بھی موجود ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

"وھو الذی انشأ جنّات معروشات و غیر معروشات"

وہ خدا وہ ہے جس نے پاڑوں پر چڑھنے والے اور نہ چڑھنے والے درختوں کے باغ پیدا کیے (انعام-۱۴۱)۔

لیکن جس وقت یہ لفظ خداوندکریم کی نسبت بولا جاتے اور یہ کہا جائے کہ "عرشِ خدا" تو اس سے اس جہان ہستی کا سارا مجموعہ مراد ہے جو فی الحقیقت تختِ حکومتِ الٰہی ہے۔

اگر یہ جملہ "استوٰی علی العرش" بولا جائے تو یہ اس امر کے لیے کنایہ ہے کہ "ایک حکمران اور زمامدار اپنی سلطنت کے امور پر مسلط و غالب ہوگیا" اس کے برعکس یہ جملہ "ثل عرشہ" (اس کا تخت برباد ہوگیا)

اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی بادشاہ کی حکومت الٹ جائے، فارسی میں بھی یہ تعبیر کنائی بہت استعمال ہوتی ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں ملک میں لوگوں نے بغاوت کر دی اور انہوں نے وہاں کے حکمران کو تخت سے نیچے اتار لیا، حالانکہ ممکن ہے کہ وہاں کسی تخت کا سرے سے وجود نہ ہو، یا یہ محاورہ کہ کچھ لوگ فلاں شخص کی حمایت میں کھڑے ہوگئے اور انہوں نے اس کو تخت پر بٹھا دیا، یہ سب محاورے قدرت و حکومت پانے یا اس کے جانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

بنا بریں زیر بحث آیت میں "استوٰی علی العرش" کا جملہ اس بات کا کنایہ ہے کہ پروردگار عالم آسمانوں اور زمین کی خلقت کے بعد ان پر ہر حیثیت سے مسلط و غالب ہوا اور اس نے ان کا نظم و نسق اپنے دستِ قدرت میں سنبھالا۔

یہیں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ: جن لوگوں نے مذکورہ بالا آیت کو "تجسم خدا" کی دلیل بنایا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کنائی معنی کی طرف توجہ نہیں کی جو ہم نے یہاں پر بیان کیے ہیں۔

"عرش" کے ایک معنی اور بھی ہیں، یہ معنی اس جگہ لیے جاتے ہیں جہاں یہ لفظ "کرسی" کے مقابلے میں بولا جائے۔ اس طرح کے مواقع پر لفظ "کرسی" (جس کے معنی غالباً اس چھوٹے تخت کے ہیں جس کے چھوٹے پائے ہوتے ہیں) سے ممکن ہے "مادی دنیا" مراد ہو اور "عرش" سے مراد وہ جہان مراد ہو جو "ماورائے مادہ" ہے جیسے عالم ارواح اور ملائکہ، جیسا کہ آیت "وسع کرسیه السمٰوات والارض" کی تفسیر میں سورۃ بقرہ میں ہم تفصیل سے بیان کر آئے ہیں۔

اس کے بعد فرماتا ہے کہ (وہ خدا) وہ ہے جو رات کو مثل ایک پردہ اور پوشش کے دن کے اوپر ڈال دیتا ہے اور دن کی روشنی کو رات کے تاریک پردوں سے ڈھانپ دیتا ہے (یغشی الیل النھار)۔

یہاں پر قابل توجہ یہ بات ہے کہ تعبیر مذکورہ بالا صرف رات کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ "دن کے ذریعے رات کو ڈھانپ لیتا ہے" کیونکہ پوشش صرف تاریکی کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے نہ کہ روشنی کے ساتھ۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: "رات تیزی کے ساتھ دن کے پیچھے پیچھے رواں دواں ہے" جیسے ایک قرضخواہ اپنے قرضدار کے پیچھے بھاگتا ہے (یطلبه حثیثا)۔

کرۂ زمین میں دن اور رات کی جو کیفیت ہے یہ تعبیر اس کے عین مناسب ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص کرۂ زمین سے باہر جاکر یہ دیکھے کہ کس طرح زمین اپنے محور پر بڑی تیزی سے محوِ گردش ہے (تقریباً ۳۰ کلومیٹر فی منٹ کی رفتار سے) اور آفتاب کی جہت مخالف میں ایک مخروطی الشکل سایہ ایک پُراسرار دیو پیکر ہیولے

۱؎ اردو میں بھی اسی طرح کے جملے استعمال ہوتے ہیں۔ (مترجم)

کی طرح روشنی کے پیچھے پیچھے گھوم رہا ہے تو اسے (یطلبہ حثیثا) کی تعبیر کا صحیح لطف حاصل ہوگا اور یہ سمجھ میں آئے گا کہ دن کے متعلق یہ کیوں نہ کہا کیونکہ سورج کا نور تو نصف کرۂ زمین پر پھیلا ہوا ہے اور اس کی کوئی شکل نہیں بنتی۔

اس کے بعد مزید فرمایا ہے: وہ ہے جس نے سورج، چاند اور ستاروں کو پیدا کیا، اس حال میں کہ سب اس کے فرمانبردار ہیں (والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ)۔

(شمس و قمر اور ستاروں کی تسخیر کے بارے میں متعلقہ آیات کے ذیل میں انشاء اللہ ہم آئندہ گفتگو کریں گے)۔

جہانِ ہستی اور نظام شب و روز کی پیدائش اور چاند، سورج اور ستاروں کی خلقت کے ذکر کے بعد مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: آگاہ ہو جاؤ کہ پیدا کرنا اور جہانِ ہستی کا انتظام کرنا صرف اس کے ہاتھ میں ہے (الا لہ الخلق والامر)۔

"خلق" و "امر" سے کیا مراد ہے؟

"خلق" و "امر" سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان کافی بحث ہوئی ہے لیکن اس آیت میں جو قرآن میں نیز دیگر آیات کے قرآن پر اگر نظر کی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "خلق" سے مراد آفرینش اوّل ہے، اور "امر" سے مراد وہ قوانین و نظام ہے جو عالم ہستی پر حکومت کرتا ہے اور جس کی وجہ سے سارا نظام جہان چل رہا ہے۔

یہ تعبیر درحقیقت ان لوگوں کا جواب ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ خدا نے اس جہان کو پیدا کرنے کے بعد اپنے حال پر چھوڑ دیا اور خود کنارے بیٹھ گیا اور اب وہ کچھ نہیں کر رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عالم ہستی اپنی ایجاد میں تو خدا کا محتاج ہے لیکن اپنی بقا میں اسے خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ آیت کہتی ہے: جس طرح کائنات اپنی آفرینش میں اس کی محتاج ہے اسی طرح تدبیر، دوام حیات اور اس کے چلانے میں بھی اسی کی ذات سے وابستہ ہے، اگر ایک لحظہ کے لیے لطفِ خدا اس کا ساتھ چھوڑ دے تو پورا نظام عالم تباہ و برباد ہو جائے۔

بعض فلاسفہ کا یہ خیال ہے کہ عالم "خلق" سے عالم "مادہ" اور عالم "امر" سے عالم "ارواح" مقصود ہے، کیونکہ عالم خلق تدریجی پہلو رکھتا ہے اور یہ جہان مادہ کی خصوصیت ہے اور عالم امر فوری و دفعۃً پہلو رکھتا ہے اور یہ ماوراء مادہ کی خصوصیت ہے جیسا کہ قرآن میں ہے:

"اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ"

جب خدا کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو حکم دیتا ہے کہ تو ہو جا! تب وہ ہو جاتی ہے (یٰسین-۸۲)

لیکن اگر لفظ "امر" کے قرآن میں موارد استعمال پر نظر کی جائے یہاں تک کہ اگر جملہ "والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ" پر نظر کی جائے جو زیر بحث آیت میں ہے، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ "امر" کے معنی ہر طرح کے فرمان الٰہی کے ہیں، چاہے وہ مادّی دنیا سے متعلق ہو یا ماورائے مادّہ سے (غور کریں)۔
آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے: برکت والا ہے وہ خدا جو سارے جہانوں کا پالنے والا ہے (تبارک اللہ رب العالمین)۔
درحقیقت یہ جملہ ارض و سماء، ماہ و خورشید اور ستاروں کی خلقت اور ان کی تدبیر کے ذکر کے بعد مقام مقدس الٰہی کی ایک طرح کی ستائش ہے، جو بندوں کو تعلیم دینے کی غرض سے کی گئی ہے۔
"تبارک" "برکت" کے مصدر سے ہے، اس کی بھی اصل "برک" (بروزن ورک) ہے، جس کے معنی اونٹ کے سینے کے ہیں اور چونکہ اونٹ جب یہ چاہتا ہے کہ کسی جگہ جم کر بیٹھے، اپنا سینہ زمین سے چسپاں کر دیتا ہے، اس بنا پر اس لفظ کے معنی میں "ثابت رہنا" شامل ہو گیا، پھر اس کے بعد جو نعمت بھی پائیدار اور ثابت رہنے والی ہوتی اسے برکت کہا جانے لگا۔ بعد ازاں ہر اس موجود کو جو عمر طولانی رکھتی ہو یا اس کے آثار مستمر و مسلسل ہوں "موجود مبارک" یا "پُر برکت" کہا گیا۔ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ تالاب کو بھی "برکہ" کہتے ہیں یہ بھی اسی وجہ سے ہے کہ اس میں پانی دیر تک ٹھہرا رہتا ہے۔
یہاں سے معلوم ہوا کہ ایک "پُر برکت" سرمایہ وہ ہے جو جلدی زوال پذیر نہ ہو۔ اسی طرح ایک "مبارک" موجود وہ ہے جس کے فیض کے آثار ایک طولانی مدت تک برقرار رہیں۔ لہٰذا یہ بات بدیہی ہے کہ اس مفہوم کا بہترین مصداق خداوند عالم کی ذات بابرکت ہے۔ وہ ایک وجود مبارک ازلی و ابدی ہے جو تمام برکتوں اور نیکیوں کا سرچشمہ ہے جس کی خیر و برکت ہمیشہ جاری و ساری رہنے والی ہے۔ تبارک اللہ رب العالمین۔
(سورۂ انعام کی آیت ۹۲ کے ذیل میں بھی ہم اس موضوع پر گفتگو کر آئے ہیں ملاحظہ ہو)۔

۵۵ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝

۵۶ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۚ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

ترجمہ

(۵۵) اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور تنہائی میں پکارو اور (زیادتی سے ہاتھ اٹھالو کیونکہ) وہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

(۵۶) اور زمین میں فساد نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے، اور خدا کو خوف و امید کی حالت میں پکارو (خوف ذمہ داریوں کا، امید اس کی رحمت کی) کیونکہ اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے نزدیک ہے۔

تفسیر

قبولیتِ دُعا کی شرائط

گزشتہ آیات سے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ عبودیت اور بندگی کا تنہا سزا وار خدا ہے۔ اسی کے ذیل میں یہاں حکم دیتا ہے کہ "دعا و مناجات" جو روح عبادت ہے صرف خدا کے سامنے ہونا چاہیئے "اپنے پروردگار کو گڑگڑا کے اور تنہائی میں پکارو" (ادعوا ربکم تضرعا و خفیۃ)۔

"تضرع" اصل میں مادّہ "ضرع" (بروزن فرع) بمعنی پستان سے لیا گیا ہے، اس بنا پر فعل "تضرع" کے معنی پستان سے دودھ دوہنے کے ہیں۔ چونکہ دودھ دوہتے وقت انگلیاں پستان کی مختلف جہتوں پر پڑتی رہتی ہیں، لہٰذا یہ لفظ اس کے لیے بولا جاتا ہے جو مختلف طریقوں سے کسی بڑے کے سامنے (اس کی خبر لینے کے لیے) خضوع وخشوع اور عجز و فروتنی کا اظہار کرے۔

بنا بریں اگر آیت مذکورہ بالا میں ہم پڑھتے ہیں کہ خدا کو تضرع (گڑگڑا کے) پکارو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے بڑے خضوع وخشوع اور تواضع کے ساتھ پکارو، کیونکہ دعا کی حقیقت یہ نہیں ہے کہ خدا کو صرف زبان سے پکارا جائے بلکہ دُعا کے معنی یہ ہیں کہ دعا دل کی گہرائیوں میں اتر کر اوپر جائے، بلکہ دعا کرنیوالے کے روئیں روئیں میں دعا کا مفہوم اتر جائے اور زبان تمام اعضائے بدن کی نمائندگی میں دعا کے الفاظ کو ادا کرے۔

اس آیت میں یہ جو حکم دیا گیا ہے کہ خدا کو خفیہ طور سے یعنی تنہائی میں پکارو اور اکیلے میں اس سے دعا کرو یہ اس لیے ہے کہ دعا کے وقت ریا نہ آنے پائے اور اخلاص پیدا ہو جائے، دل و دماغ خدا کے

حضور میں پوری طرح سے متوجہ ہو جائیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کسی غزوہ میں تھے، سپاہیان اسلام ایک درہ کے پاس پہنچے تو انہوں نے "لآ اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ وَاللّٰہ اَکبر" کا نعرہ بلند کیا۔ اس وقت حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

یآایھا الناس اربعوا علیٰ انفسکم اما انکم لاتدعون اصم ولاغائباً انکم تدعون سمیعا قریبا انہ معکم۔

اے لوگو! کچھ آہستہ سے خدا کو پکارو (آہستگی کے ساتھ دعا کرو) تم کسی بہرے اور غیر حاضر کو تو نہیں پکار رہے ہو تم اس ہستی کو پکار رہے ہو جو بڑا سننے والا اور تم سے قریب ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے[1]

اس آیت میں یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ "تضرع" سے مراد ہے آشکارا طور پر دعا کرنا، اور "خفیۃ" سے تنہائی میں دعا کرنا مراد ہے۔ کیونکہ ہر مقام کا ایک تقاضا ہوتا ہے، کبھی کھل کر اور بلند دُعا کرنا ہوتی ہے اور کبھی چھپ کر اور چپکے چپکے دعا کی جاتی ہے۔ اس آیت کے ذیل میں جو روایت علی بن ابراہیم سے نقل ہوئی ہے وہ اس مطلب کی تائید کرتی ہے۔

آخر آیت میں فرماتا ہے: خدا تجاوز کرنے والوں (حد سے گزرنے والوں) کو دوست نہیں رکھتا (انہ لا یحب المعتدین)۔

یہ جملہ اپنے دامن میں ایک وسیع معنیٰ رکھتا ہے جو ہر قسم کے تجاوز پر محیط ہے، چاہے وہ دعا کے وقت چیخنے پکارنے کی بات ہو، یا تظاہر اور ریاکاری کا معاملہ ہو یا ہنگام دعا غیر خدا کی طرف توجہ کرنا ہو، لفظ "معتدی" ان سب کے بارے میں ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ایک حکم کی طرف اشارہ ہوا ہے جو فی الحقیقت شرائطِ دعا میں سے ایک شرط ہے۔ فرمایا گیا ہے: روئے زمین پر فساد نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے (ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دعا اس وقت خدا کے حضور میں درجۂ اجابت تک پہنچتی ہے جبکہ اس میں ضروری شرائط کا لحاظ کیا جائے۔ منجملہ ان شرائط کے ایک بات یہ ہے کہ دعا میں حتی المقدور تعمیری پہلو کا لحاظ کیا جائے، لوگوں کے حقوق کا پاس ہو اور ایسی دعا کا پرتو اپنے تعمیری پہلو کے ساتھ تمام انسانی وجود کے اوپر ضوفگن ہو، بنابریں کبھی بھی مفسد اور تباہ کار افراد کی دعا درجۂ اجابت تک

[1] مجمع البیان جلد ۴ ص ۴۲۹۔

نہیں پہنچ سکتی۔

"اصلاح کے بعد فساد" سے ممکن ہے ظلم یا کفر یا دونوں مراد ہوں۔ امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

ان الارض کانت فاسدة فاصلحها الله بنبیهٗ

زمین فاسد تھی خدا نے پیغمبر اسلامؐ کے ذریعے اس کی اصلاح فرمائی[1]

بعد ازاں دوبارہ مسئلہ دعا کی طرف رجوع کیا گیا ہے اور اس کی شرائط میں سے ایک اور شرط کا ذکر کیا گیا ہے، فرماتا ہے: خدا کو خوف و رجا کے ساتھ پکارو (وادعوہ خوفًا وطمعًا)۔

نہ تو اپنے اعمال پر ایسا گھمنڈ ہو کہ یہ گمان ہو کہ تمہاری زندگی میں کوئی تاریک گوشہ موجود نہیں ہے، ایسا خیال کرنا خود سقوط و انحطاط کا ایک بڑا سبب ہے اور نہ اس طرح سے مایوس ہو جاؤ کہ اپنے آپ کو خدا کی رحمت اور دعا کی قبولیت کا مستحق نہ جانو، یہ احساس بھی انسان کو ہر قسم کی کوشش کرنے سے روک دیتا ہے، بلکہ "خوف و رجا" کے دو پروں کے ذریعہ مقام قرب الٰہی کی طرف محو پرواز رہو، امید ہو تو اس کی رحمت کی امید ہو، اور خوف ہو تو اپنی ذمہ داریوں اور لغزشوں کا خوف ہو۔

اس کے بعد آخر آیت میں رحمت خدا کے اسباب کی طرف روشنی ڈالی گئی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

• اللہ کی رحمت نیکوکاروں سے نزدیک ہے (ان رحمت الله قریب من المحسنین)۔

ممکن ہے یہ جملہ دعا کی ایک اور شرط ہو یعنی ارشاد ہوتا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری دعا ایک لفظی دعا اور اندر سے خالی نہ ہو تو ایسا کرو کہ اسے اعمال نیک کے ساتھ ادا کرو، تاکہ ان اعمال کی مدد سے اللہ کی رحمت تمہارے شامل حال ہو جائے اور تمہاری دعا اجابت کی منزل تک پہنچ جائے۔

اس طرح سے اس آیۂ شریفہ میں قبولیت دعا کی پانچ شرطیں بیان کی گئی ہیں:

اوّل: یہ کہ تضرع کے ساتھ تنہائی میں دعا مانگو۔

دوم: یہ کہ حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کرو۔

سوم: یہ کہ تمہاری دعا فساد اور تباہ کاری کے ساتھ نہ ہو۔

چہارم: یہ کہ دعا میں خوف و امید کے پہلو برابر کے ہوں۔

پنجم: یہ کہ دعا نیک اعمال کے ہمدوش ہو۔

---

[1] [illegible]

(۵۷) وَ هُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ
حَتّٰۤى اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ
الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ
الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○
(۵۸) وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ
خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ ○ ع

ترجمہ

(۵۷) وہ خدا وہ ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت (کی بارش) کے آگے آگے بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بادلوں کو اپنے دوش پر اٹھا لیتی ہیں، ہم انہیں مُردہ زمین کی طرف ہنکا دیتے ہیں، پھر ان سے پانی برساتے ہیں، پھر اس کے ذریعے ہر طرح کے پھل اگاتے ہیں (تم جان لو کہ) اسی طرح ہم مُردوں کو بھی (قیامت کے روز زندہ کر کے زمین سے) نکالیں گے (یہ مثال ہم نے اس لیے دی ہے) تاکہ تم (آخرت کو) یاد کرو۔

(۵۸) پاکیزہ سرزمین کی زراعت اللہ کے حکم سے (خوب) اُگتی ہے' اور خبیث (اور شور زدہ) زمین میں سوائے معمولی گھاس پھونس کے اور کچھ نہیں اُگتا، ہم اسی طرح سے آیتوں کو بدل بدل کے ان لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں جو شکر ادا کرتے ہیں۔

تفسیر

مربی اور قابلیت دونوں چیزوں کی ضرورت ہے

گزشتہ آیات میں مسئلہ "مبدأ" یعنی توحید کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اسی ضمن میں اسرار جہاں کے ذریعہ استدلال کیا گیا ہے۔ اب اس آیت میں بعض نعمات الٰہی بیان کرکے مسئلہ "معاد" کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، تاکہ یہ دونوں بحثیں متقابل طور پر ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہوئی نظر آئیں۔ یہ قرآن کریم کا ایک طریقہ ہے کہ بہت سے مقامات پر وہ "مبدأ" اور "معاد" کو ایک دوسرے کے ساتھ بیان کرتا ہے قابل توجہ یہ امر ہے کہ خدا کے پہچاننے کے سلسلے میں بھی، اور مسئلہ معاد کو جاننے کے لیے بھی دونوں مقامات پر خلقت کائنات کے اسرار کے ذریعہ استدلال کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ خدا وہ ہے جو ہواؤں کو اپنے باران رحمت کے آگے آگے اس طرح بھیجتا ہے جیسے کوئی خوشخبری سنانے والا آگے آگے دوڑ کر کسی مبارک مسافر کے آنے کی خبر دے (وھو الذی یرسل الریاح بشراً بین یدی رحمتہ)۔

وہ ہوائیں جو بحر اوقیانوس سے اٹھتی ہیں اور وہ بھاری بادلوں کو جو پانی کے ذخیرے سے لدے ہوتے ہوتے ہیں اپنے دوش پر اٹھائے ہوتی ہیں (حتیٰ اذآ اقلت سحاباً ثقالاً)۔

اور اس موقع پر ہم انہیں مردہ اور خشک زمینوں کی طرف ہنکاتے ہیں اور انہیں سیراب کرنے کی ذمہ داری انہیں سونپ دیتے ہیں (سقناہ لبلد میت)۔

اور ان کے ذریعے حیات بخش پانی کی چھاگلیں ہر جگہ لٹاتے ہیں (فانزلنا بہ الماء)۔

اور اس پانی کے ذریعے طرح طرح کے خوش رنگ، خوشبو اور خوش مزہ میووں کو اس گل تاریک سے اگاتے ہیں (واخرجنا بہ من کل الثمرات)۔

جی ہاں، آفتاب بحر اوقیانوس پر چمکتا ہے اور اپنی تمازت سے ان کے بخارات اوپر بھیجتا ہے۔ یہ بخارات اکٹھا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے بادل کے دل بادل بن جاتے ہیں، پھر ہواؤں کی موجیں ان بادلوں کے پہاڑوں کو اپنے دوش پر اٹھا کر اُدھر چل پڑتی ہیں جہاں ان کے برسنے کا حکم ہوتا ہے۔ ان میں کچھ ہلکی پھلکی ہوائیں جن میں ٹھنڈی رطوبت کی آمیزش بھی ہوتی ہے، وہ اس خزانۂ رحمت کی آمد آمد کا مژدہ سنانے کے لیے نسیم جانفزا بن کر آگے آگے چلتی ہیں، ان کے دامن سے اس باران حیات بخش کی خوشبو آتی ہے' اس کے بعد بادلوں کے عظیم الشان تودے، بارش کے موٹے موٹے قطروں کو اپنے سے جدا کرکے زمین کی طرف روانہ کرتے ہیں، وہ قطرے نہ تو اتنے موٹے ہوتے ہیں کہ کھیتوں کو ویران کر دیں اور زمین کو بالکل دھو ڈالیں اور نہ اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ فضا ہی میں بھٹک کر رہ جائیں، بلکہ بڑی مناسب مقدار و رفتار کے

ساتھ زمین پر اس طرح اترتے ہیں کہ اس کے اندر نفوذ کر جاتے ہیں اور بوئے ہوئے دانہ کے ماحول کو اس کی نشوونما کے لیے آمادہ کر دیتے ہیں۔ اب وہ زمین جو اپنی خشکی اور حدت کی وجہ سے گورستان بنی ہوئی تھی، اس پانی کی وجہ سے ایک لہلہاتی ہوئی کھیتی یا مہکتے ہوئے باغ کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: ہم اسی طرح مُردوں کو زمین سے باہر نکالیں گے (کذالک نخرج الموتیٰ)۔

ہم نے اس مثال کو اس لیے بیان کیا کہ روزِ معاد کا نمونہ تمہیں دکھلا دیں جو تمام سال بار بار تمہاری آنکھوں کے سامنے گزرتے رہتے ہیں تاکہ تم (آخرت کو) یاد کرو (لعلکم تذکرون) [1]

ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ چونکہ بارش غالباً ایک جیسی اور ایک حالت میں سب جگہ برستی ہے اس لیے تمام زمینیں یکساں طور پر زندہ ہو سکتی ہیں، اس کا جواب آنے والی آیت میں دیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ زمینوں کی صلاحیت کا مختلف ہونا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ زمینیں اپنی اپنی استعداد کے مطابق فیضانِ الٰہی سے استفادہ کریں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: شیریں اور پاکیزہ زمین پُر برکت اور فائدہ بخش نباتات کو اپنے پروردگار کے حکم سے باہر نکالتی ہے (والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ)۔

لیکن جو زمینیں شور زدہ، خبیث و خراب ہیں ان میں سوائے ناچیز اور کم قیمت گھاس پھونس کے کچھ نہ اُگے گا (والذی خبث لا یخرج الا نکدا) [2]

اسی طرح روزِ محشر جی اٹھنے کا حکم اگرچہ سب کو یکساں ملے گا، لیکن تمام انسان یکساں اور ایک مرتبہ واردِ محشر نہ ہوں گے، لوگ بھی صحیح سالم اور شور زمین کی طرح متفاوت اور مختلف ہیں، یہ تفاوت ان کے عقائد، نیتوں اور اعمال کے لحاظ سے ہے۔

بہ آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: ان آیتوں کو ہم ان لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں جو شکر بجا لانے والے ہیں اور ان سے فائدہ حاصل کرتے ہیں اور راہ ہدایت پر قدم بڑھاتے ہیں (کذالک نصرف الآیات لقوم یشکرون)۔

مذکورہ آیت سے درحقیقت ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا ظہور اس دنیا میں، نیز دنیائے آخرت میں دونوں جگہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ صرف "کسی فاعل کی فاعلیت" کسی چیز کے باثمر ہونے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ استعداد اور "قابلیت قابل" بھی ضروری ہے، بارش کے قطروں سے

---

[1] اس سلسلہ میں مزید توضیح کے لیے کتاب "معاد و جہاں پس از مرگ" کا مطالعہ فرمائیں جس میں مختلف آیات کے ذیل میں زندہ مثالیں دے کر مسئلہ معاد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

[2] "نکد" کے معنی بخیل آدمی کے ہیں جو کسی کو کوئی چیز آسانی سے نہ دے اور اگر کبھی بھولے سے کوئی چیز دے بھی دے تو نہایت کم مقدار اور کم قیمت ہو۔ آیہ مذکورہ میں شور زدہ زمین کو ایسے آدمی سے تشبیہ دی گئی ہے۔

حیات بخش تر اور لطیف تر کوئی شے متصور نہیں ہو سکتی، لیکن یہی آب باراں جس کی لطافت طبع میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا، ایک جگہ تو سبزہ اور پھول اگاتا ہے تو دوسری جگہ اس کی وجہ سے صرف خس و خاشاک نمودار ہوتے ہیں۔

۵۹ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّىْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝

۶۰ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

۶۱ قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِىْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۶۲ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّىْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

۶۳ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَلَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

۶۴ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ فِى الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ۝ ع

ترجمہ

(۵۹) ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے اس (قوم) سے کہا کہ اے

میری قوم ! صرف خدائے یگانہ کی پرستش کرو، کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے (اور اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرو گے تو) میں تمہارے اوپر بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

۶۰ (لیکن) ان کی قوم کے کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم تجھے کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔

۶۱ (نوحؑ نے) کہا اے میری قوم مجھ میں کوئی گمراہی نہیں ہے، لیکن میں سارے جہانوں کے رب کا فرستادہ ہوں۔

۶۲ میں اپنے پروردگار کا پیغام تم تک پہنچاتا ہوں اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں اور اللہ کی جانب سے میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

۶۳ کیا تم کو یہ تعجب ہے کہ تمہارے رب کی جانب سے یاد دہانی کے لیے تمہارے پاس آنے والا فرمان ایک ایسے شخص پر نازل ہوا ہے جو تم میں سے ہے تاکہ وہ تمہیں ڈرائے اور تم ڈرو اور اس لیے کہ تم پر رحم کیا جائے۔

۶۴ پس ان لوگوں نے اس (نوحؑ) کی تکذیب کی، پس ہم نے اسے اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ کشتی میں تھے نجات دی اور ان لوگوں کو غرق کر دیا جنہوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا۔ بیشک وہ لوگ ایک اندھی (اور کور باطن) قوم تھے۔

تفسیر

حضرت نوحؑ ــ پہلے اولوا العزم پیغمبر

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کے آغاز میں بیان کیا کہ خداوندِ عالم نے شروع میں بعض بنیادی مسائل جیسے خداشناسی، معاد، ہدایت بشر اور احساس مسئولیت بیان کرنے کے بعد کچھ بڑے پیغمبروں جیسے نوحؑ، ہودؑ، صالحؑ، لوطؑ، شعیبؑ اور آخر میں موسیٰ بن عمرانؑ کا تذکرہ کیا ہے، تاکہ ان بحثوں کے زندہ اور عملی نمونوں

کو ان کی ولولہ انگیز اور سبق آموز سیرتوں کے ساتھ پیش کیا جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت نوحؑ کی سرگزشت بیان کی گئی ہے۔ جو گفتگو ان کے اور ان کی سرکش، بُت پرست اور شریر قوم کے درمیان ہوئی تھی اسے نقل کیا گیا ہے۔

حضرت نوحؑ کا قصہ قرآن کریم میں کئی جگہ آیا ہے جیسے سورۂ ہود، سورۂ انبیاء، سورۂ مومنون، سورۂ شعراء نیز قرآن میں ایک چھوٹا سورہ بنام "نوح" بھی ہے جو قرآن کا ۷۱ واں سورہ ہے۔

اس جلیل القدر پیغمبر خدا کے مفصل حالات کشتی کا بنانا، وحشتناک طوفان کی سرگزشت اور خود خواہ فاسد اور بُت پرست لوگوں کا اس طوفان میں غرق ہونا مذکورہ سورتوں میں انشاء اللہ سپرد قلم کیا جائے گا ان چھ آیتوں میں ان تمام واقعات کو صرف فہرست وار بیان کرنا مقصود ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا (لقد ارسلنا نوحًا الی قومه)۔

سب سے پہلی چیز جو حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کو یاد دلائی وہی توحید اور ہر قسم کی بُت پرستی سے نہی تھی۔ انہوں نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! خدا کی پرستش کرو کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے (فقال یٰقوم اعبدوا الله مالکم من اله غیره)۔

توحید کا نعرہ نہ صرف حضرت نوحؑ کا پہلا نعرہ تھا بلکہ جتنے بھی انبیاء آئے سب نے سب سے پہلے لوگوں کو اسی بات کی دعوت دی۔ بنا بریں اس سورہ کی متعدد آیات نیز دیگر قرآنی سورتوں میں بہت سے پیغمبروں کی دعوت کے آغاز میں یہی جملہ ملتا ہے: یا قوم اعبدوا الله مالکم من اله غیره (اس سورہ کی آیات ۶۵ - ۷۳ - ۸۵ ملاحظہ فرمائیں)۔

اس جملے سے اس بات کا اچھی طرح سے اندازہ ہوتا ہے کہ بُت پرستی انسان کی سعادت کے راستے میں ایک زبردست خار کی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے گلزارِ توحید کے تمام باغبان (انبیاء) استعدادِ بشری کی سرزمین پر طرح طرح کے پھول اور درخت لگانے سے پہلے اپنی کمرہمت کو اس اہم کام کے لیے باندھتے تھے کہ ان شرک و بت پرستی کے خاروں کو صاف کر دیں۔

خاص طور سے سورۂ نوح کی آیت ۲۳ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے زمانے میں لوگ متعدد بتوں کی پرستش کرتے تھے جن کا نام "ود"، "سواع"، "یغوث" اور "نسر" تھا۔ ان سب کی تفصیل انشاءاللہ آئندہ پیش کی جائے گی۔

حضرت نوحؑ نے ان کی فطرتِ خوابیدہ کو بیدار کرنے کے بعد انہیں بُت پرستی کے انجام بد سے خبردار کیا اور فرمایا: میں تمہارے اوپر روزِ عظیم کے عذاب سے ڈرتا ہوں (انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم)۔

عظیم دن کے عذاب سے ممکن ہے کہ وہی طوفانِ نوح مراد ہو جس سے کمتر عذاب و سزا نہیں دیکھی

گئی۔ نیز ممکن ہے کہ اس سے مراد عذاب روزِ قیامت ہو کیونکہ قرآن کریم میں یہ تعبیر دونوں معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔ سورۂ شعراء کی آیت ۱۸۹ میں ہے۔

فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔

یہ آیت اس عذاب کے تذکرہ میں ہے جو قوم شعیب پر ان کی تباہ کاریوں کے نتیجہ میں اسی دنیا میں نازل ہوا تھا، پھر سورۂ مطففین کی آیت ۴، ۵ میں ہے:

اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ۔

آیا ان کو اس بات کا گمان نہیں ہے کہ وہ بروزِ عظیم میں اٹھائے جائیں گے[1]

مسئلہ شرک کے بعد لفظ "اخاف" (مجھے ڈر ہے کہ اس سزا میں گرفتار نہ ہو جاؤ) کے ساتھ تعبیر کرنا شاید اس وجہ سے ہو کہ حضرت نوح علیہ السلام ان سے یہ کہتے ہیں کہ اگر تمہیں شرک کرنے کی پاداش میں ایسی سزا کا یقین نہ بھی ہو تو کم از کم اس کا خوف تو کرو کیونکہ عقل اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ جس راستے میں ایسے زبردست خطرے کا احتمال بھی ہو وہ راستہ اختیار کیا جائے۔

لیکن قوم نوح بجائے اس کے کہ اس عظیم پیغمبر کی اصلاحی دعوت کو قبول کرتی جو ہر طرح سے ان کی خیر خواہی پر مشتمل تھی اور آئین توحید کو جان و دل سے مان لیتی، ظلم و ستم سے اپنا ہاتھ اٹھا لیتی، اس کے برعکس ان کی قوم کے سرداروں اور ثروت مندوں نے جب لوگوں کی بیداری کی وجہ سے اپنے مفادات کو خطرے میں دیکھا اور نوح کے مذہب کو اپنی عیاشیوں اور ہوس رانیوں کے سدِ راہ پایا، تو ان کے جواب میں صاف صاف یہ کہہ دیا: کہ ہم تو تجھے کھلی گمراہی میں دیکھتے ہیں (قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ)۔

"ملاء" عام طور سے اس گروہ کو کہتے ہیں جو اپنے لیے ایک مخصوص خیال اور عقیدہ اختیار کرتا ہے اور اس کی جتھہ بندی اور شکوہ ظاہری آنکھوں کو پُر کر دیتی ہے، کیونکہ اس لفظ کا مصدر "ملاء" ہے اور اس کے معنی پُر کرنے کے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ غالباً انسانوں کے اس گروہ کے لیے استعمال ہوا ہے جو خود پرست ہو، ظاہری طور سے مہذب ہو لیکن اندر سے گندہ ہو اور محیط کے مختلف زاویوں کو اپنے وجود سے پُر کرنے والا ہو۔

حضرت نوح نے اپنی قوم کے سخت اور توہین آمیز رویّہ کے جواب میں نہایت متانت اور محبت کے ساتھ کہا: میں نہ صرف یہ کہ گمراہ نہیں ہوں بلکہ گمراہی کی کوئی نشانی بھی مجھ میں نہیں پائی جاتی، بلکہ میں

---

[1] زیر نظر آیت میں کلمہ "عظیم" "یوم" کی صفت ہے، نہ کہ "عذاب" کی۔

پروردگارِ عالم کا بھیجا ہُوا رسول ہوں (قال یا قوم لیس بی ضلالة ولکنی رسول من رب العالمین)۔
یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مختلف خدا جو تم مانتے ہو اور ان کی الگ الگ حکومتیں تم نے بنا رکھی ہیں جیسے سمندروں کا خدا، آسمانوں کا خدا، صلح اور جنگ کا خدا وغیرہ وغیرہ یہ سب بے بنیاد باتیں اور خرافات ہیں۔ حقیقی پروردگار اور سارے جہانوں کا رب صرف وہ خدائے یگانہ و توانا ہے جو ان سب کا خالق و صانع ہے۔

(حضرت نوحؑ نے کہا) میری غرض تو صرف یہ ہے کہ میں اپنے پروردگار کے پیغام اور اس کے فرامین تم تک پہنچا دوں (ابلغکم رسالات ربی)۔
۔ اور اس راہ میں میں کسی قسم کی خیر خواہی کو تم سے نہ روکوں" (وانصح لکم)۔
۔ انصح ۔ مادّہ ۔ نصح ۔ (بروزن قفل) سے ہے، جس کے معنی خلوص کے ہیں، اسی بنا پر ۔ ناصح العسل" کے معنی خالص شہد کے ہیں، بعد میں یہ لفظ اس گفتگو کے لیے استعمال ہونے لگا جس میں خلوص ہی خلوص ہو کسی قسم کی غرض اور فریب کاری نہ ہو۔
آخر میں ارشاد ہوتا ہے: میں خدا کی جانب سے ان چیزوں کو جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے (واعلم من الله مالا تعلمون)۔
ممکن ہے یہ جملہ ان لوگوں کی مخالفتوں اور روگردانیوں کے مقابلے میں تہدید کا پہلو لیے ہوئے ہو۔ یعنی مجھے اللہ کی طرف سے ایسی دردناک سزاؤں اور خوفناک عذابوں کا علم ہے جن کا علم تم کو نہیں ہے۔ یا ہو سکتا ہے اس سے خداوند کریم کے لطف و کرم کی طرف اشارہ مقصود ہو یعنی اگر تم توبہ کر لو اور اللہ کی طرف پلٹ آؤ تو مجھے اس کے ایسے انعاموں اور ثوابوں کا علم ہے جس کی تم کو خبر نہیں ہے۔ یا پھر ممکن ہے مراد یہ ہو کہ میں اللہ کی طرف سے تمہاری ہدایت کا منصب لے کر آیا ہوں تو میں خدا کے بارے میں اور اس کے فرامین و قوانین کے بارے ایسی چیزیں جانتا ہوں جنہیں تم نہیں جانتے، اس بنا پر میری پیروی تم پر لازم ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ سب باتیں اس جملے میں مضمر ہوں۔

اس کے بعد والی آیت میں حضرت نوحؑ کی ایک اور گفتگو ملتی ہے جو ان کی قوم کے اس تعجب کے جواب میں ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک انسان حاملِ رسالت الٰہی بن جائے۔ اس پر حضرت نوحؑ نے کہا: آیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ کوئی انسان رسالت پروردگار کے پہنچانے پر مامور ہو اور اللہ کی طرف سے بیدار کرنے والے فرامین اس پر نازل ہوں تاکہ وہ تمہیں تمہارے بُرے انجام سے ڈرائے اور پرہیزگاری کے طور طریقے کی طرف تمہیں دعوت دے تاکہ تم رحمت الٰہی کے مستحق بن جاؤ (او عجبتم ان جاءکم ذکر

من ربکم علی رجل منکم لینذرکم ولتتقوا ولعلکم ترحمون)۔

یعنی اس بات میں کونسا تعجب ہے؟ کیونکہ ایک لائق و شائستہ انسان میں ہر موجود سے زیادہ اس بات کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ اللہ کی رسالت کا حامل بن جائے، علاوہ بریں یہ کہ انسان ہی انسانوں کا رہبر بن سکتا ہے نہ کہ جن اور فرشتے۔

لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ ایسے ہمدرد اور خیر خواہ رہبر کی بات دل سے پسند کرتے الٹا انہوں نے اس کی بات کی تکذیب کی اور اس کی دعوت کے سامنے سرتسلیم خم نہ کیا، بلکہ ہوا یہ کہ جتنا بھی حضرت نوحؑ زیادہ تبلیغ کرتے جاتے تھے ان کی ضد اور ہٹ دھرمی بڑھتی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ خدا نے صرف حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھیوں کو جو کشتی میں سوار تھے نجات دے دی اور جو بھی اس کی آیتوں کو جھٹلانے والے تھے انہیں ڈبو کر غرق کر دیا (فکذبوه فانجیناه والذین معه فی الفلک واغرقنا الذین کذبوا بأیاتنا)۔

اس آیت کے آخر میں اس سخت سزا کی دلیل اس طرح بیان فرمائی گئی ہے: وہ لوگ ایک اندھا گروہ تھے۔ یعنی ایسے لوگ تھے جو کور دل اور کور باطن تھے اور حقیقت کا چہرہ دیکھنے سے محروم ہو گئے تھے (انهم کانوا قوماً عمین)[1]

ان کی یہ کور دلی اور ان کے اعمالِ شوم اور پیہم ہٹ دھرمی کی وجہ سے تھی۔ کیونکہ تجربہ یہ کہتا ہے کہ اگر کوئی انسان ایک طویل مدت تک تاریکی میں رہے یا کسی اور وجہ سے اپنی آنکھیں بند رکھے اور روشنی کی جانب نگاہ کرنے سے اجتناب کرے تو وہ تدریجاً اپنی بینائی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ یہی حال دیگر اعضائے بدن کا ہے اگر وہ ایک بڑی مدت تک کام نہ کریں تو وہ خشک ہو کر ہمیشہ کے لیے بیکار ہو جائیں گے۔

انسان کی باطنی نگاہ بھی اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ حقائق سے مسلسل چشم پوشی کرتے رہنا اور عقل و خرد سے کام نہ لینا اور واقعات و حقائق سے عقل کو الگ رکھنا تدریجی طور سے عقل کی تیز بین نگاہ کو ضعیف سے ضعیف تر کر دیتا ہے یہاں تک کہ آخر میں یہ نگاہِ عقل بھی بالکل اندھی ہو جاتی ہے۔

حضرت نوحؑ اور ان کی قوم کی باقی سرگزشت ان سورتوں میں جن کا پچھلے صفحات میں ذکر ہوا ہے انشاء اللہ آئندہ تفصیل کے ساتھ بیان کی جائے گی۔

---

[1] "عمین" جمع ہے "عمیٌ" (بروزن ولی) کی یہ بالعموم اسے کہتے ہیں جس کی بصیرت اور چشم باطن ختم ہو گئی ہو، لیکن "اعمیٰ" اسے بھی کہتے ہیں جس کی ظاہری آنکھیں ختم ہو گئی ہوں اور اسے بھی جس کی باطنی بینائی ختم ہو گئی ہو (یہ بھی توجہ رہے کہ لفظ "عمی" پر اگر اعراب آجائے تو "عم" رہ جاتا ہے)۔

(۶۵) وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۗ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ
مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۚ أَفَلَا تَتَّقُونَ ○

(۶۶) قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي
سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ○

(۶۷) قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّي رَسُولٌ مِنْ
رَبِّ الْعَالَمِينَ ○

(۶۸) أُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّي وَأَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ○

(۶۹) أَوَعَجِبْتُمْ أَنْ جَاءَكُمْ ذِكْرٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ
مِنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ ۚ وَاذْكُرُوا إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ بَعْدِ
قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَسْطَةً ۖ فَاذْكُرُوا
آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○

(۷۰) قَالُوا أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللَّهَ وَحْدَهُ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ
آبَاؤُنَا ۖ فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ○

(۷۱) قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ ۖ
أَتُجَادِلُونَنِي فِي أَسْمَاءٍ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ
مَا نَزَّلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ ۚ فَانْتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُمْ
مِنَ الْمُنْتَظِرِينَ ○

(۷۲) فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ ۟

ترجمہ

(۶۵) اور قوم عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا، انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی خدا نہیں ہے، تم کیوں نہیں ڈرتے ہو۔

(۶۶) اُن کی قوم کے ایک گروہ نے جو کافر تھے یہ کہا کہ (اے ہود) ہم تم کو نادانی میں دیکھتے ہیں اور ہم تم کو یقیناً جھوٹوں میں سے گمان کرتے ہیں۔

(۶۷) انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! مجھ میں کسی قسم کی نادانی نہیں ہے، لیکن میں تمام جہانوں کے پروردگار کا فرستادہ ہوں۔

(۶۸) مَیں اپنے رب کے پیغاموں کو تم تک پہنچاتا ہوں، اور مَیں تمہارے لیے ایک امانت دار نصیحت کرنے والا ہوں۔

(۶۹) کیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے یاد دہانی آئے ایک ایسے مرد کے ذریعہ جو تم میں سے ہے، تاکہ وہ تم کو ڈرائے اور تم یاد کرو اس وقت کو جبکہ تم کو قوم نوح کا جانشین بنایا اور تم کو از روئے خلقت کشادگی دی (بدنی حیثیت سے قوی بنایا) پس اللہ کی نعمتوں کو دھیان میں لاؤ تاکہ تم فلاح پا جاؤ (کامیاب ہو جاؤ)۔

(۷۰) انہوں نے کہا کیا تم اس واسطہ آئے ہو کہ ہم صرف ایک خدا کی پرستش کریں،

اور ان (کئی خداؤں) کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے آباؤ اجداد عبادت کرتے چلے آئے ہیں؟ (ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا) لہٰذا تم جس (عذاب) سے ہم کو ڈرا رہے ہو اس کو لے آؤ اگر تم واقعاً سچوں میں سے ہو۔

(۷۱) (حضرت ہودؑ نے) کہا کہ پلیدگی اور غضب تمہارے رب کی طرف سے تم کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے، کیا تم مجھ سے کچھ ناموں کے بارے میں جھگڑا کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے آباؤ اجداد نے (بطور معبود کے) گھڑ رکھے ہیں، اللہ نے ان کی حقانیت کی کوئی دلیل بھی نہیں اتاری ہے، اچھا تو انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوتا ہوں۔

(۷۲) پس ہم نے ان (ہودؑ) کو اور جو ان کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے نجات دی' اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تھی اور حق کے سامنے سرِتسلیم خم نہیں کیا، ہم انہیں جڑ سے نابود کر دیں گے۔

تفسیر

قوم ہود کی سرگزشت کا ایک گوشہ

حضرت نوحؑ کی رسالت کی سرگزشت اور جو عبرت و حکمت کے درس اس میں موجود تھے انہیں بیان کرنے کے بعد ایک اور نبی یعنی حضرت ہودؑ کی سرگزشت بیان کی جاتی ہے۔

یہ قصّہ قرآن کریم کی دیگر سورتوں میں بھی ذرا تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے جیسے سورہ "شعراء" یا خود "سورۂ ہود" زیر بحث آیات میں صرف حضرت ہودؑ اور ان کی قوم کے درمیان جو گفتگو اور مباحثہ ہوا ہے اس کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا (و الی عاد اخاھم ھوداً)۔

قوم عاد کے لوگ سرزمین "یمن" میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جسمانی حیثیت سے اور ثروت کے اعتبار سے جو انہیں زراعت اور گلہ داری کے ذریعہ حاصل ہوتی تھی وہ ایک قوی اور خوشحال قوم تھے لیکن عقیدے کی رُو سے بہت پسماندہ تھے۔

"ہودؑ" اسی قوم کے ایک فرد تھے اور ان لوگوں سے قرابت بھی رکھتے تھے۔ انہیں اللہ کی طرف سے حکم ملا کہ اپنی قوم کی ہدایت کریں اور انہیں تباہی سے بچائیں، عذاب الٰہی سے ڈرائیں اور جو فساد ان میں پھیلا ہوا ہے اس سے نبرد آزما ہوں۔ شاید "اخاھم" (ان کے بھائی) سے اسی قرابتداری کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ہودؑ اور ان کی قوم کے درمیان تھی۔

نیز یہ احتمال بھی ہے کہ لفظ "بھائی" جو اس سورۃ میں حضرت ہودؑ کے لیے استعمال ہوا ہے اور بعض دیگر انبیاء کے لیے بھی دوسری سورتوں میں استعمال ہوا ہے جیسے حضرت نوحؑ کے لیے (شعراء۔ ۱۰۶ میں) حضرت صالحؑ کے لیے (شعراء۔ ۱۴۲ میں)، حضرت لوطؑ کے لیے (شعراء۔ ۱۶۱ میں) اور حضرت شعیبؑ کیلئے (اعراف ۸۵ میں)، یہ اس وجہ سے ہے کہ ان انبیاء نے بڑی جانسوزی، ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ ایک بھائی کی طرح قوم میں تبلیغ کی اور انہیں ہر طرح سے سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ تعبیر ان لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو کسی کو سمجھانے کے لیے بڑی کوشش اور کد و کاوش کرتے ہیں۔ علاوہ بریں اس تعبیر میں ایک طرح کی برابری اور مساوات بھی ہے اور تفوق و امتیاز اور ریاست طلبی کی نفی بھی۔ مقصد یہ ہے کہ یہ حضرات اپنی دعوت میں کوئی دنیاوی غرض نہیں رکھتے تھے اور نہ کوئی ریاست و حکومت چاہتے تھے بلکہ ان کی انتہائی غرض یہ تھی کہ اپنی اپنی قوموں کو بدبختی و تباہی کے گرداب سے نجات دلا دیں۔

ساتھ ہی یہ بھی واضح ہے کہ "اخاھم" سے دینی اور مذہبی برادری مقصود نہیں ہے کیونکہ یہ قومیں عام طور سے مشرک تھیں اور انبیائے الٰہی کی بار بار کی کوششوں کے باوجود انہوں نے مذہب حق کو قبول نہیں کیا۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت "ہودؑ" نے اپنی دعوت کو مسئلہ توحید، رسم و رواج، شرک، بت پرستی سے اپنی بیزاری کے ساتھ شروع کیا، اور ان سے یہ کہا کہ اے میری قوم! خدائے یگانہ کی پرستش کرو کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے، آیا تم پرہیزگاری اختیار نہیں کرو گے (قال یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ افلا تتقون)۔

لیکن اس خود خواہ اور متکبر گروہ نے، خاص کر ان میں سے مالدار لوگوں نے جنہیں خدا نے "ملاء" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، ہودؑ سے وہی کچھ کہا جو قوم نوح نے حضرت نوحؑ سے کہا تھا، بلکہ نادانی اور حماقت کی نسبت ان کی طرف دی۔ انہوں نے کہا کہ ہم تمہیں نادانی میں دیکھتے ہیں اور ہمیں گمان یہ ہے کہ تم جھوٹوں میں سے ایک شخص ہو (یعنی جہاں اور لوگ جھوٹ بولتے ہیں تم بھی بولتے ہو) قال الملأ الذین کفروا من قومہ انا لنراک فی سفاھۃ و انا لنظنک من الکاذبین)۔

"سفاہت" اور "نادانی" ان کے خیال کے مطابق یہ تھی کہ انسان اپنے ماحول اور اکثریت

کے رسم و رواج کے برخلاف صدائے احتجاج بلند کرے چاہے وہ رسم و رواج کیسے ہی غلط اور جاہلانہ کیوں نہ ہوں، یہاں تک کہ اپنی جان خطرہ میں ڈال دے۔ ان کی منطق کی بنا پر حضرت ہودؑ کی نادانی یہ تھی کہ کوئی انسان اپنے ماحول کے ساتھ نہ گھل مل سکے اور ابن الوقتی سے کام نہ لے اور پرانے طور طریقوں کو توڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہو اور اس وجہ سے ہر طرح کی پریشانیوں اور جنجال کو مفت میں بیٹھے بٹھائے خرید لے۔

لیکن حضرت ہودؑ نے اپنے اس مخصوص سکون و وقار کے ساتھ جو ہر پاک و برحق نبی کا شیوہ ہے بغیر کسی غصہ، دلتنگی اور مایوسی کے۔ ان سے کہا: اے قوم! میرے اندر کسی قسم کی نادانی نہیں پائی جاتی، میری گفتار و رفتار میرے سلامتی ہوش وحواس کی بیّن دلیل ہے، مَیں تمام جہانوں کے پروردگار کا فرستادہ ہوں" (قال یا قوم لیس بی سفاھۃ ولکنی رسول من رب العالمین)۔

حضرت ہودؑ نے اپنے کلام میں اس بات کا بھی اضافہ کیا: مجھ پر اللہ کی طرف سے یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ اپنے رب کا پیغام تم لوگوں تک پہنچا دوں اور ان احکام کو بھی تم تک پہنچا دوں جو تمہاری سعادت کے ضامن اور تمہیں شرک و فساد سے نجات دینے والے ہیں اور وہ بھی انتہائی خلوص، ہمدردی اور امانت کے ساتھ (ابلغکم رسالات ربی وانا لکم ناصح امین)۔

اس کے بعد حضرت ہودؑ ان لوگوں کے سامنے جو اس بات پر متعجب تھے کہ خدا نے خود ان لوگوں میں سے ایک اپنا رسول کیسے بھیج دیا، یہ کہتے ہیں کہ یہ بات حضرت نوحؑ نے بھی اپنی قوم سے کہی تھی کہ: "آیا تم اس بات پر تعجب کرتے ہو کہ پروردگار کی جانب سے ایک ایسے شخص پر وحی ہوئی ہے جو تم میں سے ہے تاکہ وہ اس عذاب سے تم کو ڈرائے جو تمہارے اعمالِ بد کی وجہ سے تم کو درپیش ہے؟ (او عجبتم ان جاءکم ذکر من ربکم علی رجل منکم لینذرکم)۔

اس کے بعد ان کے سوتے ہوئے جذبات کو بیدار کرنے کے لیے اور ان کی روح کے اندر احساس شکر گذاری کو برانگیختہ کرنے کے لیے خدا کی بعض نعمتوں کی یاد دہانی کراتے ہیں۔ "اس بات کو دھیان میں لاؤ کہ خداوند کریم نے تمہیں قوم نوحؑ کا جانشین بنایا اور جب وہ لوگ اپنی سرکشی کے باعث تباہ و برباد ہو گئے ان کی تمام وسیع زمینوں کا مالک و وارث تمہیں بنا دیا، ایسی زمینیں جو طرح طرح کی نعمتوں سے مالا مال تھیں" (واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح)۔

اس کے علاوہ۔ تم کو غیر معمولی قوت جسمانی عطا کی" (وزادکم فی الخلق بصطۃ)۔

یہ جملہ "زادکم فی الخلق بصطة" (تم کو خلقت کے لحاظ سے وسعت عطا کی) جیسا کہ ہم نے سابقاً کہا ممکن ہے اس سے قوم عاد کی جسمانی قوت کی طرف اشارہ مقصود ہو، کیونکہ قرآن کی مختلف آیات اور تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مضبوط ہڈیوں والے قوی ہیکل لوگ تھے۔ چنانچہ سورہ حم السجدہ کی آیت ۱۵ میں ہے:

"مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً"

ہم سے کون زیادہ قوی ہے۔

اور سورہ حاقہ میں آیت ۷ میں ان کی اس سزا کے بارے میں ہے جو ان کے اعمال کے نتیجہ میں ان کو دی گئی:

"فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ"

تم قوم عاد کو دیکھتے کہ وہ لوگ طوفان ہوا کے نتیجے میں اس طرح زمین پر پڑے ہوئے تھے گویا درخت خرما کے تنے کٹے پڑے ہیں۔

نیز ممکن ہے کہ اس (بصطة) سے ان کی افزائش ثروت، مالی قدرت، ان کا ظاہری ترقی یافتہ تمدن مراد ہو جیسا کہ قرآن کی دیگر آیات اور تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پہلا احتمال ظاہر آیت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

آخر میں حضرت ہودؑ اپنی خود غرض قوم سے فرماتے ہیں: خدا کی طرح طرح کی نعمتوں کو دھیان میں لاؤ تاکہ تمہارا احساس شکرگزاری بیدار ہو اور اس کے فرمان کے سامنے سرتسلیم خم کر کے نجات پا جاؤ (فاذکروا آلاء الله لعلکم تفلحون)۔

لیکن حضرت ہودؑ کی ان تمام نصیحتوں، ہدایتوں اور یاد دہانیوں سے انہوں نے کوئی اثر نہ لیا بلکہ اپنے مادی مفادات کو خطرہ میں پڑتا دیکھ کر الٹا مخالفت پر کمربستہ ہوگئے اور انہوں نے کھلم کھلا یہ اعلان کر دیا کہ: "کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہمیں خدائے یگانہ کی طرف دعوت دو اور ان تمام معبودوں کو ہم چھوڑ دیں جن کی ہمارے آباؤ اجداد سالہا سال سے پرستش کرتے چلے آئے ہیں اور ان کی عظمت کا سکہ ہمارے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے؟! ایسا ہرگز نہ ہوگا" (قالوا اجئتنا لنعبد الله وحده ونذر ما کان یعبد اٰباؤنا)۔

جیسا کہ آپ نے دیکھا کہ ان کے انکار کی سطح اس قدر گری ہوئی تھی کہ وہ خدائے وحدہ لاشریک کی پرستش سے سخت ہراساں تھے اور جدا جدا اور متعدد خداؤں کی پرستش کو اپنا سرمایۂ افتخار خیال کرتے تھے۔ لطیفہ یہ کہ ان کی ساری دلیل اپنے اس خلاف عقل فعل پر صرف یہی تھی کہ وہ اپنے بزرگوں کو ایسا

کرتے دیکھ چکے ہیں، ورنہ ان کے پاس اور کونسی معقول دلیل ہو سکتی تھی جس کی بنا پر وہ چند پتھر یا لکڑی کے ٹکڑوں کی تعظیم کرنے کی توجیہ کرسکیں۔

حضرت ہودؑ کی امید کو کلی طور سے اپنے سے قطع کرنے کے لیے حرف آخر کے طور پر انہوں نے یہ کہہ دیا کہ : ۔ اگر تم واقعاً سچ کہتے ہو اور اس عذاب کی کچھ حقیقت ہے جس سے تم ڈراتے رہے ہو تو جتنا بھی جلدی تم سے ہو سکے یہ عذاب ہماری طرف لے آؤ اور ہم کو بالکل نیست و نابود کر دو۔ (یعنی ہم کو تمہاری ان دھمکیوں کا ذرہ برابر خیال نہیں ہے) (فأتنا بما تعدنا ان کنت من الصادقین)۔

جب بات یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے اپنی آخری بات بھی کہہ دی جو اس بات کی علامت تھی کہ انہوں نے ہدایت قبول کرنے سے قطعاً اعراض کر لیا ہے اور حضرت ہودؑ بھی ان کی ہدایت سے مایوس ہو گئے ہیں تو حضرت ہودؑ نے کہا کہ اچھا جب ایسا ہے تو جان لو۔ عذاب الٰہی اور غضب خدا یقینی طور پر تمہارے اوپر نازل ہوگا۔ (قال قد وقع علیکم من ربکم رجس وغضب)۔

۔ رجس۔ کے معنی درحقیقت ہر ناپاک چیز کے ہیں۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس لفظ کے مصدر ۔ ر ج س۔ کے معنی زیادہ وسیع ہیں یعنی ۔ ہر وہ چیز جو لوگوں کی دُوری اور نفرت کا سبب بنے۔ لہٰذا ہر طرح کی ناپاکی، نجاست اور سزا کو ۔ رجس ۔ کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ سب امور انسان کی دُوری اور نفرت کا سبب بنتے ہیں۔ بہرصورت یہ لفظ آیت مذکورہ میں ممکن ہے سزائے الٰہی اور عذاب الٰہی کے معنی میں مستعمل ہو۔ اس کا ذکر لفظ ۔ قد وقع ۔ (ماضی کے صیغہ) کے ساتھ اس لیے ہے کہ یقینی طور پر تم عذاب کے مستحق ہو گئے ہو، اب یہ عذاب تمہیں دامنگیر ضرور ہوگا۔

نیز ممکن ہے کہ ۔ رجس ۔ روح کی پلیدی اور آلائش ۔ کے معنی میں ہو، یعنی تم گمراہی اور فساد کے گرداب میں اس قدر غرق ہو گئے ہوں کہ تمہاری روح طرح طرح کی آلائشوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئی ہے؟ اس بنا پر خدا کے عذاب کے مستحق بن گئے ہو۔

اس کے بعد ایک جملے کا اور اضافہ کیا گیا ہے تاکہ بتوں کے بارے میں ان کی منطق بغیر جواب کے نہ رہ جائے وہ جملہ یہ ہے : کیا تم ان چیزوں کے بارے میں جن کا صرف نام ہی خدا ہے اور یہ نام تمہارے بزرگوں نے ان کے لیے گھڑا ہے، اور وہ جھوٹ موٹ کچھ خاصیتیں اور کرامتیں ان سے منسوب کرتے چلے آتے ہیں، مجھ سے جھگڑا کرتے ہو، جبکہ خدا کی جانب سے ان کی حمایت میں کوئی دلیل نازل نہیں ہوئی ہے (اتجادلوننی فی اسماء سمیتموها انتم و اٰباؤکم ما نزل الله بها من سلطان)۔

واقعہ یہ ہے کہ تمہارے بُت صرف الوہیت کا اسم بدون مسمٰی رکھتے ہیں۔ اسم بھی وہ جو تمہارا اور تمہارے بزرگوں کا ساختہ پرداختہ اور خیال خام ہے ورنہ یہ لکڑی کے کچھ ٹکڑے جنگل کے دیگر ٹکڑوں سے مختلف نہیں ہیں۔

اس کے بعد کہا: اب جبکہ ایسا ہے تو پھر تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کروں گا۔ تم یہ انتظار کرو کہ آنے والی مصیبت میں یہ بُت تمہاری مدد کریں گے اور میں اس انتظار میں رہوں گا کہ خدا کا دردناک عذاب تمہارے اوپر نازل ہو۔ آئندہ پتہ چلے گا کہ ان دونوں انتظاروں میں کونسا انتظار حقیقت سے نزدیک تھا (فانتظروآ انی معکم من المنتظرین)۔

زیر بحث آیت کے آخر میں اس ضدی اور ہٹ دھرم قوم کا انجام مختصر لفظوں میں اس طرح بیان ہُوا ہے: ہم نے ہودؑ کو اور جو لوگ ان کے ہمراہ تھے ان کو اپنے لطف و رحمت کے ذریعے نجات دے دی اور ان لوگوں کی بیخ کنی کر دی جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے تھے اور آمادہ نہ ہوئے کہ حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں، ہم نے ان کو تہس نہس کر دیا (فانجیناہ والذین معہ برحمۃ منا و قطعنا دابر الذین کذبوا بآیاتنا وما کانوا مؤمنین)۔

* "دابر" لغت میں دراصل ہر چیز کے اختتام اور آخری حصے کو کہتے ہیں، بنا بریں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اس قوم کو آخر تک نابود کر دیا اور ان کی جڑ تک کو اکھاڑ پھینکا۔

(قوم "عاد" کا بقیہ قصہ، ان کی خصوصیات زندگی اور عادتیں، ان پر نازل ہونے والے عذاب کی کیفیت انشاء اللہ آنے والے صفحات میں سورۃ "ہود" کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ پیش کی جائے گی)۔

(۷۳) وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

(۷۴) وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝

۷۵ قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ اَتَعْلَمُوْنَ اَنَّ صٰلِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلَ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝

۷۶ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْۤا اِنَّا بِالَّذِیْۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝

۷۷ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَ عَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَ قَالُوْا یٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝

۷۸ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دَارِهِمْ جٰثِمِیْنَ ۝

۷۹ فَتَوَلّٰی عَنْهُمْ وَ قَالَ یٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّیْ وَ نَصَحْتُ لَكُمْ وَ لٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ ۝

ترجمہ

۷۳ اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! خدا کی پرستش کرو، اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ ایک روشن دلیل تمہارے لیے تمہارے پروردگار کی طرف سے آئی ہے۔ یہ اللہ کا ناقہ تمہارے لیے معجزہ ہے۔ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ خدا کی زمین میں (جنگلی گھاس پھوس میں سے) چرے، اور اس کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا ورنہ تمہیں دردناک عذاب آلے گا۔

۷۴ اور اس چیز کو اپنے دھیان میں لاؤ کہ خدا نے تمہیں قوم عاد کا جانشین بنایا اور (ان کی) زمین میں تمہیں بسایا تاکہ اس کے ہموار خطہ میں تم اپنے لیے قصر بناؤ اور پہاڑوں میں بھی) اپنے واسطے گھر تراشو لہٰذا اللہ کی ان نعمتوں کو یاد کرو، اور زمین میں فساد نہ کرو۔

۷۵ لیکن ان (صالحؑ) کی قوم کے متکبر سرداروں نے ان مستضعف (غریب لوگوں) سے پوچھا کیا (واقعی) تم کو یہ یقین ہے کہ صالح اپنے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اس چیز پر (اچھی طرح سے) ایمان لاتے ہیں جس کا ان کو (اللہ کی جانب سے) حکم دیا گیا ہے۔

۷۶ متکبر افراد نے کہا کہ (مگر) ہم تو اس چیز کے کافر ہیں جس پر تم لوگ ایمان لائے ہو۔

۷۷ اس کے بعد انہوں نے ناقہ کی کوچیں کاٹ دیں اور اپنے پروردگار کے حکم سے روگردانی کی اور کہا کہ اے صالح! اگر تم (واقعاً) خدا کے فرستادہ ہو تو جس (عذاب) سے ڈراتے ہو اس کو لے آؤ۔

۷۸ آخر کار انہیں زلزلہ نے آلیا اور وہ صبح کے وقت اپنے گھروں میں جسم بے جان ہو کر رہ گئے۔

۷۹ پس (صالح نے) ان سے منہ پھیر لیا اور کہا: اے میری قوم! میں نے اپنے رب کا پیغام تمہیں پہنچا دیا اور جو خیر خواہی کا حق تھا وہ ادا کر دیا، مگر میں کیا کروں کہ تم اپنے خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے۔

تفسیر

قوم ثمود کی عبرت انگیز سرگزشت

ان آیات میں خدا کے بزرگ پیغمبر حضرت صالحؑ کے اس جہاد کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے اپنی قوم ثمود کے خلاف کیا، قوم ثمود شام اور حجاز کے درمیان ایک کوہستانی علاقے میں رہتی تھی۔ اس سلسلے میں قرآن نے جو عبرت انگیز واقعات نوحؑ اور ہودؑ کی قوموں کے متعلق بیان کیے ہیں ان آیات میں بھی انہی کا تذکرہ ہوا ہے اور حضرت صالحؑ کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ سورہ ہائے - ہود، - شعراء، - قمر - اور - شمس - میں بھی اس سرگزشت کا ذکر ہے۔ لیکن سب سے زیادہ تفصیل سے سورۂ ہود میں اس واقعہ کا ذکر ہے۔ ان آیات میں حضرت صالح اور ان کی قوم کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اس کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے اور ان کے انجام بد کا ذکر ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا (و الی ثمود اخاھم صالحا)۔

ان پیغمبروں کو بھائی کیوں کہا گیا اس کی وجہ اسی سورہ کی آیت ۶۵ میں ہم حضرت ہودؑ کے واقعے میں بیان کر آئے ہیں۔

اس قوم کے پیغمبر حضرت صالحؑ نے بھی دیگر پیغمبروں کی طرح اپنی قوم کی اصلاح کے لیے پہلا قدم مسئلہ توحید اور یکتا پرستی سے اٹھایا اور ان سے کہا: اے میری قوم! خدائے یگانہ کی پرستش کرو کیونکہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے (قال یا قوم اعبدوا الله مالکم من اله غیره)۔

اس کے بعد اس جملے کا اضافہ فرمایا کہ میں بغیر کسی دلیل کے کوئی بات نہیں کہتا۔ بینہ اور روشن دلیل تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے لیے آچکی ہے اور یہ وہی اونٹنی ہے جس کو خدا نے تمہارے لیے معجزہ قرار دیا ہے (قد جاءتکم بینة من ربکم هذه ناقة الله لکم اٰیة)۔

"ناقہ" کے اصلی معنی لغت میں اونٹنی کے ہیں، قرآن میں سات جگہ ناقۂ صالح کا ذکر آیا ہے[1]۔ یہ اونٹنی کیسی تھی؟ اور کس طرح اللہ نے اسے قوم صالحؑ کے لیے معجزہ اور دندان شکن دلیل قرار دیا؟ ان تمام باتوں کی تفصیل انشاء اللہ ہم سورۂ ہود کی تفسیر میں پیش کریں گے۔

---

[1] علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں فرمایا ہے:

ناقہ در اصل ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو خدمت کے لیے مطیع اور آمادہ ہو۔ اس کا اطلاق شتر مادہ پر شاید اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ بہ نسبت نر اونٹ کے بہتر طور سے سواری کا کام دیتی ہے۔

ضمنی طور سے یہ وضاحت بھی کر دینا چاہیئے کہ ناقہ کی اضافت اللہ کی طرف " اضافت تشریفی " ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ یہ اونٹنی کوئی معمولی اونٹنی نہ تھی بلکہ اس میں امتیاز پایا جاتا تھا۔

بعد ازاں ان سے فرمایا : اس ناقہ کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچانا، اس کو خدا کی زمین میں چرنے دینا اور اسے اذیت نہ دینا ورنہ دردناک عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے (فذروھا تاکل فی ارض اللہ ولا تمسوھا بسوء فیأخذکم عذاب الیم)۔

" ارض " پر لفظ " اللہ " کا اضافہ اس وجہ سے ہے کہ یہ اونٹنی کسی کو نقصان نہیں پہنچاتی ہے کیونکہ اس کی غذا جنگل کی گھاس پھوس ہے، لہٰذا تم اسے کیوں نقصان پہنچاؤ۔

اس کے بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : یہ دھیان میں رہے کہ خدا نے قوم " عاد " کے بعد تمہیں ان کا جانشین اور خلیفہ قرار دیا ہے اور زمین میں تمہیں جگہ دی ہے۔ یعنی ایک طرف تو تم کو اللہ کی نعمتوں کا خیال رہنا چاہیئے، دوسرے یہ بھی یاد رہے کہ تم سے پہلے جو قوم تھی وہ اپنی سرکشی اور طغیان کے باعث عذاب الٰہی سے تباہ و برباد ہو چکی ہے (واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد و بوأکم فی الارض)۔

پھر اس کے بعد انہیں عطا کی گئی کچھ نعمتوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے : تم ایک ایسی سرزمین میں زندگی بسر کرتے ہو جس میں ہموار میدان بھی ہیں جن کے اوپر تم عالیشان قصر اور آرام دہ مکانات بنا سکتے ہو نیز اس میں پہاڑی علاقے بھی ہیں جن کے دامن میں تم مضبوط مکانات تراش سکتے ہو (جو سخت موسم میں، سردیوں کے زمانے میں تمہارے کام آ سکتے ہیں (تتخذون من سھولھا قصورًا و تنحتون الجبال بیوتا)۔

اس تعبیر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ (قوم عاد) سردی اور گرمی میں اپنی سکونت کی جگہ بدل دیتے تھے۔ فصل بہار اور گرمیوں میں وسیع اور پُر برکت میدانوں میں زراعت کرتے تھے اور پرندے اور چوپائے پالنے میں مشغول رہا کرتے تھے اس وجہ سے وہ یہاں خوبصورت اور آرام دہ مکانات بناتے تھے اور جب موسم سرما آ جاتا تھا اور اناج کاٹ لیتے تھے، تو اپنے ان گھروں میں چلے جاتے تھے جو انہوں نے پہاڑوں پر تراش کر بنائے تھے اور یہ مکانات انہیں سیلابوں اور طوفانوں سے محفوظ رکھتے تھے۔ یہاں وہ اطمینان سے سردی کے دن گزار دیتے تھے [1]

---

[1] یہ بات سب کو معلوم ہے کہ پہاڑی علاقوں میں گرمیوں کے زمانہ میں جایا جاتا ہے، سیلاب بھی زیادہ تر گرمیوں میں ہی آتے ہیں، معلوم نہیں اس تقسیم بندی کی کیا ضرورت درپیش ہوئی کہ گرمیوں میں وہ میدانوں میں اور سردیوں میں پہاڑوں پر رہیں جبکہ آیت میں اس کا کوئی اشارہ بھی نہیں ہے، آیت کا مفاد تو یہ ہے کہ وہ دونوں طرح کے مکانات رکھتے تھے جب چاہتے میدانی قصروں میں رہتے تھے اور جب چاہتے تھے پہاڑوں میں چلے جاتے تھے۔ (مترجم)

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خداوند کریم کی ان سب نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد نہ کرو اور کفرانِ نعمت نہ کرو (فاذکروآ اٰلآء اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین)[1]

یہاں پر ہمیں پھر یہ ملتا ہے کہ سردار اور ثروتمند، خوشنما ظاہر اور بد باطن لوگ جنہیں لفظ "ملاء" (آنکھوں میں سما جانے والے) سے تعبیر کیا گیا ہے، انہوں نے اس عظیم پیغمبر کی مخالفت شروع کر دی۔ ان کے خلاف ایک اچھا خاصا گروہ ان لوگوں کا تھا جو خوش فکر و پاک دل تھے اور ہمیشہ مذکورہ سرداروں کی اسیری میں تھے (یعنی ان کے مزدور تھے)، اور انہوں نے حضرت "صالح" کی دعوت کو قبول کر لیا تھا اور وہ ان کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے سرداروں کی مخالفت شروع کر دی، لہٰذا جیسا کہ قرآن کہتا ہے ان سرداروں اور متکبر افراد نے ان غریب لوگوں (مستضعفین) سے جو ایمان لا چکے تھے یہ کہا: آیا واقعاً تمہیں یہ علم ہے کہ صالح خدا کی جانب سے ہماری ہدایت کے لیے بھیجے گئے ہیں (قال الملاُ الذین استکبروا من قومہ للذین استضعفوا لمن اٰمن منھم اتعلمون ان صالحا مرسل من ربہ)۔

اس سوال سے ان کا منشا کوئی حق کی جستجو نہ تھا بلکہ دراصل وہ اس طرح مومنین کے دلوں میں شک و شبہ ڈالنا چاہتے تھے اور ان کی قوتِ ارادی کو کمزور کرنا چاہتے تھے اور چاہتے تھے کہ جس طرح وہ پہلے سرمایہ داروں کے مطیع اور فرمانبردار تھے اسی طرح رہیں اور حضرت صالحؑ کی حمایت سے ہاتھ اٹھا لیں۔

لیکن جلد ہی انہیں ایسا قطعی جواب ملا جو تابعین حضرت صالحؑ کے قوی ارادہ کی حکایت کرتا ہے، انہوں نے کہا: صرف یہی نہیں کہ ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالحؑ خدا کے فرستادہ ہیں بلکہ ہم تو ان کی پیغمبری پر ایمان بھی لا چکے ہیں (قالوآ انا بمآ ارسل بہ مؤمنون)۔

یہ جواب سن کر بھی متکبر اور مغرور افراد خاموش نہ ہوئے بلکہ مومنین کے ارادے کو متزلزل کرنے کے لیے انہوں نے دوبارہ کہا: ہم تو اس چیز کے منکر ہیں جس پر تم ایمان لاتے ہو (قال الذین استکبروآ انا بالذی اٰمنتم بہ کافرون)۔

چونکہ وہ لوگ (متکبرین) اپنی ظاہری قوت و شوکت کی وجہ سے عام لوگوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور لوگوں کے لیے نمونۂ عمل تھے، لہٰذا انہوں نے خیال کیا کہ اس مرتبہ بھی لوگ ان کی

---

[1] "تعثوا" کا مادہ "عثی" ہے جس کے معنی ہیں فساد پیدا کرنا مگر مادہ فساد، زیادہ تر فساد اخلاقی کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ مادہ "عیث" مفاسد حسی و ظاہری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بنا بریں جملہ "لا تعثوا" کے بعد "مفسدین" تاکید کے لیے ہے کیونکہ دونوں کلمے ہم معنی ہیں۔

پیروی کریں گے اور اس اظہار کمزوری بے ایمانی میں ان کا ساتھ دیں گے، مگر جلد ہی ان کو پتہ چل گیا کہ وہ کس خام خیال میں مبتلا ہیں انہوں نے دیکھا کہ خدا پر ایمان لانے کی وجہ سے لوگوں کی شخصیت میں انقلاب آگیا ہے اور اب وہ استقلال فکری اور قوی ارادہ کے مالک بن گئے ہیں۔

یہاں پر یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ آیات میں بے ایمان لوگوں کو "مستکبرین" کے عنوان سے اور زحمت کش، متقی اور با ایمان طبقہ کو "مستضعفین" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پہلی قسم کے لوگ اپنے کو سب سے بہتر خیال کرتے تھے اور اپنے زیردست افراد کے انہوں نے حقوق غصب کر لیے تھے۔ ان کی صلاحیتوں کا استحصال کرکے وہ اس مقام پر پہنچ گئے تھے کہ ان کو آج کی اصطلاح میں طبقۂ "استثمار گر" (وسائل لوٹنے والا) کہا جا سکتا ہے۔ جبکہ دوسرے طبقہ کو "استثمار شوندہ" (جس کے وسائل اور صلاحیتوں کا استحصال کیا گیا ہو) کہا جا سکتا ہے۔

جب خود خواہ و متکبر ثروتمند لوگ مومن افراد کے پائے استقلال کو نہ ڈگمگا سکے اور ان کو اس معاملہ میں مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا، دوسری طرف انہوں نے یہ دیکھا کہ اس اونٹنی کی وجہ سے جو حضرت صالحؑ کا معجزہ شمار ہوتی تھی، ان کی سم پاشیاں بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں، تو انہوں نے اس ناقہ کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیا اور اسے قتل کرنے سے پہلے "انہوں نے اس کو پے کر دیا اس کے بعد اسے جان سے مار ڈالا اس طرح انہوں نے خدا کے فرمان سے سرکشی کی" (فعقروا الناقة وعتوا عن امر ربهم)۔[1]

انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ اس کے بعد وہ حضرت صالحؑ کے پاس آئے اور اعلانیہ ان سے کہنے لگے: اگر تم واقعاً خدا کے فرستادہ ہو تو جتنی جلد ہو سکے عذاب الٰہی لے آؤ (وقالوا یاصالح ائتنا بما تعدنا ان کنت من المرسلین)۔

یعنی ہم کو ذرا بھی تمہارے ڈرانے سے خوف لاحق نہیں ہوا ہے کیونکہ تمہاری یہ سب دھمکیاں بے بنیاد ہیں ان باتوں سے ان کا مقصد یہ تھا کہ حضرت صالحؑ اور دیگر مومنین کی قوت ارادی کمزور پڑ جائے۔

جب انہوں نے اپنی سرکشی اور نافرمانی کو آخری حد تک پہنچا دیا اور ایمان قبول کرنے کی آخری کرن بھی ان کے وجود میں خاموش ہو گئی تو اللہ نے اس قانون کے مطابق کہ وہ ہمیشہ انتخاب کرتا رہتا ہے اور فاسد و مفسد کو فنا کرکے ان کی جگہ بہتر افراد کو دیتا ہے، اللہ کی سزا نے ان کو آلیا اور ایک ایسا زلزلہ رونما ہوا جس نے ان کے تمام قصروں اور پتھر کے بنے ہوئے مکانوں کو ہلا کر مسمار کر دیا۔ چشم زدن میں ان کی زرق

---

[1] اونٹ یا گھوڑے کو "پے کرنے" سے مطلب یہ ہے کہ اس کے پیر کے پیچھے جو پٹھا ہوتا ہے اس کو کاٹ دیا جائے جس کی وجہ سے وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکتا اور زمین پر گر جاتا ہے، پھر کسی قسم کی حرکت نہیں کر سکتا۔

برق زندگی کے چراغ بجھ گئے۔ صبح کے وقت صرف ان کے بے جان جسم ان کے مکانوں میں باقی رہ گئے تھے (فاخذتھم الرجفة فاصبحوا فی دارھم جاثمین)۔

۔ جاثم ۔ دراصل مادّہ ۔ جثم (بروزن خشم) سے ہے، جس کے معنی دو زانو بیٹھنے اور ایک ہی جگہ کھڑے رہنے کے ہیں۔ بعید نہیں کہ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ لوگ زلزلہ کے وقت خواب شیریں کے مزے لے رہے تھے، زلزلے کا پہلا جھٹکا محسوس کرتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے، پھر اس کے بعد حادثے نے انہیں اٹھنے کی بھی مہلت نہ دی اور خوف کی وجہ سے یا دیواروں کے گرنے کی وجہ سے یا بجلی گرنے سے جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

قوم ثمود کو کس طرح موت آئی ؟

یہاں پر ایک سوال پیش ہوتا ہے کہ زیر نظر آیت میں ہے کہ ان کی فنا کا سبب زلزلہ تھا لیکن سورہ حٰم السجدہ کی آیت ۱۳ میں ہے کہ بجلی کی وجہ سے وہ نابود ہوئے۔ جبکہ سورہ حاقہ کی آیت ۵ میں ہم پڑھتے ہیں کہ:

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ؛

یعنی قوم ثمود ایک تباہ کن آفت کی وجہ سے ہلاک ہوئی۔

کیا ان تعبیروں میں کوئی تنافی یا تضاد پایا جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب ایک جملہ میں دیا جا سکتا ہے، اور وہ یہ کہ تینوں اسباب کی بازگشت ایک چیز کی طرف ہے، یا یہ کہا جائے کہ تینوں آپس میں لازم ملزوم ہیں، کیونکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک خطہ میں زلزلہ بجلی گرنے کی وجہ سے آتا ہے، یعنی بجلی گرتی ہے اس کے بعد زلزلہ آجاتا ہے، لیکن ۔ طاغیۃ ۔ اس موجود کے معنی میں ہے جو اپنی حد سے تجاوز کرے، یہ زلزلہ کے لیے بھی صحیح ہے اور بجلی کے لیے بھی۔ بنابریں ان آیات کے درمیان کوئی تضاد نہیں پایا جاتا۔

زیر بحث آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : اس کے بعد صالحؑ نے ان سے منہ پھیر لیا اور ان سے کہا: میں نے اپنے پروردگار کی رسالت (پیغام رسانی) کا حق ادا کر دیا، اور جو کہنا چاہیئے تھا وہ تم سے کہہ دیا، میں نے تمہاری نصیحت اور خیرخواہی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی، لیکن (بات یہ ہے کہ) تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے" (فتولّٰی عنھم وقال یا قوم لقد ابلغتکم رسالة ربی ونصحت لکم ولٰکن لا تحبون الناصحین)۔

یہاں پھر ایک سوال پیش آتا ہے، وہ یہ کہ حضرت صالحؑ نے یہ گفتگو جو کی ہے وہ ان (قوم ثمود) کی نابودی کے بعد تھی یا یہ گفتگو ان کے انجام سے قبل اتمام حجت کے طور پر تھی، اگرچہ قرآن میں اس کا ذکر ان کے مرنے کو بیان کرنے کے بعد کیا گیا ہے؟

دوسرا احتمال اس خطاب کے ظاہر سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، کیونکہ ان کے ساتھ گفتگو کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اس وقت زندہ تھے لیکن پہلا احتمال بھی زیادہ بعید نہیں ہے۔ کیونکہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے افراد کی عبرت کے لیے اس قسم کی گفتگو مرنے والوں کی روح کو مخاطب کرکے کی جاتی ہے۔ جیساکہ حضرت علی علیہ السلام کے واقعات میں ہے کہ آپ نے جنگ جمل کے بعد طلحہ کے لاشہ کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا:

اے طلحہ! تم نے اسلام میں قابل قدر خدمات انجام دیں لیکن افسوس یہ کہ تم نے ان کو اپنے لیے محفوظ نہ کیا۔

نیز نہج البلاغہ کے آخر میں ہے کہ حضرت علی علیہ السلام جب جنگ صفین سے پلٹ رہے تھے تو آپ نے دروازہ کوفہ کی پشت پر قبرستان کی طرف منہ کرکے پہلے ارواح رفتگان پر سلام کیا بعد ازاں ان سے فرمایا:

تم اس قافلہ کے آگے آگے چلے گئے ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے آتے ہیں۔

٨٠ وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِۦٓ أَتَأْتُونَ ٱلْفَٰحِشَةَ مَا سَبَقَكُم بِهَا
مِنْ أَحَدٍ مِّنَ ٱلْعَٰلَمِينَ ۝
٨١ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ ٱلرِّجَالَ شَهْوَةً مِّن دُونِ ٱلنِّسَآءِ ۚ بَلْ
أَنتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ۝
٨٢ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِۦٓ إِلَّآ أَن قَالُوٓا۟ أَخْرِجُوهُم مِّن قَرْيَتِكُمْ ۖ
إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ۝
٨٣ فَأَنجَيْنَٰهُ وَأَهْلَهُۥٓ إِلَّا ٱمْرَأَتَهُۥ كَانَتْ مِنَ ٱلْغَٰبِرِينَ ۝
٨٤ وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِم مَّطَرًا ۖ فَٱنظُرْ كَيْفَ كَانَ

عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

ترجمہ

۸۰ اور (یاد کرو کہ) جب لوط نے اپنی قوم سے کہا تم ایسی بُری بات کرتے ہو جس کو تمام جہانوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔

۸۱ کیا تم تسکین شہوت کے لیے مردوں کی طرف جاتے ہو، نہ کہ عورتوں کی طرف؟ تم تجاوز کرنے والے لوگ ہو۔

۸۲ لیکن ان کی قوم کا جواب سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ ان (لوط اور ان کے ماننے والوں) کو اپنی آبادی سے باہر نکال دو، یہ لوگ اپنے کو پاک ظاہر کرنے والے ہیں۔

۸۳ (جب بات یہاں تک پہنچی تو) ہم نے ان (لوط) کو اور ان کے خاندان کو نجات دی سوائے ان کی زوجہ کے کہ وہ باقی ماندہ افراد میں سے تھی۔

۸۴ (پھر اس کے بعد) ہم نے ان پر خوب بارش کی (پتھروں کی بارش تاکہ وہ ان کو نیست و نابود کر دے)، اب دیکھو مجرموں کا انجام کیا ہوا۔

تفسیر

قوم لوط کا دردناک انجام

ان آیات قرآنی میں ایک منظر ایک اور پیغمبر کی سرگزشت کا پیش کیا گیا ہے، جو گزشتہ آیات کا مقصد ہے اس کی مزید تکمیل کی گئی ہے۔ یہ حضرت "لوط" علیہ السلام اور ان کی قوم کی سرگزشت ہے۔ یہ ماجرا قرآن کی چند سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسے سورہ ہائے "ہود"، "حجر"، "شعراء"، "انبیاء"، "نمل" اور "عنکبوت"۔

اس جگہ پانچ آیتوں میں حضرت لوطؑ اور ان کی قوم کی گفتگو کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ " اعراف " میں ان داستانوں کے بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ انبیاء اور ان کی قوموں کے مابین جو مخالفتیں رہیں اور جو ان میں گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ پیش کیا جائے، لیکن ان قصوں کی تفصیل کو دوسری سورتوں کی تفصیل کے لیے اٹھا رکھا گیا ہے (ہم بھی انشاء اللہ ان لوگوں کا مفصل قصہ سورۂ ہود اور سورۂ حجر میں بیان کریں گے)۔

اب زیر بحث آیات کی تفسیر کی جانب توجہ مبذول کرتے ہیں۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: یاد کرو پیغمبر لوطؑ کو جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم ایسا ننگین اور شرمناک فعل انجام دیتے ہو کہ جہانوں میں سے کسی نے ایسا نہیں کیا (اتأتون الفاحشة ما سبقكم بها من احد من العالمين)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عمل بذات خود ایک انتہائی بُرا اور شرمناک فعل تو ہے ہی، اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ یہ وہ بُرا کام ہے جو تم سے پہلے کسی قوم وملت نے نہیں کیا، اس وجہ سے اس کی بُرائی کئی گُنا بڑھ گئی ہے کیونکہ کسی بُرے طریقے کی بنیاد رکھنا قریب کے زمانے میں اور دُور کے زمانے میں آنے والے افراد کو اس بُرے طریقے پر چلنے کی دعوت دینے کے مترادف ہے۔

مذکورہ بالا آیت سے یہ بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل تاریخی حیثیت سے قوم لوط تک منتہی ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگ پیسے والے تھے جو اپنی زندگی ہوا پرستی اور شہوت رانی میں گزارتے تھے جس کی تفصیل انشاء اللہ مذکورہ بالا سورتوں کی تفسیر میں بیان کی جائے گی۔

اس کے بعد والی آیت میں اس گناہ کی تشریح کی گئی ہے جس کو اب تک سربستہ طور سے بیان کیا گیا تھا، ارشاد ہوتا ہے: تم لوگ شہوت کے ساتھ مردوں کی طرف جاتے ہو اور عورتوں کو تم نے چھوڑ رکھا ہے (انكم لتأتون الرجال شهوة من دون النساء)۔

بھلا اس سے بدتر اور کونسا کام ہو سکتا ہے کہ توالد وتناسل کا واحد ذریعہ یعنی " مرد عورت کا ملاپ " اس کو انسان ترک کر دے، اور " جنس موافق " کے پیچھے پڑ جائے، یہ ایسا کام ہے جو اصولی طور پر نادرست خلاف عقل اور بدن انسانی کی ساخت کے منافی اور روح کے خلاف ہے، نیز انسان کی اس فطرت اولی کے خلاف ہے جس میں ابھی کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جنسی ملاپ کی جو غرض وغایت ہے وہ فوت ہو کر رہ جائے گی دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ اس فعل کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اپنی جنسی خواہش کو جھوٹے طریقے سے پورا کرے اور نسل انسانی کو قطع کرنے کا سبب بن جائے۔ اس کے بعد آیت میں مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: تم لوگ اسراف کرنے والی قوم ہو (یعنی تم نے حدود

الٰہی سے اپنے قدم آگے بڑھا لیے ہیں اور گمراہی و سرکشی کے میدان میں فطرت کے حدود و حدود کو چھوڑ کر بھٹک گئے ہو (بل انتم قوم مسرفون)۔

ممکن ہے لفظ "مسرفون" سے اشارہ اس بات کی طرف ہو کہ وہ لوگ نہ صرف جنس کے بارے میں مسرف تھے بلکہ دیگر چیزوں میں بھی ان کی یہی حالت تھی۔

یہاں پر قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ پہلی آیت میں مطلب کو سربستہ بیان کیا تھا، اس کے بعد اس آیت میں اسے ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ علم بلاغت کے فنون میں سے ایک فن ہے کہ جب بھی کسی اہم بات کو بیان کرنا ہوتا ہے اسے اسی طرح بیان کرتے ہیں تاکہ اس کی طرف ذہنِ انسانی اچھی طرح متوجہ ہو جائے مثلاً "کوئی شخص بہت بُرا کام انجام دے تو پہلے اس کا بیدار مغز اور آگاہ سرپرست معاملے کی اہمیت جتلانے کے لیے کہتا ہے۔ تُو نے بہت بُری بات کی۔ پھر آخر میں جا کر اس پر سے پردہ اٹھائے گا اور اس کام کی تشریح کرے گا۔ اس طرح کا طرزِ بیان دراصل مقابل کے ذہن کو تدریجاً اس بات کے لیے آمادہ کرتا ہے کہ وہ معاملے کی اہمیت کی طرف متوجہ ہو جائے اور اس کی سمجھ میں یہ آجائے کہ جو بُرا کام اس نے کیا ہے وہ کتنا سنگین ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں قوم لوط کی غیر منطقی اور ضد آمیز گفتگو کا جواب دیا گیا ہے: ان لوگوں کے پاس اس ہمدرد، خیرخواہ اور مصلح پیغمبر کی بات کا کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ انہوں نے بڑی بدتمیزی اور غصّے سے کہا کہ لوط اور ان کے پیروؤں کو اپنے شہر سے باہر نکال دو، ان کا گناہ کیا ہے؟ ان کا گناہ صرف یہ ہے کہ یہ پاک لوگ ہیں اور گناہ نہیں کرتے (وما کان جواب قومہ الّا ان قالوا اخرجوھم من قریتکم انھم اناس یتطھرون)۔

اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایک کثیف اور گنہگار گروہ نے پاکدامن افراد کو ان کی پاکدامنی کے جرم میں اپنی سوسائٹی سے نکال دینے کی کوشش کی۔ یہ لوگ ایسے پاک افراد کو اپنی ہوس رانی اور شہوت پرستی کے لیے سدِّ راہ دیکھتے تھے اس بنا پر ان کی پاکدامانی اس گروہ کے لیے بجائے خوبی کے ان کی کمزوری شمار ہوتی تھی۔

"انھم اناس یتطھرون" اس جملے میں ایک یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ قوم لوط کا منشا یہ تھا کہ حضرت لوط اور ان کے پیروکاروں کو تظاہر اور ریاکاری کے ساتھ متہم کریں، جیسا کہ ہم نے اکثر اشعار وغیرہ میں سنا ہے کہ بعض گنہگار اور شرابخوار افراد مقدس اور پاک بندوں کو دکھاوے اور ریاکاری کے ساتھ متہم کرتے ہیں اور بزعم خود اپنے "شراب آلودہ چیتھڑوں" کو "زاہد کے مصلیٰ" سے بہتر خیال

کرتے ہیں، اور یہ ایک جھوٹا برائت نامہ ہے جو وہ خود اپنے ہاتھ سے اپنے لیے لکھ لیتے ہیں۔

اگر مذکورہ بالا تین آیات پر نظر ڈالی جائے تو ہر انصاف پرور شخص یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ قوم لوط کے افراد بہت بگڑے ہوئے لوگ تھے جنہوں نے ایک مصلح بزرگ کی تمام نصیحتوں اور منطقی دلیلوں اور جملہ خیر خواہیوں کو نہ صرف ٹھکرا دیا بلکہ ان کا جواب اپنی دھمکیوں اور زور نمائی اور تہمتوں سے دیا۔ لہٰذا خدا نے بعد والی آیت میں فرمایا: جب بات یہاں تک پہنچی تو ہم نے لوطؑ، ان کے پیروؤں اور ان کے خاندان میں جو واقعی پاکدامن تھے کو نجات دے دی سوائے ان کی بیوی کے کہ اس کو تباہ ہونے والی قوم میں عذاب کا مزا چکھنے کے لیے چھوڑ دیا کیونکہ وہ عورت بھی عقیدہ اور مذہب کے لحاظ سے ان لوگوں کی ہم خیال تھی (فانجیناہ واھلہ الا امرأتہ کانت من الغابرین[1])۔

بعض مفسّرین کا کہنا ہے کہ لفظ "اہل" اگرچہ زیادہ تر نزدیک کے عزیزوں پر بولا جاتا ہے مگر آیت مذکورہ میں حضرت لوطؑ کے حقیقی پیروؤں پر اس کا اطلاق ہے یعنی وہ بھی آپ کے خاندان اور اہل میں محسوب ہوتے تھے، لیکن سورہ "ذاریات" کی آیت ۳۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے آپ کے خاندان والوں اور نزدیک کے عزیزوں کے اور کوئی شخص آپ پر ایمان نہیں لایا تھا، بنا بریں لفظ "اہل" اپنے اسی حقیقی معنی یعنی خاندان والوں پر ہی استعمال ہوا ہے۔

سورہ "تحریم" کی آیت ۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت "لوطؑ" کی یہ زوجہ ابتدا میں ایک اچھی عورت تھی لیکن بعد میں اس کی نیت بدل گئی اور اس نے حضرت لوطؑ کے ساتھ خیانت کر کے قوم لوطؑ کی جرأت بڑھائی۔

اس آیت کے آخر میں بہت مختصر لیکن ایک معنی خیز اشارہ اس قوم کے لیے وحشتناک عذاب کی طرف کیا گیا ہے، فرمایا گیا ہے: ہم نے ان کے اوپر بارش برسائی (لیکن کیسی بارش؟! پتھروں کی بارش جس نے ان کو کچل کر تہس نہس کر دیا) (وامطرنا علیھم مطرًا)۔

اگرچہ آیت مذکورہ میں اس بارش کی نوعیت بیان نہیں کی گئی لیکن چونکہ اس کو لفظ "مطرا" (ایک بارش) سے تعبیر کیا گیا ہے جو ایک سربستہ لفظ ہے لہٰذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی معمولی اور عام بارش نہ تھی بلکہ پتھروں کی بارش تھی جیسا کہ سورۂ ہود کی آیت ۸۲ میں بیان ہوا ہے۔

اب دیکھو کہ مجرموں کا انجام کیا ہوا! (فانظر کیف کان عاقبۃ المجرمین)۔

---

[1] "غابر" اس شخص کو کہتے ہیں جس کے ساتھی چلے جائیں اور وہ پیچھے رہ جائے جیسا کہ حضرت لوطؑ کا خاندان ان کے ہمراہ چلا گیا اور ان کی بدبخت زوجہ عذاب کا مزہ چکھنے کے لیے شہر میں باقی رہ گئی۔

اگرچہ اس آیت میں روئے سخن پیغمبر (حضرت لوطؑ) کی طرف ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ مقصد یہ ہے کہ تمام انسان اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔

اس قوم کا مفصل احوال، اسی طرح لواطہ اور ہم جنس پرستی کے گوناگوں مضرات اور شریعت کی رُو سے اس عمل شنیع کی سزا انشاء اللہ سورہ ہود اور حجر میں بیان کی جائے گی۔

(۸۵) وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ۚ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ
مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْکُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ
فَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْیَآءَهُمْ
وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ
اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۚ
(۸۶) وَلَا تَقْعُدُوْا بِکُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ
سَبِیْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَاذْکُرُوْٓا
اِذْ کُنْتُمْ قَلِیْلًا فَکَثَّرَکُمْ ۠ وَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ○
(۸۷) وَاِنْ کَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْکُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ
وَطَآئِفَةٌ لَّمْ یُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰی یَحْکُمَ اللّٰهُ بَیْنَنَا ۚ
وَهُوَ خَیْرُ الْحٰکِمِیْنَ ○

ترجمہ

(۸۵) اور (ہم نے بھیجا) مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو، انہوں نے کہا کہ اے میری قوم خدا کی پرستش کرو کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ تمہارے پروردگار

کی جانب سے روشن دلیل آچکی ہے۔ بنا بریں جو پیمانہ اور ترازو کا حق ہے اسے ادا کرو، اور لوگوں کے مالوں میں سے کچھ کم نہ کرو اور جبکہ (ایمان اور دعوت انبیاء کی وجہ سے) روئے زمین پر اصلاح ہو چکی ہے، اس میں فساد نہ کرو۔ یہ تمہارے واسطے بہتر ہے اگر تم باایمان ہو۔

۸۶ اور ہر راستے پر نہ بیٹھو تاکہ (باایمان لوگوں کو) دھمکیاں دو اور مومنوں کو راہ راست سے روکو اور (طرح طرح کے شبہے ڈال کر) اس راہ کو ٹیڑھا دکھلاؤ، اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ تم بہت تھوڑے تھے اس نے تم کو کثرت عطا کی اور دیکھو کہ مفسدوں کا کیا انجام ہوا!۔

۸۷ اور جو کچھ ہم نے بھیجا ہے اس پر اگر ایک گروہ ایمان لایا ہے اور دوسرا گروہ ایمان نہیں لایا تو اس پر صبر کرو تاکہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

تفسیر

مدین میں حضرت شعیبؑ کی رسالت

ان آیات میں اقوام گزشتہ کی سرگزشت اور انبیائے الٰہی کی ان سے کشمکش کا پانچواں حصہ یعنی شعیب علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

حضرت شعیبؑ جن کا سلسلہ نسب تاریخ کی بنا پر چند واسطوں سے حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتا ہے، شہر "مدین" والوں کی طرف مبعوث ہوئے۔ "مدین" شام کا ایک شہر تھا جس میں تجارت پیشہ اور مالدار لوگ رہتے تھے، لیکن ان کے درمیان بت پرستی، کم ناپنا تولنا رائج تھا۔

اس عظیم پیغمبر نے اپنی قوم کے خلاف جو جہاد کیا ہے اس کی روئیداد قرآن کریم کی متعدد سورتوں میں آئی ہے خاص کر سورۂ ہود اور سورۂ شعراء میں اس کا تذکرہ مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ہم بھی قرآن

کی پیروی کرتے ہوئے انشاء اللہ سورۂ "ہود" کے ذیل میں حضرت شعیب کے قصہ کو تفصیل سے بیان کریں گے۔ اس جگہ پر اس قصے کا صرف ایک خلاصہ مندرجہ بالا آیات کے مطابق پیش کرتے ہیں۔

پہلی آیت میں خدا فرماتا ہے: ہم نے اہل "مدین" کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا (والی مدین اخاھم شعیبا)۔

بعض مفسرین جیسے علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں اور فخر رازی نے تفسیر کبیر میں بیان کیا ہے کہ "مدین" دراصل حضرت ابراہیمؑ کے ایک فرزند کا نام تھا، چونکہ آپ کی اولاد پوتے نواسے ایک سرزمین میں جو شام کے راستہ میں تھی رہتے تھے اس لیے اس زمین کا نام بھی "مدین" پڑ گیا۔

اب رہا یہ کہ حضرت شعیبؑ کو "اخاھم" (بھائی) کے لفظ سے کیوں ذکر کیا، اس کی وجہ ہم نے اسی سورہ کی آیت ۶۵ میں بیان کی ہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ حضرت "شعیب" نے اپنی دعوت کو دیگر پیغمبروں کی طرح مسئلہ توحید سے شروع کیا اور "وہ پکارے اے میری قوم! خدائے یکتا کی پرستش کرو کہ اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے" (قال یقوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ)۔

انہوں نے کہا کہ یہ حکم علاوہ بریں کہ عقل کا فیصلہ ہے، "اس کی حقانیت پر خدا کی طرف سے روشن دلیل بھی آچکی ہیں" (قد جاءتکم بینۃ من ربکم)۔

اگرچہ آیاتِ مذکورہ میں اس بات پر کوئی روشنی نہیں ڈالی گئی ہے کہ یہ بیّنہ (روشن دلیل) کیا تھی مگر ظاہر ہے کہ اس سے مراد حضرت شعیبؑ کے معجزات ہیں۔

توحید کی طرف دعوت دینے کے بعد، حضرت شعیبؑ نے ان کی اجتماعی، اخلاقی اور اقتصادی برائیوں سے ٹکر لی۔ سب سے پہلے انہوں نے چاہا کہ انہیں کم ناپ تول، دھوکا دہی اور دیگر خیانتوں سے روکیں جن میں وہ مبتلا تھے، چنانچہ انہوں نے کہا: اب جبکہ خدا کا راستہ تمہارے سامنے آشکار ہو چکا ہے تو "پیمانہ اور وزن کا حق ادا کرو اور لوگوں کے حقوق میں سے کم نہ کرو" (فاوفوا الکیل والمیزان ولا تبخسوا الناس اشیاءھم)[1]۔

یہ بات واضح ہے کہ ہر طرح کی خیانت اور ہیرا پھیری اگر باہمی معاملات میں سرایت کر جائے تو اس سے وہ باہمی اعتماد و اطمینان متزلزل ہو جاتا ہے جس پر اقتصاد کی پوری عمارت قائم و برقرار ہے اور اس کے نتیجے میں معاشرے میں ایسے نقصانات مرتب ہوتے ہیں جن کا کوئی علاج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شعیبؑ نے ان کے اس بڑے عیب پر انگلی رکھی اور اسے دور کرنا چاہا۔

اس کے بعد ان کے ایک اور عیب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: روئے زمین پر جبکہ

---

[1] "بخس" کے معنی حقوق کو کم کرنے اور احتمال ہے اس طرح نیچے آنے کے ہیں کہ ظلم و ستم کا موجب بن جائے۔

ایمان اور انبیائے الٰہی کی کوششوں سے اصلاح ہو چکی ہے، فساد برپا نہ کرو (ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا)۔
یہ بات مسلّم ہے کہ فساد پھیلانے سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، چاہے وہ فساد اخلاقی ہو یا بے ایمانی ہو یا بے امنی ہو بلکہ اس سے الٹا تباہی پھیلتی ہے' لہٰذا آیت کے آخر میں اس جملے کا اضافہ فرمایا گیا ہے:
یہ تمہارے نفع کی بات ہے اگر تم صاحبانِ ایمان ہو (ذٰلکم خیر لکم ان کنتم مؤمنین)۔
گویا اس جملہ - ان کنتم مؤمنین - کے اضافہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ اجتماعی اور اخلاقی فرائض تمہارے حق میں اس وقت مفید ثابت ہو سکتے ہیں جبکہ تمہارے دل نورِ ایمان سے روشن و منور ہو جائیں' لیکن اگر تمہارے دل ایمان سے خالی ہوں اور ان فرائض کو محض دنیاوی مصالح کی بنا پر مان لو تو اس سے کوئی دوام و ثبات میسّر نہ ہوگا۔

اس کے بعد کی آیت میں حضرت -شعیب- کی چوتھی نصیحت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: تم لوگوں کے راستے پر مت بیٹھو اور نہ ڈراؤ دھمکاؤ اور خدا کے راستے میں سدِّراہ نہ بنو، اور ان کے دلوں میں شبہے ڈال کر حق کی صراطِ مستقیم کو ان کی نگاہ میں ٹیڑھی اور کج ظاہر نہ کرو (ولا تقعدوا بکل صراط توعدون وتصدون عن سبیل اللّٰہ من اٰمن بہ وتبغونھا عوجًا)۔
جو لوگ ایمان قبول کرنا چاہتے تھے انہیں قومِ شعیب کے گمراہ لوگ کس طرح ڈراتے دھمکاتے تھے؟ مفسّرین نے اس بارے میں متعدد احتمال پیش کیے ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ ان کو قتل کی دھمکی دیتے تھے بعض نے کہا ہے کہ وہ باایمان افراد کا مال لُوٹ لیتے تھے، لیکن آیت کے بقیہ جملہ سے پہلے معنی مطابقت رکھتے ہیں۔
پانچویں آیت کے آخر میں حضرت شعیبؑ کی اس نصیحت کا ذکر ہے جس میں انہوں نے چاہا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کو یاد کریں کہ تاکہ ان میں شکرگزاری کا جذبہ بیدار ہو، ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب تم تعداد میں تھوڑے تھے، خدا نے تمہاری جمعیت کو زائد کیا اور تم کو "مین پاور" (افرادی قوت) عطا کی (واذکروا اذ کنتم قلیلًا فکثرکم)۔
اس کے بعد خوب اچھی طرح سے دیکھو کہ مفسدوں کا انجام کیا ہوا، لہٰذا ان کے نقشِ قدم پر نہ چلو (وانظروا کیف کان عاقبۃ المفسدین)۔
یہاں پر ایک بات اور ضمنی طور پر یہ معلوم ہوتی کہ آبادی کی کثرت کسی معاشرے کی عظمت، قدرت اور ترقی کا سبب بھی ہو سکتی. بشرطیکہ ایک سوچے سمجھے نظام کے ماتحت مادّی و معنوی حیثیت سے ان کی زندگی استوار ہو، جبکہ موجودہ زمانے میں بہت زیادہ پراپیگنڈا کے ذریعہ اس بات کو لوگوں کے ذہنوں میں راسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے نسل اور تعداد کو کم کریں۔

آخری آیت دراصل قوم شعیب کے بعض مومنین اور بعض کافروں کی ایک بات کا جواب ہے یوں بعض مومن افراد جبکہ ان پر کافروں کا دباؤ پڑتا تھا تو وہ فطری طور پر اپنے وقت کے پیغمبروں سے یہ کہہ اٹھتے تھے کہ ہم کب تک ان کافروں کا ظلم سہتے رہیں گے؟ اس کے ساتھ ہی جو لوگ مخالف تھے ان کی جراتیں بھی بڑھتی جاتی تھیں یہاں تک کہ وہ بھی یہ کہہ دیتے تھے کہ۔ اگر تم واقعی خدا کے فرستادہ نبی ہو تو ہماری اتنی مخالفت کے باوجود ہم کو اللہ کی طرف سے کسی قسم کا گزند کیوں نہیں پہنچتا:

حضرت شعیبؑ نے ان کے جواب میں فرمایا: اگر تم میں سے کچھ لوگ اس چیز پر ایمان لے آتے ہیں جو میں اللہ کی طرف سے لایا ہوں اور کچھ ایمان نہیں لائے تو اس سے نہ تو کافروں کو غرور لاحق ہو اور نہ مومنوں کو مایوسی، تم صبر سے کام لو تاکہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے یعنی وہ آئندہ اپنا آخری فیصلہ سنا دے گا کہ کون لوگ حق پر ہیں اور کون باطل پر (وان کان طائفة منکم اٰمنوا بالذی ارسلت به وطآئفة لم یؤمنوا فاصبروا حتی یحکم الله بیننا وهو خیر الحاکمین)۔

(۸۸) قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّکَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَکَ مِنْ قَرْیَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ کُنَّا کٰرِهِیْنَ ۝

(۸۹) قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰهِ کَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِکُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا یَکُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَآ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا کُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَی اللّٰهِ تَوَکَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ ۝

ترجمہ

(۸۸) اس (شعیبؑ) کی قوم کے طاقتور اور متکبر لوگوں نے کہا: اے شعیب ہم قسم

کھاتے ہیں کہ تم کو اور جو لوگ تم پر ایمان لاتے ہیں ان کو ہم اپنی آبادی سے باہر نکال دیں گے، یا یہ کہ تم ہمارے مذہب کی طرف پلٹ آؤ، (اس پر) انہوں نے کہا: (تم چاہتے ہو کہ ہم کو پلٹاؤ) چاہے ہم اسے ناپسند بھی کرتے ہوں؟

(۸۹) اگر ہم تمہارے مذہب کی طرف پلٹ آئیں، جبکہ اللہ نے ہم کو اس سے نجات دے دی ہے، تو گویا ہم نے اللہ پر بہتان باندھا ہے، اور ہمارے لیے یہ سزاوار نہیں ہے کہ ہم اس مذہب کی طرف دوبارہ پلٹ آئیں اِلّا یہ کہ خود ہمارا رب یہ چاہے، ہمارے پروردگار کا علم ہر چیز پر محیط ہے، ہم نے صرف اللہ پر توکل کیا ہے، اے ہمارے پروردگار! تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر کہ تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

تفسیر

اس آیت میں حضرت "شعیبؑ" کے منطقی استدلال کے مقابلے میں ان کی قوم کے ردِّعمل کو بیان کیا گیا ہے اور چونکہ ان کی قوم کے طاقتور اور متکبر افراد ظاہری حیثیت سے بہت با اثر تھے، اس بنا پر ان کا ردِّعمل بھی بہ نسبت دوسروں کے زیادہ شدید تھا۔ لہٰذا انہوں نے دُنیا کے دوسرے زوردار متکبر افراد کی طرح اپنی قوت و جماعت کے بل بوتے پر حضرت شعیبؑ اور ان کے پیروؤں کو ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ان (شعیبؑ) کی قوم کے طاقتور اور مغرور افراد نے ان سے کہا کہ ہم قسم کھا کر یہ بات کہتے ہیں کہ ہم تم کو اور تمہارے ماننے والوں کو اپنی سوسائٹی سے باہر نکال دیں گے، اِلّا یہ کہ جتنا بھی جلد ممکن ہو ہمارے مذہب کی جانب پلٹ آؤ (قال الملا الذین استکبروا من قومه لنخرجنك یا شعیب والذین اٰمنوا معك من قریتنا او لتعودن فی ملتنا)۔

ممکن ہے اس آیت کے ظاہر سے کسی کو یہ توہم ہو کہ شاید حضرت شعیبؑ بھی قبلاً بت پرستوں کی صف میں شامل تھے، جب ہی تو کفار نے یہ کہا کہ ہماری ملت کی طرف پلٹ آؤ، جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ حضرت شعیبؑ دعوت و تبلیغ سے ان کی بت پرستی کے بارے میں خاموش تھے

کیونکہ ابھی ان کو تبلیغ کا حکم نہیں ملا تھا، اس سے وہ (کفار) یہ خیال کرتے تھے کہ شعیبؑ بھی ان کی ملت پر ہیں حالانکہ پیغمبروں میں سے کوئی بھی بُت پرست نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر پیغمبر کی عقل اس کی پیغمبری سے قبل ہی اتنی کامل ہوتی ہے کہ وہ بُت پرستی جیسے احمقانہ اعمالِ ناشائستہ کا مرتکب نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ کہ کفار کا روئے سخن صرف حضرت شعیبؑ ہی کی طرف نہ تھا بلکہ یہ خطاب ان کے پیروؤں کے لیے بھی تھا لہٰذا ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر انہی کے لحاظ سے ہو۔

مخالفین کی تہدید یہی نہ تھی بلکہ انہوں نے اس کے علاوہ دوسری دھمکیاں بھی دی تھیں جو حضرت شعیبؑ سے متعلق دیگر آیات میں مذکور ہیں اور ان سے متعلق جو بحث ہے وہ انشاء اللہ آگے آئے گی۔

حضرت شعیبؑ نے ان تمام باتوں اور تمام دھمکیوں کا جواب ایک بہت ہی مختصر، سہل اور سادہ لیکن منطقی جملے سے دیا، انہوں نے کہا: کیا تم ہم کو اپنے مذہب کی طرف اس حال میں لوٹانا چاہتے ہو کہ ہم اس کی طرف مائل نہ بھی ہوں (قال اولو کنا کارھین) [1]

درحقیقت حضرت شعیبؑ یہ کہنا چاہتے تھے کہ آیا یہ مناسب ہے کہ تم اپنا عقیدہ زبردستی ہمارے اوپر ٹھونسو، اور وہ قانون جس کا بطلان ہم پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہے اس کو طاقت کے زور سے ہم پر سوار کرو؟ پھر یہ کہ اگر ہم نے ایسا کیا بھی تو اس کا تم کو کیا فائدہ پہنچے گا؟

اس کے بعد کی آیت میں حضرت شعیبؑ اپنی بات کو اس طرح آگے بڑھاتے ہیں: اگر ہم دوبارہ آئینِ بُت پرستی کی طرف پلٹ آئیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہم کو اس سے نجات دے دی ہے اور ہم اپنے کو دوبارہ اس تباہی کے گڑھے میں گرا دیں تو ہم نے گویا خدا پر افترا باندھا ہے (قد افترینا علی اللہ کذبا ان عدنا فی ملتکم بعد اذ نجّٰنا اللہ منھا)۔

یہ جملہ دراصل اس جملہ کی توضیح ہے جو قبل کی آیت میں حضرت شعیبؑ کی زبان سے جاری ہوا تھا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے بُت پرستی کے آئین کو جو چھوڑا ہے وہ از روئے ہوا و ہوس نہیں ہے اور نہ ہم نے اس معاملے میں کسی کی اندھی پیروی کی ہے بلکہ ہم نے اس عقیدہ کے بطلان کو دلائل سے سمجھا ہے اور توحید کے معاملے میں الٰہی فرمان کو جان و دل سے قبول کیا ہے لہٰذا اگر اس حال میں ہم اس مسلکِ حق کو چھوڑ کر دوبارہ مشرک بن جائیں تو ایسا ہے کہ ہم نے دیدہ و دانستہ خدا پر بہتان باندھا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ خدا ہم کو اس کی سزا دے گا۔

---

[1] اس جملہ میں درحقیقت ایک محذوف مقدر ہے کیونکہ یہ جملہ اس طرح تھا: اتریدونا فی ملتکم ولو کنا کارھین:

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں: یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم تمہارے آئین کی طرف پلٹ آئیں اِلاّ یہ کہ خدا خود یہ چاہے (ومایکون لنا ان نعود فیھا الا ان یشآء اللہ ربنا)۔

حضرت شعیبؑ کا مقصد درحقیقت یہ ہے کہ ہم ہر حال میں خدا کے فرمان کے تابع ہیں اور اس کے حکم سے ہم ذرہ برابر بھی مخالفت نہیں کر سکتے۔ اب ہمارا تمہاری طرف پلٹنا کسی حالت میں ممکن نہیں ہے اِلاّ یہ کہ خدا ہم کو پلٹنے کا حکم دے (اور وہ ایسا حکم کبھی نہیں دے سکتا کیونکہ) وہ ہر چیز سے آگاہ ہے اور اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے لہٰذا ہرگز یہ ممکن نہیں کہ وہ اس چیز سے پلٹ جائے جس کا وہ ہم کو سختی سے حکم دے چکا ہے، کیونکہ حکم دے کر پشیمان وہ ہوتا ہے جس کا دائرۂ معلومات محدود ہو اور وہ دھوکا کھا جاتے لیکن وہ کہ جس کا علم لامحدود ہے، کبھی غلطی نہیں کرتا، وہ اپنے فیصلہ پر تجدید نظر بھی نہیں کرتا (وسع ربنا کل شیء علما)۔

اس کے بعد ان لوگوں پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ ان کی دھمکیوں سے بالکل ہراساں نہیں ہیں، بلکہ وہ اپنے موقف پر مضبوطی سے قائم ہیں، حضرت شعیبؑ نے کہا: ہمارا بھروسہ صرف خدا پر ہے (علی اللہ توکلنا)۔

آخرکار، اپنا حُسنِ نیّت ظاہر کرنے کے لیے اور اس لیے کہ ان کی حقیقت پسندی اور صلح جوئی کا رُخ بھی اچھی طرح سے نمایاں ہو جائے تاکہ دشمن ان کے خلاف یہ الزام نہ لگائیں کہ وہ ہنگامہ پسند اور خواہ مخواہ انقلاب پرور انسان ہیں، انہوں نے کہا: اے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان تُو ہی حق کے ساتھ فیصلہ کر، اور ہماری مشکلات کو دُور کر اور دَرِ رحمت ہم پر کھول دے کہ تو بہترین کھولنے والا ہے (ربنا افتح بیننا وبین قومنا بالحق وانت خیر الفاتحین)۔

ابن عباس سے منقول ہے وہ کہتے ہیں:

میں اس آیت میں "فتح" کے معنی نہیں جانتا تھا، یہاں تک کہ میں نے ایک روز ایک عورت کو اپنے شوہر سے یہ کہتے سنا کہ وہ کہہ رہی تھی "افاتحک بالقاضی" یعنی تجھ کو فیصلہ کے لیے قاضی کے پاس لے چلوں گی، اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ اس قسم کے مواقع پر "فتح" کے معنی فیصلہ اور حکومت کے ہیں (کیونکہ قاضی طرفین کے سلسلے کی گرہ کو کھول دیتا ہے)۔[1]

(۹۰) وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَئِنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ○

---

[1] تفسیر منہج الصادقین۔

۹۱ فَاَخَذَتۡهُمُ الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ
جٰثِمِيۡنَ ۚۖ
۹۲ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا شُعَيۡبًا كَاَنۡ لَّمۡ يَغۡنَوۡا فِيۡهَا ۛۚ اَلَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا شُعَيۡبًا
كَانُوۡا هُمُ الۡخٰسِرِيۡنَ ۝
۹۳ فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ وَقَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسٰلٰتِ
رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَـكُمۡ‌ۚ فَكَيۡفَ اٰسٰى عَلٰى قَوۡمٍ كٰفِرِيۡنَ ۝

ترجمہ

۹۰ ان (شعیبؑ) کی قوم کے اس گروہ نے کہا جو کافر ہو گئے تھے: اگر تم نے شعیبؑ کی پیروی کی تو تم گھاٹے میں رہو گے۔

۹۱ پس زلزلے نے ان کو آلیا اور انہوں نے اس حالت میں صبح کی کہ ان کے بے جان بدن ان کے گھروں میں پڑے ہوتے تھے۔

۹۲ جن لوگوں نے شعیب کی تکذیب کی (اس طرح نابود ہو گئے کہ) گویا ہرگز ان (گھروں) میں آباد نہ تھے جن لوگوں نے شعیب کی تکذیب کی وہی گھاٹا اٹھانے والے تھے۔

۹۳ پس اس (شعیبؑ) نے ان لوگوں سے رُخ پھیر لیا اور کہا کہ اے میری قوم! مَیں نے تم کو اپنے رب کی رسالت پہنچا دی تھی اور تم کو نصیحت (بھی) کی تھی، پس (اس حال میں) مَیں کافر قوم پر کیسے افسوس کروں!

تفسیر

حضرت شعیبؑ کے مخالفین نے ان کے تابعین کو بہکانے کے لیے جو کوششیں کیں پہلی آیت

میں ان کو بیان کیا گیا ہے، فرماتا ہے، قوم شعیب کے متکبر اور خود خواہ افراد، جنہوں نے کفر اختیار کیا تھا، نے ان لوگوں سے کہا جن کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ شعیب کی تبلیغ سے متاثر ہو گئے ہیں کہ تم نے اگر شعیب کی پیروی کی تو تم یقیناً گھاٹے میں رہو گے (وقال الملأ الذین کفروا من قومہ لئن اتبعتم شعیبا انکم اذا لخاسرون)۔

گھاٹے سے ان کی مراد وہی دنیاوی اور مادی گھاٹا تھا جو مومنوں کو حضرت شعیبؑ کی دعوت قبول کرنے کی وجہ سے ملنے والا تھا کیونکہ وہ ہرگز بُت پرستی کی طرف پلٹنے والے نہ تھے، لہٰذا ان کو زبردستی اس شہر اور آبادی سے نکال دیا جانا تھا، اس طرح ان کی املاک گھر بار سب چھٹ جاتے۔

نیز یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ خسارہ (گھاٹے) سے ان کا مقصد مادی گھاٹے کے علاوہ معنوی گھاٹا بھی ہو، کیونکہ ان کا اعتقاد تھا کہ ان کا آئینِ بُت پرستی ہی باعثِ نجات ہے نہ کہ شعیب کا آئین۔

جب ان کا معاملہ یہاں تک پہنچا تو اپنی گمراہی کے علاوہ، دوسروں کو گمراہ کرنے کی بھی کوشش کرنے لگے۔ اس طرح ان کے ایمان لانے کی کوئی امید باقی نہ رہ گئی، لہٰذا برائی کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا قانونِ الٰہی حرکت میں آیا اور عذابِ الٰہی ان تک آپہنچا: ایک زبردست اور وحشتناک زلزلہ نے ان کو آلیا، جس کے نتیجے میں صبح کے وقت ان کے بے جان جسم ان کے گھروں میں پڑے کے پڑے رہ گئے۔ (فاخذتھم الرجفۃ فاصبحوا فی دارھم جاثمین)۔

اسی سورہ کی آیت ۷۸ میں "جاثمین" کی تفسیر گزر چکی ہے نیز یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ ان کی نابودی کے مختلف اسباب وعلل جو بیان کیے گئے ہیں ان میں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے، مثلاً حضرت شعیبؑ کی قوم کے بارے میں اس آیت میں ہے کہ "زلزلہ" سے ہلاک ہوئی، ہود ۹۴ میں ہے کہ "صیحہ آسمانی" (آسمانی آواز) سے ہلاک ہوئی، شعراء ۱۸۹ میں ہے کہ "ایک ہلاکت آفرین ابر کے سائبان کے ذریعہ ہلاک ہوئی۔ حالانکہ سب کی بازگشت ایک ہی چیز کی طرف ہے، اور وہ یہ کہ ایک وحشتناک صاعقہ (بجلی) ایک تاریک ابر سے ان کی آبادی پر آگری، جس کے نتیجے میں (جیسا کہ اس موقع پر عام طور سے ہوا کرتا ہے) زمین میں زبردست زلزلہ آگیا جس کی وجہ سے ان کی ساری زندگی تباہ و برباد ہو گئی۔

اس کے بعد اس وحشتناک زلزلہ کی تباہ کاریوں کو بعد والی آیت میں اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:-

جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا اس طرح نیست و نابود ہو گئے گویا کبھی ان گھروں میں زندگی بسر نہیں کرتے تھے! (الذین کذبوا شعیبا کان لم یغنوا فیھا)[1]

---

[1] "یغنوا" مادہ "غنی" سے ہے جس کے معنی کسی جگہ اقامت پذیر ہونے کے ہیں اور جیسا کہ علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان میں فرمایا ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

آخر آیت میں فرمایا گیا ہے: جن لوگوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا وہ گھاٹا اٹھانے والے تھے مومن نہ تھے (الذین کذبوا شعیبا کانوا ھم الخاسرین)۔

گویا یہ دو جملے حضرت شعیبؑ کے مخالفوں کے اعتراض کا جواب ہیں کیونکہ انہوں نے یہ کہا تھا کہ حضرت شعیبؑ کے ماننے والے اگر اپنے پہلے دین پر نہ لوٹے تو وہ ان کو اپنے شہر سے باہر نکال دیں گے' قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے ان کو اس طرح نابود کر دیا جیسے وہ وہاں پر آباد ہی نہ تھے، نکالنے کا سوال تو بعد میں پیدا ہوتا ہے۔

نیز یہ کہ انہوں نے جو کہا تھا کہ حضرت شعیبؑ کے ماننے والے گھاٹا اٹھائیں گے اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ اب دیکھو کون زیاں کار ہے تم یا تابعین شعیبؑ!

اس کے بعد آخری آیت میں حضرت "شعیبؑ" کی آخری بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ "انہوں نے گنہگار قوم سے منہ پھیر لیا اور کہا کہ میں نے اپنے پروردگار کی رسالت پہنچا دی اور کافی نصیحت بھی کی اور کسی قسم کی خیر خواہی سے دریغ نہیں کیا" (فتولی عنھم وقال یا قوم لقد ابلغتکم رسالات ربی ونصحت لکم)۔

جب حالات یہ ہوں تو اس کافر قوم کے انجام بد پر مجھے کوئی افسوس نہیں کیونکہ ان کی ہدایت کے لیے میں نے اپنی آخری کوشش بھی کر لی لیکن انہوں نے کسی طرح حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا۔ لہٰذا ان کا یہ انجام تو ہونا ہی تھا (فکیف اٰسیٰ علی قوم کافرین)۔

یہ جملہ حضرت "شعیبؑ" نے ان لوگوں کی ہلاکت کے بعد کہا تھا یا اس سے قبل؟ دونوں امکانات ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے یہ جملہ ان کی نابودی سے پہلے کہا ہو، لیکن جس وقت قرآن نے اس واقعہ کو بیان کیا تو اس کا ذکر آخر میں کیا گیا۔

لیکن اگر آخری جملے پر نظر کی جائے جس میں کہا گیا ہے: اس کافر قوم کے دردناک انجام پر کوئی جائے تاسف نہیں ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کلام نزول عذاب کے بعد کا ہے اور جیسا کہ اسی سورہ کی آیت ۷۹ میں اشارہ کیا گیا ہے، اس طرح کی باتیں مُردوں سے اکثر کی جاتی ہیں (اس کے شواہد بھی اسی جگہ بیان کیے گئے ہیں ملاحظہ ہو)۔

۹۴ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِیۡ قَرۡیَۃٍ مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذۡنَاۤ اَہۡلَہَا بِالۡبَاۡسَآءِ

بقیہ حاشیہ سابقہ: بعید نہیں کہ یہ "مغنی" کے مفہوم اصلی یعنی "بے نیازی" سے ماخوذ ہو کیونکہ جس کے پاس رہنے کو اپنا مکان ہوتا ہے وہ دوسرے مکانات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ○

(۹۵) ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّ
قَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً
وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○

ترجمہ

(۹۴) ہم نے کسی شہر اور آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا، الّا یہ کہ اس کے رہنے والوں کو سختیوں اور تکلیفوں میں مبتلا کیا تاکہ وہ (ہوش میں آئیں اور خدا کی طرف) پلٹیں۔

(۹۵) اس کے بعد (جس وقت کسی تنبیہ نے ان پر کوئی اثر نہ کیا تو) ہم نے نیکی (اور نعمت کی فراوانی) کو بجائے بدی (اور تکلیف و اذیت) کے قرار دیا، اس طرح کہ ان میں ہر طرح کی (نعمت میں) زیادتی ہوگئی (اور نعمتوں میں اس قدر اضافہ ہوگیا کہ وہ مغرور ہو گئے اور) کہنے لگے ہمارے آباؤ اجداد کو تکلیفیں اور راحتیں پہنچی تھیں، پس ہم نے ان کو یکایک پکڑ لیا ایسی حالت میں کہ ان کو اس کا (پہلے سے) احساس نہ ہو۔

تفسیر

اگر بار بار کی تنبیہ کارگر نہ ہو

یہ آیات، بعض پیغمبروں کی سرگزشت، جیسے حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کے بعد اور حضرت موسیٰؑ بن عمران کی سرگذشت بیان کرنے سے پہلے آئی ہیں۔
ان میں چند ایسے اصولوں کو بیان کیا گیا ہے جو تمام انبیاء کے قصّوں میں پائے جاتے ہیں، یہ ایسے اصول ہیں کہ اگر ہم ان کا بغور مطالعہ کریں تو ایسے حقائق آشکار ہوں گے جن کا براہ راست تعلق ہم سب سے ہے۔
پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے کسی شہر اور آبادی میں پیغمبر نہیں بھیجا الّا یہ کہ وہاں کے لوگوں کو تکلیفوں

اور بلاؤں میں گرفتار کیا، تاکہ تھوڑا بیدار ہوں، اور اپنے طغیان و سرکشی سے ہاتھ اٹھا لیں اور اُس کی طرف رجوع کریں جو ہر طرح کی نعمتوں کا سرچشمہ ہے (وما ارسلنا فی قریۃ من نبیّ الّا اخذنا اھلھا بالبأساء والضرّاء لعلھم یضرّعون)۔

اور یہ اس لیے تھا کہ انسان کی طبیعت ہے کہ جب تک وہ ناز و نعمت میں رہتا ہے تو اس میں گوش شنوا اور حق قبول کرنے کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ مگر جس وقت وہ گرداب بلا میں گرفتار ہو جاتا ہے اور بے اختیار یاد خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کا دل بھی نصیحت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے لیکن یہ بیداری جو عام طور پر سب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے، بہت سے افراد میں زود گزر اور ناپائیدار ہوتی ہے کیونکہ جونہی مشکلات برطرف ہو جاتے ہیں وہ دوبارہ خواب غفلت میں غرق ہو جاتے ہیں، جبکہ بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی زندگی کے لیے یہ مشکلات ایک موڑ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان مصائب کے بعد ان کی رفتار و کردار کا رُخ بدل جاتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے حق کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، گذشتہ آیات میں جن لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کا شمار پہلے طبقہ میں تھا۔

اس بنا پر بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: جب ان لوگوں نے حوادث روزگار کے تھپیڑوں میں اور مشکلات کے گردابوں میں بھی اپنا راستہ نہ بدلا اور اسی طرح گمراہی میں پڑے رہے تو ہم نے ان پر سے مشکلات کو ہٹا لیا اور اس کی جگہ فراخی اور نعمتیں عطا کیں یہاں تک کہ دوبارہ ان کی زندگی پُر رونق ہوگئی اور ان کی زندگی میں جو کمیاں تھیں دُور ہوگئیں، مال و دولت اور افرادی قوت میں اضافہ ہوتا گیا (ثم بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ حتّٰی عفوا)۔

۔ عفوا ۔ مادّہ ۔ عفو ۔ سے ہے جو کبھی تو کثرت و زیادتی کے معنی میں آتا ہے اور کبھی ترک کرنے اور کسی چیز سے روگردانی کرنے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی کسی چیز کے آثار محو کرنے کے لیے آتا ہے لیکن بعید نہیں ہے کہ سب کی اصل ترک کرنا ہو۔ اب یہ ترک کرنا کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ کسی چیز کو ترک کر دیا جائے تاکہ وہ توالد و تناسل کرے اور بڑھ جائے اور کبھی ترک کرنا یہ ہے کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اس کی نگہداشت بھی نہ کی جائے۔ یہاں تک کہ وہ تدریجاً محو و نابود ہو جائے، اس بنا پر یہ لفظ افزائش یا نابودی کے معنی میں بھی آیا ہے۔

زیر بحث آیت میں بھی مفسرین نے تین احتمال ذکر کیے ہیں:

پہلا یہ کہ ہم نے ان کو مہلت دی تاکہ وہ "افزائش" پا جائیں اور سختی کے زمانے میں جو نقصانات اٹھا چکے تھے ان کی تلافی ہو جائے۔

دوسرا: یہ کہ ہم نے اس طرح ان کو نعمتیں دیں کہ وہ مغرور ہو گئے اور خدا کو انہوں نے

بھلا دیا اور اس کے شکر کو ترک کر دیا۔
تیسرا: یہ کہ ہم نے نعمتیں دیں تاکہ وہ ان کے ذریعے نکبت و افلاس کے آثار محو کر دیں۔
اگرچہ ان تفسیروں کا مفہوم آپس میں مختلف ہے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے ان میں چنداں اختلاف نہیں ہے۔
اس کے بعد فرماتا ہے کہ جب ان لوگوں سے مشکلات برطرف ہوگئیں تو بجائے اس کے کہ اس حقیقت کی جانب توجہ کریں کہ "نعمت" و "نقمت" سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کی طرف رجوع کریں، خود اپنے کو دھوکا دینے کے لیے اس طرح باتیں کرنے لگے کہ اگر ہمیں مصائب و آلام اور مشکلات پیش آئی ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ہمارے آباؤ اجداد بھی ایسی مشکلات سے دوچار ہو چکے ہیں دنیا میں اس طرح کے نشیب و فراز ہر ایک کو پیش آتے رہتے ہیں، سختیاں اور تکلیفیں ہر ایک کو پیش آتی ہی رہتی ہیں جزو زندگی ہوتی ہیں (وقالوا قد مس اٰباءنا الضرآء والسرآء)۔
آخر میں قرآن کہتا ہے جس وقت بات یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے تربیت کے مختلف طریقوں میں سے کسی سے کوئی اثر نہ لیا بلکہ روز بروز ان کے غرور و استکبار میں اضافہ ہوتا گیا تو ناگاہ ہم نے ان کو اپنی سزا کے پنجے میں جکڑ لیا، اس حالت میں کہ ان کو پہلے سے اس کا کوئی سان و گمان نہ تھا۔ اسی لیے یہ سزا ان کے لیے بہت زیادہ دردناک ثابت ہوئی (فاخذناھم بغتۃ وھم لا یشعرون)۔

(۹۶) وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○
(۹۷) اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ○
(۹۸) اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ○
(۹۹) اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ○

۱۰۰ اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ
اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ
فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ○

ترجمہ

۹۶ اگر وہ لوگ جو شہروں اور آبادیوں میں رہتے ہیں خدا پر ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیں گے، لیکن انہوں نے (حقائق کی) تکذیب کی تو ہم نے بھی انہیں ان کے اعمال کی سزا دی۔

۹۷ کیا ان آبادیوں کے رہنے والے اس بات سے مطمئن و محفوظ ہیں کہ ہمارا عذاب رات کے وقت ان پر نازل ہو جائے جبکہ وہ (میٹھی) نیند کے مزے لے رہے ہوں؟

۹۸ کیا ان آبادیوں کے رہنے والے اس بات سے مطمئن و محفوظ ہیں کہ ہمارا عذاب دن کے وقت ان پر نازل ہو جائے جبکہ وہ کھیل میں مشغول ہوں۔

۹۹ آیا وہ اللہ کی تدبیر سے غافل ہیں حالانکہ اللہ کی تدبیر سے سوائے خسارہ اٹھانے والوں کے اور کوئی مطمئن نہیں ہوتا۔

۱۰۰ کیا وہ لوگ جو پہلے لوگوں کے بعد روئے زمین کے وارث ہوئے ہیں، اس بات سے عبرت نہیں لیتے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی (اگلوں کی طرح) ان کے گناہوں کی پاداش میں سزا دے دیں (بات یہ ہے کہ) ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں تاکہ وہ (حق کی آواز کو) نہ سُن سکیں۔

تفسیر

زندگی۔ ایمان وتقویٰ کے زیرِ سایہ

پچھلی آیات میں کچھ قوموں کی مختصر سرگذشت بیان کی گئی ہے، جیسے حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیبؑ کی قومیں۔ اگرچہ یہ آیتیں بجائے خود ان کے عبرت انگیز نتائج کے بیان کرنے کے لیے کافی ووافی ہیں، لیکن زیرِ بحث آیات میں مزید وضاحت کے ساتھ ان واقعات کے نتائج کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: یہ لوگ جو ان آبادیوں اور دیگر شہروں میں زندگی بسر کرتے ہیں اگر طغیان وسرکشی، تکذیبِ آیاتِ الٰہی اور ظلم وفساد کی بجائے ایمان لے آئیں اور اس کے سائے میں تقویٰ وپرہیزگاری اختیار کریں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نہ صرف عذابِ الٰہی سے بچ جائیں گے بلکہ ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے بھی کھول دیں گے (ولو اَنّ اھل القرٰی اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض)۔

لیکن افسوس! انہوں نے صراطِ مستقیم، جو سعادت وخوش بختی اور رفاہیت وسلامتی کی راہ تھی، کو چھوڑ دیا اور خدا کے پیغمبروں کی تکذیب کی اور ان کے اصلاحی منصوبوں کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا تو ہم نے بھی انہیں ان کے اعمالِ بد کے جرم میں سزا دی۔ (ولٰکن کذبوا فاخذناھم بما کانوا یکسبون)۔

چند اہم نکات

۱۔ آسمان اور زمین کی برکتوں سے کیا مراد ہے؟: اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان بحث ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد نباتات کا روئیدہ ہونا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد اجابتِ دُعا اور حلِ مشکلات ہے۔ یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ برکاتِ آسمانی سے مراد برکاتِ معنوی اور برکاتِ ارضی سے مراد برکاتِ مادّی ہوں، لیکن اگر گذشتہ آیات پر نظر کی جائے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی تفسیر زیادہ مناسب ہے کیونکہ:

گذشتہ آیات جن میں سرکشوں اور مجرموں کو شدید سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کبھی آسمان سے سیلاب نازل ہونے اور زمین سے چشموں کے ابلنے کا ذکر ہے (جیسے طوفانِ نوحؑ) اور کبھی آسمانی بجلی گرنے اور کبھی صیحہ آسمانی، کبھی زمین کے ہولناک زلزلوں کا بیان ہے۔ زیرِ نظر آیت میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ یہ سب سزائیں ان لوگوں کے اعمالِ بد کا ردِّ عمل تھیں، ورنہ اگر انسان پاک اور باایمان ہو تو آسمان سے

عذاب کے بجائے اللہ کی برکتوں کی بارش ہو۔ یہ خود انسان ہے جو برکتوں کو بلاؤں کی شکل میں بدلے جانے کا باعث ہوتا ہے۔

۲۔ **"برکات" کا مفہوم:** "برکات" جمع ہے "برکت" کی اور جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ اس کلمہ میں "ثبات" اور "استقرار" کا مفہوم مضمر ہوتا ہے، جو نعمت دیر تک برقرار رہنے والی ہو اس کو برکت کہتے ہیں، اس کے مقابلہ میں وہ بے برکت چیزیں ہوتی ہیں جو زود گزر اور جلدی فنا ہو جانے والی ہوتی ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ایمان و تقویٰ نہ صرف نزول برکاتِ الٰہی کا سبب ہوتے ہیں بلکہ ان کی وجہ سے ہی جو نعمتیں انسان کے پاس ہوتی ہیں ان کو وہ برمحل صرف کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کتنی زیادہ انسانی طاقت اور اقتصادی وسائل ہیں، مگر یہ سب اسلحہ سازی کے مقابلوں اور طرح طرح کے نابود کرنے والے ہولناک آلات کی تیاری میں صرف ہو رہے ہیں۔ یہ وہ قدرت کے عطیے ہیں جن سے ہر طرح کی برکت ختم ہوگئی ہے۔ یہ جلد ہی فنا ہو جائیں گے۔ ان سے نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ ان کی وجہ سے ہر طرف ویرانی و بربادی پیدا ہوگی لیکن اگر انسانی معاشرہ میں ایمان بخدا اور تقویٰ شامل ہو جاتے تو یہ قدرت کے عطیے ایک دوسری طرح سے ان کے درمیان صرف ہوں جس کے نتیجہ میں ان کے آثار و برکات دیر تک باقی رہیں اور اس طرح وہ برکات کے مصداق بن جائیں۔

۳۔ **اس آیت میں "اخذ" سے مراد:** آیہ مذکورہ بالا میں لفظ "اخذ" پکڑنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم ہے "سزا دینا"۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ بالعموم جس کو بھی سزا دینا منظور ہوتا ہے اس کو پہلے پکڑا جاتا ہے، پھر اس کو باندھ دیتے ہیں تاکہ وہ بھاگ نہ سکے، بعد ازاں اس کو سزا دیتے ہیں۔

۴۔ **خدا کا فیض اور عقاب کسی سے مخصوص نہیں:** اگرچہ زیرِ بحث آیہ شریفہ کے مدِنظر قریٰ اور ان کے اہالی ہیں لیکن یہ بات مسلّم ہے کہ اس کا مفہوم وسیع، عام اور دائمی ہے جو کسی ایک قوم و ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے اور یہ ایک سنتِ الٰہی ہے کہ بے ایمان و کثیف اور فاسد افراد اسی دنیا میں اپنے کیفرِ کردار میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کبھی تو آسمان و زمین کی بلائیں ان پر برستی ہیں اور کبھی جنگِ عظیم یا علاقائی جنگ کی آگ انہیں اپنی لپیٹ میں لے کر ان کے اقتصادی اور جانی سرمائے کو خاک سیاہ کر دیتی ہے اور کبھی جسمانی اور دماغی طور پر وہ ان دیکھے خطروں سے ایسے متاثر اور خوفزدہ ہوتے ہیں کہ ان کا سرمایۂ سکون و قرار چھن جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ قرآنِ کریم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں "جیسی کرنی ویسی بھرنی" کا قانون کارفرما ہے ورنہ نہ تو خدا کا فیض کسی خاص فرد کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ اس کا عقاب جو جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔

ایمان سے بے بہرہ قومیں کیوں خوشحال ہیں؟

جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے اس سے ایک ایسے سوال کا جواب خود بخود مل جائے گا جو عام طور پر لوگوں کی زبان پر آتا رہتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ اگر واقعاً ایمان اور تقویٰ نزولِ برکات الٰہی کا سبب ہے اور بے ایمانی اور گناہ سے برکتیں سلب ہو جاتی ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اکثر ہم اس کے برعکس مشاہدہ کرتے ہیں۔ یعنی بے ایمان قومیں ناز و نعمت میں غرق ہوتی ہیں جبکہ اہلِ ایمان پریشان حال نظر آتے ہیں؟!

اس سوال کا جواب دو نکتوں پر غور کرنے سے مل جائے گا:

۱۔ یہ تصور کرنا کہ بے ایمان قومیں اور گنہگار لوگ نعمت میں غرق ہیں ایک بڑا اشتباہ ہے اس اشتباہ کا سبب یہ ہے کہ ثروت اور مال و دولت کو خوش قسمتی کا سرچشمہ سمجھ لیا گیا ہے۔ عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جو قوم صنعت و ثروت کے لحاظ سے ترقی یافتہ ہو وہ ایک خوش قسمت قوم ہے حالانکہ اسی قوم کے اندرونی حالات کے اندر جھانک کر دیکھا جائے تو اس میں ایسے درد ہائے جانکاہ ملیں گے جو اس قوم کو روحانی طور پر درہم برہم کیے ہوئے ہوں گے۔ ان دردوں اور دکھوں کو دیکھنے کے بعد ہم کو ماننا پڑے گا کہ اسی قوم کے اندر ایسے بھی لاکھوں افراد ہیں جو روئے زمین کے تمام انسانوں سے زیادہ بدبخت ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ جتنی بھی اضافی ترقی نصیب ہوتی ہے وہ بھی کوشش، جستجو، نظم اور استقلال جیسے اصولوں کو اپنانے کی وجہ سے ہے جو انبیائے الٰہی کی تعلیمات میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

انہی ایام میں جبکہ یہ تفسیر لکھی جا رہی ہے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ شہر، نیویارک۔ جو دنیائے مادی کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہر ہے، یہ حادثہ رونما ہوا کہ ایک مرتبہ ناگہانی طور پر وہاں بجلی چلی گئی جیسا کہ عام طور سے بہت سے شہروں میں ہوتا رہتا ہے، لیکن نیویارک میں عجیب ہنگامہ برپا ہو گیا یعنی بہت سے لوگوں نے دکانوں پر یلغار کر دی اور جو جس کے ہاتھ میں آیا لے کر چلا گیا بہت سی دکانیں غارت ہو گئیں یہاں تک کہ پولیس نے تین ہزار غارتگروں کو گرفتار کیا۔

یہ بات مسلّم ہے کہ ان غارت گروں کی تعداد اس سے بھی زیادہ تھی کیونکہ تین ہزار تو وہ تھے جو بھاگ نہ سکے اور موقع پر پکڑے گئے۔ نیز یہ بات مسلّم ہے کہ یہ لوگ جو پکڑے گئے تھے کوئی پیشہ ور چور ڈاکو نہ تھے نہ وہ پہلے سے چوری کے لیے آمادہ تھے کیونکہ یہ ایک ناگہانی حادثہ تھا۔

بنا بریں یہ نتیجہ نکلا کہ صرف ایک دفعہ بجلی کے چلے جانے سے ایک ثروتمند اور ترقی یافتہ شہر کے ہزاروں انسان ذرا سی دیر میں انسانی جامہ اتار کر۔ ڈاکو اور غارت گر بن گئے۔ یہ نہ صرف ایک قوم د

ملت کے اخلاق کی پستی کی دلیل ہے بلکہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ آن کی اجتماعی زندگی بے امنی کی زندگی ہے۔

ایک دوسری خبر جو اس روز کے اخبارات میں تھی وہ ایک مشہور و معروف شخص جو اس روز ایک بلند و بالا آسمان خراش ہوٹل میں سکونت پذیر تھا، بیان کرتا ہے کہ بجلی جانے کے بعد میرے ہوٹل کی صورتحال بھی بہت خطرناک ہوگئی تھی۔ کوئی شخص اپنے کمرے سے باہر نکل کر راستے میں آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ کہیں غارتگروں کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ ہوٹل کے منتظمین نئے آنے والے مسافروں کو دس دس یا زیادہ کی تعداد میں مسلح پولیس افراد کے ساتھ ان کے کمروں میں بھیجتے تھے۔ شخص مذکور اپنے بیان میں اس بات کا اضافہ کرتا ہے کہ جب تک مجھے بھوک نہیں ستاتی تھی میں اپنے کمرے سے باہر آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے برخلاف مشرق کے پسماندہ شہروں میں بجلی عام طور سے فیل ہوتی رہتی ہے لیکن وہاں اس قسم کی مشکلات رونما نہیں ہوتیں، اس بات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان ملکوں نے ثروت کے لحاظ سے تو ترقی کر لی ہے مگر امن و امان ذرہ برابر بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ آدمی کو جان سے مار دینا لوگوں کے لیے پانی پی لینے کی طرح آسان ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ اگر کسی کو ساری دنیا دے دی جائے لیکن اس سے یہ کہا جائے کہ ان حالات میں تمہیں زندگی بسر کرنا ہوگی تو وہ تمام انسانوں میں بدبخت ترین فرد ہوگا، پھر یہ کہ بے امنی ان کی مشکلات میں سے ایک مشکل ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسی ہی نہ معلوم کتنی مشکلات ہیں جن میں وہ گرفتار ہیں۔ لہٰذا ان حقائق کو دیکھتے ہوئے صرف ثروت کی زیادتی کو خوش قسمتی کا نشان نہیں سمجھنا چاہیئے۔

۲۔ اب یہ جو کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو ایمان دار اور پرہیزگار ہیں وہ کیوں اقتصادی و علمی طور پر عقب افتادہ اور پسماندہ ہیں؟ اس کے جواب میں ہم پوچھیں گے کہ ان کے ایمان اور پرہیزگاری سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اگر مراد یہ ہے کہ وہ لوگ اسلام کے دعویدار ہیں اور ان کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ انبیائے الٰہی کی سیرت پر چلتے ہیں، تو ہم اس بات کو قبول کرنے پر تیار ہیں کہ ایسے لوگ پسماندہ و عقب افتادہ ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ ایمان اور پرہیزگاری کی اصل ماہیت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ دونوں چیزیں انسان کے اعمال اور اس کی زندگی کے ہر پہلو میں سرایت کر جائیں اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو زبانی کلامی دعوے سے حاصل نہیں ہوتی۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے اسلامی ملکوں اور آبادیوں میں اسلامی تعلیمات اور پیغمبروں کے ارشادات کلی طور سے متروک یا نیم متروک ہو کر رہ گئے ہیں اور آج کے اسلامی معاشرہ کا چہرہ اتنا مسخ ہو گیا ہے کہ اسے ایک اسلامی چہرہ نہیں کہا جا سکتا۔

اسلام تو پاکدامنی، نیکی، امانتداری اور مسلسل کوشش کی طرف دعوت دیتا ہے لیکن وہ امانت داری اور جدوجہد کہاں ہے؟ اسلام علم و دانش، آگاہی اور بیداری کی طرف دعوت دیتا ہے لیکن وہ علم و دانش کہاں ہے؟ اسلام اتحاد، اتفاق، یکجہتی اور فداکاری کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے، کیا واقعی آج کے مسلمانوں میں یہ صفات پائی جاتی ہیں اور اس کے باوجود وہ پسماندہ ہیں؟ لہٰذا ہم کو یہ ماننا پڑے گا کہ حقیقی اسلام کوئی اور چیز ہے اور ہم کچھ اور ہیں۔

بعد کی آیات میں اس حکم کی عمومیت پر مزید تاکید کے لیے اور یہ بیان کرنے کے لیے کہ مذکورہ بالا قانون گذشتہ اقوام کے ساتھ مخصوص نہ تھا بلکہ یہ آج اور کل کے انسانوں کے لیے بھی ہے قرآن فرماتا ہے:
وہ مجرم افراد جو روئے زمین کے مختلف خطوں میں آباد ہیں اپنے آپ کو خدا کی سزا سے محفوظ سمجھتے ہیں، ان کو اس کا ڈر نہیں کہ عذاب الٰہی (بجلی، زلزلہ یا ایسی کوئی آفت) رات کے وقت انہیں اس وقت آ لے جبکہ وہ خواب نوشین کے مزے لے رہے ہوں (أفأمن اهل القرىٰ ان يأتيهم بأسنا بياتا وهم نآئمون)۔
۔ یا یہ کہ دن کے وقت اس وقت ان کا دامن پکڑے جبکہ وہ کھیل تماشے میں مصروف ہوں (او أمن اهل القرىٰ ان يأتيهم بأسنا ضحى وهم يلعبون)۔
مقصد یہ ہے کہ وہ روز و شب، خواب و بیداری اور خوشی و ناخوشی ہر حالت میں اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جب بھی وہ چاہے اپنے ایک معمولی فرمان سے ان کے کاشانۂ ہستی کو درہم برہم کر سکتا ہے بغیر اس کے کہ وہ اس عذاب کے لیے کوئی مقدمہ فراہم کرے یا کسی مدت کے گزرنے کا انتظار کرے، ہاں بس ایک لحظہ کے اندر وہ جو بلا چاہے اس انسان کے سر پر نازل کر سکتا ہے۔
ایک عجیب بات یہ ہے کہ انسان اس ترقی یافتہ دور میں جبکہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کر لی ہے اور باوجود یہ کہ اس نے دنیائے طبیعت کی بڑی بڑی قوتوں کو اپنا تابع فرمان بنا لیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ آج بھی ان حوادث کے مقابلہ میں اتنا ہی ضعیف اور بے دست و پا ہے جتنا ہزار سال پہلے کا انسان تھا۔ یعنی خدائی آفتوں جیسے زلزلہ اور بجلی اور اسی طرح کی دوسری آفتوں کے سامنے اس حالت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان اپنی قدرت و توانائی کے باوجود بہت کمزور اور ناتواں ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ہمیشہ ہر انسان کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔

اس کے بعد کی آیت میں دوبارہ ایک دوسرے انداز میں اسی حقیقت کا اظہار مزید تاکید کیلئے فرمایا گیا ہے: کیا یہ مجرم افراد خدا کی (انتقامی) تدابیر سے مطمئن ہیں؟ حالانکہ سوائے زیاں کاروں کے

کوئی بھی اُس کی (انتقامی) تدبیر سے اپنے کو محفوظ نہیں سمجھتا (أفأمنوا مکر الله فلا یأمن مکر الله الا القوم الخاسرون)۔

جیساکہ ہم سورہ آلِ عمران کی آیت ۵۴ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں کہ لفظ "مکر" کا جو مفہوم ہماری آج کی روز مرہ کی زبان میں لیا جاتا ہے، عربی میں اس کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے فارسی میں مکر کے یہ معنی ہیں کہ کوئی شخص کسی کے خلاف شیطانی اور زیاں بخش اسکیمیں تیار کرے لیکن عربی زبان میں "مکر" کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی کو اس کے مقصد سے باز رکھنے کے لیے ہر قسم کی تدبیر سے کام لیا جائے چاہے وہ حق ہو یا باطل نیز اُس لفظ "مکر" میں ایک قسم کا تدریجی نفوذ بھی پوشیدہ ہے۔

بنا بریں "مکر الٰہی" سے مراد یہ ہے کہ خدا گنہگار بندوں کو یقینی اور ناقابلِ شکست تدبیروں کے ذریعے خوشحالی اور عیش و آرام کی زندگی سے روک دے۔ اس سے انہی سزاؤں اور ناگہانی بلاؤں طرف اشارہ مقصود ہے جو انسان کو ہر طرح سے بے چارہ کر دیتی ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

مذکورہ بالا آیت کے آخر میں ایک جملہ ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے: جو شخص گھاٹے میں ہے اس کے سوا کوئی بھی اپنے کو خدا کی (انتقامی) تدبیر اور سزا سے امان میں نہیں سمجھتا۔ یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ جملہ پیغمبروں، پیشواؤں اور صالحین کے لیے بھی ہے یا نہیں؟

بعض کا خیال ہے کہ یہ لوگ اس حکم سے خارج ہیں اور مذکورہ بالا آیت صرف گنہگاروں کے لیے ہے لیکن اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم عمومی ہے کہ جو سب کو اپنے دائرہ میں لیے ہوئے ہے کیونکہ تمام پیغمبر اور آئمہ معصومین صلوات اللہ علیہم اجمعین ہمیشہ اپنے اعمال کے ناظر و نگران رہے کہ کہیں مبادا ان سے کوئی لغزش صادر ہو جائے کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ ان کے معصوم ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کبھی ان سے کوئی مخالفت نہیں ہو سکتی[1] بلکہ وہ اپنے ایمان اور ارادہ کی قوت سے اور اپنے اختیار اور الٰہی مدد کے ذریعے خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ ہیں، جبکہ وہ ترکِ اُولیٰ سے ڈرا کرتے تھے اور اس سے ڈرا کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنی اس ذمہ داری کو ادا نہ کر سکیں جو خدا نے ان کے دوش پر رکھی ہے یہی وجہ ہے کہ سورۂ انعام کی آیت ۱۵ میں ہے:

قُلْ إِنِّیٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّی عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ۔

---

[1] عصمت کے یہی معنی ہیں کہ ان سے کوئی فعل ایسا نہیں ہو سکتا جو موجب دخول جہنم ہو، البتہ ان سے ترکِ اولیٰ ہو سکتا ہے اسی کے لحاظ سے وہ ڈرتے رہتے تھے، اب رہے اہلبیت طاہرین صلوات اللہ علیہم اجمعین تو ان سے ترکِ اولیٰ بھی محال ہے، ان کا تو استغفار ترقی درجات اور تعلیم کے لیے تھا جیساکہ مؤلف محترم کئی مقامات پر وضاحت کر چکے ہیں (مترجم)۔

کہو میں اس سے ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اللہ کی نافرمانی کی تو میں روزِ عظیم کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤں گا۔

جو روایتیں آیہ مذکورہ کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں جو ہم نے بیان کی ہے۔ صفوان جمال کہتے ہیں کہ ایک روز میں امام جعفر صادق علیہ السلام کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا، میں نے سنا کہ آپؑ کہہ رہے تھے:

اللّٰھم لا تؤمنی مکرک - ثم جھر - فقال فلا یأمن مکر اللہ الا القوم الخاسرون۔

خدایا! مجھے اپنی تدبیر سے مطمئن نہ کر، پھر اس کے بعد آپؑ نے بلند آواز سے اس آیت کی تلاوت فرمائی فلا یأمن مکر اللہ الا القوم الخاسرون۔

نیز نہج البلاغہ میں بھی ہے کہ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام نے فرمایا:

لا تأمنن علی خیر ھٰذہ الامۃ عذاب اللہ لقول اللہ سبحانہ فلا یأمن مکر اللہ الا القوم الخاسرون۔

یعنی حتیٰ کہ اس امت کے نیک لوگوں پر بھی الٰہی سزا سے مطمئن و مامون نہ ہونا کیونکہ خداوند کریم فرماتا ہے: فلا یأمن مکر اللہ الا القوم الخاسرون [1]

درحقیقت خدا کی سزا سے مطمئن و مامون نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص اپنی ذمہ داریوں کے ادا نہ کرنے یا ان میں کوتاہی واقع ہونے سے ڈرتا ہے۔ یہ خوف اور اس کے ساتھ ہی اس کی رحمت کی امید دونوں ساتھ ساتھ اور برابر سے مومن کے دل میں پائی جانا چاہئیں۔ انہی دونوں کے توازن کی وجہ سے ہر قسم کی مثبت جدوجہد جاری رہتی ہے اور یہ وہی چیز ہے جسے روایات میں "خوف و رجاء" کہا گیا اور یہ کہا گیا ہے کہ باایمان افراد ہمیشہ ان دو کے درمیان رہتے ہیں، اس کے برخلاف زیاں کار مجرم اس طرح کیفرالٰہی کو بھلا بیٹھتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو نہایت مطمئن اور امن و امان میں سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد والی آیت میں ایک مرتبہ پھر اقوام موجودہ کو بیدار کرنے اور پچھلی قوموں کے واقعات سے عبرت حاصل کرنے کے لیے قرآن فرماتا ہے: آیا وہ لوگ جو گذشتہ قوموں کی زمینوں کے وارث بنے ہیں اور ان کے ٹھکانوں پر آباد ہوتے ہیں، پچھلی قوموں کے واقعات سے بیدار نہ ہوں گے؟ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی ان گناہوں کی وجہ سے ہلاک کر دیں اور جو حال ہم نے پچھلی قوموں کا کیا ان کا بھی وہی حال کر دیں (اولم یھد للذین یرثون الارض من بعد اھلھا ان لو نشآء اصبنٰھم بذنوبھم)۔

---

[1] کلمات قصار جملہ ۳۷۷۔

اور یہ بھی ہم کر سکتے ہیں کہ ان کو زندہ باقی رکھیں اور گناہوں کے اندر غوطہ ور ہونے کی وجہ سے ان سے ہم ادراک و شعور اور حق و باطل کی تمیز سلب کرلیں جس کے نتیجہ میں ان میں حقائق کو سننے کی صلاحیت باقی نہیں رہے گی، وہ کسی نصیحت کو نہ سُن سکیں گے۔ اپنی زندگی میں حیران و پریشان رہیں گے۔ (ونطبع علی قلوبھم فھم لا یسمعون)۔

خدا ان لوگوں سے کس طرح ان کے ادراک و شعور اور سوجھ بوجھ کو سلب کرلیتا ہے، تفسیر نمونہ کی جلد اول سورہ بقرہ کی آیت، کے ذیل میں ہم اس کو تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

(۱۰۱) تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

(۱۰۲) وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ۝

ترجمہ

(۱۰۱) یہ وہ آبادیاں ہیں جن کے واقعات ہم تم سے بیان کرتے ہیں وہ (اس قدر ہٹ دھرم تھے کہ) جب ان کے پاس رسول بیّنات لے کر آئے تو وہ چونکہ سابقاً (حق کی) تکذیب کرچکے تھے اس لیے (ان پر) ایمان نہ لائے، اللہ اسی طرح کافروں کے دلوں پر مُہر لگا دیتا ہے۔

(۱۰۲) ہم نے ان میں سے اکثر کو اپنے عہد پر باقی نہ پایا، اور ہم نے ان میں سے اکثر کو فاسق پایا۔

تفسیر

ان دونوں آیتوں میں بھی انہی عبرتوں کو پیش کیا گیا ہے جو گذشتہ اقوام کے واقعات میں پوشیدہ ہیں لیکن یہاں رُوئے سخن حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے اگرچہ سب کو سنانا مقصود ہے، پہلے ارشاد ہوتا ہے: یہ آبادیاں، شہر اور قریے ہیں جن کے واقعات اور سرگذشتیں ہم تم سے بیان کرتے ہیں (تلك القرى نقص عليك من انبآئها)[1]

اس کے بعد قرآن فرماتا ہے: ایسا نہ تھا کہ وہ بغیر کسی اتمام حجت کے ہلاک کر دیئے گئے بلکہ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ان کے پیغمبران کے پاس روشن دلیلیں لے کر آئے، انہوں نے ان کی ہدایت کیلئے اپنی پوری کوششیں صرف کیں (ولقد جآءتهم رسلهم بالبينات)۔

لیکن انہوں نے ان پیغمبروں کی مسلسل تبلیغات اور ہمہ گیر دعوتوں کا اپنے عناد سے مقابلہ کیا اور وہ اس بات پر آمادہ نہ ہوئے کہ انہوں نے جس بات کی سابق میں تکذیب کر دی تھی اسے قبول کر لیں اور اس پر ایمان لے آئیں (فما كانوا ليؤمنوا بما كذبوا من قبل)۔

اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبرانِ الٰہی نے دینِ الٰہی کی طرف بلانے کے لیے بارہا قیام کیا تھا لیکن وہ اسی طرح اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹے ہوئے تھے کہ بہت سے حقائق کے روشن ہو جانے کے باوجود کسی حقیقت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

بعد کے جملے میں ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کا سبب یوں بیان کیا گیا ہے: خدا اس طرح کافروں کے دلوں پر بے ایمانی اور گمراہی کا نقش ثبت کر دیتا ہے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے (کذٰلک يطبع الله على قلوب الكافرين)۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ غلط راہ پر اپنا قدم اٹھاتے ہیں، ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ تکرار اور پیہم غلط کاریوں کی وجہ سے اور ناپاکی اور کفرِ مسلسل کے سبب ان کے دلوں پر ایک ایسا نقش بن جاتا ہے جیسا کسی سکہ کا انمٹ نقش ہوتا ہے (اتفاقاً لفظ "طبع" کے لغت میں یہی معنی ہیں یعنی کسی شکل کو کسی چیز پر سکہ کی طرح نقش کر دینا) اور یہ درحقیقت از قبیل اثر و خاصیت عمل کے ہے جس کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے کیونکہ وہی ہے جس نے "تکرارِ عمل" کو یہ خاصیت بخشی ہے کہ وہ ایک "ملکہ" کی صورت اختیار کرے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہے کہ اس طرح کی گمراہی کوئی اجباری پہلو نہیں رکھتی بلکہ اس کے اسباب پیدا کرنے والے خود افراد بشر ہوتے ہیں، اگرچہ اسباب میں تاثیر اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔

---

[1] "نقص" کی اصل "قص" ہے جس کی شرح اسی سورہ کی آیت ۷ کے ذیل میں بیان ہو چکی ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ان لوگوں کی اخلاقی کمزوری کے ان دو پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے جو ان کی گمراہی و نابودی کا سبب بن گئے ۔

پہلے قرآن فرماتا ہے : یہ لوگ پیمان شکن افراد تھے ۔ اور ہم نے ان کی اکثریت میں پائیدار عہد و پیمان نہ پایا ۔ (وما وجدنا لاکثرہم من عھد) ۔

ہو سکتا ہے اس عہد و پیمان سے ۔ فطری عہد و پیمان ۔ مراد ہو جو خداوند کریم نے بمقتضائے آفرینش و فطرت اپنے تمام بندوں سے لیا ہے ، کیونکہ جس وقت اللہ نے اپنے بندوں کو ہوش ، ادراک اور استعداد عطا کی اس کے معنی یہ ہیں کہ ان سے اس بات کا عہد لیا کہ وہ اپنے کانوں اور آنکھوں کو کھولے رکھیں ' حق کی آواز سنیں اور اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں ، یہ وہی بات ہے جو اسی سورہ کے آخر میں آیت ۱۷۲ کی تفسیر میں بعنوان ۔ عالم ذر ۔ آئے گی اور اس کی شرح ہم انشاء اللہ اپنے مقام پر کریں گے ۔

نیز ممکن ہے اس سے مراد وہ عہد و پیمان ہو جو پیغمبران وقت اپنے دور کے لوگوں سے لیا کرتے تھے کیونکہ بہت سے لوگ پہلے تو قبول کر لیتے تھے بعد ازاں اس سے پھر جاتے تھے ۔

یا یہ کہ اس سے تمام عہدوں کی طرف اشارہ مقصود ہے چاہے وہ ۔ فطری ۔ ہوں یا ۔ تشریعی ۔

بہر حال ان کی پیمان شکنی کی عادت ایک بہت بری عادت تھی جو در حقیقت پیغمبروں کی نافرمانی ' کفر و نفاق کی راہ پر چلنے پر اصرار ، پھر اس کے نتائج بد میں مبتلا ہونے کے اسباب و علل میں سے ایک بڑا سبب تھی ۔

بعد ازاں ایک اور سبب کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے : ہم نے ان میں سے اکثر کو اپنے فرمان کی اطاعت سے خارج پایا (وان وجدنا اکثرھم لفاسقین) ۔

مقصد یہ ہے کہ ان میں سرکشی ، قانون شکنی ، نظام آفرینش سے باہر نکلنے اور قوانین الٰہی کو توڑنے کا جو جذبہ پایا جاتا تھا ، یہ ان کے کفر و بے ایمانی میں ثابت قدم رہنے کا ایک اور سبب تھا ۔

اس بات کی طرف توجہ رہنا چاہیئے کہ ۔ اکثرھم ۔ میں جو ضمیر ہے وہ تمام پچھلی اقوام کی جانب پلٹ رہی ہے ، اور یہ جو کہا ہے کہ ان میں سے اکثر عہد شکن اور فاسد تھے وہ ان اقلیتوں کی رعایت سے کہا گیا ہے جنہوں نے انبیائے سابقین کی تصدیق کی تھی اور وہ ان پر ایمان لائے تھے اور وہ آخر تک ان کے وفادار رہے تھے ، اگرچہ ایسے لوگ بعض اوقات اتنے محدود اور کم ہوتے تھے کہ وہ ایک خاندان سے تجاوز نہ کرتے تھے ، لیکن روح حق طلبی جو پورے قرآن پر حکمران نظر آتی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ ایک خاندان یا معدودے چند افراد کے حق کا بھی پاس و لحاظ کیا جاتے اور ان تمام افراد کو منحرف ، گمراہ اور پیمان شکن نہ بتایا جائے ، یہ ایک پرکشش بات ہے جو قرآن کریم میں جا بجا نظر آتی ہے ۔

۱۰۳ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ
وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُفْسِدِيْنَ ۝

۱۰۴ وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ
رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

۱۰۵ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۗ
قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۝

۱۰۶ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ
مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝

۱۰۷ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ۝

۱۰۸ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۰۳ اس کے بعد ان کے پیچھے (یعنی گذشتہ انبیاء کے بعد) ہم نے موسٰی کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے گروہ کی طرف بھیجا، لیکن ان لوگوں نے (ان نشانیوں کو قبول نہ کرکے) ان کے ساتھ ظلم کیا، دیکھو مفسدوں کا انجام کیا ہوا؟

۱۰۴ اور موسٰی نے کہا: اے فرعون! مَیں سارے جہانوں کے پروردگار کا فرستادہ ہوں۔

۱۰۵ میرے لیے یہی مناسب ہے کہ مَیں خدا کی طرف سوائے حق کے کسی بات کو نسبت نہ دوں، مَیں تمہارے لیے تمہارے خدا کی طرف سے روشن دلیل لایا ہوں، لہٰذا تم بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔

۱۰۶ فرعون نے کہا کہ اگر تم کوئی نشانی لائے ہو تو اس کو پیش کرو اگر تم سچے ہو۔

۱۰۷ اس پر انہوں نے اپنا عصا پھینکا تو وہ ایک نمایاں اژدہا بن گیا۔

۱۰۸ اور اپنے ہاتھ کو (گریبان سے) باہر نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید (اور درخشاں) ہو گیا۔

تفسیر

موسٰیؑ اور فرعون کی لڑائی کا ایک منظر

بہت سے انبیاء کی سرگزشت جو گزشتہ آیات میں بطور خلاصہ بیان کی گئی ہے اسی کے ذیل میں ان آیات میں اور اسی طرح کی دیگر متعدد آیات میں جو بعد میں آنے والی ہیں حضرت موسٰیؑ کے واقعات اور فرعون کے اس کے ساتھیوں کے ساتھ ان کی جنگ پھر اس کے بعد فرعون کا عبرتناک انجام بیان کیا گیا ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ اس سورہ میں حضرت موسٰیؑ کی سرگزشت بہ نسبت دیگر انبیاء کے ذرا تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے تو ممکن ہے دو وجہ سے ہو، ایک تو یہ کہ نزولِ قرآن کے ماحول میں موسٰیؑ بن عمران کے تابعین زیادہ تعداد میں پائے جاتے تھے، نیز ان کو حقانیتِ اسلام کی طرف متوجہ کرنا بہ نسبت دیگر افراد کے زیادہ ضروری تھا۔[1]

دوسری وجہ یہ ہے کہ تمام انبیاء کا قیام اور ان کا کفار سے مقابلہ حضرت موسٰیؑ کی نہضت اور تحریک سے بہت زیادہ مشابہ تھا۔

---

[1] اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا اور مکہ یہودیوں کی آماجگاہ نہ تھا لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مدینہ اور حجاز کے دیگر علاقوں میں مقیم یہودیوں کی آبادیوں نے مجموعاً مکہ پر کافی اثر کیا تھا اس بنا پر مکی سورتوں میں بھی ان کا کافی ذکر ملتا ہے۔

بہر حال، اس سورہ کے علاوہ دیگر سورتوں جیسے بقرہ، طٰہٰ، شعراء، نمل، قصص وغیرہ میں بھی اس عبرت انگیز سرگزشت کے مختلف حصّوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اگر ہم ان آیتوں کی الگ الگ شرح کریں اس کے بعد ان سب کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیں تو بعض افراد کے اس توہم کے برخلاف کہ قرآن میں تکرار سے کام لیا گیا ہے، ہم کو معلوم ہوگا کہ قرآن میں نہ صرف تکرار نہیں ہے بلکہ ہر سورہ میں جو بحث چھیڑی گئی ہے اس کی مناسبت سے اس سرگزشت کا ایک حصّہ شاہد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

ضمناً یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اس زمانے میں مملکت مصر نسبتاً وسیع مملکت تھی۔ وہاں کے رہنے والوں کا تمدّن بھی حضرت نوحؑ، ہودؑ اور شعیبؑ کی اقوام سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ لہٰذا، حکومت فراعنہ کی مقاومت بھی زیادہ تھی، اسی بنا پر حضرت موسٰیؑ کی تحریک اور نہضت بھی اتنی اہمیت کی حامل ہوئی کہ اس میں بہت زیادہ عبرت انگیز نکات پائے جاتے ہیں۔ بنا بریں اس سورہ میں حضرت موسٰیؑ کی زندگی اور بنی اسرائیل کے حالات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کلی طور پر اس عظیم پیغمبر کی زندگی کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

حضرت موسٰیؑ کی زندگی کے پانچ ادوار

۱۔ پیدائش سے لے کر آغوش فرعون میں آپؑ کی پرورش تک کا زمانہ۔

۲۔ مصر سے آپؑ کا نکلنا اور شہر مدین میں حضرت شعیبؑ کے پاس کچھ وقت گزارنا۔

۳۔ آپؑ کی بعثت کا زمانہ اور فرعون اور اس کی حکومت والوں سے آپؑ کے متعدد تنازعے۔

۴۔ فرعونیوں سے چنگل سے حضرت موسٰیؑ اور بنی اسرائیل کی نجات اور وہ حوادث جو راستہ میں اور بیت المقدس پہنچنے پر رونما ہوئے۔

۵۔ حضرت موسٰیؑ اور بنی اسرائیل کے درمیان کشاکش کا زمانہ۔

توجہ رہے کہ قرآن مجید کی ان سورتوں میں جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے مذکورہ پانچ ادوار میں سے صرف ایک یا چند کا ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ زیر بحث آیات میں نیز اسی سورہ کی بہت سی دیگر آیات میں جو آئندہ آنے والی ہیں صرف حضرت موسٰیؑ کی بعثت اور ان کی رسالت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس بنا پر ہم ان واقعات کو جو آپؑ کی بعثت سے قبل رونما ہوئے آئندہ آنے والی آیات کے ذیل میں بیان کریں گے جو ان واقعات کے ساتھ مربوط ہیں، خصوصاً سورہ ۔قصص۔ میں اس کا ذکر آئے گا۔

زیر بحث پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اقوام گزشتہ (جیسے حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ وغیرہ کی اقوام) کے بعد ہم نے حضرت موسٰیؑ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور فرعونیوں کے پاس بھیجا (ثم بعثنا من بعدهم موسٰی بآیاتنا الٰی فرعون وملائه)۔

اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ "فرعون" اسم عام ہے جو تمام سلاطین مصر پر بولا جاتا ہے جیسے سلاطین روم کو "قیصر" اور شاہانِ ایران کو "کسریٰ" کہتے تھے۔

لفظ "ملأ" جیسا کہ سابقاً بیان کیا گیا ان افراد پر بولا جاتا ہے جو قوم کے سربرآوردہ، اشراف پُر زرق برق نظروں میں سماجانے والے اور معاشرہ کے اہم مواقع پر چھاجانے والے افراد ہوں۔

اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ درجۂ اوّل میں حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کے گروہ کی طرف مبعوث ہوئے تو اس کی دو وجوہ معلوم ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت موسیٰؑ کا ایک اہم مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے چنگل سے اور مصر اور فرعونیوں کے استیلاء سے نجات دلائیں اور یہ کام فرعون سے گفتگو کیے بغیر وقوع پذیر نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جیسے ایک مثل ہے کہ پانی ہمیشہ اس چشمہ سے صاف کرنا چاہیئے جہاں سے وہ نکلتا ہے، کیونکہ اجتماعی خرابیاں اور ماحول کے مفاسد کسی فرد یا کسی خاص مقام کی اصلاح سے دور نہیں ہوتے بلکہ چاہیئے یہ کہ سب سے پہلے معاشرے کے سربرآوردہ افراد اور ان اشخاص کی اصلاح کی جائے جن کے ہاتھ میں اس قوم کی سیاست، اقتصاد اور علم کی باگ ڈور ہے، تاکہ باقی افراد کی اصلاح کیلئے بھی زمین ہموار ہو، اور یہ ایک درس ہے جو قرآن کریم تمام مسلمانانِ عالم کو اسلامی معاشروں کی اصلاح کے لیے دے رہا ہو۔

اس کے بعد قرآن فرماتا ہے: ان لوگوں نے آیاتِ الٰہی پر ظلم کیا (فظلموا بھا)۔

"ظلم" یہاں ایک وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے اور وہ ہیں کسی شے کو بے محل استعمال کیا جانا اور اس میں شک نہیں کہ آیاتِ الٰہی کا تقاضہ یہ ہے کہ تمام لوگ ان کے سامنے سرتسلیم خم کردیں اور ان کو قبول کرکے اپنے اپنے معاشروں کی اصلاح کریں۔ مگر ہوا یہ کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں نے ان کا انکار کرکے اپنے اوپر ظلم کیا

آخر میں قرآن مزید فرماتا ہے: دیکھ مفسدوں کا انجام کیا ہوا (فانظر کیف کان عاقبة المفسدین)۔

اس جملے میں فرعون اور اس کے لشکر کی نابودی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

درحقیقت گذشتہ آیت میں نہایت اجمالی طور پر حضرت موسیٰؑ کی رسالت اور فرعون سے آپ کے مقابلے اور اس کا انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن بعد والی آیات میں اسی بات کو زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، پہلے فرماتا ہے: موسیٰ نے کہا، اے فرعون! میں سارے جہانوں کے پروردگار کی طرف سے فرستادہ ہوں (وقال موسیٰ یا فرعون انی رسول من رب العالمین)۔

یہ حضرت موسیٰ کا فرعون سے پہلا مقابلہ ہے اور حق و باطل کی نبرد کا ایک نقشہ ہے۔ جاذب توجہ یہ بات ہے کہ پہلی بار فرعون کے سامنے ایک ایسا شخص آیا جس نے فرعون کو فرعون کہہ کر خطاب کیا۔ یہ ایک ایسا خطاب تھا جو ہر قسم کے ادب، تملق، چاپلوسی اور عبودیت کے اظہار سے خالی تھا کیونکہ اب تک تو لوگ اسے ہمارے سردار! اے مالک! اے رب اور اسی طرح کے دوسرے باطل القاب کے ساتھ پکارتے آئے تھے۔

حضرت موسیٰ کی یہ تعبیر گویا فرعون کے لیے سب سے پہلے خطرہ کا الارم تھا۔ نیز حضرت موسیٰ کا یہ کہنا کہ "مَیں جہانوں کے پروردگار کا فرستادہ ہوں" فی الحقیقت فرعون کے لیے ایک طرح کا اعلانِ جنگ تھا۔ کیونکہ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ فرعون اور اس کی طرح کے دوسرے مدعیانِ ربوبیت سب جھوٹے ہیں اور تمام جہانوں کا رب صرف خدائے وحدہ لاشریک ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی رسالت کے اعلان کے بعد ہی یہ کہا:

اب جبکہ مَیں خدا کا فرستادہ ہوں تو میرے لیے مناسب ہے کہ مَیں اس کے بارے میں سوائے حق کے دوسری بات نہ کہوں کیونکہ خدا کا فرستادہ تمام عیوب سے مبرّہ و منزّہ ہوتا ہے ممکن نہیں کہ وہ کوئی غلط بات کہے (حقیق علیٰ ان لآ اقول علی اللّٰہ الا الحق)۔

بعد ازاں اپنے دعوائے نبوّت کے اثبات کے لیے آپ نے اس جملہ کا اضافہ کیا: ایسا نہیں کہ مَیں نے یہ دعویٰ بغیر کسی دلیل کے کیا ہو، مَیں تمہارے پروردگار کی جانب سے روشن و واضح دلیل لے کر آیا ہوں (قد جئتکم ببینة من ربکم)۔

لہٰذا بنی اسرائیل کو میرے ہمراہ بھیج دو (فارسل معی بنی اسرآئیل)۔

یہ درحقیقت حضرت موسیٰ کی رسالت کا ایک حصہ تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعونیوں کے چنگل سے چھٹکارا دلائیں اور اسیری کی زنجیروں کو ان کے ہاتھوں اور پیروں سے کاٹ دیں کیونکہ اس زمانے میں بنی اسرائیل ذلیل غلاموں کی حیثیت سے قبطیوں (اہلِ مصر) کے ہاتھوں میں گرفتار تھے اور قبطی ان سے ہر سخت و پست کام لیا کرتے تھے۔

آئندہ کی آیات سے نیز قرآن کی دیگر آیات سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کو یہ حکم ملا تھا کہ وہ فرعون اور دیگر اہلِ مصر کو بھی اپنے آئین کی طرف دعوت دیں، یعنی ان کی رسالت صرف بنی اسرائیل میں منحصر نہ تھی۔

فرعون نے جونہی یہ دعویٰ سنا کہ "مَیں اپنے ہمراہ روشن دلیل بھی رکھتا ہوں" فوراً کہا۔ اگر تم سچ کہتے ہو اور اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی رکھتے ہو تو اسے پیش کرو" (قال ان کنت جئت بآیة

فأت بهآ ان كنت من الصادقين)۔

اس تعبیر میں ایک تو حضرت موسیٰ کے دعوے کے متعلق شک و شبہ مخفی تھا، اس کے علاوہ اس کے یہ بھی معنی تھے کہ دیکھو! میں جویائے حق ہوں کہ اگر موسیٰ نے کوئی قاطع دلیل پیش کر دی تو فوراً اسے مان لوں گا۔

اس پر حضرت موسیٰ نے بغیر کسی توقف کے اپنے دو بڑے معجزے پیش کر دیئے جن میں سے ایک "خوف" کا مظہر تھا تو دوسرا "امید" کا جس کی وجہ سے آپ کے مقام "انذار" و "بشارت" کی تکمیل ہوتی ہے۔ "پہلے" آپ نے اپنا عصا نکال کر اس کے سامنے پھینک دیا جو ایک نمایاں اژدھے کی شکل میں ہو گیا" (فالقیٰ عصاہ فاذا ھی ثعبان مبین) ؎۱

لفظ "مبین" سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ عصا پچ مچ اژدہا بن گیا وہاں کسی قسم کے فریب نظر، ہاتھ کی صفائی یا جادو جنتر وغیرہ نہ تھا، برخلاف ان امور کے جو جادو گروں نے بعد میں ظاہر کیے، کیونکہ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ان جادو گروں نے نظر فریب کام کیا اور ایک ایسا عمل کیا جس کی وجہ سے لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ سانپ ہیں جن میں حرکت پیدا ہو گئی ہے۔

یہاں پر ایک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ سورہ نمل کی آیت ۱۰ اور قصص کی آیت ۳۱ میں ہے کہ وہ عصا "جان" کی شکل میں حرکت کرنے لگا اور "جان" عربی میں باریک سانپ کو کہتے ہیں جو تیز بھاگے، یہ تعبیر لفظ "ثعبان" جس کے معنی ایک بڑے اژدھے کے ہیں کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

لیکن اگر اس بات کی طرف توجہ کی جائے کہ مذکورہ بالا دونوں آیتیں حضرت موسیٰ کی بعثت کے آغاز سے تعلق رکھتی ہیں اور آیت زیر بحث کا تعلق حضرت موسیٰ اور فرعون کے مقابلے سے ہے، تو یہ مشکل حل ہو جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں آپ کا عصا چھوٹا سانپ بنا بعد میں اس کی جسامت میں اضافہ ہوتا گیا تاکہ حضرت موسیٰ اس معجزہ سے تدریجاً مانوس ہو جائیں پھر جب فرعون سے مقابلہ ہوا تو اس نے ایک بہت بڑے اژدھے کی صورت اختیار کر لی تاکہ دشمن کے دل پر خاطر خواہ اثر ہو جبکہ حضرت موسیٰ کے دل میں اس کی ہیبت اس سے قبل دیکھنے کی وجہ سے کم ہو چکی تھی۔

؎۱ راغب نے "مفردات" میں یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ کلمہ "ثعبان" مادہ "ثعب" سے لیا گیا ہے جس کے معنی پانی جاری ہونے کے ہیں کیونکہ یہ حیوان کسی نہر کی طرح لہرا کے چلتا ہے۔

عصا اژدھے کی شکل میں

اس میں کوئی شک نہیں کہ عصا کا اژدہا بن جانا ایک بیّن معجزہ ہے جس کی توجیہ مادّی اصولوں سے نہیں کی جاسکتی، بلکہ ایک خدا پرست شخص کو اس سے کوئی تعجب بھی نہ ہوگا کیونکہ وہ خدا کو قادرِ مطلق اور سارے عالم کے قوانین کو ارادۂ الٰہی کے تابع سمجھتا ہے لہٰذا اس کے نزدیک یہ کوئی بڑی بات نہیں کہ لکڑی کا ایک ٹکڑا حیوان کی صورت اختیار کرلے کیونکہ ایک مافوق طبیعت قدرت کے زیرِ اثر ایسا ہونا عین ممکن ہے۔

ساتھ ہی یہ بات بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اس جہانِ طبیعت میں تمام حیوانات کی خلقت خاک سے ہوتی ہے نیز لکڑی و نباتات کی خلقت بھی خاک سے ہوئی ہے، لیکن مٹی سے ایک بڑا سانپ بننے کے لیے عادتاً شاید کروڑوں سال کی مدّت درکار ہے۔ لیکن اعجاز کے ذریعے یہ طولانی مدت اس قدر کوتاہ ہوگئی کہ وہ تمام انقلابات ایک لحظہ میں طے ہو گئے جن کی بنا پر مٹی سے سانپ بنتا ہے، جس کی وجہ سے لکڑی کا ایک ٹکڑا جو قوانینِ طبیعت کے زیرِ اثر ایک طولانی مدّت میں سانپ بنتا، چند لحظوں میں یہ شکل اختیار کرگیا۔

اس مقام پر کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو تمام معجزاتِ انبیاء کی طبیعی اور مادّی توجیہات کرتے ہیں جس سے ان کے اعجازی پہلو کی نفی ہوتی ہے، اور ان کی یہ سعی ہوتی ہے کہ تمام معجزات کو معمول کے مسائل کی شکل میں ظاہر کریں، ہرچند وہ کتبِ آسمانی کی نص اور الفاظ صریحہ کے خلاف ہو۔ ایسے لوگوں سے ہمارا یہ سوال ہے کہ وہ اپنی پوزیشن اچھی طرح سے واضح کریں۔ کیا وہ واقعاً خدا کی عظیم قدرت پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے قوانینِ طبیعت پر حاکم مانتے ہیں کہ نہیں؟ اگر وہ خدا کو قادر و توانا نہیں سمجھتے تو ان سے انبیاء کے حالات اور ان کے معجزات کی بات کرنا بالکل بےکار ہے اور اگر وہ خدا کو قادر جانتے ہیں تو پھر ذرا تأمل کریں کہ ان تکلف آمیز توجیہوں کی کیا ضرورت ہے جو سراسر آیاتِ قرآنی کے خلاف ہیں (اگرچہ زیرِ بحث آیت میں میری نظر سے نہیں گزرا کہ کسی مفسّر نے جس کا طریقۂ تفسیر کیسا ہی مختلف کیوں نہ ہو اس آیت کی مادّی توجیہ کی ہو، تاہم جو کچھ ہم نے بیان کیا وہ ایک قاعدہ کلی کے طور پر تھا)۔

* * *

اس کے بعد کی آیت نے حضرت موسیٰ کا دوسرا معجزہ بیان کیا ہے، جو بشارت کا پہلو رکھتا ہے، ارشاد ہوتا ہے: موسیٰ نے اپنا ہاتھ گریبان سے باہر نکالا، تو وہ ناگہاں دیکھنے والوں کے لیے سفید اور درخشاں ہوگیا (ونزع یدہٗ فاذا ھی بیضآء للنّاظرین)۔

"نزع" کے معنی ہیں کسی چیز کو اس جگہ سے باہر نکالا جائے جہاں وہ پہلے سے قرار پذیر ہو، جیسا کاندھے سے عبا کا الگ کرنا، تن سے لباس کا دُور کرنا ایسے کاموں کو کلامِ عرب میں "نزع" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح سے بدن سے روح کے جُدا ہونے کو بھی "نزع روح" کہتے ہیں، اسی مناسبت سے یہ لفظ "خارج کرنے" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس آیت میں استعمال ہوا ہے۔

اگرچہ اس آیت میں ہاتھ نکالنے کا ذکر نہیں ہے لیکن سورہ قصص کی آیت ۳۲ میں ہے:

اُسْلُكْ يَدَكَ فِىْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ ایسے موقع پر اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں داخل کرکے جب دوبارہ باہر نکالتے تھے تو وہ نمایاں طور پر سفید اور درخشاں ہو جایا کرتا تھا اس کے بعد آہستہ آہستہ اپنی پہلی حالت پر پلٹ آتا تھا۔

کچھ تفاسیر اور روایات میں ہے کہ حضرت موسیٰ کا ہاتھ سفیدی کے علاوہ ایسی حالت میں بہت زیادہ چمکیلا بھی ہو جاتا تھا، لیکن آیاتِ قرآنی اس معاملہ میں خاموش ہیں اگرچہ اس مفہوم کے خلاف بھی نہیں ہیں۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ یہ اور اس سے پہلے بیان کیا جانے والا معجزہ جو عصا کے بارے میں تھا یہ مسلمہ طور پر کوئی عادی اور معمول کا پہلو نہیں ہے نہ طبیعت کو اس میں دخل ہے بلکہ یہ پیغمبروں کے خارقِ عادت معجزات میں داخل ہے جو ماوراء طبیعت اور قوت کی دخالت کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔

اور یہ بھی اشارہ بیان کیا گیا کہ حضرت موسیٰ نے یہ دونوں معجزے جو دکھلائے تو اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ میں صرف ڈرانے کے لیے نہیں آیا ہوں بلکہ تہدید صرف دشمنوں اور مخالفین کے لیے ہے اور تشویق، تعمیر اور نورانیت مومنین کے لیے ہے۔

۱۰۹ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ

۱۱۰ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ○

۱۱۱ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۙ

۱۱۲ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ○

ترجمہ

(۱۰۹) فرعون کے اصحاب نے کہا بے شک یہ ایک جاننے والا جادوگر ہے۔

(۱۱۰) یہ چاہتا ہے کہ تمہیں تمہاری سرزمین سے باہر نکال دے، تمہاری رائے کیا ہے؟ (اس کے مقابلے میں کیا کرنا چاہیئے)۔

(۱۱۱) (اس کے بعد) انہوں نے (فرعون سے یہ) کہا کہ اس کے اور اس کے بھائی کے معاملے کو تاخیر میں ڈال دو اور اکٹھا کرنے والوں کو تمام شہروں میں بھیج دو۔

(۱۱۲) تاکہ وہ ہر آزمودہ جادوگر کو تمہارے پاس لے آئیں۔

تفسیر

مقابلہ شروع ہوتا ہے

ان آیات میں اس پہلے ردّ عمل کو بیان کیا گیا ہے جو حضرت موسیٰؑ کی دعوت اور ان کی معجز نمائی کے نتیجے میں فرعون اور اس کی حکومت کے افراد پر مرتب ہوا۔

آیت میں پہلے اصحاب فرعون کی طرف سے یہ نقل ہوا کہ انہوں نے جیسے ہی موسیٰ سے خارق عادت امور کا مشاہدہ کیا تو فوراً ہی ان کی طرف جادو کی نسبت دے دی اور کہا: یہ ایک جاننے والا پرانا جادوگر ہے (قال الملأ من قوم فرعون ان ھٰذا الساحر علیم)۔

لیکن سورۂ شعراء کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات فرعون نے کہی تھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ

فرعون نے اپنے اصحاب سے کہا کہ یہ ایک جاننے والا جادوگر ہے۔ (شعراء ۳۴)۔

حقیقت میں یہ دونوں آیتیں آپس میں کوئی اختلاف نہیں رکھتیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات پہلے فرعون نے کہی ہو کیونکہ اس حادثے کے بعد طبیعی طور پر سب کی آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ دیکھیں اس پر موسیٰؑ کی اس ضرب کاری کا کیا اثر ہوتا ہے۔ پھر جب فرعون نے اپنی بات کہہ دی کہ یہ ایک تجربہ کار جادوگر معلوم ہوتا ہے تو اس کے اصحاب جن کو چاپلوسی کی عادت تھی اور ان

کا مقصد بجز اپنے سردار کی رضا مندی کے اور کچھ نہ تھا بیک زبان بول اٹھے : "بالکل درست فرمایا یہ ایک بہت ماہر جادوگر معلوم ہوتا ہے" یہ حالت صرف فرعون کے ساتھیوں ہی کی نہیں تھی بلکہ دنیا میں ہر ظالم سردار کے ارد گرد ایسے افراد جمع ہو جایا کرتے ہیں اور وہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو فرعون کے دربار میں ہوا۔

٭

اس کے بعد انہوں نے یہ بھی کہا کہ : "اس شخص کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں تمہارے وطن سے نکال باہر کرے" (یرید ان یخرجکم من ارضکم)۔

یعنی اس کی غرض سوائے استعمار، استثمار، حکومت طلبی اور دوسروں کی زمین غصب کرنے کے اور کچھ نہیں ہے اور یہ خارق عادت باتیں اور دعوائے نبوت سب کچھ اسی غرض سے ہے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا کہ ان باتوں کے جان لینے کے بعد اب۔ تم لوگ بھی اپنی اپنی رائے کا اظہار کرو کہ اس شخص کے بارے میں کیا رویّہ اختیار کیا جائے" (فماذا تأمرون)۔

یعنی وہ لوگ حضرت موسیٰ کے بارے میں مشورہ کرنے بیٹھے اور انہوں نے اس معاملے میں تبادلۂ خیالات کیا کیونکہ "امر" کا مادّہ ہمیشہ حکم دینے کے لیے نہیں آتا بلکہ مشورہ کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

یہاں پر پھر یہ توجہ رکھنا چاہیئے کہ بالکل یہی جملہ سورۂ شعراء میں فرعون کی زبان سے بھی نقل ہوا ہے اور اس نے اس موقع پر اپنے اطرافیوں سے کہا کہ بتاؤ تم لوگ موسیٰ کے بارے میں کیا رائے دیتے ہو؟ ہم نے بیان کیا کہ ان دونوں میں اختلاف نہیں ہے۔

یہ احتمال بھی بعض مفسّرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ جملہ "فماذا تأمرون" اطرافیانِ فرعون نے فرعون سے کہا تھا، اس میں صیغۂ جمع تعظیم کے لیے ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ قرینِ قیاس ہے۔

٭

بہرحال سب کی رائے یہ قرار پائی کہ انہوں نے فرعون سے کہا اس کے اور اس کے بھائی (ہارون) کے بارے میں جلد بازی سے کام نہ لو اور جو کچھ بھی فیصلہ کرنا ہو وہ بعد کے لیے اٹھا رکھو لیکن جادوگروں کو اکٹھا کرنے والے افراد کو تمام شہروں میں روانہ کر دو۔ (قالوا ارجه واخاه وارسل فی المدآئن حاشرین)۔

تاکہ یہ لوگ تمام ماہر و تجربہ کار جادوگروں کو تیرے پاس آنے کی دعوت دیں اور ان کو لے کر تیرے پاس آئیں" (یأتوك بكل ساحر علیم)۔

یہاں پر ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا فرعون کی جماعت یہ خیال کرتی تھی کہ شاید حضرت موسیٰ

کا دعوائے نبوت ایک سچا دعویٰ ہو اور اس طرح وہ انہیں آزمانا چاہتے تھے یا اس کے برعکس انہیں اپنے دعوے میں جھوٹا خیال کرتے تھے اور ہر شخص کی کوشش کو اپنی فکر و ہمت کے مطابق سیاسی رنگ دیتے تھے لہٰذا ان لوگوں نے حضرت موسیٰ کو قتل کرنے کی ٹھان لی لیکن اگر ان کو بعجلت قتل کر دیا جاتا تو اس سے خوشگوار نتائج برآمد نہ ہوتے کیونکہ ان کے دونوں معجزوں کی وجہ سے لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہو گئے تھے پس اگر وہ فوراً قتل کر دیئے جاتے تو نبوت کے ساتھ ساتھ مظلومیت بھی شامل ہو جاتی اور اس طرح اور زیادہ لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے۔ لہٰذا پہلے انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ پہلے ان کے معجزانہ عمل کو خارق عادت ساحرانہ اعمال سے منسلک کر دیں اور اس طرح انہیں بے آبرو کرنے کے بعد قتل کر دیں تاکہ موسیٰ و ہارون کی داستان ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ دوسرا احتمال قرائن سے زیادہ نزدیک تر ہے۔

(۱۱۳) وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا
نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝

(۱۱۴) قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝

(۱۱۵) قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ
نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ۝

(۱۱۶) قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ
وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ۝

(۱۱۷) وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِيَ
تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ۝

(۱۱۸) فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

(۱۱۹) فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۝

(۱۲۰) وَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِينَ ﴿۱۲۰﴾
(۱۲۱) قَالُوٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿۱۲۱﴾
(۱۲۲) رَبِّ مُوسٰى وَهٰرُونَ ﴿۱۲۲﴾

ترجمہ

(۱۱۳) جادوگر فرعون کے پاس آئے اور انہوں نے کہا: اگر ہم غالب ہو گئے تو کیا ہمیں کوئی اہم معاوضہ ملے گا؟

(۱۱۴) (فرعون نے) کہا: ہاں (ضرور ملے گا اور) تم لوگ (میرے) مقرب ہو جاؤ گے۔

(۱۱۵) (جادوگروں نے) کہا: اے موسٰی یا تو تم (پہلے اپنا عصا) ڈالو، یا ہم (اپنا جادو) ڈالیں۔

(۱۱۶) (موسٰی نے) کہا تم (پہلے) ڈالو، اور جب انہوں نے (اپنے جادوؤں کو) ڈالا تو لوگوں کی نظر بندی کر دی، اور لوگوں کو ڈرا دیا اور انہوں نے ایک عظیم جادو پیش کیا۔

(۱۱۷) (اس وقت) ہم نے موسٰی کی طرف وحی کی کہ (ذرا) اپنے عصا کو سامنے ڈال دو (جونہی موسٰی نے عصا ڈالا تو) وہ فوراً (ایک بڑے اژدھے کی شکل میں ہو گیا اور) ان کے جھوٹے وسیلوں کو نگلنے لگا۔

(۱۱۸) اس موقع پر حق آشکارا ہو گیا اور جو کچھ انہوں نے (کھیل) بنایا تھا نابود ہو گیا۔

(۱۱۹) وہ اس موقع پر مغلوب ہو گئے اور ذلیل و خوار ہو گئے۔

(۱۲۰) اور جادوگر سب کے سب سجدہ میں گر گئے۔

(۱۲۱) اور انہوں نے کہا کہ ہم جہانوں کے پروردگار پر ایمان لاتے ہیں۔

۱۲۲ جو موسٰی و ہارون کا پروردگار ہے۔

تفسیر

آخر کار حق نے کیسے فتح پائی

ان آیات میں حضرت موسٰیؑ اور ساحروں کے مقابلے اور آخر میں اس کے نتیجے کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ پہلی آیت میں قرآن فرماتا ہے: جادوگر فرعون کے بلانے پر اس کے پاس آتے اور انہوں نے جو سب سے پہلی بات پیش کی وہ یہ تھی کہ اگر ہم کو موسٰی پر غلبہ حاصل ہوا تو کیا ہم کو معقول صلہ ملے گا (وجآء السحرة فرعون قالوآ ان لنا لاجرًا ان کنّا نحن الغالبین)۔

اگرچہ لفظ "اجر" کے معنی ہر قسم کی پاداش اور معاوضے کے ہیں وہ کم ہو یا زیادہ لیکن چونکہ یہاں پر "اجر" "نکرہ" کے ساتھ آیا ہے اس لیے اس کے معنی زیادتی اور اہمیت کے ہیں، خصوصاً یہ کہ ان کو اجر ملنا تو یقینی تھا، لہٰذا جس چیز کا ان کو فرعون سے پہلے سے وعدہ لینا مقصود تھا وہ اہم اجر اور زیادہ معاوضہ لینے کا مسئلہ تھا۔ فرعون نے بھی بغیر کسی توقف کے ان کی بات مان لی اور کہا: تم کو نہ صرف یہ کہ اہم اجر اور خاطر خواہ معاوضہ ملے گا بلکہ تم میرے دربار کے مقرب لوگوں میں سے ہو جاؤ گے (قال نعم و انکم لمن المقربین)۔

اس طرح فرعون نے ان کو "مال و زر" کا بھی وعدہ دیا، اور "بڑے منصب" کی بھی بات کی۔ آیت کی اس تعبیر سے پتہ چلتا ہے کہ فرعون کے دربار میں تقرب حاصل کرنا مال و ثروت سے بھی اہم بات تھی اور یہ ایک معنوی درجہ شمار ہوتا تھا گویا جو بھی اس پر فائز ہو گیا دولت اس کے پاؤں چومنے لگتی تھی۔

*

آخر کار حضرت موسٰیؑ اور جادوگروں کے مقابلہ کے لیے ایک دن طے پایا، جیسا کہ سورہ طٰہٰ اور شعراء دونوں میں آیا ہے، اس مقابلے کو دیکھنے کے لیے تمام لوگوں کو دعوت عام دی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔

روز معین آیا، تمام جادوگر اپنے سازو سامان سے لیس ہو کر پہنچ گئے۔ وہ اپنے ہمراہ بہت سی رسیاں اور لاٹھیاں بھی لائے جن کے اندر کیمیاوی مادے بھرے ہوتے تھے، جن پر اگر آفتاب کی حرارت پڑے تو ان میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔

یہ ایک عجیب منظر تھا کیونکہ اتنے بڑے انبوہ کے مقابلے میں صرف حضرت موسٰیؑ اپنے بھائی ہارونؑ

کے ساتھ حاضر تھے اور ان کے ساتھ سوائے خدا کے کوئی بھی تو نہ تھا۔
ساحروں نے ایک خاص غرور کے ساتھ موسیٰ سے کہا: یا تو تم پہل کرو اور اپنا عصا پھینکو یا ہم آغاز کرتے ہیں، اور اپنے وسائل پھینکتے ہیں (قالوا یاموسیٰ اما ان تلقی واما ان نکون نحن الملقین)۔
حضرت موسیٰ نے بڑے سکون کے ساتھ جواب دیا: تم شروع کرو اور اپنے وسائل پھینکو (قال القوا)۔
جس وقت ان جادوگروں نے اپنی اپنی رسیوں کو میدان کے بیچ میں پھینکا، تو انہوں نے لوگوں کی نظر بندی کردی اور اپنے اعمال اور مبالغہ آمیز اقوال سے لوگوں کے دلوں میں خوف و وحشت پیدا کردی اور ایک بڑے جادو کا تماشہ ان کو دکھایا۔ (فلما القوا سحروا اعین الناس واسترھبوھم وجاؤ بسحر عظیم)۔
جیسا کہ ہم تفسیر نمونہ کی جلد اول آیت ۱۰۲ کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔ سحر کے معنی اصل میں دھوکا، نیرنگ، شعبدہ اور ہاتھ کی صفائی کے ہیں اور کبھی یہ لفظ ہر اس چیز کے لیے آتا ہے جس کا سبب نامرئی و مرموز ہو۔
بنا بریں اس لفظ کے ذیل میں وہ تمام افراد آجائیں گے جو ہاتھ کی صفائی، ہاتھ کی تیز حرکات اور مہارت کے ذریعے چیزوں کو اس طرح اِدھر اُدھر کر دیتے ہیں کہ ایک خارق عادت کام معلوم ہوتا ہے نیز وہ لوگ بھی اس میں داخل ہو جائیں گے جو کیمیکل کے ذریعے یا فزکس کے قوانین کے ذریعہ لوگوں کو عجیب طرح کے کھیل تماشے دکھلائیں۔ ان سب کو "ساحر" کہا جاتا ہے۔
اس کے علاوہ جادوگروں کا ایک شیوہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی زبان سے بھی کچھ ایسے کلمات کہتے جاتے ہیں جن کا اثر لوگوں کے ذہنوں پر نفسیاتی حیثیت سے پڑتا ہے۔ وہ کلمات ایسے وحشتناک اور ہولناک ہوتے ہیں جو حاضرین کے دلوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں جادوگر جس خارق عادت امر کا تماشہ دکھانا چاہتا ہے اس کے لیے ایک طرح سے زمین ہموار ہو جاتی ہے۔
اس سورۃ میں نیز دیگر سورتوں میں جو آیات وارد ہوئی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان جادوگروں نے اس روز ان تمام وسائل سحر سے کام لیا تھا۔ یہ جملہ "سحروا اعین الناس" (لوگوں کی نظر بندی کردی) یا یہ جملہ "استرھبوھم" (لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کر دیا) یا دوسری تعبیرات جو سورہ طٰہٰ اور شعرآء میں آئی ہیں اس امر کی شاہد ہیں[1]

---

[1] حقیقت سحر کی مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد اول (ص ۲۴۸ تا ص ۲۵۰ اُردو ترجمہ) ملاحظہ ہو۔

دو اہم نکات

۱۔ **ساحروں کے جادو کا ایک عجیب منظر :** قرآن نے اپنے ایک جملہ " وجآءوا بسحر عظیم " کے ذریعہ سربستہ طور پر اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جادوگروں نے اس موقع پر جو منصوبہ باندھا تھا وہ انتہائی اہم جچا تُلا اور ہولناک تھا ورنہ آیت میں لفظ " عظیم " استعمال نہ ہوتا۔

تواریخ، تفاسیر اور روایات میں بھی ان آیات کے ذیل میں جو مطالب درج ہوئے ہیں ان سے بھی اس موقع کے منظر کی اہمیت و وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین کے قول کے مطابق ان ساحروں کی تعداد کئی ہزار تھی نیز ان کے وسائل سحر بھی ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ چونکہ اس زمانے میں مصر میں سحر و ساحری کا کافی زور تھا اس بنا پر اس بات پر کوئی جائے تعجب نہیں ہے۔

خصوصاً سورہ طٰہٰ کی آیت ۶۷ میں ہے :

فاوجس فی نفسه خیفة موسٰی۔

یعنی وہ منظر اتنا عظیم و وحشتناک تھا کہ حضرت موسٰیؑ نے بھی اس کی وجہ سے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا۔

اگرچہ نہج البلاغہ میں اس کی صراحت موجود ہے کہ حضرت موسٰیؑ کو اس بات کا خوف لاحق ہو گیا تھا کہ ان جادوگروں کو دیکھ کر لوگ اس قدر متاثر نہ ہو جائیں کہ ان کو حق کی طرف متوجہ کرنا دشوار ہو جائے[1] بہرصورت یہ تمام باتیں اس بات کی مظہر ہیں کہ اس وقت ایک عظیم معرکہ درپیش تھا جسے حضرت موسٰیؑ کو بفضلِ الٰہی سر کرنا تھا۔

۲۔ **مناسب ہتھیار سے مقابلہ :** اس بحث سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اپنی وسیع حکومت میں جو اسے سرزمین مصر پر حاصل تھی ایک سوچی سمجھی شیطانی سیاست پر گامزن تھا۔ اس نے حضرت موسٰیؑ اور حضرت ہارونؑ کے مقابلے میں صرف ڈرانے دھمکانے ہی سے کام نہ لیا بلکہ اس نے بزعم خود یہ کوشش کی کہ حضرت موسٰیؑ نے جو معجزہ پیش کیا تھا اس کے مشابہ ایک ہتھیار پیش کرے۔ بلاشبہ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو پھر حضرت موسٰیؑ اور ان کی تعلیمات کا دنیا میں نام و نشان بھی نہ ملتا۔ اس صورت میں ان کا مارا جانا اس کے لیے بہت آسان ہو جاتا، لوگ بھی اس پر خوش ہوتے مگر اس بے چارے کو کیا خبر کہ حضرت موسٰیؑ نے کسی انسانی قوت پر بھروسہ نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے اس قوت لایزال الٰہی اور قدرت پروردگار لامتناہی پر تکیہ کیا ہے جو ہر طاقت کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ بہرحال

---

[1] خطبہ ۴

دشمن کے مقابلے پر مناسب ہتھیار لے کر جانا فتح حاصل کرنے کے لیے ایک بہترین راستہ ہے جس سے بڑے سے بڑے دشمن کو شکست دی جا سکتی ہے۔

یہ وقت جبکہ تمام لوگ ہیجان میں آئے ہوئے تھے، ہر طرف خوشی کے نعرے لگائے جا رہے تھے، فرعون اور اس کے ساتھیوں کے لبوں پر رضایت و طمانیت کا تبسم کھیل رہا تھا، ان کی آنکھیں بھی مسرت سے چمک رہی تھیں کہ ۔ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ کو اللہ کی وحی ہوئی ۔ اے موسیٰ! تم بھی اپنا عصا پھینک دو، عصا کا پھینکنا تھا کہ یک بیک منظر بالکل بدل گیا، چہروں سے رنگ اڑ گئے، فرعون اور اس کے تمام ساتھی لرزنے لگے جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنے عصا کو ڈال دو، ناگہاں وہ عصا (ایک اژدھے کی شکل میں ہو گیا اور) نگلنے لگا ان کے جھوٹے وسیلوں کو (واوحینا الی موسیٰ ان الق عصاك فاذا هي تلقف ما يأفكون)۔

۔ تلقف ۔ مادہ ۔ لقف ۔ (بروزن وقف) سے ہے، جس کے معنی کسی چیز کو قوت کے ساتھ پکڑنے کے ہیں چاہے دہن سے ہو یا ہاتھ سے لیکن بعض مقامات پر یہ لفظ نگلنے کے معنی میں بھی آیا ہے۔ زیر بحث آیت میں بھی بظاہر اسی معنی میں آیا ہے۔

"یأفکون" مادہ ۔ افک" (بروزن کتف) سے ہے جس کے اصلی معنی کسی چیز سے پلٹانے کے ہیں چونکہ جھوٹ انسان کو حق سے پلٹا دیتا ہے اس لیے اس کو ۔ افک ۔ کہتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہاں پر اس آیت کے معنی میں ایک اور احتمال ذکر کیا ہے وہ یہ کہ عصائے موسیٰ نے جس وقت ایک بڑے سانپ کی شکل اختیار کی تو اس نے ساحروں کے وسیلوں کو نگلا نہیں تھا بلکہ انہیں بیکار کر دیا اور ان کی پہلی شکل پر پلٹا دیا تھا۔ ان مفسرین کا خیال ہے کہ اس طرح ہر اشتباہ کا راستہ لوگوں کے لیے بند ہو جاتا ہے، جبکہ ان وسیلوں کا نگل لینا لوگوں کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتا کہ حضرت موسیٰ کا معجزہ ان کے وسیلوں سے زبردست ہے۔

لیکن یہ احتمال نہ تو کلمہ ۔ تلقف ۔ سے مطابقت رکھتا ہے، نہ آیت کے مطالب سے اسے مناسبت ہے کیونکہ ۔ تلقف ۔ کے معنی جیسا کہ بیان ہوا کسی چیز کو بہ سرعت پکڑنے کے ہیں نہ کہ اس کو دگرگوں کرنے کے ہیں۔

علاوہ بر ایں اگر یہ بنا ہوتی کہ اعجاز موسیٰ ساحروں کے سحر کو باطل کرنے کے ذریعے آشکار ہو تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ عصا ایک بڑے سانپ کی شکل اختیار کرے جیسا کہ قرآن نے اس سرگذشت کے آغاز میں بیان کیا ہے۔

ان تمام باتوں سے بھی اگر چشم پوشی کر لی جائے تو یہ سوال درپیش ہوتا ہے کہ اگر صرف شک و

تردد پیدا ہی کرنا تھا تو ساحروں کے وسائل کا پہلی صورت پر پلٹ جانا بھی شک و تردد کا باعث ہو سکتا تھا کیونکہ ممکن ہے اس وقت یہ احتمال پیدا ہوتا کہ موسیٰ اپنے سحر میں اس قدر استاد ہیں کہ دوسروں کے جادو کو باطل کر کے پہلی حالت پر پلٹا سکتے ہیں۔

بلکہ جو چیز اس امر کا باعث ہوئی کہ لوگوں کو یہ پتہ چل گیا کہ حضرت موسیٰ کا خارقِ عادت کارنامہ بشری طاقت سے خارج ہے اور وہ خدا کی بے انتہا طاقت کی وجہ سے نمایاں ہوا ہے، وہ یہ ہے کہ اس زمانے میں مصر میں آزمودہ کار اور ماہر جادوگروں کی کثرت تھی۔ اس فن میں جو لوگ حاذق تھے اور استاد سمجھے جاتے تھے وہی اس زمانے کے ماحول میں ہر طرف چھائے ہوئے تھے۔ جبکہ حضرت موسیٰ میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جاتی تھی۔ ایک گمنام انسان بنی اسرائیل کے درمیان سے اٹھا اور اس نے ایک ایسا کارنامہ پیش کیا جس کے آگے سب عاجز ہو گئے، جس سے معلوم ہوا کہ کوئی غیبی طاقت کار فرما ہے اور موسیٰ ایک معمولی انسان نہیں ہیں۔

❖

۔ اس گھڑی حق آشکار ہو گیا اور ان کے اعمال جو سراسر ناحق و نادرست تھے بالکل ناکارہ ہو کر رہ گئے۔ (فوقع الحق و بطل ما کانوا یعملون)۔

کیونکہ حضرت موسیٰ کا عمل ایک واقعیت پر مبنی تھا، اور ان ساحروں کے اعمال سوائے دھوکا اور فریبِ نظر کے کچھ نہ تھے، اور اس میں شک نہیں کہ کوئی باطل حق کے سامنے دیر تک ٹھہر نہیں سکتا۔

یہ ضربِ اول تھی جو حضرت موسیٰ نبی اللہ نے فرعون کے جبروت و اقتدار کی بنیاد پر وارد کی۔

❖

اس کے بعد کی آیت میں فرمایا گیا ہے: اس طرح شکست کے آثار ان لوگوں میں نمایاں ہو گئے، اور سب کے سب ذلیل، پست اور ناتواں ہو گئے (فغلبوا ھنالک وانقلبوا صاغرین)۔

اگرچہ تاریخوں میں اس موقع پر بہت زیادہ مطالب بیان ہوتے ہیں بلکہ بغیر تاریخ کا سہارا لیے بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس موقع پر لوگوں کے احساسات اور جوش کا کیا عالم ہوگا۔ بہت سے لوگ تو اس قدر ڈرے کہ انہوں نے بھاگنا شروع کیا، کچھ لوگ اپنے مقام پر کھڑے چیخ رہے تھے، کچھ لوگ دہشت کی وجہ سے بے ہوش ہو گئے۔ فرعون اور اس کے طرفدار جو بڑی وحشت اور اضطراب کے ساتھ اس منظر کو دیکھ رہے تھے ان کی پیشانی پر شرم و ندامت کا پسینہ آ گیا، اور اپنے مبہم و تاریک مستقبل کی طرف دیکھنے لگے کہ لو ہماری حکومت و سلطنت ہاتھ سے گئی کیونکہ اس وقت جو کچھ ہوا وہ ان کے لیے بالکل ایک غیر متوقع تھا۔ اب ان کی فکر و تدبیر کی تمام راہیں مسدود ہو گئی تھیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ وہ کیا کریں۔

اس سے بھی کاری تر ضرب اس وقت لگی جب حضرت موسیٰ اور ساحروں کے مقابلے کا نقشہ یک بیک اس طرح بدل گیا کہ ناگہاں ۔ سب جادوگر زمین پر گر گئے اور وہ عظمت الٰہی کے سامنے سربسجود ہوگئے" (و القی السحرة ساجدین)۔

۔ اور وہ پکارے کہ ہم سارے جہانوں کے پروردگار پر ایمان لائے" (قالوآ اٰمنا برب العٰلمین)۔

۔ اور وہ خدا وہی ہے جو موسٰی و ہارون کا بھی رب ہے۔ (رب موسٰی و ھارون)۔

انہوں نے اس جملے کے ذریعے اس بات کا کھلے بندوں اعلان کر دیا کہ اس خدا کے علاوہ جو بھی ادعائے ربوبیت کرے اس کی خدائی مصنوعی ہے، ہم ہیں جو حقیقی پروردگار پر ایمان لائے ہیں حتیٰ کہ انہوں نے کلمۂ "رب العالمین" پر بھی اکتفا نہ کی، کیونکہ فرعون نے اس بات کا دعوٰے کر دیا تھا کہ سارے جہانوں کا پروردگار وہی ہے، لہٰذا ضرورت ہوئی کہ اس کے بعد وہ یہ اضافہ کریں کہ ہمارا رب وہ ہے جو موسٰیؑ و ہارونؑ کا بھی رب ہے، تاکہ ہر قسم کی غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے۔

یہ وہ بات تھی جس کا فرعون اور اس کے اطرافیوں کو بالکل گمان بھی نہ تھا۔ یعنی وہ لوگ جنہیں اس نے حضرت موسٰیؑ کو زیر کرنے کے لیے بلایا تھا وہی مومنین کی صفِ اوّل میں دکھائی دینے لگے۔ یہ لوگ بغیر کسی شرم و تأمل کے خدا کے حضور خاک پر گر گئے اور انہوں نے بغیر کسی شرط کے حضرت موسٰیؑ کی اطاعت کو جان و دل سے قبول کر لیا۔

کبھی انسان میں اس طرح بھی انقلاب یکایک آجاتا ہے اور اس کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ نورِ ایمانی کی کرن ہر دل کے اندر موجود ہوتی ہے، جس کو ہو سکتا ہے کہ ماحول، خاندان از زمان طویل و قلیل کے پردے وقتی طور پر چھپا لیں، لیکن جب کبھی کوئی طوفان اٹھتا ہے تو پردہ ہٹ جاتا ہے اس وقت یہ نور شعلہ بن کر اس طرح لپکتا ہے کہ اس سے زمانے کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو جاتی ہے۔

خصوصاً اس وجہ سے بھی وہ جلدی ایمان لائے کہ وہ خود فنِ ساحری میں منجھے ہوئے استاد تھے، اس فن کے تمام رموز و اسرار سے بخوبی آگاہ تھے لہٰذا ان کو ایک "معجزہ" اور "سحر" کے درمیان جو فرق ہے اس سے آگاہی تھی، یہ وہ چیز تھی جو ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے لیے مشکل سے واضح ہوتی مگر ان کے لیے تو یہ روزِ روشن سے بھی زیادہ واضح تھی۔ انہوں نے اپنے فنِ سحر کے ذریعے جو انہوں نے سالہا سال کی زحمت کے بعد حاصل کیا تھا، یہ سمجھا کہ حضرت موسٰیؑ کا یہ کارنامہ ہرگز سحر نہیں ہو سکتا، نہ یہ کسی بشری طاقت کا کام ہے بلکہ مافوق طبیعت اسرار سے اس کا تعلق ہے لہٰذا ان کا اتنی جلدی اور اس صراحت و شدت کے ساتھ ایمان لے آنا کوئی جائے تعجب نہیں ہے۔

جملہ "القی السحرة" جو مجہول کا صیغہ ہے اس سے حضرت موسٰیؑ کے سامنے ساحروں کی فروتنی

کامل سپردگی اور غیر معمولی استقبال و قبولیت کا اندازہ ہوتا ہے یعنی معجزۂ حضرت موسیٰ میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ وہ ان کی طرف بے ساختہ کھنچ گئے اور زمین پر گر کر ان کی حقانیت کا اعتراف و اقرار کرنے لگے۔

۱۲۳ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ
اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِی الْمَدِیْنَةِ لِتُخْرِجُوْا مِنْهَاۤ
اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝
۱۲۴ لَاُقَطِّعَنَّ اَیْدِیَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ ثُمَّ
لَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِیْنَ ۝
۱۲۵ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝ۚ
۱۲۶ وَ مَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ؕ رَبَّنَاۤ
اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ ۝ۚ ع

ترجمہ

۱۲۳ فرعون نے کہا (ساحروں سے)، تم اس (موسیٰ) پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں
تمہیں اس کی اجازت دوں، یقیناً یہ ایک (زبردست) سازش ہے جو تم لوگوں نے
اس شہر میں تیار کی ہے تاکہ اس سے اس کے ساکنوں کو نکال باہر کرو (اچھا)، تم کو کچھ
دیر کے بعد پتہ چلے گا۔

۱۲۴ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں تمہارے ہاتھ پیروں کو ایک دوسرے کے الٹ (یعنی
ایک طرف کا ہاتھ تو دوسری طرف کا پیر) کاٹ ڈالوں گا اس کے بعد تم سب کو سُولی
پر لٹکا دوں گا۔

۱۲۵ (ساحروں نے)کہا (یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے) ہم اپنے پروردگار کی طرف پلٹ جائیں گے۔

۱۲۶ تیرا جو کچھ بھی غصہ ہمارے اوپر ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ہم اپنے پروردگار کی نشانیوں پر جبکہ وہ ہمارے پاس آئیں، ایمان لے آئے، خدایا! ہمارے اوپر صبر (واستقامت) کو اچھی طرح انڈیل دے، اور ہمیں دنیا سے اس حالت میں اٹھا کہ ہم مسلمان ہوں (اور زندگی کے آخری لمحوں تک ہمارے ایمان و اخلاص کو باقی رکھ)۔

تفسیر

لغو تحدیدیں

جب فرعون کے ارکان حکومت پر ساحروں کے ایمان لانے سے ایک ضرب کاری لگی، تو فرعون بہت پریشان و مضطرب ہوا۔ کیونکہ اس نے محسوس کر لیا کہ اگر وہ اس وقت شدید ردّ عمل کا مظاہرہ نہ کرے گا تو دوسرے لوگ بھی متاثر ہو کر ایمان لے آئیں گے جس کے بعد حالات پر قابو پانا ناممکن ہوگا، لہٰذا اس نے دو تدبیروں پر عمل کیا:

پہلے اس نے ساحروں پر ایک عوام پسند تہمت لگائی اس کے بعد شدید ترین تہدید کے ساتھ ان کو اپنے عتاب کا نشانہ بنایا لیکن ان دونوں منظروں کے مقابلے میں ساحروں نے ایسے صبر و شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ فرعون اور اس کے ساتھی حیرت زدہ ہو گئے اور ان کی تدبیریں خاک میں مل گئیں۔ اس طرح تخت فرعونی کی لرزاں بنیاد پر ایک تیسری ضرب لگی۔ زیر بحث آیات میں اس منظر کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے:

پہلے یہ: فرعون نے ساحروں سے کہا: آیا قبل اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں تم اس (موسیٰ) پر ایمان لے آئے ہو (قال فرعون اٰمنتم بہ قبل ان اٰذن لکم)۔

کلمہ "بہ" (اس پر) کے ذریعے اسے موسیٰ کی انتہائی تحقیر منظور تھی گویا وہ نام لیے جانے کے لائق بھی نہ تھے اور اس جملہ "قبل ان اٰذن لکم" کے ذریعے فرعون کہنا چاہتا ہے کہ میں خود ایسا حق پسند

ہوں کہ اگر موسٰی کے دعوے میں کوئی بھی حقیقت ہوتی تو میں تمہیں ایمان لانے کی اجازت دے دیتا لیکن تمہاری اس جلد بازی سے پتہ چلا کہ نہ صرف یہ کہ اس معاملے میں حقیقت کا کوئی پہلو نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں نے اہلِ مصر کے خلاف ایک عظیم سازش کر رکھی ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا جملے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فرعون کا جنون اقتدار پسندی اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ اہلِ مصر نہ صرف یہ کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام انجام نہ دیں بلکہ انہیں سوچنے اور غور و فکر کرنے اور کوئی مذہب اختیار کرنے کی بھی اجازت نہ تھی اور یہ استعمار و استبداد کی بدترین مثال ہے کہ قومیں کسی فرد کے ہاتھ میں اس طرح اسیر اور غلام ہو جائیں کہ ان سے سوچنے سمجھنے یہاں تک کہ کسی نظریہ کو اپنانے کا حق بھی ان سے چھن جائے۔ یہ وہی طریقۂ کار ہے جو "استعمارِ جدید" کے نظام میں بھی بروئے کار لایا جاتا ہے۔ یعنی استعماری قوتیں صرف سیاسی اقتصادی اور اجتماعی استثمار پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کے ذہنوں پر بھی استعمار کے تالے لگا دیئے جائیں اور صرف انہی کے نظریے اور افکار کی جڑیں لوگوں کے ذہنوں میں سرایت کر سکیں۔

چنانچہ کمیونسٹ ممالک میں جہاں چاروں طرف آہنی دیواریں کھڑی ہیں، سرحدیں بند ہیں، ہر چیز پر خاص کر تعلیم و تربیت پر سنسرشپ قائم ہے۔ استعمارِ فکری کے نشانات اچھی طرح سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

لیکن مغربی سرمایہ دار ممالک میں جہاں یہ چیزیں نہیں ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہاں ہر شخص کو ہر طرح کی آزادی ہے جبکہ آزادئ خیال بھی حاصل ہے ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ جو چاہے سوچے اور جس کا جو چاہے انتخاب کرے، وہاں یہ کام ایک دوسری طرح انجام پذیر ہوتا ہے کیونکہ ان مقامات پر بڑے بڑے سرمایہ داروں کا نشر و اشاعت، ریڈیو اور ٹیلیویژن پر پہرہ ہوتا ہے۔ وہ ان چیزوں کے ذریعے آزادئ فکر و عقیدہ کے لباس میں اپنے افکار و عقائد کو غریب عوام پر سوار کر دیتے ہیں اور مسلسل "برین واشنگ" کے ذریعے وہ دنیا کو ادھر ہی لے جاتے ہیں جدھر ان کا دل چاہتا ہے اور "دورِ حاضر کے لیے ایک بلائے عظیم ہے"۔

اس کے بعد فرعون نے اس جملہ کا اضافہ کیا : یہ پلان ہے جو تم نے اس شہر میں اس لیے بنایا ہے کہ اس کے رہنے والوں کو یہاں سے باہر نکال دو (ان ھٰذا لمکر مکرتموہ فی المدینۃ لتخرجوا منھآ اھلھا)۔

سورہ طٰہٰ کی آیت ۷۱ میں ہے :

"انہٗ لکبیرکم الذی علمکم السحر"

"موسٰی بڑا استاد ہے تمہارا، جس نے تم کو یہ جادو سکھایا ہے"۔

اگر اس پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ فرعون کا مقصد یہ ہے کہ تم لوگوں نے کافی عرصے سے مصر کی حکومت پر قبضہ جمانے اور لوگوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی اسکیم بنا رکھی ہے یہ ان چند دنوں کی بات نہیں ہے۔

اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ "مدینہ" سے مراد صرف شہر مصر نہیں بلکہ پورا مصر ملک ہے۔ جیسا کہ "المدینۃ" کے الف و لام سے ظاہر ہے جو کہ جنس کے اعتبار سے آیا ہے۔ کیونکہ جملہ "لتخرجوا منھآ اھلھا" سے مراد ہے موسیٰ اور بنی اسرائیل کا تمام مصر پر تسلط اور فرعون اور اس کے اطرافیوں کو تمام اہم مقامات سے نکال دینا یا ان میں سے ایک جماعت کو دور دراز کے مقامات کی طرف جلا وطن کر دینا۔ نیز اسی سورت کی آیت ۱۱۰ بھی اسی مدعا پر دلالت کرتی ہے۔

بہر حال یہ تہمت اس قدر بے بنیاد اور رسوا کن ہے کہ سوائے عوام الناس اور بے خبر افراد کے کوئی بھی اسے قبول نہیں کر سکتا تھا کیونکہ موسیٰ سرے سے مصر میں موجود ہی نہ تھے نہ کسی شخص نے ان کو ساحروں کے ساتھ دیکھا تھا۔ اگر وہ ان کے مشہور استاد تھے تو وہ یقینی طور سے اس سے قبل ان کے ہمراہ دیکھے جاتے اور بہت سے لوگ ان کو جانتے پہچانتے۔ اگر حضرت موسیٰ نے ان لوگوں کے ساتھ کسی طرح کی سازش کی ہوتی تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جسے بآسانی چھپایا جا سکے کیونکہ گنتی کے چند لوگوں کے درمیان تو سازش ہو سکتی ہے مگر ہزاروں جادوگروں کے درمیان جو مختلف دُور دراز کے علاقوں سے آئے تھے ایسی سازش کیسے کی جا سکتی ہے؟

اس کے بعد فرعون نے ایک سربستہ اور انتہائی شدید جملے میں انہیں دھمکی دی: لیکن تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا (فسوف تعلمون)۔

اس کے بعد کی آیت میں اس خفیہ دھمکی کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے: میں قسم کھاتا ہوں کہ میں تمہارے ہاتھوں اور پیروں کو ایک دوسرے کے الٹ (ایک طرف کا ہاتھ تو دوسری طرف کا پیر) کاٹ دوں گا اس کے بعد تم سب کو سولی پر لٹکا دوں گا (لاقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ثم لاصلبنکم اجمعین)۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کو بڑی اذیتیں دے کر قتل کرے اور دیکھنے والوں کے سامنے بڑا ہولناک اور عبرتناک منظر پیش کرے کیونکہ ان کے ہاتھ پیروں کا قطع کرنا اس کے بعد سُولی پر لٹکانا اس بات کا سبب تھا کہ ان کے بدن سے فوارے کی طرح خون جاری ہو اور وہ بلندی پر اپنے ہاتھ پیر ماریں اور تڑپ تڑپ کر جان دیں (توجہ رہے کہ اس زمانے میں سولی کے لیے گردن میں پھندا نہیں ڈالتے تھے بلکہ زیر بغل رسّی ڈال کر لٹکا دیتے تھے)۔

شاید الٹی طرف سے ہاتھ پیر کاٹنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ دیر میں اپنی جان دیں اور ان کی اذیت اور تکلیف کی مدت طولانی ہو جائے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ فرعون نے ان ساحروں کو مغلوب کرنے کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا یہ ایک عام منصوبہ تھا جو جابر حکمران اہلِ حق کو زیر کرنے کے لیے ہر دَور میں بنایا کرتے ہیں کہ ایک طرف تو ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگا کر رائے عامہ ان کے خلاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دوسری طرف ان کو زندان، تعذیب اور قتل کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے حضرت موسیٰ کے قصے میں دیکھا ہے فرعون کے ان دونوں حربوں میں سے کوئی کامیاب نہ ہوا— اور کامیاب نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

٭

ان دونوں حربوں کے مقابلہ میں جادوگروں نے میدان مقابلہ کو خالی نہ کیا بلکہ یکدل و یک زبان ہو کر یہ جواب دیا: ہم تو اپنے پروردگار کی طرف پلٹیں گے (قالوآ انآ الٰی ربنا منقلبون)۔

یعنی اے فرعون! اگر تیری آخری تہدید صورتِ عمل میں آجائے اور تُو ہم کو قتل بھی کر دے تو اس سے نہ صرف ہم کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ اس سے ہماری دلی مراد حاصل ہو گی اور ہم شربتِ شہادت پی کر جنت میں جائیں گے اور یہ ہمارے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔

اس کے بعد انہوں نے فرعون کی تہمت باطل کرنے کے لیے اور اس مجمع کے سامنے جو اس منظر کو دیکھنے کے لیے جمع ہوا تھا اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے اس طرح کہا، اصل اعتراض تیرا ہم پر صرف یہ ہے کہ ہم اپنے پروردگار کی ان آیتوں پر ایمان لے آئے ہیں جو ہماری طرف آئی ہیں (وماتنقم منآ الآ ان اٰمنا باٰیات ربنالمّا جاءتنا)۔

یعنی ہم لوگ نہ تو ہنگامہ پرور ہیں اور نہ ہم نے تیرے خلاف کوئی سازش کی ہے، نہ ہم اس لیے موسیٰ پر ایمان لاتے ہیں کہ حکومت ہمیں مل جائے یا اس سرزمین کے لوگوں کو یہاں سے باہر نکال دیں، تُو خود جانتا ہے کہ ہم لوگ ایسے نہیں ہیں، بلکہ ہم نے جب حق کو دیکھا اور اس کی نشانیوں کو بخوبی پہچان لیا تو ہم نے اپنے پروردگار کی آواز پر لبیک کہی اور ایمان لے آئے، ہمارا سارا گناہ تیری نظر میں یہی ہے اور بس!

درحقیقت انہوں نے اپنے پہلے جملے سے فرعون پر یہ ثابت کیا کہ ہم تیری دھمکیوں سے بالکل نہیں ڈرتے اور بڑے شہامت قدم کے ساتھ موت کا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں، پھر اس کے بعد دوسرے جملے سے انہوں نے ان تہمتوں کا جواب دیا جو فرعون نے ان پر لگائی تھیں۔

لفظ۔ تنقم۔ مادّہ۔ نقمت۔ (بروزن نعمت) سے ہے۔ اس کا اصلی معنی ہے زبان سے یا

عمل اور سزا کے ذریعے کسی شے کا انکار کرنا. اس بنا پر آیہ مذکورہ بالا کے معنی یہ ہوں گے کہ تیرا ایک ہی اعتراض ہم پر یہ ہے کہ ہم لوگ ایمان لے آئے ہیں، یا یہ معنی ہوں گے کہ تو ہمیں صرف اس بنا پر سزا دے رہا ہے کہ ہم نے ایمان قبول کرلیا ہے۔

اس کے بعد انہوں نے فرعون کی طرف سے اپنا منہ پھیرلیا اور خدا کی بارگاہ کی طرف متوجہ ہوکر اس سے صبر و استقامت کی التجا کی، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ بغیر خدا کی تائید و توفیق کے ان میں اتنی سخت دھمکیوں اور سزاؤں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے، لہٰذا انہوں نے کہا: خدایا! صبر کا پیمانہ ہمارے اوپر انڈیل دے اور ہمارے اخلاص و ایمان کو آخری لمحات زندگی تک باقی رکھ (ربنا افرغ علینا صبرا و توفنا مسلمین)۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ چونکہ انہیں پتہ تھا کہ خطرہ اپنے آخری درجہ تک پہنچ گیا ہے لہٰذا انہوں نے اس "افرغ علینا صبراً" کہہ کر خدا سے درخواست کی کہ تو بھی ہمیں صبر و استقامت کا آخری درجہ عطا کردے (کیونکہ لفظ "افرغ" مادہ "افراغ" سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی برتن سے کسی سیال شئے کو اس طرح انڈیل دیا جائے کہ برتن میں کچھ بھی باقی نہ رہ جائے۔

آگاہی اور استقامت

ممکن ہے کسی شخص کو اس بات پر تعجب ہو کہ ان جادوگروں کی اتنی جلدی کایا پلٹ کیسے ہوگئی کہاں تو وہ موسیٰ کے مقابلے کی ٹھان کر آئے تھے اور کہاں یہ کہ وہ فوراً مومنین کی صف میں آگئے۔ پھر مومن بھی ایسے کہ انہیں ہر قسم کی قربانی اور فداکاری سے بھی کوئی باک نہ تھا۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ اتنے کم عرصے میں کسی انسان کے ذہن میں اتنا زبردست انقلاب آجائے کہ وہ صف مخالف سے بالکل کٹ کر صف موافق میں مل جائے اور اتنی سختی سے اپنے نئے عقیدہ پر ڈٹ جائے کہ اپنے مقام اور زندگی سب کو نظرانداز کردے اور مردانہ وار بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ شربت شہادت کے آخری گھونٹ کو بھی پی جائے۔

لیکن اگر ہم اس نکتے کو سمجھ لیں کہ وہ جادوگر جو علم سحر میں ید طولیٰ رکھتے تھے وہ اپنے علم کی وجہ سے حضرت موسیٰ کی عظمت سے اچھی طرح آگاہ ہوگئے اور انہوں نے پوری آگہی کے ساتھ اس میدان میں اپنا قدم رکھا۔ ان کی یہ واقفیت و آگاہی ان کے اس عشق سوزاں کا سرچشمہ بن گئی، جس نے ان کے سارے وجود کا احاطہ کرلیا ایک ایسا عشق جس کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے اور جو انسان کی تمام خواہشوں سے مافوق ہے۔

انہیں اچھی طرح پتہ تھا کہ انہوں نے کس راستے پر اپنا قدم رکھا ہے، وہ کس واسطے جنگ کر

رہے ہیں، کس سے جنگ کر رہے ہیں اور اس جنگ کے نتیجہ میں کیسا روشن مستقبل ان کے انتظار میں ہے؟!

یہی وجہ ہے کہ ہم نے دیکھا کہ انہوں نے بڑی صراحت و شجاعت کے ساتھ (جیساکہ سورہ طٰہٰ کی آیت ۷۲ میں آیا ہے) یہ کہا:

قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہم تجھے ان روشن دلائل پر ہرگز ترجیح نہیں دیں گے جو ہمارے رب کی طرف سے ہمارے پاس آتے ہیں، تیرا جو دل چاہے کرلے لیکن یہ جان لے کہ تیری قدرت کا دائرہ صرف اسی دنیا تک محدود ہے۔

آخر کار۔ جیساکہ تواریخ اور روایات میں ہے، ان لوگوں نے اس راہ میں اس قدر پامردی و استقامت کا مظاہرہ کیا کہ فرعون نے اپنی دھمکی کو پورا کر دکھایا اور ان کے مثلہ شدہ بدنوں کو دریائے نیل کے کنارے کھجور کے درختوں کی شاخوں پر آویزاں کر دیا، جس کی وجہ سے ان کا پُرافتخار نام ہمیشہ کے لیے دنیا کے حریت پسندوں کی فہرست میں ثبت ہوگیا اور بقول مفسر بزرگوار علامہ طبرسی:

"کانوا اول النہار کفارا سحرۃ و اٰخر النہار شھداء بررۃ"

وہ صبح کے وقت کافر جادوگر تھے اور عصر کے وقت شہید و نیکوکار ہوگئے۔

لیکن توجہ رہے کہ اس طرح کا انقلاب و استقامت بجز الٰہی تائید کے ممکن نہیں ہے۔ یہ بات مسلم ہے کہ جو لوگ سچے دل سے خدا کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں خدا کی مدد بھی ان کی تلاش میں آتی ہے۔

۱۲۶ وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَقَوْمَهٗ
لِيُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ
اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ○
۱۲۸ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ
اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ
الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○
۱۲۹ قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ

قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ۟ ع

ترجمہ

۱۲۷ قوم فرعون کے سرداروں نے اس سے کہا: آیا موسٰی اور ان کی قوم کو آزاد چھوڑ دے گا کہ وہ زمین میں فساد کرتے پھریں اور تجھے اور تیرے خداؤں کو ترک کر دیں۔ (فرعون نے) کہا عنقریب میں ان کے لڑکوں کو قتل کر دوں گا اور عورتوں کو زندہ چھوڑ دوں گا (تاکہ وہ ہماری خدمت کریں) اور ہم پورے طور سے ان پر مسلط ہیں۔

۱۲۸ موسٰی نے اپنی قوم سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو اور صبر اختیار کرو کہ زمین خدا ہی کی ہے اپنے بندوں میں سے وہ جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور نیک انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

۱۲۹ انہوں نے کہا کہ (اے موسٰی) تمہارے آنے سے قبل بھی ہم نے بہت اذیتیں دیکھیں اور اب تمہارے آنے کے بعد بھی ہم دکھ جھیل رہے ہیں (آخر ان مصائب کا کب خاتمہ ہوگا؟) موسٰی نے کہا کہ مجھے امید ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تمہیں زمین میں اس کا جانشین بنا دے گا تاکہ وہ دیکھے کہ تم کس طرح کا عمل کرتے ہو۔

تفسیر

ان آیات میں فرعون اور اس کے اطرافیوں کی ایک اور گفتگو حضرت موسٰیؑ کے بارے میں نقل کی گئی ہے اور جیسا کہ ان آیات سے پتہ چلتا ہے یہ گفتگو موسٰیؑ اور جادوگروں کے مقابلے کے بعد ہوئی تھی۔

پہلی آیت میں ہے کہ، قوم فرعون کے سرداروں نے بطور اعتراض اس سے کہا: آیا موسیٰ اور بنی اسرائیل کو ان کی حالت پر آزاد چھوڑ دے گا تاکہ وہ زمین میں فساد کریں، اور تجھے اور تیرے خداؤں کو ترک کر دیں (وقال الملأ من قوم فرعون اتذر موسیٰ وقومہ لیفسدوا فی الارض ویذرک والھتک)۔

اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ سے شکست کھانے کے بعد فرعون نے ایک مدت تک انہیں اور بنی اسرائیل کو کھلا چھوڑ دیا تھا (اگرچہ یہ آزادی بہت محدود تھی) لیکن موسیٰ اور ان کے ماننے والے بھی خالی نہ بیٹھے اور حضرت موسیٰ کے آئین کی تبلیغ میں مصروف رہے یہاں تک کہ قوم فرعون کو ان کی ان سرگرمیوں کا پتہ چلا اور انہیں اندیشہ لاحق ہوا چنانچہ وہ لوگ فرعون کے پاس آئے اور اسے اس بات کی طرف آمادہ کرنا چاہا کہ وہ موسیٰ اور ان کی قوم پر سختی کرے۔

آیا یہ محدود آزادی اس معجزہ کی وجہ سے تھی جو فرعون نے حضرت موسیٰ کے ذریعے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اس کی وجہ سے اس کے دل میں خوف پیدا ہوگیا تھا؟ یا اس اختلاف کی وجہ سے تھی جو اہل مصر کے درمیان حتیٰ کہ خود قبطیوں کے درمیان حضرت موسیٰ اور ان کے آئین کے بارے میں پیدا ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے کچھ لوگ ان کی جانب مائل ہو گئے تھے، اور فرعون یہ دیکھ رہا تھا کہ ان حالات میں وہ ان کے خلاف کوئی سخت اقدام نہیں کر سکتا تھا؟ دونوں احتمالوں کا امکان ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ دونوں نے یکجا فرعون کے ذہن پر اپنا اثر کیا ہو۔

بہر حال فرعون پر ان باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا اور اس نے ان لوگوں کے جواب میں کہا: میں جلد ہی ان کے لڑکوں کو قتل کروں گا اور عورتوں کو زندہ چھوڑ دوں گا (تاکہ ان سے خدمت لی جائے) اور ہم ان پر اچھی طرح قابو رکھتے ہیں (قال سنقتل ابناءھم ونستحی نساءھم وانا فوقھم قاھرون)۔

لفظ "آلھتک" (تیرے خداؤں) سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسّرین کے درمیان بحث ہے۔ جو بات اس آیت کے ظاہر سے زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ فرعون نے بھی اپنے لیے کچھ بت اور خدا بنا رکھے تھے۔ اگرچہ سورہ نازعات کی آیت ۲۴ "انا ربکم الاعلیٰ" اور سورہ قصص کی آیت ۳۸ "ما علمت لکم من الٰہ غیری" سے پتہ چلتا ہے کہ اہل مصر سب سے بڑا خدا فرعون کو سمجھتے تھے یا کم از کم وہ خود اپنے کو ایسا سمجھتا تھا اور اپنی سطح کا کوئی دوسرا خدا اس کی نظر میں نہ تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے لیے کچھ معبود بنا رکھے تھے جن کی وہ پرستش کرتا تھا۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ فرعون نے اس مقام پر ایک گہری سیاست شروع کی اور ایک ایسا منصوبہ تیار کیا جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کی قوت و قدرت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، وہ تدبیر یہ تھی کہ بنی اسرائیل کے لڑکوں کو قتل کر کے ہمیشہ کے لیے مردوں کا خاتمہ کر دے تاکہ وہ کبھی اس سے مقابلہ نہ کر سکیں اور عورتوں

اور لڑکیوں کو کنیزی اور خدمت کے لیے باقی رکھے، یہ ہر قدیم و جدید استعمار کا ایک زبردست طریقہ ہے جس کی وجہ سے مثبت و فعال افراد قوم کی آغوش سے چھین لیے جاتے ہیں اور ان کو نابود کر دیا جاتا ہے، یا پھر ان سے مردانگی اور شجاعت کے جوہر کو طرح طرح کے حیلوں اور وسیلوں سے سلب کر لیا جاتا ہے اور افراد غیر فعال کو زندہ رہنے دیا جاتا ہے۔

مزید یہ احتمال موجود ہے کہ فرعون چاہتا تھا کہ بنی اسرائیل کی ہمت دو طرح سے ٹوٹ جائے ایک تو لڑکوں کا قتل، دوسرے ناموس کا خطرہ۔ مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل ان دو مراحل سے گھبرا کر دشمن کے چنگل میں خوب اچھی طرح سے جکڑ جائیں۔

بہر حال جملہ "انا فوقھم قاھرون" اس بات کی حکایت کرتا ہے کہ فرعون یہ کہہ کر یہ چاہتا تھا کہ ہر قسم کی فکرمندی اپنے تابعین کے دل سے دور کرے اور انہیں یہ اطلاع دے کہ حالات پورے طور سے اس کے قابو میں ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر ایک سوال یہ درپیش آتا ہے کہ فرعون نے موسیٰ کو کیوں نہ قتل کر دیا اور صرف بنی اسرائیل کے قتل کا تہیہ کیوں کیا؟

اس کا جواب سورۂ مومن کی آیات سے بخوبی مل جاتا ہے جن میں ہے کہ ابتدا میں فرعون نے ایسا ہی چاہا تھا کہ موسیٰ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دے لیکن جب فرعون کو مومن آل فرعون نے یہ دھمکی آمیز نصیحت کی کہ موسیٰ کا قتل ہو سکتا ہے کہ خطرناک واقع ہو اور وہ واقعاً خدا کے نبی برحق ہوں اور جس عذاب سے وہ ڈراتے ہیں وہ تم کو آلے، تو اس کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا اور اسے موسیٰ کے قتل کی ہمت نہ ہوئی۔

علاوہ بریں جب حضرت موسیٰ کو جادوگروں پر غلبہ حاصل ہوا تو اس کا قہری نتیجہ یہ ہوا کہ اہل مصر میں اختلاف پیدا ہو گیا اور وہ حضرت موسیٰ کے بارے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے مخالف و موافق ایسے موقع پر فرعون نے خیال کیا کہ اگر اس نے موسیٰ کے متعلق کوئی جارحانہ اقدام کیا تو ہو سکتا ہے کہ اس کا ردّ عمل اس کی حکومت کے لیے خطرناک ثابت ہو لہٰذا وہ ان کے قتل کے ارادے سے باز رہا۔

اس کے بعد کی آیت میں اس پروگرام کا ذکر ہے جو حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کیا کہ وہ کس طرح سے فرعون کا مقابلہ کریں اور یہ کہ وہ کس طرح فتحیاب ہو سکتے ہیں، انہوں نے کہا کہ اگر تین شرطوں پر عمل کرو گے تو تمہاری کامیابی یقینی ہے۔ پہلے یہ کہ تمہارا بھروسہ صرف خدا پر ہو اور اسی سے

مدد مانگو۔ (قال موسیٰ لقومہ استعینوا باللہ)۔

دوسری بات جو حضرت موسیٰ نے ان سے کہی وہ یہ تھی: پامردی اور ثابت قدمی کو کسی حال میں نہ چھوڑو۔ اور دشمن کی دھمکیوں سے مرعوب ہو کر میدان نہ چھوڑو (واصبروا)۔

اس مطلب کی مزید تاکید کے لیے اور اس کی دلیل بیان کرنے کے لیے موسیٰ ان سے کہتے ہیں: ساری زمین صرف اللہ کی ہے، وہی اس کا مالک و مختار ہے' اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے (ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ)۔

اور آخری شرط یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو کیونکہ۔ فتحیابی پرہیزگاروں کے لیے ہے (والعاقبة للمتقین)۔

یہ تینوں شرطیں جن میں سے ایک عقیدہ سے تعلق رکھتی ہے (خدا سے طلب استقامت) اور دوسری اخلاق سے متعلق ہے (صبر و استقامت) اور تیسری کا تعلق عمل سے ہے (تقویٰ و پرہیزگاری) صرف بنی اسرائیل کی ان کے دشمن پر فتحیابی کی شرطیں نہ تھیں بلکہ ہر قوم و ملت جو اپنے دشمن پر غالب آنا چاہتی ہے بغیر اس سہ نکاتی پروگرام کے کامیاب نہیں ہوسکتی کیونکہ بے ایمان افراد اور سست اور ڈرپوک لوگ اور وہ قومیں جو گنہگار اور تباہ کار ہیں اگر فتحیاب ہو بھی جائیں تو ان کی یہ کامیابی وقتی اور چند روزہ ہوگی۔

یہ بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ یہ تینوں نکات ایک دوسرے کی شاخ ہیں کیونکہ پرہیزگاری بغیر شہوات و خواہشات کے مقابلے میں صبر و استقامت کے حاصل نہیں ہوسکتی جیساکہ صبر و استقامت بغیر خدائے وحدہٗ لاشریک پر ایمان کے باقی نہیں رہ سکتی۔

*

آخر میں وہ شکوہ بیان کیا گیا ہے جو ان مشکلات سے پیدا ہوا جو بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ کے قیام کی وجہ سے پیش آئیں فرماتا ہے: انہوں نے موسیٰ سے کہا: تمہارے آنے سے پہلے بھی یہ لوگ ہمیں تکلیفیں پہنچاتے تھے، اب جب سے تم آگئے ہو تب بھی ان کی اذیت رسانی جاری ہے' پس ہمارے لیے کب کشائش پیدا ہوگی (قالوا اوذینا من قبل ان تأتینا ومن بعد ما جئتنا)۔

گویا بنی اسرائیل ہمارے بہت سے افراد کی طرح اس بات کے امیدوار تھے کہ حضرت موسیٰ کے قیام کے ساتھ ہی ایک رات کے اندر ان کے تمام مصائب کا خاتمہ ہو جائے، فرعون ہلاک ہو جائے' فرعون والے بھی سب فنا ہو جائیں اور مصر کی لمبی چوڑی سلطنت اپنے تمام خزانوں اور ذخیروں کے ساتھ ان کے اختیار میں آجائے اور یہ سب باتیں معجزہ کے طور پر وقوع پذیر ہوں جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کو کسی طرح کی کوئی زحمت نہ اٹھانا پڑے۔

لیکن حضرت موسیٰ نے ان کو سمجھایا کہ وہ آخرکار فتحیاب تو ہوں گے لیکن اس کے لیے ان کو ایک طولانی راستہ طے کرنا پڑے گا اور یہ فتحیابی جیسا کہ اللہ کی سنت اور طریقہ ہے صبر و استقامت کے جوہر دکھانے کے بعد حاصل ہوگی جیسا کہ زیر بحث آیت کہہ رہی ہے ، موسیٰ نے کہا امید ہے کہ خدا تمہارے دشمنوں کو ہلاک کر دے گا اور تم کو زمین میں ان کا جانشین قرار دے گا (قال عسیٰ ربکم ان یھلک عدوکم و یستخلفکم فی الارض)۔

یہاں پر لفظ ۔ عسیٰ ۔ (جس کے معنی شاید اور امید کے ہیں) لفظ ۔ لعل ۔ کی طرح جو بہت سی آیات میں آیا ہے ، درحقیقت اس مطلب کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے کہ تمہاری اس فتحیابی و کامیابی کی کچھ شرطیں ہیں جن کے بغیر تم کامیاب نہیں ہو سکتے (اس کی مزید توضیح کے لیے سورۂ نساء کی آیت ۸۴ کی تفسیر اسی کتاب کی جلد دوم میں ملاحظہ ہو)۔

آیت کے آخر میں فرماتے ہیں : خدا تمہیں یہ نعمتیں عطا کرے گا اور تمہاری کھوئی آزادی تمہیں دوبارہ لوٹائے گا ، تاکہ یہ دیکھے کہ اس کے مقابلے میں تمہارا عمل کیسا ہوتا ہے" (فینظر کیف تعملون)۔

یعنی کامیابی کے بعد تمہاری آزمائش کا دور شروع ہو جائے گا ، ایک ایسی ملت کی آزمائش جو پہلے اپنے دامن میں کچھ نہ رکھتی تھی اس کے بعد خدا کے فضل سے اس کا دامن نعمات الٰہی سے مالا مال ہو گیا۔

اس تعبیر میں ضمنی حیثیت سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آنے والے زمانے میں تم لوگ اس آزمائش پر پورا نہ اتر سکو گے بلکہ تمہارے ہاتھ میں بھی جب قدرت و حکومت آجائے گی تو دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی ظلم و فساد پر اتر آؤ گے۔

ایک روایت میں جو کافی میں امام محمد باقر علیہ السلام سے مروی ہے یوں ہے :

قال وجدنا فی کتاب علی صلوات اللّٰہ علیہ ان الارض للّٰہ یورثھا من یشآء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین انا و اھل بیتی الذین اورثنا اللّٰہ الارض و نحن المتقون[1]

یعنی کتاب حضرت علی علیہ السلام میں ہم نے اس طرح لکھا ہوا دیکھا کہ آیت : ان الارض للّٰہ الخ سے میں اور میرے اہلبیت مراد ہیں اور ہم ہی وہ افراد ہیں جن کو خدا آخر میں زمین منتقل کر دے گا اور ہم حقیقی متقین ہیں۔

اس حدیث سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ آیت کا مفہوم عام ہے اور اب بھی زمین پر وہ پرہیزگار موجود ہیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۵۹۔

(۱۳۰) وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ
لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ ○

(۱۳۱) فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ
سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ
اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۳۰) اور ہم نے قوم فرعون کو خشک سالی اور میووں کی کمی میں مبتلا کیا تاکہ وہ
بیدار ہو جائیں۔

(۱۳۱) لیکن انہوں نے (نہ صرف یہ کہ نصیحت قبول نہ کی بلکہ) جب انہیں کوئی اچھائی (اور
نعمت) ملی تو وہ کہتے تھے کہ یہ خود ہماری وجہ سے ہے! پھر جب کوئی برائی (اور مصیبت)
آتی تھی تو کہتے تھے کہ یہ موسٰی اور ان کے ساتھیوں کی نحوست سے ہے! کہو ان تمام
بدفالیوں کا سرچشمہ خدا کے پاس ہے (وہ تمہاری بداعمالیوں کی وجہ سے تم کو سزا دیتا ہے)
لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

تفسیر

بیدار کرنے والی سزائیں

جیسا کہ اسی سورہ کی آیت ۹۴ میں گزرا ہے کہ ایک کلی قانون تمام پیغمبروں کے لیے یہ تھا کہ جب ان کو لوگوں کی مخالفت کا سامنا ہوا اور وہ کسی طرح سے راہِ راست پر نہ آئیں تو خدا ان کو بیدار کرنے کے لیے مشکلات و مصائب میں گرفتار کرتا تھا تاکہ وہ اپنے میں نیازمندی اور محتاجی کا احساس کریں اور

ان کی فطرت توحید جو آرام و آسائش کی وجہ سے غفلت کے پردوں میں چلی گئی ہے دوبارہ ابھر آئے اور ان کو اپنی ضعف و ناتوانی کا اندازہ ہو اور اس قادر و توانا ہستی کی جانب متوجہ ہوں جو ہر نعمت و نقمت کا سرچشمہ ہے۔

پہلی آیت میں اس مطلب کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، ہم نے آلِ فرعون کو قحط، خشک سالی اور ثمرات کی کمی میں مبتلا کیا شاید متذکر بیدار ہو جائیں (ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ونقص من الثمرات لعلھم یذکرون)۔

"سنین" جمع ہے "سنة" کی جس کے معنی سال کے ہیں، لیکن عام طور سے جب یہ لفظ "اخذ" کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی قحط سالی کے ہو جاتے ہیں۔ بنا بریں "اخذہ السنة" (سال نے اس کو پکڑا) کے معنی ہیں کہ وہ خشک سالی میں مبتلا ہو گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قحط سالی کے سال بہ نسبت دوسرے سالوں کے کم ہیں لہٰذا جب کہا گیا کہ اس کو سال نے پکڑ لیا اور اس سے عام سال مراد ہو تو یہ کوئی نئی بات نہیں اس لیے اس سے مراد وہ سال ہوں گے جو کم آتے ہیں تاکہ ایک نئی بات سمجھ میں آئے اور وہ خشک سالی کے سال ہیں۔

لفظ "آل" دراصل "اھل" تھا پھر اس کے قلب میں واقع ہوا اور اس حالت میں ہو گیا، اور "اہل" کے معنی ہیں "انسان کے قریبی اور خاص آدمی چاہے وہ اس کا قریبی عزیز ہو یا اس کا ہم خیال ہم مسلک و طرفدار ہو۔"

باوجودیکہ قحط سالی نے فرعونیوں کو گھیر لیا تھا لیکن آیہ مذکورہ بالا میں صرف فرعون کے مخصوصین کا ذکر کیا گیا ہے مقصد یہ ہے کہ اگر یہ بیدار ہو گئے تو سب لوگ بیدار ہو جائیں گے کیونکہ تمام لوگوں کی نبض انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ چاہیں تو بقیہ افراد کو گمراہ کریں یا ہدایت کریں۔

اس نکتہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ خشک سالی اہلِ مصر کے لیے ایک بلائے عظیم شمار ہوتی تھی کیونکہ مصر پورے طور سے ایک زرعی مملکت تھی اس بنا پر اگر زراعت نہ ہو تو اس کا اثر ملک کے تمام افراد پر پڑتا ہے لیکن مسلمہ طور پر فرعون اور اس کے افراد چونکہ ان زمینوں کے مالک اصلی تھے اسلیے فی الحقیقت وہ سب سے زیادہ اس سے متاثر ہوتے تھے۔

ضمناً یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ خشک سالی کئی سال تک باقی رہی کیونکہ "سنین" جمع کا صیغہ ہے خصوصاً "نقص من الثمرات" کا بھی اضافہ ہوا ہے (میووں کی کمی) کیونکہ خشک سالی اگر وقتی ہو تو درختوں پر اتنا اثر انداز نہیں ہوا کرتی لیکن اگر طولانی ہو جائے تو درختوں کو بھی نابود کر دیتی ہے اگرچہ یہ احتمال بھی موجود ہے کہ خشک سالی کے علاوہ کوئی اور آفت بھی درختوں کو آ گئی ہو۔

جملہ "لعلھم یذکرون" سے گویا اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ حقیقت توحید کی طرف

توجہ ہر انسان کی سرشت میں ابتدا سے پوشیدہ ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ غلط تربیت کی وجہ سے، یا نعمتوں میں مست ہوجانے کے باعث انسان اس کو بھول جاتا ہے، لیکن جب مشکلوں میں پھنستا ہے تو دوبارہ پھر خدا یاد آتا ہے، مادۂ "تذکر" جس کے معنی یا آوری کے ہیں اس مفہوم سے مناسبت رکھتا ہے۔
قابلِ توجہ یہ ہے کہ آیہ ۹۴ کے ذیل میں جو جملہ "لعلھم یضرعون" (شاید وہ خدا کے سامنے خضوع اور فروتنی اختیار کریں) آیا ہے، فی الحقیقت پہلا جملہ "لعلھم یذکرون" اسی کا مقدمہ ہے کیونکہ انسان پہلے حالت "تذکر" میں آتا ہے اس کے بعد فروتنی اور سپردگی کی منزل پر فائز ہوتا ہے۔

لیکن۔ آل فرعون، بجائے اس کے کہ ان الٰہی تنبیہوں سے نصیحت لیتے اور خواب خرگوش سے بیدار ہوتے انہوں نے اس سے سوء استفادہ کیا اور ان حوادث کی من مانی تفسیر کی؛ جب حالات ان کے منشا کے مطابق ہوتے تھے تو وہ راحت و آرام میں ہوتے تھے تو کہتے کہ یہ حالات ہماری نیکی و لیاقت کی وجہ سے ہیں! فی الحقیقت ہم اس کے اہل و لائق ہیں (فاذا جاءتھم الحسنة قالوا لنا ھذہٖ)۔
لیکن جس وقت وہ مشکل و مصیبت میں گرفتار ہوتے تھے تو اس کو فوراً موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کے سر باندھ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ ان کی بد قدمی کی وجہ سے ہوا ہے (وان تصبھم سیئة یطیروا بموسٰی ومن معہٗ)۔
"یطیروا" مادۂ "تطیر" سے ہے جس کے معنی بد فالی کرنے کے ہیں، اس کی اصل کلمہ "طیر" (پرندہ) ہے۔ چونکہ عربوں میں رسم تھی کہ وہ پرندوں کے ذریعہ فالِ بد لیا کرتے تھے، کبھی کوے کی آواز کو منحوس جانتے تھے، کبھی کسی پرندہ کے چپ سے راست کی طرف اڑنے سے بدفالی لیتے تھے، اس لیے کلمہ "تطیر" ہر بدفالی کے لیے بولا جانے لگا۔
لیکن قرآن کریم ان کے جواب میں کہتا ہے: "ان کی بدبختیوں اور تکلیفوں کا سرچشمہ خدا کی طرف سے ہے خدا نے یہ چاہا ہے کہ اس طرح ان کو ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے سزا دے لیکن ان میں سے اکثر اس کو نہیں جانتے" (الا انما طائرھم عند اللہ ولٰکن اکثرھم لا یعلمون)۔
قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ طرزِ فکر کوئی فرعونیوں ہی کے ساتھ مخصوص نہ تھا، آج کل کے زمانہ میں بھی خود خواہ اور خود پسند قوموں میں یہ صفت بد دیکھی جا سکتی ہے کہ وہ حقیقتوں کو بدلنے کے لیے اور اپنے وجدان کو یا دوسرے لوگوں کو فریب دینے کے لیے جب بھی ان کو کوئی کامیابی نصیب ہوتی ہے تو وہ اس کو اپنی لیاقت کی طرف منسوب کرتے ہیں چاہے ان کی لیاقت و استعداد کو اس میں ذرہ برابر بھی دخل نہ ہو، اور جس وقت کوئی بدبختی ان کا دامن پکڑتی ہے تو اس کو اپنے مخفی یا آشکار دشمن کی

طرف نسبت دیتے ہیں چاہے وہ خود اس کا اصل سبب ہوں۔ قرآن بیان کرتا ہے کہ دشمنانِ پیغمبرِ اسلامؐ بھی ان کے خلاف ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے (سورۂ نساء، آیت ۷۸) دوسری جگہ قرآن کہتا ہے کہ گمراہ انسانوں کا یہی حال ہے (سورۂ فصلت آیت ۵۰) اور یہ درحقیقت خود خواہی، ضد اور غرور کا ایک زبردست مظہر ہے۔[1]

فالِ نیک و بد

مختلف قوموں میں فالِ نیک و بد کا رواج شاید پہلے سے چلا آرہا ہے، لوگ کچھ چیزوں سے "فال نیک" لیا کرتے تھے اور ان کو اپنی فتحیابی اور کامیابی کی دلیل خیال کرتے تھے اور کچھ چیزوں کو "فالِ بد" سمجھتے تھے اور ان کو اپنی شکست کی دلیل سمجھتے تھے حالانکہ کامیابی یا ناکامی کو ان چیزوں سے دُور کا لگاؤ بھی نہ تھا خصوصاً فالِ بد میں تو سراسر خرافاتی پہلو اور حد درجہ کی نامعقولیت تھی او اب بھی ہے۔

ان دونوں طرح کی فالوں کا اگرچہ کوئی اثر طبیعی (NATURAL RESULT) حقیقت میں نہیں ہوتا لیکن بلاشبہ ان کا نفسیاتی اثر مرتب ہوسکتا ہے۔ فالِ نیک بالعموم پُر امید بناتی ہے اور سرگرم عمل ہونے کا سبب بنتی ہے جبکہ "فالِ بد" ناامیدی، سستی اور توانائی پیدا کرتی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ روایاتِ اسلامی میں فال نیک سے نہیں روکا گیا ہے لیکن "فالِ بد" سے شدت سے منع کیا گیا ہے پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور حدیث ہے جس میں آپؐ نے فرمایا:

تفألوا بالخير تجدوه۔

کاموں میں فال نیک سے کام لیا کرو (اور پُر امید رہو) تاکہ مقصد تک پہنچ جاؤ۔

اس میں اس کا اثباتی پہلو نمایاں ہے، بلکہ خود پیغمبرِ اسلامؐ اور پیشوایانِ عالی مقام علیہم السلام کے واقعات میں ہے کہ وہ بعض اوقات مسائل میں فال نیک سے کام لیا کرتے تھے، مثلاً جب مسلمان واقعہ حدیبیہ میں کفارِ مکہ کے سامنے آئے تو اس میں سہیل بن عمرو کفار کا نمائندہ بن کر پیغمبرِ اسلامؐ کے پاس آیا اور حضرتؐ سے کسی نے کہا کہ سہیل آیا ہے تو آپؐ نے فوراً فرمایا:

"قد سهل عليكم امركم"

یعنی اس کا نام "سہیل" ہے میں یہ فال لیتا ہوں کہ تمہارے اوپر یہ کام سہل ہو

---

[1] ضمناً یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ بیان پر "حسنۃ" پر تو الف ولام آیا ہے اور "سیئۃ" پر تنوین آئی ہے اور نکرہ ہے اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ نعمتیں فراواں ان پر نازل ہوتی تھیں اور تکلیفیں کبھی کبھی آتی تھیں۔

آسان ہو جائے گا۔[1]

مشہور تاریخ نویس "دمیری" جو آٹھویں صدی کا مؤرخ ہے وہ بھی اپنی ایک کتاب میں اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

پیغمبر اسلام فال نیک کو اس لیے پسند فرماتے تھے کہ انسان جب بھی فضلِ الٰہی کا امیدوار ہو گا تو نیکی کی راہ میں اپنے قدم آگے بڑھائے گا اور جب اس سے اپنی امید کو توڑے گا تو شر کے راستے پر چل پڑے گا فالِ بد لینا سبب ہے سوئے ظن، انتظارِ بلا اور امیدِ بدبختی کا۔[2]

بہرحال ان وجوہ کی بنا پر "فالِ بد" جس کو عرب "تطیّر" اور "طیرہ" کہتے تھے، جیسا کہ سابقاً اشارہ ہوا ہے روایاتِ اسلامی میں ان کی شدید مذمت کی گئی ہے، قرآن مجید میں بھی بتکرار اس مطلب کا ذکر آیا ہے اور اس کی مذمت کی گئی ہے۔[3] ایک حدیث پیغمبرِ اسلامؐ کی یہ ہے آپؐ نے فرمایا:

"الطیرة شرک"

فالِ بد نکالنا (اور اس کو انسانی تقدیر میں مؤثر جاننا) ایک طرح کا شرک ہے۔[4]

یہ بھی ہے کہ اگر فالِ بد کا برا اثر مرتب ہو بھی تو یہ اسی نفسیاتی کشمکش کا نتیجہ ہے جو فال لیتے وقت پیدا ہوئی ہے۔ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"الطیرة علی ما تجعلها ان هونتها تهونت، وان شددتها تشددت، وان لم تجعلها شیئاً لم تکن شیئاً"

فالِ بد کا اثر اسی قدر ہے جتنا تم قبول کرو، اگر اس کو سبک سمجھو تو اس کا اثر بھی سبک آسان ہو گا اور اگر اس کو سخت سمجھو تو نتیجہ بھی سخت نکلے گا اور اگر اس کی طرف اعتنا نہ کرو اور اس کی پرواہ نہ کرو تو اس کا کوئی اثر برآمد نہ ہو گا۔[5]

اسلامی روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"فالِ بد" سے مقابلے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی پرواہ نہ کی جائے۔

نیز آنحضرتؐ سے منقول ہے کہ فرمایا:

ثلاث لا یسلم منها احد، الطیرة، والحسد، والظن، قیل فما نصنع؟ قال،

---

[1] المیزان جلد ۱۹ ص ۸۶۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۱۰۲۔

[3] جیسے سورۂ یٰسین آیت ۱۹، سورہ نمل آیت ۴۷، سورۂ اعراف آیت موردِ بحث۔

[4] المیزان در ذیل آیہ موردِ بحث۔

[5] المیزان در ذیل آیت موردِ بحث۔

اذا تطیرت فامض، واذا حسدت فلا تبغ، واذا ظننت فلا تحقق:

تین چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے کوئی شخص محفوظ نہیں ہے (ان تین چیزوں کی وجہ سے عام لوگوں کے دلوں میں وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے) فالِ بد، حسد اور بدگمانی، لوگوں نے پوچھا تو پھر ہم کیا کریں؟ فرمایا: جب فالِ بد کا سامنا ہو تو اس کی پرواہ نہ کرو اور اپنا کام کر گزرو، اور جب دل میں حسد پیدا ہو تو اس کو عملی طور سے بجا نہ لاؤ اور جب کسی سے بدگمانی ہو تو تحقیق نہ کرو۔

عجیب بات یہ ہے کہ فالِ بد اور فالِ نیک کا رواج ترقی یافتہ اور صنعتی ملکوں میں بھی پایا جاتا ہے اور مشہور و معروف تاریخی شخصیتوں میں بھی یہ عادت موجود تھی اور ہے۔ جیسے مغربی ممالک میں ان چیزوں سے فال بدلی جاتی ہے، کسی سیڑھی کے نیچے سے گزرنا، نمکدان گر جانا، چاقو کا ہدیہ دینا۔

البتہ فالِ نیک کا مسئلہ کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم نے کہا اکثر اس کا اثر مثبت نکلتا ہے لیکن فالِ بد کے رسم و رواج سے ہمیشہ مقابلہ کرنا چاہیئے اور اس بُری رسم کو لوگوں کے ذہنوں سے خارج کرنا چاہیئے۔ اس مقابلے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ روحِ ایمان کی تقویت کی جائے، دلوں میں خدا پر توکل و اعتماد پیدا کیا جائے۔ یہی روایاتِ اسلامی میں بھی وارد ہوا ہے۔

(۱۳۲) وَقَالُوا مَهْمَا تَأْتِنَا بِهِ مِنْ آيَةٍ لِتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِينَ ○

(۱۳۳) فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ آيَاتٍ مُفَصَّلَاتٍ فَاسْتَكْبَرُوا وَكَانُوا قَوْمًا مُجْرِمِينَ ○

ترجمہ

(۱۳۲) اور انہوں نے کہا کہ (اے موسٰی) جب تم کوئی ایسی آیت ہمارے پاس لاؤ کہ اس سے تم ہم پر جادو کر دو ہم پھر بھی تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔

(۱۳۳) پس ہم نے ان پر (لگاتار بلائیں نازل کیں) طوفان، ٹڈیاں، زراعتی آفت،

مینڈک اور خون جو الگ الگ نشانیاں تھیں، بھیجیں (لیکن وہ پھر بھی بیدار نہ ہوئے، اور انہوں نے تکبر کیا اور وہ گناہگار لوگ تھے۔

تفسیر

مختلف اور پیہم بلاؤں کا نزول

ان آیات میں ان بیدار کنندہ درسوں کا ایک اور مرحلہ بیان کیا گیا ہے جو خدا نے قوم فرعون کو دیئے۔ جب مرحلۂ اول یعنی قحط، خشک سالی اور مالی نقصانات نے ان کو بیدار نہ کیا تو دوسرے مرحلہ کی نوبت پہنچی جو پہلے مرحلہ سے شدید تر تھا۔ اس مرتبہ خدا نے ان کو پے در پے ایسی بلاؤں میں جکڑا جو ان کو اچھی طرح سے کچلنے والی تھیں۔ مگر افسوس ان کی اب بھی آنکھیں نہ کھلیں۔

پہلی آیت میں ان بلاؤں کے نزول کے مقدمہ کے طور پر فرمایا گیا ہے: انہوں نے موسیٰ کی دعوت کے مقابلے میں اپنے عناد کو بدستور باقی رکھا اور۔ کہا کہ تم ہرچند ہمارے لیے نشانیاں لاؤ اور ان کے ذریعے ہم پر اپنا جادو کرو ہم کسی طرح بھی تم پر ایمان نہیں لائیں گے" (وقالوا مهما تأتنا به من اٰية لتسحرنا بها فما نحن لك بمؤمنين)۔

لفظ "آیت" شاید انہوں نے ازراہِ تمسخر استعمال کیا تھا، کیونکہ حضرت موسیٰ نے اپنے معجزات کو آیاتِ الٰہی قرار دیا تھا، لیکن انہوں نے سحر قرار دیا۔

آیات کا لہجہ اور دیگر قرائن اس بات کے مظہر ہیں کہ فرعون کے پراپیگنڈہ کا محکمہ جو اپنے زمانے کے لحاظ سے ہر طرح کے سازو سامان سے لیس تھا وہ حضرت موسیٰ کے خلاف ہر طرف سے حرکت میں آگیا تھا اس کے نتیجے میں تمام لوگوں کا ایک ہی نعرہ تھا اور وہ یہ کہ اے موسیٰ! تم تو ایک زبردست جادوگر ہو! کیونکہ موسیٰ کی بات کو رد کرنے کا ان کے پاس اس سے بہتر کوئی جواب نہ تھا جس کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں وہ گھر کرنا چاہتے تھے۔

٭

لیکن چونکہ خدا کسی قوم پر اس وقت تک اپنا آخری عذاب نازل نہیں کرتا جب تک کہ اس پر خوب اچھی طرح سے اتمام حجت نہ کرلے اس لیے بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے پہلے طرح طرح کی بلائیں ان پر نازل کیں کہ شاید ان کو ہوش آجائے۔

پہلے - ہم نے ان پر طوفان بھیجا۔ (فارسلنا عليهم الطوفان)۔

"طوفان" مادۂ "طوف" (بروزنِ خوف) سے ہے جس کے معنی گھومنے اور طواف کرنے والی شے

کے ہیں۔ بعد ازاں ہر اس حادثے کو طوفان کہا جانے لگا جو انسان کو چاروں طرف سے گھیر لے لیکن لغتِ عرب میں زیادہ تر ۔طوفان۔ ایسے تباہ کار سیلاب کو کہتے ہیں جو گھروں کو اجاڑ دے اور درختوں کو جڑ سے اکھاڑ دے (اگرچہ آج کل کی فارسی میں ۔طوفان۔ جھکڑدار ہواؤں کو کہتے ہیں)[1]۔اس کے بعد ہم نے ان کی زراعتوں اور درختوں پر ٹڈیوں کو مسلط کر دیا۔ (والجراد)۔

روایات میں وارد ہوا ہے کہ اللہ نے ان پر ٹڈیاں اس کثرت سے بھیجیں کہ انہوں نے درختوں کے شاخ و برگ کا بالکل صفایا کر دیا، حتیٰ کہ ان کے بدنوں تک کو وہ اتنا آزار پہنچاتی تھیں کہ وہ تکلیف سے چیخنے چلاتے تھے۔

جب بھی ان پر بلا نازل ہوتی تھی تو وہ حضرت موسیٰ سے فریاد کرتے تھے کہ وہ خدا سے کہہ کر اس بلا کو ہٹوا دیں طوفان اور ٹڈیوں کے موقع پر بھی انہوں نے جناب موسیٰ سے یہی خواہش کی جس کو موسیٰ نے قبول کر لیا اور یہ دونوں بلائیں برطرف ہوگئیں، لیکن اس کے بعد پھر وہ اپنی ضد پر اتر آئے جس کے نتیجے میں تیسری بلا ۔ قمل ۔ کی ان پر نازل ہوتی (والقمل)۔

۔قمل۔ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان گفتگو ہوئی ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ ایک قسم کی نباتاتی آفت تھی جو زراعت کو کھا جاتی تھی۔

جب یہ آفت بھی ختم ہوئی اور وہ پھر بھی ایمان نہ لائے تو اللہ نے مینڈک کی نسل کو اس قدر فروغ دیا کہ مینڈک ایک نئی بلا کی صورت میں ان کی زندگی میں داخل ہوگئے (والضفادع)[2]

جدھر دیکھتے تھے ہر طرف چھوٹے بڑے مینڈک نظر آتے تھے یہاں تک کہ گھروں کے اندر، کمروں میں، بچھونوں میں، دسترخوان پر کھانے کے برتنوں میں مینڈک ہی مینڈک تھے جس کی وجہ سے ان کی زندگی حرام ہوگئی تھی، لیکن پھر بھی انہوں نے حق کے سامنے اپنا سر نہ جھکایا اور ایمان نہ لائے۔

اس وقت اللہ نے ان پر خون مسلط کیا (والدّم)۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ خون سے مراد مرض نکسیر ہے جو ایک وبا کی صورت میں ان میں پھیل گیا، لیکن بہت سے مفسرین نے لکھا ہے کہ دریائے نیل لہو رنگ ہوگیا اتنا کہ اس کا پانی کسی مصرف کے لائق نہ رہا!

آخر میں قرآن فرماتا ہے: ان معجزوں اور کھلی نشانیوں کو جو موسیٰ کی حقانیت پر دلالت کرتی تھیں ہم نے ان کو دکھلایا لیکن انہوں نے ان کے مقابلے میں تکبر سے کام لیا اور حق کو قبول کرنے سے انکار کر

---

[1] جیسا کہ اردو میں بھی ۔طوفان۔ آج کل اسی مفہوم میں مروج ہے۔(مترجم)

[2] ۔ضفادع۔ جمع ہے ۔ضفدع۔ کی جس کے معنی مینڈک کے ہیں یہ لفظ زیر بحث آیت میں جمع کے صیغہ میں آیا ہے لیکن دوسرے عذابوں کو واحد کے صیغہ میں ذکر کیا گیا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مینڈکوں کی مختلف قسموں کو خدا نے ان پر مسلط کیا تھا۔

زیادہ وہ ایک مجرم اور گنہگار قوم تھے (ایات مفصلات فاستکبروا وکانوا قوما مجرمین)۔

بعض روایات میں ہے کہ ان میں سے ہر ایک بلا ایک ایک سال کے لیے آتی تھی یعنی ایک سال طوفان و سیلاب، دوسرے سال ٹڈیوں کے دل، تیسرے سال نباتاتی آفت اسی طرح آخر تک لیکن دیگر روایات میں ہے کہ ایک آفت سے دوسری آفت تک ایک مہینہ سے زیادہ فاصلہ نہ تھا' بہرکیف اس میں شک نہیں کہ ان آفتوں کے درمیان فاصلہ موجود تھا (جیسا کہ قرآن نے لفظ۔ مفصلات سے تعبیر کیا ہے)، تاکہ ان کو تفکر کے لیے کافی موقع مل جائے۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ یہ بلائیں صرف فرعون اور فرعون والوں کے دامن گیر ہوتی تھیں، بنی اسرائیل اس سے محفوظ تھے[1] بے شک یہ اعجاز ہی تھا لیکن اگر نکتۂ ذیل پر نظر کی جائے تو ان میں سے بعض کی علمی توجیہ بھی کی جاسکتی ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ مصر جیسی سرسبز و شاداب اور خوبصورت سلطنت جو دریائے نیل کے کناروں پر آباد تھی اس کے بہترین حصے وہ تھے جو دریا سے قریب تھے وہاں پانی بھی فراوان تھا اور زراعت بھی خوب ہوتی تھی تجارتی کشتیاں وغیرہ بھی دستیاب تھیں۔ یہ خطے فرعون والوں اور قبطیوں کے قبضے میں تھے جہاں انہوں نے اپنے قصر و باغات بنا رکھے تھے، اس کے برخلاف اسرائیلیوں کو دور دراز کے خشک اور کم آب علاقے دیئے تھے جہاں وہ زندگی کے یہ سخت دن گذارتے تھے کیونکہ ان کی حیثیت غلاموں کی سی تھی۔

بنا بریں یہ ایک طبیعی امر ہے کہ جب سیلاب اور طوفان آیا تو اس کے نتیجے میں وہ آبادیاں زیادہ متاثر ہوئیں جو دریائے نیل کے دونوں کناروں پر آباد تھیں۔ اسی طرح مینڈک بھی پانی ہی سے پیدا ہوتے ہیں جو قبطیوں کے گھروں کے آس پاس بڑی مقدار میں موجود تھا۔ یہی حال خون کا ہے کیونکہ رود نیل کا پانی خون ہوا تھا، ٹڈیاں اور زرعی آفتیں بھی باغات، کھیتوں اور سرسبز علاقوں پر حملہ کرتی ہیں لہٰذا ان عذابوں سے زیادہ تر نقصان قبطیوں ہی کا ہوتا تھا۔

جو کچھ آیاتِ فوق میں ذکر ہوا ہے اس کا ذکر موجودہ توریت میں بھی ملتا ہے لیکن کسی حد تک فرق کے ساتھ۔

(ملاحظہ ہو سفر خروج فصل ہفتم تا دہم توریت)۔

---

[1] مثلاً پانی جب خون ہوا ہے تو وہ صرف فرعون والوں کے لیے خون تھا مگر بنی اسرائیل کے لیے پانی تھا، حتیٰ کہ قبطی اسرائیلیوں سے کہتے تھے کہ تم اپنے منہ میں پانی لے کر ہمارے منہ میں ڈال دو۔ جب اسرائیل ایسا کرتے تھے تو وہ پانی جب تلک ان کے منہ میں رہتا تھا پانی رہتا تھا لیکن جب وہ کسی قبطی کے منہ میں جاتا تھا تو خون ہو جاتا تھا۔ یہی حال مینڈکوں وغیرہ کا بھی تھا۔ (مترجم)

(۱۳۴) وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ
بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَ
لَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ۝
(۱۳۵) فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلٰٓى أَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوهُ إِذَا
هُمْ يَنْكُثُونَ ۝
(۱۳۶) فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِنَا
وَكَانُوا عَنْهَا غٰفِلِينَ ۝

ترجمہ

(۱۳۴) جب ان پر بلا نازل ہوتی تھی تو وہ کہتے تھے: اے موسٰی ! اپنے خدا سے کہو کہ جو عہد اس نے تم سے کیا ہے اس کے مطابق کرے، اگر اس بلا کو ہم سے دور کر دو گے تو ہم یقیناً تمہارے اوپر ایمان لے آئیں گے اور بنی اسرائیل کو تمہارے ساتھ بھیج دیں گے۔

(۱۳۵) لیکن جب وہ ایک معینہ مدت تک پہنچتے تھے اور ہم ان سے بلا دُور کر دیتے تھے، تو وہ اپنے عہد کو توڑ دیتے تھے۔

(۱۳۶) آخر کار ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان سب کو دریا میں غرق کر دیا کیونکہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ ان سے غافل رہے تھے۔

تفسیر

بار بار کی عہد شکنیاں

ان آیات میں فرعونیوں کے اس ردِ عمل کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے پروردگارِ عالم کی عبرت انگیز

اور بیدار کنندہ بلاؤں کے نزول کے بعد ظاہر کیا، ان تمام آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس وقت وہ بلا کے چنگل میں گرفتار ہو جاتے تھے، جیسا کہ عام طور سے تباہ کاروں کا دستور ہے، وقتی طور پر خواب غفلت سے بیدار ہو جاتے تھے اور فریاد وزاری کرنے لگتے تھے اور حضرت موسیٰ سے درخواست کرتے تھے کہ خدا سے ان کی نجات کے لیے دعا کریں۔ چونکہ حضرت موسیٰ ان کے لیے دعا کرتے تھے اور وہ بلا ان کے سروں سے ٹل جاتی تھی۔ مگر ان کی حالت یہ تھی کہ جونہی وہ بلا سر سے ٹلتی تھی تو وہ تمام چیزوں کو بھول جاتے تھے اور وہ اپنی پہلی نافرمانی اور سرکشی کی حالت پر پلٹ جاتے تھے۔

پہلی آیت میں ہے جس وقت ان پر بلا مسلط ہوتی تھی تو کہتے تھے اسے موسیٰ! ہمارے لیے اپنے خدا سے دعا کرو کہ جو عہد اس نے تم سے کیا ہے اسے پورا کرے اور تمہاری دعا ہمارے حق میں قبول کرے (ولما وقع علیھم الرجز قالوا یا موسی ادع لنا ربك بما عھد عندك)۔

۔اگر تم یہ بلا ہم سے دُور کر دو تو ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ہم خود بھی تم پر ضرور ایمان لائیں گے اور بنی اسرائیل کو بھی یقیناً تمہارے ہمراہ روانہ کر دیں گے" (لئن کشفت عنا الرجز لنؤمنن لك ولنرسلن معك بنی اسرآئیل)۔

"رجز" بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً: سخت بلائیں، طاعون، بت اور بت پرستی وسوسۂ شیطانی، برف یا سخت اولے۔

لیکن یہ سب معانی اس ایک عام معنی کے مختلف مصداق ہیں جو ان سب کی جڑ ہے کیونکہ اس لفظ کی اصل جیسا کہ راغب نے مفردات میں لکھا ہے "اضطراب" ہے اور علامہ طبرسی کی کتاب مجمع البیان کے مطابق اس کے اصلی معنی "انحراف از حق" کے ہیں۔ لہٰذا اگر سزاؤں اور عذابوں کو "رجز" کہا گیا ہے تو اس لیے کہ یہ سب حق سے روگردانی کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح بت پرستی بھی انحراف از حق اور اضطراب در عقیدہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب اونٹ کی ایک بیماری کو بھی "رَجَز" (بروزن "مَرَض") کہتے ہیں۔ اس بیماری میں یہ ہوتا ہے کہ اونٹ کے پیر میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ کوتاہ قدمی سے ٹھہرتا ہوا چلتا ہے۔ نیز اسی وجہ سے جنگی اشعار کو بھی "رجز" کہتے ہیں کیونکہ ان میں عام طور پر ہر "مقطع" کوتاہ اور نزدیک ہوتا ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا آیت میں لفظ "رجز" سے مراد بہ ظاہراً وہی پانچ طرح کی بیدار کنندہ سزائیں ہیں جن کا آیات گذشتہ میں تذکرہ کیا گیا ہے، اگرچہ بعض مفسرین نے یہ بھی احتمال ذکر کیا ہے کہ ممکن ہے اس سے بعض دوسری بلاؤں کی طرف اشارہ مقصود ہو، جو اللہ نے ان پر نازل فرمائیں اور گزشتہ آیات میں ان کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہوا، جیسے طاعون، برف نیز شدید اور جان لیوا ژالہ باری۔ توریت میں بھی مؤخرالذکر عذابوں کا ذکر ہوا ہے۔

جملہ "بما عهد عندك" میں عہدِ الٰہی سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان گفتگو ہے، زیادہ قرینِ صواب یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ کا موسیٰ سے یہ وعدہ ہے کہ جب بھی کوئی دعا کرد گے میں اسے پورا کر دوں گا، لیکن یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "عہد" سے مراد وہی "عہدِ نبوت" ہے یعنی اے موسیٰ! ہم تمہیں تمہارے عہدِ نبوت کا واسطہ دیتے ہیں کہ خدا سے ان بلاؤں کو دُور ہونے کی دعا کرو۔

*

اس کے بعد کی آیت میں ان کی پیمان شکنی کا ذکر کیا گیا ہے، فرماتا ہے: "جس وقت ہم ان پر سے بلاؤں کو تعیین شدہ مدت کے بعد ہٹا لیتے تھے تو وہ اپنا وعدہ توڑ ڈالتے تھے" نہ خود ہی ایمان لاتے تھے اور نہ ہی بنی اسرائیل کو اسیری سے آزاد کرتے تھے (فلما كشفنا عنهم الرجز الى اجل هم بالغوه اذا هم ينكثون)[1]

جملہ "الى اجل هم بالغوه" سے اشارہ اس مطلب کی طرف ہے کہ حضرت موسیٰؑ ان کے لیے ایک مدت معین کرتے تھے کہ فلاں وقت یہ بلا برطرف ہو جائے گی تاکہ ان پر اچھی طرح کھل جائے کہ یہ بلا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ حضرت موسیٰؑ کی دعا کی وجہ سے تھا۔

جملہ "اذا هم ينكثون" چونکہ مضارع کا صیغہ ہے اس لیے استمرار پر دلالت کر رہا ہے، یعنی وہ لوگ ہر مرتبہ حضرت موسیٰؑ کے سامنے پیمان باندھتے تھے اس کے بعد اسے توڑ ڈالتے تھے یہاں تک کہ عہد شکنی ان کی زندگی کا ایک جزو ہو گیا تھا۔

*

آخری آیت میں ان کی اس خیرہ سری، سرکشی اور پیمان شکنی کو دو مختصر جملوں میں بیان کر دیا گیا ہے۔ پہلے مجمل طور سے فرماتا ہے: ہم نے ان سے انتقام لے لیا (فانتقمنا منهم)۔

بعد ازاں اس انتقام کی شرح اس طرح سے فرمائی ہے: ہم نے انہیں دریا میں ڈبو دیا، کیونکہ انہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور وہ ان سے غافل تھے (فاغرقناهم في اليم بانهم كذبوا بآياتنا وكانوا عنها غافلين)[2]

---

[1] لفظ "نکث" (بروزن "مکث") دراصل اس کے معنی رسی کے بل کھولنے کے ہیں، بعد ازاں پیمان شکنی کے لیے استعمال ہونے لگا۔

[2] جیسا کہ لغت اور احادیث کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے "یم" کا معنی ہے سمندر نیز اس کا اطلاق نیل جیسے عظیم دریاؤں پر بھی ہوتا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں علماء میں اختلاف ہے کہ "یم" عربی زبان کا لفظ ہے یا سریانی یا ہیروگلیفی کا المنار کے مصنف جو مصر کے معروف علماء میں سے ہیں نے ہیروگلیفی اور عربی لغات کی وجوہ اشتراک کو جمع کیا ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے کتاب معجم الکبیر تالیف کی ہے نقل کرتے ہیں کہ "یم" قدیم مصری زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی ہے سمندر۔ لہٰذا چونکہ زیر بحث معاملے کا تعلق سرزمین مصر سے ہے لہٰذا قرآن نے اس ضمن میں مصر ہی کی لغات سے استفادہ کیا ہے۔

ایسا نہ تھا کہ وہ واقعاً غافل ہوں کیونکہ مختلف طریقوں سے حضرت موسیٰ ان کو بیدار کرتے رہتے تھے، بلکہ عملی طور پر ان کا طریقہ غافلوں جیسا تھا کہ ذرا بھی آیاتِ الٰہی کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔
اللہ کے انتقام سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ خدا کینہ ور اشخاص کی طرح شمان لیتا ہے اور جو جیسا اس کے ساتھ کرتا ہے وہ اس کا بدلہ چکاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے، بلکہ اللہ کا انتقام یہ ہے کہ پہلے وہ انسان کی اصلاح کے لیے طرح طرح کے طریقے استعمال کرتا ہے، اتمام حجت کرتا ہے، سمجھاتا ہے جب اس سے پوری مایوسی حاصل ہو جاتی ہے اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کا وجود بالکل فاسد اور معاشرے کے لیے خطرناک ہے اور اب اسے جینے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے تو اسے عذاب کے ذریعہ نابود کر دیتا ہے۔ "انتقام" کے لغوی معنی جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی بیان کیا سزا اور پاداش دینے کے ہیں۔ اس کے وہ معنی نہیں ہیں جو فارسی میں اس سے سمجھے جاتے ہیں۔

۱۳۷ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ
الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ۗ وَتَمَّتْ
كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ۭ
وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا
كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ○

ترجمہ

۱۳۷ اور ہم نے مشرق و مغرب کی پُر برکت زمینوں کا وارث بنایا اس قوم کو جسے (ظلم وستم کی زنجیروں میں جکڑ کے) کمزور کر دیا گیا تھا اور بنی اسرائیل نے چونکہ صبر کیا اس لیے تیرے رب کا نیک وعدہ ان کے لیے پورا ہوا، اور جو (قصر و محل) فرعون اور اس کی قوم نے بناتے تھے اور جو عالیشان دار باغات انہوں نے تیار کیے تھے ان سب کو ہم نے مسمار کر دیا۔

تفسیر

قوم فرعون کا دردناک انجام

قوم فرعون کی نابودی کے بعد وہ بنی اسرائیل جو سالہا سال دراز سے ان کے ظلم وستم کے پنجہ میں دبے ہوئے تھے آزاد ہوگئے اور فرعونیوں کی وسیع وعریض سرزمین کے مالک بن گئے۔ آیت مذکورہ بالا میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: ہم نے مشرق ومغرب کی پُر برکت زمینوں کا والی و وارث ان لوگوں کو بنا دیا جو مستضعف اور استعمار زدہ تھے (واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض ومغاربها التی بارکنا فیها)۔

جیساکہ ہم نے اس سے پہلے بھی اشارہ کیا کہ لفظ "ارث" کے معنی لغت میں اس مال کے ہیں جو کسی سے کسی کو بغیر تجارت یا دوسری طرح کے معاملہ کے مل جائے، چاہے وہ مردہ سے ملے یا زندہ سے۔

"یستضعفون" جس کا مادّہ "استضعاف" ہے کلیۃً "استعمار" کا الٹ ہے۔ لفظ "استعمار" کا استعمال تو ہمارے زمانہ میں عام ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی ظالم قوم کسی دوسری قوم کی تضعیف کرے تاکہ اس کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرے، اِلاّ یہ کہ استضعاف و استعمار میں یہ فرق ہے کہ استعمار کے ظاہری معنی آباد کرنے کے ہیں اور باطنی معنی ویران کرنے کے، لیکن استضعاف کے ظاہری باطنی دونوں معنی ایک ہیں۔

"کانوا یستضعفون" سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ فرعون والے ان کو ہمیشہ ضعف و ناتوانی میں جکڑا رکھتے تھے۔ انہوں نے فکری، اخلاقی، اقتصادی ہر لحاظ سے انہیں ناتوان کر دیا تھا۔

"مشارق الارض ومغاربها" سے مراد وہ وسیع وعریض زمینیں ہیں جو فرعون اور اس کے ماننے والوں کے قبضے میں تھیں، کیونکہ چھوٹی زمینیں متعدد مشرق و مغرب یا متعدد افق اپنے اندر نہیں رکھتیں، لیکن اگر وہ وسیع سرزمین ہو تو وہ زمین کے کروی ہونے کی وجہ سے ایسی ہوگی کہ اس میں مختلف مغرب ومشرق ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے اس تعبیر کو وسیع سرزمین کے معنی میں کنایہ سمجھا۔

اس جملہ "بارکنا فیها" سے اس سرزمین کی غیر معمولی آبادی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ یعنی مصر و شام کا علاقہ جو اُس زمانے میں اور اِس زمانے میں بھی دنیا کے پُر برکت علاقوں میں شمار ہوتا ہے خصوصاً بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس زمانے میں مملکت مصر کی اتنی وسعت تھی کہ شامات (شام، فلسطین اور لبنان وغیرہ) کے علاقے بھی اس میں داخل تھے۔

بنا بریں پورے کرۂ زمین کی حکومت مراد نہ تھی کیونکہ یہ امر تاریخی مسلمات کے قطعاً خلاف ہے، بلکہ حکومت بنی اسرائیل سے مراد فرعونوں کی سرزمین تھی۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: بنی اسرائیل کی فتحیابی کے متعلق تیرے پروردگار کا نیک وعدہ ان کے صبر و استقلال کی وجہ سے پورا ہوا (وتمت کلمة ربك الحسنی علی بنی اسرآئیل بما صبروا)۔

یہ وہی وعدہ ہے جس کا ذکر گزشتہ آیات (اسی سورہ کی آیت ۱۲۸ - ۱۲۹) میں گزر چکا ہے۔

اگرچہ ان آیات میں صرف بنی اسرائیل اور فرعونیوں کے مقابلے میں ان کے صبر و استقلال کا تذکرہ ہوا ہے، لیکن یہ بات کسی ملت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ جو مستضعف قوم بھی قیام کرے گی اسیری و استعمار کے پنجہ سے آزاد ہونے کے لیے کوشش کرے گی اور اس راہ میں پامردی اور استقامت دکھائے گی وہ آخر میں فتحیاب ہو گی ؎ اور ان کی جو زمینیں ظالموں کے قبضہ میں چلی گئی ہیں وہ آزاد ہو جائیں گے۔

آیت کے آخر میں اضافہ فرمایا گیا ہے: ہم نے فرعون اور فرعونیوں کے خوبصورت قصروں، پُرشکوہ عمارتوں، ہرے بھرے باغات کو نابود کر دیا (ودمرنا ما کان یصنع فرعون و قومه وما کانوا یعرشون)۔

راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ "صنع" زیادہ تر خوبصورت صنعتوں کے لیے آتا ہے۔ لہٰذا آیہ مذکورہ بالا میں عصر فرعونی کی خوبصورت و دیدہ زیب تعمیروں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

"وما یعرشون" دراصل ان باغوں کے لیے ہے جو مچان اور پاڑوں کے ذریعے پھلتے پھولتے ہیں جیسے انگور، کدو وغیرہ اور ان کی وجہ سے مناظر بہت خوبصورت ہو جاتے ہیں۔

"دمرنا" کی اصل "تدمیر" ہے جس کے معنی فنا اور نابود کرنے کے ہیں۔

یہاں پر یہ سوال کیا جاتا ہے کہ ان عمارتوں اور باغات کو کس طرح نابود کیا گیا، پھر یہ کہ ان کی نابودی کی کیا ضرورت پیش آئی؟!

جواب یہ ہے کہ یہ بات بعید نہیں کہ زلزلوں اور نت نئے سیلابوں کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہو گئی ہو۔ یہ تباہی اس وجہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ فرعون کے ساتھ تمام فرعون والے دریا میں غرق نہیں ہوئے تھے بلکہ خود فرعون اور اس کے کچھ خاص آدمی جو اس کے ساتھ موسٰی کا پیچھا کرتے ہوئے گئے تھے غرق ہوئے تھے۔ لہٰذا یہ بات مسلّم ہے کہ اگر باقی ماندہ افراد جن کی تعداد بہت زیادہ تھی اُو

؎ بشرطیکہ اس قوم کو جائز قیادت بھی حاصل ہو، فرعون کے مقابلے میں بنی اسرائیل کو اس وقت تک کامیابی حاصل نہ ہوئی جب تک کہ حضرت موسٰی اور حضرت ہارونؑ نے ان کی رہنمائی نہ کی۔ (مترجم)۔

وہ مصر کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی اقتصادی حالت پہلے جیسی ہوتی تو دوبارہ بنی اسرائیل کا ناطقہ بند کر دیتے اور جگہ جگہ ان کے لیے زحمت کا باعث بنتے لہٰذا مصلحت الٰہی اس بات کی متقضی ہوئی کہ مال دنیا سے ان کا ہاتھ خالی ہو جائے تاکہ ان کی سرکشی اور طغیان کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔

۱۳۸ وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰی قَوْمٍ
یَّعْكُفُوْنَ عَلٰۤی اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا یٰمُوْسَی اجْعَلْ لَّنَاۤ اِلٰهًا كَمَا
لَهُمْ اٰلِهَةٌ ؕ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۝
۱۳۹ اِنَّ هٰۤؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِیْهِ وَ بٰطِلٌ مَّا كَانُوْا
یَعْمَلُوْنَ ۝
۱۴۰ قَالَ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَی
الْعٰلَمِیْنَ ۝
۱۴۱ وَاِذْ اَنْجَیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ
الْعَذَابِ ۚ یُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَ یَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِیْ
ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ ۝

ترجمہ

۱۳۸ اور بنی اسرائیل کو ہم نے دریا سے (صحیح و سالم) پار لگا دیا، پس وہ ایک ایسی قوم کے پاس سے گزرے جو اپنے بتوں کے چاروں طرف تعظیم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ تو انہوں (بنی اسرائیل) نے کہا کہ اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی ایک ایسا معبود بنا

دو جیسے معبود ان لوگوں نے بنا رکھے ہیں۔ (موسٰی نے) کہا: تم جاہل و ناداں لوگ ہو۔

(۱۳۹) ان لوگوں (کو جنہیں تم دیکھ رہے ہو ان) کا انجام نابودی ہے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب باطل اور لغو بات ہے۔

(۱۴۰) (اس کے بعد) اس نے کہا: کیا میں خدائے برحق کے علاوہ کوئی دوسرا معبود تمہارے لیے چاہوں، ایسا خدا جس نے تمہیں تمہارے عصر کے لوگوں پر برتری عطا کی ہے۔

(۱۴۱) تم یاد کرو اس زمانہ کو جب ہم نے تمہیں فرعون والوں (کے پنجۂ ظلم) سے نجات دی، وہ تم پر مسلسل ظلم کر رہے تھے۔ تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے تھے اور عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش ہے۔

تفسیر

حضرت موسٰیؑ سے بت سازی کی فرمائش

ان آیات میں بنی اسرائیل کی سرگزشت کے ایک اور اہم حصہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ فرعونیوں پر ان کی فتحیابی کے بعد ہوا۔ اس واقعہ سے بت پرستی کی جانب ان کی توجہ ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی ابتداء کا ذکر ان آیات میں آیا ہے اور اس کے انجام کا مفصل ذکر سورۂ طٰہٰ کی آیات ۸۶ تا ۹۷ میں آیا ہے اور مختصر طور پر اسی سورہ کی آیت ۱۴۸ میں بھی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت موسٰیؑ فرعون کے جھگڑے سے نکل چکے تو ایک اور داخلی مصیبت شروع ہو گئی جو بنی اسرائیل کے جاہل، سرکش اور ضدی افراد کی وجہ سے پیش آئی۔ جیسا کہ آگے معلوم ہوگا حضرت موسٰیؑ کے لیے یہ داخلی کش مکش، فرعون اور فرعونیوں کے ساتھ جنگ کرنے سے بدرجہا سخت اور سنگین تر تھی اور ہر داخلی کشمکش کا یہی حال ہوا کرتا ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: ہم نے بنی اسرائیل کو دریا (نیل) کے اس پار لگا دیا (وجاوزنا ببنی اسرآئیل البحر)۔

لیکن "انہوں نے راستے میں ایک قوم کو دیکھا جو اپنے بتوں کے گرد خضوع اور انکساری کے ساتھ اکٹھا تھے (فاتوا علی قوم یعکفون علی اصنام لھم)۔

"عاکف" "عکوف" سے ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کی طرف احترام کے ساتھ توجہ کرنا۔

امت موسیٰ کے جاہل افراد یہ منظر دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً حضرت موسیٰ کے پاس آن کر وہ کہنے لگے اے موسیٰ! ہمارے واسطے بھی بالکل ویسا ہی معبود بنا دو جیسا معبود ان لوگوں کا ہے (قالوا یا موسی اجعل لنآ الٰھًا کما لھم اٰلھة)۔

حضرت موسیٰ ان کی اس جاہلانہ اور احمقانہ فرمائش سے بہت ناراض ہوئے۔ آپ نے ان لوگوں سے کہا: تم لوگ جاہل و بے خبر قوم ہو (قال انکم قوم تجھلون)۔

چند اہم نکات

۱۔ اس آیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بُت پرستی کا اصل سبب بشر کا جہل اور نادانی ہے۔ اس کا ایک جہل تو اپنے خالق حقیقی سے ہے یعنی اس کی ذات پاک کو نہ جاننا اور یہ نہ جاننا کہ اس کی شبیہ و نظیر ہرگز ممکن نہیں ہے۔

دوسری طرف اس جہان کی اصل علت سے جہل ہے اور اس کے حوادث کی علتوں سے بے خبری ہے اسی جہل کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن ہر حادثے کی ایک خیالی علت تراش لیتا ہے یہاں تک کہ بتوں کو بھی علت مان لیتا ہے۔

اس کا تیسرا جہل عالم ماورار طبیعت سے ہے جس کے نتیجہ میں سوائے حسی اشیاء کہ جن کو وہ اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے اور حواس پنجگانہ سے محسوس کرتا ہے، اور کسی چیز کو نہیں مانتا۔ تاریخ گواہی دیتی ہے کہ ان تین طرح کے جہلوں کی آمیزش سے بُت پرستی کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ایسا انسان جو آگاہ و فہمیدہ ہو، خدا اور اس کی صفات ذاتی سے باخبر ہو، علل حوادث کا بھی اسے علم ہو، جہانِ طبیعت اور ماورار طبیعت کی بھی اطلاع رکھتا ہو پھر اپنے ہاتھوں سے پہاڑ میں سے پتھر کے ایک ٹکڑے کو جدا کرے، اس کے ایک حصہ کو اپنے مکان کے کسی حصے مثلاً سیڑھی وغیرہ کے لیے استعمال کرے اور اسی پتھر کے دوسرے حصے سے ایک بُت تراشے اور اسے اپنا معبود قرار دے کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے اور اسے اپنی تقدیر کا مالک و مختار سمجھ بیٹھے؟!

جالبِ توجہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ بالا میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے ان لوگوں سے کہا کہ تم وہ گروہ ہو جو ہمیشہ جہالت کے اندر غوطہ زن رہا کرتا ہے (کیونکہ "تجھلون" فعل مضارع ہے جو زیادہ تر استمرار پر دلالت کرتا ہے)، خصوصاً یہ کہ اس میں جہالت کے متعلق بیان نہیں کیا گیا ہے اور یہ خود عموم پر دلالت کرتا ہے۔

سب سے زیادہ قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے "اجعل لنآ الٰھًا" (ہمارے لیے

ایک معبود بنا دو) کہہ کر یہ ثابت کر دیا کہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک ایسی چیز جو کبھی بھی صاحب اثر و فعال نہ تھی، نہ اس میں کوئی ضرر تھا نہ فائدہ، انتخاب اور قرار داد کے ذریعے اور کسی بُت یا خدا کا نام رکھنے کے ذریعے اچانک وہ طرح طرح کے آثار کا سرچشمہ قرار پا جائے، اور اس کی پرستش انسان کو اس کے رب سے نزدیک کر دے۔ اس کی بے احترامی سے بندہ خدا سے دور ہو جائے، اس کی عبادت سرچشمۂ خیر و برکت اور اس کی تحقیر نقصان و خسران کا سبب بن جائے۔ یہ انتہائی درجے کی جہالت اور بے خبری کی بات ہے۔

یہ درست ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ منشا نہ تھا کہ حضرت موسیٰ ان کے لیے ایک ایسا معبود بنا دیں جو پورے جہان کا خالق ہو بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ ان کے لیے ایک ایسا معبود بنا دیں جس کی پرستش کی وجہ سے وہ خدا کے نزدیک ہو جائیں اور وہ خیر و برکت کا سرچشمہ بنے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ صرف ایک نام رکھنے کی وجہ سے یا مجسمہ بنا دینے سے کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک بے روح اور بے خاصیت ہستی یک بیک ان خواص و آثار کا سرچشمہ بن جائے؟ اس سے زیادہ بھی کوئی بات خرافات، جہالت اور بے بنیاد توہمات پر مبنی ہو سکتی ہے؟[1]

۲۔ اس میں شک نہیں کہ بنی اسرائیل قبل اس کے کہ اس بُت پرست قوم کو دیکھیں مصریوں کے ساتھ طولانی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے خود بھی بت پرستی کی طرف میلان رکھتے تھے لیکن یہ بات ان کے دلوں میں چنگاری کی طرح دبی ہوئی تھی۔ لہذا جونہی انہوں نے راستے میں بت پرستی کا منظر دیکھا تو یہ دبی ہوئی چنگاری یک بیک سلگ اٹھی، اس سے معلوم ہوا کہ ایک انسان جیسا بھی ہو وہ کس قدر ماحول کا تابع ہوتا ہے اور اس کا ماحول اس پر کس حد تک اثرانداز ہوتا ہے۔ یہ ماحول ہے چاہے تو اسے خدا پرستی سے نزدیک کر دے اور چاہے تو صنم کے دروازے تک لے جائے۔ ماحول ہی بہت سی برائیوں اور بدبختیوں کا سبب بنتا ہے اور وہی نیکی و پارسائی کی طرف لے جاتا ہے (اگرچہ ماحول کا انتخاب ہی اصلی علت ہوتا ہے) یہی وجہ ہے کہ ماحول کی اصلاح کو اسلام میں بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

۳۔ ایک اور جالب نظر بات جو آیت مذکورہ سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ناشکر گزار افراد کی کثرت تھی، باوجودیکہ انہوں نے حضرت موسیٰ سے اتنے معجزے دیکھے، قدرت کے اتنے انعامات ان پر ہوئے، ان کا دشمن فرعون نابود ہوا ابھی کافی عرصہ بھی نہیں گذرا تھا، وہ غرق کر دیا گیا اور وہ سلامتی کے ساتھ دریا کو عبور کر گئے لیکن انہوں نے ان تمام باتوں کو یکسر بھلا دیا اور حضرت موسیٰ سے

---

[1] بت پرستی کی تاریخ کے بارے میں مزید معلومات کے لیے تفسیر نمونہ جلد اوّل (ص ۲۱۰ اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

بُت سازی کا سوال کر بیٹھے۔

نہج البلاغہ میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی نے حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کے سامنے مسلمانوں پر اعتراض کیا:

ابھی تمہارے نبیؐ دفن بھی نہ ہونے پائے تھے کہ تم لوگوں نے اختلاف کر دیا[1]

حضرت علی علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا:

انما اختلفنا عنه لا فيه ولكنكم ما جفت ارجلكم من البحر حتى قلتم لنبيكم اجعل لنا آلهاً كما لهم آلهة فقال انكم قوم تجهلون۔

ہم نے ان فرامین واقوال کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو پیغمبرؐ سے ہم تک پہنچے ہیں، پیغمبر یا ان کی نبوت سے متعلق ہم نے کوئی اختلاف نہیں کیا (چہ جائیکہ الوہیت کے متعلق ہم نے کوئی بات کی ہو) لیکن تم (یہودی) ابھی تمہارے پیر دریا کے پانی سے خشک نہیں ہونے پائے تھے کہ تم نے اپنے نبی (حضرت موسیٰؑ) سے یہ کہہ دیا کہ ہمارے لیے ایک ایسا ہی معبود بنا دو جس طرح کہ ان کے متعدد معبود ہیں، اور اس نبی نے تمہارے جواب میں تم سے کہا تھا کہ تم ایک ایسا گروہ ہو جو جہل کے دریا میں غوطہ زن ہے۔

اس کے بعد کی آیت میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی بات کی تکمیل کے لیے بنی اسرائیل سے کہا: اس بت پرست گروہ کو جو تم دیکھ رہے ہو ان کا انجام ہلاکت ہے اور ان کا ہر کام باطل و بے بنیاد ہے (ان هٰؤلآء متبر ما هم فيه و باطل ما كانوا يعملون)۔

یعنی ان کا عمل بھی عبث ہے اور ان کی زحمتیں بھی سب بے نتیجہ ہیں اور آخر میں جو ہر بت پرست قوم کا انجام بد (ہلاکت) ہے وہی ان کا بھی انجام ہونا ہے (کیونکہ "متبر" کا مادہ "تبار" ہے جس کے معنی ہیں "ہلاکت"۔

اس کے بعد مزید تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے: آیا خدائے برحق کے علاوہ تمہارے لیے کوئی دوسرا معبود بنا لوں، وہی خدا جس نے اہلِ جہان (ہمعصر لوگوں) پر تم کو فضیلت دی (قال اغير الله ابغيكم الٰهاً وهو فضلكم على العالمين)۔

مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کی پرستش کا اصل محرک شکر گزاری کا جذبہ ہو تو تمہیں یہ سوچنا چاہیئے کہ

[1] اس سے مراد خلافت کے بارے میں اختلاف ہے۔ (مترجم)

تمہاری ساری نعمتیں خدا کی دی ہوئی ہیں، اور اگر اس کی پرستش اس وجہ سے ہے کہ وہ علۃ العلل اور منشاء اثر ہے، تب بھی اس کا تعلق خدائے وحدہٗ لاشریک سے ہے، بنا بریں جس لحاظ سے بھی دیکھا جائے صرف اسی کی عبادت و پرستش کرنا چاہیئے اس کے غیر کی نہیں۔

*

اس کے بعد کی آیت میں خداوند کریم اپنی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت کا ذکر فرماتا ہے جو اس نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھی، تاکہ اس عظیم نعمت کا تصور کرکے ان میں شکر گزاری کا جذبہ بیدار ہو اور انہیں یہ احساس ہو کہ پرستش اور سجدے کا مستحق صرف خدائے یکتا و یگانہ ہے' اور اس بات کی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی کہ جو بت بے نفع اور بے ضرر ہیں ان کے سامنے سر تعظیم جھکایا جائے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: "یاد کرو اس وقت کو جبکہ ہم نے تمہیں فرعون کے گروہ کی شر سے نجات دے دی، وہ لوگ تم کو مسلسل عذاب دیتے چلے آرہے تھے (واذانجیناکم من اٰل فرعون یسومونکم سوٓء العذاب)۔

"یسومون" کی اصل "سوم" ہے جس کے معنی جیسا کہ راغب نے مفردات میں لکھا ہے کسی چیز کے پیچھے چلنے کے ہیں اور قاموس میں ہے کہ اس لفظ میں ایک طرح کا تسلسل و استمرار بھی پایا جاتا ہے، بنا بریں "یسومونکم سوٓء العذاب" کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ لوگ برابر اور مسلسل تم کو عذاب دیتے چلے آرہے تھے۔

اس کے بعد جیسا کہ قرآنی قاعدہ ہے کہ اجمال کے بعد تفصیل سے کام لیتا ہے۔ اس عذاب و ایذا رسانی کی تفصیل یوں بیان فرماتا ہے: وہ تمہارے بیٹوں کو تو قتل کر دیتے تھے اور تمہاری عورتوں لڑکیوں کو (خدمت اور کنیزی کے لیے) زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ (یقتلون ابنآءکم ویستحیون نسآءکم)۔

"اور اس مصیبت میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی" (وفی ذالکم بلآء من ربکم عظیم)۔

گذشتہ اور آئندہ آیات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے یہ جملہ بنی اسرائیل سے اس وقت کہا جب وہ دریا کو عبور کرنے کے بعد بت پرستی کی خواہش میں گرفتار ہو گئے تھے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس جملہ کے مخاطب وہ یہودی ہیں جو پیغمبر اسلامؐ کے زمانے میں موجود تھے، کیونکہ پہلی تفسیر کے مطابق اس میں ایک جملہ "قال ربکم" مقدر ماننا پڑے گا (یعنی موسیٰؑ نے کہا کہ تمہارا رب کہتا ہے) اور یہ ظاہر کے خلاف ہے۔

لیکن اگر اسے زمانہ پیغمبرؐ کی بات مانا جائے تو یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ اس طرح ماقبل اور مابعد

کی آیات سے اس جملے کو کوئی ربط باقی نہیں رہتا، یہ جملہ ایک معترضہ جملہ ہو جاتا ہے، اس بنا پر تفسیر اوّل درست معلوم ہوتی ہے۔

ضمناً یہ بات بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اس جملے کی مثل بہت کم فرق کے ساتھ سورہ بقرہ کی آیت ۴۹ میں گذر چکی ہے۔ مزید توضیح کے لیے جلد اوّل (ص۲۱۲ اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

(۱۴۲) وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ○

ترجمہ

(۱۴۲) اور ہم نے موسٰی سے تیس راتوں کا وعدہ کیا، اس کے بعد (مزید) دس راتوں سے اس کی تکمیل کر دی، اس طرح اس کے پروردگار کا اس سے وعدہ چالیس راتوں کی صورت میں پورا ہوا، موسٰی نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ میری قوم میں میرے جانشین ہو جاؤ اور (ان کی) اصلاح کرو اور مفسدوں کے راستے پر نہ چلنا۔

تفسیر

عظیم وعدہ گاہ

اس آیت میں بنی اسرائیل کی زندگی کا ایک اور منظر بیان کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ پھر حضرت موسٰی کو اپنی قوم سے جھگڑنا پڑا ہے، حضرت موسٰی کا خدا کے مقام وعدہ پر جانا، وحی کے ذریعے احکام توریت لینا، خدا سے باتیں کرنا، کچھ بزرگانِ بنی اسرائیل کو میعاد گاہ میں ان واقعات کے مشاہدہ کیلئے لانا، اس بات کا اظہار کہ خدا کو ان آنکھوں سے ہرگز نہیں دیکھا جا سکتا، پھر بنی اسرائیل کی بچھڑا پرستی اور ان کا راہِ توحید سے ہٹ جانا اور سامری کا عجیب ہنگامہ جیسی باتوں کا ذکر چھیڑا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے : ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں (پورے ایک مہینہ) کا وعدہ کیا، اس کے بعد مزید دس راتیں بڑھا کر اس وعدہ کی تکمیل کی، چنانچہ موسیٰ سے خدا کا وعدہ چالیس راتوں میں پورا ہوا (وواعدنا موسیٰ ثلاثین لیلۃ واتممناھا بعشر فتم میقات ربہ اربعین لیلۃ)۔

" میقات " کی اصل " وقت " ہے جس کے معنی اس " وقت " کے ہیں جو کسی کام کے کرنے کے لیے پہلے سے طے کر لیا جائے۔ اس کا اطلاق عام طور سے " زمانہ " کے لیے ہوتا ہے لیکن بعض اوقات اس مکان کو بھی میقات کہتے ہیں جہاں کوئی خاص کام انجام پائے، جیسے " میقات حج " یعنی وہ جگہ جہاں سے کسی شخص کو بغیر احرام کے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

اس کے بعد اس طرح بیان کیا گیا ہے : موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا : میری قوم میں تم میرے جانشین بن جاؤ اور ان کی اصلاح کی کوشش کرو اور کبھی مفسدوں کی پیروی نہ کرنا (وقال موسیٰ لاخیہ ھارون اخلفنی فی قومی واصلح ولا تتبع سبیل المفسدین)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ وعدہ کتنی راتوں کا تھا؟ : آیہ مذکورہ بالا کے متعلق پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے پہلے ہی سے چالیس راتوں کا وعدہ کیوں نہ کیا بلکہ پہلے تیس راتوں کا وعدہ کیا اس کے بعد دس راتوں کا اور اضافہ کر دیا، حالانکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۵۱ میں ایک جگہ چالیس راتوں کا ذکر ہے ؟!

مفسرین کے درمیان اس تفریق کے بارے میں بحث ہے۔ لیکن جو بات بیشتر قرین قیاس ہے، نیز روایاتِ اہلبیت علیہم السلام کے بھی موافق ہے وہ یہ ہے کہ یہ میعاد اگرچہ واقع میں چالیس راتوں کا تھا لیکن خدا نے بنی اسرائیل کی آزمائش کرنے کے لیے پہلے موسیٰ کو تیس راتوں کی دعوت دی پھر اس کے بعد اس کی تجدید کر دی تاکہ منافقین مومنین سے الگ ہو جائیں۔

اس سلسلے میں امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا :

> جس وقت حضرت موسیٰ وعدہ گاہ الہٰی کی طرف گئے تو انہوں نے بنی اسرائیل سے یہ کہہ رکھا تھا کہ ان کی غیبت تیس روز سے زیادہ طولانی نہ ہوگی لیکن جب خدا نے اس پر دس دنوں کا اضافہ کر دیا تو بنی اسرائیل نے کہا : موسیٰ نے اپنا وعدہ توڑ دیا اس کے نتیجہ میں انہوں نے وہ کام کیے جو ہم جانتے ہیں (یعنی گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے)[1]

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۳ - نور الثقلین جلد ۲ ص ۶۱ -

رہا یہ سوال کہ یہ چالیس روز یا چالیس راتیں، اسلامی مہینوں میں سے کونسا زمانہ تھا؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدت ذیقعدہ کی پہلی تاریخ سے لے کر ذی الحجہ کی دس تاریخ تک تھی۔ قرآن میں چالیس راتوں کا ذکر ہے نہ کہ چالیس دنوں کا۔ تو شاید یہ اس وجہ سے ہے کہ حضرت موسیٰؑ کی اپنے رب سے جو مناجاتیں تھیں وہ زیادہ تر رات ہی کے وقت ہُوا کرتی تھیں۔

٭

۲۔ **پیغمبر اور جانشینی؟**: دوسرا سوال جو یہاں درپیش ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ تو خود پیغمبر تھے لہٰذا انہیں حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کی رہبری اور امامت کے لیے اپنا جانشین کیونکر مقرر کیا؟

اس سوال کا جواب ایک نکتہ پر غور کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مقام نبوت کچھ اور ہے اور مقام امامت کچھ اور۔ حضرت ہارونؑ اگرچہ خود پیغمبر تھے مگر بنی اسرائیل کی عام رہبری کے منصب دار نہ تھے۔ یہ منصب وہ تھا جو صرف حضرت موسیٰؑ کو ملا ہُوا تھا لیکن جب آپ نے چاہا کہ ایک مدت کے لیے اپنی قوم سے جدا ہوں تو اپنے بھائی کو مقام امامت و پیشوائی کے لیے انتخاب کیا۔

اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام امامت بالاتر از مقام نبوت ہے۔ ہم نے اس مطلب کو وضاحت کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے قصہ میں سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۴ کی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد اوّل ص۳۱۸ اردو ترجمہ)۔

۳۔ **حضرت ہارونؑ کو تلقین؟**: اس کے بعد ایک اور سوال سامنے آتا ہے، وہ یہ کہ حضرت موسیٰؑ نے کس طرح اپنے بھائی ہارونؑ سے یہ کہا کہ: قوم کی اصلاح کی کوشش کرنا اور مفسدوں کی پیروی نہ کرنا، جبکہ حضرت ہارونؑ ایک نبیٔ برحق اور معصوم تھے وہ بھلا مفسدوں کی پیروی کیوں کرنے لگے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ: یہ درحقیقت اس بات کی تاکید کے لیے تھا کہ حضرت ہارونؑ کو اپنی قوم میں اپنے مقام کی اہمیت کا احساس رہے اور شاید اس طرح سے خود بنی اسرائیل کو بھی اس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے کہ وہ ان کی غیبت میں حضرت ہارونؑ کی رہنمائی کا اچھی طرح اثر لیں اور ان کا کہنا مانیں اور ان کے اوامر و نواہی (احکامات) کو اپنے لیے سخت نہ سمجھیں، اس سے اپنی تحقیر خیال نہ کریں اور ان کے سامنے اس طرح مطیع و فرمانبردار رہیں جس طرح وہ خود حضرت موسیٰؑ کے فرمانبردار تھے۔

٭

۴۔ **ایک میقات یا کئی میقات؟**: چوتھا سوال جو درپیش ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا

حضرت موسیٰ صرف اسی چالیس روزہ میقات پر ایک ہی دفعہ گئے تھے اور انہی چالیس دنوں میں توریت اور تمام شریعت واحکامات نازل ہوگئے۔ نیز کیا انہی چالیس دنوں کی بات ہے کہ اپنی قوم کے کچھ منتخب شدہ افراد کو بطور نمائندہ اپنے ہمراہ لے گئے تھے کہ وہ نزولِ توریت کے گواہ بنیں اور انہیں حضرت موسیٰ یہ بتلادیں کہ وہ ذاتِ خداوندی کو نہیں دیکھ سکتے اور نہ کوئی دوسرا ہی اسے دیکھ سکتا ہے؟! یا یہ کہ متعدد چلّے گذرے؟ ایک چلّہ صرف احکام الہٰی لینے کے لیے، پھر دوسرا چلّہ بزرگانِ بنی اسرائیل کو لے جانے کے لیے، پھر شاید تیسرا چلّہ دیگر مقاصد کے لیے (جیسا کہ موجودہ توریت کے سفرِ خروج باب ۱۹ تا ۲۴ میں مذکور ہے)۔

ایک مرتبہ مفسّرین کے درمیان اس موضوع کے بارے میں بحث ہوئی ہے، لیکن آیات قبل و بعد پر اگر نظر کی جائے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان سب کا تعلق ایک ہی واقعہ سے ہے کیونکہ ایک تو یہ جملہ، و لما جاء موسٰی لمیقاتنا، (جب موسیٰ ہماری وعدہ گاہ میں آئے) اچھی طرح سے ان دونوں واقعات کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ علاوہ برایں اسی سورہ کی آیت ۱۴۵ ہمیں پورے طور سے بتلاتی ہے کہ "الواحِ توریت" اور "نزولِ احکامِ شریعتِ موسیٰ" یہ دونوں واقعات اسی سفر میں ہوئے تھے۔

اس سورہ میں صرف ایک آیت (نمبر ۱۵۵) ایسی ہے جس سے تعددِ میقات کا احتمال ہوتا ہے (واختار موسٰی قومہٗ سبعین رجلا لمیقاتنا)۔ انشاء اللہ ہم جب اس کی تفسیر بیان کریں گے تو وہاں تحریر کریں گے کہ یہ آیت بھی مذکورہ مطلب کے خلاف نہیں ہے۔

۵۔ **حدیثِ منزلت:** بہت سے سُنّی اور شیعہ مفسّرین نے اس مقام پر حدیثِ منزلت (یا علی انت منّی بمنزلۃ ھارون من موسٰی) کی طرف اشارہ کیا ہے، بس اتنا فرق ہے کہ شیعہ مفسرین نے اسے حضرت علی علیہ السلام کی خلافتِ بلافصل پر ایک زندہ دلیل مانا ہے جبکہ بعض مفسّرینِ اہلسنت نے اسے رد کرتے ہوئے شیعوں پر بے رحمی اور تعصب کے ساتھ اعتراضات کیے ہیں۔

اس بحث کی مزید وضاحت کے لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم اس حدیث کی اسناد اور متن کو مختصر طور پر پیش کردیں، اس کے بعد ان اعتراضات کے متعلق بحث کریں جو فریقِ مخالف نے اس جگہ ہم پر کیے ہیں۔

حدیثِ منزلت کے اسناد

۱۔ اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک بڑی تعداد نے جنگِ تبوک کے واقعہ کو اس

طرح نقل کیا ہے:

ان رسول اللہ خرج الی تبوک واستخلف علیاً فقال اتخلفنی فی الصبیان والنسآء قال الا ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لیس نبی بعدی۔

پیغمبر اسلام تبوک کی جانب جب روانہ ہوتے تو آپؐ نے اپنی جگہ پر علیؑ کو مقرر کیا۔ علیؑ نے کہا کہ یا رسول اللہ! مجھے عورتوں اور بچوں کے درمیان چھوڑے جاتے ہیں (اور اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ میں آپ کے ہمراہ جنگ کے لیے آؤں) پیغمبرؐ نے فرمایا: یا علیؑ! کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہاری حیثیت مجھ سے وہی ہو جو ہارون کی موسیٰ سے تھی مگر یہ فرق ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

مذکورہ عبارت معتبر ترین کتب اہلسنت میں وارد ہوئی ہے یعنی یہ روایت صحیح بخاری میں سعد بن ابی وقاص سے نقل ہوئی ہے[1]

نیز صحیح مسلم میں جو اہلسنت کی درجہ اول کی کتب میں شمار ہوتی ہے باب "فضائل الصحابہ" میں یہ حدیث سعد سے منقول ہوئی ہے کہ پیغمبرؐ نے علیؑ سے فرمایا:

انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی۔

تمہاری مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کی موسیٰ سے تھی سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا[2]

صحیح مسلم کی اس حدیث میں مطلب کو کلی طور پر بیان کیا گیا ہے اس میں جنگ تبوک کی طرف کوئی اشارہ نظر نہیں آتا۔

نیز صحیح مسلم ہی میں اس حدیث کو بطور کلی بیان کرنے کے بعد پیغمبرؐ کی جنگ تبوک والی حدیث کو بھی مثل صحیح بخاری کے جداگانہ بھی نقل کیا گیا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں بھی بعینہٖ یہی مطلب آیا ہے[3]

سنن ترمذی میں اس مطلب کا اضافہ ملتا ہے کہ ایک روز معاویہ نے سعد سے کہا کہ تم "ابوتراب" (یعنی حضرت علیؑ) کو بُرا کیوں نہیں کہتے؟ سعد نے جواب دیا: مجھے یاد ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے علیؑ کے بارے میں تین باتیں فرمائی تھیں، جب مجھے یہ تینوں باتیں یاد آتی ہیں تو میں علیؑ کو بُرا نہیں

---

[1] صحیح بخاری جلد ۶ صفحہ ۳ طبع دار احیاء التراث العربی۔

[2] صحیح مسلم جلد ۴ صفحہ ۱۸۷۰ طبع دار احیاء التراث العربی طبع دوم سال ۱۹۷۲۔

[3] جلد اول صفحہ ۴۲ طبع دار احیاء الکتب العربیہ۔

کہہ سکتا، اس کے بعد سعد نے ان تین باتوں میں سے ایک وہی جنگ تبوک میں حضرت علیؑ کے متعلق مذکورہ جملے کا ذکر کیا ہے [1]

کتاب مسند احمد بن حنبل میں تقریباً دس مقامات پر اس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے، کبھی تو جنگ تبوک کے بیان میں اس کا ذکر آیا ہے اور کہیں اس کے علاوہ بھی [2]

ان مقامات میں سے ایک مقام پر درج ہے کہ:

ایک دفعہ ابن عباس بیٹھے ہوئے تھے کہ کچھ لوگ ان کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ یا تو آپ ہمارے ساتھ باہر آجایئے یا ان لوگوں کو تھوڑی دیر کے لیے باہر بھیج دیجئے کیونکہ ہم آپ سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ ابن عباس نے کہا میں تمہارے ساتھ باہر چلتا ہوں یہاں تک کہ ابن عباس نے ان سے جنگ تبوک کا واقعہ اور رسول اللہؐ کا علیؑ کے بارے میں مذکورہ قول نقل کیا۔ اس کے بعد اتنا اور اضافہ کیا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا:

انہ لا ینبغی ان اذھب الا و انت خلیفتی:

مناسب نہیں ہے کہ میں سفر کروں سوائے اس صورت کے کہ تم میرے جانشین ہو [3]

کتاب خصائص نسائی میں بھی یہ حدیث وارد ہوئی ہے [4] اسی طرح کتاب مستدرک حاکم [5] تاریخ الخلفاء سیوطی [6] صواعق محرقہ ابن حجر [7] سیرۃ ابن ہشام [8] سیرۃ حلبی [9] اور دیگر بہت سی کتابوں میں یہ حدیث وارد ہوئی ہے۔

یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ یہ کتابیں اہل سنت کی مشہور و معروف اور درجہ اوّل کی کتابوں میں سے ہیں

---

1. جلد ۵ ص۴۳۸ مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ، مالک مکتبہ حاج ریاض شیخ۔
2. مسند احمد بن حنبل جلد اوّل ص۱۷۳، ص۱۷۵، ص۱۷۷، ص۱۷۹، ص۱۸۲، ص۱۸۵، ص۲۳۱ نیز جلد ۴ ص۳۶۹ اور ص۴۳۸۔
3. مسند احمد بن حنبل جلد اول ص۲۳۱۔
4. خصائص نسائی ص۴ و ص۱۴۔
5. جلد ۳ ص۱۰۸ و ص۱۰۹۔
6. جلد اوّل ص۶۵۔
7. ص۱۷۷۔
8. سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص۱۶۳ طبع مصر۔
9. سیرت حلبی جلد ۳ ص۱۵۱ طبع مصر۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس حدیث کو صرف سعد بن ابی وقاص نے نقل نہیں کیا ہے بلکہ ان کے علاوہ دیگر صحابہ نے بھی اس حدیث کی روایت کی ہے جن کی تعداد بیس سے زیادہ ہے۔ ان صحابہ میں سے بعض یہ ہیں: جابر بن عبداللہ، ابوسعید خدری، اسماء بنت عمیس، ابن عباس، ام سلمہ، عبداللہ بن مسعود، انس بن مالک، زید بن ارقم اور ابوایوب انصاری۔

اس سے بھی زیادہ جالب بات یہ ہے کہ معاویہ اور عمر بن خطاب نے بھی اس حدیث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔

محب الدین طبری اپنی کتاب ذخائر عقبیٰ میں نقل کرتے ہیں کہ:

ایک شخص معاویہ کے پاس آیا اور اس نے معاویہ سے کوئی سوال کیا، معاویہ نے جواب دیا کہ یہ مسئلہ علیؑ سے پوچھو کیونکہ وہ بہتر جانتے ہیں، اس شخص نے کہا: اے امیرالمومنین (اس کا اشارہ معاویہ کی طرف تھا) آپ ہی جواب دیں کیونکہ آپ کا جواب مجھے علیؑ کے جواب سے زیادہ پسند ہے۔ معاویہ نے کہا: تو نے بہت بری بات کہی۔ اس کے بعد معاویہ نے کہا: پیغمبرؐ نے علیؑ کے بارے میں یہ جملہ فرمایا ہے: انت منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی، اس کے بعد معاویہ نے کہا: جب کبھی عمر کو کوئی مشکل درپیش ہوتی تھی تو وہ علیؑ کی طرف رجوع کرتے تھے۔[1]

ابوبکر بغدادی اپنی کتاب "تاریخ بغداد" میں تحریر کرتے ہیں: عمر نے ایک دفعہ ایک شخص کو دیکھا کہ وہ علی کو برا کہہ رہا ہے۔ عمر نے کہا: میرا خیال ہے کہ تو ایک منافق انسان ہے کیونکہ میں نے پیغمبرؐ کو فرماتے سنا ہے: انما علی منی بمنزلة هارون من موسیٰ الا انه لا نبی بعدی۔[2]

حدیث منزلت کے سات مواقع

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ حضرت رسول اللہؐ نے اس حدیث کو جیسا کہ عام طور سے خیال کیا جاتا ہے صرف جنگِ تبوک کے موقع پر نہیں فرمایا بلکہ دیگر متعدد مقامات پر بھی آپ نے علیؑ کے بارے میں یہ جملہ فرمایا ہے، ان مقامات میں سے بعض حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ **پہلی مواخات کے دن:** یعنی جب مکہ میں رسول اللہؐ نے پہلی مرتبہ اپنے اصحاب کے درمیان بھائی چارہ قرار دیا، اس وقت آنحضرتؐ نے علیؑ کو اپنے بھائی کی حیثیت سے منتخب کیا اور فرمایا:

---

[1] ذخائر عقبیٰ ص ۷۹ طبع مکتبۂ قدس، صواعق محرقہ ص ۱۷۷ طبع مکتبہ قاہرہ۔

[2] تاریخ بغداد جلد ۷، ص ۴۵۲ طبع مکتبہ سعادت۔

انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی[1]

۲۔ دوسری مواخات کے دن : یعنی دوسری دفعہ جب آنحضرتؐ نے مدینہ میں مہاجرین و انصار کے درمیان برادری قائم کی، یہاں بھی آپؐ نے اپنے لیے علیؑ کا انتخاب کیا اور ان کے لیے یہ جملہ ارشاد فرمایا :

وانت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ غیر انہ لا نبی بعدی وانت اخی و وارثی[2]

۳۔ ام سلیم سے فرمایا : "ام سلیم" جو تاریخ اسلام کی ایک مشہور خاتون اور مبلغہ اسلام ہیں رسول اسلام کی صحابیات میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے باپ اور بھائی رسول اللہؐ کی نصرت میں شہید ہو چکے ہیں، چونکہ ان کے شوہر نے اسلام قبول نہ کیا اس لیے اس سے جدا ہو گئی تھیں۔ ان کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ خود حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے مکان پر ان سے ملنے آیا کرتے تھے (اور ان کو تسلی دیتے تھے) ایک روز آنحضرتؐ نے ان سے فرمایا :

یا ام سلیم : ان علیاً لحمہ من لحمی و دمہ من دمی وھو منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ[3]

اے ام سلیم ! علیؑ کا گوشت میرے گوشت سے ہے اور اس کا خون میرے خون سے ہے، اور اس کی نسبت مجھ سے وہی ہے جو ہارون کی موسیٰ سے تھی۔

۴۔ اصحاب کی ایک جماعت کے سامنے فرمایا : ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ ایک روز عمر بن خطاب نے مجھ سے کہا :

علیؑ کا نام برائی کے ساتھ نہ لینا کیونکہ میں نے ان کے بارے میں تین جملے ایسے سُنے ہیں کہ ان میں سے ایک اگر میرے بارے میں ہوتا تو وہ ہر اس چیز سے میرے لیے محبوب تر تھا جس پر سورج چمکتا ہے، ایک مرتبہ میں، ابوبکر، ابو عبیدہ اور اصحاب کی ایک جماعت ہم سب پیغمبر کے پاس تھے اور پیغمبرؐ علیؑ پر تکیہ کیے ہوئے تھے، اس وقت رسول اللہؐ نے علیؑ کے شانہ پر اپنا ہاتھ مارا اور فرمایا :

انت یا علی اول المؤمنین ایمانا، و اولھم اسلاما ثم قال انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ :

---

[1] کنز العمال حدیث ۹۱۰ جلد ۵ صفحہ ۴۰ و جلد ۶ صفحہ ۳۹۰۔

[2] منتخب کنز العمال (در حاشیہ مسند احمد) جلد ۵ مسند احمد صفحہ ۳۱۔

[3] کنز العمال جلد ۶ صفحہ ۱۹۴۔

یعنی اے علی تم وہ پہلے مومن ہو جو ایمان لاتے، اور پہلے مسلمان ہو جو اسلام لاتے،
اور تمہاری نسبت مجھ سے وہی ہے جو ہارون کی نسبت موسٰی سے تھی[1]

۵۔ نسائی کی روایت : نسائی اپنی کتاب خصائص میں نقل کرتے ہیں کہ علی، جعفر اور زید کے درمیان حضرت حمزہ کے بیٹے کی سرپرستی کے بارے میں گفتگو ہو رہی تھی ہر ایک کی خواہش یہ تھی کہ یہ خدمت وہی انجام دے اس موقع پر پیغمبرؐ نے علی سے فرمایا: انت منی بمنزلة هارون من موسٰی[2]

۶۔ مسجد نبوی کے دروازوں کی بندش کے موقع پر : جس روز حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ جس جس کے دروازے مسجد (یعنی مسجد رسول) کے اندر ہیں وہ سب بند کر دیے جائیں صرف علیؑ کا دروازہ باقی رہے، جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ اس وقت رسول اللہؐ نے علیؑ سے فرمایا:

انہ یحل لک من المسجد ما یحل لی وانك منی بمنزلة
هارون من موسٰی الا انہ لا نبی بعدی[3]

"جو چیز میرے لیے مسجد میں حلال ہے (اے علی) وہ تمہارے لیے بھی حلال ہے
کیونکہ تم میرے لیے ویسے ہی ہو جیسے ہارون موسٰی کے لیے تھے"

مذکورہ بالا چھ مواقع جنگ تبوک کے علاوہ ہیں اور ان سب کو ہم نے اہلسنت کی مشہور کتابوں سے نقل کیا ہے ورنہ شیعہ کتب میں اس سے زیادہ مواقع کا تذکرہ ہے جہاں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بارہا یہی حدیث حضرت علیؑ کے بارے میں فرمائی ہے۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ اچھی طرح واضح ہوگیا کہ "حدیث منزلت" ایسی حدیث نہیں ہے جو صرف واقعہ تبوک سے ساتھ مخصوص ہو بلکہ یہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت علیؑ کے متعلق ایک عام اور ہمیشہ باقی رہنے والا فرمان ہے۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض علمائے اہلسنت جیسے "آمدی" نے اس حدیث کے متعلق جو یہ کہا ہے کہ یہ حدیث ایک خاص حکم پر مشتمل ہے اور اس سے صرف جنگ تبوک کے موقع پر حضرت علی کی جانشینی ثابت ہوتی ہے اور اس کا ربط دوسرے مقامات سے نہیں ہے، یہ خیال بالکل بے بنیاد

---

[1] کنز العمال جلد ۹ صفحہ ۳۹۵۔

[2] خصائص نسائی صفحہ ۱۹۔

[3] ینابیع المودہ باب ۱۷ کا آخری حصہ صفحہ ۸۸ طبع دوم دار الکتب العراقیہ۔

ہے کیونکہ حضرت رسول اللہؐ نے مختلف مناسبتوں سے مختلف مواقع پر اس جملہ کی تکرار کی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت علیؑ کے بارے میں حضرت رسول اللہؐ کا ایک عام حکم تھا۔

حدیث منزلت کے مفہوم کی وسعت

اگر بغیر کسی تعصب کے حدیث مذکورہ بالا کے معنی میں غور کریں اور ہر قسم کے تعصب کی عینک اتار دیں تو ہمیں یہ حدیث بتلائے گی کہ نبوت کو چھوڑ کر جتنے مناصب حضرت ہارون کو حضرت موسیٰؑ کی نسبت سے حاصل تھے وہ سب حضرت علی علیہ السلام کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حاصل تھے کیونکہ حدیث کے الفاظ عام ہیں اور "الا انہ لا نبی بعدی" کے استثناء نے اس عموم کی مزید تاکید کر دی ہے۔ اس کے علاوہ حدیث میں اور کسی قسم کی قید اور شرط نہیں ہے جس کی وجہ سے تخصیص کا قائل ہوا جاسکے۔ بنا برین اس حدیث سے امور ذیل کا استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ حضرت علی علیہ السلام بعد پیغمبرؐ امت محمدی میں سب سے افضل و اعلیٰ ہیں بالکل اسی طرح جس طرح حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کے بعد امت موسوی میں سب سے افضل و اعلیٰ تھے۔

۲۔ حضرت علی علیہ السلام وزیر پیغمبرؐ اور ان کے خاص معاون، ان کے مددگار اور رسول اللہؐ کی رہبری کے کام میں ان کے شریک تھے کیونکہ قرآن کی رُو سے یہ سب منصب حضرت ہارونؑ کے لیے ثابت ہیں جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کی زبانی ارشاد ہوتا ہے:

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ۙ هٰرُوْنَ اَخِي ۙ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۙ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۙ (طٰہٰ ۲۹ تا ۳۲)۔

میرے خاندان سے میرا ایک وزیر قرار دے، میرے بھائی ہارون کو، میری قوت کو اس کے ذریعہ بڑھا دے، اور اسے میرے کام میں شریک کر دے۔

۳۔ حضرت علی علیہ السلام عمومی اسلامی اخوت کے علاوہ پیغمبرؐ کی خصوصی و معنوی اخوت کے بھی حامل تھے۔

۴۔ علی علیہ السلام خلیفہ اور جانشین پیغمبرؐ تھے۔ ان کے ہوتے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ بنے، جس طرح حضرت ہارونؑ کے ہوتے کوئی دوسرا خلیفہ نہ تھا۔

حدیثِ منزلت کے متعلق کچھ سوال اور ان کے جواب

بعض متعصبین نے حدیث مذکور پر کچھ ایسے واہی اعتراض کیے ہیں جو واقعاً اس لائق نہیں کہ انہیں کتابوں میں لکھا جائے۔ بس اس طرح کے اعتراضوں کو سُن کر صرف یہ افسوس کرنا چاہیئے کہ بعض لوگ کتنی جلدی یکطرفہ رائے قائم کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی قوتِ فیصلہ ختم ہو جاتی ہے اور وہ روشن حقائق کو نہیں دیکھ سکتے لیکن وہ اعتراضات جو تحریر کیے جانے اور گفتگو کیے جانے کے لائق ہیں ان میں سے بعض کو ہم اس جگہ حوالۂ قلم کرتے ہیں۔

پہلا اعتراض: یہ حدیث صرف ایک محدود اور خاص حکم بیان کرتی ہے کیونکہ یہ غزوۂ تبوک کے موقع پر وارد ہوئی ہے۔ وہ بھی اس وقت جبکہ حضرت علیؑ عورتوں اور بچوں کے درمیان مدینہ میں باقی رہنے پر کبیدہ خاطر تھے اس موقع پر حضرت رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کا دل رکھنے کے لیے یہ جملہ فرمایا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ تمہاری حکومت و سرداری صرف ان عورتوں اور بچوں تک محدود ہے!!

اس اشکال کا جواب گذشتہ بحثوں سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کیونکہ اس معترض کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ یہ حدیث صرف جنگِ تبوک کے موقع پر صادر ہوئی ہے۔ بلکہ یہ ثابت ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کے متعلق یہ جملہ متعدد مواقع پر بطور ایک قانون کلی کے ارشاد فرمایا تھا جس میں سے سات مواقع کو کتبِ علمائے اہلسنت سے ہم اپنی گذشتہ بحثوں میں نقل کر آئے ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت علیؑ کا مدینہ میں رہنا صرف بچوں اور عورتوں کی حفاظت کے لیے نہ تھا، کیونکہ اگر یہی مقصد ہوتا تو اسے تو دوسرے بہت سے افراد پورا کر سکتے تھے۔ اس کے لیے حضرت علیؑ جیسے شجاع اور بہادر کی کیا ضرورت تھی وہ بھی ایسے موقع پر جبکہ رسول اللہؐ کو ایک زبردست معرکہ درپیش تھا (شاہِ روم شرقی سے جنگ کا معرکہ) ظاہر ہے کہ علیؑ کو اپنی جگہ پر مقرر کرنے سے غرض یہ تھی کہ وہ دشمن جو مدینہ کے اطراف میں تھے اور وہ منافقین جو خود مدینہ کے اندر موجود تھے آنحضرتؐ کی طولانی غیبت سے فائدہ اٹھا کر مدینہ پر قابض نہ ہو جائیں، جو شخص اس اہم مرکز کی حفاظت کر سکتا تھا وہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی ذات والا صفات تھی۔

دوسرا اعتراض: یہ بات سب کو معلوم ہے اور تاریخ کی مشہور کتابوں میں بھی لکھی ہے کہ حضرت ہارونؑ حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں وفات پا گئے تھے لہٰذا علیؑ کی ہارونؑ سے تشبیہ اس بات کو ثابت نہیں کرتی کہ علیؑ پیغمبرؐ کے بعد ان کے جانشین اور خلیفہ تھے۔

شاید یہ اعتراض ان تمام اعتراضوں میں زیادہ اہم ہے جو اس حدیث پر کیے جاتے ہیں لیکن

اس حدیث کا آخری ٹکڑا ۔ الآ انہ لا نبی بعدی۔ (میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا) اس اعتراض کا روشن جواب ہے کیونکہ پیغمبرؐ کے اس فرمان ۔ انت منی بمنزلۃ ھارون من موسٰی۔ کا تعلق اگر صرف آنحضرتؐ کی حیات سے ہوتا اور آپؐ کے بعد پر اس کی کوئی نظر نہ ہوتی تو ۔ الا انہ لا نبی بعدی ۔ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ اگر بات صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات کی ہو تو آپؐ کے بعد کی کوئی بات کہنا بالکل نامناسب ہے (اصطلاحاً اسے یوں کہنا چاہیئے کہ اس طرح کا استثناء منقطع ہو جاتے گا جو خلاف ظاہر ہے۔)

بنا بریں اس طرح کے استثناء کا اس حدیث میں ہونا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ پیغمبرؐ کے فرمان کا تعلق آپؐ کی وفات کے بعد کے زمانہ سے بھی ہے، اِلّا یہ کہ کسی کو شبہ نہ ہو اور کچھ لوگ علیؑ کو بعد از نبی، نبی نہ ماننے لگیں اس لیے حضرتؐ نے فرمادیا کہ تم ان تمام مرتبوں کے مالک ہو سوائے اس کے کہ تم میرے بعد نبی نہ ہوگے۔ بنا بریں کلام پیغمبرؐ کا یہ مفہوم ہوگا کہ یا علی! تم ہارون کے تمام مدارج و مناصب کے مالک ہو، نہ صرف میری زندگی میں بلکہ میری وفات کے بعد بھی تمہارے یہ درجے اور منصب باقی رہیں گے (سوائے مقام نبوت)۔

اس طرح یہ واضح ہوگیا کہ حضرت علیؑ کی حضرت ہارونؑ سے تشبیہ بہ لحاظ مقامات ہے نہ بہ لحاظ مدت مقامات۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ بھی اگر بعد حضرت موسٰیؑ زندہ رہ جاتے تو مسلمہ طور سے حضرت موسٰیؑ کے جانشین بھی ہوتے اور نبوت پر بھی باقی رہتے۔

لہٰذا اگر قرآن کے ان نصوص کو دیکھا جائے جن میں قرآن نے حضرت ہارونؑ کے لیے حضرت موسٰیؑ کی وزارت و معاونت کے درجہ کو ثابت کیا ہے، ان کو حضرت موسٰیؑ کے کار رہبری میں شریک بھی قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک پیغمبر بھی تھے، تو معلوم ہوگا کہ یہ تمام مناصب سوائے پیغمبری کے حضرت علی علیہ السلام کے لیے ثابت ہیں حتٰی کہ وفات پیغمبر کے بعد بھی جس کی تائید ۔ الآ انہ لا نبی بعدی ۔ کے جملہ سے ہوتی ہے۔

تیسرا اعتراض: ایک اور اشکال اس حدیث پر یہ وارد کیا جاتا ہے کہ اس حدیث کے ذریعہ استدلال کا لازمہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے لیے منصب ولایت و رہبریٔ امت رسول اللہؐ کی حیات کے زمانہ میں بھی مانا جائے جبکہ دو امام اور دو رہبر ایک زمانے میں ممکن نہیں ہیں!

لیکن اگر ایک نکتہ پر توجہ کی جائے تو اس اعتراض کا جواب بھی مل جاتا ہے اور وہ یہ کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت ہارونؑ بھی حضرت موسٰیؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل کی رہبری کے منصب کے مالک تھے، لیکن ایک مستقل اور علیحدہ رہبر نہ تھے بلکہ آپ ایک ایسے رہبر تھے جو حضرت موسٰیؑ کے زیر نظر اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ اسی طرح حضرت علیؑ بھی پیغمبرؐ کی زندگی میں امت مسلمہ کی رہبری میں ان

کے معاون تھے، لہٰذا آپ کی وفات کے بعد آپ کی حیثیت ایک مستقل رہبر کی ہو جاتے گی۔

بہرحال ۔ حدیث منزلت ۔ جو از روئے سند اسلام کی مضبوط ترین روایات میں سے ایک ہے اور اہلسنت کے تمام گروہوں کی کتابوں میں بلا استثناء اس کا ذکر ہے، دلالت کے لحاظ سے بھی اہل انصاف کی نظر میں حضرت علی علیہ السلام کی تمام امت پر فضیلت، اسی طرح آپ کی خلافت بلافصل ثابت کرنے کے لیے کافی و وافی ہے۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ بعض لوگوں نے نہ صرف حدیث کی دلالت کو خلافت پر قبول نہیں کیا ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ اس حدیث سے حضرت علیؑ کی کمترین فضیلت بھی ظاہر نہیں ہوتی ہے یہ بات واقعاً حیرت ناک ہے۔

۱۴۳ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ
رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ
اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى
رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ
اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

۱۴۳ اور جس وقت موسیٰ ہماری میعادگاہ میں آئے اور ان کے پروردگار نے ان سے بات کی، انہوں نے عرض کی کہ اے پروردگار! تو اپنے کو مجھے دکھلا دے تاکہ مَیں تجھے دیکھ لوں (پروردگار نے) کہا تم مجھے ہرگز نہ دیکھ پاؤ گے لیکن (ذرا) پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو مجھے دیکھ سکو گے لیکن جب پروردگار نے پہاڑ پر (اپنا) جلوہ کیا تو اسے (گرا کر) زمین کے برابر کر دیا اور موسیٰ بے ہوش

ہو کر گر گئے، جب وہ ہوش میں آتے تو انہوں نے عرض کی : خدایا ! تُو اس بات سے منزہ ہے (کہ تجھے کوئی دیکھ سکے) مَیں تیری جانب واپس آتا ہوں مَیں مومنوں میں سے پہلا ہوں۔

تفسیر

دیدارِ پروردگار کی خواہش

ان آیات میں نیز اس کے بعد کی آیات میں بنی اسرائیل کی زندگی کے بعض دیگر مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے حضرت موسیٰؑ سے بڑے اصرار کے ساتھ یہ خواہش کی کہ وہ خدا کو دیکھیں گے۔ اگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو وہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے ان کے ستر آدمیوں کا انتخاب کیا اور انہیں اپنے ہمراہ پروردگار کی میعادگاہ کی طرف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر ان لوگوں کی درخواست کو خدا کی بارگاہ میں پیش کیا۔ خدا کی طرف سے اس کا ایسا جواب ملا جس سے بنی اسرائیل کے لیے یہ بات اچھی طرح سے واضح ہوگئی۔ اس واقعہ کا کچھ حصّہ سورۂ بقرہ کی آیات ۵۵ اور ۵۶ میں اور کچھ حصّہ سورۂ نساءؑ کی آیت ۱۵۳ میں اور کچھ حصّہ زیرِ بحث آیات میں اور باقی حصّہ اسی سورہ کی آیت ۱۵۵ میں بیان کیا گیا ہے۔

زیرِ بحث آیات میں پہلے ارشاد ہوتا ہے : جس وقت موسیٰ ہماری میعادگاہ میں آئے اور ان کے پروردگار نے ان سے باتیں کیں تو انہوں نے کہا : اے پروردگار خود کو مجھے دکھلادے تاکہ مَیں تجھے دیکھ لوں (ولما جآء موسیٰ لمیقاتنا وکلمہٗ ربہٗ قال رب ارنی انظر الیک)۔

لیکن موسیٰ نے فوراً خدا کی طرف سے یہ جواب سنا : تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے (قال لن ترانی)۔

"لیکن پہاڑ کی جانب نظر کرو اگر وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تب مجھے دیکھ سکو گے" (ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہٗ فسوف ترانی)۔

جس وقت خدا نے پہاڑ پر جلوہ کیا تو اسے فنا کر دیا اور اسے زمین کے برابر کر دیا (فلما تجلّی ربہٗ للجبل جعلہٗ دکًّا)[1]

---

[1] "دکّ" کے معنی دراصل صاف اور ہموار زمین کے ہیں بنا بریں اس جملے "جعلہ دکا" سے مراد یہ ہے کہ پہاڑ کو اس تجلی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

موسیٰ نے جب یہ ہولناک منظر دیکھا تو ایسا اضطراب لاحق ہوا کہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے (وخر موسٰی صعقا)۔

۰اور جب ہوش میں آئے تو خدا کی بارگاہ میں عرض کی پروردگارا! تو منزہ ہے، میں تیری طرف پلٹتا ہوں، اور توبہ کرتا ہوں اور میں پہلا ہوں مومنین میں سے" (فلما افاق قال سبحانک تبت الیک وانا اول المؤمنین)۔

چند قابلِ غور نکات

۱۔ **حضرت موسٰی نے رویت کی خواہش کیوں کی؟** : یہاں پر پہلا سوال جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ جیسے اولوالعزم نبی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ذات خداوندی قابلِ دید نہیں ہے کیونکہ نہ تو وہ جسم ہے، نہ اس کے لیے کوئی مکان و جہت ہے اس کے باوجود انہوں نے ایسی خواہش کیسے کر دی جو فی الحقیقت ایک عام انسان کی شان کے لیے بھی مناسب نہیں ہے؟

اس سوال کے جواب میں اگرچہ مفسرین نے مختلف جواب دیئے ہیں لیکن سب سے واضح جواب یہ ہے کہ حضرت موسٰی نے یہ خواہش دراصل اپنی قوم کی طرف سے کی تھی کیونکہ بنی اسرائیل کے جہلاء میں سے ایک گروہ کا یہ اصرار تھا کہ وہ خدا کو کھلم کھلا دیکھیں گے تب جا کے ایمان لائیں گے (سورہ نساء کی آیت ۱۵۳ اس مطلب کی گواہ ہے)۔ حضرت موسٰی کو اللہ کی جانب سے یہ حکم ملا کہ وہ اس درخواست کو خدا کی بارگاہ میں پیش کریں تاکہ سب اس کا جواب سن لیں۔ کتاب عیون اخبار الرضا میں امام رضا علیہ السلام سے جو حدیث مروی ہے وہ بھی اس مطلب کی تائید کرتی ہے[1]

اس تفسیر کے روشن قرائن میں سے ایک یہ ہے کہ اسی سورہ کی آیت ۱۵۵ میں وارد ہوا ہے کہ اس ماجرا کے بعد حضرت موسیٰ نے خدا کی بارگاہ میں عرض کی: اتھلکنا بما فعل السفہآء منا: "کیا تو اس عمل کی وجہ سے جو ہمارے نادانوں نے کیا ہے ہلاک کر دے گا؟ اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ حضرت موسیٰ نے یہ خواہش نہیں کی تھی بلکہ جو ستر آدمی ان کے ساتھ میعاد گاہ میں گئے تھے ان کی بھی یہ خواہش نہ تھی وہ حضرت موسٰی کے منتخب شدہ علماء بنی اسرائیل تھے ان کے لانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ واپس جا کر اپنے مشاہدات ان سے بیان کریں۔

۲۔ **کیا خدا کو دیکھا جانا ممکن ہے؟** : آیہ مذکورہ بالا میں ہم پڑھتے ہیں کہ خدا نے حضرت

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ : نے اس طرح صاف اور نرم کر دیا کہ وہ ریزہ ریزہ ہو کر صاف و ہموار زمین کی طرح ہو گیا۔ حتیٰ کہ بعض روایات میں وارد ہوا ہے کہ وہ پہاڑ کئی حصوں میں تقسیم ہو کر مختلف جہات میں اڑ گیا، یا یہ کہ پورے کا پورا زمین کے اندر سما گیا۔

[1] تفسیر نور الثقلین جلد دوم صفحہ ۶۵۔

موسٰیؑ سے فرمایا: پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ پر باقی رہا تو مجھے دیکھ سکو گے: "آیا اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا دیکھا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس تعبیر کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات ناممکن ہے جیسے ایک دوسری جگہ قرآن میں آیا ہے:

حتّٰی یلج الجمل فی سم الخیاط

کافر جنت میں نہیں جائیں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ سے گزر جائے۔

چونکہ خدا کے جلوہ کے مقابلہ میں پہاڑ کا اپنی جگہ پر باقی رہنا محال تھا اس لیے یہ تعبیر استعمال کی گئی۔

۳۔ **خدا کے جلوہ سے کیا مراد ہے؟**: اس جگہ مفسّرین کے درمیان بہت بحث ہوئی ہے لیکن جو بات آیات کے موضوع سے واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ خداوندکریم نے اپنی مخلوقات میں سے کسی ایک کا پرتو پہاڑ پر ڈال دیا تھا (اور اس کے آثار کا آشکار ہونا خود اس کے آشکار ہونے کی طرح ہے) سوال یہ ہے کہ آیا یہ مخلوق خدا کی عظیم آیات میں سے کوئی ایسی آیت تھی جو ہمارے لیے ناشناختہ ہے؟ یا اٹامک انرجی کا کوئی عظیم نمونہ تھا یا مرموز لہروں میں سے کوئی زلزلہ افگن لہر تھی یا کوئی عظیم صاعقہ[1] تھی جو اس پہاڑ پر گری اور اس سے دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں اور مہیب آواز نکلی اور عظیم طاقت پیدا ہوئی جس کی وجہ سے پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔

گویا خداوندکریم اس عمل سے دو چیزیں حضرت موسٰیؑ اور بنی اسرائیل کو دکھلانا چاہتا تھا:

اوّل: یہ کہ بندہ جب خدا کی ایک مخلوق کو نہیں دیکھ سکتا تو وہ خالق کو کیسے دیکھ سکتا ہے۔

دوم: یہ کہ یہ مخلوق جو کوئی بھی تھی اللہ کی ایک عظیم آیت تھی اور خود قابلِ رویت نہ تھی بلکہ اس کے آثار دیکھے گئے تھے۔ جیسے زلزلہ عظیم، مہیب آواز، روشنی لیکن ان چیزوں کی اصل جو ان آثار کا مرکز تھا چاہے وہ مرموز امواج ہوں یا کوئی ایٹمی طاقت ہو، قابلِ رویت نہ تھی نہ اسے حواس سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود کیا کوئی اس طاقت کے وجود سے انکار کر سکتا ہے یا اس کے وجود میں شک کر سکتا ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ چونکہ یہ طاقت دکھائی نہیں دیتی صرف اس کے آثار دکھائی دیتے ہیں اس لیے ہم اس پر ایمان نہیں لاتے۔ جب ایک مخلوق کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا تو خدائے بزرگ کے بارے میں ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ وہ قابلِ مشاہدہ نہیں ہے اس لیے ہم اس پر

---

[1] "صاعقہ" اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ بادل کے ٹکڑوں اور کرۂ زمین کے درمیان بجلی (ELECTRICITY) کا تبادلہ ہوتا ہے وہ بادل جن کے اندر مثبت بجلی ہوتی ہے جب زمین جس میں منفی بجلی مخفی ہے کے نزدیک پہنچتے ہیں تو ان کے درمیان یعنی سطح زمین کے نزدیک ایک شعلہ نکلتا ہے جو بہت خطرناک اور ہلاکت آفرین ہوتا ہے لیکن "برق" اور "رعد" بادل کے دو ٹکڑوں کے درمیان الیکٹریسی کے تبادلے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ ایک بادل میں مثبت اور دوسرے میں منفی الیکٹریسٹی ہوتی ہے اور چونکہ یہ ٹکراؤ آسمان پر ہوتا ہے اس لیے اس سے سوائے ہوائی جہازوں کے اور کسی کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔

ایمان نہیں لاتے جبکہ اس کے آثار سے جہان بھرا ہوا ہے۔

اس آیت کے بارے میں ایک احتمال اور بھی ذکر کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ حضرت موسٰیؑ نے واقعاً اپنے واسطے تمنائے دید کی تھی لیکن ان کا مقصد ان آنکھوں سے دیکھنا نہ تھا جس کا لازمہ جسمیت ہے اور یہ حضرت موسٰیؑ کے مقام کے مناسب نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد خدا کا مشاہدۂ باطنی تھا ایک روحانی اور کامل فکری دیدار تھا، کیونکہ اس معنی میں کلمۂ رویت بہت استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں: میں اپنے میں یہ قدرت دیکھتا ہوں کہ اس کام کو انجام دوں۔ حالانکہ "قدرت" قابلِ دید نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ میں اس حالت کو اپنے میں پاتا ہوں۔

حضرت موسٰیؑ یہ چاہتے تھے کہ شہود و معرفت کے اس مقام پر فائز ہوں جس کا دنیا میں حاصل کرنا محال ہے۔ یہ مرتبہ صرف آخرت کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ وہ عالم شہود و بروز ہے۔

لیکن خدا نے حضرت موسٰیؑ کے جواب میں فرمایا: اس طرح کی رویت تمہارے لیے دنیا میں ہرگز ممکن نہیں ہے۔ اس مطلب کو ثابت کرنے کے لیے اللہ نے پہاڑ پر جلوہ دکھایا جس کی وجہ سے پہاڑ چکنا چور ہوگیا۔ آخر میں حضرت موسٰیؑ نے اپنی اس خواہش سے پشیمانی اور توبہ کا اظہار کیا[1]

لیکن یہ تفسیر کئی جہت سے زیرِ بحث آیت کے ظاہر کے خلاف ہے اور اس کا لازمہ چند جہت سے مجاز کا استعمال ہے[2] علاوہ ازیں یہ تفسیر ان کئی احادیث کے بھی خلاف ہے جو اس آیت کی شرح میں وارد ہوئی ہیں لہٰذا وہی پہلی تفسیر ہی درست ہے۔

۴۔ **حضرت موسٰیؑ نے کس چیز سے توبہ کی؟** : اس بارے میں آخری سوال جو سامنے آتا ہے یہ ہے کہ جب حضرت موسٰیؑ ہوش میں آئے تو انہوں نے کیوں کہا۔ "سبحانك تبت اليك" حالانکہ انہوں نے کوئی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ کیونکہ اگر انہوں نے یہ درخواست اپنی امت کی طرف سے کی تھی تو اس میں ان کا کیا قصور تھا، اللہ کی اجازت سے انہوں نے یہ درخواست خدا کے سامنے پیش کی اور اگر اپنے لیے شہود باطنی کی تمنا کی تھی تو یہ بھی خدا کے حکم کی مخالفت نہ تھی۔ لہٰذا توبہ کس بات کی تھی؟۔

دو طرح سے اس سوال کا جواب دیا جا سکتا ہے:

---

[1] خلاصہ از تفسیر میزان جلد ۸ صفحہ ۲۴۹ تا صفحہ ۲۵۴۔

[2] کیونکہ مذکورہ تفسیر مخالف ہے کلمۂ "رویت" اور جملہ "لن ترانی" اور جملۂ "اتهلكنا بما فعل السفهاء منا" کی۔ اس کے علاوہ یہ کہ شہود باطنی کی درخواست کوئی بُری درخواست نہ تھی جس کی وجہ سے حضرت موسٰیؑ کو توبہ کرنے کی حاجت ہو کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے بھی معاد کے متعلق خدا سے یہی درخواست کی تھی اور خدا نے اس کا مثبت جواب دیا تھا، اور اگر شہود باطنی کے متعلق خدا کا جواب منفی بھی ہو تب بھی اس پر مؤاخذہ (عقاب) کرنے کی دلیل نہیں ہوگا۔

اول: یہ کہ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کی نمائندگی کے طور پر خدا سے یہ سوال کیا تھا، اس کے بعد جب خدا کی طرف سے سخت جواب ملا جس میں اس سوال کی غلطی کو بتلایا گیا تھا تو حضرت موسیٰ نے توبہ بھی انہی کی طرف سے کی تھی۔

دوم: یہ کہ حضرت موسیٰ کو اگرچہ یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل کی درخواست کو پیش کریں لیکن جس وقت پروردگار کی تجلی کا واقعہ رونما ہوا اور حقیقت آشکار ہوگئی تو حضرت موسیٰ کی یہ ماموریت ختم ہوچکی تھی اب حضرت موسیٰ کو چاہیئے کہ پہلی حالت (یعنی قبل از ماموریت) کی طرف پلٹ جائیں اور اپنے ایمان کا اظہار کریں تاکہ کسی کے لیے جائے شبہ باقی نہ رہے، لہذا اس حالت کا اظہار موسیٰ نے اپنی توبہ اور اس جملہ " انی تبت الیلث وانا اول المؤمنین " سے کیا۔

۵۔ خدائے متعال کسی صورت میں قابل رویت نہیں ہے: یہ آیت قرآن کی ان آیات میں سے ہے جو اس امر کی روشن دلیل ہیں کہ خدا کی رویت ممکن نہیں ہے کیونکہ لفظ " لن " بربنائے مشہور دائمی نفی کے لیے آتا ہے۔ بنا بریں اس جملہ " لن ترانی " کا مفہوم یہ ہے کہ تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے نہ اس جہان میں نہ اُس جہان میں۔

اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کوئی اس بات کو ماننے سے انکار کر دے کہ " لن " نفیٔ ابد کے لیے آتا ہے تب بھی آیت کا اطلاق نفیٔ رویت کے لیے باقی رہتا ہے کیونکہ آیت میں رویت کی بغیر کسی قید و شرط کے نفی کی گئی ہے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ ذات خداوندی کسی زمانے میں اور کسی حال میں قابلِ رویت نہیں ہے۔

عقلی دلائل بھی ہماری رہنمائی اسی امر کی طرف کرتے ہیں کہ اس کی رویت محال ہے کیونکہ رویت اجسام کے ساتھ مخصوص ہے۔ لہذا اگر بعض آیات قرآنی یا روایات اسلامی میں " لقائے پروردگار " کا ذکر ہوا ہے تو اس سے مراد وہی " چشم باطنی " اور " دیدۂ خرد " ہے کیونکہ قرینۂ عقلی و نقلی اس مدعا کے بہترین شاہد ہیں (سورۂ انعام کی آیت ۱۰۲ کے ذیل میں بھی ہم اس موضوع پر گفتگو کر آئے ہیں)۔ (تفسیر نمونہ جلد ۵)

(۱۴۴) قَالَ يٰمُوْسٰۤى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۖ فَخُذْ مَاۤ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝

(۱۴۵) وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا

سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

ترجمہ

(۱۴۴) (خدا نے) کہا: اے موسٰی مَیں نے تمہیں لوگوں پر اپنی رسالت کے ذریعے اور (تم سے) اپنے کلام کے ذریعے منتخب کیا، پس جو کچھ مَیں نے تمہیں دیا ہے اسے لے لو اور شکر گزاروں میں سے ہو جاؤ۔

(۱۴۵) اور ہم نے ان کے لیے الواح میں ہر قسم کی نصیحت لکھی تھی اور ہر چیز کا بیان کیا تھا۔ پس (ہم نے ان سے کہا کہ) اسے مضبوطی سے تھام لو اور اپنی قوم کو حکم دو کہ وہ اچھی طرح اس پر عمل کریں (اور وہ لوگ جو مخالفت کریں ان کا انجام دوزخ ہے) جلد ہی فاسقوں کی (یہ) جگہ ہم تمہیں دکھلا دیں گے۔

تفسیر

الواحِ توریت

آخرکار اس عظیم میعادگاہ میں اللہ نے حضرت موسٰیؑ پر اپنی شریعت کے قوانین نازل فرمائے۔

پہلے ان سے فرمایا: اے موسٰی! مَیں نے تمہیں لوگوں پر منتخب کیا ہے، اور تم کو اپنی رسالتیں دی ہیں، اور تم کو اپنے ساتھ گفتگو کا شرف عطا کیا ہے (قال یا موسٰیٓ انی اصطفیتک علی الناس برسالاتی وبکلامی)۔

اب جبکہ ایسا ہے تو، جو مَیں نے تم کو حکم دیا ہے اسے لے لو اور ہمارے اس عطیہ پر شکر کرنے والوں میں سے ہو جاؤ (فخذ مآ اٰتیتک وکن من الشاکرین)۔

کیا اس آیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسٰیؑ کو خدا سے کلام کرنے کا جو شرف حاصل ہؤا وہ صرف انہی کا طرۂ امتیاز تھا کسی دوسرے نبی کو یہ شرف حاصل نہیں ہؤا؟

حق یہ ہے کہ یہ آیت اس مطلب کا اثبات نہیں کرتی بلکہ لفظ ۔ رسالات۔ کا قرینہ اس بات کا مظہر ہے کہ یہ دونوں امتیاز عام انسانوں کے مقابلے میں تھے کیونکہ رسالت کا شرف صرف

حضرت موسیٰ کے لیے مخصوص نہ تھا۔

اس کے بعد اضافہ کیا گیا ہے کہ: ہم نے جو الواح موسیٰ پر نازل کی تھیں ان پر ہر موضوع کے بارے میں کافی نصیحتیں تھیں اور ضرورت کے مسائل کی شرح اور بیان تھا (وکتبنا لہ فی الالواح من کل شیء موعظۃ وتفصیلا لکل شیء)۔

اس کے بعد ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ "بڑی توجہ اور قوتِ ارادی کے ساتھ ان فرامین کو اختیار کرو" (فخذھا بقوۃ)۔

"اور اپنی قوم کو بھی حکم دو کہ ان میں جو بہترین ہیں انہیں اختیار کریں" (وأمر قومك یأخذوا باحسنھا)۔

اور انہیں خبردار کر دو کہ ان فرامین کی مخالفت اور ان کی اطاعت سے فرار کرنے کا نتیجہ دردناک ہے اور اس کا انجام دوزخ ہے اور "میں جلد ہی فاسقوں کی جگہ تمہیں دکھلا دوں گا" (ساوریکم دار الفاسقین)۔

چند اہم نکات

۱۔ **الواح کس چیز کی بنی ہوئی تھیں:** اس آیت کا ظاہر یہ ہے کہ خداوند کریم نے حضرت موسیٰ پر جو الواح نازل کی تھیں ان میں توریت کی شریعت اور قوانین لکھے ہوئے تھے، ایسا نہ تھا کہ یہ لوحیں حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں تھیں اور اس میں فرامین منعکس ہو گئے تھے۔ اب رہا یہ سوال کہ یہ لوحیں کیسی تھیں؟ کس چیز کی بنی ہوئی تھیں؟ قرآن نے اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے۔ صرف کلمہ "الواح" سربستہ طور پر آیا ہے۔ جو در اصل "لاح یلوح" کے مادہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ظاہر ہونے اور چمکنے کے ہیں۔ چونکہ صفحہ کے ایک طرف لکھنے سے حروف نمایاں ہو جاتے ہیں اور مطالب آشکار ہو جاتے ہیں، اس لیے اس صفحہ کو جس پر کچھ لکھا جائے "لوح" کہتے ہیں[1]

لیکن روایات و اقوال مفسرین میں ان الواح کی کیفیت کے بارے میں اور ان کی جنس کے بارے میں گوناگوں احتمالات ذکر کیے گئے ہیں۔ چونکہ ان میں سے کوئی بھی یقینی نہیں ہے اس لیے ان کے ذکر سے ہم اعراض کرتے ہیں۔

۲۔ **کلام کیسے ہوا:** قرآن کریم کی مختلف آیات سے استفادہ ہوتا ہے کہ خداوند متعال نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا، خدا کا موسیٰ سے کلام کرنا اس طرح تھا کہ اس نے صوتی امواج کو فضا میں

---

[1] تفسیر تبیان جلد ۴ صفحہ ۵۳۹۔

یا کسی جسم میں پیدا کر دیا تھا۔ کبھی یہ امواج صوتی "شجرۂ وادیٔ ایمن" سے ظاہر ہوتی تھیں اور کبھی "کوہ طور" سے حضرت موسیٰ کے کان میں پہنچتی تھیں۔ جن لوگوں نے صرف الفاظ پر نظر کی ہے اور اس پر غور نہیں کیا کہ یہ الفاظ کہاں سے نکل سکتے ہیں انہوں نے یہ خیال کیا کہ خدا کا کلام کرنا اس کے تجسم کی دلیل ہے۔ حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کیونکہ خدا کے کلام کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خود اس سے کلام صادر ہوا۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے کسی جسم میں کلام پیدا کیا۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ حضرت موسیٰ جب بھی یہ کلام سنتے تھے تو انہیں اس بات کا یقین حاصل ہو جاتا تھا کہ یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ انہیں یہ علم یا تو الہام کے ذریعے حاصل ہو گیا تھا یا بعض دیگر قرائن کے ذریعے۔

۳۔ **توریت پیام کامل نہ تھا:** چونکہ توریت کے متعلق یہ تعبیر کی گئی ہے کہ "من کل شیٔ موعظہ" اس لیے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام مواعظ، نصیحتیں اور مسائل ضروری اس میں نہ تھے کیونکہ فرمایا گیا ہے: ہم نے ان کے لیے ہر چیز میں سے نصیحت لکھی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو حضرت موسیٰ کا آئین ایک آخری آئین تھا اور نہ وہ خود آخری نبی تھے لہٰذا اس زمانے میں جتنی لوگوں کی استعداد تھی اسی کی مناسبت سے احکام خدا نازل ہوتے تھے۔ لیکن جب انسان تعلیمات انبیاء کی وجہ سے استعدادِ بشری کے آخری مرحلے پر پہنچ گئے تو اس وقت اللہ کا آخری فرمان جو نوع بشر کی تمام مادی و معنوی ضروریات پر مشتمل ہے نازل ہوا۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ بعض روایات میں جو وارد ہوا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا مقام حضرت موسیٰ سے بڑا تھا کیونکہ آپ تمام قرآن کے عالم تھے اور قرآن میں تمام چیزوں کا علم ہے (ونزلنا علیک الکتاب تبیانا لکل شیٔ) جبکہ توریت میں بعض مسائل کا ذکر ہے[1] وہ اسی مطلب کے مطابق ہے۔

۴۔ **"جو فرامین بہترین ہیں" سے کیا مراد ہے؟:** یہ جو مذکورہ بالا آیت میں آیا ہے کہ "ان فرامین میں جو بہترین ہیں ان کو لے لو" گا اس کے یہ معنی ہیں کہ ان احکام میں خوب و بد موجود تھا اور انہیں حکم دیا گیا تھا کہ جو احکام خوب ہیں انہیں لے لیں اور بد کو چھوڑ دیں، یا یہ کہ ان احکام میں خوب و خوب تر موجود تھا اور ان سے کہا گیا کہ جو احکام خوب تر ہیں ان کو لے لو اور جو خوب ہیں ان کو چھوڑ دو، ایسا نہیں ہے بلکہ کبھی کبھی "افعل التفضیل" بہ معنی صفت مشبہ بھی آتا ہے، زیر بحث آیت بظاہر اسی قبیل سے ہے، یعنی "احسن" بمعنی "حسن" آیا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ سب فرامین "حسن" اور نیک ہیں۔

---

[1] ان روایات کے لیے تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۷۵ ملاحظہ ہو۔

یہ احتمال بھی اس آیت میں ہے کہ "احسن" کے معنی وہی بہتر کے ہوں اور "افعل تفضیل" کے معنیٰ میں ہو جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ اس (توریت) میں کچھ امور ایسے ہیں جن کی صرف اجازت ہے (جیسے قصاص وغیرہ) اور کچھ امور وہ ہیں جن کو بہتر کہا گیا ہے (جیسے عفو و درگزر کر دینا) یعنی اپنی امت سے کہہ دو کہ جتنا بھی ہو سکے جو امور بہتر ہیں ان کو انتخاب کریں (یعنی عفو کو قصاص پر ترجیح دیں)[1]

۵۔ "ساوریکم دار الفاسقین" (جلد ہی فاسقوں کا ٹھکانا میں تمہیں دکھلا دوں گا)

بظاہر اس سے دوزخ مراد ہے جو ان لوگوں کا ٹھکانا ہے جو خدا اور اس کے فرامین کی اطاعت سے خارج ہو گئے ہیں۔

یہ احتمال بھی بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ اگر ان فرامین سے اختلاف کرو گے تو تمہارا بھی وہی انجام ہوگا جو قوم فرعون اور دیگر گنہگاروں کا ہوا تھا اور تمہاری سرزمین فاسقوں کے ٹھکانے میں تبدیل ہو جائے گی[2]

۱۴۶ سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ
الْحَقِّ ؕ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَاِنْ یَّرَوْا
سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ۚ وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ
الْغَیِّ یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّهُمْ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا
وَکَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِیْنَ ○
۱۴۷ وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ
هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○

---

[1] یہ احتمال بھی موجود ہے کہ "احسنها" کی ضمیر "قوۃ" کی طرف پلٹتی ہو اس سے مراد یہ ہو کہ وہ بہترین قوۃ کے ساتھ احکام پر عمل کریں۔

[2] تفسیر المنار جلد ۹ صفحہ ۱۹۳۔

ترجمہ

(۱۴۶) جو لوگ زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں ان کو میں اپنی آیتوں سے جلد ہی پلٹ دوں گا (اس طرح کہ) وہ جس آیت کو بھی دیکھیں گے اس پر ایمان نہ لائیں گے، اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں گے تو اس پر نہ چلیں گے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں گے تو اس کو اختیار کریں گے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلا دیا اور وہ ان سے غافل تھے۔

(۱۴۷) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے۔ جو کچھ انہوں نے کیا ہے کیا اس کے علاوہ کی ان کو سزا ملے گی؟

تفسیر

متکبروں کا انجام

ان دو آیتوں میں جو بحث کی گئی ہے اس میں درحقیقت ان گذشتہ آیتوں کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے جن میں فرعون، فرعونیوں اور بعض بنی اسرائیل کے سرکش افراد کا انجام مذکور ہوا ہے۔ خداوند کریم نے ان آیتوں میں یہ حقیقت بیان کی ہے کہ اگر فرعون یا بنی اسرائیل کے سرکش افراد اتنے معجزات دیکھنے کے بعد اور اس قدر آیات الٰہی سننے کے بعد راہ راست پر نہ آئے تو یہ اس وجہ سے ہے کہ ہمارا یہ قانون ہے کہ جو لوگ حق کے مقابلے کے لیے صف آرا ہوتے ہیں، ہم انہیں ان کے اعمال کے جرم میں، حق کے قبول کرنے سے روک دیتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ سرکشی اور تکذیب آیات الٰہی میں اصرار انسان کی روح میں اس قدر اثر انداز ہوتا ہے کہ حق کے مقابلہ میں اس کی حیثیت ایک ایسے سخت موجود کی ہو جاتی ہے جس پر کوئی شے اثر انداز نہیں ہوتی۔

اس لیے پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم عنقریب ان لوگوں کو جو زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں اپنی

آیتوں سے پلٹا دیں گے (ساصرف عن اٰیاتی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق)۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا آیت دلائل عقل کے خلاف نہیں ہے کہ اس کی توجیہ کے لیے ہمیں دیگر مفسرین کی طرح ارتکاب خلاف ظاہر کی ضرورت پڑے۔ یہ ایک الٰہی قانون ہے کہ جو اس کے مقابلہ میں ضد سے کام لیتے ہیں اور ہٹ دھرمی کی آخری حدوں تک پہنچ جاتے ہیں، خدا ان سے ہر طرح کی توفیق کو سلب کر لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ خود ان کی بداعمالیوں کی خاصیت ہے لیکن چونکہ خدا کی ذات علۃ العلل اور مسبب الاسباب ہے اس لیے ان کی نسبت اللہ نے اپنی طرف دی ہے۔

یہ موضوع نہ تو مستلزم جبر ہے اور نہ دوسرا کوئی محذور لازم آتا ہے کہ کسی توجیہ کی ضرورت ہو۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ لفظ "تکبر" کے بعد "بغیر الحق" کی قید تاکید کے لیے ہے، کیونکہ تکبر، خود بینی اور دیگر بندگان خدا کی تحقیر ہمیشہ ناحق ہی ہوتی ہے۔

یہ تعبیر بالکل ایسی ہی ہے جیسے سورہ بقرہ کی آیت ۶۱ میں آیا ہے:

وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔

وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے۔

خاص کر یہ کہ کلمہ "فی الارض" کے ہمراہ ہے جس کے معنی زمین پر سرکشی اور طغیان برپا کرنے کے ہیں اور یقیناً یہ عمل ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے۔

اس کے بعد اس طرح کے "متکبر و سرکش" افراد کی تین صفتوں کو بیان کیا گیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ کس طرح ان سے حق کو قبول کرنے کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، ارشاد ہوتا ہے:

وہ اگر تمام آیات الٰہی کو بھی دیکھیں تب بھی ایمان نہ لائیں گے (وان یروا کل اٰیۃ لا یؤمنوا بھا)۔

"اور اگر راہ راست کو دیکھیں گے تب بھی اسے اختیار نہ کریں گے (وان یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلا)۔

اس کے برعکس "اگر غلط اور ٹیڑھے راستے کو دیکھیں گے تو اس کو اختیار کریں گے (وان یروا سبیل الغی یتخذوہ سبیلا)۔

ان صفات کا ذکر کرنے کے بعد جو ان کی حق قبول کرنے کی حکایت ہیں اس کی دلیل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، فرمایا گیا ہے: یہ سب اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی اور

ان سے غفلت برتی (ذالك بانهم كذبوا بآياتنا وكانوا عنها غافلين)۔
اس میں کوئی شک نہیں کہ صرف ایک مرتبہ یا چند مرتبہ آیات الٰہی کی تکذیب انسان میں قبولِ حق کی توفیق سلب کرنے کا استحقاق نہیں پیدا کرتی، بلکہ اس کے لیے راہ تو ابھی کھلی ہوتی ہے لیکن اگر اس حالت میں اصرار و استمرار رہے تو آخر میں یہ نوبت آجاتی ہے کہ اس میں نیک و بد (رشد و غی) کی تشخیص کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔

بعد کی آیت میں ایسے لوگوں کی سزا کو بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ ہماری آیتوں کی تکذیب کریں گے اور روزِ آخرت کی ملاقات کے منکر ہوں گے ان کے تمام اعمال بالکل حبط اور نابود ہو جائیں گے (والذین کذبوا بآیاتنا ولقاء الآخرۃ حبطت اعمالھم)۔
"حبط" کے معنی عمل کو باطل اور بے اثر کر دینے کے ہیں، یعنی اس طرح کے افراد اگر کوئی کارِ خیر بھی کریں گے تو اس سے ان کے لیے کوئی نتیجہ نہ نکلے گا (اس کی مزید توضیح کے لیے سورۂ بقرہ آیت ۲۱۷ کی تفسیر ملاحظہ ہو جو ہم اسی کتاب کی جلد دوم میں لکھ آئے ہیں)۔
آیت کے آخر میں اس طرح اضافہ فرمایا گیا ہے: ان کا جو یہ انجام ہوا ہے اس میں کسی جذبۂ انتقام کو دخل نہیں ہے بلکہ یہ خود ان کے اعمال کا نتیجہ ہے جو ان کے سامنے آیا ہے "آیا انہیں سوائے اپنے اعمال کے کسی اور چیز کی سزا دی جائے گی؟" (ھل یجزون الا ما کانوا یعملون)
یہ آیت ان آیتوں میں سے ایک ہے جو اس بات کی دلیل ہیں کہ بروزِ قیامت انسان کو اس کے اعمال کی سزا ملے گی (برخلاف مذہب جبر کے جو یہ کہتا ہے کہ جزا و سزا میں اعمال کو دخل نہیں ہے)۔

۱۴۸ وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ ۚ أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا ۘ اتَّخَذُوهُ وَكَانُوا ظَالِمِينَ ○

۱۴۹ وَلَمَّا سُقِطَ فِي أَيْدِيهِمْ وَرَأَوْا أَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوا قَالُوا لَئِنْ لَمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ ○

ترجمہ

۱۴۸ قوم موسٰی نے اس کے (میعادگاہ الٰہی کی طرف جانے کے) بعد اپنے زیور اور آلات سے ایک گوسالہ بنایا، ایک (بے جان) جسد جس میں گائے کی آواز تھی' کیا وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ وہ ان سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا اور راہ (راست) کی طرف ہدایت نہیں کرسکتا تھا، انہوں نے اس کو (بطور اپنے خدا کے) انتخاب کر لیا اور وہ ظالم تھے۔

۱۴۹ اور جب انہیں حقیقت کا پتہ چلا اور انہوں نے دیکھا کہ وہ گمراہ ہو گئے ہیں تو انہوں نے کہا: اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں نہ بخشا تو ہم ضرور گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔

تفسیر

یہودیوں میں گوسالہ پرستی کا آغاز

ان آیات میں افسوسناک اور تعجب خیز واقعات میں سے ایک واقعہ کا ذکر ہوا ہے جو حضرت موسٰیؑ کے میقات کی طرف جانے کے بعد بنی اسرائیل میں رونما ہوا۔ وہ واقعہ ان لوگوں کی گوسالہ پرستی ہے۔ جو ایک شخص بنام "سامری" نے زیور و آلاتِ بنی اسرائیل کے ذریعے شروع کیا۔

اس داستان کی اہمیت اس قدر ہے کہ قرآن نے اس کا چار سورتوں میں ذکر کیا ہے' سورۂ بقرہ آیت ۵۱، ۵۴، ۹۲، ۹۳، سورۂ نساء آیت ۱۵۳، سورۂ اعراف زیر بحث آیات اور سورۂ طٰہٰ آیت ۸۸ اور اس کے بعد کی آیات۔

اتنا ضرور ہے کہ یہ حادثہ مثل دیگر اجتماعی حوادث کے بغیر کسی آمادگی اور مقدمہ کے وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ اس میں متعدد اسباب کار فرما تھے، جن میں سے بعض یہ ہیں:

بنی اسرائیل عرصہ دراز سے اہلِ مصر کی بُت پرستی دیکھتے چلے آرہے تھے۔

جب دریائے نیل کو عبور کیا تو انہوں نے ایک قوم کو دیکھا جو بت کی پرستش کرتی تھی. جیسا کہ قرآن نے بھی اس کا ذکر کیا ہے اور گذشتہ آیات میں اس کا ذکر گزرا کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے ان کی طرح کا بُت بنانے کی فرمائش کی جس پر حضرت موسیٰؑ نے انہیں سخت سرزنش کی۔

حضرت موسیٰؑ کے میقات کا پہلے تیس راتوں کا ہونا اس کے بعد چالیس راتوں کا ہو جانا اس سے بعض منافقوں کو یہ موقع ملا کر حضرت موسیٰؑ کی وفات کی افواہ پھیلا دیں۔

قوم موسیٰؑ میں بہت سے افراد کا جہل و نادانی سے متصف ہونا اس کے مقابلے میں سامری کی مکاری و مہارت کیونکہ اس نے بڑی ہوشیاری سے بُت پرستی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنایا۔ بہرحال ان تمام باتوں نے اکٹھا ہو کر اس بات کے اسباب پیدا کیے کہ بنی اسرائیل کی اکثریت بت پرستی کو قبول کرلے اور "گوسالہ" کے چاروں طرف اس کے ماننے والے ہنگامہ برپا کر دیں۔

آیت مذکورہ بالا میں پہلے قرآن اس طرح فرماتا ہے: قوم موسیٰ نے موسیٰ کے میقات کی طرف جانے کے بعد اپنے زیورات و آلات سے ایک گوسالہ بنایا جو ایک بے جان جسد تھا جس میں سے گائے کی آواز آتی تھی، اسے انہوں نے اپنے واسطے انتخاب کیا (واتخذ قوم موسیٰ من بعدہ من حلیھم عجلاً جسداً لہ خوار)۔

اگرچہ یہ عمل سامری سے سرزد ہوا تھا (جیسا کہ سورہ طٰہٰ کی آیات میں آیا ہے)، لیکن اس کی نسبت قوم موسیٰؑ کی طرف دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس کام میں سامری کی مدد کی تھی اور وہ اس کے شریک جرم تھے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کی بڑی تعداد اس کے فعل پر راضی تھی۔

ظاہراً آیت یہ ہے کہ تمام قوم موسیٰ اس گوسالہ پرستی میں شریک تھی لیکن اگر اسی سورہ کی آیت ۱۵۹ پر نظر کی جائے جس میں آیا ہے کہ،

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓی اُمَّةٌ یَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ ہ

قوم موسیٰ میں ایک امت تھی جو لوگوں کو حق کی ہدایت کرتی تھی اور اسی کی طرف متوجہ تھی۔

اس سے معلوم ہوگا کہ زیرِ بحث آیت سے مراد تمام امت موسیٰ نہیں ہے بلکہ اس کی اکثریت اس گوسالہ پرستی کی تابع ہو گئی تھی جیسا کہ آئندہ آیات میں آنے والا ہے کہ وہ اکثریت اتنی زیادہ تھی کہ حضرت ہارون علیہ السلام مع اپنے ساتھیوں کے ان کے مقابلے میں ضعیف و ناتواں ہو گئے تھے۔

طلائی گوسالہ سے کس طرح آواز پیدا ہوئی ؟

کلمۂ "خوار" کے معنی اس مخصوص آواز کے ہیں جو گائے یا گوسالہ سے نکلتی ہے۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ سامری جو کہ ایک صاحبِ فن انسان تھا اس نے اپنی معلومات سے کام لے کر طلائی گوسالہ کے سینے میں کچھ مخصوص نل (PIPE) اس طرح مخفی کر دیئے تھے جن کے اندر سے دباؤ کی وجہ سے جب ہَوا نکلتی تھی تو گائے کی آواز آتی تھی۔

کچھ کا خیال ہے کہ گوسالہ کا منہ اس طرح کا پیچیدہ بنایا گیا تھا کہ جب اسے ہَوا کے رُخ پر رکھا جاتا تھا تو اس کے منہ سے یہ آواز نکلتی تھی۔

ایک دوسرا نکتہ جس کی طرف یہاں پر توجہ کرنا چاہیئے یہ ہے کہ سامری کو چونکہ اس بات کا احساس تھا کہ قومِ موسٰیؑ عرصۂ دراز سے محرومی اور مظلومی کی زندگی بسر کر رہی تھی اس وجہ سے اس میں مادہ پرستی اور حُبِّ زر کا جذبہ بدرجۂ اتم پایا جاتا تھا۔ جیسا کہ آج بھی ان کی یہی صفت ہے لہٰذا اس نے یہ چالاکی کی کہ وہ مجسمہ سونے کا بنایا کہ اس طرح ان کی توجہ کو زیادہ سے زیادہ اس کی طرف مبذول کرا سکے۔

اب رہا یہ سوال کہ اس محروم و فقیر ملت کے پاس اس روز اتنی مقدار میں زر و زیور کہاں سے آگیا کہ اس سے یہ مجسمہ تیار ہوگیا؟ اس کا جواب روایات میں اس طرح ملتا ہے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں نے ایک تہوار کے موقع پر فرعونیوں سے زیورات مستعار لیے تھے یہ اس وقت کی بات ہے جس کے بعد ان کی غرقابی عمل میں آئی تھی۔ اس کے بعد وہ زیورات ان عورتوں کے پاس باقی رہ گئے تھے[1]

٭

اس کے بعد قرآن سرزنش کے طور پر ان سے کہتا ہے: کیا وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ وہ گوسالہ ان سے باتیں نہیں کر سکتا تھا نہ ان کی رہنمائی کر سکتا تھا (الم یروا انہ لا یکلمھم ولا یھدیھم سبیلاً)۔

مطلب یہ ہے کہ ایک حقیقی خدا کو کم از کم ایسا تو ہونا چاہیئے کہ اسے نیک و بد کی تمیز ہو اور وہ اپنے ماننے والوں کی ہدایت کر سکے، اپنی عبادت کرنے والوں سے بات کر سکے اور عبادت کے طریقے انہیں سکھا سکے۔

اصولی طور پر عقلِ انسانی کس طرح انسان کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ ایسے بے جان

---

[1] تفسیر مجمع البیان در ذیل آیت مذکورہ ملاحظہ ہو۔

معبود کی پرستش کرے جو خود اس کا ساختہ پرداختہ ہے، حتیٰ کہ اگر بالفرض وہ سونا ایک زندہ بچھڑے کی شکل میں بھی تبدیل ہو جائے تب بھی وہ کسی طرح قابلِ پرستش نہیں ہوگا۔ گوسالہ جو بالکل نہیں سمجھتا بلکہ نافہمی میں ضرب المثل ہے۔

اس طرح ان لوگوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا لہٰذا آیت کے آخر میں فرماتا ہے:

انہوں نے گوسالہ کو اپنے معبود کے طور پر انتخاب کرلیا، اور وہ ظالم و ستمگر تھے (اتخذوہ وکانوا ظالمین)۔

لیکن جب حضرت موسیٰ واپس آئے اور مسائل واضح ہو گئے تو بنی اسرائیل کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوئے۔ انہوں نے خدا سے اپنے اس بُرے عمل کی معافی چاہی۔ چنانچہ انہوں نے کہا: اگر پروردگار ہم پر رحم نہ کرے اور ہمیں نہ بخشے تو ہم یقینی طور پر گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے (ولما سقط فی ایدیھم ورأوا انھم قد ضلوا قالوا لئن لم یرحمنا ربنا ویغفرلنا لنکونن من الخاسرین)۔

یہ جملہ "ولما سقط فی ایدیھم" (یعنی جب حقیقت ان کے ہاتھ لگی، یا جب ان کے اعمالِ شوم کا نتیجہ ان کے ہاتھ لگا، یا جب چارۂ کار ان کے ہاتھ سے نکل گیا) ادبِ عربی میں ندامت و پشیمانی سے کنایہ ہے، کیونکہ واقعات انسان کے ہاتھ لگتے ہیں اور وہ حقائق سے آگاہ ہو جاتا ہے، یا یہ کہ کسی کام کے ناپسندیدہ نتائج سے دوچار ہوتا ہے یا اس کے اوپر راہِ چارہ مسدود ہو جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس وقت پشیمان ہوتا ہے۔ بنا بریں پشیمانی اس جملے کے لوازم میں سے ہے۔

بہرحال بنی اسرائیل اپنے کیے پر نادم ہوئے، لیکن اتنی بات پر مطلب کا خاتمہ نہیں ہوا جیسا کہ بعد کی آیات میں آنے والا ہے۔

(۱۵۰) وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا لا
قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُونِي مِنْ بَعْدِي ۚ أَعَجِلْتُمْ أَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ
وَأَلْقَى الْأَلْوَاحَ وَأَخَذَ بِرَأْسِ أَخِيهِ يَجُرُّهُ إِلَيْهِ ۚ
قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي صلے

فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَآءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ
الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○

۱۵۱ قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ
وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ○

ترجمہ

۱۵۰ جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف غضبناک اور رنجیدہ پلٹے تو انہوں نے کہا کہ تم لوگ میرے بعد میرے بُرے جانشین نکلے (اور تم نے میرے آئین کو ضائع کر دیا) کیا تم نے اپنے رب کے فرمان کے (اور مدت میعاد کی تمدید اور فیصلہ کے) بارے میں عجلت سے کام لیا؟! اس کے بعد انہوں نے الواح کو ڈال دیا اور اپنے بھائی کے سر کو پکڑ لیا اور (غصہ میں اسے) اپنی طرف کھینچا۔ اس نے کہا اے میرے ماں جائے! اس قوم نے مجھے کمزور کر دیا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیں، لہٰذا کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ دشمن میری شماتت کریں اور مجھے ظالم گروہ میں قرار نہ دو۔

۱۵۱ (موسیٰ نے) کہا پروردگارا! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل کر اور تُو تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

تفسیر

گوسالہ پرستوں کے خلاف شدید ردّ عمل

ان دو آیتوں میں اس کشاکش اور نزاع کا ماجرا بیان کیا گیا ہے جو حضرت موسیٰ اور گوسالہ پرستوں کے درمیان اس وقت واقع ہوئی جب وہ میعاد گاہ سے واپس ہوئے جس کی طرف

گذشتہ آیت میں صرف اشارہ کیا گیا تھا، ان آیتوں میں تفصیل کے ساتھ حضرت موسٰیؑ کے اس ردّ عمل کو بیان کیا گیا ہے جو اس گروہ کے بیدار کرنے کے لیے ان سے ظاہر ہوا۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جس وقت موسٰیؑ غضبناک و رنجیدہ اپنی قوم کی طرف پلٹے اور گوسالہ پرستی کا نفرت انگیز منظر دیکھا تو ان سے کہا کہ تم لوگ میرے بعد بُرے جانشین نکلے تم نے میرا آئین ضائع کر دیا (ولما رجع موسٰی الٰی قومہ غضبان اسفًا قال بئسما خلفتمونی من بعدی)۔ ¹

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسٰیؑ میعادگاہِ پروردگار سے پلٹنے وقت قبل اس کے کہ بنی اسرائیل سے ملتے، غضبناک اور اندوھگین تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ خدا نے میعادگاہ میں انہیں اس کی خبر دے دی تھی جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ ۔ (سورہ طٰہٰ آیت ۸۵)

مَیں نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کی آزمائش کی لیکن وہ اس آزمائش میں پوری نہ اتری اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔

اس کے بعد موسٰیؑ نے انہیں کہا: آیا تم نے اپنے پروردگار کے فرمان کے بارے میں جلدی کی (اعجلتم امر ربکم)۔

اگرچہ مفسّرین نے اس جملے کی تفسیر میں بہت بحث کی ہے اور گوناگوں احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن ان آیات کا ظاہر یہ ہے کہ تم نے خدا کے اس فرمان، کہ اس نے میعاد کا وقت تیس شب سے چالیس شب کر دیا، جلدی کی اور جلد فیصلہ کر دیا، میرے نہ آنے کو میرے مرنے یا وعدہ خلافی کی دلیل سمجھ لیا، حالانکہ لازم تھا کہ تھوڑا صبر سے کام لیتے اور چند روز اور انتظار کر لیتے تاکہ حقیقت واضح ہو جاتی۔

اس وقت جبکہ حضرت موسٰیؑ بنی اسرائیل کی زندگی کے ان طوفانی و بحرانی لمحات سے گزر رہے تھے، سر سے پیر تک غصّہ اور افسوس کی شدت سے بھڑک رہے تھے، ایک عظیم اندوہ نے ان کے وجود پر سایہ ڈال دیا تھا اور انہیں بنی اسرائیل کے مستقبل کے بارے میں بڑی تشویش لاحق تھی کیونکہ تخریب اور تباہ کاری آسانی سے ہو جاتی ہے۔ کبھی صرف ایک انسان کے ذریعے بہت بڑی خرابی

---

¹ "اسف" کے معنی جیسا کہ راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے اس "اندوہ" کے ہیں جس میں "غیظ و غضب" کی آمیزش ہو۔ نیز یہ کلمہ ان دونوں معنی میں الگ الگ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ انسان کسی چیز سے بہت زیادہ ناراض ہو جائے۔ یہ بات طبیعی ہے اگر یہ ناراضی ان افراد سے ہو جو ماتحت ہیں تو غصہ کی شکل میں ظاہر ہو گی اور اگر ان افراد سے ہو جو اس سے اوپر ہیں جن پر اس کا کوئی زور نہیں تو رنج و اندوہ کی صورت میں ظاہر ہو گی۔ چنانچہ ابنِ عباس سے روایت ہے کہ غیظ و غضب اور رنج و اندوہ ان سب کی اصل ایک ہے اگرچہ الفاظ مختلف ہیں۔

اور تباہی واقع ہو جاتی ہے لیکن اصلاح اور تعمیر میں دیر لگتی ہے۔
خاص طور پر جب کسی نادان، متعصب اور ہٹ دھرم قوم کے درمیان کوئی غلط ساز بجا دیا جائے تو اس کے بعد اس کے بُرے اثرات کا زائل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔
قرآن نے حضرت موسیٰ کا وہ شدید ردّعمل بیان کیا ہے جو اس طوفانی و بحرانی منظر کو دیکھنے کے بعد ان سے ظاہر ہوا: "موسیٰ نے بے اختیارانہ طور پر اپنے ہاتھ سے توریت کی الواح کو زمین پر ڈال دیا اور اپنے بھائی ہارون کے پاس گئے اور ان کے سر اور داڑھی کے بالوں کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔"
(والقی الالواح واخذ برأس اخیه یجرهٗ الیه)۔
جیسا کہ قرآن کی دیگر آیات بالخصوص سورہ طٰہٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اس کے علاوہ ہارون کو بڑی شدت سے سرزنش کی اور بآواز بلند چیخ کر پکارے:
کیا تم نے بنی اسرائیل کے عقائد کی حفاظت میں کوتاہی کی اور میرے فرمان کی مخالفت کی؟![1]
درحقیقت حضرت موسیٰ کا یہ ردّعمل ایک طرف تو ان کی اس واردات قلبی، بے قراری اور شدید ناراضی کی حکایت کرتا ہے جو بنی اسرائیل کی بت پرستی کی وجہ سے پیدا ہوئی، دوسری طرف یہ اس بات کا ایک مؤثر سبب بنا کہ بنی اسرائیل کی عقل میں ایک حرکت پیدا ہو اور وہ اپنے اس عمل کی قباحت کی طرف متوجہ ہو جائیں۔
بنا بریں اگرچہ بالفرض۔ الواح توریت کا پھینک دینا قابلِ اعتراض معلوم ہوتا ہو، اور بھائی کی شدید سرزنش نادرست ہو لیکن اگر حقیقت کی طرف توجہ کی جائے کہ اگر حضرت موسیٰ اس شدید اور پُرہیجان ردّعمل کا اظہار نہ کرتے تو ہرگز بنی اسرائیل اپنی غلطی کی سنگینی اور اہمیت کا اندازہ نہ کر سکتے ممکن تھا کہ اس بت پرستی کے آثارِ بد ان کے ذہنوں میں باقی رہ جاتے لہٰذا حضرت موسیٰ نے جو کچھ کیا وہ نہ صرف غلط نہ تھا بلکہ ایک امر لازم تھا۔
اس بنا پر واضح ہوا کہ ان تمام توجیہوں کی ضرورت نہیں ہے جو اس مقام پر بعض مفسرین حضرت موسیٰ کے ردِّعمل کو مقامِ عصمتِ انبیاء سے سازگار کرنے کے لیے کرتے ہیں۔
لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ اس واقعہ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ تاریخ بنی اسرائیل میں کبھی اس قدر ناراض نہ ہوئے تھے کیونکہ ان کے سامنے بدترین منظر تھا۔ یعنی بنی اسرائیل خدا پرستی کو چھوڑ کر گوسالہ پرستی اختیار کر چکے تھے جس کی وجہ سے حضرت موسیٰ کی وہ تمام زحمتیں جو انہوں نے بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے کی تھیں سب برباد ہو رہی تھیں۔ لہٰذا ایسے موقع پر الواح کا ہاتھوں سے

[1] سورہ طٰہٰ ۹۲ - ۹۳۔

گرجانا اور بھائی سے سخت مواخذہ کرنا ایک طبعی امر تھا۔

اس شدید ردِّ عمل اور غیظ و غضب کے اظہار نے بنی اسرائیل پر بہت زیادہ تربیتی اثر مرتب کیا اور منظر کو بالکل پلٹ دیا۔ جبکہ اگر حضرت موسیٰؑ نرم زبان استعمال کرتے تو شاید اس کا تھوڑا سا اثر بھی مرتب نہ ہوتا۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: ہارونؑ نے موسیٰؑ کی محبت کو برانگیختہ کرنے کے لیے اور اپنی بے گناہی بیان کرنے کے لیے کہا: اے میرے ماں جائے! اس نادان امت کے باعث ہم اس قدر قلیل ہوگئے کہ نزدیک تھا کہ مجھے قتل کر دیں لہٰذا میں بالکل بے گناہ ہوں لہٰذا آپ کوئی ایسا کام نہ کریں کہ دشمن ہنسی اڑائیں اور مجھے اس ستمگر امت کی صف میں قرار نہ دیں (قال ابن ام ان القوم استضعفونی و کادوا یقتلوننی فلا تشمت بی الاعدآء و لا تجعلنی مع القوم الظالمین)۔

اس آیت میں جو "ابن ام" کی تعبیر آئی ہے یا سورہ طٰہٰ کی آیت ۹۴ میں "یابن ام" کی آئی ہے (جس کے معنی اے میری ماں کے بیٹے کے ہیں) حالانکہ موسیٰؑ اور ہارونؑ دونوں ایک والدین کی اولاد تھے یہ اس لیے تھا کہ حضرت ہارونؑ چاہتے تھے کہ حضرت موسیٰؑ کا جذبہ محبت بیدار کریں۔

بہر حال حضرت موسیٰؑ کی یہ تدبیر کارآمد ہوئی اور بنی اسرائیل کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے توبہ کی خواہش کا اظہار کیا۔

❁

اب حضرت موسیٰؑ کی آتشِ غضب کم ہوئی اور وہ درگاہِ خداوندی کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کی: پروردگارا! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دے اور ہمیں اپنی رحمتِ بے پایاں میں داخل کر دے تو تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے (قال رب اغفرلی ولاخی وادخلنا فی رحمتک و انت ارحم الراحمین)۔

اپنے لیے اور اپنے بھائی کے لیے بخشش طلب کرنا اس بنا پر نہیں تھا کہ ان سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا بلکہ یہ پروردگار کی بارگاہ میں ایک طرح کا خضوع و خشوع تھا اور اس کی طرف بازگشت تھی اور بت پرستوں کے اعمالِ زشت سے اظہارِ تنفر تھا۔ اسی طرح اس میں سب کے لیے ایک طرح کا نمونۂ عمل ہے تاکہ وہ یہ سوچیں کہ جبکہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی جن سے کوئی لغزش سرزد نہیں ہوئی تھی وہ خدا کی بارگاہ میں اس قدر لرزہ بر اندام ہیں، اس سے ہمیں عبرت حاصل کرنا چاہیے اور اپنے نامۂ اعمال پر ایک نظر کرنا چاہیے اور پروردگارِ عالم کی طرف پلٹنا چاہیے، اپنے گناہوں کی معافی اس سے طلب کرنا چاہیے جیسا کہ گذشتہ دو آیتوں سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

قرآن اور موجودہ توریت کا موازنہ

جیسا کہ آیات مذکورہ بالا اور سورۂ طٰہٰ کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ، گوسالہ ۔کو نہ تو بنی اسرائیل نے بنایا تھا نہ حضرت ہارونؑ نے ۔سورۂ طٰہٰ کی آیات کے مطابق بنی اسرائیل میں سے ایک شخص سامری نے یہ حرکت کی تھی ، جس پر حضرت ہارونؑ جو حضرت موسٰیؑ کے بھائی اور ان کے معاون تھے خاموش نہ بیٹھے بلکہ انہوں نے اپنی پوری کوشش صرف کی ، انہوں نے اتنی کوشش کی کہ نزدیک تھا کہ لوگ انہیں قتل کر دیتے ۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ موجودہ توریت میں گوسالہ سازی اور بُت پرستی کی طرف دعوت کو حضرت ہارونؑ کی طرف نسبت دی گئی ہے ، چنانچہ توریت کے سفر خروج کی فصل ۳۲ میں یہ عبارت ملتی ہے :

جس وقت قوم موسٰی نے دیکھا کہ موسٰی کے پہاڑ سے نیچے اترنے میں دیر ہوئی تو وہ ہارون کے پاس اکٹھا ہوئے اور ان سے کہا کہ اٹھو اور ہمارے لیے ایسا خدا بناؤ جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ یہ شخص موسٰی جو ہم کو مصر سے نکال کر یہاں لایا ہے نہیں معلوم اس پر کیا گذری ۔ ہارون نے ان سے کہا : طلائی بُندے (گوشوارے) ، جو تمہاری عورتوں اور بچوں کے کانوں میں ہیں انہیں ان کے کانوں سے اتار کر میرے پاس لاؤ ، پس پوری قوم ان گوشواروں کو کانوں سے جدا کر کے ہارون کے پاس لائی ، ہارون نے ان گوشواروں کو ان لوگوں کے ہاتھوں سے لیا اور کندہ کرنے کے ایک آلہ کے ذریعے تصویر بنائی اور اس سے ایک گوسالہ کا مجسمہ ڈھالا اور کہا کہ اسے بنی اسرائیل ! یہ تمہارا خدا ہے جو تمہیں سرزمین مصر سے باہر لایا ہے ....

اسی کے ذیل میں ان مراسم کو بیان کیا گیا ہے جو حضرت ہارونؑ نے اس بت کے سامنے قربانی کرنے کے بارے میں بیان کیے تھے ۔

اس کے بعد حضرت موسٰیؑ کے واپس آنے اور غیظ و غضب کرنے کے سلسلہ میں اس طرح لکھا ہے :

اور موسٰی نے ہارون سے کہا کہ اس قوم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے ان کو اتنے بڑے گناہ میں مبتلا کر دیا ؟

اور ہارونؑ نے کہا :

میرے آقا کا غصہ نہ بھڑکے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ یہ قوم (ہمیشہ) بدی کی طرف مائل ہے ....

جو کچھ سطور بالا میں بیان ہوا یہ بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی داستان کا ایک حصہ ہے جو توریت

میں مذکور ہے اس کی عبارت بعینہ نقل کی گئی ہے حالانکہ خود توریت نے حضرت ہارونؑ کے مقام بلند کو متعدد فصول میں بیان کیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے بعض معجزات حضرت ہارونؑ کے ذریعے ظاہر ہوتے تھے (فصل ۸ از سفر خروج توریت) اور ہارون کا حضرت موسیٰؑ کے ایک رسول کی حیثیت سے تعارف کروایا گیا ہے (فصل ۸ از سفر خروج)۔

بہرکیف حضرت ہارونؑ جو حضرت موسیٰؑ کے جانشین برحق تھے اور ان کی شریعت کے سب سے بڑے عالم و عارف تھے توریت ان کے لیے مقام بلند کی قائل ہے۔ اب ذرا ان خرافات کو بھی دیکھ لیجئے کہ انہیں ایک بت ساز ہی نہیں بلکہ ایک مؤسس بت پرستی کی حیثیت سے روشناس کرایا ہے بلکہ "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" کے مقولہ کے مطابق ان کی جانب سے ایک غلط عذر پیش کیا کیونکہ جب حضرت موسیٰؑ نے ان پر اعتراض کیا تو انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ چونکہ یہ قوم بدی کی طرف مائل تھی اس لیے میں نے بھی اسے اس راہ پر لگا دیا۔ جبکہ قرآن ان دونوں بلند پایہ پیغمبروں کو ہر قسم کے شرک اور بت پرستی سے پاک و صاف سمجھتا ہے۔

صرف یہی ایک مقام نہیں جہاں قرآنی تاریخ انبیاء و مرسلین کی پاکی و تقدس کا مظہر ہے جبکہ موجودہ توریت کی تاریخ انبیاء و مرسلین کی ساحت قدس کے متعلق انواع و اقسام کی خرافات سے بھری ہوئی ہے۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق حقانیت و اصالتِ قرآن اور موجودہ توریت و انجیل کی تحریف کو پہچاننے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان دونوں میں انبیاء کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے اس کا موازنہ کر لیا جائے اس سے اپنے آپ پتہ چل جائیگا کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے؟

(۱۵۲) اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ
مِّنْ رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَكَذٰلِكَ
نَجْزِي الْمُفْتَرِيْنَ ○
(۱۵۳) وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا
اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○
(۱۵۴) وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖ وَفِيْ

نُسۡخَتِهَا هُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ هُمۡ لِرَبِّهِمۡ يَرۡهَبُوۡنَ ○

ترجمہ

۱۵۲ وہ لوگ جنہوں نے گوسالہ کو اپنا معبود بنایا عنقریب اپنے رب کے غضب میں مبتلا ہوں گے، اور حیاتِ دنیا میں گرفتارِ ذلت ہوں گے اور ہم ان لوگوں کو جو (خدا پر) بہتان باندھتے ہیں، سزا دیتے ہیں۔

۱۵۳ اور وہ لوگ جو گناہ کریں اور اس کے بعد توبہ کرلیں اور ایمان لائیں (انہیں بخشش کی امید ہے کیونکہ) تیرا رب اس (توبہ) کے بعد ضرور بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

۱۵۴ اور جب موسٰی کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو انہوں نے (توریت کی) الواح کو اٹھایا اور اس کے اندر ان لوگوں کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ہدایت اور رحمت لکھی ہوئی تھی۔

تفسیر

جیسا کہ ہم سابقاً لکھ آئے ہیں حضرت موسٰیؑ کے اس شدید رد عمل نے اپنا اثر دکھایا اور جن لوگوں نے گوسالہ پرستی اختیار کی تھی اور ان کی تعداد اکثریت میں تھی وہ اپنے کام سے پشیمان ہوئے ان کی پشیمانی کا ذکر سابقہ آیت ۱۴۹ میں بھی آچکا ہے، لیکن چونکہ یہاں پر یہ توہم ہوتا ہے کہ ان کی بخشش کے لیے شاید مذکورہ پشیمانی کافی تھی، قرآن نے یہ اضافہ کیا ہے:

"وہ لوگ جنہوں نے گوسالہ کو اپنا معبود بنایا جلد ہی انہیں پروردگار کا غضب اور اس جہان میں ذلت و خواری نصیب ہوگی" (ان الذین اتخذوا العجل سینالھم غضب من ربھم وذلة فی الحیٰوة الدنیا)۔

نیز اس تصور کو دور کرنے کے لیے کہ یہ قانون صرف ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے فرماتا ہے:

"وہ تمام لوگ جو (خدا پر) بہتان باندھتے ہیں انہیں ہم ایسی ہی سزا دیں گے" (وکذالک نجزی المفترین)۔

لفظ "اتخذوا" کی تعبیر سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ "بت" کی کوئی حقیقت

ہے، صرف بُت پرستوں کی قرار داد اور انتخاب ہے جو بُتوں کو مزعومہ شخصیت و مقام دیتی ہے۔ اسی بنا پر اس لفظ کے بعد ہی لفظ "عجل" آیا ہے یعنی وہ گوسالہ برائے پرستش انتخاب کے بعد بھی وہی گوسالہ ہی رہا۔

باقی رہتا ہے یہ سوال کہ اس "غضب" اور "ذلت" سے کیا مراد ہے؟ قرآن نے آیہ فوق میں اس امر کی کوئی توضیح نہیں کی ہے۔ صرف سربستہ کہہ کر بات آگے بڑھادی ہے لیکن ممکن ہے اس سے ان بدبختیوں اور پریشانیوں کی جانب اشارہ مقصود ہو جو اس ماجرے کے بعد اور بیت المقدس میں ان کی حکومت سے پہلے انہیں پیش آئیں۔

یا اس سے مراد اللہ کا وہ حکم ہو جو اس گناہ کے بعد انہیں دیا گیا کہ وہ بطور پاداش ایک دوسرے کو قتل کریں جس کی تفصیل اسی کتاب کی جلد اوّل میں گذر چکی ہے۔

اس جگہ ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ ہم نے تو یہ سنا ہے کہ ندامت اور پشیمانی کے ساتھ حقیقی توبہ کا تحقق ہو جاتا ہے، جب انہوں نے اپنی ندامت و پشیمانی کا اظہار کر دیا تو اللہ کی عفو و بخشش ان کے شامل حال کیوں نہ ہوئی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس بات کی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ صرف پشیمانی ہر گناہ کے معاف ہونے کے لیے کافی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ندامت ارکانِ توبہ میں سے ایک اہم رکن ہے لیکن یہ ارکان میں سے ایک رکن ہے رکنِ کامل نہیں ہے۔

گناہ و بت پرستی اور گوسالہ کے آگے سجدہ، وہ بھی اس وسعت و ہمہ گیری کے ساتھ، پھر اس ذرا سی مدت (چالیس روز) میں ان کا بے دین ہو جانا، وہ بھی اس قوم و ملت کا جس نے اتنے معجزات دیکھے ہوں یہ ایک ایسا چھوٹا سا گناہ نہ تھا جو ایک "استغفر اللہ" سے دُھل جاتے۔

بلکہ چاہیئے یہ ہے کہ یہ قوم غضب پروردگار کو اپنی آنکھوں سے دیکھے، ذلت کا مزہ اسی دنیاوی زندگی میں چکھے اور اس تازیانے کو اپنے بدن پر محسوس کرے جو ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو اللہ پر بہتان باندھتے ہیں تاکہ آئندہ اتنے عظیم گناہ کا تصور بھی نہ آنے پائے۔

اس کے بعد کی آیت میں اس موضوع کی تکمیل کر دی گئی ہے اور اسے ایک کلی قانون کے طور پر یُوں بیان کیا گیا ہے: لیکن وہ لوگ جو اعمالِ بَد بجا لائیں اور اس کے بعد توبہ کرلیں (اور توبہ کی تمام شرائط پوری کر دیں) اور خدا پر ایمان کی تجدید کریں اور ہر قسم کے شرک اور نافرمانی سے باز رہیں، تمہارا پروردگار ان سب کے بعد انہیں بخش دے گا وہ بخشنے والا اور مہربان ہے (والذین عملوا السیئات ثم تابوا من بعدها و اٰمنوا ان ربک من بعدها

لغفور رحیم)۔

دو سوالوں کا جواب

۱۔ آیا مذکورہ بالا دونوں آیتیں ایک جملہ معترضہ ہیں جو داستان بنی اسرائیل کے درمیان تذکر کے طور پر پیغمبر اسلامؐ پر نازل ہوئیں، یا یہ دونوں آیتیں واقعۂ گوسالہ پرستی کے بعد حضرت موسیٰؑ کے لیے خدا کا ایک پیام ہیں؟۔

بعض مفسرین نے پہلا احتمال ذکر کیا ہے دوسروں نے دوسرا احتمال قبول کیا ہے، جن لوگوں نے پہلا احتمال اختیار کیا ہے انہوں نے جملہ: "ان ربک من بعدھا لغفور رحیم" (تمہارا پروردگار توبہ کے بعد بخشنے والا مہربان ہے) سے استدلال کیا ہے، کیونکہ یہ جملہ پیغمبر اسلامؐ سے ایک خطاب ہے۔ اور جن لوگوں نے دوسرا احتمال اختیار کیا ہے انہوں نے جملہ "سینالھم غضب" (جلد ہی انہیں خدا کا غضب آئے گا) سے استدلال کیا ہے جو فعل مضارع کی صورت میں ہے۔

لیکن آیت کا ظاہر یہ کہتا ہے کہ ماجرائے گوسالہ پرستی کے بعد یہ خدا کے موسیٰؑ سے خطاب کا ایک حصہ ہے، اور فعل مضارع "سینالھم" اس کا ایک قوی شاہد ہے، جبکہ اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ "ان ربک" کا خطاب حضرت موسیٰؑ سے ہو۔[1]

۲۔ مندرجہ بالا آیہ میں توبہ کے بعد ایمان کا کیوں ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ اگر ایمان نہ ہو تو توبہ نہیں ہوتی؟

اس سوال کا جواب بھی اس سے ظاہر ہے کہ ایمان کے ستون گناہ کے بعد کمزور ہو جاتے ہیں کیونکہ اسلامی روایات میں ہے:

"شراب خور جب شراب پیتا ہے اس وقت ایمان نہیں رکھتا، اسی طرح زنا کرنے والا بھی زنا کرتے وقت ایمان سے خالی ہوتا ہے"

مقصد یہ ہے کہ اس وقت ایمان اپنی تازگی کو کھو دیتا ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ وہ تاریک کم نور اور کم اثر ہو جاتا ہے۔

لیکن جس وقت بندہ توبہ کر لیتا ہے تو ایمان کی لو دوبارہ بھڑک اٹھتی ہے اور ایمان دوبارہ تازہ ہو جاتا ہے۔

ضمنی طور پر اس پر بھی روشنی ڈالنا چاہیئے کہ اس آیت میں صرف ذلت دنیوی کا ذکر کیا گیا ہے

[1] اس آیت کی تقدیر اس طرح ہے: قال اللہ لموسیٰ ان الذین ...۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ان لوگوں نے شرک و بُت پرستی سے اپنی ندامت و پشیمانی کا اظہار کیا اور اس دنیا کی سزا کو قبول کیا تو بنی اسرائیل کے اس گناہ سے ان کی توبہ قبول ہوگئی اور آخرت کی سزا معاف ہوگئی اگرچہ دوسرے گناہوں کا جو بار تھا وہ ان کے کاندھوں پر باقی رہا۔

٭

آیات زیرِ بحث کی آخری آیت کہتی ہے ، جب موسٰی کے غضب کی آگ ٹھنڈی ہوئی (اور جس نتیجہ کی انہیں توقع تھی وہ ظاہر ہوگیا) موسٰی نے زمین پر سے الواح توریت اٹھالیں ، ایسی الواح جن کے نوشتہ میں سراسر ہدایت و رحمت تھی ، لیکن ہدایت و رحمت ان افراد کے لیے جو اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں اور اس کے حکم کے سامنے سرِتسلیم خم کرتے ہیں (ولما سکت عن موسی الغضب اخذ الالواح و فی نسختھا ھدی ورحمۃ للذین ھم لربھم یرھبون)۔

٭

(۱۵۵) وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ
الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِیَّایَ ؕ
اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِیَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ؕ
تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِیْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِیُّنَا
فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ ۝
(۱۵۶) وَاكْتُبْ لَنَا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ
اِنَّا هُدْنَآ اِلَیْكَ ؕ قَالَ عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِیْ
وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ
وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۝

ترجمہ

(۱۵۵) اور موسٰی نے ہماری میعادگاہ کے لیے اپنی قوم میں سے ستّر مردوں کو چُنا ، پھر

جب زلزلے نے انہیں آلیا (اور وہ ہلاک ہو گئے) تو کہا: میرے پروردگار! اگر تو چاہتا تو انہیں اور مجھے اس (واقعہ) سے پہلے ہی ہلاک کر دیتا، آیا تو ہمیں اس چیز کی وجہ سے ہلاک کرے گا جو ہم میں سے بعض نادانوں نے کی ہے۔ یہ صرف تیری ایک آزمائش ہے، جسے تُو چاہے (مستحق گمراہی جانے) گمراہ کر دے، اور جسے تُو چاہے (اور مستحق ہدایت جانے اسے) ہدایت عطا کر دے تُو ہمارا ولی ہے لہٰذا ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر اور تُو تمام بخشنے والوں سے بہتر ہے۔

۱۵۶ اور ہمارے لیے اس دار دنیا میں اور دوسری دنیا میں بھی نیکی لکھ دے کیونکہ ہم نے تیری طرف بازگشت کی ہے (اللہ نے) کہا: میرا عذاب جسے مَیں چاہوں گا پہنچے گا اور میری رحمت نے ہر چیز کو اپنی وسعت میں لیا ہوا ہے، پس مَیں اسے ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔

تفسیر

میعاد گاہ الٰہی میں بنی اسرائیل کے نمائندوں کا حضور

آیات مذکورہ بالا میں قرآن مجید نے دوبارہ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے کچھ منتخب افراد کے میعاد گاہ الٰہی میں جانے کا ذکر کیا ہے۔

حضرت موسیٰؑ ایک مرتبہ میعاد گاہ میں گئے یا یہ واقعہ متعدد بار پیش آیا اس بارے میں مفسرین کے درمیان بحث ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم نے اسی سورہ کی آیت ۱۴۲ کے ذیل میں یاد دہانی کروائی ہے کہ آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے جو قرائن حاصل ہوتے ہیں ان سب سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ ایک ہی مرتبہ میقات پر گئے تھے وہ بھی بنی اسرائیل کے کچھ نمائندوں کو لے کر، اسی میقات میں خدا نے

موسیٰ پر الواح توریت کو نازل کیا اور ان سے گفتگو کی، نیز اسی میقات کی بات ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے یہ پیشنہاد کی کہ وہ خدا سے اس بات کی درخواست کریں کہ وہ اپنے کو دکھلائے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں زلزلہ آیا یا صاعقہ آئی اور موسیٰ بے ہوش ہو گئے اور بنی اسرائیل زمین پر گر گئے، نیز علی بن ابراہیم قمی نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں جو حدیث نقل کی ہے اس میں بھی اس مطلب کی تصریح موجود ہے۔

اگر ان آیات کے محل وقوع اور ترتیب کے لحاظ سے کسی کے ذہن میں یہ اشکال پیدا ہو کہ ان آیات میں پہلے تو اللہ نے حضرت موسیٰ کی میعاد کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد گوسالہ پرستی کا واقعہ بیان کیا ہے، اس کے بعد دوبارہ میعاد کا ذکر چھیڑ دیا ہے، آیا اس طرح کی طرزِ ادا اس فصاحت و بلاغت سے مطابقت رکھتی ہے جو قرآن کا طرۂ امتیاز ہے؟ لیکن اگر اس بات کو زیر نظر رکھا جائے کہ قرآن کریم کوئی تاریخی کتاب تو ہے نہیں جس میں واقعات کے تسلسل کا لحاظ کیا جائے بلکہ اس کتاب کا اصل موضوع ہدایت اور انسان سازی ہے لہٰذا اس قسم کی کتاب میں کبھی اس کے موضوع کی اہمیت کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ ایک واقعہ کے تسلسل کو وقتی طور پر چھوڑ دیا جائے اور اس کی بجائے کسی دوسری ضروری بات کو بیان کر دیا جائے، جب وہ بات تمام ہو جائے تو دوبارہ پہلے واقعہ کی طرف پلٹا جائے۔

اس بنا پر یہ ضروری نہیں کہ ہم زیر بحث آیت کو قصہ گوسالہ پرستی کا تتمہ جانتے ہوئے یہ کہیں کہ حضرت موسیٰ اس ماجرے کے بعد دوبارہ بنی اسرائیل کو معذرت خواہی اور توبہ کے لیے کوہِ طور پر لے گئے تھے جیسا کہ بعض مفسرین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے، ایسا صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اگر دیگر جہات سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو اتنا تو ماننا پڑے گا کہ حضرت موسیٰ کے ساتھ جو لوگ گئے، وہ بجلی یا زلزلے کے بعد ہلاک ہو گئے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جو لوگ حضرت موسیٰ کی نمائندگی میں عذرخواہی کیلئے گئے تھے خدا انہیں معاف کرنے کی بجائے وہیں ہلاک کر دے؟

٭

بہرحال مذکورہ بالا آیات میں پہلے ارشاد ہوتا ہے: "موسیٰ نے ستر آدمیوں کو اپنی قوم میں سے ہماری میعاد کے لیے انتخاب کیا (واختار موسیٰ قومہ سبعین رجلا لمیقاتنا)۔

لیکن بنی اسرائیل نے جب خدا کا کلام سنا تو انہوں نے حضرت موسیٰ سے اس بات کی خواہش کی کہ وہ اپنے کو دکھلا دے۔" اس وقت ایک عظیم زلزلہ رونما ہوا جس کی وجہ سے وہ لوگ ہلاک ہو گئے اور موسیٰ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے[1] جب وہ ہوش میں آئے تو انہوں نے عرض کی: خدایا! اگر

---

[1] حضرت موسیٰ صرف اس زلزلہ کی وجہ سے بے ہوش نہیں ہوئے تھے بلکہ اس زلزلے سے پہلے ایک نور بھی ظاہر ہوا تھا جس کی تاب نہ لا (باقی اگلے صفحہ پر)

تو چاہتا تو انہیں اور مجھے اس سے پیشتر ہلاک کر دیتا، مطلب یہ ہے کہ میں باقی لوگوں کو کیا جواب دوں جن کے نمائندوں پر یہ افتاد آپڑی (فلمآ اخذ تھم الرجفة قال ربّ لو شئت اهلکتھم من قبل و ایای)۔

اس کے بعد موسیٰ نے کہا: پروردگارا ! یہ بے جا درخواست میری قوم میں سے جو نادان تھے ان کی تھی، کیا تو ان کی وجہ سے ہمیں ہلاک کر دے گا ؟ (اتھلکنا بما فعل السفھآء منا)۔

چونکہ اس آیت میں یہ ہے کہ میعاد گاہ میں زلزلہ آیا تھا، اور سورۂ بقرہ کی آیت ۵۵ (جو رویت پروردگار کے بارے میں نازل ہوئی ہے) میں " صاعقه " کا کلمہ آیا ہے اس لیے بعض مفسرین نے اس سے یہ مطلب نکالا ہے کہ میقات کا واقعہ دو مرتبہ رونما ہوا، لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر آتے ہیں کہ جب بجلی گرتی ہے تو اس کے ساتھ اکثر زلزلہ بھی آجایا کرتا ہے، کیونکہ جب مثبت اور منفی الیکٹریسٹی آپس میں متصادم ہوتی ہے (مثبت ابر میں اور منفی زمین میں پائی جاتی ہے) تو اس کی وجہ سے دھماکہ ہوتا ہے، شعلہ نکلتا ہے اور زمین ہل جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ جگہ بھی پاش پاش ہو جاتی ہے جہاں یہ واقعہ رونما ہوتا ہے۔ حضرت صالحؑ کے قصّہ میں بھی (سورہ فصلت آیت ۱۷ میں) جب ان کی گنہگار قوم پر عذاب نازل ہوا تھا تو اس میں بھی " صاعقہ " کا ذکر ہے اور کبھی " رجفہ " سے تعبیر کیا گیا ہے (جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت ۷۸ میں ہے)۔

نیز بعض مفسرین نے اس جملہ " بما فعل السفھآء منا " (اس عمل کے بدلے میں جو ہمارے نادانوں نے کیا ہے) کو اس بات کی دلیل سمجھا ہے کہ یہ سزا ان لوگوں کو ان کے عمل کی وجہ سے ملی تھی جیسے گوسالہ پرستی نہ کہ اس وجہ سے کہ انہوں نے خدا کی رویت کی خواہش کی تھی کیونکہ اس خواہش کا اظہار انہوں نے اپنے قول سے کیا تھا اور قول کو عمل نہیں کہا جاتا۔

اس بات کا جواب ظاہر ہے کیونکہ انسان کا بات کرنا بھی اس کے افعال میں داخل ہے " سخن " پر " فعل " کا اطلاق کوئی غیر معمولی اور نئی بات نہیں ہے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ انسان کے تمام افعال کی پاداش دے گا تو یقیناً اس میں ہمارے اقوال بھی داخل ہیں کیونکہ ان پر بھی جزا و سزا دے گا۔

اس کے بعد حضرت موسیٰ خدا کی بارگاہ میں عرض کرتے ہیں : اے پروردگار ! ہمیں معلوم ہے یہ تیری ایک آزمائش تھی جسے تو چاہے (اور اسے گمراہی کا مستحق سمجھے) گمراہ کر دے اور جسے تو چاہے (اور

(بقیہ حاشیہ) : کہ حضرت موسیٰ بیہوش ہو گئے تھے جیسا کہ اس آیت سے ظاہر ہے۔

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّ خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (اعراف۔ ۱۴۳)۔

جب اس کے ربّ نے پہاڑ کے سامنے اپنی تجلی دکھلائی تو اس پہاڑ کو منہدم کر دیا اور موسیٰ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ (مترجم)

اسے ہدایت کے لائق سمجھے) ہدایت کر دے (ان ھی الا فتنتك)۔

یہاں پر بھی مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف ہے کہ لفظ "فتنة" سے کیا مراد ہے، لیکن اگر اس بات کو دیکھا جائے کہ لفظ "فتنة" قرآن مجید میں آزمائش اور امتحان کے معنی میں بہت آیا ہے جیسا کہ سورۂ انفال کی آیت ۲۸ میں فرمایا گیا ہے:

اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ۔

تمہارے سرمائے اور تمہاری اولاد آزمائش ہیں۔

اسی طرح سورۂ عنکبوت کی آیت ۲ اور سورۂ توبہ کی آیت ۱۲۶ میں بھی ہے لہٰذا اس کا مفہوم بھی کچھ زیادہ پیچیدہ نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بنی اسرائیل کی اس واقعہ میں شدید آزمائش ہوئی تھی اور خدا نے ان پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان کی خواہش (تمنائے رویت) ایک نامناسب اور محال خواہش تھی۔

اس آیت کے آخر میں حضرت موسیٰ عرض کرتے ہیں: بار الٰہا! صرف تو ہی ہمارا ولی و سرپرست ہے، ہمیں بخش دے اور اپنی رحمت ہمارے شامل حال کر دے، تو بہترین بخشنے والا ہے (انت ولینا فاغفرلنا وارحمنا وانت خیر الغافرین)۔

ان تمام آیتوں اور دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام ہلاک ہونے والوں کو پھر نئے سرے سے زندگی مل گئی اور وہ لوگ حضرت موسیٰ کے ہمراہ ہی بنی اسرائیل کی طرف پلٹ کر آگئے اور انہوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ ان سے بیان کیا اور ان بے خبر لوگوں کی ہدایت میں مشغول ہو گئے۔

٭

اس کے بعد کی آیت حضرت موسیٰ کی درخواست کے تتمہ کے طور پر ہے جس میں مسئلہ توبہ جس کی طرف سابقہ آیت میں اشارہ ہو چکا ہے، کی تکمیل کی غرض سے حضرت موسیٰ عرض کرتے ہیں:

خداوندا! اس دنیا میں اور آخرت میں ہمارے لیے نیکی مقرر کر دے (واکتب لنا فی ھٰذہ الدنیا حسنة وفی الاٰخرة)۔

"حسنة" کے معنی ہر طرح کی نیکی، زیبائی اور خوبی کے ہیں۔ اس بناء پر تمام نعمتیں، عمل صالح کی توفیق، بخشا جانا، جنت کا ملنا، اور ہر طرح کی سعادت "حسنة" میں داخل ہے لہٰذا اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ "حسنة" کو کسی ایک فائدے کے ساتھ مخصوص کر دیا جائے جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے۔

اس کے بعد اس درخواست کی دلیل اس طرح بیان کرتے ہیں : ہم نے تیری طرف بازگشت کی ہے اور جو کلام ہمارے نادانوں نے کیا تھا اور وہ تیرے مقام کے مناسب نہ تھا اس سے ہم معافی کے خواستگار ہیں (انا ھدنا الیک)۔

"ھدنا" کا مادہ "ھود" (بروزن "صَوت") ہے جس کے معنی نرمی اور آہستگی کے ساتھ واپس لوٹنے کے ہیں۔ اس طرح کہ بعض اہل لغت نے اس کے معنی میں کہا ہے کہ خیر سے شر کی طرف اور شر سے خیر کی طرف لوٹنے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہے[1]۔ لیکن بہت سے مواقع پر یہ لفظ "توبہ" اور خدا کی اطاعت کی طرف پلٹنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

راغب اپنی کتاب "مفردات" میں بعض علماء سے یہ قول نقل کرتے ہیں کہ : قوم یہود کو یہود جو کہا جاتا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے۔ اس نام سے ان کی تعریف ظاہر ہوتی ہے یعنی یہ وہ قوم ہے جس نے خدا کی طرف بازگشت کی تھی، کثرتِ استعمال سے اس کے اصلی معنی فراموش ہوگئے اور صرف ایک نام کی حیثیت سے یہ لفظ باقی رہ گیا۔

لیکن اگر بعض علماً کے سابق قول کا لحاظ کیا جائے جس میں کہا گیا ہے کہ شر سے خیر کی طرف یا خیر سے شر کی طرف دونوں طرح کی بازگشت کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے تو اس معنی میں یہ لفظ یہودیوں کے لیے کسی خاص تعریف کا حامل نہ ہوگا بلکہ ممکن ہے اس لفظ سے ان کی متلوّن مزاجی کی حکایت کرنا مقصود ہو اور یہ بتلانا ہو کہ یہ قوم اخلاقی اعتبار سے پائیدار نہیں ہے۔

دیگر مفسرین نے کہا ہے کہ اس قوم کا نام "یہود" جو رکھا گیا ہے اس سے اس کے مادہ "ہود" کو کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ در اصل یہ لفظ "یہوذا" سے ہے جو حضرت یعقوبؑ کے فرزندوں میں سے ایک کا نام ہے، بعد ازاں "ذال" کو "دال" سے تبدیل کر دیا گیا اور "یہودا" ہوگیا اسی کی طرف قوم "یہودی" منسوب ہے[2]۔

بہرحال آخرکار اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ کی دعا قبول فرمائی اور ان کی توبہ قبول ہوئی لیکن کسی قید و شرط کے بغیر نہیں بلکہ اس کے ساتھ بعض شرطیں تھیں جن کا ذکر آیت کے ذیل میں فرمایا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

مَیں اپنا عذاب اور سزا جسے چاہوں گا (اور اسے اس سزا کا مستحق پاؤں گا) پہنچاؤں گا (قال عذابی اصیب بہ من اشآء)۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بارہا بیان کیا ہے کہ ان مواقع پر یہ جو لفظ "مشیت" استعمال کیا جاتا

---

[1] تفسیر المنار جلد ۹ صفحہ ۲۲۱۔ اس کے مؤلف نے اس بات کو ابن الاعرابی سے نقل کیا ہے۔

[2] تفسیر ابو الفتوح رازی جلد ۵ صفحہ ۳۰۰۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ہے، بلکہ دیگر تمام مقامات پر جہاں بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس کے معنی مطلقاً چاہنے کے نہیں ہیں یعنی بغیر قید و شرط کے چاہنا، بلکہ اس سے مراد ایسا چاہنا ہے جو حکمت اور اہلیت کے ساتھ مقید ہے اس طرح اس بارے میں جو اشکال بھی وارد ہو وہ دُور ہو جائے گا۔

اس کے بعد اضافہ فرمایا گیا ہے: لیکن میری رحمت ہر چیز کو اپنے دامن میں لیے ہوتے ہے (ورحمتی وسعت کل شیٔ)۔

خدا کی اس وسیع رحمت سے ممکن ہے دنیاوی نعمتوں کی طرف اشارہ مقصود ہو جو تمام مخلوقات کے شامل حال ہیں، نیک و بد مومن و کافر سب ہی ان سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

نیز ممکن ہے اس سے مادی و معنوی ہر طرح کی نعمتیں مراد ہوں کیونکہ خدا کی معنوی نعمتیں کسی ایک قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کے لیے کچھ شرطیں ہیں جن کے بغیر وہ کسی کو نہیں ملتیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ اللہ کی رحمت کے دروازے ہر ایک پر کھلے ہیں۔ اب یہ لوگوں کا کام ہے کہ وہ یہ فیصلہ کریں کہ ان دروازوں کے اندر داخل ہونا ہے کہ نہیں۔ اب اگر کوئی اپنے میں وہ شرطیں پیدا نہ کرے جن کی وجہ سے وہ ان دروازوں میں داخل ہو سکے تو یہ خود اس کی کوتاہی ہوگی اس سے اللہ کی رحمت پر کوئی حرف نہ آئے گا (دوسری تفسیر آیہ مذکورہ کے مفہوم سے زیادہ نسبت رکھتی ہے)۔

لیکن اگر کسی کو یہ خیال گزرے کہ اللہ کی رحمت ہر ایک کے لیے ہے اور ہر شخص بلا کسی قید و شرط کے اس کا مستحق قرار پا سکتا ہے تو اس توہم کو دُور کرنے کے لیے اس آیت کے آخر میں اضافہ فرمایا گیا ہے: میں عنقریب اپنی رحمت کو ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جن میں تین صفتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ تقویٰ کو اختیار کرتے ہوں، زکوٰۃ ادا کرتے ہوں اور ہماری آیتوں پر ایمان لائے ہوں" (فساکتبھا للذین یتقون ویؤتون الزکوٰۃ والذین ھم بآیاتنا یؤمنون)۔

"تقویٰ" سے ہر قسم کی آلائش اور گندگی سے بچنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

"زکوٰۃ" سے اس کے تمام اور ہمہ گیر معنی مراد ہیں جیسا کہ حدیث میں وارد ہوا ہے۔ "لکل شیٔ زکوٰۃ" ہر چیز کے لیے ایک زکوٰۃ ہوتی ہے، بنا بریں اس کے معنی ہر عمل نیک کے ہوں گے۔

یہ جملہ "والذین ھم بآیاتنا یؤمنون" تمام مذہبی مقدسات و عقائد پر ایمان لانے کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ اس طرح سے یہ آیت ایک ایسے نظام عمل پر مشتمل ہے جو ہر حیثیت سے کامل و جامع ہے۔

اور اگر "زکوٰۃ" سے اس کے خاص معنی یعنی "زکوٰۃ مال" مراد لیے جائیں تو تمام الٰہی فرائض میں سے صرف اس کا انتخاب کیا جانا اس اہمیت کی وجہ سے ہے جو اسے عدالتِ اجتماعی میں حاصل ہے۔

ایک حدیث شریف میں اس طرح نقل ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک دفعہ مشغول نماز تھے کہ ایک اعرابی کو یہ کہتے سنا وہ یہ کہہ رہا تھا:

اللّٰھم ارحمنی و محمدا ولاترحم معنا احدًا۔

یعنی خدایا! صرف مجھے اور محمد (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کو اپنی رحمت کے دامن میں لے لے اور ہم دونوں کے علاوہ کسی اور کو اپنی رحمت میں داخل نہ کرنا۔

جب حضرت رسول اللہؐ نے نماز ختم کی اور سلام پڑھا تو اس شخص کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا:

"لقد تحجرت واسعا"

یعنی تُو نے ایک لامحدود شے کو محدود کر دیا اور اسے ایک اختصاصی پہلو دے دیا ہے۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا وند کریم کی رحمت لامحدود و بے پایاں ہے اسے کسی عالم میں بھی میرے اور تیرے درمیان محدود نہیں کیا جا سکتا[1]

(۱۵۷) اَلَّذِیۡنَ یَتَّبِعُوۡنَ الرَّسُوۡلَ النَّبِیَّ الۡاُمِّیَّ الَّذِیۡ یَجِدُوۡنَهٗ مَكۡتُوۡبًا عِنۡدَهُمۡ فِی التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِيۡلِ يَاۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ‌ ؕ فَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِهٖ وَعَزَّرُوۡهُ وَنَصَرُوۡهُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ الَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهٗۤ ‌ۙ اُولٰۤـئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ۞

۱۹ ع ۹

ترجمہ

(۱۵۷) جو لوگ (خدا کے اس) فرستادہ نبی اُمّی کی پیروی کرتے ہیں جس کی صفات وہ

[1] تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

اپنے پاس توریت و انجیل میں پاتے ہیں اور یہ نبی انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور بدی سے روکتا ہے، پاکیزہ چیزیں ان کے لیے حلال قرار دیتا ہے، ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور وہ ان کے کاندھوں سے بوجھ ہٹاتا ہے، پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور انہوں نے اس کی حمایت کی اور اس کی مدد کی، اور اس نور کی پیروی کی جو اس پر نازل ہوا ہے، وہ کامیاب ہیں۔

تفسیر

ایسے پیمبر کی پیروی کرو

موجودہ آیت در اصل اس گذشتہ آیت کی تفصیل و تکمیل ہے جس میں ان لوگوں کی صفات بیان کی گئی ہیں جنہیں اللہ کی وسیع رحمت میسر ہے، یعنی تقوٰے، ادائے زکوٰۃ اور آیات الٰہی پر ایمان، ان صفات سہ گانہ کو ذکر کرنے کے بعد، اس آیت میں توضیح کے طور پر کچھ مزید صفات کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ پیغمبر اسلامؐ کی پیروی کرنا ہے کیونکہ خدا پر ایمان لانا، پیغمبر پر ایمان لانے اور ان کی پیروی کرنے سے جدا نہیں ہے، اسی طرح تقویٰ اور زکوٰۃ بھی رسول اللہؐ کی پیروی اور رہبری کے بغیر مکمل نہیں ہے۔

اس لیے فرمایا گیا ہے: وہ لوگ اس رحمتِ الٰہی میں داخل ہیں جو پروردگار عالم کے اس فرستادہ رسول کی پیروی کریں (الذین یتبعون الرسول)۔

اس کے بعد اس رسول کے متعلق خداوند کریم رسالت کے علاوہ چھ صفتیں بیان فرماتا ہے:

۱۔ وہ اللہ کا پیغمبر ہے (النبی)۔

نبی اس شخص کو کہتے ہیں جو خدا کا پیغام بیان کرے اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے چاہے اسے دعوت الی الحق اور تبلیغ کا حکم نہ دیا جائے۔ لیکن رسول وہ شخص ہے جسے مقام نبوت پر فائز ہونے کے ساتھ، دعوت الی الحق اور آئینِ الٰہی کی تبلیغ کرنے اور اس راہ میں قیام کرنے کا حکم بھی ملا ہو۔ در حقیقت رسالت کا درجہ نبوت سے بالاتر ہے اس بنا پر رسالت میں نبوت کا درجہ بھی شامل ہے، لیکن چونکہ آیہ مذکورہ مقام پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریح و توضیح کرنا چاہتی ہے لہٰذا اس نے ان دونوں کا مستقلاً ذکر کیا ہے۔ واقع میں جو معنی لفظ "رسول" میں پوشیدہ ہیں اسے مستقل اور

واضح طور پر اس کی تحلیل کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔

۲۔ ایسا پیغمبر جس نے کسی سے درس نہیں پڑھا اور وہ عام لوگوں میں سے مبعوث ہوا، اس نے سرزمین مکہ ام القریٰ سے توحید الٰہی کا حقیقی آفتاب بن کر طلوع کیا ہے (الامی)۔

لفظ "اُمی" (جو یا تو مادّہ "ام" جس کے معنی ماں کے ہیں، یا مادّہ "امت" جس کے معنی جمع اور گروہ کے ہیں، سے ماخوذ ہوا ہے) کے بارے میں مفسرین میں بحث ہے۔ کچھ لوگ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ اُمی وہ شخص ہے جس نے کسی سے درس نہ پڑھا ہو یعنی جس حالت میں ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اسی طرح باقی رہا ہو کسی استاد کے مدرسہ میں داخل نہ ہوا ہو۔

بعض نے اس کے یہ معنی لیے ہیں کہ اُمی وہ ہے جو عام افراد کے گروہ سے نکلا ہو۔ اشراف عیاش اور جبّار طبقہ سے نہ نکلا ہو۔

بعض کا خیال یہ ہے کہ لفظ "اُمی" "مکی" کے مترادف ہے یعنی ام القریٰ (مکہ) کا رہنے والا کیونکہ مکہ کا ایک نام "ام القریٰ" بھی ہے۔

اسلامی روایات جو مختلف ماخذوں سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں بھی "اُمی" بمعنی "اَن پڑھ" نہیں ہے بلکہ ان میں سے بعض روایات میں "اُمی" کی تفسیر "مکی" سے کی گئی ہے۔[1]

لیکن اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ لفظ "اُمی" سے تینوں مفہوموں کی طرف اشارہ مقصود ہو جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے کہ ایک لفظ کا استعمال چند معنی میں جائز ہے ادبیات عرب میں اس کے بہت سے شواہد ملتے ہیں (پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُمی ہونے کے معنی پر اس آیت کی تفسیر کے بعد تفصیلی طور سے روشنی ڈالی جائے گی انشاءاللہ)۔

۳۔ "نیز یہ ایسا پیغمبر ہے جس کی صفات، علامتیں اور اس کی حقانیت کی نشانیاں گذشتہ آسمانی کتابوں (توریت و انجیل وغیرہ) میں لوگ پاتے ہیں" (الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل)۔

اس آیت کی تفسیر مکمل ہونے کے بعد ہم اس بارے میں بھی مفصل طور پر بحث کریں گے کہ کتب عہدین (توریت و انجیل) میں حتیٰ کہ موجودہ تحریف شدہ کتب میں کہاں کہاں ہمارے نبی کی حقانیت کی مختلف بشارتیں اور پیشین گوئیاں پائی جاتی ہیں۔

۴۔ وہ ایسا پیغمبر ہے جس کی دعوت کا مفہوم عقل کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ وہ ان نیکیوں کی طرف جن کی عقل گواہی دیتی ہے لوگوں کو دعوت دیتا ہے، اور تمام بُرے کاموں سے جن سے عقل منع کرتی

---

[1] مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۹ اور تفسیر روح المعانی جلد ۹ صفحہ ۷۹ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

ہے روکتا ہے (یأمرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر)۔

۵۔ اس کی دعوت کا مفہوم فطرت سلیم سے بھی ہم آہنگ ہے چنانچہ وہ تمام پاک و پاکیزہ چیزوں کو جن کو طبع سلیم پسند کرتی ہے لوگوں کے لیے پسند کرتا ہے اور وہ ان کے لیے حلال قرار دیتا ہے اور جو چیز خبیث اور قابلِ نفرت ہے اسے لوگوں پر حرام قرار دیتا ہے (و یحل لھم الطیبات و یحرم علیھم الخبآئث)۔

۶۔ وہ ان جھوٹے نبیوں کی طرح نہیں ہے جن کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ سادہ لوح افراد کو پھانسیں اور ان سے ناجائز فوائد حاصل کریں، یہ نبی صرف اتنا ہی نہیں کہ ان کے کندھے پر کسی قسم کا بار نہیں رکھتا بلکہ ان کے دوش سے بھاری بوجھ اتارتا ہے اور ان تمام طوق و سلاسل کو ان سے الگ کرتا ہے جنھوں نے بشریت کے ہاتھوں اور پیروں کو (جاہلانہ عقائد و رسوم کی زنجیروں سے) جکڑ دیا تھا (و یضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم)[1]

چونکہ یہ چھ صفات مقامِ رسالت کو ملانے کے بعد سات صفتیں بنتی ہیں، یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعوے کی روشن دلیلیں ہیں اس لیے اضافہ فرمایا گیا ہے: جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کے درجہ کو بلند سمجھیں اور تبلیغ رسالت میں اس کی مدد کریں اور اس آشکار نور (یعنی قرآن مجید) کی پیروی کریں جو اس پر نازل ہوا ہے بلاشبہ ایسے افراد کامیاب ہیں (فالذین اٰمنوا بہٖ و عزّروہ و نصروہ واتبعوا النور الذیٓ انزل معہٗٓ اولٰٓئک ھم المفلحون)۔

"عزّروہ" مادّہ "تعزیر" سے ہے جس کے معنی اس طرح کی حمایت و مدد کرنے کے ہیں جس میں احترام کی آمیزش بھی ہو، بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز سے منع کرنے اور روکنے کے ہیں، اگر دشمن سے بچایا اور روکا جائے تو اس کا مفہوم مدد کرنے کا ہوگا اور اگر یہ منع کرنا گناہ سے ہو تو اس کے معنی سزا اور تنبیہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر ہلکی سزاؤں کو "تعزیر" کہتے ہیں۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ بالا آیت میں "انزل الیہ" کے بجائے کلمہ "انزل معہ" (اس کے ساتھ نازل ہوا) آیا ہے جبکہ ہمیں پتہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان سے نازل نہیں ہوتے تھے، لیکن چونکہ آپ کی نبوت و رسالت قرآن کے ساتھ خدا کی جانب سے نازل ہوئی ہے لہٰذا لفظ "معہ" کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔[2]

---

[1] "اصر" کے معنی لغت میں نگہداشت کرنے اور محبوس کرنے کے ہیں اس بنا پر اس سنگین کام کو جو انسان کو دوسرے کاموں سے روک دے "اصر" کہتے ہیں اگر عہد و پیمان یا کیفر و سزا کو بھی "اصر" کہتے ہیں تو وہ ان محدودیتوں کی بنا پر ہے جو یہ چیزیں انسان کیلئے پیدا کرتی ہے۔

[2] تفسیر برہان میں علی بن ابراہیم قمی سے منقول ہے کہ "النور الذی انزل معہ" سے مراد حضرت امیرالمومنین علیہ السلام ہیں نیز اس کی (باقی اگلے صفحہ پر)

چند قابلِ توجہ امور

۱۔ آنحضرتؐ کی نبوت پر ایک آیت میں پانچ دلیلیں: قرآنِ کریم کی کسی آیت میں آنحضرتؐ کی حقانیت پر اتنی دلیلیں اکٹھا نہیں ملیں گی جتنی اس آیت میں موجود ہیں۔

اگر ہم پیغمبر آخرالزمانؐ کی ان سات صفتوں پر غور کریں جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں تو ہمیں آنحضرتؐ کی حقانیت کی پانچ روشن دلیلیں ملیں گی۔

اول: یہ کہ وہ "اُمّی" تھے یعنی انہوں نے کسی کے آگے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا، اس کے باوجود انہوں نے ایسی کتاب پیش کی جس نے نہ صرف اہلِ حجاز کی قسمت بدل دی بلکہ وہ تاریخِ بشریت میں سب کی توجہ کا مرکز بنی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو آپ کی نبوّت کے قائل نہیں ہیں انہیں بھی اس کتاب کی عظمت اور اس کی تعلیمات کی ہمہ گیری میں کوئی شک نہیں ہے۔

ایک ایسا انسان جس نے نہ تو کسی سے درس پڑھا، نہ وہ مدرسہ گیا، بلکہ اس نے ایک انتہائی جاہلانہ ماحول اور بربریت کی فضا میں پرورش پائی، کیا بر بنائے عادت و معمول یہ ممکن ہے کہ ایسا شخص تنہا اتنا بڑا کام انجام دے؟!

دوم: یہ کہ اس کی نبوّت کی دلیلیں مختلف الفاظ میں گذشتہ آسمانی کتابوں میں پائی جاتی ہیں جس سے ایک حق طلب انسان کو اس کی حقانیت کا پتہ ملتا ہے اور وہ مطمئن ہو جاتا ہے، یہ ایسی بشارتیں ہیں جو صرف اس کی ذات اور اس کے صفات پر منطبق ہوتی ہیں۔

سوم: یہ کہ اس کی دعوت کے جو اصول ہیں وہ عقل و دانش کے مطابق ہیں، کیونکہ اچھائی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا عقل کے مطابق ہے یہی اس کی دعوت کا مقصد ہے جو اس کی تعلیمات سے حاصل ہوتا ہے۔

چہارم: یہ کہ اس کی دعوت کے اصول طبعِ سلیم اور فطرتِ انسانی کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہیں۔

پنجم: یہ کہ اگر آپؐ اللہ کے فرستادہ نہ ہوتے تو یہ بات حتمی ہے کہ آپؐ اتنے بڑے کام کے پردہ میں اپنے ذاتی منافع کو پیشِ نظر رکھتے، اور اگر ایسا ہوتا تو آپؐ نہ صرف لوگوں کو ان کے قید و بند سے آزاد نہ کرواتے بلکہ انہیں اسی عالمِ غفلت و بے خبری میں پڑا رہنے دیتے، اس طرح سے آپؐ ان سے زیادہ ناجائز فائدے حاصل کر سکتے تھے۔ جبکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آپؐ نے بشریت کے

بقیہ حاشیہ: تائید حدیث "انا و علی من نور واحد" سے بھی ہوتی ہے۔ (مترجم)

ہاتھ پاؤں سے بھاری زنجیروں کو الگ کر دیا ہے :

جن زنجیروں کو آپؐ نے کاٹا ان میں سے بعض یہ ہیں :

جہل ونادانی کی زنجیریں، جنہیں آپؐ نے اس طرح کاٹا کر لوگوں کو علم و دانش کی طرف مسلسل اور ہمہ گیر دعوت دی۔

بت پرستی اور خرافات پرستی کی زنجیریں : جنہیں آپؐ نے دعوت توحید کے ذریعے کاٹا۔

قبائلی تعصب کی زنجیریں، جنہیں آپؐ نے یوں ختم کیا کہ انہیں اخوتِ اسلامی کی تعلیم دی۔

دنیاوی لحاظ سے پستی و بلندی کی زنجیریں : جنہیں آپؐ نے مساوات کی تعلیم کے ذریعے کاٹ دیا۔

اس کے علاوہ دیگر طرح طرح کی زنجیریں جن کو آپؐ نے بیک قلم قلم کر دیا۔ یہ کارنامہ بجائے خود آپؐ کی حقانیت کی زبردست دلیل ہے۔

۲۔ پیغمبرؐ کے "اُمّی" ہونے کا کیا مطلب ہے؟ : لفظ "اُمّی" کے مفہوم کے بارے میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے عام طور پر تین احتمال بیان کیے جاتے ہیں :

اوّل۔ اس کے معنی "اَن پڑھ" کے ہیں۔

دوم۔ "اُمّی"، وہ ہے جو "اُم القریٰ" یعنی سرزمین مکہ میں پیدا ہوا اور وہاں اس کی پرورش ہوئی ہو۔

سوم۔ وہ شخص جو عوام الناس میں سے اٹھا ہو، لیکن سب سے زیادہ مشہور پہلی تفسیر ہے جو اس کلمہ کے موارد استعمال سے بھی زیادہ تعلق رکھتی ہے اور جیسا کہ ہم نے بیان کیا ممکن ہے کہ تینوں معنی مراد لیے گئے ہوں۔

یہ بات کہ آنحضرتؐ نے نہ تو کسی معلم سے تعلیم حاصل کی اور نہ ہی آپؐ کسی مدرسہ میں گئے، اس میں مؤرخین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، قرآن کریم میں بھی سورۂ عنکبوت کی آیت ۴۸ میں پیغمبرؐ کی قبل بعثت حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ ۔

یعنی تم اس (اعلانِ رسالت) سے قبل نہ تو کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ ہی اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے جس کی وجہ سے دشمنوں کو یہ موقع ملے کہ وہ تمہاری رسالت میں شک و شبہ ڈال سکیں۔

سرزمین حجاز میں عام طور پر پڑھے لکھے لوگ اس قدر کم تھے کہ وہ تمام سرزمین میں گنتی کے ہونے کی وجہ سے جانے اور پہچانے جاتے تھے، یہاں تک کہ سرزمین مکہ جو حجاز کا مرکز سمجھی جاتی تھی اس

میں پڑھے لکھے مردوں کی تعداد کُل ۱۷ عدد تھی اور عورتوں میں سے صرف ایک عورت لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔[1]

یہ بات واضح اور مسلّم ہے کہ ان چند محدود افراد میں سے کسی ایک سے بھی اگر پیغمبر پڑھنا لکھنا سیکھتے تو یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ رہتی بلکہ سب کے زبان زد ہو جاتی۔

اگر ہم آپ کی نبوت کو تسلیم نہ بھی کریں، تب بھی یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ نے مکہ کے محدود افراد میں سے کسی سے پڑھا ہو اور اس کے بعد آپ نے اس سے انکار کر دیا ہو۔ اگر آپ نے پڑھا ہوتا تو اہلِ مکہ میں سے کوئی تو کہتا کہ اے محمد! تم غلط کہتے ہو کہ تم نے کسی سے نہیں پڑھا، تم نے تو فلاں شخص سے تعلیم حاصل کی ہے۔

بہر حال پیغمبرؐ کی یہ صفت (اَن پڑھ ہونا) آپ کی نبوّت کی بنیاد کو مستحکم کرتی ہے تاکہ آپ کو ذاتِ خداوندی اور دنیائے ماوراء الطبیعت سے جو تعلق حاصل ہے اس کا لوگوں کو یقین حاصل ہو اور اس سلسلہ میں آپؐ جو دعوت دیں اسے لوگ قبول کر لیں۔

آپؐ کا یہ حال قبل از بعثت کا تھا، بعثت کے بعد بھی کسی تاریخ میں نہیں ملتا کہ آپؐ نے اپنے اعلانِ نبوّت کے بعد کسی سے تعلیم حاصل کی ہو، بنا بریں آپؐ اپنی اسی سابقہ اُمی حالت میں آخر عمر تک باقی رہے۔

لیکن ایک بڑی غلط فہمی جو یہاں پر پیدا ہوتی ہے اور اس سے اجتناب ضروری ہے یہ ہے کہ درس نہ پڑھنا الگ چیز ہے اور جاہل ہونے کا الگ مفہوم ہے۔ لہٰذا اس سے یہ مطلب نہیں نکالنا چاہیئے کہ آپؐ معاذ اللہ کوئی جاہل شخص تھے۔ اس لیے جن لوگوں نے "اُمّی" کی یہ تفسیر کی ہے کہ آپؐ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے گویا ان کی توجہ اس نکتے کی طرف نہیں ہے۔

اس میں کوئی مانع نہیں ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الٰہی تعلیم کے ذریعے سے پڑھنا یا پڑھنا اور لکھنا جانتے تھے بغیر اس کے کہ آپؐ نے کسی بشر سے ان امور کو سیکھا ہو کیونکہ اس صفت کا بلاشبہ کمالاتِ انسانی میں شمار ہوتا ہے اور اس سے مقامِ نبوّت کی تکمیل ہوتی ہے۔

اس مطلب کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جو آئمہ طاہرین صلوات اللہ علیہم سے مروی ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا آپ میں اس کی صلاحیت موجود تھی۔[2]

لیکن اس لیے کہ آپؐ کی نبوّت میں کسی کو چھوٹے سے چھوٹا شبہ بھی نہ ہونے پائے آپؐ اپنی

---

[1] فتوح البلدان بلاذری، طبع مصر ص ۴۵۹۔

[2] تفسیر برہان جلد ۴ ص ۳۳۲ سورہ جمعہ کی ابتدائی آیات کے ذیل میں۔

اس صفت سے کام نہیں لیتے تھے۔

اس مقام پر یہ جو کہا گیا ہے کہ لکھنے اور پڑھنے کی قوت بذاتِ خود کوئی کمال نہیں ہے بلکہ یہ دونوں علم حقیقی اور کمالات تک پہنچنے کی سیڑھی ہیں، یہ خود حقیقی علم نہیں ہیں، اس بات کا جواب خود اس میں پوشیدہ ہے کیونکہ کسی کمال کے وسیلے سے آگاہی بذاتِ خود ایک کمال شمار ہوتی ہے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ آئمہ طاہرینؑ کی بعض روایات میں "اُمّی" کے ان معنی (ان پڑھ) کی صریحی طور سے نفی کی گئی ہے، بلکہ اس کے معنی "مکی" بیان کیے گئے ہیں؟ اور "اُمّی" کو "ام القریٰ" سے لیا گیا ہے[1]

اس کے جواب میں ہم کہیں گے اس مفہوم کی دو روایتیں ہیں جن میں سے ایک روایت وہ ہے جسے اصطلاح میں "مرفوعہ" کہا جاتا ہے لہٰذا وہ سند کے لحاظ سے بے وقعت ہے۔ دوسری روایت میں ایک راوی بنام "جعفر بن محمد صوفی" ہے جو علم رجال کی رُو سے مجہول شخص ہے۔

اب رہا یہ امر کہ بعض لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ سورۂ جمعہ میں خدا فرماتا ہے:

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

نیز اسی مطلب کی دیگر آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ پیغمبرؐ قرآن کو دیکھ کر لوگوں کے سامنے پڑھتے تھے، یہ غلط فہمی پر مبنی ہے کیونکہ لفظ "تلاوت" دیکھ کر پڑھنے کو بھی کہتے ہیں اور حافظہ سے پڑھنے کو بھی کہتے ہیں، جو لوگ قرآن کی آیات، یا اشعار یا دعائیں اپنی یادداشت سے پڑھتے ہیں اس پر بھی تلاوت کا اطلاق بکثرت ہوا ہے۔

بہرحال جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے حسبِ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ پیغمبرؐ نے یقیناً کسی شخص سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا اور نہ وہ سوائے خدا کی ذات کے کسی کے شاگرد تھے۔

۲۔ کوئی معتبر دلیل اس بات کی موجود نہیں ہے کہ آپؐ نے اپنی نبوت کے اعلان سے پہلے یا اس کے بعد، عملی طور پر، کبھی کچھ پڑھا یا لکھا ہو۔

۳۔ یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ آپؐ پروردگار عالم کی تعلیم کی بنا پر لکھنے اور پڑھنے پر قادر تھے۔

کتب عہدین میں پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کی بشارتیں

اگرچہ اس بات کے یقینی قرائن موجود ہیں کہ یہود و نصاریٰ کی مقدس کتابیں (توریت و انجیل) وہ اصلی کتابیں نہیں ہیں جو حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ پر آسمان سے نازل ہوئی تھیں، بلکہ انسان کا دستِ تحریف ان کی طرف دراز ہوا ہے ان کتابوں میں سے کچھ حصہ بالکل ضائع ہوگیا ہے اور اس

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۳۳۲ و تفسیر نور الثقلین، جلد ۲ صفحہ ۸۷ زیر بحث آیہ کے ذیل میں۔

وقت جو لوگوں کے پاس موجود ہے وہ ایک مخلوط و مرکب کتاب ہے جس میں کچھ ایسے افکار ہیں جو ذہن انسانی کی پیداوار ہیں اور کچھ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی وہ تعلیمات ہیں جو ان دو نبیوں پر نازل ہوئی تھیں اور ان کے شاگردوں کے پاس موجود تھیں [1]

اس بنا پر اگر موجودہ کتب میں آنحضرتؐ کی پیشین گوئی کے متعلق کوئی صریح جملہ نہ ملے تو اس میں کوئی جائے تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔

لیکن اس کے باوجود انہی تحریف شدہ کتابوں میں ایسی عبارتیں ملتی ہیں جن سے اس پیغمبر عالیمقامؐ کے ظہور کا کھلا اشارہ ملتا ہے۔ ان عبارتوں کو ہمارے بعض علماء نے اپنی کتابوں یا مقالوں میں جو اس موضوع پر تحریر کیے ہیں، اکٹھا کیا ہے۔ چونکہ ان سب کا تذکرہ طول کا باعث ہے اس لیے نمونہ کے طور پر ان میں سے بعض کا ہم یہاں پر تذکرہ کرتے ہیں:

۱۔ توریت سفر تکوین فصل ۱۷، نمبر ۱۷ تا ۲۰ میں ہے:

اور ابراہیم نے خدا سے کہا کاش اسماعیل تیرے حضور میں زندہ رہے (خدا نے جواب دیا) اے ابراہیم! ہم نے اسماعیل کے بارے میں تمہاری دعا سن لی۔ ہم نے اسے برکت دی اور اسے بہت زیادہ پھولنے پھلنے والا قرار دیا چنانچہ اس کی نسل سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور انہیں ہم بہت بڑی امت قرار دیں گے۔

۲۔ سفر پیدائش باب ۴۹ نمبر ۱۰ میں ہے:

عصای سلطنت یہودا سے اور ایک فرمان روا اس کے پیروں کے آگے سے قیام کریگا تا اینکہ "شیلوہ" آجائے کہ اس پر تمام امتیں اکٹھا ہو جائیں گی۔

یہاں پر یہ بات قابل توجہ ہے کہ لفظ "شیلوہ" کے ایک معنی "رسول" یا "رسول اللہ" کے ہیں جیساکہ مسٹر ہاکس نے اپنی کتاب "قاموس مقدس" میں تصریح کی ہے۔

۳۔ انجیل یوحنا باب ۱۴ نمبر ۱۵ و ۱۶ میں ہے:

اگر تم مجھے دوست رکھتے ہو تو میرے احکام کو محفوظ رکھنا اور میں باپ سے سوال کروں گا تو وہ ایک دوسرا تسلی دینے والا تم کو عطا کر دے گا جو ابد تک تمہارے ساتھ رہیگا۔

۴۔ انجیل یوحنا باب ۱۴ نمبر ۲۶ میں ہے:

وہ تسلی دینے والا آئے گا کہ جسے میں اپنے باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی وہ ایک صحیح روح کہ جو باپ کی طرف سے آئے گی وہ میرے بارے میں گواہی دے گی۔

۵۔ نیز اسی انجیل یوحنا باب ۱۶ نمبر ۷ میں ہے:

---

[1] مزید آگاہی کے لیے ملاحظہ ہو کتاب "رہبر سعادت یا دین محمدؐ" اور کتاب "قرآن و آخرین پیامبر"۔

لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لیے یہ بہتر ہے کہ میں چلا جاؤں کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ تسلی دہندہ تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر میں چلا جاؤں تو میں اسے تمہارے پاس بھجوا دوں گا... لیکن جب ۔ وہ ۔ یعنی راستی کا روحِ رواں آجائے گا تو وہ تم کو راستی (صراطِ مستقیم) کی طرف ہدایت کرے گا کیونکہ وہ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہے گا بلکہ جو (خدا سے) سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ ہونے والے واقعات کی خبر دے گا۔[1]

یہاں پر جس نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ فارسی انجیلوں میں مذکورہ بالا جملوں میں جو انجیل یوحنا سے لیے گئے ہیں کلمہ ۔ تسلی دہندہ ۔ آیا ہے لیکن عربی انجیل مطبوعہ لندن (مطبعہ ولیم وٹیس ۔ سال ۱۸۵۷ء) میں اس کے بجائے فارقلیط کا لفظ مذکور ہے۔

۱۵۸ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ِۨالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۵۸ کہہ دو: اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا فرستادہ ہوں، وہ اللہ جس کے قبضۂ قدرت میں زمین و آسمان کی حکومت ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ جلاتا اور مارتا ہے، پس اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ جس نے کسی کے آگے درس نہیں پڑھا ہے وہ اللہ اور اس کے کلموں پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو تاکہ ہدایت پا جاؤ۔

---

[1] یہ تمام عبارتیں جو اوپر کتب عہد قدیم و جدید سے نقل کی گئیں ہیں اس فارسی ترجمہ سے لی گئی ہیں جو ۱۸۷۸ عیسوی میں لندن میں مشہور عیسائی علماء کے ذریعہ عربی سے فارسی میں ترجمہ ہوا ہے۔

تفسیر

پیغمبرؐ کی عالمگیر دعوت

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے :

کچھ یہودی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عرض کی ، اے محمدؐ کیا تم ہی وہ شخص ہو جس نے یہ خیال کیا ہے کہ وہ اللہ کا فرستادہ ہے اور حضرت موسیٰؑ کی طرح تم پر وحی نازل ہوتی ہے ؟!

حضرت رسول اللہؐ نے تھوڑا سکوت کیا اس کے بعد فرمایا : ہاں میں ہوں سید اولادِ آدم، لیکن اس پر فخر نہیں کرتا ، میں ہی خاتم الانبیاء ، امام اتقیاء ، اور رسولِ پروردگارِ عالم ہوں ۔ انہوں نے پوچھا : تم کس کی طرف بھیجے گئے ہو ؟ عرب کی طرف یا عجم کی طرف یا ہماری طرف ؟!

ان کے اس سوال کے جواب میں یہ آیہ (مذکورہ بالا) نازل ہوئی جس میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ آپ کی رسالت تمام جہانوں کے لیے ہے [1]

لیکن اس کے باوجود اس آیت کا ربط گذشتہ آیت سے قابلِ انکار نہیں ہے کیونکہ گذشتہ آیت میں بھی صفاتِ پیغمبرؐ کا تذکرہ کیا گیا تھا اور اس آیت میں بھی صفاتِ پیغمبرؐ کا ذکر ہے ۔

ابتدا میں پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا ہے : "کہہ دو : اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں" (قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا) ۔

یہ آیت بھی دیگر بہت سی قرآنی آیات کی طرح اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرتؐ کی رسالت عالمی اور جہانی تھی ۔

اسی طرح سورہ سبا کی ۲۸ ویں آیت میں ہے :

"وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ"

ہم نے تمہیں نہیں بھیجا ہے مگر تمام انسانوں کی طرف ۔

اور سورہ انعام کی ۱۹ ویں آیت میں ہے :

وَاُوۡحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ لِاُنۡذِرَكُمۡ بِهٖ وَمَنۡۢ بَلَغَ ۔

اس قرآن کی وحی میری طرف اس لیے ہوتی ہے کہ تمہیں اس کے ذریعے ڈراؤں اور ان لوگوں کو ڈراؤں جن تک اس (قرآن) کی آواز پہنچے ۔

---

[1] تفسیر صافی ، آیت مذکورہ بالا کے ذیل میں ، کتاب مجالس کے حوالے سے ۔

اور سورہ فرقان کے شروع میں ہے :

"تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ؛"

پائندہ و برقرار ہے[1] وہ خدا جس نے اپنے بندہ پر قرآن نازل کیا تاکہ تمام جہانوں کے رہنے والوں کو (ان پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کے بارے میں) ڈرائے۔

یہ آیتیں نمونے کے طور پر پیش کی گئی ہیں جو اس بات کی گواہ ہیں کہ آپ کی رسالت جہانی تھی، نیز اس کے بارے میں انشاء اللہ ہم سورۂ شوریٰ کی آیت ۷ کے ذیل میں مزید بحث کریں گے نیز سورۂ انعام کی آیت ۹۲ کے ذیل میں بھی ہم اس موضوع پر کافی بحث کر آئے ہیں[2]

اس کے بعد جس خدا کی طرف پیغمبرؐ نے دعوت دی اس کی تین صفتیں بیان ہوتی ہیں :

وہ خدا جس کے قبضۂ قدرت میں آسمانوں اور زمینوں کی حکومت ہے (الذی له ملك السمٰوات والارض) ۔

وہ خدا جس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود ایسا موجود نہیں ہے جو پرستش کے لیے سزاوار ہو (لآ الٰه الا هو) ۔

ایسا خدا جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، اور زندگی اور موت کا نظام اسی کے ہاتھ میں ہے (یحیی و یمیت) ۔

اس طرح سے یہ آیت ہر اس الوہیت کی نفی کرتی ہے جو آسمانوں اور زمینوں کی خالق نہ ہو۔ اسی طرح ہر قسم کی بت پرستی، تثلیث مسیحیت کی بھی نفی کرتی ہے۔ نیز اس بات کی بھی مظہر ہے کہ وہ اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ سارے جہانوں کے لیے کوئی رسول بھیجے اور وہ روزِ قیامت برپا کرنے کی بھی طاقت رکھتا ہے۔

آخر میں تمام اہلِ جہان کو دعوت دی گئی ہے کہ : ایمان لے آؤ اللہ پر اور اس کے اس رسول پر جس نے کسی سے درس نہیں پڑھا اور وہ عام لوگوں کے گروہ میں سے مبعوث ہوا ہے (فآمنوا باللّٰه ورسوله النبی الامی) ۔

"ایک ایسا پیغمبر جو صرف دوسرے لوگوں کو ہی ان حقائق کی دعوت نہیں دیتا بلکہ پہلے وہ اپنی بات پر یعنی خدا اور اس کے فرمانوں پر ایمان رکھتا ہے" (الذی یؤمن باللّٰه وکلماته) ۔

وہ صرف ان آیات کو قبول نہیں کرتا کہ جو اس کے اوپر نازل ہوئی ہیں بلکہ وہ تمام پچھلے گذشتہ نبیوں کو بھی مانتا ہے ۔

---

[1] برکتوں والا ہے ۔ (مترجم)

[2] تفسیر نمونہ جلد ۳ ۔

اس کا اپنے آئین پر ایمان لانا اس کے اعمال و کردار سے صاف آشکار ہے جو اس کی حقانیت پر ایک روشن دلیل ہے کیونکہ کسی کہنے والے کا عمل کافی حد تک اس بات کا مظہر ہے کہ وہ اپنی بات پر خود کتنا ایمان رکھتا ہے۔ اپنی بات پر ایمان رکھنا اس کی صداقت کی دلیلوں میں سے ایک ہے۔ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ اپنے احکام کی کتنی لاج رکھتے تھے اور آپ کو اپنی گفتار پر کس قدر یقین و ایمان تھا۔

ہاں! ایسے پیغمبر کی پیروی کرو، تاکہ ہدایت کا نور تمہارے دلوں میں چمک اٹھے اور تم سعادت کے راستے پر چل پڑو" (واتبعوہ لعلکم تہتدون)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تنہا ایمان کافی نہیں ہے بلکہ یہ اس وقت مفید ہے جب عملی پیروی کے ساتھ ساتھ ہو۔ اسی صورت میں یہ ایمان مکمل ہوگا۔

جاذب توجہ یہ امر ہے کہ آیت مذکورہ بالا مکہ میں اس وقت نازل ہوئی جب پیروان اسلام نہایت اقلیت میں تھے ان کی تعداد اس قدر کم تھی کہ کسی کو یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ شاید پیغمبر اسلامؐ ایک آنے والے وقت میں مکہ پر مسلط ہو سکتے ہیں چہ جائیکہ جزیرۃ العرب یا دنیا کا ایک اہم حصہ ان کے زیر اقتدار آسکتا ہے۔

لہٰذا جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ پیغمبر اسلامؐ نے پہلے تو صرف مکہ والوں کے لیے اپنی رسالت کا دعویٰ کیا تھا، پھر جب ان کے مشن نے قوت پکڑی اور لوگ زیادہ سے زیادہ دین اسلام اختیار کرنے لگے تو انہیں پورے حجاز پر قبضہ کرنے کی فکر ہوئی پھر اس کے بعد دیگر ممالک کو فتح کرنے کا خیال آیا اور دنیا کے مختلف بادشاہوں کو خط لکھے جانے لگے اور تب انہوں نے اپنے آئین کے عالمی ہونے کا اعلان کیا، ان تمام باتوں کا جواب آیۂ مذکورہ بالا دے رہی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے یہ آیت صاف اعلان کر رہی ہے کہ آپؐ نے اپنی رسالت کے آغاز ہی میں اس کے جہانی اور عالمی ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔

۱۵۹ وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰٓى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ○

۱۶۰ وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى
مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ
فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ

مَشْرَبَهُمْ ؕ وَ ظَلَّلْنَا عَلَیْهِمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَیْهِمُ الْمَنَّ
وَالسَّلْوٰی ؕ كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ
كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ یَظْلِمُوْنَ ○

ترجمہ

(۱۵۹) اور قوم موسٰیؑ میں سے ایک گروہ حق کی طرف ہدایت کرتا ہے اور اسی حق کے ساتھ عدالت کرتا ہے۔

(۱۶۰) اور ہم نے انہیں بارہ گروہوں میں تقسیم کر دیا جس میں سے ہر ایک گروہ (بنی اسرائیل کے خاندانوں کی) ایک شاخ تھا اور جس وقت موسٰی نے اپنی قوم (جو بیابان میں تشنہ کام تھی) کے لیے پانی مانگا تو ہم نے ان کی طرف وحی کی کہ اپنا عصا پتھر پر مارو، ناگہاں اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے، اس طرح کہ ہر گروہ اپنے چشمہ کو پہچانتا تھا اور ہم نے بادل کو ان کے اوپر سایہ فگن کیا، اور ہم نے ان پر من وسلویٰ نازل کیا اور ان سے کہا کہ ہم نے جو پاکیزہ روزی تمہیں عطا کی ہے اس میں سے کھاؤ (اور اللہ کا شکر بجا لاؤ، لیکن انہوں نے شکر کی بجائے ہماری نافرمانی اور ظلم کیا) لیکن انہوں نے ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنی جانوں پر ستم ڈھایا۔

تفسیر

بنی اسرائیل پر اللہ کی نعمتوں کی ایک جھلک

ان آیات میں ایک مرتبہ پھر بنی اسرائیل اور ان کی سرگزشت کا ذکر ہوا ہے۔
پہلی آیت میں ایک ایسی واقعیت کی طرف اشارہ ہے جس کی شبیہ اور مثل ہم قرآن میں دیکھ

چکے ہیں۔ یہ ایک ایسی واقعیت ہے جو قرآن کریم کی روحِ حق طلبی کی حکایت کرتی ہے یعنی نیک کردار اقلیتوں کا پاس و لحاظ یعنی: ایسا نہ تھا کہ بنی اسرائیل تمام کے تمام فاسد و مفسد تھے جس کے نتیجے میں یہ قوم ایک سرکش و گمراہ قوم کی حیثیت سے پہچانی جائے، بلکہ ان کی فتنہ انگیز اکثریت کے مقابلے میں ان کی ایک ایسی اقلیت بھی تھی جو صالح تھی اور وہ اکثریت کے مذاق کے برخلاف تھی۔ قرآن اس صالح اقلیت کے لیے ایک خاص اہمیت کا قائل ہے، وہ کہتا ہے: اور قوم موسٰی میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو حق کی طرف دعوت دیتا ہے اور حق و عدالت کے ساتھ حاکم ہے (ومن قوم موسیٰ امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون)۔

ممکن ہے اس آیت کے ذریعے ان تھوڑے سے افراد کی طرف اشارہ مقصود ہو جنہوں نے سامری کے حکم کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا بلکہ وہ ہر حال میں حضرت موسیٰؑ کے پیغام کے حامی و طرفدار رہے، یا اس سے وہ صالح گروہ مراد ہو جو حضرت موسیٰؑ کے بعد برسرِ عمل آیا۔

لیکن یہ معنیٰ آیت کے ظاہر سے زیادہ مطابقت نہیں رکھتا، کیونکہ "یھدون" اور "یعدلون" فعل مضارع کے صیغے ہیں جو کم از کم زمانۂ حال یعنی زمان نزولِ قرآن کی حکایت کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا گروہ اس وقت بھی موجود تھا، اِلّا یہ کہ یہاں پر ایک لفظ "کان" کو مقدر مانا جائے تاکہ اس آیت کا مطلب حال کے بدلے ماضی میں ہو جائے مگر ہمیں معلوم ہے کہ بغیر کسی قرینہ کے کسی لفظ کو عبارت میں مقدر کرنا خلافِ ظاہر ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس قوم سے مراد زمانۂ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانہ کے وہ انصاف پسند یہودی ہوں جنہوں نے آنحضرتؐ کی دعوت پر توجہ دی اور بعد میں وہ آہستہ آہستہ مسلمان ہوتے چلے گئے، یہ تفسیر اس آیت کے الفاظ کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

اب رہی یہ بات کہ بعض شیعہ اور سُنّی روایات میں جو آیا ہے کہ اس سے مراد بنی اسرائیل کا وہ چھوٹا سا گروہ ہے جو ماوراء چین میں زندگی بسر کرتا ہے، یہ لوگ عادلانہ، تقویٰ اور خداشناسی اور خدا پرستی کی زندگی بسر کرتے ہیں، یہ تفسیر علاوہ اس کے کہ ہمارے اس علم کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی جو ہمیں دنیا کے متعلق حاصل ہے کہ ایسے لوگ دنیا میں کہیں نہیں پائے جاتے، مذکورہ احادیث سند کی رُو سے بھی معتبر نہیں ہیں اس لیے ایسی روایات کا سہارا نہیں لیا جا سکتا۔

⁂

اس کے بعد کی آیت میں ان چند نعمتوں کا ذکر ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھیں: پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ گروہوں میں تقسیم کیا (وقطعنا ھم اثنتی عشرۃ اسباطا اممًا)۔

یہ بات ظاہر ہے کہ جب ایک قوم کی تقسیم بندی انتظامی طور پر کی جائے جس کا ہر حصہ یا ہر گروہ ایک لائق رہبر کے زیر انتظام بھی ہو تو اس قوم کی نگہداشت و تربیت زیادہ آسان ہو جاتی ہے اور ان کے درمیان عدالت و انصاف کرنا بھی سہل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا کے تمام ممالک اس کوشش میں مصروف ہیں کہ اس قاعدہ کی پیروی کریں۔

کلمہ "اسباط" جمع ہے "سبط" (بروزن "ثبت" اسی طرح بر وزن "سفت") کی جس کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کو بآسانی وسعت دینا۔ بعد ازاں اس لفظ کو اولادِ انسانی کی ایک خاص قسم یعنی نواسہ کو کہا جانے لگا۔ نیز خاندان کے دوسرے شعبوں کو بھی سبط یا اسباط کہا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کو ملنے والی دوسری نعمت یہ تھی کہ وہ جس وقت اس تپتے ریگستان میں بیت المقدس کی طرف سفر کر رہے تھے اور انہیں خطرناک اور جان لیوا تشنگی نے آ لیا اور انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے پانی طلب کیا تو "ہم نے موسیٰ کی طرف یہ وحی کی کہ اپنا عصا پتھر پر مارو۔ انہوں نے جب یہ عمل کیا تو ناگہاں اس پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے" (واوحینا الی موسیٰ اذ استسقاہ قومہٗ ان اضرب بعصاک الحجر فانبجست منہ اثنتا عشرۃ عینا)۔

اور یہ چشمے اس طرح سے ان کے درمیان تقسیم کر دیئے گئے کہ ان میں سے "ہر ایک بخوبی اپنے چشمے کو جانتا پہچانتا تھا" (قد علم کل اناس مشربھم)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بارہ چشمے جو اس عظیم پتھر سے نمودار ہوتے تھے، آپس میں الگ الگ نشانیاں رکھتے تھے اور ایک دوسرے سے مختلف تھے جس کی بنا پر بنی اسرائیل کے قبائل میں سے ہر ایک اپنے چشمے کو پہچانتا تھا۔ اور یہ بجائے خود اس بات کا سبب تھا کہ بنی اسرائیل آپس میں اختلاف نہ کریں۔ ان میں آپس کا نظم و انضباط برقرار رہے اور وہ آسانی کے ساتھ سیراب ہو جائیں۔

ایک اور نعمت اللہ کی طرف سے ان کو ملی تھی جبکہ وہ انتہائی گرم اور جلسانے والے بیابان میں سرگرداں تھے اور ان کے لیے سر چھپانے کی کوئی پناہ گاہ نہ تھی وہ یہ تھی کہ "کہ ہم نے ان کے اوپر بادل سایہ فگن کیا" (وظللنا علیھم الغمام)۔

بالآخر چوتھی نعمت ان کے لیے یہ تھی کہ "من و سلویٰ کو دو لذیذ اور مقوی غذاؤں کے طور پر ان کے لیے بھیجا" (وانزلنا علیھم المن والسلوٰی)۔

"من و سلویٰ" ان دو دل پسند اور مفید غذاؤں (جو اللہ نے اس بیابان میں بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھیں) کے بارے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں بیان کی ہیں جنہیں ہم اسی کتاب کی جلد اوّل میں سورۂ بقرہ کی آیت ۵۷ کی تفسیر میں بیان کر آئے ہیں۔ وہاں ہم نے کہا ہے کہ یہ بات بعید

نہیں کہ "من" ایک طرح کا شہد تھا جو اطراف کے پہاڑوں میں پایا جاتا تھا، یا مخصوص درختوں کا شیرہ تھا جو اسی بیابان کے درختوں سے نکلتا تھا اور "سلویٰ" کبوتر کی طرح کا ایک پرندہ تھا۔[1]

اور ہم نے ان سے کہا کہ "جو پاک و پاکیزہ غذائیں ہم نے تم کو عطا کی ہیں ان میں سے کھاؤ (اور خدا کے فرمان پر چلو) (کلوا من طیبات ما رزقناکم)۔

لیکن انہوں نے کھایا اور ناشکری کی، ان لوگوں نے "ہم پر ستم نہیں کیا بلکہ خود اپنی جانوں پر ستم ڈھایا" (وما ظلمونا ولکن کانوآ انفسھم یظلمون)۔

اس بات کی طرف توجہ رہے کہ اس آیت کا مضمون تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ سورۃ بقرہ کی آیت ۵۷، ۶۰ میں بھی گزر چکا ہے اِلّا یہ کہ وہاں پر بجائے "انبجست" کے "انفجرت" آیا ہے، اور جیسا کہ مفسرین کی ایک جماعت کا خیال ہے ان دونوں لفظوں میں فرق یہ ہے کہ "انفجرت" کے معنی زیادہ پانی کے زور کے ساتھ پھوٹنے کے ہیں، جبکہ "انبجست" کے معنی تھوڑے پانی کے باہر نکلنے کے ہیں، اس کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ وہ چشمہ یک بیک زور اور کثرت کے ساتھ باہر نہیں نکل پڑا ورنہ اس پر قابو پانا مشکل ہو جاتا اور لوگ گھبرا جاتے بلکہ وہ پہلے آہستہ آہستہ اور کم مقدار میں نمایاں ہوا، پھر اس کے بعد اس کے زور اور مقدار میں اضافہ ہوا، جبکہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ دونوں کلمے ایک ہی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

(۱۶۱) وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْٓـٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ○

(۱۶۲) فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ○

---

[1] "من و سلویٰ" کے بارے میں مزید توضیح کے لئے ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ آیت ۵۷ کے ذیل میں۔

ترجمہ

(۱۶۱) اور (وہ وقت یاد کرو) جب ان لوگوں سے یہ کہا گیا کہ اس قریہ (بیت المقدس) میں سکونت اختیار کرو اور ہر جگہ سے (اور ہر طرح سے) جیسا چاہو کھاؤ (اور فائدہ حاصل کرو) اور یہ کہو کہ بار الٰہا! ہمارے گناہوں کو گرا دے، اور دروازۂ (بیت المقدس) میں تواضع و فروتنی کے ساتھ داخل ہو جاؤ، اگر ایسا کرو گے تو میں تمہارے گناہوں کو بخش دوں گا اور نیک کام کرنے والوں کا صلہ زیادہ عطا کروں گا۔

(۱۶۲) لیکن ان میں سے وہ لوگ جنہوں نے (اپنے اوپر) ظلم و ستم کیا تھا، انہوں نے اس بات (اور طے شدہ پروگراموں) کو الٹ پلٹ کر دیا اور جو بات ان سے کہی گئی تھی انہوں نے اس کے خلاف کیا، لہٰذا جو ستم انہوں نے کیا تھا ہم نے اس کی وجہ سے ان پر آسمان سے بلا نازل کی۔

تفسیر

پچھلی آیات کا تسلسل باقی رکھتے ہوئے، ان دو آیتوں میں بھی پروردگار عالم نے بنی اسرائیل کے لیے اپنی نعمتوں کا ذکر کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ انہوں نے اپنی سرکشی اور طغیان کے ذریعے کس طرح اس کا بدلہ دیا۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے، اس وقت کو یاد کرو جب ان لوگوں سے کہا گیا کہ اس سر زمین (بیت المقدس) میں سکونت اختیار کرو اور وہاں کی بکثرت نعمتوں سے، ہر جگہ سے جس طرح چاہو استفادہ کرو (واذ قیل لهم اسکنوا هٰذه القریة وکلوا منها حیث شئتم)۔

اور ہم نے ان سے کہا، خدا سے اپنے گناہوں کے جھڑنے اور اپنی خطاؤں کے بخشے جانے کی درخواست کرو اور بیت المقدس میں بڑی فروتنی کے ساتھ داخل ہو جاؤ (وقولوا حطة وادخلوا الباب سجدًا)۔

پس اگر تم نے اس بات پر عمل کیا تو ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور تم میں سے جو

نیکوکار ہیں انہیں بہتر بدلہ عطا کریں گے" (نغفرلکم خطیئاتکم سنزید المحسنین)۔

لیکن باوجود یکہ اللہ کی رحمت کے دروازے ان پر کھول دیئے گئے تھے اور انہیں اس بات کا موقع دیا گیا تھا کہ اگر وہ اس موقع سے استفادہ کریں تو اپنے گزشتہ اور آئندہ اعمال کی اصلاح کرلیں مگر بنی اسرائیل کے ظالموں نے نہ صرف یہ کہ اس موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا بلکہ انہوں نے فرمان پروردگار کے برعکس عمل کیا (فبدّل الذین ظلموا قولاً غیر الذی قیل لھم)۔

" آخرکار ان کی اس نافرمانی اور اپنی جانوں پر ستم کرنے کی وجہ سے ہم نے ان پر آسمان سے عذاب نازل کیا" (فارسلنا علیھم رجزًا من السماء بما کانوا یظلمون)۔

اس بات کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ ان دونوں آیتوں کا مضمون بھی تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ سورۂ بقرہ کی آیت ۵۸ اور ۵۹ میں آ چکا ہے اور اس کی تفسیر بھی ہم شرح و بسط کے ساتھ وہاں بیان کرچکے ہیں[1]۔

دونوں مقامات پر جو فرق ہے وہ صرف اتنا ہے کہ یہاں آخر میں فرمایا گیا ہے : بما کانوا یظلمون ، اور وہاں ارشاد ہوا ہے : بما کانوا یفسقون ، اور شاید ان دونوں کا فرق اس وجہ سے ہو کہ گناہوں کے دو رُخ ہوتے ہیں، ایک وہ جس کا تعلق خدا سے ہوتا ہے دوسرا وہ جس کا تعلق خود انسان سے ہوتا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت میں لفظ "فسق" استعمال کیا گیا ہے جس کا مفہوم ہے "پروردگارِ عالم کے فرمان سے خروج" جبکہ اِس آیت میں "ظلم" سے تعبیر کرکے دوسرے رُخ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حطّة کیا ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم ملا تھا کہ جب وہ بیت المقدس میں وارد ہوں تو ایک خالص اور واقعی توبہ کے ذریعہ جو لفظ "حطّہ" کے اندر مضمر ہے' اپنے دل و دماغ کو گناہوں کی آلائش سے دھو ڈالیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگیں جو بیت المقدس پہنچنے سے پہلے انہوں نے خصوصاً اپنے اس عظیم پیغمبر حضرت موسٰی علیہ السلام کو جو تکلیفیں پہنچائی تھیں ان سب کی خدا سے معافی طلب کریں۔

کلمہ "حطة" جو بیت المقدس پہنچنے کے وقت ان لوگوں کا نعرہ تھا" مسئلتنا حطة" کا مخفف

[1] ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد اول۔

تھا ، جس کے معنی ہیں ۔ ہم اپنے گناہوں کے جھڑنے کا سوال کرتے ہیں' کیونکہ ۔ حطۃ ۔ کے معنی کسی چیز کے اوپر سے نیچے کی طرف آنے کے ہیں ۔

لیکن اس نعرہ کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ دوسرے نعروں کی طرح یہ بھی صرف زبان پر آکر رہ جائے اور دل کی گہرائیوں میں نہ اترے ، نہیں ، بلکہ مقصد یہ تھا کہ ان کی زبان ان کی روح اور ان کے تمام ذرات وجود کی ترجمان ہو لیکن جیسا کہ بعد والی آیت میں آیا ہے ان میں سے بہتوں نے اس اصلاحی نعرہ کو بھی مسخ کر دیا اور اسے ایک ناشائستہ شکل دے دی اور اسے مذاق اڑانے کا ذریعہ بنا لیا ۔

(۱۶۳) وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ
إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ
شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ ۙ لَا تَأْتِيهِمْ ۚ كَذَٰلِكَ ۚ نَبْلُوهُمْ
بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝
(۱۶۴) وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا ۙ اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ
أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ۖ قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ
وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝
(۱۶۵) فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ
عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ
بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ۝
(۱۶۶) فَلَمَّا عَتَوْا عَن مَّا نُهُوا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُونُوا
قِرَدَةً خَاسِئِينَ ۝

ترجمہ

(۱۶۳) اور ان سے سوال کرو اس شہر کی سرگزشت کے متعلق جو سمندر کے کنارے پر آباد تھا (اور اس وقت کو یاد کرو جبکہ) وہ ہفتہ کے دن (خدا کے قانون کے خلاف) طغیان و سرکشی کرتے تھے، جس وقت ان کی مچھلیاں ہفتہ کے روز ظاہر ہوتی تھیں (جو ان کی چھٹی کا دن تھا) اس کے علاوہ دوسرے روز وہ ان کے پاس نہیں آتی تھیں؛ اس طرح ہم نے ان کی آزمائش کی جس کے مقابلے میں وہ نافرمانی کرتے تھے۔

(۱۶۴) (اور اس وقت کو یاد کرو) جبکہ ان میں سے ایک گروہ نے یہ کہا کہ تم ان گنہگاروں کو کیوں موعظہ کرتے ہو جنہیں خدا آخر کار ہلاک کرنے والا ہے یا عذاب کرنے والا ہے، شدید عذاب کے ساتھ (ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو یہاں تک کہ وہ ہلاک ہو جائیں)، انہوں نے کہا کہ یہ نصیحتیں تمہارے پروردگار کے سامنے اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے ہیں، علاوہ ازیں شاید وہ ان کی بناء پر (اپنے گناہوں سے باز آجائیں) اور تقویٰ اختیار کریں۔

(۱۶۵) لیکن جب انہوں نے ان تمام نصیحتوں کو فراموش کر دیا جو انہیں وقتاً فوقتاً دی جاتی رہیں تو ہم نے ان لوگوں کو نجات دی جو (لوگوں کو برائی سے) منع کرتے رہے تھے اور جن لوگوں نے ستم کیا تھا انہیں ان کی نافرمانی کی وجہ سے شدید عذاب میں مبتلا کر دیا۔

(۱۶۶) جب ان لوگوں نے اس فرمان کے مقابلے میں سرکشی کی جو انہیں دیا گیا تھا تو ہم نے ان سے کہا کہ بندروں کی شکل میں ہو کر دُور ہو جاؤ[1]

---

[1] اگرچہ اس آیت میں "دُور ہو جاؤ" کے معنی میں کوئی لفظ نہیں ہے، لیکن مفردات راغب میں ہے "خسأت الکلب
(باقی اگلے صفحہ پر)

تفسیر

ایک عبرت انگیز سرگزشت

ان آیات میں بنی اسرائیل کی ایک اور پُر حوادث سرگزشت کا ذکر ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کی اُس جماعت کا تذکرہ ہے جو سمندر کے کنارے رہتی تھی۔ مگر یہ کہ ان آیات میں خطاب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ تم اپنے زمانے کے یہودیوں سے ان لوگوں کے متعلق سوال کرو، مقصد یہ ہے کہ اس واقعے کی یاد ان کے ذہنوں میں سوال کے ذریعے تازہ کرو تاکہ یہ اس سے عبرت حاصل کریں اور طغیان و سرکشی اور اس کے نتیجے میں انہیں جو سزا ملنے والی ہے اس سے اجتناب کریں۔

جیسا کہ اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے یہ سرگزشت بظاہر ان یہودیوں کی ہے جو ایک سمندر (بظاہر بحیرۂ احمر جو فلسطین کے پاس ہے) کے کنارے شہر "ایلہ" (جسے آج کل "ایلات" کہتے ہیں) میں رہتے تھے، ان کی آزمائش کے لیے اللہ نے انہیں حکم دیا تھا کہ ہفتہ کے روز مچھلی کا شکار نہ کریں، سارے دنوں میں شکار کریں صرف ایک دن تعطیل کر دیا کریں لیکن ان لوگوں نے اس حکم کی صریحاً مخالفت کی جس کے نتیجے میں وہ دردناک عذاب میں مبتلا ہوئے جس کی تفصیل ان آیات میں بیان کی گئی ہے۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: جو یہودی تمہارے زمانے میں موجود ہیں ان سے اس شہر کے ماجرے کے متعلق سوال کرو جو سمندر کے کنارے آباد تھا" (واسئلهم عن القرية التي كانت حاضرة البحر)۔

"اور انہیں وہ زمانہ یاد دلاؤ جبکہ وہ ہفتہ کے روز قانونِ الٰہی کی مخالفت کرتے تھے" (اذ يعدون في السبت)۔

کیونکہ ہفتہ کے روز ان کی تعطیل کا دن تھا جس میں ان کو یہ حکم ملا تھا کہ اس روز وہ اپنا کاروبار ترک کر دیں اور عبادت خدا میں مشغول ہوں لیکن انہوں نے اس حکم کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔

اس کے بعد قرآن کریم اس جملے کی جو اجمالی طور پر پہلے گزر چکا ہے اس طرح شرح کرتا ہے کہ یاد کرو۔ جب ہفتہ کے دن مچھلیاں پانی کے اوپر ظاہر ہوتی تھیں اور دوسرے دنوں میں وہ کم دکھلائی دیتی تھیں" (اذ تأتيهم حيتانهم يوم سبتهم شرعا)۔

بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ: فخسأ یعنی زجرته فانزجر۔ میں نے کتے کو ذلت کے ساتھ جھڑکا پس اس نے جھڑکا جانا قبول کیا یعنی بھاگ گیا لہٰذا ایمان پر اُردو میں لازمی معنی یہ ہوں گے کہ: ذلت کی حالت میں بندروں کی شکل میں ہو کر دور ہو جاؤ۔ (مترجم)

"سبت" کے معنی لغت میں استراحت کے لیے تعطیل کرنے کے ہیں اور یہ جو قرآن میں سورہ "سبا" میں ہم پڑھتے ہیں:

وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا۔

ہم نے تمہاری نیند کو استراحت کا سبب قرار دیا ہے۔

اس سے بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ مقصود ہے، چونکہ ہفتہ کے روز یہودیوں میں کاروبار بند ہو جاتا تھا اس لیے اس دن کو "سبت" کہا جانے لگا اور یہی نام آج تک باقی رہ گیا۔

یہ بات واضح ہے کہ جو لوگ سمندر کے کنارے زندگی بسر کرتے تھے ان کی خوراک اور آمدنی کا بڑا ذریعہ مچھلی کا شکار ہوتا تھا اور چونکہ ہفتہ کے روز مسلسل تعطیل ان کے درمیان رائج رہی تھی لہٰذا اس روز مچھلیاں امن محسوس کرتی تھیں اور وہ گروہ در گروہ پانی کی سطح پر ظاہر ہوتی تھیں لیکن دوسرے دنوں میں چونکہ ان کا شکار کیا جاتا تھا اس لیے وہ گہرے پانی میں بھاگ جاتی تھیں۔ بہرحال یہ کیفیت چاہے کسی فطری امر کے نتیجہ میں ہو یا کوئی خلاف معمول الٰہی بات ہو اس سے ان لوگوں کی آزمائش مطلوب تھی جیسا کہ قرآن بیان کرتا ہے:

ہم نے اس طرح ان لوگوں کی آزمائش کی اس چیز کے ذریعے جس کی وہ مخالفت کرتے تھے (كذالك نبلوهم بما كانوا يفسقون)۔

درحقیقت جملہ "بما كانوا يفسقون" کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی آزمائش اس چیز کے ذریعے کی گئی تھی جو انہیں اپنی طرف جذب کرتی تھی اور انہیں نافرمانی کی طرف دعوت دیتی تھی اور تمام آزمائشیں اسی طرح کی ہوتی ہیں کیونکہ آزمائش کا کام یہ ہے کہ وہ کشش گناہ کے مقابلہ میں لوگوں کی قوت مقابلہ کو معین کرے، اگر گناہ اپنے میں کوئی کشش نہ رکھے تو آزمائش کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔

جس وقت بنی اسرائیل اس بڑی آزمائش سے دوچار ہوئے جو ان کی زندگی کے ساتھ وابستہ تھی تو وہ تین گروہوں میں بٹ گئے:

اوّل: جن کی اکثریت تھی، وہ لوگ تھے جنہوں نے اس فرمانِ الٰہی کی مخالفت پر کمر باندھ لی۔

دوم: جو حسبِ معمول ایک چھوٹی اقلیت پر مشتمل تھا وہ گروہِ اوّل کے مقابلے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرعی ذمہ داری ادا کرتا تھا۔

سوم: یہ وہ لوگ تھے جو ساکت اور غیر جانبدار تھے۔ یہ نہ تو گنہگاروں کے ساتھ تھے اور نہ انہیں گناہوں سے منع کرتے تھے۔

دوسری زیر بحث آیت میں اس گروہ نے دوسرے گروہ سے جو گفتگو کی ہے اسے نقل کیا گیا ہے:
اس وقت کو یاد کرو جب ان میں سے ایک گروہ نے دوسرے سے کہا:
تم ان لوگوں کو کیوں وعظ و نصیحت کرتے ہو جنہیں آخر کار خدا ہلاک کرنے والا ہے یا دردناک عذاب میں مبتلا کرنے والا ہے (واذ قالت امة منهم لم تعظون قوما الله مهلكهم او معذبهم عذابا شديدا)۔[1]

انہوں نے جواب میں کہا: ہم اس لیے برائی سے منع کرتے ہیں کہ خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری کو ادا کر دیں اور وہ اس بارے میں ہم سے کوئی باز پرس نہ کرے۔ علاوہ ازیں شاید ان کے دلوں میں ہماری باتوں کا کوئی اثر بھی ہو جائے اور وہ طغیان و سرکشی سے ہاتھ اٹھالیں (قالوا معذرة الى ربكم ولعلهم يتقون)۔

مذکورہ بالا جملے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نصیحت کرنے والے دو اغراض کے ماتحت یہ کام انجام دیتے تھے، ایک تو یہ کہ خدا کے سامنے وہ معذور قرار پا جائیں کہ انہوں نے اپنی ذمہ داری کو ادا کر دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ شاید گناہگاروں کے دل میں یہ بات اتر جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر احتمالِ تاثیر نہ بھی ہو تب بھی نصیحت کرنا چاہیئے، جبکہ مشہور یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اولین شرط یہ ہے کہ احتمال تاثیر ہو۔

لیکن اس بات کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حقائق اور اپنی ذمہ داریوں کا بیان کرنا واجب ہو جاتا ہے چاہے تاثیر کا احتمال نہ بھی ہو۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب حالت یہ ہو کہ اگر حکم الٰہی بیان نہ کیا جائے اور گناہ پر تنقید نہ کی جائے تو وہ حکم الٰہی نذر طاقِ نسیان کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ بدعتیں لے لیں گی اور شعلیین کے سکوت کو ان کی رضا مندی کی دلیل سمجھا جائے گا، اس موقع پر ضروری ہے کہ حکم خدا کو آشکارا طور پر ہر جگہ بیان کیا جائے چاہے گنہگاروں پر اس کا کوئی اثر نہ ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ نہی کرنے والے یہ کہتے تھے: ہم چاہتے ہیں کہ تمہارے پروردگار کی بارگاہ میں ہم معذور سمجھے جائیں۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ تم بھی خدا کے سامنے مسئولیت رکھتے ہو یہ صرف ہماری شرعی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ تمہاری ذمہ داری بھی ہے۔

---

[1] ان لوگوں کو "امة منهم" سے جو تعبیر کیا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گروہ دوم گروہ اول سے تعداد میں کم تھا کیونکہ پہلے گروہ کے لیے "قوما" کی تعبیر استعمال کی گئی ہے (بغیر کلمہ "منهم" کے) بعض روایات میں ہیں اس طرح ملتا ہے کہ اس شہر کی تعداد اسی ہزار سے زیادہ تھی جس میں سے ستر ہزار نے گناہ کا ارتکاب کیا تھا (تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۴۲)۔

اس کے بعد والی آیت کہتی ہے کہ: آخرکار دنیا پرستی نے ان پر غلبہ کیا۔ اور انہوں نے خدا کے فرمان کو فراموش کر دیا، اس وقت ہم نے ان لوگوں کو جو لوگوں کو گناہ سے منع کرتے تھے، نجات دی، لیکن گنہگاروں کو ان کے گناہ کے سبب سخت عذاب میں مبتلا کر دیا (فلما نسوا ما ذکروا بہٖ انجینا الذین ینھون عن السوٓء واخذنا الذین ظلموا بعذاب بئیس بما کانوا یفسقون)۔[1]

اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ۔ فراموشی۔ ایسی حقیقی فراموشی نہ تھی جو موجب عذر ہوتی ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے خدائی فرمان سے اس طرح بے اعتنائی برتی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اسے بالکل فراموش کر دیا ہے۔

اس کے بعد انہیں سزا دیئے جانے کی کیفیت اس طرح بیان فرمائی گئی ہے: انہوں نے اس بات کے مقابلے میں سرکشی کی جس سے انہیں روکا گیا تھا (لہٰذا) ہم نے ان سے کہا دھتکارے ہوئے بندروں کی شکل میں ہو جاؤ (فلما عتوا عما نھوا عنہ قلنا لھم کونوا قردۃ خاسئین)۔[2]

ظاہر ہے کہ امر "کونوا" (ہو جاؤ) یہاں پر ایک فرمانِ تکوینی ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے:

اِنَّمَآ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيۡـًٔا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ (یٰسین - ۸۲)

چند قابلِ توجہ باتیں

۱۔ بنی اسرائیل نے کس طرح گناہ کیا تھا؟: اس امر میں کہ بنی اسرائیل نے کس وقت قانون شکنی کی، مفسرین کے درمیان بحث ہے۔ بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ایک حیلہ اختیار کیا، انہوں نے سمندر کے کنارے بہت سے حوض بنا لیے تھے اور انہیں نہروں کے ذریعے سمندر سے ملا دیا تھا۔ ہفتہ کے روز ان حوضوں کے راستے کھول دیتے تھے پانی کے ساتھ مچھلیاں ان حوضوں کے اندر آجاتی تھیں، غروب کے وقت جب واپس جانا چاہتی تھیں تو واپسی کا راستہ بند کر دیتے تھے، جب اتوار کا دن ہوتا تھا تو پھر ان کا شکار کر لیتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ہم نے ہفتہ کے روز شکار تھوڑی کیا ہے بلکہ ہم نے تو صرف انہیں حوضوں میں محصور کر لیا تھا اصل شکار تو اتوار کے

---

[1] لفظ "بئیس" کی اصل "بأس" ہے جس کے معنی شدید ہیں۔

[2] لفظ "عتوا" کی اصل "عتو" (بروزن غلو) ہے جس کے معنی ہیں "نافرمانی"۔ جن مفسرین نے اس کے معنی "رکنے" کے لیے ہیں وہ اہلِ لغت کے اقوال کے خلاف ہے۔

روز ہوتا ہے۔[1]

بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ وہ لوگ ہفتہ کے روز مچھلی پکڑنے کے کانٹوں کو دریا میں ڈال دیتے تھے اس کے بعد جب اس میں مچھلیاں پھنس جاتی تھیں تو دوسرے روز انہیں نکال لیتے تھے اور اس حیلہ سے ان کا شکار کرتے تھے۔

بعض روایات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ بغیر کسی حیلہ کے بروز شنبہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ شکار میں مشغول ہوتے تھے۔

ممکن ہے کہ یہ تمام روایات صحیح ہوں اس طرح کہ ابتدأ میں حوضوں یا قلابوں کے ذریعے حیلے سے شکار کرتے ہوں، جب اس طرح سے ان کی نظر میں گناہ کی اہمیت کم ہوگئی ہو تو پھر انہوں نے اعلانیہ گناہ کرنا شروع کر دیا ہو اور ہفتہ کے دن کی حرمت کو ضائع کرکے مچھلی کی تجارت سے مالدار ہو گئے ہوں۔

۲۔ کن لوگوں کو عذاب سے نجات ملی؟: مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تین گروہ تھے۔

۱۔ افراد گناہ گار۔
۲۔ سکوت کرنے والے۔
۳۔ نصیحت کرنے والے۔

ان میں سے تیسرے گروہ کو عذابِ الٰہی سے رہائی نصیب ہوئی اور جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ ان کی بات نہیں مانتے اور برابر گناہ میں مشغول ہیں تو انہیں دکھ ہوا اور انہوں نے کہا اب ہم شہر سے باہر چلے جاتے ہیں اب ہم تم لوگوں کے ساتھ نہیں رہیں گے چنانچہ وہ لوگ رات کے وقت شہر سے باہر جنگل میں چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد عذابِ خدا نازل ہوگیا جس نے باقی دونوں گروہوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

بعض مفسّرین نے جو یہ خیال کیا ہے کہ یہ عذاب صرف گناہگار افراد پر نازل ہوا تھا اور جو لوگ خاموش تھے وہ بھی محفوظ بچ گئے تھے، بظاہر مذکورہ بالا آیات سے موافقت نہیں رکھتا۔

۳۔ کیا دونوں گروہوں کو ایک ہی طرح کی سزا ملی تھی؟: مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہے کہ مسخ ہونے کی سزا گنہگاروں کے ساتھ مخصوص تھی کیونکہ ارشاد ہوتا ہے:

فلما عتوا عما نهوا عنه ... (جب انہوں نے اس چیز کے مقابلے میں سرکشی کی جس سے انہیں روکا گیا تھا...) لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب سے نجات

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۴۲، یہ بات ابن عباس سے تفسیر مجمع البیان میں بھی اس آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہے۔

پانے والے صرف وہ لوگ تھے جو بدکاروں کو برائی سے روکتے تھے، کیونکہ ارشاد ہوتا ہے:

انجینا الذین ینھون عن السوء۔

ہم نے ان لوگوں کو عذاب سے نجات دی جو برائی سے منع کرتے تھے۔

ان دونوں آیتوں کو ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سزا تو دونوں گروہوں کو ملی تھی لیکن مسخ کیے جانے کی سزا صرف گنہگاروں کو ملی تھی۔ جبکہ دوسرے لوگوں کی سزا احتمالی کے طور پر صرف ان کی ہلاکت تھی اگرچہ گنہگار افراد بھی مسخ ہونے کے چند روز بعد مرگئے تھے[1]۔

۴۔ یہ مسخ جسمانی تھا یا روحانی؟: مسخ۔ یا دوسرے لفظوں میں۔ انسانی شکل کا کسی حیوان کی شکل میں تبدیل ہو جانا، مسلمہ طور پر ایک خلاف معمول اور خلاف طبیعت بات ہے، اگرچہ میوٹیشن (MUTATION) بعض حیوانات کا دوسرے حیوانات کی شکل اختیار کر لینا نادر طور پر دیکھا گیا ہے اور سائنس میں تکامل حیات کی بنیاد بھی اسی بات پر رکھی گئی ہے، لیکن میوٹیشن (MUTATION) جہاں دیکھا گیا ہے وہ بہت نادر الوقوع موارد ہیں، وہ بھی حیوانات کی جزوی صفات میں پایا جاتا ہے نہ کہ ان کی کلی صفات میں، یعنی ایسا ہرگز نہیں ہوا کہ میوٹیشن (MUTATION) کی وجہ سے ایک حیوان اپنی نوع مثلاً بندر سے بکری بن گیا ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی حیوان کی خصوصیات دگرگوں ہو جائیں، پھر یہ کہ یہ تبدیلی اس کی نسل میں پیدا ہوتی ہے نہ کہ جو حیوان پیدا ہو گیا ہے اس کی شکل یک بیک بدل گئی ہو، بنا بریں کسی انسان یا حیوان کی شکل کا بدل کر دوسری نوع اختیار کر لینا ایک خلاف معمول بات ہے۔

ہم نے بارہا یہ بات کہی ہے کہ کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو طبیعت اور عادت کے برخلاف واقع ہوتے ہیں جو کبھی تو پیغمبروں کے معجزوں کی صورت میں اور کبھی بعض خارق العادت کاموں کی صورت میں بعض انسانوں سے ظاہر ہوتے ہیں چاہے وہ انسان پیغمبر نہ بھی ہوں (ایسے افعال میں اور معجزات میں فرق ہوتا ہے) لہٰذا جب خارق العادت امور اور معجزات کے وقوع کو تسلیم کر لیا جائے تو مسخ ہو جانا یا ایک انسان کا دوسرے انسان کی صورت اختیار کر لینا کوئی خلاف عقل بات نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم نے اعجاز انبیاء کی بحث میں بیان کیا ہے کہ اس طرح کا خارق العادت واقعہ رونما ہونا نہ تو قانون علل و اسباب میں کوئی استثناء ہے اور نہ ہی عقل و خرد کے برخلاف، بلکہ اس میں صرف ایک "عادی" و طبیعی کلیہ کی شکست ہے جس کی نظیر ہم نے بعض استثنائی

---

[1] اگر بعض روایات سے اس کے برخلاف کوئی بات سامنے آتی ہے تو وہ جہاں آیت مذکورہ کے ظاہر کو دیکھتے ہوئے قابل اعتماد نہیں ہو سکتا وہاں سند کے لحاظ سے بھی اس کی تصعیف کی گئی ہے اس بات کا احتمال ہے کہ اس کے راوی سے غلطی ہو گئی ہو۔

انسانوں میں بارہا دیکھی ہے [1]

بنا بریں اس بات میں کوئی منافقہ نہیں کہ کلمہ "مسخ" کا جو ظاہری مفہوم ہے اسی کو مانا جائے جو اس آیت میں بھی آیا ہے اور دیگر آیات میں بھی آیا ہے نیز دیگر مفسرین نے بھی زیادہ تر یہی معنی مراد لیے ہیں۔

لیکن بعض مفسرین جو اقلیت میں ہیں ان کا خیال ہے کہ مسخ سے "مسخ روحانی" اور صفات اخلاقی کی تبدیلی مراد ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سرکش لوگوں میں بندر یا خنزیر کی صفات پیدا ہوگئی تھیں۔ مثلاً اندھی تقلید کرنا، شکم پرستی اور شہوت رانی جو ان جانوروں کی نمایاں صفتیں ہیں وہ ان میں نمایاں ہوگئی تھیں۔ مذکورہ احتمال ایک قدیمی مفسر "مجاہد" سے نقل کیا گیا ہے۔

بعض افراد نے یہ کہا ہے کہ "مسخ" ہونا قانونِ تکامل کے خلاف اور خلقت تدریجی سے پیچھے ہٹنا ہے' یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ "قانونِ تکامل" ان افراد سے مخصوص ہے جو راہِ تکامل پر گامزن ہوں، نہ ان مخلوقات کے لیے جو اس جادہ سے منحرف ہوگئی ہوں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھنا چاہیئے کہ ایک سالم و تندرست انسان اپنے بچپن میں برابر نشوونما کرتا ہے، لیکن اگر اس کے بدن میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو ممکن ہے کہ نہ صرف اس کی نشوونما رک جائے بلکہ وہ عقب کی طرف پلٹ جائے اور اس کی ذہنی اور جسمانی ترقی تدریجاً ضائع ہو جائے۔

لیکن ہر حال میں یہ ملحوظِ نظر رکھنا چاہیئے کہ وہ مسخ ہونا ہو یا جسمانی تغییر، یہ ان اعمال کی مناسبت سے ہوگا جنہیں یہ شخص گنہگار بجا لاتا رہا ہے، یعنی چونکہ گنہگاروں میں کچھ افراد نے نفس پرستی اور شہوت رانی کے جذبہ سے متاثر ہو کر خدا کی نافرمانی کی، جبکہ دوسرے افراد وہ تھے جنہوں نے اندھی تقلید کی عادت کی بنا پر گناہ کیا لہٰذا مسخ کیے جانے کے وقت ہر گروہ اپنے اعمال کی مناسب شکل میں ظاہر ہوا۔

اگرچہ زیرِ بحث آیات میں صرف "قردة" (بندروں) کا ذکر آیا ہے اور "خنازیر" (سوروں) کا تذکرہ نہیں ہے لیکن سورہ مائدہ کی آیت ۶۰ میں کچھ ایسے لوگوں کا بھی تذکرہ ہے جن کی صورت مسخ کے وقت مذکورہ بالا دونوں جانوروں (بندر اور سور) کی ہوگئی تھی۔ بعض مفسرین مثلاً ابن عباس

---

[1] بعض معاصر اہلِ قلم نے مدارک اور حوالوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ایسے استثنائی انسانوں یا حیوانوں کے حالات پر کتاب لکھی ہے جو بہت دلچسپ ہے' ان میں سے ایسے لوگوں کا تذکرہ ہے جو اپنی انگلیوں کے ذریعے تحریر کو پڑھ سکتے ہیں یا ایک عورت جس نے دو مہینوں کے فاصلے سے دوبارہ بچہ پیدا کیا اور ہر دفعہ دو جڑواں بچے پیدا ہوئے یا ایک ایسا بچہ متولد ہوا جس کا دل قفس سینہ کے اوپر تھا، یا ایک ایسی عورت جسے بچہ پیدا ہونے تک اپنے حاملہ ہونے کی کوئی اطلاع نہ تھی، اسی طرح کے دیگر خارقِ عادت واقعات مذکورہ بالا امور کے حوالوں کے لیے ملاحظہ کریں کتاب "آیا مسخ نزدیک نیست" صفحہ ۴۳ تا صفحہ ۵۹۔

کے قول کے مطابق یہ آیت بھی انہی اصحاب سبت کے بارے میں نازل ہوئی ہے یعنی شکم پرست اور بوالہوس بوڑھے خنزیر کی شکل میں اور اندھی تقلید کرنے والے جوان بندروں کی شکل میں مسخ ہو گئے تھے۔

لیکن اس امر کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہیئے کہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ مسخ ہونے والے انسان صرف چند روز زندہ رہ کر مر گئے تھے اور ان کی نسل بھی دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔

۵۔ شریعت کی آڑ میں الٰہی فرمان کی خلاف ورزی : اگرچہ مذکورہ بالا آیات میں اصحاب سبت کی حیلہ گری کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے سابقاً اشارہ کیا کہ بہت سے مفسرین نے ان آیات کی شرح میں چھوٹے چھوٹے حوض بنانے یا ہفتہ کے دن دریا میں کانٹے ڈالنے کی داستان بیان کی ہے۔ نیز روایات اسلامی میں بھی یہ امر دکھلائی دیتا ہے۔ بنابریں سزا اور کیفر جو اس شدت کے ساتھ ان لوگوں کو ملی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیلہ گری اور شریعت کی آڑ لینے کی وجہ سے حقیقت گناہ میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے گناہ بہرحال گناہ ہے چاہے وہ اعلانیہ طور پر کیا جائے یا شریعت کی آڑ لے کر کیا جائے۔

لہٰذا وہ لوگ جو اس خام خیال میں مبتلا ہیں کہ گناہ اور حرام فعل کو توڑ موڑ کر شریعت کی آڑ میں جائز کیا جا سکتا ہے وہ درحقیقت خود فریبی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ بدبختی سے یہ حرکت بعض ایسے نادانوں میں دیکھی گئی ہے جو اپنے کو دین کی طرف منسوب بھی کرتے ہیں، اور یہی بات ہے جس کی وجہ سے دین و مذہب کا چہرہ دور سے دیکھنے والوں کی نگاہ میں سخت بدنما معلوم ہوتا ہے۔

اس عمل میں ایک بہت بُرائی مذہب کے چہرہ کو بدنما کرنے کے علاوہ جو ہے وہ یہ ہے کہ اس سے دوسروں کی نظر میں گناہ حقیر ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے دیگر افراد میں بھی اسے کرنے کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔

نہج البلاغہ میں ہے کہ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ حدیث نقل کی ہے :

> ایک روز ایسا بھی آئے گا جبکہ لوگوں کی آزمائش ان کے مالوں کے ذریعے سے کی جائے گی، یہ خدا پر احسان جتاتے ہیں کہ دیندار ہیں اور اس عالم میں وہ خدا کی رحمت کے امیدوار بھی ہیں اور اس کے عذاب سے خود کو امان میں سمجھتے ہیں۔
>
> یستحلون حرامہٗ بالشبھات الکاذبۃ والاھوآء الساھیۃ فیستحلون الخمر بالنبیذ والسحت بالھدیۃ والربا بالبیع۔
>
> یہ حرام خدا کو جھوٹے شبہات اور واہیات افکار کے ذریعے حلال سمجھتے ہیں

شراب پر ۔ نبیذ[1]۔ رشوت پر ۔ ہدیہ ۔ اور ربا پر ۔ بیع ۔ کا لیبل لگا کر اپنے اوپر حلال کر لیتے ہیں ۔

(نہج البلاغہ ۱۵۶ ویں خطبہ کا آخری حصّہ)

اس بات کی طرف توجہ کرنا چاہیئے کہ اس قسم کی حیلہ گریوں کا باعث یا تو یہ تھا کہ وہ اپنے باطنی چہرہ کو افکارِ عمومی سے چھپانا چاہتے تھے یا وہ اس سے خود اپنے کو دھوکا دیتے تھے ۔

۴۔ **آزمائش الٰہی کی مختلف شکلیں :** یہ بات درست ہے کہ دریا کے ساحل پر رہنے والوں کے لیے مچھلی کا شکار کرنا کوئی بُرا کام نہیں ہے لیکن یہ بات ممکن ہے کہ کبھی خدا آزمائش کے طور پر کچھ لوگوں کو اس عمل سے منع کر دے تاکہ ان کی فداکاری کا حال معلوم ہو جائے ، یہ خدائی امتحان و آزمائش کی ایک شکل ہے ۔ علاوہ ازیں روزِ شنبہ یہودیوں کے دین میں ایک مقدس دن تھا ۔ اس دن شکار سے منع کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اس دن دنیاوی کاموں کی تعطیل کر کے پوری طرح سے خدا کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اللہ کی عبادت کریں ، لیکن شہر " ایلہ " کے ساحل نشینوں نے ان تمام باتوں کو نظر انداز کر دیا اور کھلے دل کے ساتھ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی جس کی وجہ سے انہیں ایسی سخت سزا ملی جو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے درسِ عبرت بن گئی ۔

(۱۶۷) وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ښ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

(۱۶۸) وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا ۚ مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ ۡ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ○

[1] " نبیذ " کے معنی یہ ہیں کہ تھوڑا خرمہ یا کشمش کسی برتن میں پانی کے ساتھ بھگو دیتے تھے ، اسے چند روز گزر جاتے تھے ، اس کے بعد وہ پانی صاف کر کے پیتے تھے ۔ اس کو اگرچہ شراب تو نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن موسم کی گرمی کے اثر سے اس میں جو میٹھا مادّہ تھا وہ ایک ہلکے " الکحل " کی شکل میں تبدیل ہو جاتا تھا ۔

ترجمہ

(۱۶۷) اور (اس وقت کو بھی یاد کر) جب تیرے پروردگار نے یہ خبر دی کہ وہ قیامت تک کے لیے ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کردے گا جو انہیں ہمیشہ سخت عذاب دیں گے، بے شک تیرا رب بہت جلد سزا دینے والا ہے اور (توبہ کرنے والوں کے لیے) بڑا بخشنے والا اور مہربان (بھی) ہے۔

(۱۶۸) اور ہم نے انہیں زمین پر مختلف گروہوں میں تقسیم کر دیا، ان میں کچھ گروہ نیکوکار اور کچھ اس کے علاوہ ہیں، اور ہم نے ان کی آزمائش کی نیکیوں اور بدیوں کے ذریعے کہ شاید وہ (ہماری طرف) پلٹیں۔

تفسیر

یہودیوں کا پراگندہ ہونا

درحقیقت ان آیات میں قوم یہود کی ان دنیوی سزاؤں کا ایک حصہ بیان کیا گیا ہے جو انہیں اس وجہ سے دی گئیں کہ انہوں نے فرمانِ الٰہی کا مقابلہ اپنی نافرمانی اور سرکشی سے کیا، اور حق و عدالت کو اپنے پیروں تلے روند ڈالا

سب سے پہلے ارشاد ہوتا ہے: وہ وقت یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے یہ خبر دی تھی کہ اس گنہگار قوم پر کچھ ایسے لوگوں کو مسلط کرے گا جو قیامت تک کے لیے انہیں عذاب دیتے رہیں (واذ تاذن ربك ليبعثن عليهم الى يوم القيامة من يسومهم سوٓء العذاب)۔

"تاذن" اور "اذن" دونوں کے معنی اطلاع اور خبر دینے کے ہیں، نیز اس کے معنی قسم کھانے کے بھی ہیں اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ خدا نے یہ قسم کھائی ہے کہ وہ ان لوگوں پر ایسے لوگوں کو مسلط کرے گا جو قیامت تک کے لیے ان کو تکلیف و عذاب دیتے رہیں گے۔

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ سرکش گروہ قیامت تک راحت و آرام نہ پائے گا چاہے اپنے لیے ایک حکومت و سلطنت بنالے، اس کے باوجود ہمیشہ اغیار کے دباؤ اور رنج و الم میں مبتلا رہے

گا الا یہ کہ یہ قوم واقعاً اپنا طریقۂ کار بدلے اور ظلم و فساد سے اپنا ہاتھ روک لے۔

آیت کے آخر میں اضافہ فرمایا گیا ہے: تمہارا پروردگار ایسا ہے کہ مستحقین عذاب کے لیے اس کی سزا میں بھی جلدی ہے، اور توبہ کرنے والوں کے لیے اس کی بخشش و مہربانی بھی (ان ربک لسریع العقاب وانہ لغفور رحیم)۔

اس جملے سے پتہ چلتا ہے کہ خداوند کریم نے ان کے لیے واپسی کا راستہ کھلا رکھا ہے تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ قسمت کے لکھے کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہوئی کہ وہ بدبخت ہو کر الٰہی سزا کے مستوجب بنے۔

*

اس کے بعد کی آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہودی سارے جہاں میں کس طرح تتر بتر ہو گئے: ہم نے انہیں زمین میں تتر بتر کر دیا اور وہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے' ان میں سے بعض صالح و نیکو کار تھے اسی بنا پر جب انہوں نے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانِ حق کو سنا تو وہ فوراً ایمان لے آئے اور بعض دیگر افراد ایسے (حق پرست) نہ تھے' چنانچہ انہوں نے حق کی دعوت کو پس پشت ڈال دیا اور اپنی مادی زندگی کو اچھا بنانے کے لیے کسی عمل سے دریغ نہیں کیا (وقطعناھم فی الارض امما منھم الصالحون و منھم دون ذالک)۔

اس آیت میں یہ حقیقت دوبارہ ظہور پذیر ہو رہی ہے کہ اسلام کو نسلِ یہود سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور نہ ہی اسلام انہیں ایک خاص مذہب یا خاص مکتبِ فکر رکھنے کی وجہ سے بُرا سمجھتا ہے بلکہ ان کی قدر و قیمت ان کے اعمال کے لحاظ سے دیکھی جاتی ہے۔

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: ہم نے مختلف ذریعوں سے نیکیوں اور برائیوں کے ذریعے ان کا امتحان لیا کہ شاید وہ پلٹیں (وبلوناھم بالحسنات والسیئات لعلھم یرجعون)۔

کبھی ہم نے انہیں شوق دلایا اور انہیں خوشحالی اور نعمت میں رکھا تاکہ ان میں شکر گزاری کا احساس بیدار ہو اور وہ حق کی طرف پلٹ کر آجائیں، اور کبھی اس کے برخلاف انہیں سختیوں اور مصیبتوں میں مبتلا کیا تاکہ وہ غرور و تکبّر کی سواری سے اتر آئیں اور اپنی کمزوری و ناتوانی کا احساس کریں اور بیدار ہوں اور خدا کی طرف پلٹیں، ان دونوں طریقوں کے استعمال کرنے کا مقصد صرف یہی تھا کہ ان کی اخلاقی تربیت ہو اور وہ حق کی جانب پلٹ کر آئیں۔

لہٰذا لفظ "حسنات" ہر طرح کی نعمت، خوش حالی، آسائش اور آرام اپنے مفہوم میں لیے ہوئے ہے جبکہ لفظ "سیئات" ہر طرح کی تکلیف اور سختی کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔ لہٰذا ان دونوں لفظوں

کے معنی کو اچھائیوں اور برائیوں میں محدود کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

۱۶۹ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ
عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ
يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ؕ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ
مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ
وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝
۱۷۰ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا
نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۶۹ ان کے بعد ان کے وہ فرزند ان کے جانشین ہوئے جو (آسمانی) کتاب (توریت) کے وارث بنے (لیکن ان کی یہ حالت ہے کہ) وہ اس دنیائے دنی کے مال و متاع کو اختیار کرتے ہیں (اور اسے الٰہی احکام پر ترجیح دیتے ہیں) اور یہ کہتے ہیں کہ (اگر ہم گنہگار ہیں تو) خدا ہمیں جلد ہی بخش دے گا (ہم اپنے کیے پر پشیمان ہیں) لیکن اگر اس کے بعد پہلے متاع کی مثل ان کے پاس آتا ہے تو اسے پھر لے لیتے ہیں (اور دوبارہ حکم خدا کو پس پشت ڈال دیتے ہیں) کیا ان سے (خدا کی) کتاب کا یہ پیمان نہیں لیا گیا ہے کہ خدا کی طرف کسی جھوٹ کو نسبت نہ دیں اور

سوائے حق کے کوئی بات نہ کہیں اور انہوں نے بار ہا اسے پڑھا ہے اور ان لوگوں کے لیے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا آخرت کا گھر بہتر ہے۔

۱۷۰ اور وہ لوگ جو کتاب (خدا) سے تمسک اختیار کریں اور نماز پڑھیں (انہیں بڑا انعام ملے گا کیونکہ) ہم اصلاح کرنے والوں کی جزا ضائع نہیں کرتے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں ان کے بزرگوں کا تذکرہ کیا گیا تھا لیکن مذکورہ بالا آیت میں ان کے فرزندوں اور ذریّت کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

پہلے اس بات کی یاد دہانی کروائی گئی ہے کہ۔ ان کے بعد ان کی اولاد ان کی جانشین ہوئی جنہوں نے اپنے اجداد سے کتاب توریت کی میراث پائی لیکن اس کے باوجود وہ اس دنیائے فرومایہ کے زیب وزین پر فریفتہ ہوگئے اور انہوں نے اپنے مادّی فائدوں کے بدلے حق و ہدایت کو فروخت کر ڈالا" (فخلف من بعد ھم خلف ورثوا الکتاب یأخذون عرض ھٰذا الادنیٰ)۔

"خلف" (بر وزنِ حرف) بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ یہ لفظ غیر صالح اولاد کے لیے استعمال ہوتا ہے، جبکہ "خلف" (بر وزنِ شرف) کے معنی صالح و نیک اولاد کے ہیں[1]

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے کہ وہ لوگ جس وقت اس کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ایک طرف انہیں وجدان منع کرتا ہے اور دوسری طرف ان کے مادّی منافع برائی کی طرف دعوت دیتے ہیں تو اس وقت وہ جھوٹی امیدوں کا سہارا لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں: اس وقت تو ہم اس منفعت کو جائز یا ناجائز جس طرح بھی ہو حاصل کرلیں، خدائے رحیم و مہربان ہمیں بخشش دے گا (ویقولون سیغفر لنا)۔

اس جملے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ اس قسم کے کام کرنے کے بعد زود گزر پشیمانی اور جھوٹی توبہ کی حالت میں مبتلا ہوتے تھے لیکن جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ان کی یہ ندامت و پشیمانی ناپائیدار ہوتی تھی، اسی بنا پر۔ اگر اسی طرح کا فائدہ انہیں دوبارہ ملتا تھا تو اسے وہ حاصل کر لیتے تھے" (وان یأتھم عرض مثلہٗ یأخذوہ)۔

---

[1] مجمع البیان و تفسیر ابوالفتوح رازی زیر بحث آیت کے ذیل ہیں۔

وجہ سے ہے کہ ایک حقیقی نماز انسان کا اس کے رب سے رشتہ اس قدر مضبوط کر دیتی ہے کہ بندہ اپنے ہر کام کے وقت اپنے خدا کو ہمیشہ حاضر و ناظر اور اپنے اعمال کا نگران پاتا ہے' یہ نماز ہی کی صفت ہے جس کا ذکر دیگر آیات میں آیا ہے کہ نماز نہی عن المنکر کرتی ہے اس موضوع کا انسانی سوسائٹی اور اس کی اصلاح کے ساتھ جو ربط خاص ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے ۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ نظام العمل صرف قوم یہود کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا قانون ہے جو تمام امتوں اور ملتوں میں کار فرما ہے، اس بنا پر یہ کہنا درست ہے کہ جو لوگ حقائق کو چھپاتے ہیں اور ان میں تحریف اور تبدیلی کر کے اپنے لیے متاع ناپائیدار اور زود گزر منافع فراہم کرتے ہیں، اور جب اس عمل کے بُرے نتائج سامنے آتے ہیں تو وہ اپنے میں ایک جھوٹی توبہ کی حالت پیدا کرتے ہیں ایسی توبہ جو ذرا سی مادی منفعت کی چمک دمک سے یوں بہ جاتی ہے جس طرح گرمی کے سورج کے سامنے تھوڑی سی برف بہہ جاتی ہے، ایسے لوگ درحقیقت معاشرے کی اصلاح کے مخالف ہیں، یہ اپنے ذاتی منافع پر اجتماعی منافع کو قربان کر دیتے ہیں۔ یہ عمل چاہے کسی یہودی سے سرزد ہو یا کسی مسیحی سے یا کسی مسلمان سے !

(۱۷۱) وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ
وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ع ۲۱ ۱۱

ترجمہ

(۱۷۱) اور (اس بات کو بھی یاد کرو) جب ہم نے پہاڑ کو ایک سائبان کی طرح ان کے اوپر اس طرح سایہ فگن کیا کہ انہوں نے یہ گمان کیا کہ وہ عنقریب ان کے اوپر آپڑے گا (اور اس حال میں ہم نے ان سے عہد لیا اور کہا) جو کچھ تمہیں (احکام و فرامین) کی صورت میں دیا گیا ہے اسے مضبوطی سے تھام لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو

(اور اس پر عمل کرو) تاکہ پرہیزگار بن جاؤ۔

تفسیر

قوم یہود کے بارے میں آخری بات

"نتقنا" کی اصل "نتق" (بروزن قلع) ہے جس کے معنی کسی چیز کو کسی جگہ سے اکھیڑ کر کسی دوسری جگہ پھینک دینے کے ہیں۔ جن عورتوں کے ہاں زیادہ بچے ہوتے ہیں انہیں بھی "ناتق" کہتے ہیں، کیونکہ وہ بچے کو اپنے رحم سے آسانی کے ساتھ جدا کرکے باہر ڈال دیتی ہے۔

یہودیوں کی سرگزشت جو اس سورہ میں بیان کی گئی ہے یہ آیت اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ اس میں یہودیوں کی ایک اور سرگزشت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی سرگزشت ہے جس میں ایک درس عبرت ہے اور ایک عہد و پیمان کا ذکر بھی۔ ارشاد ہوتا ہے: اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے پہاڑ کو ان کے سر کے اوپر قرار دیا اس طرح جیسے ایک سائبان سایہ فگن ہو (واذ نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة)۔

"اور اس طرح کہ انہیں لگتا تھا جیسے وہ ان کے سر پر گر پڑے گا" وہ یہ دیکھ کر سراسیمہ اور پریشان ہوگئے اور گڑگڑانے لگے (وظنوا انه واقع بهم)۔

اس حال میں ہم نے ان سے کہا، "ہم نے جو احکام تمہیں دیئے ہیں انہیں مضبوطی سے تھام لو۔ (خذوا ماآتيناكم بقوة)۔

"اور جو کچھ ان احکام میں آیا ہے اسے ذہن نشین کرلو تاکہ پرہیزگار ہوجاؤ" خدا کی سزا سے ڈرو اور اس (کتاب) میں ہم نے تم سے جو عہد و پیمان لیے ہیں ان پر عمل کرو (واذكروا ما فيه لعلكم تتقون)۔

یہ آیت، نیز سورہ بقرہ کی آیت ۶۳ تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک ہی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں جسے مشہور مفسر علامہ طبرسی نے اپنی کتاب "مجمع البیان" میں ابن زید کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت موسیٰ کوہ طور سے پلٹ رہے تھے اور توریت کے احکام ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے جب اپنی قوم کو ان کی ذمہ داریوں اور حلال و حرام کے قوانین سے آگاہ کیا تو ان لوگوں نے یہ خیال کیا کہ ان تمام احکام پر عمل کرنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ چنانچہ انہوں نے مخالفت پر کمر باندھی۔ اس موقع پر ایک پہاڑ سے ایک بہت بڑی چٹان الگ ہوکر ہوا میں بلند ہوئی اور ان کے سروں پر آکر ٹھہر گئی۔ اس وقت وہ لوگ اتنے خوفزدہ

ہو گئے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ کے سامنے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ حضرت موسیٰ نے اسی حال میں فرمایا: اگر تم ان احکام پر عمل کرنے کا عہد کر لو تو یہ خطرہ تم سے دُور ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی انہوں نے قبول کر لیا اور سجدے میں گر پڑے اور وہ بلا ان سے دُور ہو گئی۔

٭

یہاں پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں جنہیں ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور ان کا جواب بھی دیا ہے، یہاں پر ہم ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

پہلا سوال: کیا اس طرح کسی سے عہد لینا درست ہے؟ کیا اس میں جبر کا پہلو نہیں ہے؟

جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں جبر کا پہلو ضرور ہے لیکن یہ بات بھی مسلّم ہے کہ جب ان سے خطرہ دور ہو گیا تو اختیار پلٹ آیا یعنی وہ باقی راستہ اپنی مرضی اور اختیار کے ساتھ طے کر سکتے تھے۔

اس کے علاوہ ایک جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ عقائد کے معاملے میں جبر و اکراہ لایعنی چیز ہے لیکن جو امور انسان کے فعل و عمل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں نوعِ بشر کی خیر و سعادت ہے ان میں جبر و اکراہ کرنے میں کیا حرج ہے، اگر کسی کو نشہ پینے سے جبراً روکا جائے یا اسے کسی خطرناک راستے پر چلنے سے جبراً روک دیا جائے تو کیا یہ کوئی بُری بات ہے؟

دوسرا سوال: پہاڑ ان کے سروں پر کس طرح ٹھہرا رہا؟

جواب یہ ہے کہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ حکمِ خدا کی وجہ سے کوہ طور اپنی جگہ سے جدا ہو کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح سایہ فگن ہو گیا تھا۔

بعض کا کہنا ہے کہ ایک شدید زلزلے کی وجہ سے پہاڑ اس طرح ہلا اور ٹیڑھا ہو گیا کہ جو لوگ اس پہاڑ کے دامن میں تھے ان کے سروں پر پہاڑ کی چوٹی کا سایہ پڑنے لگا۔

یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ اس پہاڑ سے ایک بہت بڑا پتھر الگ ہو کر ذرا سی دیر کے لیے ان کے سروں پر ٹھہرا اور اس کے بعد وہ وہاں سے گذر گیا اور ایک طرف گر گیا۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک خارقِ عادت اور غیر معمولی بات تھی۔ طبیعت کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔

ایک دوسری بات جو اس آیت میں قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ خدا نے یہ نہیں کہا کہ وہ پہاڑ ان کے سروں پر سائبان بن گیا بلکہ یہ فرمایا کہ: گویا سائبان بن گیا (کانّہٗ ظلۃ)۔

یہ تعبیر یا تو اس وجہ سے ہے کہ اگر کسی کے اوپر سائبان بنایا جاتا ہے تو وہ اس کی حفاظت کیلئے بر بنائے محبت بنایا جاتا ہے، جبکہ یہ سائبان بعنوان تہدید و خوف بنایا گیا تھا اور یا اس وجہ سے یہ

سوائے حق کے کوئی بات نہ کہیں اور انہوں نے بارہا اسے پڑھا ہے اور ان لوگوں کے لیے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا آخرت کا گھر بہتر ہے۔

۱۷۰ اور وہ لوگ جو کتاب (خدا) سے تمسک اختیار کریں اور نماز پڑھیں (انہیں بڑا انعام ملے گا کیونکہ) ہم اصلاح کرنے والوں کی جزا ضائع نہیں کرتے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں ان کے بزرگوں کا تذکرہ کیا گیا تھا لیکن مذکورہ بالا آیت میں ان کے فرزندوں اور ذریّت کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

پہلے اس بات کی یاددہانی کروائی گئی ہے کہ - ان کے بعد ان کی اولاد ان کی جانشین ہوئی جنہوں نے اپنے اجداد سے کتاب توریت کی میراث پائی لیکن اس کے باوجود وہ اس دنیائے فرومایہ کے زیب و زین پر فریفتہ ہوگئے اور انہوں نے اپنے مادّی فائدوں کے بدلے حق و ہدایت کو فروخت کر ڈالا" (فخلف من بعدھم خلف ورثوا الکتاب یأخذون عرض ھٰذا الادنیٰ)۔

"خلف" (بروزن حرف) بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ یہ لفظ غیر صالح اولاد کے لیے استعمال ہوتا ہے، جبکہ "خلَف" (بروزنِ شرف) کے معنی صالح و نیک اولاد کے ہیں[1]

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے کہ وہ لوگ جس وقت اس کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ایک طرف انہیں وجدان منع کرتا ہے اور دوسری طرف ان کے مادّی منافع برائی کی طرف دعوت دیتے ہیں تو اس وقت وہ جھوٹی امیدوں کا سہارا لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں : اس وقت تو ہم اس منفعت کو جائز یا ناجائز جس طرح بھی ہو حاصل کرلیں، خدائے رحیم و مہربان ہمیں بخش دے گا (ویقولون سیغفرلنا)۔

اس جملے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ اس قسم کے کام کرنے کے بعد زود گزر پشیمانی اور جھوٹی توبہ کی حالت میں مبتلا ہوتے تھے لیکن جیسا کہ قرآن کہتا ہے : ان کی یہ ندامت و پشیمانی ناپائیدار ہوتی تھی، اسی بنا پر۔ اگر اسی طرح کا فائدہ انہیں دوبارہ ملتا تھا تو اسے وہ حاصل کرلیتے تھے" (وان یأتھم عرض مثلہٗ یأخذوہ)۔

---

[1] مجمع البیان و تفسیر ابوالفتوح رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

"عرض" بروزن (غرض) کے معنی ایسی چیز کے ہیں جو عارضی، کم دوام اور ناپائیدار ہو۔[1] اسی وجہ سے یہ لفظ دنیائے مادی کی چیزوں پر بولا جاتا ہے کیونکہ یہ چیزیں ناپائیدار ہوتی ہیں حالانکہ ایک روز ایسا آنے والا ہے کہ ان کا حساب ہاتھ سے نکل جائے گا اور وہ روز انسان کے اختیار سے اس طرح دور ہو جائے گا کہ اس کے ذرا سے حصّہ کے انتظار میں وہ ٹھنڈی آہ بھرے گا، اس کے علاوہ اس دنیا میں تمام نعمتیں ناپائیدار اور زوال پذیر ہیں۔

بہرحال اس جملے میں یہودیوں کی جماعت کی رشوت ستانی اور اس کی خاطر تحریف آیات آسمانی اور جو احکام ان کے مفادات سے مطابقت نہ رکھتے ان کی فراموشی کی طرف اشارہ ہے۔ اس بنا پر اس کے بعد ہی فرمایا گیا ہے: کیا ان لوگوں نے اپنی آسمانی کتاب توریت کے ذریعہ یہ عہد نہیں کیا تھا کہ خدا کی طرف جھوٹی بات کی نسبت نہیں دیں گے اور حق کے سوا کوئی بات نہیں کہیں گے (الم یؤخذ علیھم میثاق الکتاب ان لا یقولوا علی اللہ الا الحق)۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اگر انہیں آیاتِ الٰہی کا علم نہ ہوتا اور لاعلمی کی حالت میں حکمِ الٰہی کے خلاف یہ کام بجا لاتے تو ممکن تھا کہ ان کے لیے عذر تراشی کی مجال ہوتی، لیکن قابلِ اشکال بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے بارہا توریت کے مطالب کو دیکھا اور سمجھا تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے انہیں ضائع کر دیا اور اس کے احکام کو پسِ پشت ڈال دیا (و درسوا ما فیہ)۔

"درس" کے لغوی معنی کسی چیز کی تکرار کرنے کے ہیں، اسی لیے جو مطالب کسی استاد کے ذریعے حاصل کیے جائیں اور بار بار ان کی تکرار کی جائے انہیں "درس" کہا جاتا ہے۔ مکانات وغیرہ کی کہنگی اور فرسودگی کو بھی "درس یا اندراس" کہتے ہیں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہواؤں اور بارشوں اور دیگر حوادث کے بار بار آنے کی وجہ سے عمارتیں کہنہ اور فرسودہ ہو جاتی ہیں۔

آخرکار فرمایا گیا ہے: یہ لوگ غلطی پر ہیں، یہ اعمال اور مال و متاع انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے بلکہ "آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے" (والدار الاٰخرۃ خیر للذین یتقون)۔

آیا تم اتنے واضح حقائق کو بھی نہیں سمجھتے" (افلا تعقلون)۔

*

اس کے بعد قرآن مذکورہ بالا گروہ کے برخلاف ایک دوسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ لوگ نہ صرف ہر قسم کی تحریف اور کتمانِ آیات سے پرہیز کرتے ہیں بلکہ ان کے ساتھ تمسک کرتے ہیں، اور ان پر حرف بحرف عمل بھی کرتے ہیں، قرآن نے اس گروہ کا نام "مصلحانِ جہان" رکھا ہے،

---

[1] اس امر کی طرف توجہ رکھنا چاہیئے کہ "عرض" (بروزنِ غرض) اور "عرض" (بروزنِ قرض) دو مختلف الفاظ ہیں جن کے معنی بھی مختلف ہیں کیونکہ پہلے لفظ کے معنی مادی دنیا کے ہر طرح کے سرمائے کے ہیں جبکہ دوسرے لفظ کے معنی نقد پیسہ کے ہیں۔

اور ان کے لیے اہم جزا کا وعدہ کیا ہے ان کے متعلق اس طرح فرماتا ہے: جو لوگ کتاب پروردگار سے تمسک اختیار کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں، ان کے لیے بڑی جزا ہے، کیونکہ ہم اصلاح کرنے والوں کا بدلہ ضائع نہیں کریں گے (والذین یمسکون بالکتاب واقاموا الصلوٰۃ انا لا نضیع اجر المصلحین)۔

اس کتاب سے توریت مراد ہے یا قرآن کریم؟ مفسرین نے دونوں طرح کی تفسیریں کی ہیں لیکن اگر گذشتہ آیات کی جانب توجہ کی جائے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے اس گروہ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جنہوں نے اپنا حساب گمراہ لوگوں سے الگ کر لیا تھا، اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ توریت و انجیل سے تمسک کرنا، ان بشارتوں کو دیکھتے ہوئے جو ان دونوں کتابوں میں پیغمبر اسلامؐ کے متعلق موجود ہیں، اس پیغمبر پر ایمان سے جدا نہ ہوگا۔

کلمہ "یمسکون"، جس کے معنی تمسک کرنے کے ہیں اپنے دامن میں ایک جاذب نظر نکتہ لیے ہوئے ہے، کیونکہ "تمسک" کے معنی کسی چیز کو لینے اور اس کی حفاظت کی خاطر اس کے ساتھ چمٹ جانے کے ہیں۔ یہ اس کی حسی صورت ہے اور اس کی معنوی صورت یہ ہے کہ انسان اپنی پوری کوشش کے ساتھ کسی عقیدے یا نظام کا پابند ہو جائے اور اس کی بقا و حفاظت کے لیے اپنی پوری پوری کوشش صرف کر دے۔ اس بنا پر کتاب الٰہی سے تمسک کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان قرآن یا توریت یا کسی دوسری کتاب کو اپنے ہاتھ میں مضبوطی کے ساتھ تھام لے اور اس کے صفحات یا اس کی جلد کی حفاظت میں اپنی پوری کوشش صرف کر دے، بلکہ حقیقی تمسک یہ ہے کہ اپنے نفس کو اس بات کی قطعی اجازت نہ دے کہ کسی پہلو سے اس کتاب کے فرامین کی مخالفت کی جائے بلکہ اس کے مفاہیم و احکام کے تحقق پانے اور عملی صورت اختیار کرنے میں اپنی جان و دل کے ساتھ کوشش کرے۔

*

مذکورہ بالا آیات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ روئے زمین پر اصلاح واقعی کتاب آسمانی سے تمسک کے بغیر ناممکن ہے، یہ تعبیر ایک مرتبہ اور اس حقیقت کو بیان کر رہی ہے کہ دین و مذہب ایک ایسا نظام العمل نہیں ہے جس کا تعلق محض آخرت یا عالم ماوراء الطبیعت سے ہو، بلکہ یہ ایک ایسا آئین ہے جس کا تعلق تمام نوع بشر کی زندگیوں سے ہے کیونکہ یہ مذہب ہی ہے جس کی وجہ سے تمام افراد انسانی میں عدالت، صلح، رفاہیت، آسائش اور آرام کے اصول رائج ہوتے ہیں بلکہ "اصلاح" کے تمام مفہوم میں جتنی چیزیں آسکتی ہیں وہ سب اس میں داخل ہیں۔

ہاں! یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے تمام فرمانوں میں سے یہاں نماز ہی کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس

وجہ سے ہے کہ ایک حقیقی نماز انسان کا اس کے رب سے رشتہ اس قدر مضبوط کر دیتی ہے کہ بندہ اپنے ہر کام کے وقت اپنے خدا کو ہمیشہ حاضر و ناظر اور اپنے اعمال کا نگران پاتا ہے، یہ نماز ہی کی صفت ہے جس کا ذکر دیگر آیات میں آیا ہے کہ نماز نہی عن المنکر کرتی ہے اس موضوع کا انسانی سوسائٹی اور اس کی اصلاح کے ساتھ جو ربط خاص ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ نظام العمل صرف قوم یہود کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا قانون ہے جو تمام امتوں اور ملتوں میں کار فرما ہے، اس بنا پر یہ کہنا درست ہے کہ جو لوگ حقائق کو چھپاتے ہیں اور ان میں تحریف اور تبدیلی کر کے اپنے لیے متاع ناپائیدار اور زودگزر منافع فراہم کرتے ہیں، اور جب اس عمل کے بُرے نتائج سامنے آتے ہیں تو وہ اپنے میں ایک جھوٹی توبہ کی حالت پیدا کرتے ہیں ایسی توبہ جو ذرا سی مادّی منفعت کی چمک دمک سے یوں بہ جاتی ہے جس طرح گرمی کے سورج کے سامنے تھوڑی سی برف بہہ جاتی ہے، ایسے لوگ درحقیقت معاشرے کی اصلاح کے مخالف ہیں، یہ اپنے ذاتی منافع پر اجتماعی منافع کو قربان کر دیتے ہیں، یہ عمل چاہے کسی یہودی سے سرزد ہو یا کسی مسیحی سے یا کسی مسلمان سے!

۱۷۱ وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ
وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ع ۲۱ / ۱۱

ترجمہ

۱۷۱ اور (اس بات کو بھی یاد کرو) جب ہم نے پہاڑ کو ایک سائبان کی طرح ان کے اوپر اس طرح سایہ فگن کیا کہ انہوں نے یہ گمان کیا کہ وہ عنقریب ان کے اوپر آپڑے گا اور اس حال میں ہم نے ان سے عہد لیا اور کہا) جو کچھ تمہیں (احکام و فرامین) کی صورت میں دیا گیا ہے اسے مضبوطی سے تھام لو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو

(اور اس پر عمل کرو) تاکہ پرہیزگار بن جاؤ۔

تفسیر

قوم یہود کے بارے میں آخری بات

"نتقنا" کی اصل "نتق" (بروزن قطع) ہے جس کے معنی کسی چیز کو کسی جگہ سے اکھیڑ کر کسی دوسری جگہ پھینک دینے کے ہیں۔ جن عورتوں کے ہاں زیادہ بچے ہوتے ہیں انہیں بھی "ناتق" کہتے ہیں، کیونکہ وہ بچے کو اپنے رحم سے آسانی کے ساتھ جدا کرکے باہر ڈال دیتی ہے۔

یہودیوں کی سرگزشت جو اس سورہ میں بیان کی گئی ہے یہ آیت اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے۔ اس میں یہودیوں کی ایک اور سرگزشت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی سرگزشت ہے جس میں ایک درسِ عبرت ہے اور ایک عہد و پیمان کا ذکر بھی۔ ارشاد ہوتا ہے: اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے پہاڑ کو ان کے سر کے اوپر قرار دیا اس طرح جیسے ایک سائبان سایہ فگن ہو (واذ نتقنا الجبل فوقهم كانه ظلة)۔

"اور اس طرح کہ انہیں لگتا تھا جیسے وہ ان کے سر پر گر پڑے گا۔ وہ یہ دیکھ کر سراسیمہ اور پریشان ہوگئے اور گڑگڑانے لگے (وظنوا انه واقع بهم)۔

اس حال میں ہم نے ان سے کہا، "ہم نے جو احکام تمہیں دیئے ہیں انہیں مضبوطی سے تھام لو۔ (خذوا ما اٰتينٰكم بقوة)۔

"اور جو کچھ ان احکام میں آیا ہے اسے ذہن نشین کر لو تاکہ پرہیزگار ہو جاؤ۔ خدا کی سزا سے ڈرو اور اس (کتاب) میں ہم نے تم سے جو عہد و پیمان لیے ہیں ان پر عمل کرو (واذكروا ما فيه لعلكم تتقون)۔

یہ آیت، نیز سورہ بقرہ کی آیت ۶۳ تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک ہی واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں جسے مشہور مفسّر علامہ طبرسی نے اپنی کتاب "مجمع البیان" میں ابن زید کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت موسٰیؑ کوہ طور سے پلٹ رہے تھے اور توریت کے احکام ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے جب اپنی قوم کو ان کی ذمہ داریوں اور حلال و حرام کے قوانین سے آگاہ کیا تو ان لوگوں نے یہ خیال کیا کہ ان تمام احکام پر عمل کرنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ چنانچہ انہوں نے مخالفت پر کمر باندھی۔ اس موقع پر ایک پہاڑ سے ایک بہت بڑی چٹان الگ ہو کر ہوا میں بلند ہوئی اور ان کے سروں پر آکر ٹھہر گئی۔ اس وقت وہ لوگ اتنے خوفزدہ

ہو گئے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ کے سامنے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ حضرت موسیٰ نے اسی حال میں فرمایا: اگر تم ان احکام پر عمل کرنے کا عہد کرلو تو یہ خطرہ تم سے دُور ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی انہوں نے قبول کرلیا اور سجدے میں گر پڑے اور وہ بلا ان سے دُور ہوگئی۔

٭

یہاں پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں جنہیں ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ذکر کیا ہے اور ان کا جواب بھی دیا ہے، یہاں پر ہم ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

پہلا سوال: کیا اس طرح کسی سے عہد لینا درست ہے؟ کیا اس میں جبر کا پہلو نہیں ہے؟

جواب یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں جبر کا پہلو ضرور ہے لیکن یہ بات بھی مسلّم ہے کہ جب ان سے خطرہ دور ہوگیا تو اختیار پلٹ آیا یعنی وہ باقی راستہ اپنی مرضی اور اختیار کے ساتھ طے کر سکتے تھے۔

اس کے علاوہ ایک جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ عقائد کے معاملے میں جبر و اکراہ لایعنی چیز ہے لیکن جو امور انسان کے فعل و عمل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں نوعِ بشر کی خیر و سعادت ہے ان میں جبر و اکراہ کرنے میں کیا حرج ہے، اگر کسی کو نشہ پینے سے جبراً روکا جائے یا اسے کسی خطرناک راستے پر چلنے سے جبراً روک دیا جائے تو کیا یہ کوئی بُری بات ہے؟

دوسرا سوال: پہاڑ ان کے سروں پر کس طرح ٹھہرا رہا؟

جواب یہ ہے کہ بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ حکمِ خدا کی وجہ سے کوہِ طور اپنی جگہ سے جدا ہو کر ان کے سروں پر سائبان کی طرح سایہ فگن ہوگیا تھا۔

بعض کا کہنا ہے کہ ایک شدید زلزلے کی وجہ سے پہاڑ اس طرح ہلا اور ٹیڑھا ہوگیا کہ جو لوگ اس پہاڑ کے دامن میں تھے ان کے سروں پر پہاڑ کی چوٹی کا سایہ پہنچنے لگا۔

یہ احتمال بھی پایا جاتا ہے کہ اس پہاڑ سے ایک بہت بڑا پتھر الگ ہو کر ذرا سی دیر کے لیے ان کے سروں پر ٹھہرا اور اس کے بعد وہ وہاں سے گذر گیا اور ایک طرف گر گیا۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک خارق عادت اور غیر معمولی بات تھی۔ طبیعت کو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔

ایک دوسری بات جو اس آیت میں قابلِ توجہ ہے وہ یہ ہے کہ خدا نے یہ نہیں کہا کہ وہ پہاڑ ان کے سروں پر سائبان بن گیا بلکہ یہ فرمایا کہ: گویا سائبان بن گیا (کانہٗ ظلۃ)۔

یہ تعبیر یا تو اس وجہ سے ہے کہ اگر کسی کے اوپر سائبان بنایا جاتا ہے تو وہ اس کی حفاظت کیلئے بربنائے محبت بنایا جاتا ہے، جبکہ یہ سائبان بعنوان تہدید و خوف بنایا گیا تھا' اور یا اس وجہ سے یہ

تعبیر ذکر کی گئی ہے کہ سائبان عام طور پر دائمی ہوتا ہے جبکہ یہ پتھر ان کے سروں پر تھوڑے سے وقت کے لیے تھا۔

ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ قوم بنی اسرائیل کی سرگزشت اور ان کے گوناگوں واقعات ان کی تلخ و شیریں یادیں یہ سب کچھ اس سورۃ کے ذریعے اپنے اختتام کو پہنچ گئے اور یہ سرگزشت انبیاءً کا آخری حصہ ہے جس کا اس سورہ میں ذکر کیا گیا ہے۔

انبیاء کے حالات کے اختتام پر اس آیت کا ذکر جبکہ آخری واقعہ اس قوم سے مربوط نہیں ہے۔ ممکن ہے اس وجہ سے ہو کہ ان تمام واقعات کا ذکر کرنے کا آخری مقصد یہ تھا کہ آیاتِ الٰہی سے تمسک کیا جائے اور اللہ کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان پر عمل کرکے تقویٰ اور پرہیزگاری کی منزل تک پہنچا جائے جس کا ذکر اس آیت میں اور اس سے قبل کی آیت میں بھی کیا گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری رسالت نیز دیگر انبیائے الٰہی کی باطل سے جنگیں، ان کا طرح طرح کے مصائب اور سختیوں کو برداشت کرنا، یہ سب کچھ اسی لیے تھا کہ فرمانِ خدا کا احترام کیا جائے اور اس کے نتیجے میں حق و عدالت اور طہارت و تقویٰ کے اصول تمام افرادِ بشر کے درمیان پورے طور سے رائج ہو جائیں اور لوگ اللہ کے سیدھے راستے پر چلنے لگیں۔

تفسیرِ نمونہ کی چھٹی جلد تمام ہوئی۔

چھٹی جلد، تفسیرِ نمونہ کا یہ ترجمہ بقلم سید طیب آغا جزائری

۱۹ رجادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ کو تمام ہوا۔

وَلَہُ الشکر علیٰ ذٰلک

۱۷۲۔ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ
عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ۙ
۱۷۳۔ اَوْ تَقُوْلُوْۤا اِنَّمَاۤ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ
اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ
۱۷۴۔ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ

ترجمہ

۱۷۲۔ اُس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے اولادِ آدم کی صلب سے ان کی ذریت کو لیا اور انہیں اُن کے اپنے نفسوں پر گواہ بنا دیا (اور پھر اُن سے سوال کیا) کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں۔ انہوں نے کہا ہاں ہم گواہی دیتے ہیں۔ (خدا نے ایسا کیوں کیا) اس لیے کہ وہ قیامت کے دن یہ عذر پیش نہ کریں کہ ہمیں معلوم نہ تھا (اور توحید اور خدا کو جاننے کے فطری عہد سے بے خبر تھے)۔

۱۷۳۔ یا تم یہ نہ کہو کہ ہمارے آباء و اجداد تو بت پرستی کرتے تھے اور ہم بھی تو اُن ہی کی اولاد تھے (لہٰذا ان کی پیروی کرنے کے علاوہ ہمارے لیے اور کوئی راستہ نہ تھا) جو کچھ باطل پرستوں نے کیا، کیا ہمیں اُس پر سزا دیتا ہے اور ہلاک کرتا ہے۔

۱۷۴۔ اور ہم اپنی آیات کو اس لیے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں کہ شاید وہ حق کی طرف لوٹ آئیں (اور یہ جان لیں کہ توحید کی آواز ان کی رُوح کی گہرائیوں میں اوّل دِن سے موجود تھی)۔

تفسیر

پہلا عہد و پیمان اور عالم ذر

مذکورہ بالا آیات اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہیں کہ توحید کا اقرار ایک فطری تقاضا ہے اور ہر انسانی روح کی گہرائیوں میں خدا کے وجود کی گواہی موجود ہے۔ اسی بناء پر جو بحث و تمحیص اس سورہ کی گزشتہ آیات میں توحید استدلالی کے بارے میں کی گئی ہے یہ اُن کی تکمیل کرتی ہیں۔

اگرچہ اس پہلی آیت کی تفسیر کرتے وقت مختلف مفسرین کے درمیان زور شور سے بحثیں ہوئی ہیں اور اس آیت کے متعلق مختلف طرح کی احادیث بھی ملتی ہیں تاہم ہماری کوشش یہ ہوگی کہ اوّل اس آیت کی اجمالی تفسیر کریں پھر مفسرین کی اہم ترین مباحث کا تذکرہ کریں اور آخر میں ان تمام مباحث کی روشنی میں محتاط انداز سے اپنا استدلالی نقطۂ نظر پیش کریں۔

اس آیت میں خدا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مخاطب ہے، پہلے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے اولادِ آدم کی صلب سے اُن کی ذریت کو لیا اور پھر انہیں ظاہر کیا اور انہیں خود اُن کا گواہ بنا کر اُن سے پوچھا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں تو اُنھوں نے کہا ہم شہادت دیتے ہیں، کہ تو ہمارا پروردگار ہے (واذ اخذ ربك من بنی اٰدم من ظهورهم ذریتهم واشهدهم علٰی انفسهم الست بربكم قالوا بلٰی شهدنا)۔

لفظ "ذریة" لغت میں علماء کے مطابق "چھوٹی اور کم سن اولاد" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اکثر اوقات "تمام اولاد" کو کہتے ہیں۔ بعض اوقات مفرد اور بعض اوقات جمع کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ لفظ جمع کا مفہوم رکھتا ہے۔

اس لفظ کے مادہ کے بارے میں مختلف آراء ملتی ہیں بعض اسے "ذرء" (بروزن "زرع") پیدائش و آفرینش کے معنی میں لیتے ہیں۔ اس بناء پر "ذریة" کا اصل مطلب "مخلوق" اور "پیدا شدہ" ہے۔

اور بعض اسے "ذر" (بروزن "شر") کے مادہ سے سمجھتے ہیں جس کا معنی ہے بہت چھوٹے موجودات جیسے گرد و غبار کے ذرات اور بہت ہی چھوٹی چیونٹیاں، انسانی اولاد بھی ابتداء میں بہت ہی چھوٹے سے ذرے (نطفہ) سے زندگی کا آغاز کرتی ہے اس لیے اسے "ذریت" کہتے ہیں۔ تیسرا "ذرو" (بروزن "مرو") کے مادہ سے پراگندہ اور منتشر ہونے کے معنی میں لیا گیا ہے اور انسان کی اولاد کو "ذریة" اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ پایۂ تکمیل کو پہنچنے پر زمین میں چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔

اس کے بعد مسئلہ توحید کے سلسلے میں سوال و جواب اور اولادِ آدم سے عہد و پیمان لینے کے مقصد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: یہ کام خدا نے اس لیے انجام دیا تاکہ قیامت کے دن وہ یہ نہ کہیں کہ ہم تو اس حقیقت توحید و خدا شناسی سے ناآشنا تھے (ان تقولوا یوم القیٰمة انا كنا عن هٰذا غافلین)۔

خدا نے اُن لوگوں سے جو وعدہ لیا تھا اس میں ایک اور بھی مقصد پوشیدہ تھا، جس کا دوسری آیت میں اشارہ ملتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: یہ عہد و پیمان ہم نے اس لیے لیا تھا تاکہ وہ یہ نہ کہیں کہ "ہمارے آباء و اجداد چونکہ ہم سے پہلے بت پرست

تھے اور ہم بھی کیونکہ اُنہی کی اولاد تھے اس لیے ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم ان کی پیروی کرتے تو کیا خدا ہمیں ان لوگوں کے باعث سزا دیتا ہے جنہوں نے بے ہودہ کام کیا (او تقولوا انما اشرك اٰباؤنا من قبل وكنا ذرية من بعدهم افتهلكنا بما فعل المبطلون)۔

ہاں ہم اپنی آیات اس لیے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ یہ لوگ اچھی طرح سمجھ لیں کہ توحید کا نُور اور روشنی ابتداء ہی سے ان کی روح میں موجود تھی۔ شاید وہ ان حقائق کی طرف توجہ کرتے ہوئے حق کی طرف پلٹ آئیں۔ وكذٰلك نفصل الاٰيات ولعلهم يرجعون)۔

عالم ذر کے بارے میں فیصلہ کن بحث

جیسا کہ ہم نے پڑھا ہے زیرِ نظر آیات میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اولادِ آدم کے عہد و پیمان کا تذکرہ موجود ہے۔ وہ عہد و پیمان جو آدم کی اولاد سے سربستہ طریقے لیا گیا لیکن اس عہد و پیمان کی تفصیلات آیت کے متن میں نہیں ہیں۔

ان آیات سے متعلق اسلامی کتب و مصادر میں جو مختلف طرح کی روایات موجود ہیں مفسرین نے اُن کو بنیاد بنا کر کئی نظریے قائم کیے ہیں جن میں زیادہ اہم دو نظریات ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ جس وقت حضرت آدم پیدا ہوئے تو آخری بشر تک ان کی اولاد ذرات کی شکل میں ان کی پشت سے باہر نکلی (اور بعض روایات کے مطابق یہ ذرات آدم کی مٹی سے نکلے) وہ بات سُننے اور جواب دینے کی حد تک کافی عقل و شعور کے حامل تھے تو اُس وقت خدا اُن سے مخاطب ہوا۔

"الست بربكم"

"کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں"

تو سب نے جواباً عرض کیا:

"بلیٰ شهدنا"

"جی ہاں ہم اس حقیقت کی گواہی دیتے ہیں"

پھر یہ سب ذرات آدم کی پشت (یا آدم کی مٹی) کی طرف واپس لوٹ گئے۔ اس بناء پر اس عالم کو عالم ذر اور اس پیمان کو پیمان الست کہتے ہیں۔ اس لیے مذکورہ پیمان ایک پیمان تشریعی انسانوں اور اُن کے پروردگار کے درمیان ایک خود آگاہی کی قرار داد تھی۔

۲۔ اس عالم اور اس پیمان سے مراد وہی "عالم استعداد" اور "پیمان فطرت" اور عہدِ تکوین ہے۔ اس طرح سے کہ باپوں کی پشت اور ماؤں کے رحم سے "نطفہ" کی صورت میں اولادِ آدم کے خروج کے وقت جبکہ اُن کی حیثیت ذرات سے زیادہ نہ تھی خدا نے توحید کی گواہی کے لیے انہیں استعداد اور اہلیت عنایت کی۔ پھر ان کی سرشت اور فطرت میں یہ خدائی راز ایک اندرونی ذاتی حس کے طور پر انہیں ودیعت کیا اور اسے ایک جانی پہچانی حقیقت کے طور پر ان کے شعور میں رکھا۔

یہی وجہ ہے کہ تمام انسان رُوحِ توحید سے شناسائی کے حامل ہیں اور خدا نے جو اُن سے سوال کیا تھا وہ تکوین و آفرینش کی

زبان میں تھا اور انہوں نے جو جواب دیا تھا وہ بھی اسی زبان میں تھا۔
ایسا انداز روزمرہ کی گفتگو میں بھی بکثرت ملتا ہے مثلاً ہم کہتے ہیں: "رخسار کا رنگ اندرونی راز کی نشاندہی کرتا ہے" یا ہم کہتے ہیں کہ "کسی کی آنکھوں کا بند ہونا یہ بتاتا ہے کہ وہ رات سویا نہیں"۔ ایک عرب ادیب کہتا تھا:

سل الارض من شق انهارك وغرس اشجارك واينع ثمارك فان لم تجبك حواراً اجابتك اعتباراً۔

اُس زمین سے پوچھو کس نے تیرے دریاؤں کے راستے بنائے، کس نے تیرے درختوں کو لگایا اور تیرے پھلوں کو پکایا۔ اگر زمین نے عام زبان سے جواب نہ دیا تو زبانِ حال سے جواب دے گی۔

قرآن مجید میں بھی زبانِ حال میں گفتگو کرنے کا اسلوب بعض آیات میں آیا ہے مثلاً:

فقال لها وللارض ائتيا طوعاً او كرهاً قالتا اتينا طائعين

خدا نے زمین و آسمان سے فرمایا: اپنی رضا و رغبت سے یا مجبوراً آؤ اور فرمانبرداری کرو۔ تو انہوں نے کہا: ہم تیری اطاعت کرتے ہوئے اپنی رضا و رغبت سے آتے ہیں۔ (حٰم السجدہ - ۱۱)

ان آیات کی تفسیر کے بارے میں یہ دو مشہور نظریات کا خلاصہ تھا۔ لیکن پہلی تفسیر پر مندرجہ ذیل اعتراضات بھی کیے جاتے ہیں:

۱۔ آیات کے متن میں اولادِ آدم کی پشت سے ذرات کے خارج ہونے کے بارے میں گفتگو ہے نہ کہ خود آدم سے (من بنی ادم من ظهورهم ذريتهم) جبکہ پہلی تفسیر خود آدم یا آدم کی مٹی سے نکلنے کی بات کرتی ہے۔

۲۔ اگر یہ عہد و پیمان کائی خود آگاہی اور عقل و شعور سے لیا گیا تھا تو پھر کس طرح سب کے سب اسے بھول گئے ہیں۔ کسی شخص کے دل میں بھی اس کی یاد نہیں ہے۔ جبکہ اس کا فاصلہ ہمارے زمانے کی نسبت اس جہان اور دوسرے جہان اور قیامت سے زیادہ نہیں ہے۔ حالانکہ قرآن مجید کی کئی آیات میں ہم پڑھتے ہیں کہ بنی نوع انسان (قطع نظر اس سے کہ وہ جنتی ہوں یا جہنمی) قیامت میں دُنیا کے حالات کو نہیں بھولیں گے اور وہ انہیں بہت اچھی طرح یاد ہوں گے تو عالم ذر کے بارے میں یہ فراموشی کسی طرح بھی قابلِ توجیہ نہیں ہے۔

۳۔ اس عہد و پیمان کا کیا مقصد تھا۔ اگر یہ مقصود تھا کہ عہد و پیمان کرنے والا اس قسم کے عہد و پیمان کو یاد کر کے راہِ حق میں قدم اُٹھائے اور خداشناسی کے سوا کسی اور راستے پر نہ چلیں تو کہنا چاہیے کہ یہ مقصد تو کسی طرح بھی اس عہد و پیمان سے حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ سب اسے بھول چکے ہیں اور اصطلاح کے مطابق "بہتر لا" پر سوئے ہوئے ہیں اور اس ہدف اور مقصد کے بغیر یہ پیمان لغو اور فضول نظر آتا ہے۔

۴۔ اس قسم کے جہان کے وجود کا اعتقاد حقیقت میں ایک قسم کے تناسخ کے قبول کرنے کے متبادل ہے کیونکہ اس تفسیر کے مطابق یہ قبول کرنا پڑے گا کہ روحِ انسانی موجودہ پیدائش سے پہلے اس جہان میں قدم رکھ چکی ہے اور کم یا طویل دورانیہ طے کرنے کے بعد اس جہان سے واپس چلی گئی ہے۔ تو اس طرح تناسخ کے بہت سے اعتراضات اس کی طرف متوجہ ہوں گے۔

لیکن اگر ہم دوسری تفسیر کو قبول کر لیں تو ان میں سے کوئی اعتراض متوجہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس صورت میں سوال و جواب اور مذکورہ عہد و پیمان ایک فطری پیمان ہوگا جس کے آثار اب بھی ہر شخص کی اپنی روح کے اندر نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ متاخرین ماہرین نفسیات کی تحقیقات کے مطابق "حسِ مذہبی" یعنی خود آگاہ انسان کے بنیادی نفسیاتی احساسات میں سے ایک ہے۔ اور یہی وہ حس ہے جو انسان کو طول تاریخ میں

خداشناسی کی طرف رہنمائی کرتی رہی ہے اور اس فطرت کے ہوتے ہوئے کبھی بھی انسان یہ عذر نہیں کرسکتا کہ ہمارے آباء واجداد تو بت پرست تھے (فطرت اللہ التی فطر الناس علیہا) (روم : ۳۰)

دوسری تفسیر پر صرف ایک اہم اعتراض کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ اس میں سوال وجواب اپنے اندر مِنشا کا پہلو سے ہیں گے لیکن جس چیز کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اس کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ تعبیریں عربی زبان اور دیگر زبانوں میں موجود ہیں تو پھر اس پر کوئی بھی اعتراض نہیں ہوسکتا اور یہ تفسیر تمام تفاسیر کی نسبت زیادہ قریب نظر آتی ہے۔

عالم ذر اور اسلامی روایات

شیعہ اور سنی کے مختلف کتب ومصادر میں عالم ذر کے بارے میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو پہلی نظر میں ایک مسلسل روایت کے حصے معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً تفسیر برہان میں ۳۷ روایات اور تفسیر نورالثقلین میں ۳۰ روایات مذکورہ بالا آیات کی ذیل میں نقل ہوئی ہیں۔ اور جن میں بعض مشترک اور بعض مختلف ہیں اور جن روایات میں تفاوت وفرق پایا جاتا ہے اُن کا مجموعہ شاید چالیس سے زیادہ ہو۔

لیکن اگر صحیح طریقے سے ان روایات کی درجہ بندی اور تجزیہ وتحلیل کی جائے نیز ان کے مضامین اور اسناد کی جانچ پڑتال کی جائے تو ہم دیکھیں گے کہ ان پر ایک معتبر روایت کی حیثیت سے (چہ جائیکہ متواتر روایت کی حیثیت میں) ابھی بھروسہ اور اعتماد نہیں کیا جاسکتا (غور کیجئے)۔

ان میں سے بہت سی روایات تو زرارہ سے ہیں کچھ صالح بن سہل سے کچھ "ابوبصیر" کچھ "جابر" اور کچھ "عبداللہ بن سنان" سے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی شخص ایک مضمون کی کئی روایات نقل کرے تو وہ سب ایک ہی روایات شمار ہوں گی اور نتیجتاً مندرجہ بالا روایات کی تعداد اس کثیر عدد سے جو شروع میں نظر آتا تھا گر جائے گی اور شاید دس سے کہ بیس روایات سے تجاوز نہ کرے یہ تو سند کے لحاظ سے ہے۔

لیکن مضمون اور دلالت کے لحاظ سے ان روایات کے مفاہیم مکمل طور سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، بعض پہلی اور بعض دوسری تفسیر سے موافقت رکھتے ہیں اور بعض مفاہیم ان میں سے کسی سے بھی مطابقت نہیں رکھتے۔ مثلاً وہ روایات جو زرارہ سے نقل کی ہیں۔ اور محل بحث آیات کے ذیل میں تفسیر برہان میں ۲-۳-۴-۸-۱۱-۲۸ اور ۲۹ شمارہ میں نقل ہوئی ہیں وہ پہلی تفسیر کے ساتھ موافق ہیں۔ اور وہ جو عبداللہ بن سنان سے تفسیر برہان میں ۷ اور ۱۲ کے شمارہ کے تحت ذکر ہوئی ہیں وہ دوسری تفسیر کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ان روایات میں سے بعض مبہم ہیں

جن کا سوائے کنایہ کی شکل اور اصطلاح کے مطابق "مبہولیک" کی شکل میں کوئی مفہوم نہیں مثلاً اٹھارہ اور تئیسویں روایت جو "ابوسعید خدری" اور "عبداللہ کلبی" سے اسی تفسیر میں نقل ہوئی ہے۔

کچھ مذکورہ روایات میں صرف بنی آدم کی ارواح کی طرف اشارہ ہوا ہے (مثلاً مفضل کی روایت جس کا شمارہ ۲۰ میں ذکر ہوا ہے)

علاوہ ازیں اوپر والی روایات میں سے بعض سند معتبر کی حامل ہیں اور بعض سند کے بغیر ہیں۔

اُن روایات کے ایک دوسرے سے متعارض ہونے کی وجہ سے ان پر ایک معتبر دستاویز کے لحاظ سے اعتماد اور بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ بزرگ علماء نے اس ضمن میں کہا ہے کہ ان روایات کے علم وفہم کو صاحبانِ روایات کے سپرد کرنا چاہیئے۔ اور ان کے متعلق مناسب قسم کے فیصلے کریں۔

تو اس صورت میں ہم ہیں اور اُن آیات کا متن، جو قرآن میں آئی ہیں اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ دُوسری تفسیر آیات کے زیادہ قریب ہے۔

• اور اگر ہماری بحث میں تفسیر اور تشریح کی اجازت ہوتی تو ہم تمام حوالہ جات اور روایات کا شرح و بسط سے ذکر کرتے اور ہر ایک میں بحث و تمحیص کرتے تاکہ جو کچھ ہم نے اوپر بیان کیا ہے اور زیادہ واضح ہو جاتا۔ لیکن دلچسپی لینے والے حضرات تفسیر نور الثقلین، برہان اور بحار الانوار کی طرف رجوع کرکے گزشتہ بحث کی بنیاد پر روایات کی درجہ بندی اور اسناد و مضامین کی تحقیق کر سکتے ہیں۔

۱۷۵۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ
الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝
۱۷۶۔ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ
هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ
تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ
فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝
۱۷۷۔ سَاۗءَ مَثَلَاۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ
كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ۝
۱۷۸۔ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۷۵۔ اور اُن کے لیے اُس شخص کی سرگزشت پڑھو کہ جسے ہم نے خود اپنی آیات دیں۔ لیکن (بالآخر) وہ ان کے (حکم) سے نکل گیا اور شیطان نے اُس پر غلبہ پالیا اور وہ گمراہوں میں سے ہو گیا۔

۱۷۶۔ اور اگر ہم چاہتے تو اس کے (مقام) کو ان آیات (اور علوم و دانش) کے ساتھ اُوپر لے جاتے (لیکن جبر کرنا

کرنا ہماری سنّت کے خلاف ہے لہٰذا ہم نے اُسے اُس کی حالت پر چھوڑ دیا) لیکن وہ پستی کی طرف مائل ہوا اور اس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور وہ (باؤلے) کتے کی مانند ہے کہ اگر اُس پر حملہ کرو تو اپنا منہ کھول دیتا ہے اور زبان باہر نکال دیتا ہے۔ اور اگر اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو پھر بھی یہی کام کرتا ہے گویا دنیا پرستی کا اتنا پیاسا ہے کہ کبھی سیراب نہیں ہوتا) یہ اُس گروہ کی مانند ہے کہ جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا۔ یہ کہانیاں (اُن سے) بیان کرو، شاید وہ غور و فکر کریں (اور ہوش میں آجائیں)

۱۷۷۔ کتنی بری مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں لیکن وہ تو خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

۱۷۸۔ وہ جسے خدا ہدایت کرے (حقیقی) ہدایت پانے والا وہی ہے اور جنہیں (اُن کے اعمال کی وجہ سے) گمراہ کرے وہ (واقعی) خسارے میں ہیں۔

تفسیر

ایک عالم جو فرعونوں کا خدمت گار ہے

اس آیت میں بنی اسرائیل کے ایک اور واقعہ کی طرف اشارہ ہوا ہے جو اُن لوگوں کے لیے ایک مثال اور نمونہ ہے جو اس قسم کی صفات رکھتے ہیں۔

جیسا کہ ہم ان آیات کی تفسیر کے دوران میں پڑھیں گے مفسرین نے اس شخص کے بارے میں جس کے متعلق یہ آیات نازل ہوئی ہیں، متعدد شکوک کا اظہار کیا ہے لیکن یہ درست ہے کہ آیت کا مفہوم دیگر آیات کی طرح کہ جو اگرچہ خاص حالات میں نازل ہوئیں، کلی اور عمومی ہے۔

پہلی آیت میں پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: اُس شخص کا واقعہ جسے ہم نے اپنی آیات دی تھیں لیکن بالآخر وہ ان سے بھٹک گیا اور شیطانی وسوسوں میں گرفتار ہو کر گمراہوں کے زمرے میں داخل ہو گیا، ان سے بیان کرو (واتل علیہم نبأ الذی آتیناہ آیاتنا فانسلخ منہا فاتبعہ الشیطان فکان من الغاوین)۔

یہ آیت واضح طور پر کسی ایسے شخص کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو پہلے مومنین کی صف میں شامل تھا اور آیات و علوم الٰہی پر ایمان رکھتا تھا۔ پھر وہ اس راستہ سے بھٹک گیا اس بناء پر شیطان نے اُسے وسوسہ میں ڈالا اور اُس کا انجام گمراہی اور بدبختی تک جا پہنچا۔

"انسلخ" مادہ "انسلاخ" سے ہے جو اصل میں چمڑے سے باہر آنے کے معنی میں ہے۔ یہ لفظ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ آیات خداوندی اور علوم الٰہی نے ابتداء میں اس کا اس طرح احاطہ کیا ہُوا تھا کہ وہ اس کے بدن کے چمڑے کی طرح ہو گئے تھے مگر اچانک وہ اس چمڑے کے محیط سے باہر نکل آیا اور اس نے ایک تیز چکر کھاتے ہوئے اپنا راستہ مکمل طور پر بدل لیا۔

"فاتبعہ الشیطان" سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان پہلے تو اس سے اپنی اُمید منقطع کر چکا تھا کیونکہ وہ مکمل طور پر حق کے راستے پر گامزن تھا لیکن مذکورہ انحراف کے بعد شیطان نے تیزی سے اس کا پیچھا کیا اور اس تک پہنچ گیا۔ اس کی تاک میں لگا رہا اور اس کے دل میں وسوسے ڈالنے لگا اور آخر کار اسے گمراہ، شقی اور بدبخت لوگوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔[1]

بعد والی آیت اس بات کی اس طرح تکمیل ہے کہ "اگر ہم (خدا) چاہتے تو اسے جبراً حق کی راہ پر قائم رکھ سکتے تھے اور ان آیات وعلوم کے ذریعہ اسے بلند مقام دے سکتے تھے (ولو شئنا لرفعناہ بھا) لیکن یہ مسلّم ہے کہ جس پروردگار کی سُنّت انسان کو ارادہ وفیصلہ کی آزادی واختیار دینا ہے افراد کو جبراً حق کی راہ پر چلانا اس کی اس سنّت سے مناسبت نہیں رکھتا اور یہ بات کسی کی شخصیت وعظمت کی نشانی نہیں بن سکتی لہٰذا بلا توقف مزید ارشاد ہوتا ہے: ہم نے اسے اس کے اختیار پر چھوڑ دیا اور وہ بجائے اس کے کہ اپنے علوم ودانش سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہر روز بلند تر مقام کی طرف بڑھتا پستی کی طرف جھکا اور ہوا وہوس کی پیروی کی وجہ سے اپنے تنزل کی جانب مائل ہوا (ولکنہٗ اخلد الی الارض واتبع ھواہ)۔

"اخلد" "اخلاد" کے مادہ سے ہے۔ جس کا مطلب ہے کسی جگہ دائمی سکونت اختیار کرنا؛ اس بنا پر "اخلد الی الارض" کا معنی ہے کہ ہمیشہ کے لیے زمین سے چمٹ گیا جو یہاں کنایہ ہے اور اس مادی دنیا کی چمک دمک اور غیر شرعی لذات اور آسائشوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اس کے بعد اس شخص کو کتے سے تشبیہ دی ہے۔ ایسا کتا جو اپنی زبان پیاسے جانوروں کی طرح ہمیشہ باہر نکالے رکھتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: وہ کتے کی طرح ہے۔ اگر اس پر حملہ کرو تو اس کا منہ کھلا ہُوا ہے اور زبان باہر نکلی ہوئی ہے اور اگر اسے اس کی حالت پر چھوڑ دیں تو بھی اسی طرح رہتا ہے (فمثلہٗ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث)۔

اس نے لذت پرستی کی شدت اور اس مادی دُنیا کی بے تحاشا محبت سے مغلوب ہو کر ایک لامحدود اور نہ ختم ہونے والی پیاس کی حالت اپنا رکھی ہے کہ ہمیشہ وہ دنیا پرستی کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ کسی ضرورت کے تحت نہیں بلکہ ایک بیمار کی طرح، باؤلے کتے کی مانند کہ جس پر باؤلے پن کی وجہ سے پیاس کی ایک جھوٹی کیفیت طاری رہتی ہے اور وہ کسی وقت بھی سیراب نہیں ہوتا۔ یہی حالت اُن دُنیا پرستوں اور پست ہمّت ہوا وہوس کے پجاریوں کی ہے کہ جنہیں دُنیا کی جتنی بھی آسائشیں میسّر ہوں لیکن اُن کی نیت سیر نہیں ہوتی۔

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ یہ مثال کسی مخصوص شخص کے ساتھ منسوب نہیں بلکہ یہ ان تمام گروہوں کی مثال ہے جو آیاتِ خدا کو جھٹلاتے ہیں (ذالک مثل القوم الذین کذبوا بایاتنا)۔

---

[1] "اتبعہ" اور "تبعہ" "لحقہ وادرکہ" (اس سے ملحق ہوا اور اسے پالیا) کے معنی میں آیا ہے۔

یہ واقعات ان کے سامنے بیان کرو ہو سکتا ہے کہ وہ ان پر سوچ بچار کریں اور صحیح راستے کا یقین کر لیں (فاقصص القصص لعلهم يتفكرون)۔

دُنیا پرست اور منحرف عالم بلعم باعورا

جیسا کہ آپ نے دیکھا اوپر والی آیات میں کسی کا نام نہیں لیا گیا بلکہ ایک عالم کے متعلق گفتگو ہوئی ہے جو پہلے حق کے راستے پر گامزن تھا اور کوئی اس کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی دن یہ حق سے منحرف ہو جائے گا لیکن آخرکار دُنیا پرستی اور خواہشات نفسانی نے اُس پر غلبہ پایا اور اُسے پستیوں میں دھکیل دیا کہ وہ گمراہوں اور شیطان کے پیروکاروں کی صف میں جا کھڑا ہوا۔

بہت سی روایات اور مفسرین کے کلمات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مُراد بلعم باعورا نامی ایک شخص تھا جو حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں رہتا تھا اور بنی اسرائیل کے نامی گرامی علماء میں اس کا شمار ہوتا تھا یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ اُس سے ایک بڑے مبلغ کی حیثیت سے کام لیتے تھے اور وہ اس درجے پر فائز تھا کہ اُس کی دُعا بارگاہ خداوندی میں شرف قبولیت پاتی تھی۔ لیکن وہ فرعون کی ظاہری شان و شوکت اور اُس کے وعدوں سے اتنا متاثر ہوا کہ راہ حق سے جھک گیا لہٰذا اس کی تمام قدر و منزلت جاتی رہی۔ حتٰی کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے مخالفین کی صف میں جا شامل ہوا[1]

باقی رہا یہ احتمال کہ یہ شخص امیہ بن ابی الصلت ہے جو زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر ہے جو پہلے گذشتہ کتب آسمانی سے آگاہی رکھنے کی وجہ سے آخری پیغمبر کے ظہور کے انتظار میں تھا۔ لیکن پھر وہ یہ سوچنے لگا کہ ہو سکتا ہے کہیں وہ خود ہی پیغمبر ہو۔ اس لیے اس نے بعثت پیغمبرؐ کے بعد رسول اکرمؐ سے حسد کو مخالفت کی بنیاد بنایا۔

یہ بھی احتمال پیش کیا گیا ہے کہ اس سے مشہور راہب ابو عامر مراد ہے، جو زمانہ جاہلیت میں لوگوں کو پیغمبرؐ اسلام کے ظہور کی خوشخبری دیتا تھا لیکن پیغمبرؐ کے ظہور کے بعد اس نے مخالفت کی راہ اپنائی۔ تو یہ دونوں احتمال حقیقت سے دُور نظر آتے ہیں۔

کیونکہ "واتل" "نبأ" اور "فاقصص القصص" کے الفاظ نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ واقعہ پیغمبر اسلامؐ کے ہمعصر افراد سے متعلق نہیں تھا۔ بلکہ یہ گذشتہ اقوام کی سرگذشت ہے۔ علاوہ ازیں سورۂ اعراف ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور ابو عامر راہب اور امیہ بن ابو صلت کا تعلق مدینہ سے ہے۔

تفسیر المنار میں پیغمبر اسلامؐ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں بلعم باعور کی مثال اس اُمت میں امیہ بن ابی الصلت ایسی ہے[2] اسی طرح امام باقرؑ سے نقل ہوا ہے، آپؑ نے فرمایا:

الاصل في ذٰلك بلعم، ثم ضربه الله مثلا لكل مؤثر هواه على هدى الله من اهل القبلة.

---

[1] موجودہ توراۃ میں بھی بلعم باعورا کے ماجرا کی تفصیل آئی ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ توراۃ آخر کار اسے انحراف سے بری الذمہ قرار دیتی ہے مزید تفصیل کے لیے سفر اعداد کے باب ۲۲ سے رجوع کریں۔

[2] المنار جلد ۹ ص ۴۱۲

اصل آیت بلعم کے بارے میں ہے اس کے بعد خدا نے اسے ایک مثال کے طور پر ایسے اشخاص کے لیے استعمال کیا ہے جنہوں نے اس اُمت میں ہوس پرستی کو خدا پرستی اور خدا کی ہدایت پر مقدم گردانا ہے۔[1]

اصولی طور پر انسانی معاشروں میں اتنا خطرہ کسی چیز سے نہیں جتنا ان علماء سے ہوتا ہے جو اپنے علم و فکر کو اپنے زمانے کے فرعونوں اور جابروں کے اختیار میں دے دیتے ہیں اور ہوس پرستی اور مادی دنیا کی شان و شوکت (اخلاد الی الارض) سے مرعوب ہو کر اپنا تمام سرمایۂ فکر و نظر طاغوتوں کے قبضے میں دے دیتے ہیں اور وہ بھی عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے اس قسم کے افراد سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ امر صرف حضرت موسیٰ یا باقی انبیاء کے زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ زمانہ پیغمبرؐ سے لے کر اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ کہ بلعم باعور، ابوعامر اور امیہ بن ابوالصلت جیسے عالم اپنے علم و دانش اور اجتماعی اثر و رسوخ کو درہم و دینار یا مقام و منزلت کے عوض بیچ دیتے ہیں یا پھر کینہ و حسد کی بناء پر منافقین، دشمنانِ حق، فرعونوں، بنی اُمیّہ اور بنی عباس جیسے طاغوتوں کے اختیار میں دیتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیات میں علماء کے اس گروہ کی کچھ نشانیاں بیان ہوئی ہیں جن کے ذریعے انہیں پہچانا جا سکتا ہے۔ وہ ایسے مادہ پرست ہیں جنہوں نے دنیا کی محبت میں خدا کو بھلا دیا ہے۔ وہ اتنے کم ظرف ہیں کہ بارگاہِ خداوندی اور خلقِ خدا کی نظر میں بلند مقام حاصل کرنے کی بجائے ذلت کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اپنی اسی کم ظرفی کی وجہ سے سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ شیطان کے شدید وسوسوں میں گھرے ہوئے ہیں اور انہیں آسانی سے خریدا اور بیچا جا سکتا ہے۔ وہ بیمار اور باؤلے کتّوں کی مانند ہیں جو کبھی سیراب نہیں ہوتے۔ انہی وجوہ کی بناء پر انہوں نے حق کو چھوڑ دیا ہے اور بے راہ روی اختیار کر لی ہے وہ گمراہوں کے پیشوا ہیں۔ ایسے افراد کی پہچان لازمی ہے تاکہ سختی سے ان کے شر سے محفوظ رہا جا سکے۔

بعد والی دونوں آیات میں بلعم اور دنیا پرست علماء کی سرگزشت سے ایک کلی اور کلی نتیجہ اخذ کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے، کیا بُری مثال ہے ان لوگوں کی جو ہماری آیات سے انکار کرتے ہیں اور کیسا بُرا انجام اور ذلت اُن کے انتظار میں ہے (ساء مثلا القوم الذین کذبوا بآیاتنا) لیکن وہ ہم پر ظلم و ستم نہیں کرتے تھے بلکہ خود اپنے اوپر ستم روا رکھتے تھے (وانفسهم کانوا یظلمون)۔ اور اس سے زیادہ ظلم کیا ہوگا کہ معنوی علم و دانش کا سرمایہ جو خود اُن کی اور اُن کے معاشرے کی سربلندی کا باعث بن سکتا تھا، صاحبِ زر اور صاحبِ اقتدار کے اختیار میں دے دیتے ہیں اور سستے داموں اُسے فروخت کر کے بالآخر اپنے آپ کو اور معاشرے کو پستی میں دھکیل دیتے ہیں۔

لیکن اس قسم کی لغزشوں اور شیطانی دام و فریب سے خبردار رہو کیونکہ ان سے رہائی خدا کی توفیق اور ہدایت کے بغیر ممکن نہیں جال اور پھندا بڑا ہی سخت ہے مگر یہ کہ رحمتِ الٰہی مددگار ہو۔

"جسے خدا ہدایت دے اور اپنی رحمت کو اس کا مددگار بنا دے تو حقیقتاً وہی ہدایت پانے والا ہے۔"

(من یھد اللہ فھو المھتدی)

---

[1] مجمع البیان جلد ۴ ص ۵۰۰

"اور جس شخص کو خدا اس کے بُرے اعمال کے نتیجہ میں اُس کے حال پر چھوڑ دے یا کامیابی اور موافقت کے ذرائع شیطانی وسوسوں کے مقابلہ میں اُس سے چھین لے تو وہ واقعی زیاں کار اور خسارے میں ہے۔

(ومن یضلل فاولئك هم الخاسرون)۔

بارہا ہم نے کہا ہے کہ ہدایت الٰہی اور گمراہی نہ جبری پہلو رکھتی ہے اور نہ ہی بغیر کسی وجہ اور حساب و کتاب کے ہے۔ ان دونوں سے مراد وسائل ہدایت فراہم کرنا یا اس قسم کے ذرائع کو روک لینا ہے۔ وہ بھی انسان کے گذشتہ اچھے یا بُرے اعمال کی وجہ سے جو اس نے انجام دیے ہیں۔ بہرحال آخری پختہ ارادہ خود انسان کا اپنا ہوتا ہے۔ اس بناء پر زیر نظر آیت ان گذشتہ آیات سے مکمل مطابقت رکھتی ہے جو ارادہ کی آزادی کی تائید کرتی ہیں اور ان کے درمیان اختلاف نہیں۔

۱۷۹۔ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ
لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ
اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۗ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۗ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○

۱۸۰۔ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ
فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۗ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

۱۸۱۔ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۱۷۹۔ یقیناً جن وانس کے بہت سے گروہوں کو ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے وہ ایسے دل (اور ایسی عقل) رکھتے ہیں کہ جن سے (وہ سوچتے نہیں اور) سمجھتے نہیں اور ایسی آنکھیں رکھتے ہیں کہ جن سے وہ دیکھتے نہیں اور ایسے کان رکھتے ہیں کہ جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ چوپاؤں کی طرح ہیں۔ بلکہ وہ زیادہ گمراہ ہیں (اور) وہ غافل ہیں (کیونکہ ہدایت کے تمام تر اسباب میسر ہونے کے باوجود وہ گمراہ ہیں)۔

۱۸۰۔ خدا کے بہترین نام ہیں۔ اسے ان نیک ناموں سے پکارو اور انہیں چھوڑ دو جو خدا کے ناموں میں تحریف کرتے ہیں

(اور یہ تمام اس کے غیر کے لیے رکھتے ہیں اور اس کے لیے شریک کے قائل ہیں) وہ عنقریب اپنے کردہ (برے) اعمال کی سزا پائیں گے۔

۱۸۱۔ اور جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے جو حق کی تبلیغ کرتا ہے۔

تفسیر

دوزخیوں کی نشانیاں

یہ آیات اس بحث کی تکمیل کرتی ہیں جو گذشتہ آیات میں دُنیا پرست علماء اور اسی طرح ہدایت اور گمراہی کے عوامل کے ضمن میں گزری ہے۔ ان آیات میں لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر ایک گروہ کی صفات کی وضاحت کی گئی ہے اور وہ ہیں دوزخیوں کا گروہ اور بہشتیوں کا گروہ۔

اوّل دوزخیوں کے بارے میں جو پہلا گروہ ہے قسم اور تاکید کا سہارا لیتے ہوئے کہا گیا ہے: ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ (ولقد ذرأنا لجھنم کثیرًا من الجن و الانس)۔

"ذرأنا" "ذرء" (بروزن زرع) یہاں خلقت و آفرینش کے معنی میں ہے۔ لیکن دراصل پراگندہ اور منتشر کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے

"تذروہ الریاح"

"ہوائیں اسے پراگندہ کرتی ہیں" (سورہ کہف۔ آیہ ۴۵)۔

اور چونکہ موجودات کی پیدائش روئے زمین میں ان کے انتشار اور پھیلنے کا سبب ہے لہٰذا یہ لفظ خلقت و آفرینش کے معنی میں بھی آیا ہے۔

بہرحال یہاں جو اہم اعتراض سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کیونکر یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے بہت سے جن و انس کو دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ جبکہ ایک اور مقام پر ہے کہ:

وما خلقت الجن والانس الّا لیعبدون[1]

اس آیت کے مطابق تمام جن و انس خدا کی پرستش، ترقی اور فرمانبرداری کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اسی لیے تو مذہب جبر کے بعض طرفداروں نے اپنے مذہب کے اثبات کے لیے اس آیت سے استدلال کیا ہے جیسے فخرالدین رازی وغیرہ۔

لیکن اگر آیات قرآن کو ایک دوسرے کی روشنی میں غور سے دیکھا جائے اور سطحی نتائج اخذ نہ کیے جائیں تو اس سوال کا جواب

---

[1] ذاریات۔ آیہ ۵۶۔

خود آیت میں موجود ہے اور دوسری آیات میں تو اس طرح وضاحت کے ساتھ نظر آتا ہے کہ قارئین کے لیے غلط فہمی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ کیونکہ پہلے تو یہ تشریح اس طرح درست ہے کہ مثلاً ایک بڑھئی کہتا ہے کہ جو لکڑیاں میں لایا ہوں ان کا زیادہ تر حصہ خوبصورت دروازے بنانے کے لیے ہے اور دوسرا یعنی باقی ماندہ حصہ جلانے اور آگ روشن کرنے کے لیے ہے جو لکڑیاں صاف ستھری مضبوط اور صحیح سالم ہیں انہیں پہلے مصرف میں لاؤں گا اور جو لکڑیاں خراب اور ٹوٹی پھوٹی ہیں انہیں دوسرے کام میں صرف کروں گا تو ظاہر ہے کہ بڑھئی کے دو مقاصد ہیں ایک حقیقی اور اصلی اور دوسرا ثانوی۔ اس کا ہدف تو بہترین دروازے اور پرخوبصورت نقش ونگار اور لکڑی کا دیگر سامان تیار کرنا ہے۔ اور وہ اپنی تمام تر کوشش اس مقصد کے حصول میں صرف کرے گا۔ لیکن جب وہ دیکھے گا کہ کچھ لکڑی ناکارہ ہے اور اس کے کام کی نہیں تو مجبوراً اُسے جلانے کے لیے الگ کردے گا۔ تو یہ ثانوی ہدف ومقصد ہے نہ کہ اصلی (غور کیجئے گا)۔

اس مثال میں اور ہمارے زیرِ بحث موضوع میں فرق صرف یہ ہے کہ لکڑیوں کا ایک دوسرے سے فرق اختیاری نہیں ہے۔ لیکن انسانوں کا فرق خود ان کے اعمال سے وابستہ ہے اور ان کے اختیار میں ہے۔ اس گفتگو کا بہترین ثبوت وہ صفات ہیں جو جہنمی اور بہشتی گروہ کی ہم مندرجہ بالا آیات میں پڑھتے ہیں۔ جو نشاندہی کرتی ہیں کہ اس گروہ بندی کا سرچشمہ خود انہی کے اعمال ہیں۔

دوسرے لفظوں میں خدا نے مختلف آیات میں صریحاً بتایا ہے کہ اس نے سب کو پاک و پاکیزہ خلق فرمایا ہے اور یہ ان کے اختیار میں ہے کہ وہ چاہیں تو نیکی کے راستے پر چلیں اور ترقی پائیں لیکن ایک گروہ اپنے اعمال کی وجہ سے جہنم کا راستہ اختیار کرتا ہے جو بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ اور ایک گروہ اپنے اعمال کی بنا پر اپنے آپ کو بہشت کے لیے نامزد کرتا ہے۔ اور اس کا انجام خوش بختی ہے اس کے بعد دوزخی گروہ کی صفات کا خلاصہ تین جملوں میں بیان کیا گیا ہے۔

پہلا یہ کہ وہ دل تو رکھتے ہیں لیکن ان سے غور وفکر اور ادراک کا کام نہیں لیتے (لهم قلوب لا يفقهون بها) یہ بات متعدد مقامات پر کہی جا چکی ہے قرآن کی اصطلاح میں روحِ فکر اور قوتِ عقل کے معنی میں ہے یعنی اس کے باوجود کہ وہ قوتِ فکر رکھتے ہیں اور چوپایوں کی طرح بے شعور نہیں پھر بھی اس فضیلت سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور نہ ہی سوچ بچار کرتے ہیں اور حوادث کے عوامل و نتائج پر غور نہیں کرتے اور اس عظیم بدبختی کے چنگل سے نجات پانے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتے۔

دوسرا یہ کہ روشن اور حقیقت کو دیکھنے والی آنکھیں تو رکھتے ہیں لیکن حقائق پر نگاہ نہیں ڈالتے اور اندھوں کی طرح ان کے قریب سے گزر جاتے ہیں (ولهم اعين لا يبصرون بها)۔

تیسرا یہ کہ صحیح وسالم کان رکھنے کے باوجود سچائی کی بات نہیں سنتے اور بہروں کی طرح اپنے آپ کو حرفِ حق سننے سے محروم رکھتے ہیں (ولهم أذان لا يسمعون بها)۔

یہ لوگ درحقیقت چوپایوں کی طرح ہیں کیونکہ چوپایوں سے انسان کا امتیاز بیدار فکر، چشم بینا اور سننے والے کان کی بناء پر ہے افسوس کہ یہ ان سب صلاحیتوں کو گنوا چکے ہیں۔ (اولئك كالانعام)۔ بلکہ وہ چوپاؤں سے بھی زیادہ گمراہ اور پست تر ہیں (بل هم اضل)۔

کیونکہ چوپائے تو یہ استعداد اور وسائل نہیں رکھتے لیکن یہ عقلِ سلیم دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان کی بدولت ہر قسم کی ترقی و سعادت کا امکان رکھتے ہیں۔ چونکہ ان کا رجحان ہوس پرستی اور ذلت کی طرف ہوتا ہے اس لیے وہ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے استفادہ

نہیں کرتے اور یہیں سے اُن کی بدبختی شروع ہو جاتی ہے۔ تو وہ غافل اور بے خبر افراد ہیں۔ اور اسی لیے وہ بے راہ روی کا شکار رہیں (اولٓئک ھم الغافلون)۔

آبِ حیات کا چشمہ اُن کے پاس ہے پھر بھی وہ پیاس کے مارے فریاد کر رہے ہیں بھلائی کے دروازے ان کے سامنے کھلے ہوئے ہیں لیکن ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی بدبختی کو خود دعوت دیتے ہیں اور گراں قدر عقل، آنکھ اور کان جیسی نعمتوں سے فیض نہیں اٹھاتے۔ یہ نہیں کہ خدا نے انہیں جبری طور پر دوزخیوں کی صف میں شامل کر دیا ہے۔

وہ چوپایوں کی طرح کیوں ہیں

قرآن مجید میں بے خبر غافلین کو بارہا بے شعور چوپایوں اور حیوانات سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مویشیوں سے تشبیہ اس لیے دی گئی ہو کہ وہ صرف کھانے پینے، سونے اور جنسی شہوات میں لگے رہتے ہیں۔ بالکل ان اقوام و ملل کی طرح جو پُرفریب نعروں کے ذریعے عدالت اجتماعی اور قوانین بشری کا آخری مقصد روٹی پانی اور ایک آسودہ مادی زندگی کا حصول قرار دیتے ہیں۔ حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں اس سلسلے میں ارشاد فرماتے ہیں:

کالبھیمۃ المربوطۃ ھمھا علفھا اوالمرسلۃ شغلھا تقممھا

مثل بندھے ہوئے جانور کے جو صرف گھاس کی فکر میں ہے یا دوسرے جانور جو چراگاہ میں چھوڑ دیئے گئے ہیں اور اِدھر اُدھر سے بچا کھچا گھاس اُٹھا لیتے ہیں [1]

بالفاظ دیگر آسودہ حال اور دولت مند گروہ گھر میں پرورش پانے والی بندھی ہوئی بھیڑ بکریوں کی طرح ہے اور جو گروہ خوشحال نہیں وہ ان مویشیوں کی طرح ہے جو بیابان میں دربدر پانی اور گھاس کے پیچھے پھرتے رہتے ہیں لیکن ان دونوں گروہوں کا مقصد شکم سیری کے سوا کچھ نہیں۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے ہو سکتا ہے یہ ایک ہی فرد پر صادق آئے یا ایک قوم و ملت پر۔ وہ قومیں جنہوں نے اپنی فکر و سوچ کو ناکارہ کر دیا ہے اور وہ غیر مہذب سرگرمیوں میں مصروف ہیں نہ تو وہ اپنی بدبختی کی اصل بنیادوں پر غور و فکر کرتی ہیں اور نہ اپنی ترقی کی بنیادوں پر سوچ بچار کرتی ہیں۔ ان کے کان سنتے ہیں نہ آنکھیں دیکھتی ہیں تو یہ بھی دوزخی ہیں نہ صرف قیامت کی دوزخ میں ہوں گے بلکہ وہ اس دنیا میں بھی زندگی کی دوزخ میں گرفتار ہیں۔

بعد والی آیت میں اہل بہشت کی وضع و کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اول دوزخیوں کی صف سے باہر نکالنے کے لیے لوگوں کو خدا کے اسماء حسنیٰ پر گہری توجہ دینے کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: خدا کے لیے بہترین نام ہیں اسے انہی کے ساتھ پکارو (وللہ الاسمآء الحسنیٰ فادعوہ بھا)۔ اسماء حسنیٰ سے مراد پروردگار کی مختلف صفات ہیں جو سب اچھی اور

---

[1] نہج البلاغہ۔ خط نمبر ۴۵۔

سب کی سب حسنیٰ ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ خدا عالم ہے، قادر ہے، رازق ہے، عادل ہے، جواد ہے، کریم ہے، رحیم ہے اور اسی طرح اس کی اور بھی بہت سی صفات ہیں۔

خدا کو ان ناموں کے ساتھ پکارنے سے مراد صرف یہ نہیں کہ ان الفاظ کو ہم اپنی زبان پر جاری کریں، مثلاً ہم کہیں یا عالم، یا قادر "یا ارحم الراحمین" بلکہ چاہیے یہ کہ ہم ان صفات کو حتی المقدور اپنے اندر پیدا کریں۔ خدا کے علم و دانش کا پرتو، اس کی قدرت و توانائی کی ایک کرن اور اس کی وسیع رحمت کا ایک ذرہ ہم میں اور ہمارے معاشرے میں عملی شکل اختیار کرلے۔ دوسرے لفظوں میں اس جیسے اوصاف خود میں پیدا کریں اور اس کے اخلاقِ حسنیٰ کو اپنائیں اور اُسے مشعل راہ بنائیں تاکہ اس علم و قدرت اور اسی عدالت و رحمت کے سائے میں ہم اپنے آپ کو اور اس معاشرے کو جس میں زندگی بسر کر رہے ہیں دوزخیوں کی صف سے نکال لیں۔

اس کے بعد خدا لوگوں کو اس بات سے ڈراتا ہے کہ وہ اُس کے ناموں میں تحریف نہ کریں لہٰذا ارشاد ہوتا ہے انہیں چھوڑ دو جو خدا کے ناموں میں ردّ و بدل کرتے ہیں وہ عنقریب اپنے بُرے اعمال کی سزا پائیں گے (وذروا الذین یلحدون فی اسمآئہ سیجزون ما کانوا یعملون)۔

"الحاد" اصل میں "لحد" (بروزن مہد) اس گڑھے کے معنی میں ہے جو ایک ہی طرف ہو اسی بنا پر وہ گڑھا جو قبر کی ایک طرف ہو اسے لحد کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہر اس کام کو الحاد کہا جانے لگا جو اعتدال اور وسط کی حد سے افراط یا تفریط کی طرف مائل ہو۔ شرک اور بت پرستی پر بھی اسی وجہ سے الحاد کا اطلاق ہوتا ہے۔

اسماء خدا میں الحاد سے مراد یہ ہے کہ ہم ان کے الفاظ اور مطالب کو تبدیل کردیں یا اسے ایسے اوصاف کے ساتھ متصف کریں کہ جو خدا کے شایانِ شان نہ ہو۔ عیسائیوں کی طرح جو تین خداؤں کو مانتے ہیں یا یہ کہ خدا کی صفات کو اس کی مخلوق پر منطبق کریں بت پرستوں کی طرح جو بتوں کے ناموں کو خدا کے نام سے اخذ کرتے تھے مثلاً ایک بت کو "لات" دوسرے کو "العزیٰ" اور تیسرے کو "منات" کہتے تھے جو بالترتیب "اللہ" "العزیز" اور "المنان" سے مشتق تھے۔ یا مثل عیسائیوں کے جو خدا کا نام عیسیٰ اور روح القدس کو دیتے ہیں۔

یا یہ کہ اس کی صفات میں اس طرح ردّ و بدل کریں کہ جس کا نتیجہ مخلوقات سے تشبیہ یا صفات کی تعطیل یا اس قسم کی کوئی چیز ہو یا صرف نام پر اکتفا کریں بلکہ اس کے کہ ان صفات کو اپنے اُوپر یا اپنے معاشرے پر منطبق کریں۔

آخری آیت میں دو حصّوں کی طرف کہ جو بہشتی گروہ کی بنیادی صفات ہیں، اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان میں سے کہ جنہیں ہم نے خلق کیا ہے ایک امت اور گروہ ایسا ہے جو لوگوں کو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے اور حق کے مطابق حکم کرتا ہے (وممن خلقنا امة یھدون بالحق وبه یعدلون)۔

حقیقت یہ ہے کہ ان کے دو واضح پروگرام ہیں۔ ان کی فکر، ان کا ہدف، ان کی دعوت اور ان کی تہذیب و تمدن حق اور جانبِ حق ہے نیز ان کا عمل ان کا پروگرام اور ان کی حکومت حق اور حقیقت کی بنیاد پر قائم ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ اسماء حسنیٰ کیا ہیں: شیعہ و سنی کتب حدیث و تفسیر میں "اسماء حسنیٰ" کے سلسلہ میں تفصیلی مباحث ملتی ہیں کہ جن کا خلاصہ اور اپنا

نکتہ نظر ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ "اسماء حسنیٰ" کا مطلب "اچھے نام" ہے اور ہمیں معلوم ہے کہ پروردگار کے سب نام اپنے اندر اچھے مفاہیم ہی رکھتے ہیں تو اس بنا پر اس کے سب نام ہی حسنیٰ ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ وہ ذات پاک کی صفات ثبوتیہ میں سے ہوں مثلاً "عالم و قادر" یا یہ کہ ذات مقدس کی صفات سلبیہ میں سے ہوں۔ جیسا کہ "قدوس" یا وہ جو صفات فعل ہیں جو اس کے کسی فعل کی ترجمانی کرتی ہیں مثلاً خالق، غفور، رحمٰن اور رحیم۔

دوسری طرف اس میں بھی شک نہیں کہ صفات باری تعالیٰ کا احاطہ اور شمار نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے کمالات لامحدود ہیں اور اس کے ہر کمال کے لیے کوئی نام اور صفت ہم انتخاب کر سکتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی صفات میں سے بعض بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہیں اور "اسماء حسنیٰ" جو کہ اوپر والی آیت میں آئے ہیں شاید ان میں ممتاز تر صفات کی طرف اشارہ ہو کیونکہ وہ روایات جو پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ اہل بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں ان میں بارہا یہ مطلب نظر سے گزرا ہے کہ خدا کے ننانوے نام ہیں اور جو شخص بھی اسے ان ناموں کے ساتھ پکارے اس کی دعا مستجاب ہوگی اور جو انہیں شمار کرے وہ اہل بہشت میں سے ہے۔

مثلاً وہ روایت جو کتاب توحید صدوق میں امام صادقؑ نے اپنے آباؤ اجداد کے حوالے سے حضرت علیؑ سے نقل کی ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"ان اللّٰہ تبارک و تعالیٰ تسعۃ و تسعین اسماً مأۃ الا واحدۃ. من احصاھا دخل الجنۃ......"[1]

"اللہ کے ننانوے نام ہیں جو انہیں شمار کرے جنت میں داخل ہوگا۔

نیز کتاب توحید ہی میں امام علی بن موسیٰ رضاؑ سے ان کے آباؤ اجداد کے حوالے سے حضرت علیؑ سے نقل ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"ان اللّٰہ عزوجل تسعۃ و تسعین اسماً من دعا اللّٰہ بھا استجاب لہ ومن احصاھا دخل الجنۃ"[2]

یعنی خدا تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کے ذریعے اللہ کو پکارے اس کی دُعا مستجاب ہوگی اور جو انہیں شمار کرے وہ داخلِ جنت ہوگا۔

صحیح بخاری، مسلم، ترمذی اور اہلسنت کی دیگر کتب حدیث میں بھی یہی مضمون خدا کے ننانوے ناموں کے بارے میں درج ہے اور یہ بھی کہ جو شخص خدا کو ان کے ساتھ پکارے اس کی دعا قبول ہوگی یا جو شخص انہیں شمار کرے وہ اہل بہشت میں سے ہوگا۔ ان میں سے بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ننانوے نام قرآن مجید میں ہیں۔ مثلاً وہ روایت جو ابن عباس سے منقول ہے کہ پیغمبرؐ نے فرمایا:

"للّٰہ تسعۃ و تسعون اسماً من احصاھا دخل الجنۃ وھی فی القرآن"[3]

اللہ کے ننانوے نام گننے والا جنت میں جائے گا اور وہ قرآن میں ہیں۔

اسی لیے بعض علماء نے کوشش کی ہے کہ وہ ان ناموں اور صفات کو قرآن مجید سے اخذ کریں لیکن خدا کے جو نام قرآن مجید میں آئے ہیں وہ ننانوے سے زیادہ ہیں لہٰذا ہو سکتا ہے کہ اسماء حسنیٰ انہیں کے درمیان ہوں۔ اور یہ درست نہیں کہ ننانوے ناموں کے

---

[1]، [2]، [3] تفسیر المیزان۔ مجمع البیان اور نور الثقلین آیہ ہذا کے ذیل میں۔

علاوہ خدا کا اور کوئی نام نہیں۔

بعض روایات میں یہ ننانوے نام آئے ہیں۔ ہم ذیل میں ان میں سے ایک حدیث بیان کرتے ہیں (لیکن یاد رہے کہ ان میں سے بعض نام جس طرح اس روایت میں آئے ہیں اس طرح متن قرآن میں نہیں ہیں لیکن ان کا مضمون و مفہوم قرآن میں موجود ہے)۔

اور یہ وہ روایت ہے جو "توحید صدوق" میں امام صادقؑ سے ان کے آباؤ اجداد کے حوالے سے حضرت علیؑ کے ذریعہ پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے کہ جس میں اس طرف اشارہ فرمانے کے بعد خدا کے ننانوے نام ہیں آپ فرماتے ہیں:

وھی اللہ، الالٰہ، الواحد، الاحد، الصمد، الاول، الاٰخر، السمیع، البصیر القدیر، القاہر، العلی، الاعلیٰ، الباقی، البدیع، البارئ، الاکرم، الباطن، الحی الحکیم، العلیم، الحلیم، الحفیظ، الحق، الحسیب، الحمید، الحفی، الرب، الرحمٰن الرحیم، الذاریٔ، الرازق، الرقیب، الرؤف، الرائی، السلام، المؤمن، المھیمن، العزیز الجبار، المتکبر، السید، السبوح، الشھید، الصادق، الصانع، الظاہر، العدل، العفو، الغفور، الغنی الغیاث، الفاطر، الفرد، الفتاح، الفالق، القدیم، الملک، القدوس، القوی، القریب، القیوم القابض، الباسط، قاضی الحاجات، المجید، المولیٰ، المنّان، المحیط، المبین، المغیث، المصوّر الکریم، الکبیر، الکافی، کاشف الضر، الوتر، النور، الوھّاب، الناصر، الواسع، الودود، الھادی الوفی، الوکیل، الوارث، البرّ، الباعث، التوّاب، الجلیل، الجواد، الخبیر، الخالق، خیر الناصرین، الدیّان الشکور، العظیم، اللطیف، الشافی۔[1]

لیکن جو چیز یہاں زیادہ اہمیت رکھتی ہے اور خصوصیت کے ساتھ جس کی طرف ہمیں توجہ دینی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کو ان ناموں سے پکارنے یا پروردگار کے اسماء حسنیٰ کو شمار کرنے سے یہ مراد نہیں کہ ان کے معانی و مفاہیم کی طرف توجہ کیے بغیر صرف الفاظ ادا کیے جائیں تو کوئی شخص سعادت مند ہو جائے گا یا اس کی دعا قبول ہو جائے گی۔ بلکہ اصل مقصد تو یہ ہے کہ ان اسماء اور صفات پر ایمان رکھتا ہو اور کوشش کرے کہ اپنے وجود میں ان کے مفاہیم کا پرتو یعنی عالم، قادر، رحمان، رحیم، حلیم، غفور، قوی، قیوم، غنی، رازق وغیرہ کا مفہوم اپنے وجود میں منعکس کرے۔ مسلم ہے کہ ایسا شخص بہشتی بھی ہو جائے گا اور اس کی دعا بھی قبول ہوگی اور ہر خیر و نیکی کو بھی پالے گا۔

جو کچھ ضمناً بیان ہوا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگر کچھ روایات اور دعاؤں میں ان ناموں کے علاوہ خدا کے اسماء کا تذکرہ ملتا ہے اور بعض دعاؤں میں خدا کے ناموں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی ہے، تو ہمارا بیان ان کے منافی نہیں کیونکہ خدا کے اسماء کی کوئی انتہا نہیں اور خدا کی ذات با کمال ولا زوال کی طرح وہ غیر محدود ہیں اگرچہ ان میں سے کچھ صفات اور اسماء ممتاز ہیں۔

بعض اور روایات بھی ہیں منجملہ وہ روایت جو کافی میں امام صادقؑ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

نحن واللہ الاسماء الحسنیٰ

---

[1] المیزان جلد ۸ صفحہ ۳۷۶ (منقول از توحید صدوق)۔

خدا کی قسم ہم خدا کے اسماء حسنیٰ ہیں۔[۱]

گویا اس طرف اشارہ ہے کہ صفات خداوندی کا قوی پرتو ہمارے وجود میں منعکس ہوا ہے اور ہماری معرفت اس کی پاک ذات کی معرفت کے لیے ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ ایسی روایات بھی سطور بالا میں پیش کیے گئے مفہوم سے کوئی تضاد نہیں رکھتیں۔

یا پھر بعض دوسری احادیث میں درج ہے کہ تمام "اسماء حسنیٰ" کا خلاصہ "خالص توحید" میں ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کی تمام صفات اس کی یکتا ذات پاک کی طرف لوٹتی ہیں۔

فخرالدین رازی اپنی تفسیر میں ایک مطلب کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ایک لحاظ سے قابلِ غور ہے کہ پروردگار کی تمام صفات ان دو حقیقتوں کی نشاندہی کرتی ہیں: "اس کی ذات کی ہر چیز سے بے نیازی" یا "ہر چیز کی اس کی ذات کی طرف نیازمندی"۔[۲]

۲۔ فلاح و نجات پانے والا گروہ: جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ بندگان خدا کا ایک گروہ حق کی طرف دعوت دیتا ہے اور حق کے مطابق حکم کرتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس گروہ سے کون لوگ مراد ہیں ان روایات میں جو احادیث اسلام میں آئی ہیں مختلف تعبیریں نظر سے گزرتی ہیں۔ بشمول ان کے امیرالمومنینؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

اس سے مراد امت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔[۳]

یعنی وہ لوگ جو رسولِ اکرمؐ کے سچے پیروکار ہیں اور جو آنحضرتؐ کی تعلیمات میں کسی قسم کے رد و بدل، تغیر، بدعت اور انحراف سے کنارہ کش ہیں۔

اسی بناء پر ایک اور حدیث میں رسول اکرمؐ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

والذی نفسی بیدہ لتفترقن ھذہ الامة علی ثلاث وسبعین فرقة کلھا فی النار الا فرقة "وممن خلقنا امة یھدون بالحق وبه یعدلون" وھذہ التی تنجو من ھذہ الامة.

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی کہ جو سب دوزخ میں جائیں گے سوائے ایک فرقے کے کہ جن کی طرف خدا نے آیہ وممن خلقنا امة ...... میں اشارہ کیا ہے صرف وہی اہلِ نجات ہیں۔[۴]

ہو سکتا ہے ۷۳ کا عدد کثرت یا بہتات کے لیے استعمال ہوا ہو اور مختلف گروہوں کی طرف اشارہ مطلوب ہو جو اسلام کی پوری تاریخ میں عجیب و غریب عقائد کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے رہے اور خوش قسمتی سے ان میں سے زیادہ تر ختم ہو گئے ہیں اور تاریخ عقائد کی کتب میں صرف اُن کے نام رہ گئے ہیں۔ ایک اور حدیث میں جو اہلِ سنت کے منابع میں حضرت علیؑ سے منقول ہے ہم پڑھتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے ان مختلف گروہوں کے ضمن میں جو آئندہ اُمتِ اسلامی میں پیدا ہونے والے تھے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وہ گروہ جو اہلِ نجات ہے وہ میرے شیعہ اور میرے مکتب کے پیروکار ہیں۔[۵]

---

[۱] نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۰۳۔ [۲] تفسیر فخر رازی جلد ۱۵ صفحہ ۶۶۔ [۳] نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۰۵۔ [۴] مدرک قبلی۔
[۵] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۵۲

بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ اس آیت سے مراد آئمہ اہل بیت ہیں[1]
واضح ہے کہ اوپر والی تمام روایات ایک ہی سچائی وحقیقت کی تصدیق کررہی ہیں۔ اور اس حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو بیان کررہی ہیں۔ یعنی آیت میں ایک ایسے گروہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو دعوتِ حق دیتا ہے اور جس کا قول وفعل نظام حکومت اور پروگرام سراسر حق ہے اور وہ سچے اور صحیح اسلام کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے اور یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ تمام تضادات کے باوجود جو علمی، نسلی اور لسانی معاملات میں ہوتے ہیں وہ (پھر بھی) ایک ہی امت اور ایک گروہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ کیونکہ قرآن ان کے بارے میں اُمّت (نہ کہ اُمم) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

۳۔ خدا کا اسم اعظم: بعض روایات میں کہ جو "بلعم باعورا" کے واقعہ سے متعلق ہیں، جس کا تذکرہ ہوچکا ہے یہ آیا ہے کہ وہ خدا کے "اسم اعظم" کو جانتا تھا۔ اوپر والی آیات کی مناسبت سے جن میں خدا کے اسماءِ حسنیٰ پر گفتگو ہوئی ہے مناسب ہوگا کہ ہم اس موضوع کی طرف اشارہ کریں۔

اسم اعظم کے سلسلے میں گوناگوں روایات ملتی ہیں اور ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اس اسم سے باخبر ہو نہ صرف اس کی دعا قبول ہوتی ہے بلکہ یہ عین بھی اٹھاتا ہے کہ خدا کے حکم سے عالم طبیعت میں تصرف بھی کرسکتا ہے اور اہم کام انجام دے سکتا ہے۔

اس بارے میں کہ خدا کے ناموں میں سے اسم اعظم کونسا ہے بہت سے علماء اسلام نے بحث کی ہے اور زیادہ تر مباحث جس محور کے گرد گھومتی ہیں، وہ یہ ہے کہ خدا کے ناموں میں سے وہ اس نام کا سراغ لگائیں جو یہ عجیب اور عظیم خاصیت رکھتا ہو۔

لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس بات کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے کہ ہم ایسے نام اور صفات کا پتہ لگائیں کہ جن کے مفہوم کو اپنانے سے ہم ایسا روحانی کمال حاصل کریں کہ جس سے وہ آثار مرتب ہوں۔ بالفاظ دیگر اصل مسئلہ ان صفات کو خود میں پیدا کرنا، ان مفاہیم کا واجد ہونا اور ان اوصاف سے متصف ہونا ہے۔ ورنہ کس طرح ممکن ہے کہ گناہوں سے آلودہ ایک شخص مستجاب الدعوۃ وغیرہ ہوجائے۔

اور اگر ہم سنتے ہیں کہ بلعم اسم اعظم کا حامل تھا اور اسے ہاتھ سے کھو بیٹھا تو اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ وہ خود سازی، ایمان کی آگاہی اور پرہیزگاری کی وجہ سے روحانیت کے اس مرتبہ پر فائز ہوگیا تھا کہ اس کی دعا بارگاہِ ایزدی میں رد نہیں ہوتی تھی لیکن پھر وہ ان لغزشوں کے نتیجے میں کہ جن سے بہرحال انسان محفوظ نہیں ہے اور ہوس پرستی میں مبتلا ہونے سے، فرعونوں اور طاغوتوں کی خدمت گزاری کی وجہ سے وہ روحانیت ومعنویت سے مکمل طور پر ہاتھ دھو بیٹھا اور اس مقام ومرتبہ کو کھو بیٹھا اور اسم اعظم کے بھول جانے سے مراد ہوسکتا ہے یہی معنی ہو۔

نیز اگر مرقوم ہے کہ رسول عظیم اور ہادیانِ برحق اسم اعظم سے آگاہ تھے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ انہوں نے خدا کے اس عظیم ترین اسم کی حقیقت کو اپنے وجود میں جذب کرلیا تھا اور اس حالت وکیفیت کی وجہ سے خدا نے انہیں یہ بلند مقام عطا فرمادیا تھا۔

۱۸۲۔ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

۱۸۳۔ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ۝

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۰۴ و صفحہ ۱۰۵۔

ترجمہ

۱۸۲۔ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہم تدریجاً انہیں اس طریقے سے سزا دیں گے جسے وہ نہیں جانتے۔

۱۸۳۔ اور انہیں ہم مہلت دیتے ہیں (تاکہ ان کی سزا زیادہ دردناک ہو جائے) کیونکہ میرا منصوبہ قوی (اور حساب و کتاب کے مطابق) ہے (اور کوئی شخص اس سے فرار کی قدرت نہیں رکھتا)۔

تفسیر

تدریجی سزا

اس بحث کے بعد جو گذشتہ آیات میں دوزخیوں کے بارے میں ہوئی تھی۔ ان دو آیات میں خدا کی طرف سے سزا کا ذکر ہے جو ایک سنت کے طور پر بہت سے سرکش گنہگاروں کو دی جاتی ہے اور یہ وہی سزا ہے جسے "عذاب استدراج" یا "تدریجی سزا" کہتے ہیں۔

استدراج قرآن میں دو مواقع پر آیا ہے۔ ایک زیر نظر آیت میں اور دوسرا سورہ "قلم" کی آیہ ۴۴ میں دونوں مواقع پر "استدراج" کا استعمال آیاتِ الٰہی کا انکار کرنے والوں کے لیے ہوا ہے۔

لغت میں استدراج کے دو معانی ہیں ایک یہ کہ کسی چیز کو تدریجاً اور آہستہ آہستہ لینا (کیونکہ یہ لفظ "درجہ" سے اخذ کیا ہے جو سیڑھی کے ایک قدم کے معنی میں ہے جس طرح انسان اوپر چڑھنے اور نیچے اترنے یا عمارت کے نچلے حصوں سے اوپر کی طرف جاتے ہوئے سیڑھی کے درجوں یا قدموں سے فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح جب کسی چیز کو تدریجاً اور مرحلہ وار لیں یا گرفتار کریں تو اس عمل کو استدراج کہتے ہیں) استدراج کا دوسرا معنی ہے لپیٹنا اور تہ کرنا۔ جس طرح کاغذوں کے ایک پلندے کو لپیٹتے ہیں (ان دونوں معانی کو راغب نے کتاب مفردات میں بھی بیان کیا ہے) لیکن غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں معانی ایک کلی اور جامع مفہوم "انجام تدریجی" کی ہی ترجمانی کرتے ہیں۔

استدراج کا معنی واضح ہو جانے کے بعد ہم آیت کی تفسیر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں خداوند عالم پہلی آیت میں فرماتا ہے جنہوں نے ہماری آیات کی تذلیل کی اور انکار کیا تدریجاً اور آہستہ آہستہ اس راستے سے کہ جسے وہ نہیں جانتے ہم سزا کے پھندے میں انہیں گرفتار کریں گے اور ان کی زندگی (کی بساط) کو لپیٹ دیں گے (والذین کذبوا بآیاتنا سنستدرجھم من حیث لا یعلمون) دوسری آیت میں تاکید مطلب کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اس طرح نہیں کہ جلدبازی میں ایسے افراد کو ہم فوراً سزا دے دیں بلکہ انہیں ہم کافی مہلت اور وقت دیتے ہیں تاکہ وہ واپس سیدھے راستے پر آجائیں اور ہوش میں آجائیں اور جب وہ نہیں سمجھتے تو انہیں گرفتار کرتے ہیں (واملی لھم)۔ کیونکہ جلدبازی اور تیزی کرنا تو ان لوگوں کا کام ہے جو کافی قدرت نہیں رکھتے۔ اور انہیں ڈر ہوتا ہے کہ موقع ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے "لیکن میرا طریقہ کار قوی ہے اور سزا اس طرح منصوبے کے مطابق ہوتی ہے کہ کسی شخص میں اس سے فرار کی قدرت نہیں" (ان کیدی متین) "متین" قوی اور شدید کے معنی میں ہے اور اصل میں "متن" سے لیا گیا ہے کہ جو اس مضبوط پٹھے کو کہتے ہیں جو پشت پر

رہتا ہے۔

"کید" اور "مکر" ہم معانی ہیں اور جس طرح سورہ آل عمران کی آیہ ۵۴ (جلد ۲) میں بیان کیا گیا ہے "مکر" لغت میں چارہ جوئی، باز رکھنے اور کسی کے مقصد تک پہنچنے کے معنی میں ہے اور "تکلیف دہ سازشیں" والا معنی جو آجکل کی فارسی میں پایا جاتا ہے وہ اس کے عربی مفہوم میں نہیں ہے۔

"استدراجی سزا" کے بارے میں کہ جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہوا ہے اور دوسری آیات قرآن اور احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے توضیح یہ ہے کہ خدا گنہگاروں اور منہ زور سرکشوں کو ایک سنت کے مطابق فوراً سزا نہیں دیتا بلکہ نعمتوں کے دروازے ان پر کھول دیتا ہے تو وہ زیادہ سرکشی دکھاتے ہیں خدا کی نعمتوں کو ضرورت سے زیادہ اکٹھا کر لیتے ہیں۔ اس کے دو مقاصد ہوتے ہیں یا تو یہ نعمتیں ان کی اصلاح اور سیدھے راستے پر آنے کا سبب بن جاتی ہیں اور اس صورت میں ہدایت خداوندی کا پروگرام عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور یا ان کے غرور اور بے راہ روی میں اضافہ ہو جاتا ہے تو اس موقع پر ان کی سزا دردناک مرحلہ پر پہنچ جاتی ہے کیونکہ جب وہ خدا کی بے شمار نعمتوں اور عنایتوں میں غرق ہو جاتے ہیں تو خدا ان سے وہ تمام نعمتیں چھین لیتا ہے اور زندگی کی بساط لپیٹ دیتا ہے ایسی سزا بہت ہی سخت ہے

البتہ یہ معنی اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ صرف لفظ استدراج میں پنہاں نہیں ہے بلکہ (من حیث لا یعلمون) کی شرط کی طرف متوجہ ہونے سے معلوم ہوتا ہے۔

بہر حال اس آیت میں تمام گنہگاروں کے لیے تنبیہ ہے کہ وہ عذاب الٰہی کی تاخیر کو اپنی پاکیزگی اور راستی یا پروردگار کی کمزوری پر محمول نہ کریں اور وہ عنایات اور نعمتیں جن میں وہ غرق ہیں انہیں خدا سے اپنے تقرب سے تعبیر نہ کریں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو کامیابیاں اور نعمتیں انہیں ملتی ہیں۔ پروردگار کی استدراجی سزا کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ خدا انہیں اپنی نعمتوں میں محو کر دیتا ہے اور انہیں مہلت دیتا ہے انہیں بلند سے بلند تر کرتا ہے لیکن آخر کار انہیں اس طرح زمین پر پٹختا ہے کہ ان کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے۔ اور ان کے تمام کاروبار زندگی اور تاریخ کو لپیٹ دیتا ہے۔

امیر المومنین حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں۔

انہ من وسع علیہ فی ذات یدہ فلم یرہ ذٰلک استدراجًا فقد امن مخوفا

"وہ شخص کہ جسے خدا نے بہا نعمات اور وسائل دے اور وہ اسے استدراجی سزا نہ سمجھے تو وہ خطرے کی نشانی سے غافل ہے[1]"

نیز حضرت علیؑ سے کتاب "روضہ کافی" میں نقل ہوا ہے آپؑ نے فرمایا،

"ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں کوئی چیز حق سے زیادہ پوشیدہ اور باطل سے زیادہ ظاہر اور خدا اور اس کے رسولؐ پر جھوٹ بولنے سے زیادہ نہیں ہوگی۔

یہاں تک کہ آپؑ نے فرمایا۔

"اس زمانے میں کچھ افراد ایسے ہوں گے کہ صرف قرآن کی ایک آیت چن کر (اس کی تحریف کریں گے) اور خدا کے دین سے نکل جائیں گے اور ہمیشہ وہ ایک حاکم کے دین سے دوسرے حاکم کے دین کی طرف اور ایک شخص کی دوستی سے

[1] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۰۷

دوسرے کی دوستی کی طرف اور ایک حکمران کی اطاعت سے دوسرے حکمران کی اطاعت کی طرف اور ایک کے عہد و پیمان سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتے رہیں گے اور آخر کار ایسے راستے سے کہ جس کی طرف ان کی توجہ نہیں، پروردگار کی استدراجی سزا میں گرفتار ہو جائیں گے۔[1]

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

کم من مغرور بما قد انعم الله علیه وکم من مستدرج بستر الله علیه وکم من مفتون بثناء الناس علیه،

"کتنے لوگ ایسے ہیں جو پروردگار کی نعمتوں کی وجہ سے مغرور ہو جاتے ہیں اور کتنے گنہگار ایسے ہیں جن کے گناہوں پر خدا نے پردہ ڈال رکھا ہے لیکن وہ گناہ کو جاری رکھتے ہوئے سزا کی طرف بڑھتے رہتے ہیں اور کتنے ایسے ہیں کہ لوگوں کی خوشامد سے دھوکا کھا جاتے ہیں"۔[2]

نیز امام جعفر صادقؑ سے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ آپؑ نے ارشاد فرمایا:

هو العبد یذنب الذنب فتجدد له النعمة معه تلهیه تلك النعمة عن الاستغفار عن ذلك الذنب۔

"اس آیت سے مراد وہ گنہگار بندہ ہے کہ جو گناہ کرتا ہے اور خدا اسے اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے (کہ شاید وہ سدھر جائے) لیکن وہ اس نعمت کو اپنی اچھائی کے حساب میں ڈال لیتا ہے اور وہ اسے گناہ سے توبہ کرنے کی بجائے غفلت میں ڈال دیتی ہے"۔[2]

نیز اسی امامؑ سے کتاب کافی میں اس طرح نقل ہوا ہے۔

ان الله اذا اراد بعبد خیرا فاذنب ذنبا اتبعه بنقمة ویذکره الاستغفار، واذا اراد بعبد شرا فاذنب ذنبا اتبعه بنعمة لینسیه الاستغفار ویتمادی بها، وهو قوله عز وجل سنستدرجهم من حیث لا یعلمون، بالنعم عند المعاصی۔[3]

"جب خدا کسی بندے کی خیر چاہتا ہے تو جب وہ گناہ کرتا ہے تو (فوراً) اسے سزا دیتا ہے تاکہ وہ توبہ کو یاد رکھے اور جب کسی بندے کی برائی (اس کے اعمال کے نتیجہ میں) چاہتا ہے تو جب وہ گناہ کرتا ہے تو اسے نعمت عطا کرتا ہے تاکہ وہ استغفار کو بھول جائے اور اس (گناہ) کو جاری رکھے۔

اور یہ وہی چیز ہے جس کے متعلق ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۰۶۔

[2] و [2] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۰۶۔

[3] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۵۲۔

سنستدرجھم من حیث لا یعلمون ، یعنی نعمتوں کے ذریعہ گناہوں کے وقت تدریجاً ایسے طریقے سے
کہ جسے وہ نہیں جانتے ہم انہیں سزا میں مبتلا کرتے ہیں۔

۱۸۴۔ اَوَلَمۡ یَتَفَكَّرُوۡا ۜ مَا بِصَاحِبِهِمۡ مِّنۡ جِنَّةٍ ؕ اِنۡ هُوَ اِلَّا نَذِیۡرٌ
مُّبِیۡنٌ ○

۱۸۵۔ اَوَلَمۡ یَنۡظُرُوۡا فِیۡ مَلَكُوۡتِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا خَلَقَ
اللّٰهُ مِنۡ شَیۡءٍ ۙ وَّاَنۡ عَسٰۤی اَنۡ یَّكُوۡنَ قَدِ اقۡتَرَبَ اَجَلُهُمۡ ۚ
فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَهٗ یُؤۡمِنُوۡنَ ○

۱۸۶۔ مَنۡ یُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ ؕ وَیَذَرُهُمۡ فِیۡ طُغۡیَانِهِمۡ
یَعۡمَهُوۡنَ ○

ترجمہ

۱۸۴۔ کیا وہ سوچتے نہیں کہ ان کے ہم نشین (پیغمبر خدا) پر کوئی جنون کے آثار نہیں ہیں (تو پھر وہ کس طرح ایسے بے ہودہ
الزام اس پر لگاتے ہیں) وہ تو صرف ان کو ڈرانے والا ہے (جو لوگوں کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے)۔

۱۸۵۔ کیا وہ آسمان و زمین کی حکومت میں جسے خدا نے پیدا کیا ہے (توجہ سے عبرت کی) نظر نہیں ڈالتے (اور کیا
اس میں بھی فکر نہیں کرتے کہ) شاید ان کی زندگی ختم ہونے کے قریب ہے (اگر وہ اس واضح آسمانی کتاب پر
ایمان نہ لائے تو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔

۱۸۶۔ جسے خدا (اس کے برے اعمال کی پاداش میں) گمراہ کر دے تو پھر کوئی اسے ہدایت کرنے والا نہیں اور خدا
انہیں ان کی بغاوت اور سرکشی میں چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ سرگرداں رہیں۔

شانِ نزول

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جب پیغمبر اکرم ابھی مکہ میں تھے تو ایک رات آپ صفا کی پہاڑی پر چڑھ گئے اور لوگوں کو ایک
خدا کو ماننے اور اسی کی عبادت کرنے کی دعوت دی۔ خصوصاً آپ نے تمام قبائل قریش کو پکارا اور انہیں خدا کی سزا سے ڈرایا یہاں

تک کرات کا کافی حصہ گزر گیا تو بت پرست کہنے لگے (ان صاحبهم قد جن بات ليلا يصوت الى الصباح) ہمارا ساتھی پاگل ہوگیا ہے شام سے لے کر صبح تک پکارتا رہتا ہے اس موقع پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں منہ توڑ جواب دیا گیا۔

باوجودیکہ اس آیت کی مخصوص شان نزول ہے، پھر بھی اس میں چونکہ پیغمبر کا تعارف اور اس کی تخلیق کا مقصد اور دوسری زندگی کے لیے تیاری کی دعوت ہے یہ گذشتہ مباحث سے تعلق رکھتی ہے جو دوزخی اور بہشتی گروہوں کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔

تفسیر

تہمت تراشیاں اور بہانہ سازیاں

اس آیت میں پہلے پیغمبر پر جنون کے الزام کے بارے میں بت پرستوں کی بے بنیاد بات کا خدا تعالیٰ اس طرح جواب دیتا ہے: کیا وہ اپنی سمجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے تاکہ جان لیں کہ ان کے ہم نشین (پیغمبرؐ) میں کسی قسم کے جنون کے آثار نہیں (اولم يتفكروا ما بصاحبهم من جنة)۔[1]

اس طرف اشارہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ ان کے درمیان کوئی اجنبی نہ تھے بلکہ ان کی اپنی اصطلاح میں "صاحب" یعنی دوست و ہمسر تھے۔ چالیس سال سے زیادہ عرصے سے ان میں آپ کا آنا جانا تھا۔ ہمیشہ انہوں نے آپ کے فکر و تدبر کو دیکھا اور ہمیشہ دانشمندی کے آثار آپ میں مشاہدہ کیے۔ جو شخص اس دعوت سے پہلے معاشرے کے مدبر ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ تو کس طرح انہوں نے اچانک اس پر یہ بہتان لگا دیا۔ اس قسم کا بے ہودہ الزام لگانے سے بہتر نہیں تھا کہ وہ سوچتے کہ ہوسکتا ہے وہ درست ہی کہہ رہا ہو اور دعوت حق کے لیے خدا نے ہی اُسے مامور کیا ہو۔ جس طرح اس پر الزام تراشی کے بعد قرآن کہتا ہے: "وہ فقط واضح ڈرانے والا ہے جو اپنی قوم کو آنے والے خطرات سے خبردار کرتا ہے" (ان هو الا نذير مبين)۔ مذکورہ بالا دوسری آیت میں اس بیان کی تکمیل کے لیے عالم ہستی، آسمانوں اور زمین کے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے: "کیا وہ آسمان و زمین کی حکومت اور اس مخلوق پر جسے خدا نے پیدا کیا ہے راستی کی نظر نہیں ڈالتے" (اولم ينظروا في ملكوت السموٰت والارض وما خلق الله من شيء)۔ تاکہ وہ جان لیں کہ اس وسیع عالم کو بنانا اور اس میں حیرت انگیز نظام قائم کرنا فضول نہیں بلکہ اس کا کوئی مقصد تھا اور پیغمبرؐ جو دعوت حق دیتے ہیں وہ درحقیقت اُسی مقصد خلقت کی تکمیل اور انسان کی تربیت و ترقی کے مقصد کی ہی ایک کڑی ہے۔

"ملکوت" دراصل "ملک" سے بنا ہے۔ جو حکومت اور مالکیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس میں "واو" اور "ت" کا اضافہ تاکید اور مبالغہ کے لیے آتا ہے اور عام طور پر "عالم ہستی پر خدا کی مکمل حکومت" کے لیے بولا جاتا ہے اس عالم ہستی کے بہترین نظام پر نظر ڈالنا جو خدا کے ملک و حکومت کی وسعت رکھتا ہے ایک تو خدا پرستی اور حق پر ایمان کو تقویت دیتا ہے ساتھ ہی اس عظیم و منظم

---

[1] جیسا کہ بزرگ اہل لغت نے کہا ہے "جنة" جنون کے معنی میں ہے اور اس کا اصلی معنی پوشش ڈھانپنا اور حائل ہونا ہے گویا جنون کے وقت ایک پردہ عقل کے اوپر پڑ جاتا ہے (مزید وضاحت کے لیے جلد ۳) نمونہ صفحہ ۲۰۲ کی طرف رجوع فرمائیں۔

عالم میں ایک اہم مقصد بھی واضح ہو جاتا ہے۔ دونوں باتیں انسان سے اس بات کا تقاضا کرتی ہیں یا لوگ سے خدا کے نما ئندے اور اس کی رحمت کی جستجو پہ ابھارتی ہیں تاکہ انسان اپنے مقصد تخلیق کو پورا کر سکے۔

اس کے بعد انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے، کیا انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ ہو سکتا ہے کہ ان کی زندگی کی آخری گھڑیاں آپہنچی ہوں اور اگر آج ایمان نہ لائے اور اس پیغمبر کی دعوت کو قبول نہ کیا اور جو قرآن اس پر نازل ہوا ہے اسے ان واضح نشانیوں کے باوجود تسلیم نہ کیا تو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے (و ان عسیٰ ان یکون قد اقترب اجلهم فبای حدیث بعدهٗ یؤمنون)۔

یعنی — پہلی بات تو یہ ہے کہ ایسا نہیں کہ ان کی عمر جاودانی اور دائمی ہو، مہلت کی گھڑیاں تیزی سے گزر رہی ہیں، کوئی نہیں جانتا کہ کل زندہ ہو گا یا نہیں تو پھر ایسے میں آج اور کل کرنا اور مسائل کو پسِ پشت ڈالنا ہرگز دانشمندانہ کام نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ اس قرآن پر باوجود ان سب نشانیوں کے جو خدا کی طرف سے اس میں ہیں، ایمان نہ لائے تو کیا اس سے برتر اور بالاتر کتاب کے انتظار میں ہیں، کیا ممکن ہے کہ وہ کسی دوسری بات اور دعوت پر ایمان لے آئیں گے۔

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں زیر نظر آیت نے مشرکین کے لیے فرار کے تمام راستے بند کر دیئے ہیں۔ ایک طرف سے انہیں رسول اللہ کی اعلانِ رسالت سے قبل کی عقل و دانش کی طرف متوجہ کیا گیا ہے تاکہ وہ آپ پر جنون کی تہمت لگا کر ان کی دعوت سننے سے فرار نہ کریں، دوسری طرف سے انہیں نظام خلقت، خالق اور مقصد خلقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، تیسری طرف سے انہیں دنیا کی زندگی کے جلد گزر جانے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور چوتھی طرف سے یہ کہا گیا ہے کہ اگر وہ اس طرح کی واضح کتاب پر ایمان نہیں لائے تو پھر کسی چیز پر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ کیونکہ اس سے بالاتر کا تو تصور نہیں ہو سکتا۔

آخر کار زیر نظر آیات میں سے آخری آیت میں گفتگو کو یوں سمیٹا گیا ہے کہ: جسے خدا اس کے قبیح اور دائمی بُرے اعمال کی وجہ سے گمراہ کر دے اس کے لیے کوئی ہدایت کرنے والا نہیں ہے اور خداوند عالم انہیں اس طرح طغیان و سرکشی میں چھوڑ دے گا تاکہ وہ حیران و سرگرداں رہیں (من یضلل اللہ فلا ھادی لہٗ و یذرھم فی طغیانھم یعمھون)۔

جیسا کہ ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ ایسی تعبیریں تمام کافروں اور گنہگاروں کے لیے نہیں ہیں بلکہ ایسے لوگوں کے لیے مخصوص ہیں جو حقائق کے سامنے اس طرح کی ہٹ دھرمی، تعصب اور عناد کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ گویا ان کی آنکھ، کان اور دل پر پردہ پڑا ہوا ہے، ایسے تاریک پردے جو ان کے اعمال کا نتیجہ ہیں اور اضلالِ الٰہی (یعنی خدا کی طرف سے گمراہ کیے جانے) سے بھی یہی مراد ہے۔

۱۸۷۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ
رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؔ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا

عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۸۷۔ تجھ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب واقع ہوگی۔ کہہ دو: اس کا علم میرے پروردگار کو ہے اور اس کے علاوہ کوئی اس وقت کو واضح نہیں کر سکتا (لیکن قیامت کا قیام) آسمانوں اور زمین (تک) میں سخت (اہمیت کا حامل) ہے اور وہ تمہارے تعاقب میں نہیں آئے گی مگر یہ کہ اچانک اور ناگہانی طور پر۔ (پھر وہ) تجھ سے یوں سوال کرتے ہیں گویا تو اس کے وقوع پذیر ہونے کے زمانے سے باخبر ہے۔ کہہ دو: اس کا علم صرف خدا کے پاس ہے لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔

شانِ نزول

قیامت کب برپا ہوگی؟

جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے[1] قریش نے چند آدمیوں کو مامور کیا کہ وہ نجران جائیں اور یہودی علماء سے ملیں (کیونکہ عیسائیوں کے علاوہ نجران میں یہودی بھی آباد تھے)۔ ان کے ذمہ لگایا گیا کہ وہ ان سے پیچیدہ قسم کے سوالات پوچھ آئیں تاکہ وہ سوالات پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں پیش کیے جا سکیں (ان کا گمان تھا کہ رسولِ خدا ان کے جواب نہ دے پائیں گے)۔ ان میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ قیامت کب برپا ہوگی۔

جب انہوں نے یہ سوال رسول اللہ سے کیا تو زیرِ نظر آیت کے ذریعے انہیں جواب دیا گیا[2]

تفسیر

اگرچہ آیت کے لیے مخصوص شانِ نزول بیان کی گئی ہے تاہم یہ قبل کی آیات سے واضح طور پر وابستہ ہے کیونکہ گذشتہ آیات میں مسئلہ قیامت کا ذکر تھا اور ساتھ ہی اس کے لیے تیاری کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ فطری طور پر ایسی بحث کے بعد بہت سے لوگوں

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۵۰۔

[2] بعض مفسرین ــ مثلاً طبری مرحوم ــ نے اس آیت کی شانِ نزول یہودیوں کے بارے میں ذکر کی ہے کہ وہ خدمتِ پیغمبرؐ میں آئے اور انہوں نے قیامت کے متعلق سوال کیا لیکن یہ سورت چونکہ مکہ میں نازل ہوئی ہے اور وہاں پیغمبر اکرمؐ کو یہودیوں سے سابقہ نہیں پڑتا تھا لہٰذا یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے۔

کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کب آئے گی۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے: تجھ سے ساعت (روزِ قیامت) کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب آئے گی (یسئلونک عن الساعۃ ایان مرسٰھا)۔

لفظ "ساعت" اگرچہ "دنیا سے جانے کے آخری وقت" کے مفہوم میں بھی آیا ہے لیکن زیادہ تر اور بقول بعض ہمیشہ قرآن مجید میں "قیامِ قیامت" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ خاص طور پر اس سلسلے میں تاکید کرنے والے کچھ قرائن بھی ہیں جن کا ہم اس بحث کے ضمن میں ذکر کریں گے، مثلاً شانِ نزول کا جملہ "متٰی تقوم الساعۃ" (یعنی قیامت کب برپا ہوگی)۔

لفظ "ایان" "متٰی" کے مساوی ہے اور زمانے کے بارے میں سوال کے لیے ہے۔

"مرسٰی" اصطلاح کے مطابق مصدر میمی ہے، "ارساء" کا ہم معنی ہے اور کسی چیز کے اثبات یا وقوع کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے مستحکم اور ثابت پہاڑوں کو جبال راسیات کہا جاتا ہے۔ لہٰذا "ایان مرسٰھا" کا مفہوم ہے "قیامت کس زمانے میں وقوع پذیر اور ثابت ہوگی"۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اے پیغمبر! اس سوال کے جواب میں صراحت سے کہہ دو کہ یہ علم صرف میرے پروردگار کے پاس ہے اور اس کے علاوہ کوئی اس وقت کو ظاہر نہیں کرسکتا (قل انما علمھا عند ربی لا یجلیھا لوقتھا الا ھو)۔

لیکن سرسری طور پر اس کی دو نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ پہلے فرمایا گیا ہے: قیامت کا برپا ہونا آسمانوں اور زمین میں ایک سخت معاملہ ہے (ثقلت فی السمٰوٰت والارض)۔ اس سے زیادہ سنگین اور سخت حادثہ اور کونسا ہوسکتا ہے کیونکہ اس دن قیامت میں تمام آسمانی کرات ریزہ ریزہ ہوکر گر پڑیں گے، آفتاب بے نور ہوجائے گا، ماہتاب تاریک ہوجائے گا، ستارے اپنی روشنی سے محروم ہوجائیں گے اور ذراتِ عالم ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں گے — ان میں سے جو کچھ بچے گا اس سے ایک نیا جہان معرضِ وجود میں آئے گا۔[1]

پھر ارشاد ہوتا ہے: تجھ سے یوں پوچھتے ہیں گویا تو قیامت کے زمانہ وقوع سے باخبر ہے (یسئلونک کانک حفی عنھا)۔[2]

مزید ارشاد ہوتا ہے: ان کے جواب میں کہو کہ یہ علم صرف خدا کے پاس ہے لیکن بہت سے لوگ اس حقیقت سے آگاہی نہیں رکھتے کہ یہ علم اس ذاتِ پاک سے مخصوص ہے لہٰذا پے در پے اس کے متعلق سوال کرتے ہیں (قل انما علمھا عند اللّٰہ ولٰکن اکثر الناس لا یعلمون)۔

ہوسکتا ہے یہ سوال کیا جائے کہ یہ علم ذاتِ خدا سے کیوں مخصوص ہے اور کیوں کسی کو یہاں تک کہ انبیاء کو بھی اس سے آگاہ نہیں کیا گیا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وقوعِ قیامت سے عدمِ آگاہی سے اس کے عظیم موقع کے ناگہانی ہونے کا مقصد حاصل ہوتا ہے تاکہ لوگ کسی وقت بھی قیامت کو دور نہ سمجھیں اور ہمیشہ اس کے انتظار میں رہیں اور اس طرح سے اس موقع پر اپنے آپ کو نجات دلانے کے لیے تیار رہیں۔ یہ عدمِ آگاہی تربیتِ نفوس، ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہونے اور گناہ سے پرہیز کرنے کے لیے مثبت اور واضح طور پر پُر اثر ہے۔

---

[1] بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس جملے سے مراد یہ ہے کہ قیامت کے بارے میں جاننا اور آگاہی حاصل کرنا اہل آسمان و زمین کے لیے ثقیل اور بوجھل ہے — لیکن حق وہی ہے جو اوپر بیان کیا جاچکا ہے کیونکہ لفظ "علم" اور "اھل" کو محذوف ماننا آیت کے ظاہر کے خلاف ہے۔

[2] "حفی" اصل میں ایسے شخص کو کہتے ہیں جو پے در پے کسی چیز کے متعلق سوال کرے، اصرار سے اس کے پیچھے پڑا رہے اور چونکہ سوال میں اصرار انسان کے علم میں پیش رفت کا باعث ہوتا ہے اس لیے کبھی یہ لفظ "عالم" کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

۱۸۸۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ښ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ڔ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ۧ

ترجمہ

۱۸۸۔ کہہ دو: میں اپنے نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر جو کچھ خدا چاہے (اور پوشیدہ وغیب اسرار سے بھی باخبر نہیں ہوں مگر وہ کہ جس کا خدا ارادہ کرے) اور اگر میں غیب سے باخبر ہوتا تو اپنے لیے بہت سے منافع فراہم کر لیتا اور مجھے کوئی برائی (اور نقصان) نہ پہنچتا۔ میں تو صرف ایمان لانے والوں کے لیے (عذاب الٰہی سے) ڈرانے والا اور (اس کی عظیم جزاؤں کی) خوشخبری دینے والا ہوں۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے ــــ مثلاً مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں ــــ نقل کیا ہے کہ اہل مکہ نے پیغمبر اسلامؐ سے کہا کہ اگر تم خدا سے ارتباط رکھتے ہو تو کیا تمہارا پروردگار آئندہ اجناس کی قیمتوں میں ہونے والی کمی بیشی سے باخبر نہیں کرتا تاکہ اس طرح سے تم اپنے فائدے میں جو کچھ ہو اُسے مہیا کر لو اور جو کچھ تمہارے نقصان میں ہو اس سے بچ جاؤ یا پھر وہ تمہیں مختلف علاقوں کی خشک سالی یا سیرابی سے آگاہ نہیں کرتا تاکہ خشک سالی کے دوران پُر برکت زمینوں کی طرف کوچ کر جاؤ ــــ اس موقع پر زیر نظر آیت نازل ہوئی۔

تفسیر

پوشیدہ اسرار صرف خدا جانتا ہے

اس آیت کے لیے بھی اگرچہ ایک خاص شان نزول مذکور ہے تاہم گذشتہ آیت سے اس کا ارتباط واضح ہے کیونکہ گذشتہ آیت میں اس سلسلے میں تھی کہ قیامت کے برپا ہونے کا وقت خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور زیر نظر آیت میں علم غیب کی خدا کے علاوہ کسی کے لیے کاملاً نفی کی گئی ہے۔

پہلے جملے میں پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے: ان سے کہہ دو کہ اپنے بارے میں مَیں کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں مگر وہ کہ جو خدا چاہے (قل لا املك لنفسي نفعا ولا ضرا الا ما شاء الله)۔

اس میں شک نہیں کہ ہر شخص اپنے لیے نفع حاصل کر سکتا ہے یا ضرر اپنے سے دُور کر سکتا ہے لیکن اس کے باوجود، جیسا کہ ہم دیکھ رہے

ہیں کہ مندرجہ بالا آیت میں مطلقاً ہر بشر کی اس قدرت کی نفی کی گئی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ در حقیقت انسان اپنے کاموں کے لیے اپنی طرف سے کوئی قدرت و طاقت نہیں رکھتا بلکہ تمام قدرتیں خدا کی طرف سے ہیں اور وہی ہے جس نے یہ قدرتیں انسانی اختیار میں دی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں تمام قدرتوں کا مالک اور عالم ہستی میں بالذات صاحبِ اختیار صرف خدا کی ذاتِ پاک ہے اور باقی سب یہاں تک کہ انبیاء اور ملائکہ بھی اسی سے قدرت حاصل کرتے اور ان کی مالکیت اور قادریت بالغیر ہے الا ما شاء اللہ (مگر وہ جو خدا چاہے اور میرے اختیار میں دے دے)۔ یہ بھی اسی مطلب پر گواہ ہے۔

قرآن مجید کی اور بہت سی آیات میں بھی نفع و نقصان اور سود و زیاں کی غیر خدا سے مالکیت کی نفی کی گئی ہے۔ اسی بناء پر بتوں اور جو کچھ غیر خدا ہے اس کی پرستش سے منع کیا گیا ہے۔

سورہ فرقان آیہ ۳ میں ہے:

واتخذوا من دونہ آلھۃ لا یخلقون شیئا و ھم یخلقون ولا یملکون لانفسھم ضرا ولا نفعا

انہوں نے خدا کے علاوہ اپنے لیے معبود قرار دے رکھے ہیں، ایسے معبود جو کوئی چیز پیدا نہیں کرسکتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور اپنے بارے میں سود و زیاں پر اختیار نہیں رکھتے (چہ جائیکہ دوسروں کے بارے میں کچھ کرنے پر قادر ہوں)۔

ہر مسلمان خدا کے علاوہ کسی کو بھی خالق، رازق اور نفع و نقصان کا مالک نہیں سمجھتا۔ اسی لیے اگر وہ کسی سے کوئی چیز مانگتا بھی ہے تو در حقیقت اس کی نظر میں ہوتی ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ خدا کی طرف سے ہے (غور کیجئے گا)۔

یہاں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ انبیاء اور آئمہ کو کسی بھی کام میں وسیلہ قرار دینے کی نفی میں اس آیت کو دستاویز کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اسے ایک قسم کا شرک سمجھتے ہیں دراصل اشتباہ کا شکار ہیں، انہوں نے تصور کر لیا ہے کہ پیغمبر اور امام سے توسل کا مفہوم یہ ہے کہ انہیں خدا کے مقابلے میں مستقل اور سود و زیاں کا مالک سمجھا جائے ـــ حالانکہ اگر کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ پیغمبر اور امام خود سے کچھ نہیں رکھتے بلکہ جو کچھ چاہتے ہیں خدا سے چاہتے ہیں اس حالت میں ان سے توسل یا شفاعت و سفارش چاہنا تو عین توحید اور عین اخلاص ہے "الا ما شاء اللہ" ـــ میں قرآن نے اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا ہے نیز "من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ" میں "الا باذنہ" بھی اسی طرف اشارہ ہے۔

اس بناء پر دو گروہ توسل کے معاملے میں اشتباہ کا شکار ہیں۔ ایک وہ جو پیغمبر یا امام کے لیے خدا کے مقابلے میں بالذات قدرت اور مستقل دستگاہ کے قائل ہیں اور یہ ایک قسم کا شرک اور بت پرستی ہے اور دوسرے وہ جو انبیاء اور آئمہ سے قدرت بالغیر کی نفی کرتے ہیں اور یہ بھی صریح آیاتِ قرآن سے انحراف ہے۔ راہِ حق یہ ہے کہ انبیاء اور آئمہ حکم خدا سے اس کے ہاں شفاعت کرتے ہیں اور متوسل ہونے والے کی مشکل کا حل خدا سے چاہتے ہیں۔

یہ بات بیان کرنے کے بعد قرآن نے ایک اور اہم مسئلے کی نشاندہی کی ہے، یہ مسئلہ دراصل ایک گروہ نے پیغمبر اکرم سے پوچھا تھا اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے: ان سے کہہ دو کہ میں غیب اور پوشیدہ اسرار سے آگاہ نہیں ہوں کیونکہ اگر اسرار نہاں سے آگاہ ہوتا تو اپنے لیے بہت سے منافع مہیا کر لیتا اور مجھے کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچتا (و لو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من

الخیر وما مسنی السوء)۔ کیونکہ جو شخص تمام مخفی اسرار سے آگاہ ہو وہ ان چیزوں کو انتخاب کرسکتا ہے جو اس کے لیے نفع بخش ہیں اور جن سے اس کا نقصان ہوسکتا ہے اس سے پرہیز کرے گا۔

اس کے بعد اپنی رسالت کے حقیقی مقام کو ایک مختصر اور صریح جملے میں بیان فرمایا ہے: میں صرف ایمان لانے والوں کو ڈرانے والا اور بشارت دینے والا ہوں (ان انا الا نذیر و بشیر لقوم یؤمنون)۔

کیا پیغمبر غیب نہیں جانتے تھے؟

کچھ لوگ جن کا مطالعہ محدود ہے اور جو کسی ایک آیت کو فقط سطحی طور پر دیکھتے ہیں اور دوسری آیاتِ قرآن کو نگاہ میں نہیں رکھتے بلکہ خود اسی آیت میں موجود تمام قرائن پر توجہ نہیں دیتے، فیصلہ کر دیتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیت کو بھی ایسے لوگوں نے انبیاء کرام سے علم غیب کی مطلقاً نفی کی دلیل سمجھا ہے۔ حالانکہ یہ آیت تو پیغمبر سے علم بالذات و مستقل کی نفی کرتی ہے جب کہ اس میں شک نہیں کہ ہر شخص اپنے بارے میں اور دوسروں کے بارے میں نفع اور نقصان کا مالک ہے۔

لہٰذا قبل کا جملہ واضح گواہ ہے کہ سود و زیاں کی مالکیت کی نفی یا علم غیب کی نفی سے نفی مطلق مراد نہیں ہے بلکہ ہدف نفی استقلال ہے۔ دوسرے لفظوں میں پیغمبر اپنی طرف سے کچھ نہیں جانتے تھے بلکہ جو کچھ خدا نے غیب اور اسرار نہاں سے انہیں عطا کیا تھا وہ اسے جانتے تھے، جیسا کہ سورہ جن آیہ ۲۶ اور ۲۷ میں ہے:

عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدا الا من ارتضی من رسول

خدا تمام امورِ غیب سے آگاہ ہے اور وہ کسی کو اپنے علم غیب سے آگاہ نہیں کرتا مگر ان رسولوں کو جن سے وہ راضی ہے۔

اصولی طور پر مقام رہبری کی تکمیل کے لیے اور بالخصوص ایک عالمی قیادت کے لیے تمام مادی و روحانی امور میں بہت سے مسائل سے آگاہی ضروری ہے۔ قیادت کے اس مرتبے کے لیے بہت سے ایسے امور سے واقفیت ضروری ہے جو دوسرے لوگوں سے پوشیدہ ہیں۔ ایسے رہبر کے لیے نہ صرف احکام و قوانین کا علم ضروری ہے بلکہ جہانِ ہستی کے اسرار، انسانی عمارت کے امور اور ماضی و مستقبل کے حوادث کا کچھ علم خدا تعالیٰ اپنے بھیجے ہوئے نمائندوں کو عطا کرتا ہے اور اگر نہ کرے تو ان کی رہبری کی تکمیل نہیں ہوتی۔

بالفاظ دیگر کہا جاسکتا ہے کہ اگر وہ اسرارِ غیب سے بالکل آگاہ نہ ہوں تو ان کے اقدامات اور گفتگو زمان و مکان میں محدود ہو کر رہ جائیں گے اور ان کا قول و عمل ایک دور اور ایک ماحول میں مقید ہو جائے گا لیکن اگر وہ اسرارِ غیب میں سے ایک حصہ پر مطلع ہوں تو وہ پروگراموں کی اس طرح سے تشکیل دیں گے کہ وہ آنے والوں اور دوسرے حالات و مقتضیات میں موجود لوگوں کے لیے

---

۱ درحقیقت زیر نظر آیت میں "و لا اعلم الغیب" کا جملہ مذوف ہے اور بعد والا جملہ اس پر گواہ ہے۔

بھی مفید اور کافی وافی ہوں گے۔

غیب کی آگاہی ــــ کے سلسلے میں مزید توضیح تفسیر نمونہ جلد ۳ ص ۳۵۱ پر ملاحظہ کیجئے۔

۱۸۹۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ
اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ ۚ فَلَمَّآ
اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ
مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ○
۱۹۰۔ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى
اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○
۱۹۱۔ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ○
۱۹۲۔ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ○
۱۹۳۔ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ
اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ○

ترجمہ

۱۸۹۔ وہ خدا وہ ہے کہ جس نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے اور اس کی بیوی کو اسی کی جنس (اور نوع) سے قرار دیا ہے تاکہ اس سے سکون حاصل کرے۔ اس کے بعد جب وہ اس سے نزدیک ہوا تو وہ ایک ہلکے سے (بوجھ کے ساتھ) حاملہ ہو گئی کہ جس کے ہوتے ہوئے وہ اپنے دوسرے کام جاری رکھے ہوئے تھے اور جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں نے مل کر اپنے پروردگار سے دعا کی (کہ انہیں نیک اور صالح فرزند عطا کرے اور عرض کیا) کہ اگر تو نے ہمیں نیک فرزند عطا کیا تو ہم شکرگزاروں میں سے ہوں گے۔

۱۹۰۔ پس جب اس نے انہیں نیک بیٹا دیا تو انہوں نے دوسرے موجودات کو اس میں مؤثر سمجھا اور) خدا

نے انہیں جو نعمت بخشی تھی اس کے لیے شرکاء کے قائل ہو گئے اور جسے اس کا شریک قرار دیا جائے خدا اس سے برتر ہے۔

۱۹۱۔ کیا ایسے موجودات کو اس کا شریک قرار دیتے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور وہ خود مخلوق ہیں۔

۱۹۲۔ اور نہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں۔

۱۹۳۔ اور جب انہیں ہدایت کی طرف دعوت دو تو تمہاری پیروی نہیں کرتے۔ ان کے لیے اس میں کوئی فرق نہیں، چاہے انہیں دعوت دو یا خاموش رہو۔

تفسیر

ایک عظیم نعمت کا کفران

ان آیات میں مشرکین کے حالات اور طرز فکر کے ایک اور پہلو اور ان کے اشتباہ کا جواب دیا گیا ہے۔ گذشتہ آیت میں سود و زیاں اور علم غیب سے آگاہی کو خدا میں منحصر قرار دیا گیا ہے اور درحقیقت خدا تعالےٰ کی توحیدِ افعالی کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، اب یہ آیات گذشتہ آیات کے مضمون کی تکمیل شمار ہوتی ہیں کیونکہ یہ بھی خدا کی توحیدِ افعالی کی طرف اشارہ ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے : وہ خدا وہ ہے کہ جس نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اس کی بیوی کو اس کی جنس سے قرار دیا تاکہ اس سے سکون حاصل کرے (ھوالذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منھا زوجھا لیسکن الیھا)۔

یہ دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں آرام بخش زندگی گزار رہے تھے "لیکن جب شوہر نے اپنی بیوی سے جنسی ارتباط کیا تو وہ ہلکے سے بوجھ سے حاملہ ہوگئی، ابتدا میں تو اس حمل سے کوئی مشکل پیدا نہ ہوئی اور حاملہ ہونے کے باوجود اپنے دوسرے کاموں کو جاری رکھے ہوئے تھی (فلما تغشٰھا حملت حملاً خفیفاً فمرّت بہ)[1]

لیکن جوں جوں روز و شب گزرے حمل کا بوجھ بڑھتا گیا یہاں تک کہ اس نے بہت بوجھ محسوس کیا (فلما اثقلت) اس وقت وہ دونوں ایک فرزند کے انتظار میں تھے اور ان کی آرزو تھی کہ خدا انہیں نیک فرزند عطا فرمائے لہٰذا وہ "بارگاہِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے اپنے پروردگار کو اس طرح پکارا : بارالہا ! اگر تو نے ہمیں صالح اور نیک فرزند عطا کیا تو ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے (دعوااللہ ربھما لئن اٰتیتنا صالحاً لنکونن من الشاکرین)۔ لیکن

---

[1] • "تغشٰھا" "تغشّی" کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے ڈھانپنا اور چھپانا۔ یہ لفظ عربی زبان میں مباشرت کے لیے ایک لطیف اشارہ ہے۔

جب خدا نے انہیں بچہ سالم اور باصلاحیت فرزند عطا کیا تو اس عظیم نعمت کی حمایت میں خدا کے شریک کے قائل ہو گئے لیکن خدا ان کے شرک سے برتر و بالاتر ہے (فلما آتاھما صالحاً جعلا لہ شرکآء فیما آتاھما فتعالی اللہ عما یشرکون)۔

ایک اہم سوال کا جواب

مندرجہ بالا آیات میں جن میاں بیوی کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے وہ کون ہیں؟ اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔
کیا نفس واحدۃ اور اس کی بیوی سے مراد آدم اور حوا ہیں، جبکہ آدم نبی تھے اور حوا ایک اچھی با ایمان خاتون تھیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ راہ توحید سے منحرف ہو کر راہ شرک پر چل پڑے ہوں۔
اور اگر آدم کے علاوہ کوئی اور مراد ہے اور تمام انسانوں کے لیے ہے تو لفظ "واحدۃ" سے یہ بات کیسے مناسبت رکھتی ہے؟
اس سے قطع نظر یہاں کس عمل یا فکر و نظر کو شرک قرار دیا گیا ہے؟
ان باتوں کا جواب پیش خدمت ہے۔
ان آیات کی تفسیر میں ہمارے سامنے دو راستے ہیں، اس سلسلے میں مفسرین کی جو مختلف باتیں سامنے آئی ہیں شاید ان سب کی بنیاد انہی سے سمجھ میں آجائے۔

۱۔ پہلا راستہ یہ ہے کہ "واحدۃ" سے مراد آیت میں "واحد شخصی" ہے، جیسا کہ بعض دوسری آیات میں بھی ہے۔ مثلاً سورہ نساء کی پہلی آیت میں بھی ایسا ہی ہے[1]۔
"نفس واحدۃ" قرآن مجید میں پانچ مقامات پر آیا ہے، ایک زیر بحث آیت میں، دوسرا سورہ نساء کی پہلی آیت میں، تیسرا انعام آیہ ۹۸ میں، چوتھا لقمان آیہ ۲۸ میں اور پانچواں زمر آیہ ۶ میں۔ ان میں سے بعض مقامات کا ہماری موجودہ بحث سے تعلق نہیں ہے البتہ بعض مقامات زیر بحث آیت کے مشابہ ہیں لہٰذا "واحد شخصی" کا مطلب یہ ہوگا کہ یہاں تصرف طور پر حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی کی طرف اشارہ ہے۔
مسلم ہے کہ اس صورت میں شرک سے مراد غیر خدا کی پرستش اور پروردگار کے علاوہ کسی کی الوہیت کا اعتقاد نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس سے مراد بیٹے کی طرف ایک طرح کا میلان ہو کہ کبھی بعض میلانات بھی خدا سے غافل کر دیتے ہیں۔
۲۔ دوسری تفسیر یہ ہے کہ "واحدۃ" سے مراد یہاں "واحد نوعی" ہے یعنی خدا نے تم سب کو ایک ہی نوع سے پیدا کیا ہے اور تمہاری بیویوں کو بھی تمہاری جنس میں سے قرار دیا ہے۔
اس صورت میں دونوں آیات اور بعد والی آیات نوع انسانی کی طرف اشارہ ہیں یعنی انسان بچے کی پیدائش کے انتظار کے دنوں میں تو بہت دست دعا بلند کرتے ہیں اور خدا سے نیک اور قابل اولاد کی خواہش کرتے اور ان لوگوں کی طرح جو مشکل اور خطرے کے وقت تو پورے خلوص سے بارگاہ خداوندی کی طرف جاتے ہیں اور اس سے عہد کرتے ہیں کہ وہ حاجات پوری ہونے اور مشکلات حل ہونے کے بعد شکر گزار رہیں گے لیکن جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے یا ان کی مشکل حل ہو جاتی ہے تو تمام عہد و پیمان فراموش کر دیتے ہیں۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۳ (صفحہ ۲۵۷ اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

کبھی کہتے کہ ہمارا بیٹا اگر صحیح و سالم اور خوبصورت ہے تو ماں باپ پر گیا ہے اور قانونِ وراثت کا تقاضا تھا، کبھی کہتے ہیں کہ ہماری غذا، طرز اور دیگر امور اور حالات سازگار اور اچھے تھے لہٰذا یہ انہی کا نتیجہ ہے اور کبھی ان بتوں کا رخ کرتے ہیں کہ جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے بچے پر انہی کی نظرِ کرم تھی۔ اسی طرح کی باتیں کرتے ہیں اور خلقتِ الٰہی کے تمام نقوش نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ اس نعمت کی علت و سبب عوامل طبیعی کو قرار دیتے ہیں یا پھر اپنے بے ہودہ معبودوں کا کرشمہ شمار کرتے ہیں[1]

مندرجہ بالا آیات میں کچھ ایسے قرائن موجود ہیں جو دوسری تفسیر سے زیادہ مناسبت رکھتے ہیں مثلاً:

۱۔ آیات کی تعبیریں ایسے میاں بیوی کی حالت بیان کرتی ہیں جو پہلے سے کسی معاشرے میں رہتے تھے اور اچھی بری اولاد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے خدا سے اچھی اولاد کا تقاضا کیا اور اگر آیات آدم و حوا سے متعلق ہوتیں تو ان کے ہاں تو ابھی بچہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا اور ابھی صالح و غیر صالح اور اچھے برے کا وجود ہی نہ تھا کہ وہ خدا سے اپنے لیے اچھے بیٹے کی درخواست کرتے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ دوسری آیت اور اس کے بعد والی آیات میں سب جمع کی ضمیریں ہیں۔ یہ چیز بتاتی ہے تثنیہ کی ضمیر سے مراد دو گروہ تھے نہ کہ دو شخص۔

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ بعد کی آیات نشاندہی کرتی ہیں کہ ان آیات میں شرک سے مراد بت پرستی ہے نہ کہ اولاد کی محبت وغیرہ اور یہ بات حضرت آدم اور ان کی زوجہ کے لیے روا نہیں ہے۔

ان قرائن کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اوپر والی آیات نوعِ انسانی اور شوہروں اور بیویوں کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں جیسا کہ ہم اس تفسیر کی دوسری جلد (ص ۲۵۳ اردو ترجمہ) میں اشارہ کر آئے ہیں، انسان کی بیوی کا انسان سے پیدا ہونے کا یہ معنی نہیں کہ اس کے لیے مرد کے بدن کا کوئی حصہ الگ ہو کر بیوی بن گیا ہے (جیسا کہ ایک جعلی اور اسرائیلی روایت میں ہے کہ حوا آدم کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی ہیں) بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کی بیوی اس کی نوع سے ہے جیسا کہ سورہ روم کی آیہ ۲۱ میں ہے:

ومن اٰیاتہٖ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا

قدرتِ خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ ہم نے تمہاری بیویاں نوع سے پیدا کی ہیں تاکہ ان سے سکون حاصل کرو۔

ایک مشہور اور جعلی روایت

اہلِ سنت کی بعض کتب میں اور کچھ غیر معتبر شیعہ کتب میں مندرجہ بالا آیات کی تفسیر میں ایک حدیث نقل کی گئی ہے جو انبیاء کے بارے میں اسلامی عقائد سے کسی لحاظ سے بھی مناسبت نہیں رکھتی اور وہ یہ ہے:

---

[1] بعض مفسرین نے دونوں آیات کو حضرت آدم کے لیے اور ذیل آیت کو اولادِ آدم کے لیے قرار دیا ہے جو آیت کے ظاہری مفہوم سے کسی طرح سے بھی مطابقت نہیں رکھتا اور اصطلاح کے مطابق حذف اور تقدیر یا ضمیر کو مرجع کے غیر کی طرف پلٹنے کا محتاج ہے۔

سمرہ بن جندب پیغمبر اکرمؐ کے حوالے سے بیان کرتا ہے:

لما ولدت حوآء طاف بها ابلیس وکان لا یعیش لها
ولد فقال سمیه عبد الحارث فعاش وکان ذٰلك من
وحی الشیطان و امره؛

یعنی — جب حوا کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو شیطان اس کے گرد چکر لگانے لگا اور اس سے پہلے حوا کا کوئی بچہ زندہ نہیں رہتا تھا۔ شیطان نے حوا سے کہا: اس کا نام عبدالحارث رکھو (کیونکہ حارث شیطان کے ناموں میں سے ہے لہٰذا عبدالحارث کا معنی ہے شیطان کا بندہ)۔ حوا نے ایسا ہی کیا اور وہ بچہ زندہ رہ گیا اور ایسا شیطان کی وحی اور اس کے حکم سے ہوا۔[1]

اسی مضمون کی بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضرت آدمؑ بھی اس بات پر راضی ہو گئے تھے۔

اس روایت کا راوی چاہے مشہور کذاب سمرہ بن جندب ہو یا کعب الاحبار اور وہب بن منبہ جیسے افراد جو یہودیوں کے مشہور لوگوں میں سے تھے اور پھر مسلمان ہو گئے اور بعض علماء اسلام کے نظریے کے مطابق تورات اور بنی اسرائیل کی خرافات یہی دونوں مسلمانوں میں لائے، بہرحال جو بھی ہو روایت کا مضمون خود ہی اس کے بطلان کی دلیل ہے کیونکہ وہ آدم جو خلیفۃ اللہ اور خدا کے عظیم پیغمبر تھے اور علم الاسماء کے حامل تھے۔ اگرچہ وہ ترک اولیٰ کی وجہ سے جنت سے زمین پر آئے تاہم وہ ایسی شخصیت نہ تھے کہ شرک کی راہ انتخاب کرتے اور اپنے بیٹے کا نام "بندۂ شیطان" رکھتے۔ ایسا کام تو صرف کسی بت پرست، جاہل، نادان اور بے خبر ہی کے شایانِ شان ہو سکتا ہے۔

اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ مذکورہ روایت میں شیطان کا معجزہ اور کرامت بیان کی گئی ہے کہ اس بچے کا نام جب اس کے نام پر رکھا گیا تو گذشتہ تمام بچوں کے برخلاف زندہ رہا۔

بہت افسوس کی بات ہے کہ بعض گذشتہ مفسرین ایسی روایات سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں تفسیر کے طور پر بیان کر دیا۔

بہرکیف یہ روایت چونکہ قرآن کے بھی خلاف ہے اور عقل کے بھی لہٰذا اسے کسی ردی کی ٹوکری میں پھینک دینا چاہیے۔

اس واقعہ کے بعد قرآن بت پرستی کی دوبارہ سخت الفاظ میں مذمت کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا یہ لوگ کچھ ایسے موجودات کو خدا کا شریک قرار دیتے ہیں جو کوئی چیز پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے بلکہ وہ خود اس کی مخلوق ہیں (ایشرکون ما لا یخلق شیئا وهم یخلقون)۔ علاوہ ازیں یہ جعلی معبود اپنے پجاریوں کی کسی بھی مشکل میں مدد نہیں کر سکتے یہاں تک کہ وہ مشکلات میں خود اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے (ولا یستطیعون لهم نصرا و لآ انفسهم ینصرون)۔

یہ معبود ایسے ہیں کہ "اگر تم انہیں ہدایت کرنا چاہو تو وہ تمہاری پیروی نہیں کریں گے یہاں تک کہ اس کا شعور بھی نہیں رکھتے (وان تدعوهم الی الهدٰی لا یتبعوکم) — جو ہادیوں کی پکار اور ندا کو بھی نہیں سنتے وہ دوسروں کی ہدایت کیسے کر سکتے ہیں۔

---

[1] المنار جلد ۹ صفحہ ۵۲۴ بحوالہ مسند احمد۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر کے لیے ایک اور احتمال ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ "ھم" کی ضمیر بت پرستوں اور مشرکوں کے لیے ہے یعنی ان میں سے ایک گروہ اس قدر ہٹ دھرم اور متعصب ہے کہ انہیں جتنی بھی توحید کی دعوت دی جائے وہ اسے تسلیم اور قبول نہیں کرتے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مراد یہ ہو کہ اگر تم ان سے ہدایت کا تقاضا کرو تو اس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ بہر حال تمہارے لیے برابر ہے کہ انہیں دعوت حق دو یا خاموش رہو، دونوں صورتوں میں ہٹ دھرم بت پرست اپنے رویے سے دست بردار نہیں ہوں گے (سواء علیکم ا۔۔۔ وتموھم ام انتم صامتون)۔

دوسرے احتمال کے مطابق اس جملے کا معنی یہ ہے کہ تمہارے لیے برابر ہے، چاہے بتوں سے کسی چیز کا تقاضا کرو یا چپ رہو دونوں صورتوں میں نتیجہ منفی ہے کیونکہ بت کسی کی تقدیر میں کوئی اثر نہیں رکھتے اور کسی کی کوئی خواہش پوری نہیں کر سکتے۔

فخر الدین رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> مشرکین جب کسی مشکل میں پھنس جاتے تھے تو بتوں کے سامنے فریاد کرتے اور جب انہیں کوئی مشکل درپیش نہ ہوتی تو خاموش رہتے۔ قرآن ان سے کہتا ہے: چاہے ان کے سامنے تضرع وزاری کرو یا چپ رہو، دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

۱۹۴۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمۡثَالُكُمۡ فَادۡعُوۡهُمۡ فَلۡيَسۡتَجِيۡبُوۡا لَـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ○

۱۹۵۔ اَلَهُمۡ اَرۡجُلٌ يَّمۡشُوۡنَ بِهَاۤ اَمۡ لَهُمۡ اَيۡدٍ يَّبۡطِشُوۡنَ بِهَاۤ اَمۡ لَهُمۡ اَعۡيُنٌ يُّبۡصِرُوۡنَ بِهَاۤ اَمۡ لَهُمۡ اٰذَانٌ يَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا ؕ قُلِ ادۡعُوۡا شُرَكَآءَكُمۡ ثُمَّ كِيۡدُوۡنِ فَلَا تُنۡظِرُوۡنِ ○

ترجمہ

۱۹۴۔ جنہیں وہ خدا کے علاوہ پکارتے ہیں (اور جن کی پرستش کرتے ہیں) تمہاری طرح کے بندے ہیں۔ اگر سچے ہو تو انہیں پکارو تو انہیں چاہیے کہ وہ تمہیں جواب دیں (اور تمہارے تقاضوں کو پورا کریں)۔

۱۹۵۔ کیا وہ (کم از کم خود تمہاری طرح) پاؤں رکھتے ہیں کہ جن کے ساتھ چلیں پھریں یا ہاتھ رکھتے ہیں کہ جن

سے کوئی چیز اٹھا سکیں (اور کوئی کام انجام دے سکیں) یا کیا وہ آنکھیں رکھتے ہیں کہ ان سے دیکھ سکیں یا ان کے کان ہیں کہ ان سے سن سکیں (نہیں ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں) کہہ دو: (اب جبکہ ایسا ہے تو) ان بتوں کو جنہیں تم نے خدا کا شریک بنا رکھا ہے، (میرے برخلاف) انہیں پکارو اور میرے خلاف سازش اور مکر و فریب کرو اور لحظہ بھر کی مہلت نہ دو (تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ ان سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا)۔

تفسیر

ان دونوں آیات میں توحید کی بحث اور شرک سے مقابلہ جاری ہے اور اس سلسلے کی گزشتہ بحث کی ان میں تکمیل ہوئی ہے۔ ان میں عبادت میں شرک اور غیر خدا کی پرستش کو احمقانہ اور عقل و منطق سے عاری کام قرار دیا گیا ہے۔ ان دو آیات کے مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ چار دلیلوں سے بت پرستوں کی منطق باطل ہو جاتی ہے۔

قرآن مختلف طرح کے استدلال سے اس مسئلہ پر بحث کرتا ہے اور ہر وقت اس پر ایک نئی برہان پیش کرتا ہے، اس کا راز یہ ہے کہ شرک ایمان کا اور انفرادی و اجتماعی سعادت کا بدترین دشمن ہے اور چونکہ افکار بشر کی مختلف جڑیں ہیں اور شاخیں ہیں اور ہر دور میں شرک ایک نئی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور انسانی معاشروں کو خطرے سے دوچار کر دیتا ہے لہٰذا قرآن اس کی خبیث جڑوں اور شاخوں کو کاٹنے کے لیے ہر موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

یہاں ارشاد فرمایا گیا ہے: جنہیں تم خدا کے علاوہ پکارتے ہو اور جن کی عبادت کرتے ہو اور جن سے مدد طلب کرتے ہو وہ تمہاری طرح کے بندے ہیں (ان الذین تدعون من دون الله عباد امثالکم)۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ انسان ایسی چیز کے سامنے سجدہ ریز ہو جو خود اس جیسی ہے اور اپنی تقدیر اور سرنوشت اس کے ہاتھ میں سمجھے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر غور و فکر کرو تو دیکھو گے کہ وہ جسم بھی رکھتے ہیں، زمان و مکان کی زنجیر میں بھی اسیر ہیں قوانین طبیعت کے بھی محکوم ہیں اور زندگی اور دیگر توانائیوں کے لحاظ سے بھی محدود ہیں خلاصہ یہ ہے وہ تم سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے، تم نے صرف وہم و خیال سے ان کے لیے امتیاز گھڑ رکھا ہے۔

آیت میں بت پرستوں کے معبودوں کو "عباد" کہا گیا ہے جو "عبد" کی جمع ہے اور جس کا معنی ہے "بندہ" جبکہ عبد زندہ موجود کو کہا جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ —— اس کی کئی ایک تفاسیر کی گئی ہیں۔

پہلی یہ کہ ممکن ہے یہاں ان معبودوں کی طرف اشارہ ہو جو انسانوں میں سے ہیں جیسے عیسائیوں کے لیے حضرت عیسیٰؑ، عرب بت پرستوں کے لیے فرشتے وغیرہ۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اس توہم کی وجہ جو وہ بتوں کے متعلق رکھتے تھے، یہ کہا گیا ہو کہ فرض کریں کہ وہ عقل و شعور بھی رکھتے ہیں (پھر بھی وہ تم سے برتر موجود تو نہیں ہیں۔

تیسری یہ کہ "عبد" لغت میں بعض اوقات ایسے موجود کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو دوسرے کے زیر تسلط اور زیر فرمان ہو اور اس کے سامنے خاضع ہو چاہے وہ عقل و شعور نہ بھی رکھتا ہو۔ جیسے ایسی سڑک کو "معبد" (بروزن مقدم) کہتے ہیں جس پر ہمیشہ آمد و رفت رہتی ہے۔[1]

مزید فرمایا گیا ہے: اگر تم سوچتے ہو کہ وہ قدرت و شعور رکھتے ہیں تو انہیں پکار کر دیکھو کیا وہ تمہیں جواب دیتے ہیں، اگر تم سچ کہتے ہو (فادعوهم فليستجيبوا لكم ان كنتم صٰدقين)۔

ان کی منطق کو باطل کرنے کے لیے یہ دوسری دلیل بیان کی گئی ہے کہ ان کا موت کا سا سکوت و خاموشی ان کے بے شعور ہونے اور کسی چیز پر ان کی قدرت نہ ہونے کی نشانی ہے۔

پھر مزید واضح کیا گیا ہے کہ حتیٰ کہ وہ اپنے عبادت گزاروں سے زیادہ پست اور عاجز ہیں "اچھی طرح دیکھو کیا وہ کم از کم تمہاری طرح پاؤں رکھتے ہیں کہ جن سے چل پھر سکیں" (الهم ارجل يمشون بها) "یا کیا وہ ہاتھ رکھتے ہیں کہ جن سے کوئی چیز پکڑ سکیں اور کوئی کام کر سکیں" (ام لهم ايد يبطشون بها)[2] "یا کیا وہ آنکھیں رکھتے ہیں کہ جن سے دیکھ سکیں" (ام لهم اعين يبصرون بها) "یا کیا پھر وہ کان رکھتے ہیں کہ جن سے سن سکیں" (ام لهم اٰذان يسمعون بها)۔ وہ تو اس قدر ضعیف ہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لیے تمہاری مدد کے محتاج ہیں اور خود اپنے وجود کی حفاظت کے لیے کمک کے محتاج ہیں۔ نہ وہ دیکھنے والی آنکھ رکھتے ہیں نہ سننے والے کان اور نہ کوئی اور قوت حس ان کے پاس ہے۔

آیت کے آخر میں چوتھا استدلال یوں پیش کیا گیا ہے: اے پیغمبر! ان سے کہو کہ یہ معبود جنہیں تم نے خدا کا شریک قرار دے رکھا ہے انہیں میرے برخلاف بلاؤ اور تم سب ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر جتنی کر سکو میرے خلاف سازش کرو اور اس کام میں کسی قسم کی تاخیر روا نہ رکھو پھر دیکھتے ہیں کہ اس کے باوجود تم کیا کر سکتے ہو (قل ادعوا شركاءكم ثم كيدون فلا تنظرون)۔ یعنی اگر میں جھوٹ بولتا ہوں اور وہ مقربانِ خدا ہیں اور میں نے ان کے حریم احترام میں جسارت کی ہے تو پھر وہ مجھ پر غضب کیوں نہیں کرتے اور تم اور وہ مل کر مجھ پر کیوں کوئی اثر نہیں کر پاتے۔ لہٰذا جان لو کہ یہ غیر مؤثر موجودات ہیں کہ جنہیں تمہارے توہمات نے قوت بخشی ہے۔

۱۹۶۔ اِنَّ وَلِيِّۦَ اللّٰهُ الَّذِيْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ ○

۱۹۷۔ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَآ

۱۔ اُردو میں بھی بعض اوقات ایسے الفاظ اور جملے استعمال ہوتے ہیں مثلاً اُردو زبان تو اس گھر کی لونڈی ہے حالانکہ عام طور پر لونڈی زندہ موجود کو کہتے ہیں۔ (مترجم)

۲۔ "یبطشون" کا مادہ "بطش" (بروزن "عرش") ہے۔ اس کا معنی ہے کسی چیز کو پوری طاقت اور سختی سے پکڑنا۔

اَنۡفُسَہُمۡ یَنۡصُرُوۡنَ ○

۱۹۸ وَ اِنۡ تَدۡعُوۡہُمۡ اِلَی الۡہُدٰی لَا یَسۡمَعُوۡا ؕ وَ تَرٰىہُمۡ یَنۡظُرُوۡنَ
اِلَیۡکَ وَ ہُمۡ لَا یُبۡصِرُوۡنَ ○

ترجمہ

۱۹۶۔ (لیکن) میرا ولی اور سرپرست وہ خدا ہے جس نے یہ کتاب نازل کی ہے اور وہ سب نیکوں اور صالحین کا سرپرست ہے۔

۱۹۷۔ اور جنہیں تم اس کے علاوہ پکارتے ہو وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے اور (حتّٰی کہ) اپنی مدد بھی نہیں کر سکتے۔

۱۹۸۔ اور اگر ان سے ہدایت چاہو تو وہ تمہاری باتوں کو نہیں سنتے اور تم انہیں دیکھو گے کہ (وہ اپنی مصنوعی آنکھوں سے) تمہیں دیکھ رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ نہیں دیکھ سکتے۔

تفسیر

بے وقعت معبود،

گذشتہ آیت میں تھا کہ تم اور تمہارے بت مجھے کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ زیرِ بحث پہلی آیت میں اس کی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ارشاد ہوا ہے، میرا ولی، سرپرست اور بھروسہ خدا ہے جس نے مجھ پر یہ آسمانی کتاب نازل کی ہے (ان ولیی اللّٰہ الذی نزل الکتٰب)۔ نہ صرف میری بلکہ وہ تمام صالح اور شائستہ لوگوں کی حمایت اور سرپرستی کرتا ہے اور اپنا لطف وعنایت ان کے شاملِ حال کرتا ہے (وھو یتولی الصالحین)۔

اس کے بعد پھر تاکیداً بت پرستی کے بطلان پر دلائل دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے، خدا کے علاوہ تم جن معبودوں کو پکارتے ہو ان سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا، وہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں (والذین تدعون من دونہ لا یستطیعون نصرکم ولآ انفسھم ینصرون)۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ "اگر مشکلات میں ان سے ہدایت اور راہنمائی چاہو تو یہاں تک کہ وہ تمہاری بات بھی نہیں سن سکتے (وان تدعوھم الی الھدٰی لا یسمعوا)۔

حتّٰی کہ اپنی مصنوعی آنکھوں سے، جن سے گویا تیری طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں درحقیقت کچھ نہیں دیکھ پاتے (وتراھم ینظرون الیک وھم لا یبصرون)۔

ہم پہلے بھی اشارہ کر آئے ہیں کہ آخری آیت ممکن ہے بتوں کی طرف اشارہ ہو یا بت پرستوں کی طرف۔ پہلی صورت میں اس کا مفہوم وہی ہے جو بیان کیا جا چکا ہے اور دوسری صورت میں اس کی تفسیر یہ ہوگی کہ اگر تم مسلمان ان ہٹ دھرم مشرکوں اور بت پرستوں کو صحیح توحیدی راستے کی طرف دعوت دو تو وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہیں کریں گے۔ وہ اپنی آنکھوں سے تمہاری طرف دیکھتے تو ہیں اور صدق وحقیقت کی نشانیاں بھی انہیں تم میں نظر آتی ہیں لیکن پھر بھی وہ حقائق کو نہیں دیکھ پاتے۔

آخری دو آیات کا مضمون گذشتہ آیات میں بھی آیا ہے اور یہ تکرار زیادہ سے زیادہ تاکید کے لیے ہے تا کہ بت پرستی کا مقابلہ کیا جائے اور مشرکین کی فکر اور روح سے اس کی ریشہ کشی کی جائے۔

۱۹۹۔ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ○

۲۰۰۔ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

۲۰۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ○ۚ

۲۰۲۔ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِى الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ○

۲۰۳۔ وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ مِنْ رَّبِّىْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ

۱۹۹۔ ان سے نرمی برتو اور ان کا عذر قبول کر لو اور نیکیوں کی طرف دعوت دو اور جاہلوں سے رُخ موڑ لو (اور ان سے لڑائی جھگڑا نہ کرو)۔

۲۰۰۔ اور جب شیطانی وسوسہ تجھ تک پہنچے تو خدا کی پناہ لو کیونکہ وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۲۰۱۔ پرہیز گار جب شیطانی وسوسوں میں گرفتار ہوں تو (خدا اور اس کی جزاو سزا کی) یاد اور ذکر میں مصروف ہو جاتے ہیں (اور اس کی یاد ہی کے زیر سایہ وہ راہ حق دیکھتے ہیں) پس وہ بینا ہو جاتے ہیں۔

۲۰۲۔ (جو پرہیز گار نہیں) اُن کے بھائی (یعنی شیاطین) انہیں ہمیشہ گمراہی میں آگے بڑھاتے رہتے ہیں اور پھر اس میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے۔

۲۰۳۔ اور جب (نزولِ وحی میں تاخیر ہو جائے اور) تو ان کے لیے کوئی آیت نہ لائے تو کہتے ہیں تو خود سے (اپنی طرف سے) اسے کیوں نہیں چن لیتا۔ کہہ دو کہ میں تو صرف اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی ہوتی ہے یہ تیرے پروردگار کی طرف سے ایمان لانے والوں کے لیے بینائی کا وسیلہ اور ہدایت و رحمت کا ذریعہ اور سبب ہے۔

تفسیر

شیطانی وسوسے

ان آیات میں تبلیغ اور لوگوں کی رہبری و پیشوائی کی شرائط جاذب نظر طریقے سے اور بہت اچھے انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ ان آیات کا مفہوم گزشتہ آیات سے بھی مناسبت رکھتا ہے جو کہ مشرکین کے لیے تبلیغ کے طور پر ہی تھیں۔

پہلی آیت میں رسولِ خدا سے خطاب کی صورت میں رہبروں اور مبلغوں کے فرائض کے تین حصوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے، لوگوں سے سخت گیری نہ کرو اور ان سے نرمی برتو، ان کے عذر قبول کرو اور وہ جتنی قدرت رکھتے ہیں ان سے اس سے زیادہ خواہش نہ کرو (خذ العفو)۔

"عفو" بعض اوقات کسی چیز کی اضافی مقدار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، کبھی "حد وسط" کے مفہوم کے لیے آتا ہے، کبھی خطاکاروں کے عذر قبول کرنے اور انہیں بخش دینے کا معنی دیتا ہے اور کبھی کاموں کو آسان سمجھنے کا مفہوم لیے ہوتا ہے۔

آیات کے قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ زیر نظر آیت بعض مفسرین کے قول کے برخلاف مالی مسائل اور لوگوں کے مال سے اضافی مقدار لینے سے کوئی ربط نہیں رکھتی بلکہ یہاں اس کے لیے مناسب مفہوم آسان سمجھنا، درگزر کرنا اور حد وسط انتخاب کرنا ہی ہے[1]

واضح ہے کہ رہبر اور مبلغ اگر سخت گیر شخص ہو تو بہت جلد لوگ اس کے گرد و گرد سے منتشر ہو جائیں گے اور لوگوں کے دلوں میں اس کا نفوذ ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ قرآن مجید کہتا ہے:

ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک

اگر تم سخت گیر، بد اخلاق اور سنگدل ہوتے تو مسلّم ہے کہ لوگ تمہارے اردگرد سے پراگندہ ہو جاتے۔ (آل عمران۔ ۱۵۹)

---

[1] لفظ "عفو" کی مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول ص ۵۱۴ تا ۵۱۲ اردو ترجمہ کی طرف رجوع کریں۔

اس کے بعد دوسرا حکم دیا گیا ہے، لوگوں کو نیک کاموں کا اور وہ کہ جنہیں عقل و خرد شائستہ قرار دے اور خدا ان کی نیکی اور اچھائی کے طور پر تعارف کروائے، حکم دو (وأمر بالعرف)۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ سخت گیری نہ کرنے کا مطلب "سب اچھا" اور خوشامد نہیں بلکہ رہبر اور مبلغ کو چاہیے کہ وہ حقائق پیش کرے اور لوگوں کو حق کی طرف دعوت دے اور کوئی چیز فروگذاشت نہ کرے۔

تیسرے مرحلے میں جاہلوں کے مقابلے میں تحمل اور بردباری کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جاہلوں سے رخ موڑ لو اور ان سے زاد جھگڑو نہیں (واعرض عن الجاهلين)۔

جب کسی رہبر اور مبلغ کو ہٹ دھرم متعصب، جاہل، کوتاہ فکر اور پست اخلاق افراد کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو گالیاں سننا پڑتی ہیں، تہمتیں لگتی ہیں، اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں اور اس پر پتھر پھینکے جاتے ہیں ایسی صورت حال میں کامیابی کا طریقہ یہ نہیں کہ جاہلوں سے دست و گریباں ہوا جائے بلکہ بہترین راہ تحمل، حوصلہ اور چشم پوشی ہے اور تجربہ شاہد ہے کہ جاہلوں کی بیداری اور ان کے غضب، حسد اور تعصب کی آگ خاموش کرنے کے لیے یہ بہترین طریقہ ہے۔

بعد والی آیت میں ایک اور حکم دیا گیا ہے جس میں درحقیقت رہبروں اور مبلغوں کے لیے ان کی چوتھی ذمہ داری بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ مقام و منزلت، مال و دولت اور خواہشات و شہوت وغیرہ کی صورت میں شیطان[1] ہمیشہ ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیطان اور شیطان صفت لوگ ان وسوسوں کے ذریعے انہیں ان کے راستے سے منحرف کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ قرآن حکم دیتا ہے: اگر شیطانی وسوسے تیرا رخ کریں تو اپنے آپ کو خدا کی پناہ میں دے دے، خود کو اس کے سپرد کر دے اور اسی کے لطف سے مدد طلب کر کیونکہ وہ تیری بات سنتا ہے، تیرے اسرار نہاں سے آگاہ ہے اور شیطانوں کے وسوسوں سے باخبر ہے (واما ینزغنك من الشيطان نزغ فاستعذ بالله انه سميع عليم)۔

جامع ترین اخلاقی آیت

امام صادقؑ سے منقول ہے:

قرآن مجید میں کوئی آیت اخلاقی مسائل میں اس آیت سے زیادہ جامع نہیں ہے[2]

بعض علماء نے اس حدیث کی تفسیر میں کہا ہے کہ قوائے انسانی کے اصول تین ہیں عقل، غضب اور شہوت اور اخلاقی فضائل بھی تین حصوں میں ہیں:

۱۔ فضائل عقلی ــــ جن کا نام "حکمت" ہے اور آیت میں "وأمر بالعرف" میں ان کا خلاصہ کیا گیا ہے (یعنی نیک اور شائستہ کاموں کا حکم دے)۔

۲۔ فضائل نفسی ــــ جو کہ طغیان اور شہوت کے مقابلے میں ہیں۔ انہیں "عفت" کہتے ہیں اور زیر بحث آیت میں

---

[1] "ینزغنك" کا مادہ "نزغ" (بروزن "نزع") ہے۔ اس کا معنی ہے کسی کام میں خرابی پیدا کرنا یا اس کی تحریک دینا۔

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

"خذ العفو" میں ان کی تلخیص کی گئی ہے۔

۳۔ قوتِ غضبیہ کے مقابلے میں نفس پر کنٹرول کو "شجاعت" کہتے ہیں۔ اس کی طرف اشارہ "اعرض عن الجاهلين" میں کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا حدیث کی تشریح چاہے اس صورت میں کی جائے جیسے مفسرین نے کی ہے یا رہبر کی شرائط کی صورت میں جیسے ہم نے بیان کیا ہے، بہر حال اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ زیر نظر آیت میں مختصر اور جچے تلے انداز میں اخلاقی اور اجتماعی حوالے سے ایک جامع، وسیع اور ہمہ گیر پروگرام پیش کیا گیا ہے، اس طرح سے کہ اس میں تمام مثبت اصلاحی امور اور انسانی فضائل مل سکتے ہیں بعض مفسرین کے بقول اس آیت میں جچے تلے انداز میں جس طرح سے معانی کی وسعت و گہرائی سمو دی گئی ہے وہ اعجازِ قرآن کی مظہر ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ آیت میں مخاطب اگرچہ پیغمبر اکرمؐ ہیں لیکن آیت ساری امت اور تمام رہبروں اور مبلغوں کے بارے میں ہے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں مقامِ عصمت کے خلاف کوئی مطلب موجود نہیں ہے کیونکہ پیغمبر اور معصوم ہستیوں کو بھی وساوسِ شیطانی کے مقابلے میں اپنے آپ کو سپردِ خدا کرنا چاہیے اور وساوسِ شیاطین کے مقابلے میں کوئی بھی خدا کے لطف اور حمایت سے بے نیاز نہیں، یہاں تک کہ معصومین بھی۔

بعض روایات میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ نے اس کے بارے میں جبرئیل سے وضاحت چاہی (کہ لوگوں سے کس طرح سے نرمی برتی جائے اور سخت گیری نہ کی جائے)۔

جبرئیل نے کہا: میں تو نہیں جانتا، لازم ہے کہ میں اس سے سوال کروں جو جانتا ہے۔

اس کے بعد جبرئیل دوبارہ نازل ہوئے اور کہا:

يا محمد ان الله يأمرك ان تعفوا عمن ظلمك و تعطى من حرمك وتصل من قطعك

یا محمدؐ! خدا آپ کو حکم دیتا ہے کہ جنہوں نے آپ پر ظلم کیا ہے (جب آپ میں قدرت آجائے) تو ان سے انتقام نہ لیں اور درگزر کر دیں، جنہوں نے آپ کو محروم کیا ہے انہیں عطا کریں اور جنہوں نے آپ سے قطع رحمی کی ہے ان سے صلہ رحمی کریں [1]

ایک اور حدیث میں ہے:

جب یہ آیت نازل ہوئی اور پیغمبرِ خدا کو حکم دیا گیا کہ جاہلوں کے مقابلے میں تحمل کیجئے، تو پیغمبرؐ نے عرض کیا: پروردگار! خشم و غضب کے ہوتے ہوئے کیسے تحمل کیا جا سکتا ہے؟

اس پر دوسری آیت نازل ہوئی اور پیغمبرؐ کو حکم دیا گیا کہ ایسے موقع پر اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیں [2]

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

حاشیہ ۲ صفحہ آئندہ پر

اس نکتے کا ذکر بھی مناسب ہے کہ دوسری آیت بعینہ سورہ حٰم السجدہ کی آیت ۳۶ ہے فرق صرف اتنا ہے کہ "انہ سمیع علیم" کی جگہ وہاں پر "انہ ھو السمیع العلیم" ہے۔

بعد والی آیت میں شیطانی وسوسوں پر غلبے کا طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: شیطانی وسوسے جب پرہیزگار لوگوں کو گھیر لیتے ہیں تو وہ خدا کو یاد کرتے ہیں، اس کی لامتناہی نعمات کا ذکر کرتے ہیں اور گناہوں کے برے نتائج اور دردناک عذاب کو یاد کرتے ہیں تو اس وقت وسوسوں کے تاریک بادل اطرافِ قلب سے چھٹ جاتے ہیں اور وہ راہ حق کو دیکھتے ہیں اور اسے ہی انتخاب کر لیتے ہیں (ان الذین اتقوا اذا مسھم طآئف من الشیطٰن تذکروا فاذا ھم مبصرون)۔

"طائف" کا معنی ہے "طواف کرنے والا" گویا شیطانی وسوسے طواف کرنے والے کی طرح انسانی روح اور فکر کے مسلسل چکر لگاتے رہتے ہیں تاکہ نفوذ کرنے اور اندر جانے کا کوئی راستہ پالیں۔ ایسے موقع پر اگر انسان خدا کو یاد کرے اور گناہوں کے برے نتائج پر نظر کرے تو انہیں دور کر کے رہائی حاصل کر لیتا ہے ورنہ آخرکار ان وسوسوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

اصولی طور پر ہر شخص ایمان کے ہر مرحلے میں اور ہر عمر میں کبھی نہ کبھی شیطانی وسوسوں میں گرفتار رہتا ہے اور کبھی یوں محسوس کرتا ہے کہ خود اس کے اندر کوئی سخت محرک قوت پیدا ہو گئی ہے جو اسے گناہ کی طرف دعوت دے رہی ہے یہ مسلم ہے کہ یہ وسوسے اور تحریکیں جوانی میں زیادہ ہوتی ہیں اور اسی طرح گناہ کے ماحول میں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ جیسے آجکل کے آلودہ معاشرے اور ماحول کہ جن میں فساد اخلاق کے مراکز بہت زیادہ ہیں، ہر طرف بے قید و بند آزادی میسر ہے، نشر و اشاعت کے ادارے زیادہ تر شیطان کی خدمت میں مصروف ہیں اور شیطانی وسوسوں کی اشاعت کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں راہِ نجات کا صرف اور صرف ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے "تقویٰ" کہ جس کی طرف زیرِ بحث آیت میں اشارہ ہوا ہے، اس کے بعد مراقبت ہے اور آخر میں اپنی طرف توجہ کرنا، خدا سے پناہ مانگنا، اس کے الطاف و نعمات کو یاد کرنا اور خطاکاروں کے دردناک عذاب کو یاد کرنا ہے۔

روایات میں بارہا شیطانی وساوس کو دور کرنے کے لیے ذکر خدا کی گہری تاثیر کا تذکرہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ بہت سے صاحب ایمان علماء اور شخصیات ہمیشہ شیطانی وسوسوں سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے مراقبت کے ذریعے اپنا دفاع کرتے تھے۔ (مراقبت علم اخلاق میں ایک تفصیلی موضوع ہے)۔ اصولی طور پر نفس اور شیطان کے وسوسے بیماری کے جراثیم کی طرح ہیں جو ہر کسی میں موجود ہوتے ہیں لیکن وہ کمزور اور ناتواں گوشوں اور جسموں کی تلاش میں رہتے ہیں تاکہ وہاں نفوذ کریں لیکن جن کا جسم صحیح سالم، قوی اور طاقتور ہے وہ ان جراثیم کے اثرات سے خود کو بچا لیتے ہیں ــــ اذا ھم مبصرون (یعنی ــ یاد خدا کے وقت ان کی آنکھیں بینا ہو جاتی ہیں اور وہ حق کو دیکھ لیتے ہیں) ــــ یہ جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ شیطانی وسوسے انسان کی باطنی نگاہ پر پردہ ڈال دیتے ہیں اور حالت یہ ہو جاتی ہے کہ راہ اور چاہ کی، دوست اور دشمن کی اور نیک اور بد کی پہچان نہیں رہتی لیکن خدا کی یاد انسان کو بینائی اور روشنی بخشتی ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ: المنار کے مؤلف نے جلد ۹ صفحہ ۵۳۸ پر یہ حدیث اس عنوان کے تحت درج کی ہے:

روی عن جدنا الامام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ......

یعنی ہمارے جد امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے یوں نقل کیا گیا ہے.......

اور اسے حقائق کی شناخت کی قدرت عطا کرتی ہے۔ ایسی شناخت اور معرفت کہ جس کے ذریعے انسان وسوسوں کے چنگل سے نجات پالیتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ پرہیزگار ذکر خدا کے سائے میں شیطانی وسوسوں سے رہائی حاصل کرتے ہیں لیکن یہ اس حالت میں ہے کہ جب گناہ آلودہ افراد جو شیطان کے بھائی ہیں اس کے دام اور جال میں گرفتار ہوں۔ اگلی آیت میں قرآن اس بارے میں کہتا ہے: ان کے بھائی یعنی شیاطین مسلسل انہیں گمراہی میں آگے لے جاتے ہیں اور انہیں گمراہ کرنے سے باز نہیں آتے بلکہ بے رحمی سے ان پر اپنے حملے جاری رکھتے ہیں (و اخوانھم یمدونھم فی الغی ثم لا یقصرون)۔

"اخوان" شیاطین کے لیے کنایہ ہے اور "ھم" کی ضمیر مشرکوں اور گناہگاروں کے لیے ہے۔ جیسا کہ سورہ اسراء کی آیت ۲۷ میں ہے:

ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین

فضول خرچی کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں۔

"یمدونھم" "امداد" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے مدد دینا، دوام بخشنا اور اضافہ کرنا۔ یعنی وہ اس راہ کی طرف ہمیشہ اور مسلسل انہیں کھینچتے رہتے ہیں اور آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔

لا یقصرون — کا معنی ہے کہ شیاطین انہیں گمراہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔

اس کے بعد مشرکوں اور گنہگاروں کی ایک جماعت کی حالت بیان کرتا ہے۔ یہ لوگ منطق و استدلال سے دور ہیں فرمایا گیا ہے: جب ان کے سامنے قرآن کی آیات پڑھو تو وہ ان کی تکذیب کرتے ہیں اور جب ان کے لیے کوئی آیت نہ لاؤ اور نزول وحی میں تاخیر ہو جائے تو کہتے ہیں کہ ان آیات کا کیا بنا، اپنی طرف سے کیوں نہیں بنا لیتے ہیں، یہ سب خدا کی وحی تھوڑی ہیں (و اذا لم تاتھم بایۃ قالوا لولا اجتبیتھا)[1] لیکن ان سے کہہ دو کہ میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی ہوتی ہے اور جو کچھ خدا نازل کرتا ہے اس کے سوا کچھ نہیں کہتا (قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی)۔

یہ قرآن اور اس کی نورانی آیات پروردگار کی طرف سے بینائی اور بیداری کا ذریعہ ہیں کہ جو ہر آمادہ انسان کو بصارت، روشنی اور نور عطا کرتی ہیں (ھذا بصائر من ربکم)۔ "اور با ایمان اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والے افراد کے لیے سرمایہ ہدایت اور رحمت ہے۔"

اس آیت سے ضمنی طور پر واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی تمام گفتار اور کردار کا سرچشمہ وحی آسمانی تھی اور جو لوگ اس بات کے خلاف کچھ کہتے ہیں وہ در اصل قرآن سے ناواقف ہیں۔

---

[1] "اجتباء" "جبایت" سے ہے۔ اس کا معنی ہے حوض یا اس قسم کی چیز میں پانی جمع کرنا۔ اس لیے حوض کو "جابیۃ" کہا جاتا ہے۔ خراج کی جمع آوری کو بھی "جبایت" کہتے ہیں۔ بعد ازاں کسی چیز کو انتخاب کے لیے جمع کرنے کو "اجتباء" کہا جانے لگا۔ "لولا اجتبیتھا" کا معنی ہے تو نے کیوں انتخاب نہیں کیا۔

۲۰۴۔ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ
تُرْحَمُوْنَ ○

۲۰۵۔ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ
الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ○

۲۰۶۔ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ
وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ○ ع السجدة

ترجمہ

۲۰۴۔ جب قرآن پڑھا جائے تو کان دھر کر سنو اور خاموش رہو تاکہ رحمتِ خدا تمہارے شاملِ حال ہو۔

۲۰۵۔ اپنے پروردگار کو اپنے دل میں تضرع اور خوف سے، آہستہ اور آرام سے صبح و شام یاد کرو اور غافلین میں سے نہ ہو جاؤ۔

۲۰۶۔ وہ جو (مقامِ قرب میں) تیرے پروردگار کے نزدیک ہیں کسی حالت میں اس کی عبادت کے بارے میں تکبر نہیں کرتے۔ اس کی تسبیح کرتے ہیں اور اس کے لیے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔

تفسیر

تلاوتِ قرآن ہو رہی ہو تو خاموش رہو

اس سورۃ (اعراف) کا آغاز عظمتِ قرآن کے بیان سے ہوا ہے اور قرآن ہی کے بارے میں اس کی یہ آخری آیات گفتگو کر رہی ہیں۔

بعض مفسرین نے زیرِ بحث آیات میں سے پہلی کے بارے میں کئی ایک شانِ نزول ذکر کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ابن عباس اور دیگر لوگوں کا کہنا ہے کہ مسلمان ابتداء میں کبھی کبھی نماز میں باتیں کر لیتے تھے۔ کبھی یوں ہوتا کہ جماعت ہو رہی ہوتی اور نیا

آنے والا پوچھ لیتا کہ کتنی رکعتیں ہو چکی ہیں اور وہ جواب دیتے کہ اتنی رکعتیں ادا ہو چکی ہیں۔ اسی صورتِ حال کے پیش نظر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کام سے منع کیا گیا۔

نیز زہری سے منقول ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ قرآن کی تلاوت کر رہے ہوتے تو ایک انصاری نوجوان بلند آواز سے قرآن پڑھتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس کام سے روک دیا گیا۔

بہرصورت قرآن مندرجہ بالا آیت میں حکم دیتا ہے: جب قرآن کی تلاوت ہو رہی ہو تو توجہ سے اسے سنو اور خاموش رہو، شاید رحمتِ خدا تمہارے شاملِ حال ہو (واذا قرئ القراٰن فاستمعوا لهٗ وانصتوا لعلكم ترحمون)۔

"انصتوا" "انصات" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے کان دھر کر خاموشی سے سننا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خاموشی اور سننے کا یہ حکم تمام مواقع کے لیے ہے کہ جب قرآن کی تلاوت ہو رہی ہو یا صرف حالتِ نماز کے لیے ہے جبکہ امام جماعت قرأت کر رہا ہو۔ اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے۔ اس ضمن میں حدیث و تفسیر کی کتابوں میں مختلف احادیث نقل کی گئی ہیں۔

ظاہر آیت سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ یہ حکم عمومی ہے اور سب کے لیے ہے اور کسی معین حالت سے مخصوص نہیں ہے لیکن متعدد روایات جو ہادیانِ اسلام سے نقل ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے اور علماء نے بھی جس امر پر اجماع و اتفاق کیا ہے یہ ہے کہ تمام اوقات میں استماع اور تلاوت کا سننا واجب نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستحب حکم ہے۔ یعنی بہتر اور مستحب یہ ہے کہ جہاں کہیں اور جس حالت میں کوئی تلاوتِ قرآن کر رہا ہو دوسرے سننے والے احترام قرآن میں سکوت اور خاموشی اختیار کریں اور کان لگا کر خدا کا پیغام سنیں اور اپنی زندگی میں اس سے سبق حاصل کریں کیونکہ قرآن صرف پڑھنے کی کتاب نہیں بلکہ سمجھنے اور اس کے بعد عمل کرنے کی کتاب ہے۔ اس مستحب حکم کی اس قدر تاکید کی گئی ہے کہ بعض روایات میں اسے واجب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

یجب الانصات للقراٰن فی الصلٰوۃ وفی غیرها واذا قرء عندك القراٰن وجب علیك الانصات والاستماع

تجھ پر واجب ہے کہ نماز اور نماز کے علاوہ بھی تلاوتِ قرآن ہو رہی ہو تو خاموشی اختیار کرے اور اسے سنے اور جب تیرے سامنے قرآن پڑھا جائے تو ضروری ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے اور کان دھر کے اسے سنا جائے۔[1]

یہاں تک کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر امام جماعت قرأت میں مشغول ہو اور کوئی دوسرا آدمی کسی آیت کی تلاوت کرنے لگے تو مستحب ہے کہ امام خاموش ہو جائے یہاں تک کہ وہ آیت ختم کرے پھر امام قرأت کی تکمیل کرے جیسا کہ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

حضرت علی علیہ السلام نمازِ صبح میں مشغول تھے اور (ایک تاریک دل منافق) ابن کوا آپؑ کے پیچھے نماز پڑھ

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۵۸۔

رہا تھا اچانک اس نے نماز میں اس آیت کی تلاوت کی:

ولقد اوحی الیک والی الذین من قبلک لئن اشرکت لیحبطن عملک ولتکونن من الخاسرین

(اس آیت کی تلاوت سے اس کا مقصد یہ تھا کہ بطور کنایہ حضرت علیؑ پر احتمالی طور پر میدان صفین میں حکمیت قبول کرنے پر اعتراض کرے)

لیکن امامؑ نے اس حالت میں بھی احترام قرآن میں سکوت اختیار کیا یہاں تک کہ اس نے آیت ختم کی اس کے بعد امامؑ اپنی نماز کی قرأت کی طرف لوٹے۔ ابن کوا نے دوبارہ وہی کام کیا امامؑ نے پھر سکوت اختیار کیا۔ ابن کوا نے تیسری مرتبہ آیت کا تکرار کیا اور حضرت علیؑ نے پھر سے احترام قرآن میں سکوت فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے اس آیت کی تلاوت کی:

فاصبر ان وعد اللہ حق و لا یستخفنک الذین لا یوقنون

(یہ اس طرف اشارہ تھا کہ خدا کا دردناک عذاب منافقین اور بے ایمان لوگوں کے انتظار میں ہے اور ان کے مقابلے میں تحمل اور حوصلہ مندی کا ثبوت دو)۔

آخر کار امامؑ نے سورت کو تمام کیا اور رکوع میں گئے[1]

اس ساری بحث سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی آیات کو سنتے وقت استماع اور سکوت بہت ہی مناسب اور اچھا کام ہے لیکن ایسا کلی طور پر واجب نہیں اور شاید اجماع اور روایات کے علاوہ "لعلکم ترحمون" (شاید رحمتِ خدا تمہارے شامل حال ہو) ـــ بھی اس حکم کے مستحب ہونے کی طرف اشارہ ہو۔

صرف ایک ہی مقام پر یہ حکم الٰہی واجب ہے اور وہ نمازِ جماعت کا موقع ہے کہ جہاں ماموم کو امام کی قرأت سنتے وقت سکوت کرنا چاہیے اور کان دھر کے قرأت سننا چاہیے یہاں تک کہ بعض فقہاء نے اس آیت کو ماموم سے حمد اور سورۃ کی قرأت کے سقوط کی دلیل سمجھا ہے۔

منجملہ ان روایات کے جو اس حکم پر دلالت کرتی ہیں ایک حدیث ہے جو امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے جس میں آپؑ نے فرمایا ہے۔

و اذا قرء القرآن فی الفریضۃ خلف الامام فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون

اور جب قرآن نمازِ واجب میں پڑھا جا رہا ہو اور تم پیش نماز کے پیچھے ہو تو کان دھر کر سنو اور خاموش رہو۔ شاید رحمتِ خدا تمہارے شامل حال ہو[2]

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۔

[2] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ

رہا سوال لفظ "لعل" (شاید) کے بارے میں جو ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے تو پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ رحمتِ خدا تمہارے شاملِ حال ہونے کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ بس تم سکوت اختیار کرو اور اسے کان دھر کے سنو بلکہ اس کی اور بھی شرائط ہیں کہ جن میں سے ایک اس پر عمل کرنا ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی برمحل ہے کہ مشہور فقیہ فاضل مقداد نے کتاب کنز العرفان میں اس آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے اور وہ یہ کہ اس سے مراد آیاتِ قرآن کا سننا، ان کے مفاہیم کو سمجھنا اور اس کے معجزہ ہونے کا کھوج لگانا ہے۔

یہ تفسیر شاید اس بناء پر کی گئی ہو کہ اس سے پہلے کی آیت میں مشرکین کے متعلق گفتگو تھی کہ وہ نزولِ قرآن کے بارے میں بہانہ جوئی کرتے تھے، لہٰذا قرآن ان سے کہتا ہے، خاموش رہو اور کان لگا کر سنو تاکہ حقیقت کو پا سکو[1]

اس میں کوئی مانع نہیں کہ مندرجہ بالا آیت کا مفہوم اس قدر وسیع سمجھا جائے کہ اس میں مسلمان اور کافر سب سے خطاب ہو۔ غیر مسلمان سنیں تو سکوت اختیار کریں اور اس میں غور و فکر کریں تاکہ ایمان لے آئیں اور خدا کی رحمت ان کے شاملِ حال ہو اور مسلمان بھی کان دھریں، اس کے مفاہیم کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں تاکہ رحمتِ الٰہی انہیں اپنے جلو میں لے لے ــــ کیونکہ قرآن سب کے لیے ایمان، علم اور عمل کی کتاب ہے اور یہ کسی ایک گروہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔

اگلی آیت میں مندرجہ بالا حکم کی تکمیل کے لیے پیغمبر کو حکم دیا گیا ہے (البتہ یہ ایک عمومی حکم ہے اگرچہ روئے سخن پیغمبر کی طرف ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں دیگر مقامات پر بھی ایسا ہوا ہے)، اپنے پروردگار کو اپنے دل میں تضرع و زاری اور خوف کے ساتھ یاد کرو (واذکر ربك فی نفسك تضرعًا[2] وخیفة)۔

مزید ارشاد ہوتا ہے: اور آہستہ، آرام اور سکون کے ساتھ اس کا نام زبان پر لاؤ (ودون الجهر من القول)۔ اور ہمیشہ صبح و شام یہ کام جاری رکھو (بالغدو والآصال)۔

"آصال" "اصیل" کی جمع ہے جو غروب اور شام کے قریب کا معنی دیتا ہے۔

اور یادِ خدا سے غافل اور بے خبر لوگوں میں سے ہرگز نہ ہو جا (ولا تکن من الغافلین)۔

ہر حالت میں، ہر روز صبح و شام خدا کی یاد دلوں کی بیداری کا سبب ہے اور غفلت کے تاریک بادلوں کو انسان سے دور رکھنے کا ذریعہ ہے۔ یادِ خدا بارانِ بہار کی طرح ہے کہ اس کی پھوار جب دل پر پڑتی ہے تو بیداری، توجہ، احساسِ ذمہ داری، روشن بینی اور ہر قسم کے مثبت اور اصلاحی عمل کے پھول اگاتی ہے۔

اس کے بعد سورہ کو اس گفتگو پر ختم کیا گیا ہے کہ ــــ نہ صرف تمہیں ہی ہر حالت میں یادِ خدا میں رہنا چاہیے بلکہ مقرب بارگاہِ پروردگار فرشتے اور وہ جو مقامِ قرب میں تیرے پروردگار کے قریب ہیں کسی وقت بھی اس کی عبادت کرنے پر تکبر نہیں کرتے اور مسلسل اس کی تسبیح کرتے رہتے

---

[1] کنز العرفان جلد اول ص۱۹۵۔

[2] "تضرع" "ضرع" کے مادہ سے "پستان" کے معنی میں ہے اس شخص کے کام کو بھی "تضرع" کہتے ہیں جو انگلیوں کی پوروں سے دودھ دوہے۔ بعد ازاں یہ لفظ اظہارِ خضوع اور تواضع کے لیے استعمال ہونے لگا۔

ہیں اور اس کی پاک ذات کو ہر اس چیز سے منزہ سمجھتے ہیں جو اس کے مقام و منزلت کے لائق نہیں اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز رہتے ہیں (ان الذین عند ربك لا یستکبرون عن عبادته و یسبحونه و له یسجدون)۔

"عند ربك" یعنی وہ جو تیرے پروردگار کے پاس ہیں۔ یہ قرب مکانی کے معنی میں نہیں ہے کیونکہ خدا کا کوئی مکان نہیں ہے بلکہ قرب مقام کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ اس حیثیت و مقام کے باوجود خدا کی بندگی، سجدہ اور تسبیح میں کوتاہی نہیں کرتے لہٰذا تم بھی کوتاہی نہ کرو۔

اس آیت کی تلاوت کے وقت سجدہ کرنا مستحب ہے لیکن بعض اہل سنت مثلاً ابو حنیفہ کے پیروکار اسے واجب شمار کرتے ہیں۔

بارالٰہا! ہمارے دل کو اپنی یاد کے نور سے روشن کردے۔ وہی روشنی جس کے سائے میں ہم اپنا راستہ حقیقت کی طرف کھول سکیں۔ اور اس نور سے پرچم حق لہرائے، غافلوں سے برسرپیکار رہنے اور ذمہ داریوں کو سمجھنے اور اپنے ذمہ پیماؤں کو پہچاننے میں مدد لیں۔

سورۂ اعراف کی تفسیر اختتام کو پہنچی

سورۂ انفال

مدنی ہے

اس کی ۷۵ آیات ہیں

سورۂ انفال کے
مختلف اور اہم مباحث

سورۂ انفال کی پچھتر آیات میں نہایت اہم مباحث موجود ہیں:

☆ پہلا اسلام کے اہم مالی مسائل کے کچھ حصوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ انفال اور خمس بھی ان میں شامل ہیں کہ جن سے بیت المال کا ایک بڑا حصہ تشکیل پاتا ہے۔

☆ دوسرے مباحث میں حقیقی مومنین کی صفات اور امتیازات کا ذکر ہے۔ جنگ بدر کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جو کہ دشمنوں کے ساتھ مسلمانوں کا پہلا مسلح ٹکراؤ تھا۔ اس جنگ کے عجیب و غریب اور حیرت انگیز حوادث کا ذکر کیا گیا ہے۔

☆ سورہ کا ایک اہم حصہ مسلمانوں پر دشمن کے ہجوموں کے مقابلے میں احکام جہاد پر مشتمل ہے۔ اس میں مسلمانوں کی اس سلسلے میں ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں۔

☆ اس میں پیغمبر اسلام کے حالات اور ہجرت کی تاریخی رات کا واقعہ بیان ہوا ہے جسے لیلۃ المبیت کہتے ہیں۔

☆ اسلام سے پہلے مشرکین کی کیفیت اور ان کی خرافات کا بھی تذکرہ ہے۔

☆ ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کی کمزوری اور ناتوانی کی کیفیت اور اس کے اسلام کے زیر سایہ ان کی تقویت کا ذکر بھی اس میں موجود ہے۔

☆ خمس کا حکم اور اس کی تقسیم کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

☆ بیان کیا گیا ہے کہ ہر دور میں ہر مقام پر جہاد کے لیے جنگی، سیاسی اور اجتماعی تیاری ضروری ہے۔

☆ ظاہری افرادی کمی کے باوجود معنوی اور روحانی طاقت کے حوالے سے دشمن پر مسلمانوں کی برتری کا ذکر بھی اس میں موجود ہے۔

☆ جنگی قیدیوں کے بارے میں احکام اور ان سے سلوک کے بارے میں بھی گفتگو کی گئی ہے۔

☆ ہجرت کرنے والوں اور ہجرت نہ کرنے والوں کے بارے میں بات کی گئی ہے۔

☆ منافقوں سے مبارزہ و مقابلہ بھی اس میں موجود ہے اور ان کی پہچان کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

☆ آخر میں اخلاقی، اجتماعی اور دیگر اصلاحی حوالے سے متعدد مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

ان تمام امور کے پیش نظر مقام تعجب نہیں اگر کچھ روایات میں اس سورہ کی تلاوت کی بہت فضیلت بیان کی گئی ہے۔ مثلاً امام صادق سے مروی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

من قرء الانفال و برآئة فی کل شهر لم یدخله نفاق ابدًا وکان من شیعة امیر المؤمنین (ع) حقا و یأکل یوم القیمة من موآئد الجنة

معهم حتی یفرغ الناس من الحساب

جو شخص ہر ماہ سورہ انفال اور برائت کی تلاوت کرے گا اس کے وجود میں ہرگز روحِ نفاق داخل نہیں ہوگی اور وہ حقیقی طور پر امیرالمومنین حضرت علیؑ کا پیرو ہوگا اور قیامت کے دن ان کے ساتھ بیٹھ کر جنت کے کھانوں میں سے کھائے گا یہاں تک کہ لوگ اپنے حساب سے فارغ ہوں گے[1]

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہوا ہے، قرآن کی سورتوں کے فضائل اور عظیم ثواب کہ جن کا تلاوت کرنے والوں کے لیے وعدہ کیا گیا ہے فقط الفاظ پڑھنے سے ہاتھ نہیں آئیں گے بلکہ پڑھنا تو مقدمہ ہے غور و فکر کرنے کا اور غور و فکر وسیلہ ہے سمجھنے کا اور سمجھنا تمہید ہے عمل کرنے کی اور چونکہ سورہ انفال اور سورہ برائت میں منافقین اور سچے مومنین کی صفات بیان کی گئی ہیں تو جو افراد ان دونوں سورتوں کو پڑھیں اور اپنی زندگی میں ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہوں ان کے وجود میں کبھی بھی روحِ نفاق داخل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح چونکہ ان دونوں سورتوں میں سچے مجاہدین کی صفات بیان کی گئی ہیں اور سرورِ مجاہدین حضرت علی علیہ السلام کی فداکاریوں کا کچھ ذکر ہے تو جو افراد ان دونوں سورتوں کے مفاہیم کا ادراک کریں اور انہیں اپنے اوپر نافذ کریں یقیناً وہ امیرالمومنینؑ کے پیروؤں میں سے ہو جائیں گے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ یَسۡـَٔلُوۡنَکَ عَنِ الۡاَنۡفَالِ ؕ قُلِ الۡاَنۡفَالُ لِلّٰہِ وَ الرَّسُوۡلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَصۡلِحُوۡا ذَاتَ بَیۡنِکُمۡ ۪ وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوۡلَہٗۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ○

ترجمہ

شروع اللہ کے نام سے جو رحمان و رحیم ہے۔

۱۔ تم سے انفال (غنائم اور ہر وہ مال جس کا مالک مشخص نہ ہو) کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہہ دو: انفال خدا اور رسول سے مخصوص ہے پس خدا (کے حکم کی مخالفت) سے بچو اور پرہیز کرو اور جو بھائی آپس میں لڑے ہوئے ہیں ان میں صلح کراؤ اور خدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو، اگر ایمان رکھتے ہو۔

شانِ نزول

ابن عباس سے منقول ہے کہ رسول اللہؐ نے جنگ بدر کے روز مجاہدینِ اسلام کی تشویق کے لیے کچھ انعامات مقرر کیے مثلاً فرمایا کہ جو فلاں دشمن کو قید کر کے میرے پاس لائے گا اسے یہ انعام دوں گا۔ ان میں پہلے ہی روح ایمان و جہاد موجود تھی اوپر سے یہ تشویق بھی، نتیجہ یہ ہوا کہ جوان سپاہی بڑے افتخار سے مقابلے کے لیے آگے بڑھے اور اپنے مقصد کی طرف لپکے۔ بوڑھے سن رسیدہ افراد جھنڈوں تلے موجود رہے۔ جب جنگ ختم ہوئی تو نوجوان اپنے پر افتخار انعامات کے لیے بارگاہِ پیغمبرؐ کی طرف بڑھے۔ بوڑھے ان سے کہنے لگے کہ اس میں ہمارا بھی حصہ ہے کیونکہ ہم تمہارے لیے پناہ اور سہارے کا کام کر رہے تھے اور تمہارے لیے جوش و خروش کا باعث تھے۔ اگر تمہارا معاملہ سخت ہو جاتا تو تمہیں پیچھے ہٹنا پڑتا تو یقیناً تم ہماری طرف آتے۔ اس موقع پر دو انصاریوں میں تو تکار بھی ہو گئی اور انہوں نے جنگی غنائم کے بارے میں بحث کی۔

اس اثنا میں زیرِ نظر آیت نازل ہوئی جس میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا کہ غنائم کا تعلق پیغمبرؐ سے ہے وہ جیسے چاہیں انہیں تقسیم فرمائیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے بھی مساوی طور پر سب سپاہیوں میں غنائم تقسیم کر دیے اور برادرانِ دینی میں صلح و مصالحت کا حکم دیا۔

تفسیر

جیسا کہ ہم شانِ نزول میں پڑھ چکے ہیں کہ اوپر والی آیت جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی اور جنگی مالِ غنیمت کے سلسلے میں وہ بات کر رہی ہے اور ایک قانون کلی کے طور پر ایک وسیع اسلامی حکم کو بیان کر رہی ہے۔ خدا تعالیٰ پیغمبرؐ کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے: تجھ سے انفال کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔

یسئلونک عن الانفال

کہہ دے کہ انفال خدا اور پیغمبرؐ کے ساتھ مخصوص ہیں (قل الانفال للّٰہ والرسول)۔ اس بنا پر تقویٰ اختیار کرو اور اپنے درمیان اصلاح کرو اور وہ بھائی کہ جن کا باہمی جھگڑا ہو گیا ہے ان میں صلح و آشتی کراؤ۔ (فاتقوا اللّٰہ واصلحوا ذات بینکم)۔ "اور خدا اور اس کے پیغمبرؐ کی اطاعت کرو"

اگر تم ایمان رکھتے ہو" (واطیعوا اللہ و رسولہ ان کنتم مؤمنین) یعنی ایمان صرف زبانی کلامی نہیں بلکہ ایمان کی جلوہ گاہ زندگی کے تمام مسائل میں فرمان خدا و پیغمبر کی بے قید و بند اطاعت کرنا ہے نہ کہ صرف جنگی غنائم میں بلکہ ہر چیز میں ان کے فرمان پر کان دھرنا اور ان کے اوامر کے سامنے تسلیم خم کرنا چاہیے

انفال کیا ہے ؟

" انفال " اصل میں " نفل " (بروزن نفع) کے مادہ سے ہے اور اس کا فعل ہے زیادتی اور اضافہ مستحب نمازوں کو بھی " نافلہ " اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہ واجبات پر اضافہ ہیں۔" نوہ " کو بھی " نافلہ " اسی لیے کہتے ہیں چونکہ وہ اولاد میں اضافہ ہوتا ہے۔ " نوفل " ایسے شخص کو کہتے ہیں جو زیادہ بخشش کرتا ہو۔

جنگی غنائم کو انفال کہا جاتا ہے یا تو یہ اس بنا پر ہے کہ یہ اموال کا ایک اضافی سلسلہ ہے جو مالک کے بغیر رہ جاتا ہے اور جنگ کرنے والوں کے ہاتھ آتا ہے جب کہ اس کا کوئی مستعین مالک نہیں ہوتا اور یا یہ اس لحاظ سے ہے کہ فوجی دشمن پر کامیابی حاصل کرنے کے لیے جنگ کرتے ہیں نہ کہ مال غنیمت کے لیے۔ اس بنا پر غنیمت ایک اضافی چیز ہے جو ان کے ہاتھ آ جاتی ہے۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ مندرجہ بالا آیت اگرچہ جنگی غنائم کے بارے میں ہے لیکن اس کا مفہوم کلی اور عمومی ہے اور یہ حکم تمام اضافی اموال، جن کا مالک مخصوص نہ ہو، کے بارے میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اہل بیت سے منقول روایات میں انفال کا ایک وسیع مفہوم بیان کیا گیا ہے معتبر روایات میں ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا :

انها ما اخذ من دار الحرب من غير قتال كالذي انجلى عنها اهلها وهو المسمى فيئا و ميراث من لا وارث له و قطائع الملوك اذا لم تكن مغصوبة والآجام، وبطون الاودية والموات، فانها لله ولرسوله وبعده لمن قام مقامه يصرفه حيث يشاء من مصالحه ومصالح عياله۔

انفال ان اموال کو کہتے ہیں جو دار الحرب سے جنگ کے بغیر حاصل ہوں، اسی طرح وہ زمین جس کے رہنے والے اسے چھوڑ کر ہجرت کر گئے ہوں اسے فیئ کا نام دیا گیا ہے اور اس شخص کی میراث جس کا کوئی وارث نہ ہو اور وہ سرزمین اور مال جو بادشاہ اسے یا اُسے بخش دیتے ہیں جب کہ ان کے مالک کی پہچان نہ ہو اور جنگل اور پہاڑوں کے درمیان کے تنگ راستے اور غیر آباد زمینیں یہ سب خدا اور پیغمبر کا مال ہیں اور پیغمبر کے بعد اس کا ہے جو ان کا قائم مقام ہو اور وہ اسے ہر اس راہ میں کہ جس میں وہ اپنی اور ان لوگوں کی کہ جن کی وہ کفالت کرتا ہے مصلحت دیکھے صرف کرے گا[1]

اگرچہ تمام جنگی غنائم کا مندرجہ بالا حدیث میں ذکر نہیں آیا لیکن ایک اور حدیث جو امام صادق ؑ سے منقول ہے اس میں ہے کہ آپ نے فرمایا :

ان غنائم بدر كانت للنبي خاصة فقسمها بينهم تفضلا منه۔

جنگ بدر کا مالِ غنیمت پیغمبرؐ سے مخصوص تھا لیکن آپ نے بخشش کے طور پر اسے لشکرِ اسلام میں تقسیم کر دیا[2]

---

[1] وسائل، کنز العرفان جلد اول صفحہ ۲۵۴

جو کچھ بیان کیا جا چکا ہے اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ انفال کے مفہوم میں نہ صرف جنگی غنائم شامل ہیں بلکہ ہر وہ مال انفال ہے جس کا کوئی مخصوص مالک نہ ہو اور ایسے تمام اموال خدا، پیغمبر اور ان کے قائم مقام سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی حکومت سے تعلق رکھتے ہیں اور تمام مسلمانوں کے مفاد میں صرف ہوں گے۔

البتہ جنگی غنائم اور جو منقولہ اموال جنگ میں لشکرِ اسلام کے ہاتھ آئیں ان کے بارے میں قانون اسلام جس کی ہم اس سورت میں تشریح کریں گے یہ ہے کہ پانچ حصوں میں چار غازیوں کو دے دیئے جائیں گے اور یہ ان کی تشویق اور زحمات کی کچھ تلافی کے لیے ہے۔ ایک حصہ خمس کے طور پر الگ کیا جائے گا۔ اس خمس کے مصارف کے بارے میں آیت ۴۱ کے ذیل میں اشارہ کیا جائے گا۔ اس طرح سے غنائم بھی انفال کے عمومی مفہوم میں شامل ہیں یا اللہ دراصل حکومت اسلامی کی ملکیت ہیں اور پانچ میں سے چار حصے جو غازیوں کو بخشے گئے ہیں وہ عطیہ اور تفضل کے طور پر ہے (غور کیجئے گا)۔

۲۔ ہو سکتا ہے یہ خیال پیدا ہو کہ زیر نظر آیت کہ جس کے مفہوم میں جنگی غنائم بھی شامل ہیں اسی سورہ کی آیت ۴۱ کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ غنائم کا صرف پانچواں حصہ (یعنی خمس) خدا، پیغمبر اور دیگر مصارف کے لیے ہے کیونکہ اس کا مفہوم تو یہ ہے کہ باقی چار حصے جنگی سپاہیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

لیکن سطور بالا میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جنگی غنائم دراصل سب خدا اور رسول سے متعلق ہیں اور یہ ایک قسم کی بخشش اور تفضل ہے کہ ان کے چار حصے جنگی سپاہیوں کو دے دیئے گئے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر حکومتِ اسلامی منقولہ غنائم میں سے اپنے حق کے چار حصے مجاہدین پر صرف کرتی ہے۔ اس مفہوم کے پیش نظر دونوں آیات میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوتا۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خمس والی آیت جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے آیہ انفال کی ناسخ نہیں ہے بلکہ دونوں اپنی پوری قوت سے باقی ہیں۔

۳۔ جیسا کہ ہم شانِ نزول میں پڑھ چکے ہیں بعض مسلمانوں کے درمیان جنگی غنائم کے بارے میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے اوّل تو غنیمت کے مسئلے کی جڑ ہی کاٹ دی گئی اور مالِ غنیمت کو مکمل طور پر پیغمبر کے اختیار اور ملکیت میں قرار دے دیا گیا اس کے بعد مسلمانوں کے درمیان اور ان افراد کے درمیان جن میں جھگڑا ہوا تھا، دوسروں کو صلح و مصالحت کروانے کا حکم دیا گیا۔

اصولی طور پر "اصلاح ذات البین" افہام و تفہیم، دشمنیوں اور کدورتوں کا خاتمہ اور نفرت کو محبت اور دشمنی کو دوستی میں تبدیل کرنا اسلام کا ایک اہم ترین پروگرام ہے۔

• "ذات" کا معنی ہے کسی چیز کی خلقت، بنیاد اور اساس۔ "بین" حالت ارتباط کو اور دو شخصوں یا چیزوں کے درمیان پیوند قائم کرنے اور انہیں آپس میں ملانے کو کہتے ہیں۔ اس بناء پر "اصلاح ذات البین" کا مطلب ہے ارتباط کی بنیاد کی اصلاح، پیوند اور جوڑ کی تقویت اور ہمبستگی اور درمیان میں سے تفرقہ و نفاق کے عوامل و اسباب کا خاتمہ۔

تعلیماتِ اسلامی میں اس بات کو اس قدر اہمیت دی گئی ہے کہ اسے بلند ترین عبادات میں سے قرار دیا گیا ہے۔ امیرالمومنین حضرت علیؑ نے اپنی آخری وصیتوں میں جبکہ آپؑ بسترِ شہادت پر تھے، اپنے فرزندانِ گرامی سے فرمایا:

انی سمعت جدکما رسول اللّٰہ (ص) یقول، اصلاح ذات البین افضل من

عامة الصلوٰة والصیام۔

میں نے تمہارے نانا رسول اللہؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا، لوگوں کے درمیان اصلاح رابطہ مختلف قسم کی مستحب نمازوں اور روزوں سے بھی برتر و افضل ہے۔[1]

کتاب کافی میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

صدقة یحبها الله اصلاح بین الناس اذا تفاسدوا و تقارب بینهم اذا تباعدوا۔[2]

وہ عطیہ و بخشش جسے خدا دوست رکھتا ہے وہ لوگوں میں صلح و مصالحت کروانا ہے جب وہ فساد کی طرف مائل ہوں اور انہیں ایک دوسرے کے قریب کرنا ہے جب کہ وہ ایک دوسرے سے دور ہوں۔

نیز اسی کتاب میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے اپنے صحابی مفضل سے فرمایا:

اذا رأیت بین اثنین من شیعتنا منازعة فافتدها من مالی

جب ہمارے شیعوں میں سے دو افراد میں جھگڑا دیکھو (جو مالی امور سے متعلق ہو) تو میرے مال میں سے تاوان اور فدیہ ادا کرو (اور ان کی صلح کروا دو)۔[3]

اسی بناء پر ایک اور روایت میں ہے کہ مفضل نے ایک دن شیعوں میں سے دو آدمیوں کو میراث کے معاملے میں جھگڑتے ہوئے دیکھا تو انہیں اپنے گھر بلایا۔ ان میں چار سو درہم کا اختلاف تھا۔ وہ مفضل نے انہیں دے دیئے اور ان کا جھگڑا ختم کروا دیا۔ اس کے بعد ان سے کہا کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ میرا مال نہیں تھا بلکہ امامؑ نے مجھے حکم دے رکھا ہے کہ ایسے مواقع پر مالِ امام سے استفادہ کرتے ہوئے اصحاب کے درمیان صلح و مصالحت کروا دوں۔[4]

اجتماعی معاملات میں اس قدر تاکیدیں کیوں کی گئی ہیں، تھوڑا سا غور و فکر کیا جائے تو اس کا سبب واضح ہو جاتا ہے۔ کسی قوم کی عظمت، طاقت، قدرت اور سربلندی باہمی افہام و تفہیم اور ایک دوسرے سے تعاون کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے تنازعات کی اصلاح نہ ہو تو عداوت و دشمنی کی جڑ آہستہ آہستہ دلوں میں اتر جاتی ہے اور ایک متحد قوم کو پراگندہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ آسیب زدہ ضعیف و ناتواں اور زبوں حال گروہ ہر حادثے اور ہر دشمن کے مقابلے میں سخت خطرے سے دوچار ہو گا بلکہ ایسی حالت میں تو نماز، روزہ جیسے اصولی مسائل یا خود وجودِ قرآن بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ اسی بناء پر اصلاح ذات البین کے بعض مراحل شرعاً واجب ہیں حتیٰ کہ انہیں انجام دینے کے لیے بیت المال کے وسائل سے استفادہ کرنا جائز ہے اور بعض دوسرے مراحل جو مسلمانوں کی سرنوشت کے حوالے سے زیادہ اہم نہیں مستحب مؤکد ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ

[2] اصولِ کافی، باب اصلاح ذات البین، حدیث ۱ و ۲۔

[3] اصولِ کافی، باب اصلاح ذات البین، حدیث ۱ و ۲۔

[4] مدرک قبل

۲۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا
تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَۚۖ
۳۔ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَؕ
۴۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّاؕ لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ
وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌۚ

ترجمہ

۲۔ مومن صرف وہ لوگ ہیں کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیات پڑھی جائیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ صرف اپنے پروردگار پر توکل کرتے ہیں۔

۳۔ وہ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

۴۔ حقیقی مومن وہ ہیں کہ جن کے لیے ان کے پروردگار کے پاس (بے حد) درجات ہیں اور ان کے لیے مغفرت و بخشش ہے اور بے نقص اور بے عیب روزی ہے۔

تفسیر

مومنین کی پانچ خصوصیات

گزشتہ آیت میں مسلمانوں کے درمیان غنائم پر ہونے والی بحث کی مناسبت سے تقویٰ اور ایمان کی بات کی گئی تھی۔ اس گفتگو کی تکمیل کے لیے زیر نظر آیات میں سچے اور حقیقی مومنین کی صفات منفرد اور پرمعنی عبارتوں میں بیان کی گئی ہیں۔ ان آیات میں خدا تعالیٰ نے مومنین کی پانچ امتیازی صفات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جن میں سے تین روحانی اور معنوی پہلو رکھتی ہیں اور دو عملی اور خارجی پہلو رکھتی ہیں۔

پہلے تین یہ ہیں:

احساس ذمہ داری،

ایمان کا تکامل اور ارتقا

اور توکل ـــــ شامل ہیں

دوسرے حصے میں

خدا سے ارتباط

اور خلقِ خدا سے تعلق اور ربط شامل ہیں۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: مومنین صرف وہ لوگ ہیں کہ جب بھی خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل احساسِ مسئولیت سے اس کی بارگاہ میں دھڑکنے لگتے ہیں (انما المومنون الذین اذا ذکر الله وجلت قلوبهم)۔

"وجل" خوف اور ڈر کی اس کیفیت کو کہتے ہیں جو انسان کو دو میں سے کسی ایک وجہ سے لاحق ہوتی ہے اور وہ یہ کہ انسان میں ذمہ داریوں کے ادراک کے ساتھ یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس نے خدا کی طرف سے عائد کردہ لازمی فرائض کو ادا نہیں کیا اور یا یہ کہ انسان کی توجہ خدا کے لامتناہی وجود اور ہیبت و عظمت مقام کی طرف ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ کبھی انسان کسی بزرگ شخصیت کو کہ جو واقعاً ہر لحاظ سے باعظمت ہو اس کے مقام سے اس قدر متاثر ہوتا ہے اور اپنے دل میں اس قدر خوف اور وحشت محسوس کرتا ہے کہ بات کرتے ہوئے اس کی زبان میں لکنت پیدا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات وہ اپنی بات بھول جاتا ہے اگرچہ وہ بزرگ شخص اس سے اور دیگر سب سے انتہائی محبت اور لگاؤ رکھتا ہو اور ڈرنے والے سے کوئی غلطی بھی سرزد نہ ہوئی ہو اور اس قسم کا خوف عظمت کے ادراک کا عکس العمل ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرأیته خاشعا متصدعا من خشیة الله

یہ قرآن اگر ہم پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ خوفِ خدا سے پھٹ جاتا۔

(حشر - ۲۱)

نیز یہ بھی ارشاد ہے:

انما یخشی الله من عباده العلماء

خدا سے صرف علماء اور عظمتِ الٰہی سے آگاہ لوگ ہی ڈرتے ہیں۔

(فاطر - ۲۸)

لہٰذا آگاہی و علم اور خوف کے درمیان ہمیشہ کا تعلق ہے۔ اس بناء پر یہ اشتباہ ہوگا اگر ہم خوف کا سرچشمہ صرف ذمہ داریوں کی عدم ادائیگی کو سمجھیں۔

اس کے بعد ان کی دوسری صفت بیان کی گئی ہے: وہ راہِ تکامل میں مسلسل آگے بڑھتے رہتے ہیں اور ایک لحظہ بھی آرام نہیں کرتے۔ "اور جب ان کے سامنے آیاتِ خدا پڑھی جائیں تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے (واذا تلیت علیهم آیاته زادتهم ایمانا)۔

رشد و نمو اور تکامل و ارتقاء تمام زندہ موجودات کی خاصیت ہے جس میں نمو اور تکامل نہ ہو وہ مردہ ہے یا موت کے کنارے پہنچ چکا ہے۔ سچے اور زندہ مومنین یہ ایمان رکھتے ہیں کہ ان کی ہستی کا نوبہار پودا آیاتِ خدا کی آبیاری سے سدا شاداب رہتا ہے تازہ بہ تازہ پھل پھول پیدا کرتا ہے وہ زندہ نما مُردوں کی طرح ایک ہی جگہ اور حالت کا شکار نہیں رہتے اور اکتا دینے والی ایک ہی صورت کی

سی کیفیت میں نہیں رہتے۔ ہر نیا دن آتا ہے تو ان کی فکر، ایمان اور صفات بھی تازہ ہوتی ہیں۔

ان کی تیسری نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ صرف اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اسی پر توکل کرتے ہیں (وعلیٰ ربھم یتوکلون)۔
ان کا افقِ فکر اس قدر بلند ہے کہ وہ کمزور اور ناتواں مخلوق پر بھروسہ کرنے سے انکار کر دیتے ہیں چاہے وہ مخلوق ظاہراً کتنی ہی عظمت رکھتی ہو اور پانی سرچشمہ سے لیتے ہیں اور وہ جو کچھ چاہتے ہیں اور طلب کرتے ہیں عالمِ ہستی کے بے کراں سمندر ذاتِ پاک پروردگار سے چاہتے ہیں۔ ان کی روح عظیم ہے اور ان کی سطحِ فکر بلند ہے اور ان کا سہارا صرف خدا ہے۔

اشتباہ نہ ہو کہ توکل کا مفہوم جیسا کہ بعض تحریف کرنے والوں نے خیال کیا ہے یہ نہیں کہ عالمِ اسباب سے آنکھیں بند کر لی جائیں، ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جایا جائے اور گوشہ نشین ہو جایا جائے بلکہ اس کا مفہوم ہے خود سازی، بلند نظری اور ایثار، غیر اللہ سے عدم وابستگی اور عدم انفکاک۔ جہانِ طبیعت اور عالمِ ہستی کے اسباب سے استفادہ کرنا عین توکل بر خدا ہے چونکہ ان اسباب کی تاثیر مشائے ایزدی اور ارادۂ الٰہی کے مطابق ہی ہے۔

سچے مومنین کی ان تین قسم کی روحانی صفات کو بیان کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے کہ وہ احساسِ مسئولیت اور عظمتِ پروردگار کے احساس کے تحت اور اسی طرح بڑھتے ہوئے ایمان اور توکل کی بدولت وہ عملاً دو محکم رشتوں کے حامل ہیں۔ ایک ان کا خدا سے محکم رابطہ اور دوسرا بندگانِ خدا سے قوی ارتباط۔ "وہ ایسے لوگ ہیں کہ نماز کو (کہ جو خدا سے رابطہ کا مظہر ہے) قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے بندگانِ خدا کے لیے خرچ کرتے ہیں (الذین یقیمون الصلوٰة ومما رزقنٰھم ینفقون)۔

"نماز پڑھنے" کی بجائے "قیامِ نماز" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ وہ نہ صرف نماز پڑھتے ہیں بلکہ وہ اس طرح سے عمل کرتے ہیں کہ پروردگار سے یہ رابطہ اسی طرح ہر جگہ قائم رہتا ہے۔

"ممّا رزقنٰھم" (اور ہم نے جو انہیں روزی دی ہے) ایک تعبیر ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جو تمام تر مادی و معنوی سرمائے پر محیط ہے وہ نہ صرف اپنے اموال سے بلکہ اپنے علم و دانش سے، اپنے ہوش و فکر سے، اپنے مقام و حیثیت سے اور اپنے اثر و رسوخ سے بھی اور ان تمام نعمات سے جو ان کے اختیار میں ہیں بندگانِ خدا کی خدمت کرتے ہیں۔

محلِ بحث آخری آیت میں اس طرح کے سچے مومنین کے بلند مقام و مرتبہ اور فراواں اجر و ثواب کو بیان کیا گیا ہے۔
پہلے ارشاد ہوتا ہے "حقیقی مومنین صرف وہی ہیں (اولٰئک ھم المؤمنون حقًّا)۔
اس کے بعد ان کے لیے تین اہم جزائیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ وہ اپنے پروردگار کے ہاں اہم درجات کے حامل ہیں (لھم درجات عند ربھم)۔ وہ درجات کہ جن کی مقدار معین نہیں اور یہی ابہام ان کے غیر معمولی اور بے حد و حساب ہونے پر دلالت کرتا ہے[1]
۲۔ علاوہ ازیں اس کی مغفرت، رحمت اور بخشش ان کے شاملِ حال ہوگی (و مغفرة)۔
۳۔ اور رزقِ کریم ان کے انتظار میں ہے (و رزق کریم)۔ یعنی بے حد و حساب، بے عیب عظیم اور دائمی نعمات

---

[1] "درجة" اور "درجات" کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی دوسری جلد کی طرف رجوع کریں۔

ان کی انتظار میں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمان جو اسلام کا دم بھرتے ہیں اور اپنے آپ کو اسلام اور قرآن کا طلبگار سمجھتے ہیں بعض اوقات نادانی کی وجہ اپنی پسماندگی کا ذمہ اسلام اور قرآن پر ڈال دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم صرف انہی چند آیات کو کہ جن میں سچے مومنین کی صفات بیان کی گئی ہیں اپنی زندگی میں اپنا لیں یہ ضعف و کمزوری، زبوں حالی اور ادھر ادھر سے وابستگی کو ایمان و توکل کے زیر سایہ ترک کر دیں، ہر نئے دن میں ایمان اور علم کے نئے مرحلے کی طرف قدم بڑھائیں، ایمان کے سائے میں اپنے معاشرے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر اپنی مسئولیت کا احساس کریں اور ہمارا رابطہ خدا اور خلقِ خدا سے اس طرح قوی ہو کہ ہم اپنے وجود کا تمام سرمایہ معاشرے کی پیش رفت کے لیے صرف کر دیں —— تو کیا پھر بھی ہماری یہی حالت ہوگی جو آج ہے؟

اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ایمان کے کئی مرحلے اور درجے ہیں بعض مراحل میں ہو سکتا ہے کہ ایمان اس قدر کمزور ہو کہ عملاً دکھائی نہ دے اور بہت سی آلودگیاں بھی انسان کے ساتھ ہوں لیکن ایک حقیقی راسخ اور محکم ایمان کے لیے محال ہے کہ وہ عمل، مثبت، تعمیری اور اصلاحی پہلوؤں سے خالی ہو اور وہ کہ جو ایمان کو عمل کے ساتھ نہیں سمجھتے ان کی نظر ایمان کے نہایت پست مرحلے اور درجے پہ ہے۔

۵۔ كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۙ

۶۔ يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ؕ

ترجمہ

۵۔ (بدر کے مالِ غنیمت سے متعلق تم میں سے بعض کی ناگواری) اسی طرح ہے کہ جیسے خدا نے تجھے تیرے گھر سے حق کے ساتھ باہر (میدان بدر کی طرف) نکالا جب کہ مومنین کا ایک گروہ اسے پسند نہیں کرتا تھا (لیکن اس کا انجام ایک واضح کامیابی تھا)۔

۶۔ اگرچہ وہ جانتے تھے کہ یہ فرمانِ خدا ہے پھر بھی وہ تجھ سے مجادلہ کرتے تھے (اور خوف و ہراس نے انہیں یوں گھیر رکھا تھا) گویا انہیں موت کی طرف لے جایا جا رہا ہے اور (گویا وہ اسے اپنی آنکھ سے) دیکھ رہے ہیں۔

تفسیر

اس سورہ کی پہلی آیت میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ نئے مسلمانوں میں سے کچھ لوگ جنگ بدر کے غنائم کی تقسیم کی کیفیت سے ناراض تھے یہاں تک کہ زیر بحث آیات میں بھی خداوند عالم انہیں کہتا ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں کہ کوئی چیز تمہیں اچھی نہ لگے چاہے تمہاری مصلحت اسی میں ہو جیسا کہ خود جنگ بدر تم میں سے بعض کو ناپسند تھی کہ جس کے مال غنیمت کے بارے میں اب تم گفتگو کر رہے ہو لیکن تم نے دیکھا کہ آخرکار وہ مسلمانوں کے لیے درخشاں نتائج کی حامل ہوئی لہٰذا احکام الٰہی کو اپنی کوتاہ نظر سے نہ دیکھو بلکہ ان کے سامنے سر تسلیم خم کرو اور ان کے اصلی نتائج سے فائدہ اٹھاؤ۔

پہلی آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے: غنائم بدر پر کچھ افراد کی یہ ناگواری ایسے ہی ہے جیسے خدا نے تجھے تیرے گھر اور مقام مدینہ سے حق کے ساتھ باہر نکالا جب کہ کچھ مومنین اس سے کراہت کر رہے تھے اور اسے ناپسند کرتے تھے (کما اخرجك ربك من بيتك بالحق وان فريقا من المؤمنين لكرهون)۔

"بالحق" اس طرف اشارہ ہے کہ خروج کا یہ حکم وحی الٰہی اور پیغام آسمانی کے مطابق دیا گیا تھا کہ جس کا نتیجہ اسلامی معاشرے کے حق میں تھا۔

یہ ظاہر بین اور کم حوصلہ لوگ بدر کی طرف جاتے ہوئے راستے میں اس فرمان حق کے بارے میں مسلسل تجھ سے مجادلہ اور گفتگو کرتے رہے اگرچہ وہ جانتے تھے کہ یہ حکم خدا ہے پھر بھی اعتراض سے باز نہیں آتے تھے (يجادلونك في الحق بعد ما تبين)۔ اور انہیں خوف وہراس نے یوں گھیر رکھا تھا جیسا انہیں موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہو اور گویا وہ اپنی موت اور نابودی کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہوں (كانما يساقون الى الموت وهم ينظرون)۔

بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ وہ کس قدر غلط فہمی کا شکار تھے اور بلاوجہ خوف وہراس میں گرفتار تھے اور جنگ بدر مسلمانوں کے لیے کیسی درخشاں کامیابیاں لے کر آئی تو یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود انہوں نے جنگ بدر کے بعد مال غنیمت کے سلسلے میں زبان اعتراض کیوں دراز کی ہے۔

ضمنی طور پر "فريقا من المؤمنين" کی تعبیر سے واضح ہوتا ہے کہ اول تو یہ جھگڑا اور گفتگو منافقت اور بے ایمانی کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ایمان کی کمزوری اور اسلامی مسائل کے بارے میں کافی دانش وبینش نہ ہونے کی وجہ سے تھی۔

دوسری بات یہ کہ صرف چند افراد ہی ایسی فکر رکھتے تھے اور مسلمانوں کی اکثریت جو سچے مجاہدوں پر مشتمل تھی فرمان پیغمبر اور ان کے اوامر کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے تھی۔

۷۔ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ

بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

۸۔ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۔ اور وہ وقت یاد کرو جب خدا نے تم سے وعدہ کیا کہ قریش کے تجارتی قافلے اور ان کا لشکر، ان (دو گروہوں میں سے) تمہارے لیے ایک ہو گا (اور تم اس پر کامیاب ہو جاؤ گے) لیکن خدا چاہتا ہے کہ اپنے کلمات سے حق کو تقویت دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے (لہٰذا لشکرِ قریش سے تمہاری مڈبھیڑ کروادی)۔

۸۔ تاکہ حق ثابت ہو جائے اور باطل ختم ہو جائے اگرچہ مجرم اسے ناپسند کرتے ہوں اور اس سے کراہت کرتے ہوں۔

اسلام اور کفر کا پہلا مسلح تصادم ——— جنگِ بدر

گزشتہ آیات میں چونکہ جنگِ بدر کی طرف اشارہ ہو چکا ہے لہٰذا قرآن بحث کو جنگِ بدر کے واقعہ کی طرف کھینچ لایا ہے۔ زیرِ بحث آیات اور آئندہ کی کچھ آیات میں اس سلسلے کے بعض نہایت حساس پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے جن میں سے ہر کوئی اپنے اندر تعلیم و تربیت کی ایک دنیا لیے ہوئے ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ مسلمان ان حقائق کو کہ جن کا کچھ تجربہ وہ کر چکے ہیں ہمیشہ کے لیے نقش کریں اور ہمیشہ ان سے سبق حاصل کرتے رہیں۔

زیرِ نظر آیات اور آئندہ کی آیات کی توضیح و تفسیر سے پہلے اس اسلامی جہاد کا مختصر سا خاکہ پیش کر دینا ضروری ہے جو کہ سخت ترین اور خون آشام دشمنوں سے مسلمانوں کی پہلی مسلح جنگ تھی۔ یہ اس لیے ہے تاکہ ان آیات میں جو باریک نکتے اور اشارات آئے ہیں وہ مکمل طور پر واضح ہو سکیں۔

مؤرخین، محدثین اور مفسرین نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے:

جنگِ بدر کی ابتداء یہاں سے ہوئی کہ مکہ والوں کا ایک اہم تجارتی قافلہ شام سے مکہ کی طرف واپس جا رہا تھا۔ اس قافلے کو مدینہ کی طرف سے گزرنا تھا۔ اہلِ مکہ کا سردار ابوسفیان قافلہ کا سالار تھا۔ اس کے پاس پچاس ہزار دینار کا مال تجارت تھا۔ پیغمبر اسلامؐ نے اپنے اصحاب کو اس عظیم قافلے کی طرف تیزی سے کوچ کا حکم دیا کہ جس کے پاس دشمن کا ایک بڑا سرمایہ تھا تاکہ اس سرمائے کو ضبط کر کے دشمن کی اقتصادی قوت کو سخت ضرب لگائی جائے تاکہ اس کا نقصان دشمن کی فوج کو پہنچے۔

پیغمبرؐ اور ان کے اصحاب ایسا کرنے کا حق رکھتے تھے کیونکہ مسلمان مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کر کے آئے تو اہلِ مکہ نے ان کا بہت سا مال پر قبضہ کر لیا تھا جس سے مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا لہٰذا وہ حق رکھتے تھے کہ اس نقصان کی تلافی کریں۔

اس سے قطع نظر بھی اہل مکہ نے گذشتہ تیرہ برس میں پیغمبر اسلامؐ اور مسلمانوں سے جو سلوک روا رکھا اس سے بات ثابت ہو چکی تھی وہ مسلمانوں کو ضرب لگانے اور نقصان پہنچانے کے لیے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنوائیں گے یہاں تک کہ وہ خود پیغمبر اکرمؐ کو قتل کرنے پر تل گئے تھے۔ ایسا دشمن پیغمبر اکرمؐ کے ہجرت مدینہ کی وجہ سے بے کار نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ واضح تھا کہ وہ قاطع ترین ضرب لگانے کے لیے اپنی قوت جمع کرتا۔ پس عقل و منطق کا تقاضا تھا کہ پیش بندی کے طور پر ان کے تجارتی قافلے کو گھیر کر اس کے اتنے بڑے سرمائے کو ضبط کر لیا جاتا تاکہ اس پر ضرب پڑے اور اپنی فوجی اور اقتصادی بنیاد مضبوط کی جاتی۔ ایسے اقدامات آج بھی اور گذشتہ ادوار میں بھی عام دنیا میں فوجی طریق کار کا حصہ رہے ہیں۔ جو لوگ ان پہلوؤں کو نظر انداز کر کے قافلے کی طرف پیغمبر کی پیش قدمی کو ایک طرح کی غارت گری کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں یا تو وہ حالات سے آگاہ نہیں اور اسلام کے تاریخی مسائل کی بنیادوں سے بے خبر ہیں اور یا ان کے کچھ مخصوص مقاصد ہیں جن کے تحت وہ واقعات و حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔

بہر حال ایک طرف ابوسفیان کو مدینہ میں اس کے دوستوں کے ذریعے اس امر کی اطلاع مل گئی اور دوسری طرف اس نے اہل مکہ کو صورت حال کی اطلاع کے لیے ایک تیز رفتار قاصد روانہ کر دیا کیونکہ شام کی طرف جاتے ہوئے بھی اسے اس تجارتی قافلے کی راہ میں رکاوٹ کا اندیشہ تھا۔

قاصد ابوسفیان کی نصیحت کے مطابق اس حالت میں مکہ میں داخل ہوا کہ اس نے اپنے اونٹ کی ناک کو چیر دیا تھا اس کے کان کاٹ دیئے تھے، خون ہیجان انگیز طریقے سے اونٹ سے بہہ رہا تھا، قاصد نے اپنی قمیض کو دونوں طرف سے پھاڑ دیا تھا اور اونٹ کی پشت کی طرف منہ کر کے بیٹھا ہوا تھا تاکہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ مکہ میں داخل ہوتے ہی اس نے چیخ چلانا شروع کر دیا:

اے کامیاب و کامران لوگو! اپنے قافلے کی خبر لو، اپنے کارواں کی مدد کرو، جلدی کرو ــــ لیکن مجھے امید نہیں کہ تم وقت پر پہنچ سکو، محمدؐ اور تمہارے دین سے نکل جانے والے افراد قافلے پر حملے کے لیے نکل چکے ہیں۔

اس موقع پر پیغمبرؐ کی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب کا ایک عجیب و غریب خواب بھی مکہ میں زبان زد عام تھا اور لوگوں کے ہیجان میں اضافہ کر رہا تھا۔ خواب کا ماجرا یہ تھا کہ عاتکہ نے تین روز قبل خواب میں دیکھا کہ:

ایک شخص پکار رہا ہے کہ لوگو! اپنی قتل گاہ کی طرف جلدی چلو۔ اس کے بعد وہ منادی کوہ ابوقبیس کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ اس نے پتھر کی ایک بڑی چٹان کو حرکت دی تو وہ چٹان ریزہ ریزہ ہو گئی اور اس کا ایک ایک ٹکڑا قریش کے ایک ایک گھر میں جا پڑا اور مکہ کے درّے سے خون کا سیلاب جاری ہو گیا۔

عاتکہ وحشت زدہ ہو کر خواب سے بیدار ہوئی اور اپنے بھائی عباس کو سنایا۔ اس طرح خواب لوگوں تک پہنچا تو وہ وحشت و پریشانی میں ڈوب گئے۔ ابوجہل نے خواب سنا تو بولا: یہ عورت دوسرا پیغمبر ہے جو اولاد عبدالمطلب میں ظاہر ہوا ہے۔ لات و عزیٰ کی قسم ہم تین دن کی مہلت دیتے ہیں اگر اتنے عرصے میں اس خواب کی تعبیر ظاہر نہ ہوئی تو ہم آپس میں ایک تحریر لکھ کر اس پر دستخط کریں گے کہ بنی ہاشم قبائل عرب میں سے سب سے زیادہ جھوٹے ہیں۔ تیسرا دن ہوا تو ابوسفیان کا قاصد آ پہنچا۔ اس کی پکار نے تمام اہل مکہ کو ہلا کے رکھ دیا اور چونکہ تمام اہل مکہ کا اس قافلے میں حصہ تھا سب فوراً جمع ہو گئے۔ ابوجہل کی کمان میں ایک لشکر تیار ہوا۔ اس میں ۹۵۰ جنگجو تھے جن میں سے بعض ان کے بڑے اور مشہور سردار اور بہادر تھے۔ ۷۰۰ اونٹ تھے اور ۱۰۰ گھوڑے تھے۔ لشکر مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

پیغمبر اسلامؐ ۳۱۳ افراد کے ساتھ جن میں تقریباً تمام مجاہدین اسلام تھے سرزمین بدر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ یہ مقام مکہ اور مدینہ کے راستے میں ہے۔ یہاں آپ کو قریش کے لشکر کی روانگی کی خبر ملی۔ اس وقت آپؐ نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا کہ کیا ابوسفیان کے قافلے کا تعاقب کیا جائے اور قافلے کے مال پر قبضہ کیا جائے یا لشکر کے مقابلے کے لیے تیار ہوا جائے۔ ایک گروہ نے دشمن کے لشکر کا مقابلہ کرنے کو ترجیح دی جب کہ دوسرے گروہ نے اس تجویز کو ناپسند کیا اور قافلے کے تعاقب کو ترجیح دی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ہم مدینہ سے مکہ کی فوج کا مقابلہ کرنے کے ارادے سے نہیں نکلے تھے اور ہم نے اس لشکر کے مقابلے کے لیے جنگی تیاری نہیں کی تھی جب کہ وہ ہماری طرف پوری تیاری سے آرہا ہے۔

اس اختلاف رائے اور تردد میں اس وقت اضافہ ہو گیا جب انہیں معلوم ہوا کہ دشمن کی تعداد مسلمانوں سے تقریباً تین گنا ہے اور ان کا سازوسامان بھی مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود پیغمبر اسلامؐ نے پہلے گروہ کے نظریے کو پسند فرمایا اور حکم دیا کہ دشمن کی فوج پر حملے کی تیاری کی جائے۔

جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو دشمن کو یقین نہ آیا کہ مسلمان اس قدر کم تعداد اور سازوسامان کے ساتھ میدان میں آئے ہوں گے۔ ان کا خیال تھا کہ سپاہ اسلام کا اہم حصہ کسی مقام پر چھپا ہوا ہے تاکہ وہ غفلت میں کسی وقت ان پر حملہ کر دے لہٰذا انہوں نے ایک شخص کو تحقیقات کے لیے بھیجا۔ انہیں جلدی معلوم ہو گیا کہ مسلمانوں کی جمعیت یہی ہے جسے وہ دیکھ رہے ہیں۔

دوسری طرف جیسا کہ ہم نے کہا ہے مسلمانوں کا ایک گروہ وحشت و خوف میں غرق تھا۔ اس کا اصرار تھا کہ اتنی بڑی فوج کہ جس سے مسلمانوں کا کوئی موازنہ نہیں، خلاف مصلحت ہے لیکن پیغمبر اسلامؐ نے خدا کے وعدے سے انہیں جوش دلایا اور انہیں جنگ پر ابھارا۔ آپؐ نے فرمایا کہ خدا نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ دو گروہوں میں سے ایک پر تمہیں کامیابی حاصل ہوگی قریش کے قافلے پر یا لشکرِ قریش پر اور خدا کے وعدہ کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ خدا کی قسم ابوجہل اور کئی سرداران قریش کے مقام قتل کو گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

اس کے بعد آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ بدر[1] کے کنوئیں کے قریب پڑاؤ ڈالیں۔

اس ہنگامے میں ابوسفیان اپنا قافلہ خطرے کے علاقے سے نکال لے گیا۔ اصل راستے سے ہٹ کر دریائے احمر کے ساحل کی طرف سے وہ تیزی سے مکہ پہنچ گیا۔ اس نے ایک قاصد کے ذریعے لشکر کو پیغام بھیجا:

خدا نے تمہارا قافلہ بچا لیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان حالات میں محمدؐ کا مقابلہ کرنا ضروری نہیں کیونکہ اس کے اتنے دشمن ہیں جو اس کا حساب چکا لیں گے۔

لشکر کے کمانڈر ابوجہل نے اس تجویز کو قبول نہ کیا۔ اس نے اپنے بڑے بتوں لات اور عزیٰ کی قسم کھائی کہ نہ صرف ان کا مقابلہ کریں گے بلکہ مدینہ کے اندر تک ان کا تعاقب کریں گے یا انہیں قید کر لیں گے اور مکہ میں لے آئیں گے تاکہ اس کامیابی کا شہرہ تمام قبائل عرب کے کانوں تک پہنچ جائے۔

---

[1] بدر، دراصل قبیلہ جہینہ کے ایک شخص کا نام تھا جس نے اس مقام پر کنواں کھودا تھا اس کے بعد وہ زمین سرزمینِ بدر اور کنواں چاہ بدر کے نام سے مشہور ہو گیا۔

آخرکار لشکرِ قریش بھی مقام بدر تک آپہنچا۔ انہوں نے اپنے غلام پانی لانے کے لیے کنویں کی طرف بھیجے۔ اصحابِ پیغمبرؐ نے انہیں پکڑ لیا اور ان سے حالات معلوم کرنے کے لیے انہیں خدمتِ پیغمبرؐ میں لے آئے۔ حضرتؐ نے ان سے پوچھا تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم قریش کے غلام ہیں۔ فرمایا: لشکر کی تعداد کیا ہے؟ انہوں نے کہا: ہمیں اس کا پتہ نہیں۔ فرمایا: ہر روز کتنے اونٹ کھانے کے لیے نحر کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا: نو سے دس تک۔ فرمایا: ان کی تعداد ۹ سو سے لے کر ایک ہزار تک ہے (ایک اونٹ ایک سو فوجی جوانوں کی خوراک ہے)۔

ماحول پُرہیبت اور وحشت ناک تھا۔ لشکرِ قریش کے پاس فراواں جنگی ساز و سامان تھا۔ یہاں تک کہ حوصلہ بڑھانے کے لیے گانے بجانے والی عورتوں کو بھی ساتھ لائے تھے۔ وہ اپنے سامنے ایسے حریف کو دیکھ رہے تھے کہ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ ان حالات میں وہ میدانِ جنگ میں قدم رکھے گا۔

پیغمبر اکرمؐ دیکھ رہے تھے کہ ممکن ہے آپ کے اصحاب خوف و وحشت کی وجہ سے رات آرام سے سو نہ سکیں اور پھر کل دن کو تھکے ہوئے جسم اور روح کے ساتھ دشمن کے مقابل ہوں لہٰذا خدا کے وعدے کے مطابق آپ نے ان سے فرمایا:

تمہاری تعداد کم ہو تو اس کا غم نہ کرو، آسمانی فرشتوں کی ایک عظیم جماعت تمہاری مدد کے لیے آئے گی۔

آپ نے انہیں خدائی وعدے کے مطابق اگلے روز فتح کی پوری تسلی دے کر مطمئن کر دیا اور وہ رات آرام سے سو گئے۔

دوسری مشکل جس سے مجاہدین کو پریشانی تھی وہ میدانِ بدر کی کیفیت تھی۔ ان کی طرف زمین نرم تھی اور اس میں پاؤں دھنس جاتے تھے۔ رات یہ ہوا کہ خوب بارش ہوئی۔ اس کے پانی سے مجاہدین نے وضو کیا، غسل کیا اور تازہ دم ہو گئے۔ ان کے نیچے کی زمین بھی اس سے سخت ہو گئی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ دشمن کی طرف اتنی زیادہ بارش ہوئی کہ وہ پریشان ہو گئے۔

دشمن کے لشکرگاہ سے مسلمان جاسوسوں کی طرف سے ایک نئی خبر موصول ہوئی اور جلد ہی مسلمانوں میں پھیل گئی۔ خبر یہ تھی کہ فوجِ قریش اپنے ان تمام وسائل کے باوجود خوفزدہ ہے۔ گویا وحشت کا ایک لشکر خدا نے ان کے دلوں کی سرزمین پر اتار دیا تھا۔

اگلے روز چھوٹا سا اسلامی لشکر جذبے لوہے کے ساتھ دشمن کے سامنے صف آرا ہوا۔ پیغمبر اکرمؐ نے پہلے انہیں صلح کی تجویز پیش کی تاکہ عذر اور بہانہ باقی نہ رہے۔ آپ نے ایک نمائندے کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ میں نہیں چاہتا کہ تم وہ پہلا گروہ بن جاؤ کہ جس پر ہم حملہ آور ہوں۔

بعض سردارانِ قریش چاہتے تھے کہ یہ صلح کا ہاتھ جو ان کی طرف بڑھایا گیا ہے اسے تھام لیں اور صلح کر لیں لیکن پھر ابوجہل مانع ہوا۔

آخرکار جنگ شروع ہوئی۔ اس زمانے کے طریقے کے مطابق پہلے ایک کے مقابلے میں ایک نکلا۔ ادھر لشکرِ اسلام میں رسول اللہ کے چچا حمزہ اور حضرت علی جو جوان ترین افراد تھے میدان میں نکلے۔ مجاہدینِ اسلام میں سے چند اور بہادر بھی اس جنگ میں شریک ہوئے۔ ان جوانوں نے اپنے حریفوں کے پیکر پر سخت ضربیں لگائیں اور کاری وار کیے اور ان کے قدم اکھیڑ دیے۔ دشمن کا جذبہ اور کمزور پڑ گیا۔ یہ دیکھا تو ابوجہل نے عمومی حملے کا حکم دے دیا۔

ابوجہل پہلے ہی حکم دے چکا تھا کہ اصحابِ پیغمبرؐ میں سے جو اہلِ مدینہ میں سے ہیں انہیں قتل کر دو، مہاجرین مکہ کو اسیر کر لو۔ مقصد یہ تھا کہ پراپیگنڈا کے لیے انہیں مکہ لے جائیں۔

یہ لمحات بڑے حساس تھے۔ رسول اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ جمعیت کی کثرت پر نظر نہ کریں اور صرف اپنے مدمقابل پر نگاہ رکھیں، دانتوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر بھینچیں، باتیں کم کریں، خدا سے مدد طلب کریں، حکمِ پیغمبرؐ سے کہیں بھی سر تابی نہ کریں اور مکمل کامیابی کی امید رکھیں۔

رسول اللہ نے دستِ دعا آسمان کی طرف بلند کیے اور عرض کیا:

یارب ان تھلک ھذہ العصابۃ لم تعبد۔

پروردگار! اگر یہ گروہ مارا گیا تو کوئی تیری عبادت کرنے والا نہیں ہوگا۔

دشمن کے لشکر کی سمت میں سخت ہوا چل رہی تھی اور مسلمان ہوا کی طرف پشت کر کے ان پر حملے کر رہے تھے۔ ان کی استقامت، پامردی اور دلاوری نے قریش کا ناطقہ بند کر دیا۔ ابوجہل سمیت دشمن کے ستر آدمی قتل ہو گئے ان کی لاشیں خاک وخون میں غلطاں پڑی تھیں۔ ستر افراد ہی مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہو گئے۔ مسلمانوں کے بہت کم افراد شہید ہوئے۔

اس طرح مسلمانوں کی پہلی مسلح جنگ طاقتور دشمن کے خلاف غیر متوقع کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی [1]

تفسیر

جنگ بدر کی کچھ کیفیت بیان ہو چکی ہے۔ اب ہم زیر نظر آیات کی تفسیر کی جانب پلٹتے ہیں۔ پہلی آیت میں جنگ بدر میں اجمالی طور پر کامیابی کے خدائی وعدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، وہ وقت یاد کرو جب خدا نے تم سے وعدہ کیا کہ دو گروہوں میں سے ایک (قریش کا تجارتی قافلہ یا لشکر قریش) تمہارے قبضے میں دے گا (و اذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انھا لکم)۔ لیکن تم جنگ کی مصیبت، اس سے تلف ہونے والے جان و مال اور اس سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کی وجہ سے چاہتے تھے کہ قافلہ تمہارے قبضے میں آجائے نہ کہ لشکر قریش (و تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم)۔

روایات میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے ان سے فرمایا:

احدی الطائفتین لکم اما العیر و اما النفیر۔

"عیر" کا معنی ہے "قافلہ" اور "نفیر" کا معنی ہے "لشکر"۔ لیکن جیسا کہ آپ آیت میں ملاحظہ کر رہے ہیں کہ "لشکر" کے لیے "ذات الشوکۃ" اور "قافلہ" کے لیے "غیر ذات الشوکۃ" آیا ہے۔

یہ تعبیر ایک لطیف نکتے کی حامل ہے کیونکہ "شوکۃ" کہ جو قدرت و شدت کے معنی میں ہے در اصل "شوک" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "کانٹا"۔ بعد ازاں یہ لفظ فوجیوں کے نیزوں کی انیوں کے لیے یہ لفظ استعمال ہونے لگا اور پھر ہر قسم کے ہتھیاروں کو "شوکۃ" کہا جانے لگا اور ہتھیار چونکہ قدرت و شدت کی نشانی ہے لہٰذا ہر طرح کی قدرت و شدت کے لیے بھی لفظ "شوکت" استعمال ہونے لگا لہٰذا "ذات الشوکۃ" مسلح فوج کے معنی میں ہے اور "غیر ذات الشوکۃ" غیر مسلح قافلے کے مفہوم میں ہے۔ اب اگر اس میں کچھ لوگ مسلح بھی تھے تو مسلّم ہے کہ وہ زیادہ نہ تھے۔

مفہوم یہ ہوا کہ تم میں سے ایک گروہ آرام طلبی کے لیے یا مادی مفاد کے لیے چاہتا تھا کہ مال تجارت کی طرف جایا جائے نہ کہ مسلح فوج کا سامنا کیا جائے حالانکہ اختتامِ جنگ نے ثابت کر دیا کہ ان کی حقیقی مصلحت اس میں تھی کہ وہ دشمن کی فوجی طاقت کو درہم برہم کر دیں تاکہ

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۳۰ اور تفسیر مجمع البیان جلد ۴ صفحہ ۵۲۰ تا ۵۲۳ (اختصار و تلخیص کے ساتھ کہیں کہیں وضاحت بھی کی گئی ہے)۔

آئندہ کی عظیم کامیابیوں کی راہ ہموار ہو جائے لہٰذا اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: خدا چاہتا ہے کہ اس طرح سے اپنے کلمات سے حق کو ثابت کرے اور دینِ اسلام کو تقویت دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے (و یرید اللہ ان یحق الحق بکلماتہ ویقطع دابر الکافرین)[1] لہٰذا تم سب مسلمانوں کے لیے بہت بڑا درس عبرت تھا کہ مختلف حوادث میں ہمیشہ دور اندیشی سے کام لو، مستقبل کی تعمیر کرو، کوتاہ اندیش نہ بنو اور صرف آج کی فکر میں نہ رہو اگرچہ دور اندیشی اور انجام کار پر نظر رکھنے میں بہت مشکلات ہیں اور کوتاہ بینی کے نتیجے میں آسائش اور جلدی گزر جانے والے مادی منافع کا حصول ہوتا ہے کیونکہ پہلی کامیابی تو ایک وسیع اور ہمہ گیر کامیابی ہے جب کہ دوسری کامیابی ایک سطحی اور وقتی کامیابی ہے۔

یہ صرف اس زمانے کے مسلمانوں کے لیے درس نہیں ہے بلکہ آج کے مسلمانوں کو بھی اس آسمانی تعلیم سے الہام لینا چاہیے۔ مشکلات پریشانیوں اور طاقت فرسا مصیبتوں کی وجہ سے اصولی پروگرام سے چشم پوشی کر کے غیر اصولی، معمولی اور کم وقت طلب کاموں کے پیچھے ہرگز نہیں جانا چاہیے۔

اگلی آیت میں زیادہ واضح طور پر اس مطلب سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس پروگرام کا (مسلمانوں کی میدان بدر میں فوجِ دشمن سے مڈ بھیڑ کا) اصلی ہدف اور مقصد یہ تھا کہ حق یعنی توحید، اسلام، عدالت اور انسانی آزادی خرافات قید و بند اور مظالم کے چنگل سے آزاد ہو جائے اور باطل یعنی شرک، کفر، بے ایمانی، ظلم اور فساد ختم ہو جائے اگرچہ مجرم مشرکین اور مشرک مجرمین اسے پسند نہ کریں (لیحق الحق و یبطل الباطل ولو کرہ المجرمون)۔

کیا یہ آیت گزشتہ آیت کے مفہوم کی تاکید کرتی ہے جیسا کہ پہلی نظر میں دکھائی دیتا ہے یا اس کا کوئی نیا مفہوم ہے اس سلسلے میں بعض مفسرین نے مثلاً فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں اور صاحب المنار نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ لفظ "حق" گزشتہ آیت میں جنگ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی کی طرف اشارہ ہے لیکن یہی لفظ دوسری آیت میں اسلام اور قرآن کی اس کامیابی کی طرف اشارہ ہے جو جنگ بدر میں فوجی کامیابی کے نتیجہ میں حاصل ہوئی ہے۔ اس طرح سے فوجی کامیابی ان خاص حالات میں ہدف، مقصد اور مکتب کی کامیابی کی تمہید تھی۔

یہ احتمال بھی ہے کہ پہلی آیت خدا کے (تشریعی) ارادے کی طرف اشارہ ہو (جو پیغمبرؐ کے فرمان کی صورت میں ظاہر ہوا تھا) اور دوسری آیت اس حکم اور فرمان کے نتیجے کی طرف اشارہ ہو (غور کیجیے گا)

۹۔ إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُمْ بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ۝

۱۰۔ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ

---

[1] دابر ۔ کسی چیز کے عقب اور پچھلے حصے کو کہتے ہیں۔ اس بنا پر قطع دابر کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے معنی میں ہے۔

إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○

۱۱۔ إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِنَ السَّمَاءِ
مَاءً لِيُطَهِّرَكُمْ بِهِ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ
عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ○

۱۲۔ إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلَائِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ آمَنُوا ۚ
سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوا فَوْقَ الْأَعْنَاقِ
وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ○

۱۳۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ وَمَنْ يُشَاقِقِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ○

۱۴۔ ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ وَأَنَّ لِلْكَافِرِينَ عَذَابَ النَّارِ ○

ترجمہ

۹۔ وہ وقت یاد کرو (جب انتہائی پریشانی کے عالم میں میدانِ بدر میں) اپنے پروردگار سے تم مدد چاہ رہے تھے
اور اس نے تمہاری خواہش کو پورا کر دیا (اور کہا) کہ میں تمہاری ایک ہزار ایسے فرشتوں سے مدد کروں گا جو
ایک دوسرے کے پیچھے آ رہے ہوں گے۔

۱۰۔ لیکن خدا نے یہ صرف تمہاری خوشی اور تمہارے اطمینانِ قلب کے لیے کیا ورنہ بغیر خدا کی جانب کے
کامیابی نہیں ہے خدا توانا اور حکیم ہے۔

۱۱۔ وہ وقت یاد کرو جب اونگھ نے جو کہ آرام اور سکون کا سبب تھی خدا کی طرف سے تمہیں گھیر لیا اور آسمان کی
طرف سے تم پر پانی نازل کیا تاکہ اس سے وہ تمہیں پاک کرے اور شیطانی پلیدی تم سے دور کرے اور تمہارے

دلوں کو مضبوط کرے اور تمہیں ثابت قدم بنا دے۔

۱۲۔ وہ وقت یاد کرو جب تیرے پروردگار نے فرشتوں کو وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، جو لوگ ایمان لائے ہیں انہیں ثابت قدم رکھو، میں جلد ہی کافروں کے دل میں خوف اور وحشت ڈال دوں گا۔ ضربیں (دشمنوں کے سروں) گردنوں کے اُوپر لگاؤ اور اُن کے ہاتھ پاؤں بے کار کر دو۔

۱۳۔ یہ اس بناء پر ہے کہ انہوں نے خدا اور اس کے پیغمبر سے دشمنی کی ہے اور جو بھی خدا اور اس کے پیغمبر سے دشمنی کرے گا (وہ سخت سزا پائے گا کہ) خدا شدید العقاب ہے

۱۴۔ یہ (دنیاوی سزا) چکھو اور کافروں کے لیے تو (جہنم کی) آگ کی سزا (دوسرے جہان میں) ہوگی۔

تفسیر

بدر کے تربیتی درس

یہ آیات جنگ بدر کے حساس مواقع کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس خطرناک موقع پر خدا نے مسلمانوں کو جن طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا تھا ان میں ان کی نشاندہی کی گئی ہے تاکہ ان میں اطاعت اور شکر گزاری کا جذبہ ابھارا جائے اور ان کے سامنے آئندہ کی کامیابیوں کا راستہ کھول دیا جائے۔

پہلے فرشتوں کی مدد کا ذکر ہے، ارشاد ہوتا ہے: وہ وقت یاد کرو جب دشمن کی کثرتِ تعداد اور ان کے زیادہ جنگی ساز و سامان سے وحشت و اضطراب کے باعث تم نے خدا کی پناہ لی اور دستِ حاجت اس کی طرف دراز کیا اور اس سے مدد کی درخواست کی (اذ تستغیثون ربکم)۔

کچھ روایات میں آیا ہے کہ خدا سے استغاثہ اور مدد طلب کرنے میں رسول اللہؐ بھی مسلمانوں کے ساتھ ہم آواز تھے آپؐ نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر رکھے تھے اور کہہ رہے تھے:

اللّٰھم انجزلی ما وعدتنی اللّٰھم ان تھلک ھٰذہ العصابۃ لاتعبد فی الارض۔

خدایا! مجھ سے جو تو نے وعدہ کیا تھا اُسے پورا کر دے۔ پروردگار! اگر مومنین کا یہ گروہ مارا گیا تو زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

آپؐ نے اس استغاثہ اور دعا کو اتنا طول دیا کہ عبا آپ کے دوش مبارک سے گر گئی ہے[1]

[1] حاشیہ بر صفحہ آئندہ

اس وقت خدا نے تمہاری دعا اور درخواست کو قبول کر لیا اور فرمایا کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری نصرت کروں گا جو ایک دوسرے کے پیچھے آرہے ہوں گے (فاستجاب لکم انی ممدکم بالف من الملئکة مردفین)۔ "مردفین" کا مادہ "ارداف" ہے، اس کا معنی ہے ایک دوسرے کے پیچھے ہونا۔ اس بنا پر اس لفظ کا مفہوم یہ ہوگا کہ فرشتے ایک دوسرے کے پیچھے مسلمانوں کی مدد کے لیے آئے تھے۔ آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی پیش کیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ یہ ایک ہزار کا دستہ تھا اور دیگر دستے اس کے پیچھے تھے اس طرح سے سورہ آل عمران کی آیہ ۱۲۴ بھی اس مفہوم پر منطبق ہو جاتی ہے جس میں ہے کہ پیغمبر نے مومنین سے کہا:

کیا یہ کافی نہیں ہے کہ خدا نے تمہاری تین ہزار فرشتوں کے ساتھ مدد کی۔

لیکن ظاہر یہ ہے کہ جنگ بدر میں فرشتوں کی تعداد ایک ہزار تھی اور "مردفین" اس ایک ہزار کی صفت ہے۔ سورہ آل عمران کی آیت مسلمانوں سے ایک خدائی وعدہ تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو خدا مزید تمہاری مدد کے لیے بھیجے گا۔

اس کے بعد کہیں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ کامیابی فرشتوں یا ان جیسوں کے ہاتھ میں ہے، فرمایا گیا ہے: خدا نے ایسا صرف بشارت کے طور پر اور تمہارے اطمینان قلب کے لیے کیا (وما جعله الله الا بشری ولتطمئن به قلوبکم)۔ ورنہ کامیابی تو صرف خدا کی طرف سے ہے اور ان ظاہری اور باطنی اسباب کے اوپر اس کا ارادہ اور مشیت ہے (وما النصر الا من عند الله)۔ کیونکہ خدا ایسا قادر و قوی ہے کہ کوئی بھی اس کے ارادہ اور مشیت کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا اور ایسا حکیم و دانا ہے کہ اس کی مدد اہل افراد کے علاوہ کسی کو نہیں پہنچتی (ان الله عزیز حکیم)۔

کیا فرشتوں نے جنگ کی تھی؟

مفسرین کے درمیان اس سلسلے میں بہت اختلاف ہے۔

بعض کا نظریہ ہے کہ فرشتے باقاعدہ معرکۂ جنگ میں شریک ہوئے تھے اور انہوں نے ایسے ہتھیاروں سے دشمن کے لشکر پر حملہ کیا جو انہی سے مخصوص تھے۔ انہوں نے ان میں سے کچھ افراد کو ڈھیر کر دیا۔ اس سلسلے میں ان مفسرین نے کچھ روایات بھی نقل کی ہیں۔

کچھ قرائن ایسے بھی ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ دوسرے گروہ کا نظریہ حقیقت کے زیادہ قریب ہے جو کہتے ہیں کہ فرشتے صرف مومنین کی دلجوئی اور روحانی تقویت کے لیے نازل ہوئے تھے ــــ کیونکہ

۱۔ ہم مندرجہ بالا آیت میں پڑھ چکے ہیں کہ فرمایا گیا ہے: یہ سب کچھ تمہارے اطمینان قلب کے لیے تھا تاکہ اس پشت پناہی کے احساس سے بہتر طور پر جنگ کر سکو، نہ یہ کہ فرشتوں نے جنگ کے لیے قدم بڑھایا۔

۲۔ اگر فرشتوں نے براہ راست جنگ سے دشمن کے سپاہیوں کو چت کر دیا تو مجاہدین بدر کی کونسی فضیلت باقی رہ جاتی ہے جو روایات میں جسے زور و شور سے بیان کی گئی ہے۔

۳۔ بدر میں دشمن کے مقتولین کی تعداد ستر افراد ہے۔ اس میں سے ایک بڑا حصہ حضرت علیؑ کی تلوار سے قتل ہوا اور باقی

حاشیہ صفحہ ہذا۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

دیگر مجاہدین اسلام کے ہاتھوں قتل ہوا۔ ان مجاہدین میں سے بیشتر کے نام تاریخ میں مذکور ہیں اس بنا پر فرشتوں کے لیے کونسے باقی رہ جاتے ہیں اور انہوں نے کتنے افراد قتل کیے۔

اس کے بعد خدا تعالیٰ مومنین کو اپنی دوسری نعمت یاد دلاتے ہوئے فرماتا ہے: وہ وقت یاد کرو جب تمہیں اونگھ نے گھیر لیا جو خدا کی طرف سے تمہارے جسم و روح کے لیے باعث سکون تھی (اذ یغشیکم النعاس امنۃ منہ)۔ "یغشی" "غشیان" کے مادہ سے ہے، اس کا معنی ہے ڈھانپنا اور احاطہ کرنا۔ گویا نیند ایک پردے کی طرح ان پر ڈال دی گئی اور اس نے انہیں ڈھانپ لیا۔ "نعاس" نیند کی ابتدا (اونگھ) یا تھوڑی اور ہلکی سی آرام بخش نیند کو کہا جاتا ہے اور شاید یہ اس طرف اشارہ ہے کہ عین استراحت کے باوجود اس طرح گہری نیند تم پر مسلط نہیں ہوئی کہ دشمن موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تم پر شب خون مارے۔ اس طرح مسلمانوں نے اس پُر اضطراب رات میں اس عظیم نعمت سے فائدہ اٹھایا جس نے اگلے روز میدان جنگ میں ان کی بڑی مدد کی۔

تیسری نعمت جو اس میدان میں تمہیں عطا کی گئی یہ تھی کہ آسمان سے تم پر پانی برسایا (و ینزل علیکم من السماء ماء)۔ تاکہ اس کے ذریعے تمہیں پاک کرے اور شیطانی نجاست تم سے دور کردے (لیطھرکم بہ و یذھب عنکم رجز الشیطان)۔ یہ نجاست ہو سکتا ہے شیطانی وسوسے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس شب بعض کے جنب ہو جانے کی وجہ سے جسمانی ناپاکی ہو یا ممکن ہے دونوں قسم کی نجاست ہو۔

بہر حال اس حیات بخش پانی نے جو بدر کے اطراف کے گڑھوں میں جمع ہو گیا تھا۔ دشمن نے کنوئیں اپنے قبضے میں لے رکھے تھے اور مسلمانوں کو طہارت اور پینے کے لیے پانی کی سخت ضرورت تھی۔ اس حالت میں بارش کے اس پانی نے ان سب نجاستوں کو دھو ڈالا اور انہیں بہا لے گیا۔

علاوہ ازیں خدا چاہتا تھا کہ اس نعمت کے ذریعے تمہارے دلوں کو محکم کرے (ولیربط علی قلوبکم)، نیز چاہتا تھا کہ یہ ریتلی زمین جس میں تمہارے پاؤں دھنس جاتے تھے اور پھسل جاتے تھے بارش کے برسنے کی وجہ سے مضبوط ہو جائے تاکہ تمہارے قدم مضبوط ہو جائیں (و یثبت بہ الاقدام)۔

یہ احتمال بھی ہے کہ ثابت قدمی سے مراد روح کی تقویت اور جوش و ولولہ میں اضافہ ہو یا ہو سکتا ہے دونوں چیزیں مراد ہوں۔

مجاہدین بدر پر پروردگار کی نعمتوں میں سے ایک نعمت وہ خوف و ہراس تھا جو دشمنوں کے دلوں میں ڈال دیا گیا تھا جس نے ان کے حوصلوں کو متزلزل کر رکھا تھا۔ اس سلسلے میں ارشاد ہوتا ہے: وہ وقت یاد کرو جب خدا نے فرشتوں کی طرف وحی بھیجی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اور تم اہل ایمان کو تقویت دو اور انہیں ثابت قدم رکھو (اذ یوحی ربک الی الملٰئکۃ انی معکم فثبتوا الذین اٰمنوا) اور عنقریب میں کافروں کے دلوں میں خوف اور وحشت ڈال دوں گا (سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب)۔

واقعاً یہ عجیب و غریب بات تھی کہ تواریخ کے مطابق مسلمانوں کے چھوٹے سے لشکر کے مقابلے قریش کی طاقتور فوج نفسیاتی طور پر اس قدر شکست خوردہ ہو چکی تھی کہ ان میں سے ایک گروہ مسلمانوں سے جنگ کرنے سے ڈرتا تھا۔ بعض اوقات وہ دل میں سوچتے کہ یہ عام انسان نہیں ہیں۔ بعض کہتے کہ یہ موت کو اپنے اونٹوں پر لاد کر مدینے سے تمہارے لیے سوغات لائے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دشمن کے دل میں یہ خوف ڈالنا کہ جو کامیابی کے عوامل میں سے ایک مؤثر عامل ہے، بلاوجہ نہ تھا۔ مسلمانوں کی

وہ پامردی، ان کی نماز جماعت، ان کے حرارت بخش شعار اور سچے مومنین کا اظہارِ وفاداری، سب کچھ اپنی تاثیر مرتب کر رہا تھا۔
سعد بن معاذ انصار کے نمائندہ کے طور پر خدمتِ پیغمبرؐ میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے:

میرے ماں باپ آپ پر قربان اے اللہ کے رسول! ہم آپ پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے آپ کی نبوت کی گواہی دی ہے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں خدا کی طرف سے ہے۔ آپ جو بھی حکم دینا چاہیں دیجیے اور ہمارے مال میں جو کچھ آپ چاہیں لے لیں۔ خدا کی قسم اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ اس دریا (دریائے احمر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو وہاں سے قریب تھا) کود پڑو تو ہم کود پڑیں گے۔ ہماری یہ آرزو ہے کہ خدا ہمیں توفیق دے کہ ایسی خدمت کریں جو آپ کی آنکھ کی روشنی کا باعث ہو۔

جی ہاں ایسی گفتگو جو دوست اور دشمن میں پھیل جاتی تھی، اس استقامت کے علاوہ جو وہ پہلے ہی کئی میں مسلمان مردوں اور عورتوں میں دیکھ چکے تھے ــــ سب باتیں اکٹھی ہو گئیں اور اس سے دشمن وحشت زدہ ہو گیا۔

دشمن کی طرف سخت آندھی چل رہی تھی، اُن پر موسلا دھار بارش برس رہی تھی، ملائکہ کے وحشت ناک خواب کا بھی مکہ میں چرچا ہو چکا تھا، یہ اور دوسرے عوامل مل کر انہیں خوف زدہ کیے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے میدانِ بدر میں پیغمبرِ اکرمؐ کے ذریعے مسلمانوں کو جو پیغام دیا تھا وہ انہیں یاد دلایا جا رہا ہے اور وہ یہ کہ: مشرکین سے جنگ کرتے وقت غیر موثر ضربوں سے پرہیز کرو اور انہیں ضائع نہ کرو بلکہ دشمن پر کاری ضربیں لگاؤ "گردن سے اوپر ان کے مغز اور سر پر ضرب لگاؤ" (فاضربوا فوق الاعناق)۔ اور ان کے ہاتھ پاؤں بیکار کر دو" (واضربوا منهم كل بنان)۔

"بنان" "بنانة" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ہاتھ یا پاؤں کی انگلی کی پور۔ خود انگلی کو بھی "بنانة" کہتے ہیں۔ زیرِ بحث آیت میں ہو سکتا ہے ہاتھ اور پاؤں کے لیے کنایہ کے طور پر یہ لفظ آیا ہو اور یا پھر اپنے اصلی معنی میں ہو۔ کیونکہ اگر ہاتھ کی انگلیاں کٹ جائیں اور بے کار ہو جائیں تو انسان ہتھیار اٹھانے کے قابل نہیں رہتا اور اگر پاؤں کی انگلیاں کٹ جائیں تو چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رہتی۔
یہ احتمال بھی ہے کہ اگر حملہ آور دشمن پیادہ ہو تو اس کے سر کو نشانہ بناؤ اور اگر سوار ہو تو اس کے ہاتھ پاؤں کو۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ بعض اس جملے کو ملائکہ سے خطاب سمجھتے ہیں لیکن قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ اس میں مخاطب مسلمان ہی ہیں اور اگر فرشتے بھی مخاطب ہوں تو ہو سکتا ہے کہ دماغ اور ہاتھ پاؤں پر ضرب لگانے سے مراد یہ ہو کہ ان پر ایسا خوف طاری کر دو کہ کام کرتے ہوئے ان کے ہاتھ پاؤں شل ہو جائیں اور سر نیچے جھک جائیں (البتہ یہ تفسیر ظاہر عبارت کے خلاف ہے اور ملائکہ کے جنگ نہ کرنے کے بارے میں جو قرائن بیان کیے جا چکے ہیں اسی کو ثابت سمجھنا چاہیے)۔

ان تمام باتوں کے بعد اس بنا پر کہ کوئی ان سخت فرامین اور سرکوبی کرنے والے ان لازمی و قطعی احکام کو آئینِ جوانمردی اور رحم و انصاف کے خلاف تصور نہ کرے فرمایا گیا ہے: وہ اس چیز کے مستحق ہیں کیونکہ وہ خدا اور اس کے پیغمبر کے سامنے عداوت، دشمنی، نافرمانی اور سرکشی پر اُتر آئے ہیں (ذلك بانهم شاقوا الله ورسوله)۔

"شاقوا" "شقاق" کے مادہ سے ہے۔ اس کا معنی ہے شگاف اور جدائی اور چونکہ مخالف دشمن اور معصیت کار اپنی صف جدا کر لیتا ہے لہٰذا اس کے عمل کو شقاق کہتے ہیں اور جو شخص بھی خدا اور پیغمبر کی مخالفت کے دروازے سے داخل ہو گا وہ دنیا اور آخرت

میں دردناک سزا میں گرفتار ہوگا کیونکہ (جس طرح اس کی رحمت وسیع اور لامتناہی ہے) اس کی سزا بھی شدید اور دردناک ہے (ومن یشاقق اللہ ورسولہ فان اللہ شدید العقاب)۔

اس کے بعد اس امر کی تاکید کے لیے ارشاد ہوتا ہے: اس دنیا کی سزا کا مزہ چکھو، میدان جنگ میں کاری ضربوں، قتل، قید اور شکست کی سزا بھگتو اور دوسرے جہان کی سزا کے منتظر رہو (کیونکہ جہنم کی) آگ کا عذاب کافروں کے انتظار میں ہے (ذٰلکم فذوقوہ و ان للکٰفرین عذاب النار)۔

۱۵۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَۚ ○

۱۶۔ وَ مَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَىٕذٍ دُبُرَهٗۤ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ○

۱۷۔ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ۪ وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰىۚ وَ لِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًاؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○

۱۸۔ ذٰلِكُمْ وَ اَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَیْدِ الْكٰفِرِیْنَ ○

ترجمہ

۱۵۔ اے ایمان والو! جب میدانِ جنگ میں کافروں کا سامنا کرو تو ان سے پشت نہ پھیرو۔

۱۶۔ اور جو شخص اس وقت ان سے پیٹھ پھیرے گا مگر یہ کہ اس کا مقصد میدان سے پلٹ کر نیا حملہ کرنا ہو یا (مجاہدین کے گروہ سے ملنا ہو تو) ایسا شخص (غضبِ پروردگار میں گرفتار ہوگا اور اس کی قرارگاہ جہنم ہے اور یہ کیسی بری جگہ ہے

۱۷۔ یہ تم نہ تھے جنہوں نے انہیں قتل کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا ہے اور (اے پیغمبر!) یہ تو نہ تھا کہ جس نے ان

کے چہروں پر مٹی پھینکی) بلکہ خدا نے پھینکی تھی اور خدا چاہتا تھا کہ وہ مومنین کو اس طرح اچھی طرح سے آزمائے اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۱۸۔ مومنین اور کافرین کی سرنوشت یہی تھی جو تم نے دیکھ لی اور خدا کفار کی سازشوں کو کمزور کرنے والا ہے۔

تفسیر

جہاد سے فرار ممنوع ہے

جیسا کہ گذشتہ آیات کی تفسیر میں اشارہ ہو چکا ہے کہ جنگ بدر کی کامیابی اور خدا کی اور بہت سی نعمتیں جو اس نے اولین مسلمانوں پر اس واقعہ میں کی تھیں تاکہ وہ گذشتہ اور آئندہ کے حوالے سے ان سے سبق حاصل کریں لہٰذا زیر نظر آیات میں روئے سخن مومنین کی طرف کرتے ہوئے ان سے ایک عمومی جنگی اصول اور حکم نصیحت اور تاکید کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے : اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو جب بھی میدان جنگ میں کافروں سے تمہارا آمنا سامنا ہو تو انہیں پشت نہ دکھاؤ اور راہ فرار اختیار نہ کرو (یاایها الذین اٰمنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفًا فلا تولوهم الادبار)۔

" لقیتم " لقاء کے مادہ سے اجتماع اور روبرو ہونے کے معنی میں ہے لیکن اکثر مواقع پر میدان جنگ میں آمنا سامنا ہونے کے معنی میں آیا ہے۔

" زحف " اصل میں کسی چیز کی طرف حرکت کرنے کے معنی میں ہے اس طرح سے کہ پاؤں زمین کی طرف کھنچے چلے جائیں جیسے بچہ ٹھیک طرح سے چلنے پھرنے سے پہلے چلنے کی کوشش کرتا ہے یا جیسے اونٹ جب تھک جاتا ہے تو اپنے پاؤں زمین پر کھینچتا ہے۔ بعد ازاں کثیر تعداد والے لشکر کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگا کیونکہ دور سے یوں لگتا ہے جیسے زمین پر گھسٹتا ہوا آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں لفظ " زحف " اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ دشمن تعداد اور ساز و سامان کے لحاظ سے تم سے بڑھ کر ہو اور تم اقلیت میں ہو پھر بھی تمہیں میدان جنگ سے فرار نہیں کرنا چاہیے جیسے میدان بدر میں دشمنوں کی تعداد تم سے کئی گنا زیادہ تھی اور تم نے ثابت قدمی دکھائی اور بالآخر کامیاب ہو گئے۔ اصولی طور پر جنگ سے بھاگنا اسلام میں ایک بہت بڑا گناہ شمار ہوتا ہے۔ قرآن کی بعض آیات پر توجہ کی جائے تو زیادہ سے زیادہ ان میں یہ بات اس امر سے مشروط ہے کہ دشمن کا لشکر زیادہ سے زیادہ مسلمانوں سے دوگنا ہو اس کے بارے میں اسی سورہ کی آیت ۶۵ و ۶۶ کے ذیل میں انشاء اللہ بحث کی جائے گی۔

اسی بناء پر اگلی آیت میں بعض مواقع کے استثناء کے ساتھ میدان جنگ سے پیٹھ پھیرنے والوں کے بارے میں کہا گیا ہے جو لوگ دشمن سے جنگ کرتے وقت ان سے پشت پھیریں مگر یہ کہ یہ کنارہ کشی کسی جنگی چال کے لیے ہو یا مسلمان گروہ سے مل کر لڑنے کے لیے ہو تو ایسے لوگ اللہ کے غضب میں گرفتار ہوں گے (ومن یولهم یومئذ دبره الا متحرفًا لقتال او متحیزًا الی فئة فقد باء بغضب من الله)۔

جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ فرار کے معاملے میں اس آیت میں دو استثنائی صورتیں بیان کی گئی ہیں جو ظاہری طور پر فرار ہیں لیکن دراصل مقابلے اور جہاد کی صورتیں ہیں۔

پہلی صورت کو "متحرفاً لقتال" کہا گیا ہے۔ "تحرف" کے مادہ سے ہے اس کا معنی ہے درمیان سے اطراف کی طرف ہٹنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سپاہی ایک جنگی تکنیک کے طور پر دشمن کے مقابلے سے بھاگ کھڑے ہوں اور ایک طرف ہٹ جائیں تاکہ اُسے اپنے پیچھے کھینچ لائیں اور اسے غفلت میں ڈال کر اس کے پیکر پر اچانک ضرب لگائیں یا جنگ اور بھاگنے کی تکنیک سے دشمن کو تھکا دیں کیونکہ جنگ میں کبھی حملہ کیا جاتا ہے اور کبھی نئے حملے کے لیے پیچھے ہٹ آنا پڑتا ہے عرب کے بقول ــــ الحرب کر وفر ــــ یعنی جنگ جھپٹنے اور پلٹنے کا نام ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سپاہی میدان میں اپنے آپ کو اکیلا پائے اور دیگر فوجی سپاہیوں سے ملنے کے لیے پیچھے ہٹ آئے اور ان سے مل جانے کے بعد حملہ شروع کرے۔

بہرحال میدان سے بھاگنے کی حرمت کی خشک صورت میں تفسیر نہیں کی جانا چاہیے کہ جس سے جنگی حکمتِ عملی اور تدابیر ہی ختم ہو جائیں کیونکہ جنگی تدابیر بہت سی کامیابیوں کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، جنگ سے بھاگ جانے والے نہ صرف غضبِ الٰہی کا شکار ہوں گے بلکہ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیسی بُری جگہ ہے (وماوٰه جهنم وبئس المصير)۔

"باء" "بواء" کے مادہ سے مراجعت اور جگہ لینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے اصل معنی ہیں کسی مقام یا مکان کو صاف و شفاف اور ہموار کرنا چونکہ انسان جب کوئی مکان لیتا ہے تو اپنی جگہ صاف اور ہموار کرتا ہے لہٰذا یہ لفظ اس مفہوم میں آیا ہے اور اسی طرح چونکہ انسان اپنی رہائش گاہ کی طرف پلٹ کر آتا ہے لہٰذا بازگشت اور لوٹ آنے کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ پروردگار کا مسلسل اور دائمی غضب ان کے شاملِ حال رہے گا گویا انہوں نے غضبِ الٰہی میں گھر بنا لیا ہے۔

"مأوىٰ" اصل میں "پناہ گاہ" کے معنی میں ہے اور یہ جو مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ جہاد سے بھاگنے والوں کا "مأویٰ" جہنم ہے تو یہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے بھاگ کر اپنے لیے کوئی پناہ گاہ ڈھونڈتے ہیں تاکہ ہلاکت سے محفوظ رہیں لیکن (ان کی خواہش کے) برعکس ان کی پناہ گاہ جہنم ہوگی، نہ صرف دوسرے جہان میں بلکہ وہ اس جہان میں بھی ذلت، بدبختی، شکست اور محرومیت کی جلانے والی جہنم کی پناہ میں ہوں گے۔

اسی لیے کتاب عیون الاخبار میں ہے کہ امام علیؑ بن موسیٰ الرضاؑ کے ایک صحابی نے بہت سے احکام کے فلسفے کے بارے میں سوال کیا، اس میں اس نے جہاد سے فرار کی حرمت کے فلسفے کے بارے میں بھی پوچھا، اس سلسلے میں آپؑ نے تحریر فرمایا:

> جہاد سے فرار کو خدا نے اس لیے حرام قرار دیا ہے کیونکہ یہ دین کی کمزوری اور تنزلی کا سبب اور انبیاء ائمہ اور عادل پیشواؤں کے پروگرام کی تحقیر و تذلیل کا باعث ہوتا ہے، نیز اس کے سبب مسلمان دشمن پر کامیابی حاصل نہیں کر پاتے اور دشمن کو توحیدِ پروردگار، اجرائے عدالت اور ترکِ ظلم و فساد کی دعوت کی مخالفت پر سزا نہیں دے سکتے اور اس

کے سبب دشمن مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ جسور اور بے باک ہو جائیں گے یہاں تک کہ مسلمان ان کے ہاتھوں قتل ہوں گے اور قید ہوں گے اور آخرکار اللہ کا دین صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔[1]

حضرت علی علیہ السلام کو جو بہت سے امتیازات حاصل تھے اور آپ کبھی کبھار دوسروں کی تشویق کے لیے جن کی طرف اشارہ کرتے تھے ان میں سے ایک میدانِ جنگ سے فرار نہ کرنا بھی تھا۔ آپ فرماتے ہیں۔

انی لم افر من الزحف قط ولم یبارزنی احد الا سقیت الارض من دمہ۔

(حالانکہ میں نے اپنی پوری زندگی میں بہت سی جنگوں میں شرکت کی ہے لیکن) میں نے دشمن کی فوج کے سامنے سے کبھی فرار نہیں کیا اور کوئی شخص میدانِ جنگ میں میرے سامنے نہیں آیا مگر یہ کہ میں نے اس کے خون سے زمین کو سیراب کر دیا۔[2]

تعجب کی بات ہے کہ بعض اہل سنت مفسرین اس بات پر مصر ہیں کہ زیر بحث آیت کا حکم جنگ بدر سے مخصوص تھا اور یہ تہدید و سرزنش جو جہاد سے فرار کرنے والوں کے بارے میں ہے صرف بدر کے مجاہدین سے مربوط ہے حالانکہ نہ صرف آیت کے لیے اختصاص کی کوئی دلیل موجود نہیں بلکہ آیت کا مفہوم تمام جنگ کرنے والوں اور تمام مجاہدین کے لیے عمومی ہے۔ نیز آیات و روایات کے قرائن بھی اس امر کی تائید کرتے ہیں (البتہ اس اسلامی حکم کی کچھ شرائط ہیں جن کا تذکرہ اسی سورہ کی آئندہ آیات میں آئے گا)۔

اس کے بعد اس بناء پر کہ مسلمان جنگ بدر کی کامیابی پر مغرور نہ ہوں اور صرف اپنی جسمانی قوت و طاقت پر بھروسہ نہ کرنے لگ جائیں بلکہ ہمیشہ اپنے قلب و روح کو یادِ الٰہی اور نصرتِ خدا سے گرم اور روشن رکھیں ارشاد فرمایا گیا ہے: میدان بدر میں تم نے دشمن کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا ہے (فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم)۔

اور اے پیغمبر! ان کے چہروں پر تو نے مٹی اور ریت نہیں پھینکی بلکہ خدا نے پھینکی ہے (وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی)۔

اسلامی روایات میں ہے اور مفسرین نے بیان کیا ہے کہ روز بدر رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

زمین سے مٹی اور سنگریزوں کی ایک مٹھی بھر کے مجھے دے دو۔

حضرت علیؑ نے ایسا ہی کیا اور رسولِ خداؐ نے اسے مشرکین کی طرف پھینک دیا اور فرمایا:

شاھت الوجوہ

تمہارے منہ قبیح اور سیاہ ہو جائیں۔

لکھا ہے کہ معجزانہ طور پر وہ گرد و غبار اور سنگریزے دشمنوں کی آنکھوں میں جا پڑے اور وہ سب وحشت زدہ ہو گئے۔

اس میں شک نہیں کہ ظاہراً یہ سب کام رسول اللہؐ نے اور مجاہدین بدر نے انجام دیئے لیکن یہ جو کہا گیا ہے کہ تم نے یہ کام نہیں کیا یہ

---

[1] نورالثقلین، جلد ۲ صفحہ ۱۳۸۔

[2] نورالثقلین، جلد ۲ صفحہ ۱۳۹۔

اس طرف اشارہ ہے کہ:

اوّل تو وہ جسمانی، روحانی اور ایمانی طاقت کہ جو اس سارے معاملے کا سرچشمہ تھی، تمہیں خدا کی طرف سے بخشی گئی تھی اور تم نے اس راستے میں خدا کی بخشی ہوئی طاقت سے قدم اٹھایا۔

دوم یہ کہ میدانِ بدر میں پراعجاز حوادث ظاہر ہوئے کہ جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، یہی مجاہدینِ اسلام کی روحانی تقویت اور دشمنوں کی نفسیاتی شکست کا سبب بنے یہ غیر معمولی امور اور اثرات خدا کی طرف سے ہی تھے۔

درحقیقت یہ آیت اس نظریے کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ:

لا جبر ولا تفویض بل امر بین الامرین

یعنی ــــ نہ جبر ہے اور نہ تفویض اور مکمل سپردگی بلکہ معاملہ ان دونوں کے درمیان ہے۔

جیسے دشمنوں کو قتل کرنے کی نسبت مسلمانوں کی طرف دی گئی اور مٹی پھینکنے کی نسبت پیغمبر کی طرف دی گئی ہے اور ساتھ ہی ان سے یہ نسبت سلب بھی کر لی گئی ہے (غور کیجئے گا)

اس میں شک نہیں کہ ایسی عبارتوں میں کوئی تناقض نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ یہ کام تمہارا کام بھی ہے اور خدا کا کام بھی ــــ تمہارا اس وجہ سے کہ تمہارے ارادے سے انجام پایا ہے اور خدا کا اس لیے کہ قوت اور مدد اس کی طرف سے ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو خیال کرتے ہیں کہ یہ آیت نظریۂ جبر کی دلیل ہے ان کا جواب خود نفسِ آیت میں پنہاں ہے۔

"وحدت وجود" کے نظریے کے قائل جو افراد اس آیت کو اپنے نظریے کی دستاویز کے طور پر پیش کرتے ہیں، ان کا جواب بھی خود آیت میں لطیف انداز میں موجود ہے کیونکہ اگر خدا اور مخلوق ایک ہی ہیں تو پھر ایک شکل میں فعل کی نسبت ان کے لیے ثابت اور دوسری صورت میں نہیں کی جا سکتی۔ یہ نفی و اثبات خود خالق و مخلوق کے تعدد کی دلیل ہے اور اگر اپنی فکر کو پہلے سے کیے گئے نادرست اور تعصب آمیز فیصلوں سے خالی کر لیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ اس آیت کا کسی بھی انحرافی اور ٹیڑھے مکتب اور نظریے سے کوئی تعلق نہیں بلکہ مکتب واسطہ اور "امر بین الامرین" کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ بھی ایک تربیتی مقصد کے لیے یعنی آثارِ غرور ختم کرنے کے لیے جو عموماً کامیابیوں کے بعد انسانوں کو دامن گیر ہو جاتے ہیں۔

آیت کے آخر میں ایک اور اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ میدانِ بدر مسلمانوں کے لیے ایک آزمائش کا میدان تھا اور خدا چاہتا تھا کہ مومنین کو اپنی طرف سے اس کامیابی کے ذریعے آزمائے (و لیبلی المؤمنین منه بلآء حسنا)۔

"بلآء" دراصل آزمائش کرنے کے معنی میں ہے البتہ آزمائش کبھی نعمتوں کے ذریعے ہوتی ہے جسے "بلآء حسن" کہتے ہیں اور کبھی مصیبتوں اور سختیوں کے ذریعے ہوتی ہے جسے "بلاء سیء" کہتے ہیں جیسا کہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے:

و بلونا هم بالحسنات و السيئات

انہیں ہم نے نعمتوں اور مصیبتوں کے ذریعے آزمایا۔ (اعراف ـ ۱۶۸)۔

خدا چاہتا تھا کہ طاقتور دشمن سے پہلے مسلح تصادم میں مسلمانوں کو کامیابی کا لطف عطا کرے تاکہ وہ آئندہ کے لیے پُرامید اور پُرحوصلہ ہو سکیں۔

آزمائش کی صورت میں یہ الٰہی نعمت سب کے لیے تھی اور انہیں اس کامیابی سے کبھی منفی نتیجہ نہیں لینا چاہیئے اور غرور و تکبر میں گرفتار نہیں ہونا چاہیے کہ کہیں وہ دشمن کو معمولی سمجھنے لگیں اور خود سازی اور تیاری کا عمل چھوڑ دیں اور لطف پروردگار پر بھروسہ کرنے میں غفلت کرنے لگیں۔ لہٰذا آیت کو اس جملے پر تمام کیا گیا ہے، خدا سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی (ان اللہ سمیع علیم)۔ یعنی خدا نے پیغمبر اور مومنین کی صدائے استغاثہ سنی اور وہ ان کی صدقِ نیت و اخلاص سے آگاہ اور باخبر تھا۔ اسی لیے اس نے سب پر اپنا لطف فرمایا اور انہیں دشمن پر کامیاب کیا آئندہ بھی خدا مسلمانوں کے اخلاص نیت اور ہمدردی و استقامت کے مطابق ہی ان سے سلوک کرے گا مخلص اور مجاہد مومن آخرکار کامیاب ہوں گے اور دکھاوا کرنے والے ریاکار اور مرف باتیں کرنے والے بے عمل شکست کھا جائیں گے۔

بعد والی آیت میں اسی امر کی تاکید اور اظہارِ عمومیت کے لیے فرمایا گیا ہے، مومنین اور کافرین کا انجام وہی تھا جو تم نے سن لیا ہے (ذٰلکم)[1]

اس کے بعد علت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے، اللہ کفار کی سازشوں کو مومنین کے مقابلے میں کمزور کر دیتا ہے تاکہ انہیں اور ان کے پروگراموں کو کوئی نقصان اور زد نہ پہنچا سکیں (وان اللہ موھن کید الکافرین)۔

۱۹۔ اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَ اِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ اِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّ لَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۹۔ اگر تم فتح و کامرانی چاہتے ہو تو وہ تمہاری طرف آئی ہے اور اگر مخالفت سے اجتناب کرو تو تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر لوٹ آؤ تو ہم بھی پلٹ آئیں گے (اور اگر اپنی مخالفتیں جاری رکھو گے تو ہم تمہیں دشمن کے سامنے کریں گے) اور تمہاری جمعیت چاہے کتنی زیادہ کیوں نہ ہو وہ تمہیں (خدائی مدد سے) بے نیاز نہیں کر سکتی اور خدا مومنین کے ساتھ ہے۔

---

[1] یہ جملہ درحقیقت یہ ہے: ذٰلکم الذی سمعتم ھو حال المؤمنین والکافرین

تفسیر

اس سلسلے میں کہ مندرجہ بالا آیت میں رُوئے سخن کن افراد کی طرف ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ اس میں مشرکین مخاطب ہیں کیونکہ وہ میدانِ بدر کی طرف آنے سے پہلے خانہ کعبہ کے پاس گئے انہیں زعم تھا کہ وہ حق پر ہیں، اس لیے وہ غرور میں مبتلا تھے، خانہ کعبہ کے پردے کو پکڑ کر کہنے لگے:

اللّٰھم انصر اعلی الجندین و اھدی الفئتین و اکرم الحزبین۔

خدایا! ان دو لشکروں میں سے جو برتر، ہدایت یافتہ تر اور معزز تر ہے اسے کامیابی عطا کر۔[1]

نیز منقول ہے کہ ابوجہل نے اپنی دعا میں کہا:

خداوندا ہمارا دین پرانا اور قدیمی ہے لیکن محمدؐ کا دین تازہ اور خام ہے ان دونوں میں سے جو بھی تیرے نزدیک محبوب تر ہے اس کے پیروکاروں کو کامیابی عطا کر۔[2]

لہٰذا ــــ جنگ بدر کے اختتام پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اُن سے کہا گیا: اگر تم فتح و کامرانی اور دینِ حق کے خواہاں ہو تو محمدؐ کا دین کامیاب ہوا اور اس کی حقانیت تم پر واضح اور آشکار ہوگئی (ان تستفتحوا فقد جاءکم الفتح)۔

اور اگر دینِ شرک سے اور فرمانِ خدا کی مخالفت سے ہاتھ اٹھا لو تو یہ بات تمہارے فائدے میں ہے (و ان تنتھوا فھو خیر لکم)۔ اور اگر تم مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے لوٹ آؤ گے تو ہم بھی تمہاری طرف پلٹ آئیں گے اور مسلمانوں کو کامیاب کریں گے اور تمہیں مغلوب کر دیں گے (و ان تعودوا نعد)۔

اور اپنی تعداد کی زیادتی پر ہرگز غرور نہ کرو کیونکہ تمہاری جمعیت کتنی بھی زیادہ کیوں نہ ہو تمہیں بے نیاز نہیں کر سکتی (و لن تغنی عنکم فئتکم شیئا و لو کثرت)، اور خدا مومنین کے ساتھ ہے (و ان اللّٰہ مع المؤمنین)۔

لیکن اس تفسیر کو ایک بات دُور کر دیتی ہے اور وہ یہ کہ قبل اور بعد کی تمام آیات کا رُوئے سخن مومنین کی طرف ہے اور آیات کے درمیان معنوی تعلق ہے، لہٰذا ان کے درمیان صرف ایک آیت کا رُوئے سخن کفار کی طرف یہ بات بعید نظر آتی ہے لہٰذا بعض مفسرین نے اس میں مومنین کو مخاطب سمجھا ہے۔ اس لحاظ سے بہترین تفسیر یہ بنتی ہے کہ بعض نئے اور ضعیف الایمان مسلمانوں کے درمیان جنگی اموالِ غنیمت کی تقسیم کے بارے میں جھگڑا ہو گیا تو یہ آیات نازل ہوئیں اور انہیں سرزنش کی اور اموالِ غنیمت پورے کے پورے پیغمبرؐ کے اختیار اور ملکیت میں دے دیئے۔ آپ نے بھی مساوی طور پر انہیں تمام مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد مومنین کی تربیت کے لیے انہیں جنگ بدر کے واقعات یاد دلائے گئے ہیں کہ کس طرح سے خدا تعالیٰ نے انہیں ایک طاقتور

---

[1] تفسیر صافی، آیۂ زیر بحث کے ضمن میں اور تفسیر کبیر از فخر الدین رازی جلد ۱۵ صفحہ ۱۴۲۔

[2] تفسیر مجمع البیان اور دیگر تفاسیر، اسی آیت کے ذیل میں۔

دشمن کے مقابلے میں کامیابی عطا کی۔

یہ آیت بھی اسی مطلب کا تکرار کر رہی ہے کہ اگر تم مسلمانوں نے خدا سے فتح و کامیابی کا تقاضا کیا تو خدا نے تمہاری دعا کو قبول کرلیا اور تم کامیاب ہوگئے۔

اور اگر پیغمبر کے سامنے اعتراض کرنے اور باتیں بنانے سے پرہیز کرو تو یہ تمہارے فائدے میں ہے اور اگر تم اپنی اسی اعتراض آمیز روش کی طرف پلٹ گئے تو ہم بھی پلٹ جائیں گے اور تمہیں دشمن کے چنگل میں تنہا چھوڑ دیں گے اور تمہاری جمعیت چاہے کتنی زیادہ کیوں نہ ہو خدائی مدد کے بغیر وہ کوئی کام نہیں کرسکے گی اور خدا تعالیٰ سچے اور اپنے فرمان کے مطیع مومنین اور اپنے پیغمبر کے ساتھ ہے۔

چونکہ خصوصاً آئندہ چند آیات بھی مسلمانوں کو ان کی چند مخالفتوں کی وجہ سے ملامت کر رہی ہیں اور گذشتہ آیات میں بھی ہم نے ایسا ہی دیکھا ہے نیز آیات میں معنوی ربط بھی واضح ہے لہٰذا دوسری تفسیر زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔

۲۰۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ○

۲۱۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ○

۲۲۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ○

۲۳۔ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ۭ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

ترجمہ

۲۰۔ اے ایمان لانے والو! خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور روگردانی نہ کرو جبکہ تم اس کی باتیں سنتے ہو۔

۲۱۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کہتے تھے ہم نے سنا ہے لیکن درحقیقت وہ سنتے نہ تھے۔

۲۲۔ زمین پر چلنے والوں میں سے خدا کے نزدیک بدترین وہ گونگے اور بہرے افراد ہیں جو عقل و فکر نہیں رکھتے۔

۲۳۔ اور اگر خدا ان میں کوئی بھلائی جانتا (تو حق بات) ان کے کانوں تک پہنچاتا لیکن (ان کی موجودہ حالت میں) اگر حق ان کے کانوں تک پہنچاتا ہے تو وہ مخالفت کرتے ہیں اور روگرداں ہوتے ہیں۔

تفسیر

سننے والے بہرے

یہ آیات گذشتہ مباحث کے تسلسل میں آئی ہیں۔ اور یہ مسلمانوں کو جنگ، صلح اور دیگر تمام امور میں پیغمبرِ خدا کی مکمل اطاعت کی دعوت کے سلسلے میں ہیں۔ آیات کا لب و لہجہ نشاندہی کرتا ہے کہ اس سلسلے میں بعض مومنین نے اپنے فرض میں کوتاہی کی تھی۔ لہٰذا پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو (یآیہا الذین اٰمنوا اطیعوا اللہ و رسولہ)۔

دوبارہ تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے اور اس کے حکم کی اطاعت سے کبھی روگردانی نہ کرو جب کہ تم اس کی باتیں اور اوامر و نواہی سنتے ہو (ولا تولوا عنہ و انتم تسمعون)۔

اس میں شک نہیں کہ حکم خدا کی اطاعت سب پر لازم ہے چاہے کوئی مومن ہو یا کافر لیکن چونکہ پیغمبر کے مخاطب اور ان کے تربیتی پروگراموں میں شرکت کرنے والے مومنین تھے لہٰذا یہاں روئے سخن ان کی طرف ہے۔

اسی سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے اگلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ان لوگوں کی مانند نہ ہو جاؤ جو کہتے تھے ہم نے سنا ہے لیکن درحقیقت وہ نہیں سنتے تھے (و لا تکونوا کالذین قالوا سمعنا و ھم لا یسمعون)۔

یہ بہت عمدہ اور جاذب نظر تعبیر ہے جو قرآن نے ایسے لوگوں کے بارے میں استعمال کی ہے جو جانتے ہیں مگر عمل نہیں کرتے، سنتے ہیں مگر اثر نہیں لیتے اور ظاہراً مومنین کی صف میں شامل ہیں لیکن مطیع فرمان نہیں ہیں، فرمایا گیا ہے کہ وہ سننے والے کان رکھتے ہیں، الفاظ اور باتیں سنتے ہیں اور ان کے معانی بھی سمجھتے ہیں لیکن چونکہ ان کے مطابق عمل نہیں کرتے تو گویا بالکل بہرے ہیں چونکہ یہ سب کچھ تو عمل کے لیے تمہید ہے اور جب عمل نہیں تو تمہید بے فائدہ ہے۔

اس سلسلے میں کہ یہ لوگ کون تھے جن کی یہ صفت قرآن بیان کر رہا ہے اور مسلمانوں کو ہوش میں رہنا چاہیے کہ وہ ان جیسے نہ بن جائیں بعض کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ منافق ہیں جو مسلمانوں کی صفوں میں گھسے ہوئے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہودیوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ ہے اور بعض نے اسے مشرکین عرب کی طرف اشارہ سمجھا ہے لیکن کوئی مانع نہیں کہ آیت کے مفہوم میں ان تینوں گروہوں کے وہ افراد شامل ہوں جو عمل کے بغیر باتیں کرنے والے ہوں۔

گفتار عمل کے بغیر اور سننا تاثیر کے بغیر انسانی معاشروں کے لیے ایک بہت بڑی مصیبت ہے اور بہت سی بدبختیوں کا سرچشمہ ہے لہٰذا دوبارہ اگلی آیت میں بھی یہ سلسلہ کلام جاری ہے اور ایک دوسرے خوبصورت انداز میں فرمایا گیا ہے: زمین پر چلنے والوں میں سے خدا کے نزدیک بدترین وہ ہیں جو نہ سننے والے کان رکھتے ہیں نہ بولنے والی زبان اور نہ ہی عقل و ادراک، وہ بہرے اور گونگے

اور بے عقل ہیں (ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون) [1]

قرآن چونکہ ایک کتاب عمل ہے کوئی رسمی کتاب نہیں لہٰذا وہ ہر جگہ نتائج کو سہارا لیتی ہے اور اصولی طور پر ہر بے خاصیت موجود کو معدوم سمجھتی ہے ، ہر بے حرکت و بے اثر زندہ کو مردہ قرار دیتی ہے اور انسان کا ہر عضو جو اس کی ہدایت و سعادت کے راستے میں کارآمد نہ ہو اسے نہ ہونے کے برابر شمار کرتی ہے ۔ اس آیت میں بھی ان اشخاص کو جو بظاہر صحیح و سالم کان رکھتے ہیں لیکن ان کے کان آیات خدا کلام حق اور سعادت بخش پروگراموں کو سننے پر آمادہ نہیں انہیں بہرہ قرار دیتی ہے اور اسی طرح جو لوگ صحیح و سالم زبان رکھتے ہیں لیکن مہر سکوت ان کی زبان پر لگی ہوئی ہے وہ حق کا دفاع کرتے ہیں ، نہ ظلم و فساد کا مقابلہ کرتے ہیں ، نہ جاہل کو ارشاد کرتے ہیں ، نہ امر بالمعروف کرتے ہیں اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور نہ ہی راہِ حق کی طرف دعوت دیتے ہیں ، بلکہ اس عظیم خدائی نعمت کو صاحبان زر و زور کی چاپلوسی یا تحریفِ حق اور تقویت باطل میں استعمال کرتے ہیں ، ایسے افراد کو گونگا شمار کرتی ہے اور وہ جو ہوش و عقل کی نعمت سے بہرہ مند تو ہوتے ہیں لیکن صحیح غور و فکر نہیں کرتے انہیں دیوانوں میں شمار کرتی ہے ۔

اگلی آیت میں ارشاد ہوتا ہے : خدا انہیں حق کی دعوت دینے میں کوئی مضائقہ نہیں جانتا ، اگر وہ مائل ہوتے اور خدا اس لحاظ سے ان میں خیر اور بھلائی دیکھتا تو جیسے بھی ہوتا ان تک حق بات پہنچا تا (ولو علم اللہ فیھم خیرًا لا سمعھم)۔

پھر روایات میں آیا ہے کہ ہٹ دھرم بت پرستوں کی ایک جماعت پیغمبر خدا کے پاس آئی ۔ یہ لوگ کہنے لگے : ہمارے جد بزرگ قصی بن کلاب کو زندہ کرو اور وہ تمہاری نبوت کی گواہی دے تو ہم سب تسلیم کر لیں گے ۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا ہے کہ اگر یہ لوگ یہی بات حقیقت کے طور پر کہتے تو خدا یہ کام معجز نمائی کے طور پر انجام دے دیتا لیکن یہ جھوٹ بولتے ہیں اور ان کا ہدف قبول حق سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے اور اگر اس حالت میں خدا ان کی درخواست قبول کرے اور حق بات اس سے زیادہ ان کے کانوں تک پہنچائے یا ان کے جد قصی بن کلاب کو زندہ کر دے اور یہ اس کی گواہی سن لیں پھر بھی یہ روگردانی کریں گے اعراض کیے رہیں گے (ولو اسمعھم لتولوا وھم معرضون)۔

یہ جملے ایسے لوگوں کے بارے میں ہیں جنہوں نے بارہا حق کی باتیں سنی ہیں اور قرآن کی روح پرور آیات ان کے کانوں تک پہنچی ہیں اور انہوں نے ان کے مضامین و مفاہیم کو سمجھا ہے مگر پھر بھی تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے ان کا انکار کرتے ہیں ، ایسے افراد اپنے اعمال کی وجہ سے ہدایت کی صلاحیت گنوا بیٹھے ہیں اور اب خدا اور اس کے پیغمبر کو ان سے کوئی سروکار نہیں ۔

یہ آیت جبری مذہب کے پیروکاروں کے لیے ایک دندان شکن جواب ہے ۔ یہ آیت نشاندہی کرتی ہے کہ تمام سعادتوں کا سرچشمہ خود انسان ہے اور خدا بھی لوگوں کی اہلیت اور آمادگی کے لحاظ سے ہی ان سے سلوک کرتا ہے ۔

دو اہم نکات

۱۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ : بعض اوقات بعض نکتہ چین اس آیت سے اپنے لیے ایک پریشان کن مطلب اخذ کرتے ، وہ یہ منطق پیدا

---

[1] " صم " " اصم " کی جمع ہے ، اس کے معنی ہیں " بہرے " اور " بکم " " ابکم " کی جمع ہے ، اس کے معنی ہیں " گونگے "۔

کرتے ہیں کہ اس آیت میں قرآن کہتا ہے: "اگر خدا ان میں کوئی اچھائی دیکھے تو ان تک حق پہنچا دے" اور "اگر حق ان تک پہنچا دے تو وہ روگردانی کرتے ہیں"۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ "اگر خدا ان میں کوئی خیر دیکھے تو وہ روگردانی کریں گے"۔

یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کیونکہ گفتگو کے پہلے حصے میں جو یہ آیا ہے کہ "حق کو ان کے کانوں تک پہنچائے گا" اس کے بارے میں انہیں اشتباہ ہوا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ اس سلسلے میں آمادگی رکھتے ہوں تو حق کو ان کے کانوں تک پہنچائے گا۔ لیکن جملے کے دوسرے حصے میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اسباب فراہم نہ ہونے کی صورت میں یہ کام کرے تو وہ روگردانی کریں گے۔

لہٰذا یہ جملہ مندرجہ بالا آیت میں دو مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے اور اس سے مذکورہ منطقی قیاس اخذ نہیں کیا جا سکتا ۱ (غور کیجیے گا)۔

یہ بالکل اس طرح ہے کہ کوئی کہے کہ اگر میں جانتا کہ فلاں شخص میری دعوت کو قبول کرے گا تو میں اسے دعوت دیتا لیکن اس وقت حالات ایسے ہیں کہ اگر میں اسے دعوت دوں تو وہ قبول نہیں کرے گا لہٰذا میں اسے دعوت نہیں دوں گا۔

۲۔ حق بات سننے کے مختلف مراحل ہیں۔ بعض اوقات انسان صرف الفاظ اور عبارات سنتا ہے لیکن ان کے مفاہیم پر غور و فکر نہیں کرتا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اس قدر سننے پر بھی تیار نہیں ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وقال الذين كفروا لا تسمعوا لهذا القرآن والغوا فيه لعلكم تغلبون

کفار کہتے ہیں کہ اس قرآن کی طرف کان نہ دھرو اور شور مچاؤ شاید تم کامیاب ہو جاؤ تاکہ کوئی شخص حق بات نہ سن سکے۔ (حٰم السجدہ ـ ۲۶)

کبھی انسان گفتگو اور الفاظ سننے کو تو تیار ہوتا ہے لیکن کبھی بھی عمل کا ارادہ اور عزم نہیں کرتا، جیسے منافقین ہیں کہ جن کی طرف سورہ محمد آیہ ۱۶ میں فرمایا گیا ہے:

ومنهم من يستمع اليك حتى اذا خرجوا من عندك قالوا للذين اوتوا العلم ماذا قال آنفا

ان میں سے بعض ایسے منافق ہیں جو تمہاری باتیں کان دھر کے سنتے ہیں لیکن جب وہ تیرے پاس سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو انکار یا استہزاء کے طور پر آگاہ اور باخبر لوگوں سے کہتے ہیں یہ کیا بات تھی جو محمد کہہ رہا تھا۔

بعض اوقات ان کی کیفیت کچھ ایسی ہو جاتی ہے کہ اگر وہ کسی بات کو توجہ سے سنیں بھی تو وہ حق بات کا ادراک نہیں کر پاتے

---

۱ منطقی اصطلاح کے مطابق مذکورہ قیاس میں "حد وسط" موجود نہیں ہے کیونکہ پہلے جملے میں "لاسمعهم حالكونهم يعلم فيهم خيرا" ہے اور دوسرے جملے میں "لاسمعهم حالكونهم لا يعلم فيهم خيرا" ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا دو جملوں میں حد وسط موجود نہیں ہے کہ اس سے قیاس کی تشکیل کی جا سکے اور یہ دونوں جملے ایک دوسرے سے مختلف اور الگ الگ ہیں (غور کیجیے گا)۔

ان سے نیک و بد کی تمیز کی حس ہی سلب ہو جاتی ہے اور یہ خطرناک ترین مرحلہ ہے۔

قرآن ان تینوں گروہوں کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ درحقیقت بہرے ہیں کیونکہ حقیقی سننے والا تو وہ ہے جو توجہ سے سنتا بھی ہے، سمجھتا بھی ہے، سوچتا بھی ہے اور از روئے اخلاص عمل کا بھی مصمم ارادہ رکھتا ہے۔

آج بھی کتنے لوگ ہیں جو آیات قرآن سنتے وقت (بغیر تشبیہ کے ــــ جیسے موسیقی کی آوازیں سن رہے ہوں) احساس کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی زبان سے شور و ہیجان کی کیفیت کے مظہر جملے نکلتے ہیں لیکن ان کی ساری ہمت بس یہی ہوتی ہے اور عمل میں کورے ہوتے ہیں اور یہ کیفیت مقصد قرآن سے میل نہیں کھاتی۔

۲۴۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ
لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ
وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ○
۲۵۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۤصَّةً ۚ وَ
اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○
۲۶۔ وَاذْكُرُوْۤا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِى الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ
اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ
مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○

ترجمہ

۲۴۔ اے ایمان والو! خدا اور پیغمبر کی دعوت قبول کرو، جب وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف پکارے جو تمہاری زندگی کا سبب ہے اور جان لو کہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ کہ تم سب (قیامت میں) اس کے پاس محشور ہو گے۔

۲۵۔ اور اس فتنے سے ڈرو جو صرف تمہارے ظالموں کو نہیں پہنچے گا (بلکہ سب کو گھیرے گا کیونکہ دوسروں نے خاموشی اختیار کی تھی) اور جان لو کہ خدا شدید العقاب ہے۔

۲۶۔ اور وہ وقت یاد کرو جب تم روئے زمین پر ایک مختصر، چھوٹا اور کمزور گروہ تھے یہاں تک کہ تم ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں کو نہ لے جائیں لیکن اس نے تمہیں پناہ دی، تمہاری مدد کی اور تمہیں پاکیزہ رزق سے بہرہ مند کیا تاکہ اس کی نعمت کا شکر ادا کرو۔

تفسیر

دعوت ___ زندگی کی طرف

گذشتہ آیات میں مسلمانوں کو علم، عمل، اطاعت اور تسلیم کی طرف دعوت دی گئی تھی۔ ان آیات میں اسی ہدف کو ایک اور انداز سے حاصل کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: اے ایمان لانے والو! خدا اور اس کے پیغمبر کی دعوت کو قبول کرو، جب وہ تمہیں ایسی چیز کی طرف دعوت دیتا ہے جو تمہیں زندہ کرتی ہے (یا ایھا الذین اٰمنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم)۔

مندرجہ بالا آیت صراحت سے کہتی ہے کہ دعوتِ اسلام دراصل زندگی اور حیات کی طرف دعوت ہے۔ حیاتِ روحانی، حیاتِ مادی، حیاتِ ثقافتی، حیاتِ اقتصادی، حیاتِ سیاسی، حقیقی مفہوم کے ساتھ حیاتِ اخلاقی اور حیاتِ اجتماعی غرض اسلام کی دعوت ہر لحاظ سے اور ہر پہلو سے حیات ہے۔

یہ مختصر ترین اور جامع ترین تعبیر ہے جو اسلام اور دینِ حق کے بارے میں آئی ہے۔ اگر کوئی پوچھے کہ اسلام کا ہدف اور مقصد کیا ہے اور وہ ہمیں کیا دے سکتا ہے تو ایک ہی مختصر سے جملے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا ہدف اور مقصد تمام جہاتِ زندگی میں حیات عطا کرنا ہے اور یہی اسلام ہمیں عطا کرتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا طلوعِ اسلام سے قبل اور دعوتِ قرآن سے پہلے لوگ مردہ تھے کہ قرآن انہیں دعوتِ حیات دیتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جی ہاں، وہ اس حیات سے محروم تھے کہ جو حیات قرآن عطا کرتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ حیات کے کئی پہلو اور مراحل ہیں کہ قرآن جن سب کی نشاندہی کرتا ہے۔

"زندگی" کا مفہوم بعض اوقات سبزہ زار کی حیات کے معنی میں آیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

اعلموا ان اللہ یحی الارض بعد موتھا

جان لو کہ خدا زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ (حدید - ۱۷)

کبھی حیاتِ جسمانی کے معنی میں آیا ہے، مثلاً:

ان الذی احیاھا لمحی الموتی

وہ خدا کہ جس نے اس (زمین) کو زندہ کیا، مردوں کو بھی زندہ کرے گا۔ (حم السجدہ - ۳۹)

کبھی زندگی ـــــ فکری، عقلی اور انسانی حیات کا معنی لیے ہوئے ہوتی ہے، مثلاً:

او من کان میتا فاحییناہ.....

وہ شخص جو مردہ اور گمراہ تھا پس پھر ہم نے اس کی ہدایت کی یا وہ گمراہوں کی طرح ہے۔ (انعام ۱۲۲)

کبھی دوسرے جہان کی حیات جاوداں کے مفہوم میں ہے، مثلاً:

یالیتنی قدمت لحیاتی

اے کاش! آج (روز قیامت) کی زندگی کے لیے میں نے کوئی چیز آگے بھیجی ہوتی۔ (فجر - ۲۴)

اور کبھی زندگی لامحدود اور لامتناہی علم و توانائی کے معنی میں ہوتی ہے، جیسا کہ خدا کے بارے میں ہے:

ھُوَ الْحَیُّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ

وہ ایسا زندہ ہے کہ جس کے لیے کوئی موت نہیں ہے۔

موت کی اقسام کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ اگرچہ مادی اور حیوانی زندگی کے حامل تھے لیکن وہ انسانی، معنوی اور عقلی زندگی سے محروم تھے۔ قرآن آیا اور اس نے انہیں حیات اور زندگی کی دعوت دی۔

یہاں سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ جو لوگ دین و مذہب کو ایک خشک، بے روح، محدود زندگی سے ماوراء اور فکری و اجتماعی پروگراموں سے الگ سمجھتے ہیں وہ کس قدر اشتباہ اور غلطی پر ہیں۔ ایک سچا دین وہی ہو سکتا ہے جو زندگی کے تمام شعبوں اور پہلوؤں میں حرکت پیدا کرے روح پھونکے، فکر عطا کرے اور احساس ذمہ داری پیدا کرے، ہمیشگی، اتحاد، ارتقاء اور تکامل ایجاد کرے اور تمام معانی کے لحاظ سے حیات آفریں ہو۔

ضمناً یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ جو لوگ اس آیت کی تفسیر صرف جہاد یا ایمان یا قرآن یا بہشت کے ساتھ کرتے ہیں اور ان امور کو حیات کے تنہا عامل کے طور پر پیش کرتے ہیں درحقیقت مفہوم آیت کو محدود کر دیتے ہیں کیونکہ آیت کے مفہوم میں تو یہ سب امور شامل ہیں اور ان سے بڑھ کر ہر چیز، ہر فکر، ہر پروگرام اور ہر حکم جو حیات انسانی کی کوئی صورت پیدا کرے آیت کے مفہوم میں شامل ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے، جان لو کہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ کہ تم سب قیامت میں اس کے پاس جمع کیے جاؤ گے (واعلموا ان اللہ یحول بین المرء وقلبہ وانہ الیہ تحشرون)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، اس میں شک نہیں کہ دل سے مراد روح اور عقل ہے لیکن یہ کہ خدا کس طرح انسان اور اس کی روح و عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے، اس بارے میں بہت سے احتمالات ذکر کیے گئے ہیں۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ یہ بندوں سے خدا کے نہایت قربت کی طرف اشارہ ہے گویا وہ خود انسان کی جان اور اس کے اندر موجود ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ○

ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہیں۔ (ق ـ ۱۶)

کبھی کہا جاتا ہے کہ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ قلوب اور افکار کی گردش خدا کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ دعا میں ہم کہتے ہیں:

یا مقلب القلوب و الابصار

اے وہ کہ قلوب اور افکار کی گردش جس کے ہاتھ میں ہے۔

کبھی کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر لطفِ خدا نہ ہوتا تو انسان ہرگز حق کی حقانیت اور باطل کے بطلان پر آگاہ نہ ہو پاتا۔

کچھ لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک لوگوں کو موقع میسر ہے اطاعتِ الٰہی اور نیک کاموں کی انجام دہی کے لیے کوشش کرتے رہیں کیونکہ خدا انسان اور اس کے دل کے درمیان موت کے ذریعے رکاوٹ پیدا کر دیتا ہے۔

لیکن ایک عمومی حوالے سے ان تمام تفاسیر کو ایک ہی جامع تفسیر میں جمع کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ خدا ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور تمام موجودات پر محیط ہے وہ ان موجودات میں سے نہیں لیکن ان سے جدا بھی نہیں۔ موت و حیات، علم و قدرت، امن و سکون اور توفیق و سعادت سب اس کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں لہٰذا انسان نہ کوئی چیز اس سے چھپا سکتا ہے، نہ کوئی کام اس کی توفیق کے بغیر کر سکتا ہے اور نہ ہی یہ مناسب ہے کہ انسان اس کے علاوہ کسی کی طرف رخ کرے اور اُس کے غیر سے درخواست کرے کیونکہ وہی تمام چیزوں کا مالک ہے اور انسان کے تمام وجود پر محیط ہے۔

اس جملے کا گذشتہ جملے سے ربط اس لحاظ سے ہے کہ اگر پیغمبر زندگی اور حیات کی طرف دعوت دیتا ہے تو وہ ایسی ہستی کا فرستادہ ہے کہ موت و حیات اور ہدایت و عقل سب جس کے قبضۂ قدرت میں ہیں لہٰذا اس امر کی تاکید کے لیے ارشاد ہوتا ہے کہ تم نہ صرف آج اس کی قدرت کے احاطہ میں موجود ہو بلکہ دوسرے جہان میں بھی اسی کی طرف جاؤ گے یہاں اور وہاں سب اس کے سامنے موجود ہو۔

صرف ظالم ہی انجامِ بد سے دوچار نہیں ہوں گے

اس کے بعد خدا اور پیغمبر کی حیات بخش دعوت قبول نہ کرنے کے بُرے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس فتنے سے بچو کہ جو تم میں سے صرف ظالموں ہی کو نہیں آئے گا بلکہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا (واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة)۔

لفظ "فتنة" قرآن مجید میں مختلف مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ کبھی آزمائش و امتحان کے معنی میں اور کبھی بلاء، مصیبت اور عذاب کے معنی میں۔ اصل میں اس لفظ کا معنی ہے سونے کو کٹھالی میں داخل کرنا تاکہ اس کا کھرا یا کھرا پن واضح ہو جائے۔ بعد ازاں یہ لفظ ایسی آزمائشوں کے معنی میں استعمال ہونے لگا جو انسان کی صفاتِ باطنی کو ظاہر کر دیتی ہیں اور اسی طرح بلاؤں اور ان سزاؤں کے لیے میں استعمال ہونے لگا جو روحِ انسانی کی صفائی یا اس کے گناہ کی تخفیف کا باعث ہوں۔

زیرِ بحث آیت میں یہ لفظ اجتماعی مصائب اقوام کے مفہوم میں ہے کہ جو سب کو دامنگیر ہوں، اصطلاح کی زبان میں جس میں خشک و ترسب

جل جائیں۔

درحقیقت اجتماعی حوادث کی خاصیت یہی ہے کہ جب معاشرہ اشاعتِ حق اور رسالت کے بارے میں اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کرے اور اس کوتاہی کے نتیجے میں قانون شکنیاں، ہرج مرج اور بے امنی وغیرہ پیدا ہو جائیں تو نیک و بد سب اس کی آگ میں جلتے ہیں۔ یہ دراصل خداوند عالم کی طرف سے تمام اسلامی معاشروں کے لیے خطرے کا الارم ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ افراد و معاشرہ نہ صرف اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ اپنے فرائض ادا کریں بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو بھی ان کے فرائض کی انجام دہی پر ابھاریں کیونکہ اختلاف، انتشار اور عدم اتفاق اجتماعی پروگراموں کی شکست کا باعث ہوتے ہیں اور یہ دھواں سب آنکھوں میں پڑے گا۔ میں نہیں کہتا کہ چونکہ میں نے اپنی ذمہ داری نبھالی ہے لہٰذا دوسروں کی فرض ناشناسی کے بُرے آثار سے بچ جاؤں گا کیونکہ اجتماعی معاملات کو شخصی اور انفرادی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ بالکل اس طرح ہے جیسے دشمن کی طاقتور حملہ آور فوج کی تعداد ایک لاکھ ہو۔ اس کا حملہ روکنے کے لیے اگر پچاس ہزار افراد اپنی ذمہ داری نبھائیں تو مسلّم ہے کہ کافی نہیں ہوں گے اور شکست کے بُرے نتائج سے ذمہ دار اور غیر ذمہ دار سبھی دوچار ہوں گے اور جیسا کہ ہم نے کہا ہے اجتماعی اور معاشرتی مسائل کی یہی صورت ہے۔

یہ حقیقت ایک اور طریقے سے بھی واضح کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ معاشرے کے نیک لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ بُروں کے مقابلے میں خاموش ہو کر نہ بیٹھ جائیں اگر انہوں نے سکوت اختیار کیا تو خدا کے ہاں وہ بھی بُروں کے انجام میں شریک قرار پائیں گے۔ جیسا کہ ایک مشہور حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ان اللّٰہ عز وجل لا یعذب العامة بعمل الخاصة حتی یروا المنکر بین ظهرانیهم وهم قادرون علی ان ینکروه فاذا فعلوا ذٰلک عذب اللّٰہ الخاصة والعامة۔

خداوند عزوجل عام لوگوں کے عمل کی سزا کسی خاص گروہ کو نہیں دے گا مگر اس صورت میں کہ جب منکرات اور خدا کی نافرمانیاں ان کے درمیان ہو رہی ہوں اور وہ لوگ ان کے انکار اور مخالفت کی قدرت رکھتے ہوئے سکوت اور خاموشی اختیار کریں، اس صورت میں خدا تعالیٰ اس خاص گروہ کو اور معاشرے کے تمام لوگوں کو سزا دے گا[1]

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ حکم خدا کی دنیاوی اور اُخروی دونوں سزاؤں پر صادق آتا ہے اور اسی طرح ایک گروہ یا سب کے اعمال کے نتائج اور آثار کے سلسلے میں بھی صادق آتا ہے[2]

---

[1] تفسیر المنار جلد ۹ صفحہ ۶۳۸۔

[2] مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ "لا تصیبن" نفی کا صیغہ ہے یا نہی کا۔ بعض نے نہی قرار دیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ فتنوں سے بچو کیونکہ یہ صرف ظالموں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیں گے اور بعض دیگر نے اسے نفی کا صیغہ سمجھا ہے لیکن چونکہ عربی ادب کے علماء کے نظریے کے مطابق نون تاکید سوائے نہی کے اور جواب قسم کے نہیں آتی لہٰذا اسے جواب قسم قرار دیتے ہیں گویا آیت میں قسم مقدر ہے۔

آیت کے آخر میں تہدید آمیز لہجے میں کہا گیا ہے: جان لو کہ خدا کا عذاب و عقاب سخت ہے (واعلموا ان اللہ شدید العقاب)۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خدا کا لطف و رحمت انہیں غافل کردے اور خدائی عذاب و سزا کی شدت کو فراموش کردیں اور فتنے انہیں دامنگیر ہوجائیں جیسا اسلامی معاشرے کو دامنگیر ہوئے ہیں اور ان خدائی سنتوں اور طریقوں کو بھول جانے کی وجہ سے وہ پیچھے کی طرف اُلٹے پاؤں چلے گئے ہیں۔

اگر ہم اپنے دور کے اسلامی معاشروں پر ایک نظر ڈالیں تو ہم دیکھیں گے کہ دشمن کے مقابلے میں وہ پے درپے شکست کا شکار ہورہے ہیں۔ استعمار، یہودیت اور صہیونیت ان کے خلاف کامیابی سے مصروف عمل ہے۔ مادہ پرستی اور اخلاقی مفاسد کا دور دورہ ہے۔ گھر گھر میں انتشار ہے۔ جوان نسل بداعمالیوں اور برائیوں کا شکار ہے۔ انحطاط، پستی اور علمی پسماندگی کے مفاسد دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ صورت حال آیت کی حقیقت اور اس کے مفہوم کی تصویر کشی کررہی ہے کہ کس طرح ان فتنوں نے چھوٹے بڑے، نیک و بد اور عالم و جاہل کو گھیر رکھا ہے اور یہ اسی طرح جاری و ساری رہیں گے یہاں تک کہ مسلمانوں میں اجتماعی روح بیدار ہوجائے اور ہر کوئی معاشرے میں اپنی اجتماعی ذمہ داری کو قبول کرے اور اسلام کی طرف سے عائد دو فرائض امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قطعی، حتمی اور تخلف ناپذیر صورت اختیار کرلیں۔

قرآن مسلمانوں کا ہاتھ پکڑ کر انہیں ایک مرتبہ پھر ان کی گذشتہ تاریخ کی طرف پلٹاتا ہے اور انہیں سمجھاتا ہے کہ تم کس درجے میں تھے اور اس وقت کس مقام پر کھڑے ہوتا کہ جو درس انہیں گذشتہ آیات میں دیا گیا ہے اس کا اچھی طرح ادراک کریں۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ وقت یاد کرو جب تم ایک چھوٹا سا ناتواں گروہ تھے اور دشمنوں کے چنگل میں پھنسے ہوئے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ تمہیں ضعف و ناتوانی کی طرف کھینچ لے جائیں (واذکروا اذ انتم قلیل مستضعفون فی الارض)۔ اس طرح کہ تم ڈرتے تھے کہ کہیں مشرکین اور مخالفین تمہیں اُچک نہ لیں" (تخافون ان یتخطفکم الناس)۔

یہ ایک لطیف تعبیر ہے جو اُس دور کے مسلمانوں کی انتہائی کمزوری اور افرادی قوت کی کمی کو واضح کرتی ہے جیسے کوئی چھوٹا سا جسم ہوا میں معلق ہو کہ دشمن جسے آسانی سے اچک سکتا ہے۔ یہ ہجرت سے پہلے مسلمانوں کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے جب کہ ان کا دشمن وہاں بہت طاقتور تھا یا پھر ہجرت کے بعد کے دور کی طرف ایران اور روم کی عظیم طاقتوں کے مقابلے میں ان کی حالت کی طرف اشارہ ہے۔

"لیکن خدا نے تمہیں پناہ دی" (فاواکم) "اور اپنی مدد سے تمہیں تقویت دی" (وایدکم بنصرہ) "اور تمہیں پاکیزہ رزق سے بہرہ مند کیا" (ورزقکم من الطیبات) "شاید اس کی نعمت کا شکر بجالاؤ" (لعلکم تشکرون)۔

۲۷۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْۤا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

۲۸۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۷۔ اے ایمان والو! خدا ور رسول سے خیانت نہ کرو (نیز) اپنی امانتوں میں خیانت روا نہ رکھو جب کہ تم متوجہ ہو اور جانتے ہو۔

۲۸۔ اور جان لو کہ تمہارے اموال اور اولاد آزمائش کا ذریعہ ہیں اور خدا کے ہاں (ان کے لیے) اجر عظیم ہے (جو امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں)۔

شان نزول

مندرجہ بالا آیات کے نزول کے بارے میں کئی ایک روایات ہیں۔ ان میں سے ایک روایت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ:

پیغمبر خدا نے حکم دیا کہ بنی قریظہ (جو مدینہ کے یہودیوں میں سے تھے) کا محاصرہ کر لیا جائے۔ یہ محاصرہ اکیس راتوں تک جاری رہا۔ لہٰذا وہ صلح کی تجویز پیش کرنے پر مجبور ہو گئے جیسے ان کے بھائی بنی نضیر (جو مدینے کا یہودیوں کا ایک اور گروہ تھا) کے لوگوں نے بھی کیا تھا۔ صلح کی تجویز میں انہوں نے پیش کش کی کہ وہ مدینے سے کوچ کر کے شام کی طرف چلے جائیں۔ رسولِ خدا نے یہ تجویز قبول نہ فرمائی (شاید اس لیے کہ ان کی پیش کش کی صداقت مشکوک تھی) اور فرمایا کہ صرف سعد بن معاذ کا فیصلہ قبول کیا جائے۔

انہوں نے تقاضا کیا کہ رسول اللہ ابولبابہ (آپ کے مدنی صحابی) کو ان کے پاس بھیجا جائے۔

ابولبابہ کا ان سے دوستی کا پرانا رشتہ تھا اور اس کے گھر والے، بیٹے اور مال و منال ان کے پاس تھے۔

یہ تجویز رسول اللہ نے قبول فرمائی اور ابولبابہ کو ان کے پاس بھیج دیا۔

انہوں نے ابولبابہ سے مشورہ کیا کہ کیا اس میں مصلحت ہے کہ وہ سعد بن معاذ کی قضاوت قبول کر لیں۔

ابولبابہ نے اپنے گلے کی طرف اشارہ کیا یعنی اگر قبول کرو گے تو مارے جاؤ گے لہٰذا اس تجویز کو قبول نہ کرو۔

وحی خدا کے قاصد جبرئیل نے اس امر کی اطلاع پیغمبر کو دے دی۔

ابولبابہ کہتا ہے: ابھی میں نے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا تھا کہ متوجہ ہوا کہ میں نے خدا اور پیغمبر سے

خیانت کی ہے۔

اس موقع پر یہ آیات اس کے متعلق نازل ہوئیں۔

اس وقت ابولبابہ سخت پریشان ہوا یہاں تک کہ اس نے اپنے آپ کو ایک طناب کے ذریعے مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا اور کہا، خدا کی قسم نہ کھانا کھاؤں گا نہ پانی پیوں گا یہاں تک کہ مر جاؤں یا پھر خدا میری توبہ قبول کرلے۔

سات شب و روز گزر گئے نہ اس نے کچھ کھایا نہ پیا یہاں تک کہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا تو خدا نے اس کی توبہ قبول کر لی۔

یہ خبر مومنین کے ذریعے اسے ملی لیکن اس نے قسم کھائی کہ میں اپنے آپ کو ستون سے نہیں کھولوں گا جب تک پیغمبر خدا آکر خود نہ کھولیں۔

پیغمبر اکرمؐ آئے اور انہوں نے اسے کھولا۔

ابولبابہ نے کہا: میں اپنی توبہ کی تکمیل کے لیے اس گھر کو چھوڑتا ہوں جس میں میں اس گناہ کا مرتکب ہوا تھا اور اپنے تمام مال سے صرف نظر کرتا ہوں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: صرف اتنا کافی ہے کہ اپنے مال کا تیسرا حصہ صدقہ کردے۔[1]

کتب اہل سنت میں بھی یہی مضمون اس آیت کی شان نزول کے متعلق موجود ہے۔

گذشتہ آیات چونکہ جنگ بدر سے مربوط تھیں لہٰذا بعض نے اس بات کو بعید سمجھا ہے کہ یہ آیت یہودیوں اور بنی قریظہ سے متعلق ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ ان روایات سے مراد یہ ہے کہ ابولبابہ کا واقعہ آیت کا ایک مصداق قرار پاسکتا ہے نہ کہ یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی ہے۔ ایسا ہی انہوں نے گذشتہ آیات کی شان نزول سے متعلق بھی کہا ہے۔ مثلاً بعض کتب میں کچھ صحابہ سے منقول ہے کہ فلاں آیت عثمان کے قتل کے بارے میں نازل ہوئی ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ عثمان کا قتل وفات پیغمبر سے سالہا سال بعد ہوا ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ آیت تو بنی قریظہ کے واقعہ کے بارے میں ہی نازل ہوئی ہو لیکن چونکہ بدر کی آیات سے مناسبت رکھتی تھی لہٰذا پیغمبر خدا کے حکم سے ان کے ساتھ رکھ دی گئی ہو۔

تفسیر

خیانت اور اس کا سرچشمہ

پہلی آیت میں خداوند عالم نے روئے سخن مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے کہا ہے اے ایمان والو! خدا اور پیغمبر سے خیانت نہ

---

[1] نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۴۳۔

کرو(یآایھا الذین اٰمنوا لا تخونوا اللہ والرسول)۔

خدا اور رسول سے خیانت یہ ہے کہ مسلمانوں کے فوجی راز دوسروں تک پہنچا دیئے جائیں یا دشمنوں کو اپنے ساتھ مقابلے اور جنگ میں تقویت پہنچائی جائے یا واجبات، محرمات اور خدائی احکام کو بالکل پس پشت ڈال دیا جائے۔ لہٰذا ابن عباس سے منقول ہے کہ جو شخص اسلامی احکام اور پروگراموں میں سے کسی چیز کو ترک کر دے وہ اسی قدر خدا اور پیغمبر سے خیانت کا مرتکب ہوا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اپنی امانتوں میں بھی خیانت کرو(وتخونوا امٰنٰتکم)۔[1]

"خیانت" کا مطلب ہے اس حق کی ادائیگی نہ کرنا جس کی ادائیگی کا انسان نے ذمہ لیا ہو۔ یہ دراصل "امانت" کی ضد ہے۔ "امانت" اگرچہ مالی امانتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن منطقِ قرآن میں اس کا ایک وسیع مفہوم ہے کہ زندگی کے جو تمام اجتماعی، سیاسی اور اخلاقی پہلوؤں پر محیط ہے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے:

المجالس بالامانة

جو باتیں خصوصی نشستوں اور مجالس میں ہوں وہ امانت ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے:

اذا حدث الرجل بحدیث ثم التفت فھو امانة

جب کوئی شخص کسی سے بات کر رہا ہو، پھر وہ ادھر ادھر دیکھے (کہ کہیں کوئی اسے سن تو نہیں رہا) تو یہ بات امانت ہے۔

لہٰذا اسلام کی آب وخاک مسلمانوں کے ہاتھ خدائی امانت ہے ان کی اولاد بھی امانت ہے اور سب سے بالاتر قرآن مجید اور اس کی تعلیمات پروردگار کی عظیم امانت ہیں۔

بعض کا کہنا ہے کہ خدا کی امانت اس کا دین ہے، رسول کی امانت ان کی سنت ہے اور مومنین کی امانت ان کا مال اور اسرار ہیں لیکن مندرجہ بالا آیت میں امانت میں تمام مفاہیم شامل ہیں۔

بہرحال امانت میں خیانت سب سے زیادہ قابلِ نفرت عمل اور قبیح ترین گناہ ہے۔ جو شخص امانت میں خیانت کرتا ہے درحقیقت وہ منافق ہے جیسا کہ حدیث پیغمبر میں منقول ہے:

اٰیة المنافق ثلاث: اذا حدث کذب، واذا وعد اخلف، واذا ائتمن خان، وان صام وصلی وزعم انہ مسلم

منافق کی تین نشانیاں ہیں، جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرتا ہے۔ ایسا شخص منافق ہے چاہے روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہو۔

---

[1] "تخونوا" یہاں دراصل "لا تخونوا" ہے جملے کے سابقہ حصے کے قرینے سے "لا" محذوف ہو گیا ہے۔

اصولی طور پر امانت میں خیانت نہ کرنا انسانی فرائض اور حقوق میں سے ہے یعنی اگرچہ صاحبِ امانت مسلمان نہ ہو تب بھی اس کی امانت میں خیانت نہیں کی جاسکتی۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، ہوسکتا ہے تم غلطی سے اور بے خبری میں کسی چیز میں خیانت کر بیٹھو لیکن جان بوجھ کر کبھی ایسا نہ کرنا (وانتم تعلمون)۔

البتہ جو اعمال ابولبابہ کے کام جیسے ہیں انہیں اشتباہ یا بے خبری نہیں کہا جاسکتا بلکہ مال، اولاد اور ذاتی مفاد سے عشق بعض اوقات حساس مواقع پر انسان کی آنکھ اور کان بند کر دیتے ہیں اور وہ خدا اور پیغمبر سے خیانت کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ یہ درحقیقت جان بوجھ کر خیانت کرنا ہے لیکن اہم بات یہ ہے کہ انسان فوراً ابولبابہ کی طرح بیدار ہو کر گذشتہ گناہ کی تلافی کرے۔

اگلی آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ ہوشیار رہیں کہیں مادی امور اور جلد گزر جانے والے شخصی مفادات انسان کی کی آنکھ اور کان پر پردہ نہ ڈال دیں اور وہ ایسی خیانتوں کا مرتکب نہ ہو جائے جو اس کے معاشرے کی زندگی اور سرنوشت کو خطرے میں ڈال دے۔ ارشاد ہوتا ہے: جان لو کہ تمہارے اموال اور اولاد تمہاری آزمائش اور امتحان کا ذریعہ ہیں (واعلموا انما اموالکم واولادکم فتنة)۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے ایسے مواقع پر "فتنة" کا معنی ہے "آزمائش کا ذریعہ"، اور درحقیقت ایمان و کفر اور انسانی قدر و قیمت کے اندازے کے لیے یہ دو چیزیں اہم ترین میزان ہیں۔ مال و اسباب حاصل کرنا، انہیں خرچ کرنا، ان کی حفاظت کرنا اور ان سے لگاؤ کی کیفیت یہ سب امتحانِ بشر کے میدان ہیں۔

بہت سے ایسے اشخاص ہیں جو عام عبادات اور دین و مذہب کے ظاہری امور کے لحاظ سے بلکہ بعض اوقات مستحبات کی انجام دہی میں بہت سخت اور پکے ہیں لیکن جب کوئی مالی معاملہ بیچ میں آجائے تو سب چیزیں ایک طرف ہو جاتی ہیں اور قوانینِ الٰہی، مسائلِ انسانی اور حق و عدالت سب کچھ بھول جاتا ہے۔

اولاد کے بارے میں بھی یہی صورت ہے کہ جو انسان کے دل کا میوہ ہے اور بچے انسان کی شاخِ حیات کے پھول ہیں بہت سے افراد جو بظاہر امورِ دینی اور مسائلِ انسانی و اخلاقی کے پابند ہیں انہیں ہم دیکھتے ہیں کہ جب ان کی اولاد کا معاملہ ہوتا ہے تو گویا ان کے افکار و نظریات پر پردہ پڑ جاتا ہے اور وہ ان تمام مسائل کو بھول جاتے ہیں۔ اولاد کی محبت کے ہاتھوں حرام کو حلال اور حلال کو حرام شمار کرتے ہیں۔ اولاد کی آئندہ کی خیالی زندگی کے لیے ہر کام پر تیار ہو جاتے ہیں اور ہر حق کو پاؤں تلے روند دیتے ہیں۔

ہمیں چاہیے کہ امتحان کے ان دونوں میدانوں میں اپنے آپ کو خدا کے سپرد کریں اور ہوش و حواس کو قائم رکھیں۔ بہت سے لوگوں کے پاؤں ان دونوں میدانوں میں پھسل گئے ہیں اور وہ گر پڑے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیے ابدی نفرین اور دائمی پھٹکار حاصل کی ہے۔

اگر ہم سے کبھی کوئی لغزش سرزد ہو جائے تو ابولبابہ کی طرح ہمیں اس کی تلافی کرنا چاہیے یہاں تک کہ وہ مال جو ایسی لغزش کا سبب بنے اسے اس راہ میں قربان کر دینا چاہیے۔

آیت کے آخر میں ان لوگوں کو جو ان دونوں میدانوں سے کامیابی کے ساتھ نکل آئیں انہیں بشارت دی گئی ہے کہ پروردگار

کے پاس اجر عظیم اور بہت بڑی جزا ہے (وان اللہ عندہ أجر عظیم)۔ اولاد کی محبت کتنی ہی عظیم دکھائی دے اور مال و دولت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو پھر بھی اللہ کا اجر اور جزا ان سے برتر، عالی تر اور بزرگ تر ہے۔

یہاں کچھ سوالات سامنے آتے ہیں مثلاً یہ کہ اپنے اس علمی احاطے کے باوجود خدا تعالیٰ لوگوں کی آزمائش کیوں کرتا ہے اور یہ کہ خدا کی آزمائش سب کے لیے کیوں ہے یہاں تک کہ انبیاء و مرسلین کے لیے بھی ہے۔ نیز یہ کہ خدائی آزمائش کے مواقع کون کون سے ہیں اور ان میں کامیابی کا طریقہ کیا ہے۔ ان سب سوالات کے جوابات تفسیر نمونہ جلد اول (ص۳۹۷ تا ص۴۰۲ اردو ترجمہ) میں دیئے جا چکے ہیں۔

۲۹۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

ترجمہ

۲۹۔ اے ایمان لانے والو! اگر خدا کے حکم کی مخالفت سے ڈرو تو وہ تمہارے لیے حق اور باطل کو الگ الگ کر دے گا (اور تمہیں ایسی روشن ضمیری عطا کرے گا جس کے ذریعے تم حق اور باطل میں تمیز کر سکو) اور تمہارے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گا اور تمہیں بخش دے گا اور وہ عظیم فضل و بخشش کا مالک ہے۔

تفسیر

ایمان اور روشن ضمیری

گذشتہ آیات میں ایسے حیات بخش احکام بیان ہوئے ہیں جو مادی اور روحانی سعادت کے ضامن ہیں لیکن ان پر تقویٰ اور پرہیزگاری کے بغیر عمل نہیں ہو سکتا لہٰذا اس آیت میں انسانی کردار میں تقویٰ اور اس کے آثار کی اہمیت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ اس آیت میں تقویٰ اور پرہیزگاری کے چار نتائج بیان کیے گئے ہیں۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: اے ایمان لانے والو! اگر تقویٰ اختیار کرو اور حکم خدا کی مخالفت سے پرہیز کرو تو وہ تمہیں ایک خاص نورانیت اور روشن ضمیری بخشے گا جس سے تم حق اور باطل کے درمیان اچھی طرح سے امتیاز کر سکو گے (یاایھا الذین اٰمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا)۔

"فرقان" "فرق" کے مادہ سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور یہاں ایسی چیز کے معنی میں ہے جو حق کو باطل سے اچھی طرح جدا کر دے۔

یہ مختصر اور پر معنی لفظ انسان کے لیے ایک اہم ترین حیات ساز مسئلہ بیان کرتا ہے اور وہ یہ کہ اس راستے میں جس میں انسان کامیابی کی طرف جاتا ہے ہمیشہ پھسلنے کے مقامات آتے ہیں اور بے راہ رویاں موجود ہوتی ہیں اور اگر انہیں اچھی طرح نزدیکے اور نہ پہچانے اور ان سے پرہیز نہ کرے تو اس طرح گرے گا کہ اس کا نام ونشان تک باقی نہیں رہے گا۔ اس راستے میں اہم ترین مسئلہ حق و باطل، نیک و بد، دوست دشمن، مفید و نقصان دہ عوامل اور سعادت و بدبختی کی شناخت ہے اگر واقعاً انسان ان حقائق کو اچھی طرح پہچان لے تو اس کے لیے مقصد تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔

مشکل یہ ہے کہ ایسے بہت سے مواقع پر انسان اشتباہ میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ باطل کو حق، دشمن کو دوست اور بے راہ روی کو شاہراہ سمجھنے لگ جاتا ہے۔

ایسے مواقع پر تیز نظر، قوی ادراک اور بہت زیادہ نورانیت اور روشن بینی درکار ہے۔ زیر نظر آیت کہتی ہے کہ یہ نگاہ اور ادراک تقویٰ کے درخت کا ثمر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کس طرح تقویٰ اختیار کرنے سے اور گناہ و سرکشی سے پرہیز کرنے سے انسان میں ایسی نظر اور ادراک پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بات شاید بعض لوگوں کے لیے مبہم اور غیر واضح ہو لیکن اگر کچھ دقت نظر سے کام لیا جائے تو ان دونوں باتوں کے درمیان موجود رشتہ واضح ہو جاتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ پہلے تو انسانی قوت عاقلہ حقائق کے ادراک کے لیے کافی حد تک آمادہ ہے لیکن حرص، طمع، شہوت، خود پرستی، حسد اور مال، بیوی، اولاد، جاہ وحشمت اور مقام ومنصب سے عشق کے پردے سیاہ دھوئیں کی طرح عقل کی آنکھوں پر پڑ جاتے ہیں یا گاڑھے گرد وغبار کی طرح اردگرد کی فضا کو ڈھانپ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے تاریک ماحول میں انسان حق و باطل کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا لیکن اگر تقویٰ کے پانی سے اس غبار کو دھو ڈالا جائے اور درمیان سے یہ سیاہ اور تاریک دھواں ختم ہو جائے تو حق کے چہرے کو دیکھنا آسان ہو جائے۔ بقول شاعر:

جمالِ یار ندارد حجاب و پردہ ولی
غبار رہ بنشان تا نظر توانی کرد

ترجمہ: یعنی حسنِ یار تو حجاب اور پردے میں نہیں ہے لیکن

ایک اور شاعر نے کہا ہے:

حقیقت سرائی است آراستہ
ہوی وہوس گرد برخاستہ
نبینی کہ ہر جا کہ برخاست گرد
نبیند نظر گرچہ بیناست مرد

ترجمہ: کیا تو نہیں دیکھتا کہ جہاں گرد پڑی ہو وہاں آنکھ نہیں دیکھتی اگرچہ دیکھنے والا شخص بینا ہو۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ ہر کمال جہاں بھی ہے وہ کمالِ حق کا پرتو ہے اور انسان جس قدر خدا کے زیادہ نزدیک ہوتا ہے اس کمالِ مطلق کا زیادہ فاقتور پرتو اس کے وجود پر پڑتا ہے۔ اس حساب سے تمام علوم وفنون کا سرچشمہ اس کا علم ہے اور

جب بھی انسان تقویٰ کے ذریعے اور گناہ اور ہوا و ہوس سے پرہیز کرکے اس سے زیادہ نزدیک ہو اور اپنے وجود کے قطرے کو اس کے وجود و ہستی کے بے کنار سمندر سے ملادے تو اس کے علم و دانش سے بہت کچھ پائے گا۔

دوسرے لفظوں میں انسان کا دل آئینے کی طرح ہے اور پروردگار کا وجود ہستی آفتاب عالمتاب کی طرح ہے۔ اب اگر اس آئینے کو ہوا و ہوس کا زنگ تاریک کردے تو اس میں نور کا انعکاس نہیں ہوگا لیکن اگر اسے تقویٰ و پرہیزگاری کے پانی سے صیقل کردیا جائے اور زنگ اتار دیا جائے تو اس آفتاب پر فروغ کا خیرہ کرنے والا نور اس میں منعکس ہوگا اور وہ ہر طرف کو روشن کردے گا۔

یہی وجہ ہے کہ ہم پوری تاریخ میں پرہیزگار مردوں اور عورتوں کے حالات میں روشن ضمیری اور روشن بینی کے ایسے واقعات دیکھتے ہیں جو علم و دانش کے عام طریق سے ہرگز قابلِ ادراک نہیں ہیں۔

وہ بہت سے ایسے حادثات کی بنیاد کو اچھی طرح سے پہچانتے تھے جنہیں اجتماعی مصائب و آلام اور شور و غوغا میں نہیں پہچانا جاسکتا اور وہ دشمنانِ حق کے قابلِ نفرت چہروں کو ہزاروں پُرفریب پردوں کے پیچھے بھی دیکھ لیتے تھے انسانوں کی شناخت، معرفت، ادراک اور بصیرت پر تقویٰ کا عجیب اثر بہت سی روایات میں بھی بیان ہوا ہے اور دیگر آیات میں بھی اس کی تاثیر بیان کی گئی ہے۔

سورہ بقرہ آیہ ۲۸۲ میں ہے:

واتقوا الله ویعلمکم الله

تقویٰ اختیار کرو اور اللہ تمہیں تعلیم دے گا۔

ایک مشہور حدیث میں ہے:

المؤمن ینظر بنور الله

صاحبِ ایمان انسان اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

نہج البلاغہ کے کلماتِ قصار میں ہے:

اکثر مصارع العقول تحت بروق المطامع

زیادہ تر عقلوں کو لالچ کی چمک دمک پچھاڑ دیتی ہے اور حرص و طمع عقل کی آنکھ کو بیکار کردیتی ہے اور پھر لوگ گرنے اور پھسلنے کی جگہ کو نہیں دیکھ پاتے۔

تیسری بات یہ ہے عقلی تجزیہ و تحلیل کے لحاظ سے بھی تقویٰ اور ادراک حقائق کے درمیان تعلق قابلِ فہم ہے۔ مثلاً وہ معاشرے جو ہوا و ہوس کے محور پر گردش کرتے ہیں اور ان کے نشر و اشاعت کے ادارے اسی ہوا و ہوس کی ترویج کے لیے کردار ادا کرتے ہیں، اخبارات برائیوں اور خرابیوں کو رواج دیتے ہیں، ریڈیو سے آلودگی اور انحرافات کی آواز بلند ہوتی ہے اور ٹیلیویژن بھی ہوا و ہوس کی خدمت کرتے ہیں واضح ہے کہ ایسے معاشرے میں حق و باطل میں، اچھائی اور برائی میں تمیز اکثر لوگوں کے لیے بہت ہی مشکل ہے۔ لہٰذا تقویٰ کا فقدان عدم تشخیص یا غلط تشخیص کا سرچشمہ ہے۔ یا مثلاً وہ گھرانہ جو تقویٰ سے محروم ہے اور اس کے بچے گندے ماحول میں پرورش پارہے ہیں اور بچپن ہی سے برائی اور بے لگام آزادی کے خوگر ہوچکے ہیں آئندہ جب وہ بڑے ہوں

گے تو اچھائی اور برائی میں تمیز ان کے لیے مشکل ہو جائے گی۔

اصولی طور پر اگر یہ صلاحیتیں اور قوتیں بے کار ہو جائیں اور یہ سرمایہ ماؤ گا وہیں رائیگاں ہو جائے تو لوگ شعور و ادراک کے لحاظ سے پست ہو جائیں گے اور پست افکار کے حامل ہوں گے چاہے وہ صنعتی اور مادی لحاظ سے ترقی کر جائیں۔

لہٰذا ہم اچھی طرح دیکھتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو تقویٰ کے خلاف ہے ایک طرح کی بے خبری، عدم آگہی یا غلط تشخیص کا سرچشمہ ہے۔ لہٰذا آج کی اس مشینی دنیا میں ایسے معاشرے موجود ہیں جو علم و صنعت کے لحاظ سے بہت آگے پہنچ گئے ہیں لیکن اپنی روزمرہ کی زندگی میں ایسی وحشت ناک بے سروسامانی اور تضادات کا شکار ہیں جو انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ سب امور قرآن کی اس بات کی عظمت کو واضح کر دیتے ہیں۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ تقویٰ صرف عملی تقویٰ میں منحصر نہیں ہے بلکہ فکری اور عقلی تقویٰ بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے تو یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ بے لگام فکری آزادی کے مقابلے میں فکری تقویٰ کا معنی یہ ہے کہ ہم اپنے مطالعات میں صحیح مدارک اور حقیقی مطالب تلاش کریں۔ کافی تحقیق اور ضروری غور و خوض کے بغیر کسی مسئلے کے بارے میں نظریے اور عقیدے کا اظہار نہ کریں۔ جو لوگ فکری تقویٰ کو بروئے کار لاتے ہیں بے شک وہ بڑی آسانی سے بے لگام لوگوں کی نسبت صحیح نتائج تک پہنچ جاتے ہیں لیکن وہ لوگ جو انتخابِ مدارک اور طرزِ استدلال میں بے اصولی ہیں ان سے بے حساب غلطیاں اور اشتباہات سرزد ہوتے ہیں۔

باقی رہی وہ اہم بات جس کی طرف یقیناً سنجیدگی سے توجہ کرنا چاہیے اور وہ یہ کہ اسلام کے دیگر اصلاحی اور انسان ساز پروگراموں کی طرح "تقویٰ" بھی ہم مسلمانوں کے ہاتھوں تحریف و تغیر کا شکار ہے۔ بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ صاحبِ تقویٰ انسان وہ ہے جو اپنا بدن اور لباس زیادہ دھوتا ہے، تمام لوگوں اور تمام چیزوں کو نجس یا مشکوک سمجھے، اجتماعی اور معاشرتی مسائل سے کنارہ کش ہو، کسی سیاہ و سفید کو ہاتھ نہ لگائیں اور ہر معاملے میں خاموش رہے۔ پرہیزگاری اور تقویٰ کی ایسی غلط تفسیریں درحقیقت اسلامی معاشروں کے انحطاط کے عوامل میں سے ہیں۔ اس قسم کا تقویٰ آگاہی پیدا کرتا ہے نہ روشن ضمیری اور نہ حق و باطل کے درمیان تمیز عطا کرتا ہے۔

اب جب کہ پرہیزگاروں کی پہلی جزا کی وضاحت ہو چکی ہے ہم آیت کے اگلے حصے کی تفسیر اور باقی چار جزاؤں کو بیان کرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے: حق و باطل میں امتیاز کے علاوہ پرہیزگاری کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ "خدا تمہارے گناہ چھپائے گا اور ان کے آثار تمہارے وجود سے ختم کر دے گا (و یکفر عنکم سیئاتکم)۔ علاوہ ازیں اپنی بخشش بھی تمہارے شاملِ حال کرے گا (و یغفر لکم)۔ اور بھی بہت سی جزائیں اور عنایات تمہارے انتظار میں ہیں جنہیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا کیونکہ خدا بہت زیادہ فضل و بخشش رکھتا ہے (و اللہ ذو الفضل العظیم)۔

یہ چار اثرات تقویٰ و پرہیزگاری کے درخت کا ثمر ہیں۔ تقویٰ اور ان آثار میں بعض کے درمیان فطری اور طبیعی ربط اس سے مانع نہیں کہ ہم ان سب کی نسبت خدا کی طرف دے دیں کیونکہ ہم اس تفسیر میں بار ہا کہہ چکے ہیں کہ ہر موجود کا ہر اثر خدا کی مشیت اور ارادے سے ہے لہٰذا اس اثر کی نسبت خدا کی طرف بھی دی جا سکتی ہے اور اس موجود کی طرف بھی۔

یہ کہ "تکفیر سیئات" اور "غفران" میں کیا فرق ہے، اس سلسلے میں بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ پہلا دنیا میں پردہ پوشی کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا آخرت کی سزا سے نجات حاصل کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن ایک اور احتمال بھی ہے کہ "تکفیر سیئات" گناہوں کے نفسیاتی اور اجتماعی آثار کی طرف اشارہ جو تقویٰ کے ذریعے ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن "غفران" خدا کی عفو و بخشش اور سزا سے نجات کی طرف اشارہ ہے۔

۳۰۔ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ○

ترجمہ

۳۰۔ وہ وقت (یاد کرو) جب کافر سازش کر رہے تھے کہ تجھے قید کر لیں یا قتل کر دیں اور یا (مکہ سے) نکال دیں وہ سوچ بچار کر رہے تھے (اور پروگرام بنا رہے تھے) اور خدا بھی تدبیر کر رہا تھا اور خدا بہترین چارہ جو (اور مدبر) ہے

شان نزول

مفسرین اور محدثین مندرجہ بالا آیت کو ان حوادث کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جن کے نتیجے میں رسول اللہؐ کو مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ ان حوادث کی مختلف تعبیرات بیان ہوئی ہیں جو سب کی سب ایک ہی حقیقت تک جا پہنچتی ہیں اور وہ یہ کہ خدا نے معجزانہ طور پر پیغمبر اکرمؐ کو ایک عظیم اور حتمی خطرے کے چنگل سے نجات دی۔ درالمنثور میں اس سلسلے میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے:

مختلف قبائل سے قریش اور اشراف مکہ کا ایک گروہ جمع ہوا تاکہ وہ دارالندوہ[1] میں میٹنگ کریں اور انہیں رسول اللہ کی طرف سے درپیش خطرے پر غور و فکر کریں۔

(کہتے ہیں) اثنائے راہ میں انہیں ایک عمر رسیدہ اور باتجربہ شخص ملا جو درحقیقت شیطان تھا یا کوئی انسان جو شیطانی روح کا حامل تھا۔

انہوں نے اس سے پوچھا: تم کون ہو؟

کہنے لگا: اہل نجد کا ایک بڑا بوڑھا ہوں مجھے تمہارے ارادے کی اطلاع ملی تو میں نے چاہا کہ تمہاری میٹنگ میں شرکت کروں

---

[1] اشراف مکہ کی مشاورتی میٹنگیں اس مقام پر منعقد ہوا کرتی تھیں۔

اور اپنا نظریہ اور خیرخواہی کی رائے پیش کرنے میں دریغ نہ کروں۔

کہنے لگے، بہت اچھا اندر آجایئے۔

اس طرح وہ بھی دارالندوۃ میں داخل ہوگیا۔

حاضرین میں سے ایک نے ان کی طرف رُخ کیا اور (پیغمبر اسلامؐ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: اس شخص کے بارے میں کوئی سوچ بچار کرو، کیونکہ بندا ڈر ہے کہ وہ تم پر کامیاب ہوجائے گا (اور تمہارے دین اور تمہاری عظمت کو خاک میں ملائے گا)۔

ایک نے تجویز پیش کی: اسے قید کرو یہاں تک کے زندان ہی میں مرجائے۔

بوڑھے نجدی نے اس تجویز پر اعتراض کیا اور کہا: اس میں خطرہ یہ ہے کہ اس کے طرف دار ٹوٹ پڑیں گے اور کسی مناسب وقت اسے قید خانے سے چھڑا کر اس سرزمین سے باہر لے جائیں گے لہٰذا کوئی زیادہ بنیادی بات کرو۔

ایک اور نے کہا: اسے اپنے شہر سے نکال دو تاکہ تمہیں اس سے چھٹکارا مل جائے کیونکہ جب وہ تمہارے درمیان سے چلا جائے گا تو پھر جو کچھ بھی کرتا پھرے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اور پھر وہ دوسروں ہی سے سروکار رکھے گا۔

بوڑھے نجدی نے کہا: واللہ یہ نظریہ بھی صحیح نہیں ہے، کیا تم اُس کی شیریں بیانی، لسانی طاقت اور لوگوں کے دلوں میں اس کا نفوذ کر جانا نہیں دیکھتے؟ اگر ایسا کرو گے تو وہ تمام دنیائے عرب کے پاس جائے گا اور وہ اس کے گرد جمع ہوجائیں گے اور پھر وہ ایک انبوہِ کثیر کے ساتھ تمہاری طرف پلٹے گا اور تمہیں تمہارے شہروں سے نکال باہر کرے گا اور بڑوں کو قتل کردے گا۔

مجمع نے کہا: بخدا! یہ سچ کہہ رہا ہے کوئی اور تجویز سوچو۔

ابوجہل ابھی تک خاموش بیٹھا تھا، اُس نے گفتگو شروع کی اور کہا: میرا ایک نظریہ ہے اور اس کے علاوہ میں کسی رائے کو صحیح نہیں سمجھتا۔

حاضرین کہنے لگے: وہ کیا ہے؟

کہنے لگا: ہم ہر قبیلے سے ایک بہادر شمشیر زن کا انتخاب کریں اور ان میں سے ہر ایک ہاتھ میں ایک کاٹ دینے والی تلوار دیں اور پھر وہ سب مل کر موقع پاتے ہی اُس پر حملہ کریں۔ جب وہ اس صورت میں قتل ہوگا تو اس کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا اور میں نہیں سمجھتا کہ بنی ہاشم تمام قبائل قریش سے لڑسکیں گے لہٰذا مجبوراً اس صورت میں خون بہا پر راضی ہوجائیں گے اور یوں ہم بھی اس کے آزار سے نجات پالیں گے۔

بوڑھے نجدی نے (خوش ہوکر) کہا: بخدا! صحیح رائے یہی ہے جو اس جوان مرد نے پیش کی ہے میرا بھی اس کے علاوہ کوئی نظریہ نہیں۔

اس طرح یہ تجویز اتفاق رائے سے پاس ہوگئی اور وہ یہی مصمم ارادہ لے کر وہاں سے اُٹھ گئے۔

جبرئیل نازل ہوئے اور پیغمبر اسلامؐ کو حکم ملا کہ وہ رات کو اپنے بستر پر نہ سوئیں۔ پیغمبر اکرمؐ رات کو غار ثور کی طرف روانہ ہوگئے اور حکم دے گئے کہ علیؑ آپؐ کے بستر پر سو جائیں (تاکہ جو لوگ دروازے کی دراز سے بستر پیغمبرؐ پر نظر رکھے ہوئے ہیں انہیں بستر پر سویا ہوا سمجھیں اور آپؐ کو خطرے کے علاقے سے دور نکل جانے کی مہلت مل جائے)۔

حاشیہ بر صفحہ آئندہ

جب صبح ہوئی تو گھر میں گھس آئے۔ انہوں نے جستجو کی تو حضرت علیؑ کو بستر پیغمبرؐ پر دیکھا۔ اس طرح سے خدا نے ان کی سازش کو نقش بر آب کر دیا۔

وہ پکارے: محمدؐ کہاں ہے؟

آپ نے جواب دیا: میں نہیں جانتا۔

وہ آپؐ کے پاؤں کے نشانوں پر چل پڑے یہاں تک کہ پہاڑ (اور اس کی غار) کے پاس پہنچ گئے لیکن (انہوں نے تعجب سے دیکھا کہ مکڑی نے غار کے سامنے جالا تن رکھا ہے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ اگر وہ اس غار میں ہوتا تو غار کے دھانے پر مکڑی کا جالا تو نہ ہوتا۔ اس طرح وہ واپس چلے گئے) پیغمبرؐ تین دن تک غار کے اندر رہے (اور جب دشمن مکہ کے تمام بیابانوں میں آپؐ کو تلاش کر چکے اور تھک ہار کر مایوس پلٹ گئے تو آپؐ مدینہ کی طرف چل پڑے)۔[1]

تفسیر

ہجرت کی ابتداء

بعض کا نظریہ ہے کہ یہ آیت اور اس کے بعد کی پانچ آیات مکہ میں نازل ہوئیں چونکہ یہ ہجرت پیغمبرؐ کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں لیکن آیت کا طرزِ بیان گواہی دیتا ہے کہ یہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے چونکہ اس میں ایک گذشتہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا اگرچہ واقعہ ہجرت کی طرف اشارہ کر رہی ہے لیکن مسلماً مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس میں پیغمبرِ اکرمؐ اور مسلمانوں پر پروردگار کے ایک احسانِ عظیم اور نعمتِ عظمیٰ کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: وہ وقت یاد کرو جب مشرکینِ مکہ نے سازش کی کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر دیں اور یا جلا وطن کر دیں (واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک)۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے لفظ "مکر" عربی زبان میں تدبیر، چارہ جوئی اور منصوبہ بندی کے معنی میں ہے نہ کہ اس مشہور معنی میں جو آج کل فارسی زبان میں مروج ہے۔ اسی طرح لفظ "حیلۃ" بھی لغت میں چارہ جوئی اور تدبیر کے معنی میں ہے لیکن فارسی زبان میں آج کل یہ لفظ خطرناک مخفی سازش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔[2]

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: وہ منصوبہ بندی، چارہ جوئی اور تدبیر کرتے ہیں اور خدا بھی چارہ جوئی اور تدبیر کرتا ہے اور وہ بہترین منصوبہ ساز اور مدبر ہے (ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین)۔

اگر ہم ہجرت کے واقعہ پر صحیح غور و فکر کریں تو اس نکتے پر پہنچیں گے کہ وہ پیغمبرِ اسلامؐ کو ختم کرنے کے لیے اپنی پوری فکری اور

حاشیہ: ثور مکہ کے قریب ایک غار کا نام ہے۔

[1] المنار و مجمع البیان، زیرِ نظر آیت کے ذیل میں بحوالہ الدر المنثور۔

[2] اردو زبان میں بھی یہ الفاظ آج کل اسی معنی میں استعمال ہوتے ہیں (مترجم)۔

جسمانی صلاحیتیں صرف کر چکے تھے یہاں تک کہ جب رسولِ خدا ان کے چنگل سے نکل گئے تو انہوں نے آپ کی گرفتاری کے لیے ایک سو اونٹوں کا انعام مقرر کیا تھا جو کہ اس دور میں ایک بہت بڑا سرمایہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے مذہبی تعصب یا اتنا بڑا انعام حاصل کرنے کے لیے اطرافِ مکہ کے کوہ و بیابان چھان ڈالے تھے۔ یہاں تک کہ وہ غار کے دھانے تک بھی آپہنچے تھے لیکن خدا تعالیٰ نے ایک نہایت معمولی اور چھوٹے سے (مکڑی کے جالے) کے ذریعے ان کی سب سازشیں نقش برآب کر دیں۔

اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ واقعہ ہجرت تاریخ اسلام بلکہ تاریخ انسانیت کے ایک نئے مرحلے کا آغاز تھا ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ خدا نے عنکبوت کے چند تاروں کے ذریعے تاریخ انسانیت کی راہ کو بدل کے رکھ دیا۔

یہ بات واقعہ ہجرت میں منحصر نہیں بلکہ تاریخِ انبیاء نشاندہی کرتی ہے کہ خدا تعالیٰ متکبرین کی سرکوبی کے لیے ہمیشہ معمولی سے ذرائع کو کام میں لاتا ہے۔ کبھی آندھی کے ذریعے، کبھی بہت زیادہ مچھروں کے ذریعے، کبھی ابابیل جیسے چھوٹے پرندوں کے ذریعے اور کبھی ایسی ہی دیگر چھوٹی چھوٹی چیزوں ذریعے ـــــ تاکہ خدا کی بے پایاں قدرت کے سامنے انسان کی کمزوری اور ناتوانی واضح ہو جائے اور اسے طغیان اور سرکشی کی فکر سے باز رکھے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قید، جلاوطنی اور قتل کی سازشیں صرف مشرکین کی طرف پیغمبر اسلامؐ کے خلاف ہی نہ تھیں بلکہ جابر اور سرکش لوگ ہمیشہ مصلحین کی زبان روکنے کے لیے اور معاشرے کے ستم رسیدہ دکھی عوام میں ان کا اثر و نفوذ ختم کرنے کے لیے ان تینوں میں سے کسی نہ کسی حربے کا سہارا لیتے رہے تھے۔ لیکن جیسے پیغمبر اسلامؐ کے خلاف مشرکینِ مکہ کے اقدام کا نتیجہ برعکس نکلا اور وہ اسلام کے لیے ترقی اور نئی تحریک کا مقدمہ اور تمہید بن گیا ایسے ظالمانہ اقدامات کا عام طور پر الٹا ہی نتیجہ نکلتا رہا۔[۱]

۳۱۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

۳۲۔ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

---

[۱] یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ تفسیر نمونہ کی تالیف کی رفتار پہلے بہت کم تھی لیکن اب جب کہ موجودہ دوران سے پہلے اور بعد والی آیات کی تفسیر مرآباد کی جلاوطنی کے دوران (معدوم شاہِ ایران کی حکومت میں) لکھی جا رہی ہے کام کی رفتار بہت تیز ہو گئی ہے اور بالآخر ساتویں جلد مرآباد اور انارک کی دو جلاوطنیوں کے دور میں اختتام پذیر ہوئی ہے (مؤلف)۔

(الحمد اللہ میں بھی ترجمہ پر اس وقت موفق ہوا ہوں جب کہ بہت سی قوتیں میرے خلاف صف آرا ہیں جن میں شیخی جو مرزائیوں کی طرح اسلام کے دشمن ہیں پیش پیش ہیں۔ مترجم)۔

۳۳۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ○

۳۴۔ وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

۳۵۔ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ؕ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○

ترجمہ

۳۱۔ اور جب ہماری آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا (کوئی اہم چیز نہیں ہے) ہم بھی چاہیں تو ویسی باتیں کہہ سکتے ہیں، یہ تو گزرے ہوئے لوگوں کے افسانے ہیں (لیکن وہ جھوٹ کہتے ہیں اور ہرگز اس کی مثل نہیں لاسکتے)

۳۲۔ اور (وہ وقت یاد کیجیے) جب انہوں نے کہا: پروردگارا! اگر یہ حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسا یا ہمارے لیے دردناک عذاب بھیج دے۔

۳۳۔ لیکن جب تک تم ان کے درمیان ہو خدا ان پر عذاب نہیں بھیجے گا نیز جب تک وہ استغفار کرتے رہیں خدا انہیں عذاب نہیں کرے گا۔

۳۴۔ خدا انہیں کیوں عذاب نہ کرے حالانکہ وہ مسجد الحرام (کے پاس سے موحدین کو عبادت کرنے) سے روکتے ہیں جب کہ وہ اس کے سرپرست نہیں ہیں، اس کے سرپرست تو صرف پرہیزگار ہیں لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

۳۵۔ ان کی نماز (جب کہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم بھی نماز پڑھتے ہیں، خدا کے) گھر کے پاس سیٹیاں اور تالیاں

بجانے کے سوا کچھ نہ تھی پس اپنے کفران کی بناء پر عذابِ خدا چکھو۔

تفسیر

بے ہودہ باتیں کرنے والے

گذشتہ آیت میں بے ہودہ مشرکین کی عملی منطق کا ایک نمونہ بیان کیا گیا ہے۔ اب زیر نظر آیات میں ان کی فکری منطق کا ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ نہ وہ سلامت فکری رکھتے ہیں نہ درست روی بلکہ ان کے تمام پروگرام بے بنیاد اور احمقانہ ہیں۔

پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: جب ہماری آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں ہم نے سن لیا ہے (لیکن کوئی اہم بات نہیں ہے)، ہم چاہیں تو ہم بھی ایسی بات کہہ سکتے ہیں (و اذا تتلی علیھم اٰیاتنا قالوا قد سمعنا لو نشاء لقلنا مثل ھٰذا)۔

ان میں کوئی خاص بات نہیں بس گذشتہ لوگوں کے افسانے ہیں (ان ھٰذا الا اساطیر الاولین)۔

یہ باتیں وہ اس حالت میں کر رہے ہیں کہ جب قرآن کے مقابلے کی بار ہا فکر کر چکے ہیں اور اس سے عاجز رہ گئے ہیں۔ وہ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ ان میں قرآن کے مقابلے کی طاقت اور سکت نہیں ہے لیکن تعصب اور کینہ پروری کی وجہ سے یا لوگوں کو غفلت میں رکھنے کے لیے کہتے ہیں کہ یہ آیات کوئی اہم نہیں ہیں ایسی آیات تو ہم بھی لا سکتے ہیں لیکن لا کبھی نہیں سکتے۔ یہ ان کی ایک غلط منطق تھی۔ تاریخ کے جابر لوگوں کی طرح خالی اور بے بنیاد دعووں کے ذریعے ان کی کوشش تھی کہ ان کے اقتدار کے محل چند دن تک قائم رہیں۔

اگلی آیت میں ان کی ایک اور عجیب منطق بیان کی گئی ہے، فرمایا گیا ہے: وہ وقت (یاد کرو) جب (وہ دست دعا بلند کرتے تھے اور) کہتے تھے خداوندا! اگر یہ (دین اور قرآن) حق ہے اور تیری طرف سے ہے تو آسمان سے ہمارے سروں پر پتھر برسا (واذ قالوا اللّٰھم ان کان ھٰذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء)۔ یا ہمیں کسی اور دردناک عذاب میں مبتلا کردے (او ائتنا بعذاب الیم)۔

یہ بات وہ اس لیے کہتے تھے کہ شدید تعصب اور ہٹ دھرمی کی بناء پر ان کا خیال تھا کہ دین اسلام سو فیصد بے بنیاد ہے ورنہ جس شخص کو اس کی حقانیت کا احتمال بھی ہو وہ خود پر اس طرح کی پھٹکار نہیں بھیجتا۔ یہ احتمال بھی ہے کہ شاید مشرکین کے سرکردہ افراد لوگوں کو غفلت میں رکھنے کے لیے کبھی کبھی ایسی باتیں کرتے تھے تاکہ سادہ لوح افراد سمجھیں کہ محمدؐ کا دین بالکل باطل ہے حالانکہ دل سے وہ ایسا نہیں کہتے تھے۔

گویا مشرکین چاہتے تھے کہ یہ کہیں کہ تم گذشتہ انبیاء کے بارے میں کہتے ہو کہ خدا ان کے دشمنوں کو بعض اوقات پتھروں کی بارش برسا کر سزا دیتا تھا (جیسے حضرت لوطؑ کی قوم کے ساتھ ہوا) تو اگر سچ کہتے ہو تو تم بھی ایسا کر دکھاؤ۔

مجمع البیان میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

رسول اللہ غدیر خم میں جب حضرت علیؑ کو خلافت کے لیے معین اور منصوب کر چکے اور فرمایا:

من کنت مولاہ فعلی مولاہ

(جس کسی کا میں مولا ہوں پس اس کا علی بھی مولا ہے)

آپ کا یہ فرمان ہر طرف پھیل گیا۔ (منافقین میں سے ایک شخص) نعمان بن حارث فہری (تھا، وہ) پیغمبر اسلام کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا: ہم سے آپ نے کہا کہ ہم توحید کو قبول کریں اور بتوں کی نفی کی شہادت دیں اور آپ کی رسالت کی گواہی دیں اور آپ نے ہمیں جہاد، حج، روزہ، نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا۔ ہم نے ان سب کو قبول کریں لیکن آپ نے اس پر بس نہ کی اور اس لڑکے (حضرت علی ابن ابی طالب) کو خلیفہ بنا کر آپ نے کہا ہے کہ "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" یہ بات آپ کی طرف سے ہے یا خدا کی طرف سے حکم ہے؟

پیغمبر خدا نے فرمایا: اس خدا کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں یہ خدا کی طرف سے حکم ہے۔

یہ سن کر نعمان یہ کہتے ہوئے پلٹا:

اللّٰھم ان کان ھٰذا ھو الحق من عندك فامطر علینا حجارۃ من السمآء

خداوندا! اگر یہ بات تیری طرف سے ہے تو آسمان سے ہم پر پتھروں کی بارش برسا۔

تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ اس پر ایک پتھر گرا کر جس سے وہ مر گیا [1]

یہ حدیث اس بات کے منافی نہیں کہ یہ آیت واقعہ غدیر سے پہلے نازل ہوئی ہو کیونکہ اس آیت کی شان نزول نعمان کا واقعہ نہیں تھا بلکہ نعمان نے اپنے اوپر پھٹکار کے لیے وہ آیت استعمال کی جو پہلے نازل ہو چکی تھی۔ جیسے ہم قرآن سے استفادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ

(انشاء اللہ العظیم مندرجہ بالا حدیث کی مزید تشریح اور کتب اہل سنت سے اس سلسلے میں بہت سے مدارک کا ذکر سورہ معارج کی ابتداء میں "سئل سائل بعذاب واقع" کے ذیل میں آئے گا)۔

گذشتہ آیات کے سلسلے میں مخالفین نے پیغمبر اکرمؐ پر دو اعتراضات کیے۔ ان میں سے ایک کا بطلان تو واضح تھا لہٰذا قرآن نے اس کا جواب نہیں دیا اور وہ یہ تھا کہ انہوں نے کہا: اگر ہم چاہیں تو قرآن کی مثل لا سکتے ہیں، کہ یہ دعویٰ کھوکھلا اور جھوٹا تھا اور اگر ان میں سکت ہوتی تو لائے ہوتے لہٰذا اس بات کے جواب کی ضرورت نہ تھی۔

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اگر یہ آیات حق ہیں اور خدا کی طرف سے ہیں تو پھر وہ ہمیں سزا دے اور ہم پر کوئی مصیبت نازل کر دے۔ قرآن زیر بحث آیات میں سے تیسری آیت میں انہیں یوں جواب دیتا ہے: خدا انہیں کبھی عذاب نہیں کرے گا

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۵۱۔

جب تک قرآن میں موجود ہے (وما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم)۔ درحقیقت تیرا پُر برکت وجود ــــ کہ تو رحمۃ للعالمین ہے ــــ اس سے مانع ہے کہ ان گنہ گاروں پر عذاب نازل ہو اور یہ گذشتہ اقوام کی طرح نابود ہو جائیں کہ جو مختلف ذرائع سے اجتماعی یا انفرادی طور پر نابود ہو جاتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اسی طرح اگر وہ استغفار کریں (اور اس سے عفو و بخشش کا تقاضا کریں) تو خدا انہیں سزا نہیں دے گا (وما کان اللہ معذبھم وھم یستغفرون)۔

اس جملے کی تفسیر میں مفسرین نے کئی ایک احتمالات پیش کیے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ بعض مشرکین قبل کی آیت میں مذکور جملہ کہنے کے بعد اپنے کہے پر پشیمان ہوئے اور عرض کیا:

غفرانک ربنا!

خدایا! ہمیں اس گفتگو پر بخش دے۔

اسی سبب سے ــــ حتی کہ پیغمبر خدا کے مکہ سے خروج کے بعد بھی وہ بلا و فنا میں گرفتار نہیں ہوئے۔

بعض کا خیال ہے کہ یہ جملہ مکہ میں باقی رہ جانے والے مومنین کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہجرتِ پیغمبر کے بعد جو افراد ہجرت پر قدرت نہیں رکھتے تھے مکہ میں اسی طرح رہ گئے تھے اور ان کا وجود پیغمبر اکرمؐ کے وجود کا پرتو تھا لہٰذا مشرکین مکہ پر عذاب نازل نہ ہوا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جملہ ایک شرطیہ جملے کا مفہوم رکھتا ہو یعنی اگر وہ اپنے کردار پر پشیمان ہوں اور درگاہِ خداوندی کا رخ کریں اور استغفار کریں تو ان سے خدا کا عذاب اور سزا برطرف ہو جائے گا۔

ان تمام امور کے باوجود آیت کی تفسیر میں یہ تمام احتمالات مجموعی طور پر بھی بعید نہیں ہیں یعنی ممکن ہے آیت ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ ہو۔

بہر حال آیت کا مفہوم زمانۂ پیغمبر کے لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کے لیے یہ ایک کلی قانون ہے۔ اسی لیے شیعہ کتب میں حضرت علی علیہ السلام سے اور سُنی کتب میں اُن کے شاگرد ابن عباس سے ایک مشہور حدیث میں ہے:

کان فی الارض امانان من عذاب اللہ وقد رفع احدھما فدونکم الاٰخر فتمسکوا بہ وقرأ ھذہ الاٰیۃ

روئے زمین میں عذاب الٰہی سے مامون رہنے کے دو ذریعے تھے کہ جن میں سے ایک (وجودِ پیغمبرؐ) اٹھا لیا گیا ہے۔ اب دوسرے (استغفار) سے تمسک رکھو۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت کی[1]

مندرجہ بالا آیت اور اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ سخت بلاؤں اور مصائب سے امان حاصل کرنے کے لیے

---

[1] نہج البلاغۃ، کلمات قصار۔

لوگوں کے پاس وجودِ پیغمبرؐ ایک موثر ذریعہ ہے اور اس کے بعد استغفار، توبہ اور درگاہِ حق کی طرف رخ کرنا دوسرا عامل ہے۔

اب اگر دوسرا عامل بھی اٹھ جائے تو دردناک عذاب اور سزاؤں سے جو ان کے گناہوں کی وجہ سے ان کے انتظار میں ہیں بچنے کے لیے انسانی معاشروں کے پاس کوئی ذریعہ نہ ہوگا۔ یہ دردناک سزائیں طبیعی حوادث کی صورت میں ہوتی ہیں، یا گھروں کو تباہ و ویران کر دینے والی جنگوں کی شکل میں یا کسی اور صورت میں، جیسا کہ ہم اب تک ان کی مختلف قسمیں دیکھ چکے ہیں یا سن چکے ہیں۔

دعائے کمیل جو حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے، میں ہے:

اللّٰھم اغفرلی الذنوب التی تنزل البلاء

خدایا! ہمارے وہ گناہ بخش دے جو نزولِ بلا کا سبب ہیں۔

یہ تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ اگر استغفار نہ ہو تو بہت سے گناہ ایسے ہیں جو نزولِ بلا کا سرچشمہ بن جائیں۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ استغفار سے مراد صرف یہ نہیں کہ یہ کہا جائے:

خدایا! مجھے بخش دے،

اللّٰھم اغفرلی

ایسے جملوں کا تکرار کافی نہیں بلکہ استغفار کی روح یہ ہے کہ انسان حق کی طرف لوٹ آئے اور اپنے گذشتہ گناہوں کی تلافی کے لیے آمادگی کا اظہار کرے۔

اگلی آیت میں قرآن کہتا ہے: یہ عذابِ الٰہی کا استحقاق رکھتے ہیں تو پھر خدا انہیں کیوں عذاب نہ کرے حالانکہ وہ مومنین کے لیے مسجد الحرام میں جانے سے رکاوٹ بنتے ہیں (وما لھم الا یعذبھم اللّٰہ وھم یصدون عن المسجد الحرام)۔

یہ اس زمانے کی طرف اشارہ ہے کہ جب مسلمان مکہ میں تھے اور مشرکین انہیں حق نہیں دیتے کہ وہ آزادانہ خانۂ خدا کے پاس نماز جماعت قائم کر سکیں اور مسلمانوں کی طرح طرح کی مزاحمتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا یا پھر یہ ان رکاوٹوں کی طرف اشارہ ہے جو ان کی طرف سے مومنین کو حج و عمرہ کے مراسم کی ادائیگی میں حائل تھیں۔

تعجب کی بات ہے کہ برائیوں میں آلودہ یہ مشرکین اپنے آپ کو اس عظیم مرکزِ عبادت کا سرپرست سمجھتے تھے لیکن قرآن مزید کہتا ہے: یہ کبھی بھی اس مقدس مرکز کے سرپرست نہیں تھے (وما کانوا اولیآءہ) اگرچہ وہ اپنے آپ کو خانۂ خدا کا متولی اور صاحبِ اختیار فرض کرتے تھے مگر صرف وہی لوگ اس کی سرپرستی کا حق رکھتے ہیں جو موحد اور پرہیزگار ہیں (ان اولیآؤہ الا المتقون) لیکن ان میں سے اکثر اس واقعیت اور حقیقت سے بے خبر ہیں (ولکن اکثرھم لا یعلمون)۔

اگرچہ یہ حکم مسجد الحرام کے بارے میں بیان کیا گیا ہے لیکن درحقیقت تمام مراکزِ دینی، مساجد اور مذہبی اداروں پر محیط ہے۔ ان کے متولی اور سرپرست پاکیزہ ترین، پرہیزگار اور نہایت فعال افراد ہونے چاہئیں تاکہ وہ انہیں تعلیم و تربیت اور بیداری و آگاہی کے پاک اور زندہ مراکز بنائیں نہ کہ ایسے مٹھی بھر جانبدار، خود فروش اور آلودہ افراد ہوں جو انہیں تجارتی

اڈہ اور افکار کی خرابی اور حق سے بے گانگی کے مرکز میں تبدیل کردیں۔

ہمارا نظریہ ہے کہ اگر مسلمان مساجد اور مذہبی مراکز کے بارے میں اسی اسلامی حکم پر عمل کرتے تو آج مسلم معاشروں کی کوئی اور ہی شکل ہوتی۔

زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ مدعی تھے کہ ان کی بھی نماز اور عبادت ہے۔ وہ خانۂ خدا کے گرد سیٹیاں اور تالیاں بجانے کا احمقانہ کام کرتے تھے اور اسے نماز کا نام دیتے تھے لہٰذا قرآن مزید کہتا ہے: ان کی نماز خانہ خدا کعبہ کے گرد سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا اور کچھ نہ تھی (وما کان صلاتھم عند البیت الا مکآء و تصدیۃ)۔

تاریخ میں ہے کہ زمانہ جاہلیت میں کچھ ایسے عربی بدو تھے جو طواف کے وقت مادر زاد ننگے ہو جاتے تھے اور سیٹیاں بجانے تالیاں پیٹتے اور اسے عبادت کا نام دیتے تھے۔

نیز منقول ہے کہ جب پیغمبر اکرمؐ حجر اسود کے پاس شمال کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوتے (تاکہ آپ کا رخ کعبہ اور بیت المقدس دونوں کی طرف ہو جائے) اور نماز ادا فرماتے تو بنی سہم کے دو شخص آنحضرتؐ کے دائیں بائیں کھڑے ہو جاتے۔ ایک چیختا چنگھاڑتا اور دوسرا تالیاں پیٹتا تاکہ پیغمبر اکرمؐ کی نماز خراب ہو جائے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اب جب کہ تمہارے تمام کام یہاں تک کہ تمہاری نماز اور عبادت ایسی احمقانہ، بری اور شرمناک ہے تو تم سزا کے مستحق ہو "پس اپنے اس کفر کی وجہ سے عذاب الٰہی کو چکھو" (فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون)۔

جس وقت انسان عربوں کی زمانہ جاہلیت کی تاریخ کی ورق گردانی کرتا ہے اور اس کے ان حصوں کا مطالعہ کرتا ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے تو بڑے تعجب سے دیکھتا ہے کہ ہمارے زمانے میں جو اصطلاحاً فضا اور ایٹم کا بھی زمانہ ہے، کئی ایسے لوگ ہیں جو زمانۂ جاہلیت کے اعمال دھراتے ہیں اور پھر اپنے آپ کو عبادت کرنے والوں کی صف میں خیال کرتے ہیں۔ قرآنی آیات اور بعض اوقات وہ اشعار جو پیغمبر اکرمؐ یا حضرت علیؑ کی مدح میں ہیں کو موسیقی کی دھنوں میں ملا کر رقص کی طرح اپنا سر، گردن اور ہاتھ ہلاتے ہیں۔ پھر اسے ان مقدسات کی خدمت میں خراج عقیدت قرار دیتے ہیں۔ یہ اعمال کبھی وجد و سماع کے نام پر، کبھی ذکر و حال کے نام پر اور کبھی دوسرے ناموں پر خانقاہوں اور دیگر مقامات پر انجام پاتے ہیں۔ حالانکہ اسلام ان تمام باتوں سے بیزار ہے اور یہ اعمال زمانہ جاہلیت کے اعمال ہی کا نمونہ ہیں۔

یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ زیر بحث تیسری آیت میں ان سے سزا اور عذاب کی (دو شرائط کے ساتھ) نفی کی گئی ہے جب کہ چوتھی آیت میں ان کے لیے عذاب کا ذکر ہے تو کیا یہ دونوں آیات آپس میں تضاد رکھتی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تیسری آیت میں دنیاوی سزاؤں کی طرف اشارہ ہے اور چوتھی آیت میں ممکن ہے دوسرے جہان کی سزا کی طرف اشارہ ہو اور یا اس طرف اشارہ ہو کہ یہ گروہ اس دنیا میں بھی سزا کا استحقاق رکھتا ہے اور اس کا سبب ان کے لیے فراہم ہے اور اگر پیغمبر ان کے درمیان سے اٹھ جائیں اور یہ توبہ بھی نہ کریں تو وہ عذاب انہیں دامن گیر ہوگا۔

۳۶۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ لِیَصُدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ
فَسَیُنۡفِقُوۡنَہَا ثُمَّ تَکُوۡنُ عَلَیۡہِمۡ حَسۡرَۃً ثُمَّ یُغۡلَبُوۡنَ ۬ؕ وَ
الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِلٰی جَہَنَّمَ یُحۡشَرُوۡنَ ﴿ۙ﴾
۳۷۔ لِیَمِیۡزَ اللّٰہُ الۡخَبِیۡثَ مِنَ الطَّیِّبِ وَ یَجۡعَلَ الۡخَبِیۡثَ
بَعۡضَہٗ عَلٰی بَعۡضٍ فَیَرۡکُمَہٗ جَمِیۡعًا فَیَجۡعَلَہٗ فِیۡ جَہَنَّمَ ؕ
اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿٪﴾

ترجمہ

۳۶۔ جو کافر ہو گئے ہیں وہ اپنے اموال لوگوں کو راہ خدا سے روکنے کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ وہ ان اموال کو (جنہیں حاصل کرنے کے لیے زحمت اٹھاتے ہیں اس راہ میں) خرچ کرتے ہیں لیکن یہ ان کے لیے حسرت و اندوہ کا سبب ہوگا اور پھر وہ شکست کھا جائیں گے اور (دوسرے جہان میں یہ) کافر سب کے سب جہنم کی طرف جائیں گے۔

۳۷۔ (یہ سب کچھ) اس لیے ہے کہ خدا (چاہتا ہے کہ) ناپاک کو پاک سے جدا کر دے اور ناپاکوں کو ایک دوسرے پر رکھ کر متراکم کر دے اور دوزخ میں ایک ہی جگہ قرار دے اور یہ ہیں زیاں کار۔

شانِ نزول

تفسیر علی بن ابراہیم اور بہت سی دوسری تفاسیر میں ہے کہ مندرجہ بالا آیت جنگ بدر کے لیے مکہ کے لوگوں کی مالی امداد کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے کیونکہ جب مشرکین مکہ ابوسفیان کے قاصد کے ذریعے واقعہ سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے بہت سا مال و اسباب اکٹھا کیا تاکہ اپنے جنگی ساتھیوں کی مدد کریں لیکن آخر کار وہ شکست کھا گئے اور مارے گئے اور جہنم کی آگ کی طرف چلے گئے اور اس راہ میں انہوں نے جو کچھ صرف کیا تھا ان کی حسرت و اندوہ کا سبب بنا۔

البتہ پہلی آیت میں ان کی باقی امداد کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے اسلام کے خلاف مقابلوں میں کی تھیں اور اس

مسئلے کو ایک عمومی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔
بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ آیت ابوسفیان کی جنگ احد میں دو ہزار کرائے کے سپاہیوں کی مدد کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن چونکہ یہ آیات جنگ بدر سے مربوط آیات کے ساتھ آئی ہیں اس لیے پہلی شانِ نزول زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

تفسیر

آیت کی شانِ نزول جو کچھ بھی ہو اس کا مفہوم جامع ہے اور یہ دشمنانِ حق و عدالت کی ان تمام مالی امدادوں کے بارے میں ہے جو وہ اپنے بُرے مقاصد کی پیش رفت کے لیے کرتے تھے۔ پہلے فرمایا گیا ہے: کافر اور حق دشمن اپنا مال خرچ کرتے ہیں تاکہ لوگوں کو راہِ حق سے روکیں (ان الذین کفروا ینفقون اموالهم لیصدوا عن سبیل الله) لیکن اموال کا یہ صرف کرنا ان کی کامیابی کا باعث نہیں بن سکتا "عنقریب وہ یہ اموال خرچ کریں گے لیکن انجام کار وہ ان کی حسرت و اندوہ کا سبب ہوگا (فسینفقونها ثم تکون علیهم حسرة) اور پھر وہ اہلِ حق کے ہاتھوں مغلوب ہوں گے (ثم یغلبون)۔
یہ لوگ نہ صرف اس جہان میں حسرت و شکست میں گرفتار ہوں گے بلکہ دوسرے جہان میں یہ کافر اکٹھے ہو کر جہنم میں جائیں گے (والذین کفروا الی جهنم یحشرون)۔

چند اہم نکات

۱۔ اس آیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شکست کھانے سے پہلے ہی اپنے کام کی بے ہودگی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور چونکہ انہوں نے جو اموال خرچ کیے ہیں ان کا انہیں کوئی دوامی نتیجہ میسر نہیں آیا لہٰذا رنج و اندوہ میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور یہ ان کی ایک دنیاوی سزا ہے۔
ان کی دوسری سزا ان کے منصوبوں کی شکست ہے کیونکہ کرائے کے فوجی اور مال و دولت کے عشق میں جنگ لڑنے والے مقدس ہدف کی خاطر لڑنے والے صاحبانِ ایمان کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے۔
دورِ حاضر کے حوادث نے بھی بارہا یہ بات ثابت کی ہے کہ طاقتور حکومتیں جو اپنے فوجیوں کو دولت اور ثروت کا لالچ دے کر اور جنسی خواہشات کی تشویق کے ذریعے چھوٹی سی قوموں کے مقابلے میں جو ایمان کی بناء پر جنگ کرتی ہیں، ذلت و رسوائی سے مغلوب ہو جاتی ہیں۔
ان دو دنیاوی سزاؤں کے علاوہ انہیں ایک تیسری سزا کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ سزا دوسرے جہان میں ہوگی اور وہ غضبِ الٰہی کے جہنم میں گرفتار ہوں گے۔
۲۔ جو کچھ مندرجہ بالا آیت میں آیا ہے ہماری آج کی دنیا میں بھی اس کے بہت سے نمونے ہیں۔ شیطانی سامراجی قوتیں، ظلم و فساد کے طرف دار اور بے پردہ و باطل مذاہب کے حامی اپنے اہداف کی پیش رفت اور انسانوں کو راہِ حق سے روکنے کی خاطر مختلف صورتوں میں بہت زیادہ سرمایہ صرف کرتے ہیں۔

کبھی کرائے کے فوجیوں کی صورت میں، کبھی ظاہراً انسانی امداد کی شکل میں مثلاً ہسپتالوں اور اسکولوں کی تعمیر کی صورت میں، کبھی ثقافتی امداد کے حوالے سے لیکن اصلی مقصد سب کا ایک ہے اور وہ ہے استعمار اور ظلم و ستم کی وسعت اور اگر سچے مومن مجاہدین جنگ بدر کی طرح منظم اور پرعزم طور پر صف بندی کر لیں تو وہ ان تمام سازشوں کو نقش برآب کر سکتے ہیں اور ان سرمایوں کی حسرت سے ان کے دلوں کو بھر سکتے ہیں اور آخر کار انہیں دوزخ میں بھیج سکتے ہیں۔

۲۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ دعوت پیغمبر کی صداقت کی نشانی ہے کیونکہ اس میں آنے والے واقعات کی خبر دی گئی ہے اس میں دشمنانِ اسلام کی شکست کی خبر ہے جب کہ انہوں نے کامیابی کے لیے بہت مال و دولت صرف کیا تھا۔

لیکن اگر ہم آیت کو آئندہ کے واقعات سے مربوط غیبی خبر نہ بھی سمجھیں تب بھی کم از کم حق و باطل کے بارے میں قرآن نے ایک دقیق اور حساب شدہ مفہوم پیش کیا ہے جو قرآن اور تعلیماتِ اسلام کی عظمت کو واضح کرتا ہے۔

گذشتہ آیت میں دشمنانِ حق کے مالی مصارف کے تین بُرے نتائج واضح کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: یہ حسرت، شکست اور بدبختی اس بنا پر ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ ناپاک کو پاک سے اس جہان میں اور دوسرے جہان میں الگ الگ کر دے (لیمیز اللہ الخبیث من الطیب)۔

یہ ایک سنتِ الٰہی ہے کہ ہمیشہ پاک اور نجس مخلص اور ریا کار، سچے مجاہد اور جھوٹے مجاہد، خدائی کام اور شیطانی کام، انسانی پروگرام اور ضد انسانیت پروگرام واضح ہوئے بغیر نہیں رہتے آخر پہچانے جاتے ہیں اور جلوۂ حق نمایاں ہو کے رہتا ہے البتہ یہ اس صورت میں ہے کہ حق کے طرفدار جنگ بدر کے مسلمانوں کی کافی آگاہی اور جذبۂ فداکاری سے سرشار ہوں۔

مزید ارشاد ہوتا ہے: خدا ناپاک چیزوں کو ایک دوسرے کا ضمیمہ قرار دیتا ہے اور سب کو ایک ڈھیر بنا دیتا ہے اور جہنم میں قرار دیتا ہے (ویجعل الخبیث بعضہ علی بعض فیرکمہ جمیعا فیجعلہ فی جھنم)۔

خبیث اور ناپاک جس گروہ سے ہوں اور جس شکل اور لباس میں ہوں آخر کار ایک ہی شکل میں ڈھل جائیں گے اور ان سب کا انجام زیاں کاری ہی ہوگا جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ وہ خسارے میں ہیں اور زیاں کار ہیں (اولٰئک ھم الخاسرون)۔

۳۸۔ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ۝

۳۹۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

۴۰۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى

وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ○

ترجمہ

۳۸۔ وہ لوگ کافر ہو گئے ہیں انہیں کہہ دو کہ اگر وہ مخالفت سے باز آ جائیں (اور ایمان لے آئیں) تو ان کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے اور اگر وہ سابقہ اعمال کی طرف پلٹ جائیں تو گذشتہ لوگوں والی خدا کی سنت ان کے بارے میں جاری ہو گی۔

۳۹۔ اور ان کے ساتھ جنگ کرو تا کہ (شرک اور سلبِ آزادی کا) فتنہ ختم ہو جائے اور دین (اور عبادت) سب خدا کے ساتھ مخصوص ہو جائے اور اگر وہ (شرک اور فساد کی راہ سے لوٹ آئیں اور غلط اعمال سے) اجتناب کریں تو (خدا انہیں قبول کرے گا) جو کچھ وہ انجام دیتے ہیں خدا اُسے دیکھنے والا ہے۔

۴۰۔ اور اگر وہ روگردانی کریں تو جان لو کہ (وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے کیونکہ) خدا تمہارا سرپرست ہے وہ بہترین سرپرست اور بہترین مددگار ہے۔

تفسیر

ہم جانتے ہیں کہ قرآن کی روش ہے کہ وہ بشارت اور انذار کو اکٹھا کر دیتا ہے یعنی جیسے وہ دشمنانِ حق کو سخت اور دردناک عذاب کی تہدید کرتا ہے اسی طرح لوٹ آنے کا راستہ بھی ان کے لیے کھلا رکھتا ہے۔

محلِ بحث آیات میں سے پہلی آیت بھی قرآن کے اسی طریقے کے مطابق ہے۔ اس میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر وہ مخالفت، ہٹ دھرمی اور سرکشی سے باز رہیں اور دینِ حق کی طرف پلٹ آئیں تو ان کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے (قل للذین کفروآ ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف)۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کو قبول کر لینے سے گذشتہ دور میں جو کچھ بھی ہوا ہو اسے بخش دیا جاتا ہے اور یہ بات اسلامی روایات میں ایک عمومی قانون کے طور بیان کی گئی ہے جیسے کہا گیا ہے:

الاسلام یجب ما قبلہ

اسلام اپنے ماقبل کو چھپا دیتا ہے۔

اسی طرح اہلِ سنت کے طرق سے پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

ان الاسلام یھدم ما کان قبلہ، وان الھجرۃ تھدم ما کان قبلھا وان الحج

یهدم ما کان قبله

اسلام سے پہلے جو کچھ ہوا اسلام اسے ختم کر دیتا ہے اور ہجرت اپنے ماقبل کو مٹا دیتی ہے اور اسی طرح خانۂ خدا کا حج بھی اپنے ماقبل کو محو کر دیتا ہے [1]

مراد یہ ہے کہ اسلام سے پہلے کے غلط اعمال و افعال یہاں تک کہ فرائض و واجبات کا ترک کرنا اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے ختم ہو جاتا ہے اور اس قانون کا عطف اور ربط گزشتہ سے نہیں ہے۔ اسی لیے کتب فقہ اسلامی میں ہے کہ مسلمان ہونے والے شخص کے لیے گزشتہ عبادات کی قضا تک ضروری نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: لیکن اگر وہ اپنی غلط روش سے باز نہ آئیں" اور اگر وہ سابقہ اعمال کی طرف پلٹ جائیں تو جو خدائی سنت گزشتہ لوگوں کے لیے رہی ہے ان کے لیے بھی انجام پائے گی" (وان یعودوا فقد مضت سنة الاولین)۔ اور اس سنت سے مراد وہی انجام ہے جس سے دشمنان حق انبیاء کے مقابلے میں اور خود مشرکین مکہ تک جنگ بدر میں پیغمبر اسلام کے مقابلے میں دوچار ہوئے ہیں۔

سورۂ غافر کی آیت ۵۱ میں ہے:

انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیٰوة الدنیا ویوم یقوم الاشهاد

ہم اپنے رسولوں کی اور مومنین کی دنیاوی زندگی میں اور روز قیامت کہ جس میں گواہ کھڑے ہوں گے مدد کریں گے۔

اسی طرح سورہ بنی اسرائیل۔

سنة من قد ارسلنا قبلك من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلا

یہ ہماری سنت گزشتہ پیغمبروں کے بارے میں ہے اور یہ سنت کبھی تبدیل نہیں ہوگی۔

گزشتہ آیت میں چونکہ دشمنوں کو حق کی طرف پلٹ آنے کی دعوت دی جا چکی ہے اور ممکن تھا کہ یہ دعوت مسلمانوں میں یہ فکر پیدا کر دیتی کہ اب جہاد کا دور ختم ہو گیا ہے اور انعطاف اور نرمی کے علاوہ اب کوئی راستہ نہیں لہٰذا اس اشتباہ کو دور کرنے کے لیے مزید فرمایا گیا ہے "ان سخت ترین دشمنوں کے ساتھ جنگ کرو اور اس جنگ کو جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور سارے کا سارا دین اللہ کے لیے ہو جائے (وقاتلوهم حتی لا تکون فتنة ویکون الدین کله لله)۔

جیسا کہ ہم سورہ بقرہ کی آیہ ۱۹۳ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں لفظ "فتنة" کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں ہر قسم کے دباؤ ڈالنے والے اعمال شامل ہیں۔ اس لیے کبھی یہ لفظ قرآن میں شرک و بت پرستی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جو کہ معاشرے کے لیے بہت سی رکاوٹیں اور دباؤ پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح ایسے دباؤ کے مفہوم میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جو دعوت اسلام

---

[1] صحیح مسلم طبق نقل المنار جلد نہم صفحہ ۶۶۵۔

کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے اور حق طلب لوگوں کی آواز کو دبانے کے لیے ہو۔ یہاں تک کہ مومنین کو کفر کی طرف پلٹانے کے لیے ڈالے جانے والے دباؤ پر بھی "فتنہ" کا اطلاق ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں بعض مفسرین نے "فتنہ" کو شرک کے معنی میں لیا ہے بعض نے دشمنوں کی مسلمانوں سے فکری و اجتماعی آزادی سلب کرنے کی کوششوں کے معنی میں لیا ہے لیکن حق یہ ہے کہ آیت کا مفہوم وسیع ہے۔ اس سے مراد شرک بھی ہے (" ویکون الدین کلہ للہ" کے قرینہ سے) دشمنوں کی طرف سے مسلمانوں پر وارد ہونے والے ہر قسم کے دباؤ بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے۔

مقصدِ جہاد اور ایک بشارت

مندرجہ بالا آیت مقدس اسلامی جہاد کے مقاصد میں سے دو کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

۱۔ بت پرستی کی بساط الٹنا اور بتکدوں کا خاتمہ ــــ کیونکہ جیسے ہم مقاصدِ جہاد کی بحث میں کہہ چکے ہیں کہ دینی آزادی ان اشخاص کے لیے مخصوص ہے جو کسی آسمانی دین کی پیروی کریں اور ان کے لیے عقیدہ اور نظریہ بدلنے کے لیے دباؤ صحیح نہیں ہے لیکن بت پرستی نہ دین ہے نہ مکتب و مذہب بلکہ بے ہودگی، انحراف اور کجروی ہے۔ حکومت اسلامی کو چاہیے کہ پہلے تو تبلیغ کے ذریعے اور اگر ممکن نہ ہو تو طاقت کے بل پر ہر جگہ سے بت پرستی ختم کرے اور بت خانوں کو برباد کر دے۔

۲۔ اظہارِ رائے، تبلیغ اور نشر و اشاعت کی آزادی ــــ اس کے لیے بھی اسلام اجازت دیتا ہے کہ اگر کچھ لوگ اپنے عمل سے مسلمانوں سے عمل کی آزادی اور نشر و اشاعت، تبلیغ اور دعوتِ اسلام کی آزادی میں حائل ہوں تو مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ جہاد آزادی کا راستہ اپنائیں اور منطقی تبلیغ کی آزادی حاصل کریں (مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول ص ۳۶۳ تا ص ۳۶۹ اُردو ترجمہ کی طرف رجوع کریں)۔

اہلِ سنت کی تفاسیر (مثلاً روح البیان) میں اور اہلِ تشیع کی مختلف تفاسیر میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

لم یجیٔ تأویل ہذہ الآیۃ ولو قام قائمنا بعد سیری من یدرکہ ما یکون من تأویل ہذہ الآیۃ ولیبلغن دین محمد ما بلغ اللیل حتی لا یکون مشرک علی ظہر الارض

اس آیت کی اصلی تاویل اور تفسیر ابھی تک ظاہر نہیں ہوئی اور جب ہمارا قائمؑ قیام کرے گا تو جو لوگ ان کا زمانہ پائیں گے وہ اس آیت کی تاویل کو دیکھیں گے۔ خدا کی قسم اس وقت دینِ محمدؐ ان تمام جگہوں پر پہنچ جائے گا جن پر سکون بخش رات اپنا پردہ ڈالتی ہے، یہاں تک کہ روئے زمین پر کوئی مشرک اور بت پرست باقی نہیں رہے گا[1]

---

[1] یہ عبارت تفسیر مجمع البیان میں منقول ہے۔

تفسیر المنار کے مؤلف نے حضرت مہدیؑ کے قیام کے بارے میں اپنے مخصوص تعصب کی بناء پر اس حدیث کا انکار کیا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی تفسیر کی تصریحات میں وہابی مکتب و مذہب کی طرف خصوصی میلان کا اظہار کرتا ہے حالانکہ سخت قسم کے وہابی بھی صراحت کے ساتھ حضرت مہدیؑ کے ظہور کو ایک مسلم امر سمجھتے ہیں اور اس سلسلے کی روایات کو متواتر قرار دیتے ہیں کہ جن کے اسناد و مدارک سورہ توبہ کی آیہ ۳۲ کے ذیل میں (اسی جلد میں) پیش کیے جائیں گے۔

مفسر مذکور کے اشتباہ کے اصلی نقطہ اور اس کے جواب کی طرف بھی ہم اشارہ کریں گے۔ کتاب "مصلح بزرگ جہانی" میں بھی ہم نے زیادہ تفصیل سے ان مطالب کا ذکر کیا ہے۔ نیز اگر ظہور حضرت مہدیؑ سے مربوط کچھ روایات غلط ہیں یا خرافات پر مشتمل ہیں تو اس کی وجہ سے ان سب صحیح اور متواتر روایات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آیت کے ذیل میں دوبارہ ان کے شدت عمل کے مقابلے میں دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھایا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے: اگر وہ اپنی راہ و روش سے دستبردار ہو جائیں تو وہ جو کچھ کرتے ہیں خدا اس سے آگاہ ہے اور وہ ان سے اپنے خاص لطف و عنایت کا برتاؤ کرے گا (فان انتھوا فان اللّٰہ بما یعملون بصیر)۔

اور اگر وہ اپنی روگردانی جاری رکھیں اور دعوت حق کے سامنے سر تسلیم خم نہ کریں تو جان لو کہ کامیابی تمہارے لیے ہے اور شکست ان کے انتظار میں ہے کیونکہ خدا تمہارا مولا اور سرپرست ہے (و ان تولوا فاعلموا ان اللّٰہ مولٰکم)۔

اور وہ بہترین مولا و رہبر اور بہترین یاور و مددگار ہے (نعم المولٰی و نعم النصیر)۔

۴۱۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ
لِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ
اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ
يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

ترجمہ

۴۱۔ اور جان لو کہ جس قسم کی غنیمت تمہیں ملے تو خدا، رسول، ذی القربیٰ، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے اس کا پانچواں حصہ ہے، اگر تم خدا پر اور جو کچھ ہم نے اپنے بندہ پر حق کی باطل سے جدائی کے دن اور (صاحب ایمان اور بے ایمان) دو گروہوں کی مڈبھیڑ کے دن (جنگ بدر کے روز) نازل کیا، ایمان لے آؤ اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

تفسیر

ایک اہم اسلامی حکم ــــ خمس

سورت کی ابتدا میں ہم نے دیکھا ہے کہ کچھ مسلمانوں نے جنگ بدر کے بعد جنگی غنائم کے سلسلے میں جھگڑا کیا تھا۔ خدا نے مادۂ اختلاف کی زیشہ کنی کے لیے غنائم کو مکمل طور پر پیغمبرؐ کے اختیار میں دے دیا تاکہ وہ جیسے مصلحت سمجھیں انہیں صرف کریں اور پیغمبر اکرمؐ نے جنگ میں حصہ لینے والے غازیوں کے درمیان انہیں مساوی طور پر تقسیم کر دیا۔

زیر نظر آیت درحقیقت اسی مسئلہ غنائم کی طرف بازگشت ہے۔ یہ ان آیات کی مناسبت سے ہے جو اس سے قبل جہاد کے بارے میں آئی ہیں اور چونکہ عام طور پر جہاد کا غنائم کے مسئلے سے تعلق ہوتا ہے لہٰذا حکم غنائم کا بیان یہاں مناسبت رکھتا ہے (بلکہ جیسا کہ ہم بتائیں گے قرآن یہاں اس حکم کو جنگی غنائم سے بھی بالاتر لے گیا ہے اور ہر طرح کی آمدن کی طرف اشارہ کرتا ہے)۔

آیت کے شروع میں فرمایا گیا ہے، جان لو کہ جیسی غنیمت بھی تمہیں نصیب ہو اس کا پانچواں حصہ خدا، رسول، ذی القربیٰ (ائمہ اہل بیت) اور (خاندان رسولؐ میں سے) یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے (واعلموا انما غنمتم من شیء فان لله

خمسہ وللرسول ولذی القربٰی والیتٰمٰی والمساکین وابن السبیل)۔

تاکید کے طور پر مزید فرمایا گیا ہے، اگر تم خدا پر اور وہ جو ہم نے اپنے بندے پر (جنگ بدر کے دن) حق کے باطل سے جدا ہونے کے دن جب مومن و کافر ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئے تھے نازل کیا، ایمان لائے ہو تو اس حکم پر عمل کرو اور اس کے سامنے سرتسلیم خم کردو (ان کنتم اٰمنتم باللّٰہ وما انزلنا علٰی عبدنا یوم الفرقان یوم التقی الجمعان)۔

یہاں اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اس آیت میں روئے سخن مومنین کی طرف ہے کیونکہ جہاد اسلامی کے غنائم کے بارے میں بحث ہو رہی ہے اور یہ بات واضح ہے کہ مجاہد اسلام مومن ہوتا ہے، اس کے باوجود فرمایا گیا ہے "اگر تم خدا اور رسول پر ایمان لائے ہو" یہ اس طرف اشارہ ہے کہ صرف یہ کہ اظہار ایمان، ایمان کی علامت نہیں بلکہ میدانِ جہاد میں شرکت بھی ہو سکتا ہے ایمان کامل کی نشانی نہ ہو اور یہ عمل کچھ اور مقاصد کے لیے انجام پا رہا ہو۔ مومن کامل وہ شخص ہے جو تمام احکام کے سامنے اور بالخصوص مالی احکام کے سامنے سرتسلیم خم کیے ہوئے ہو اور خدائی احکام میں تبعیض کا قائل نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک حکم مان لے اور دوسرے کو چھوڑ دے۔

آیت کے آخر میں خدا کی غیرمحدود قدرت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور خدا ہر چیز پر قادر ہے (واللّٰہ علٰی کل شیء قدیر)۔ یعنی باوجودیکہ میدانِ بدر میں تم ہر لحاظ سے اقلیت میں تھے اور دشمن ظاہراً ہر لحاظ سے برتری رکھتا تھا، قادر و توانا خدا نے انہیں شکست دی اور تمہاری مدد کی یہاں تک کہ تم کامیاب ہو گئے۔

چند اہم نکات

۱۔ حق کی باطل سے جدائی کا دن: اس آیت میں یوم بدر کو حق کی باطل سے جدائی کا دن (یوم الفرقان) اور کفر کے طرفداروں کی ایمان کے طرفداروں سے مڈبھیڑ کا دن قرار دیا گیا ہے اور اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بدر کا تاریخی دن ایک ایسا دن تھا جس میں پیغمبر اسلام کی حقانیت کی نشانیاں ظاہر ہوئیں کیونکہ آپ نے پہلے سے مسلمانوں سے کامیابی کا وعدہ کر رکھا تھا جب کہ ظاہراً اس کی کوئی نشانی موجود نہ تھی۔ ایسے میں کامیابی کے لیے مختلف غیر متوقع عوامل اکٹھے ہو گئے کہ انہیں اتفاق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس بنا پر ان آیات کی صداقت کہ جو رسول اللہ پر ایسے دن نازل ہوئیں ان کی دلیل خود انہی میں پوشیدہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنگ بدر کا دن (یوم التقی الجمعان) درحقیقت مسلمانوں کے لیے ایک عظیم خدائی نعمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ ابتداء میں ایک گروہ اس جنگ سے احتراز کرتا تھا لیکن یہی جنگ اور اس میں کامیابی انہیں کئی سال آگے لے گئی اور مسلمانوں کا نام اور شہرت اس کے سبب تمام جزیرۂ عرب میں پھیل گئی اور اس نے تمام اہلِ عرب کو نئے دین اور اس کی حیرت انگیز قدرت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔

ضمناً یہ دن کہ جو امتِ اسلامی کے لیے بھی "وانفسنا" یعنی نفسا نفسی کا دن تھا اسلام کے سچے مومن، جھوٹے دعویداروں سے ممتاز ہو گئے لہٰذا یہ دن ہر لحاظ سے حق کی باطل سے جدائی کا دن تھا۔

۲۔ ایک وضاحت: اس سورہ کی ابتداء میں ہم کہہ چکے ہیں کہ سورہ انفال کی آیت اور اس آیت میں کوئی تضاد نہیں ہے اور اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم ایک کو دوسری کا ناسخ سمجھیں کیونکہ آیہ انفال کا تقاضا یہ ہے کہ جنگی غنائم بھی پیغمبرؐ سے متعلق ہیں لیکن

رسول اللہؐ پانچ میں سے چار حصّے جنگجو غازیوں کو بخش دیتے ہیں اور پانچواں حصّہ ان مصارف کے لیے جو آیت میں معین ہوئے ہیں رکھ لیتے ہیں۔ مزید توضیح کے لیے اسی سورہ کی پہلی آیت کے ذیل میں کی گئی بحث کی طرف رجوع کیجئے۔

۳۔ "ذی القربٰی" سے کیا مراد ہے؛ اس آیت میں "ذی القربٰی" سے مراد نہ تو سب لوگوں کے رشتہ دار ہیں اور نہ ہی رسول اللہؐ کے سب رشتہ دار بلکہ آئمہ اہل بیتؑ مراد ہیں۔ اس امر کی دلیل وہ متواتر روایات ہیں جو اہل بیت پیغمبرؐ کے طرق سے نقل ہوئی ہیں[1] کتب اہل سنت میں بھی اس طرف اشارے موجود ہیں۔

اس بناء پر وہ لوگ کہ جو خمس کے ایک حصے کو پیغمبر اسلامؐ کے تمام رشتہ داروں سے متعلق قرار دیتے ہیں انہیں اس سوال کا سامنا کرنا پڑے گا کہ یہ کیسا امتیاز ہے جو اسلام نے پیغمبرؐ کے رشتہ داروں سے متعلق روا رکھا ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام نسل، قوم اور قبیلہ سے بالاتر ہے۔ لیکن اگر اسے آئمہ اہل بیتؑ سے مخصوص سمجھیں تو اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وہ رسول اللہؐ کے جانشین اور اسلامی حکومت کے رہبر و رہنما تھے اور ہیں تو خمس کا ایک حصّہ ان سے مختص کیے جانے کی علت واضح ہو جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدا کا حصّہ، پیغمبرؐ کا حصّہ اور ذی القربٰی کا حصّہ تینوں حصّے حکومت اسلامی کے قائد و رہبر سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اپنی سادہ زندگی کا اس سے انتظام کرتا ہے باقی مختلف مخارج کہ جو رہبری امت کا لازمہ ہیں کے لیے صرف کرتا ہے۔ یعنی حقیقت میں یہ حصّہ معاشرے اور عوام کی ضرورت کے لیے ہے۔

بعض مفسرین اہل سنت "ذی القربٰی" پیغمبر اکرمؐ کے تمام رشتہ داروں کو سمجھتے ہیں۔ مثلاً المنار کا مؤلف بھی اسی بات کا قائل ہے لہٰذا وہ مذکورہ اعتراض کے جواب میں ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور پیغمبرؐ کی اسلامی حکومت کے لیے تشریفات اور تکلفات کا قائل ہوا ہے اور رسول اللہؐ کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم وقبیلہ کو مال کے ذریعے اپنے گرد جمع رکھا۔ واضح ہے کہ اس قسم کی منطق کسی طرح بھی ایک عالمی اسلامی انسانی اور قوم وقبیلہ کے امتیازات سے پاک حکومت سے مناسبت نہیں رکھتی (اس سلسلے میں کچھ مزید توضیح بھی ہے جو کہ آئندہ کی بحثوں میں آئے گی)۔

۴۔ "یتامٰی ومساکین وابن السبیل" سے یہاں کیا مراد ہے؛ کیا اس سے مراد صرف بنی ہاشم اور سادات کے یتیم، مسکین اور مسافر ہیں؛ اگرچہ ظاہر آیت تو مطلق ہے اور اس میں کوئی قید دکھائی نہیں دیتی۔ اس سلسلے میں ہم جو اسے منحصر قرار دیتے ہیں تو اس کی دلیل وہ بہت سی روایات ہیں جو طرق اہل بیتؑ میں وارد ہوئی ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ قرآن میں بہت سے احکام بطور مطلق آئے ہیں لیکن ان کی شرائط وقیود "سنت" کے وسیلے سے بیان ہوئی ہیں اور یہ بات زیر بحث آیت میں ہی منحصر نہیں جو تعجب کیا جائے۔

علاوہ ازیں اگر ہم دیکھیں کہ بنی ہاشم کے حاجت مندوں کے لیے زکوٰۃ مسلمہ طور پر حرام ہے تو چاہیے کہ کسی دوسرے ذریعے سے ان کی احتیاجات پوری کی جائیں۔ یہی امر اس کا قرینہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں بنی ہاشم کے حاجت مندوں کے لیے مخصوص حکم ہے۔ لہٰذا احادیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں؛

> جب خدا تعالیٰ نے ہم پر زکوٰۃ حرام فرمائی تو ہمارے لیے خمس مقرر فرمایا یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ ہم پر حرام ہے اور خمس حلال ہے[2]

---

۱ وسائل الشیعہ جلد ۶ بحث خمس کی طرف رجوع کیجئے۔

۲ حاشیہ صفحہ آئندہ پر

۵۔ کیا "غنائم" سے مراد فقط جنگی مالِ غنیمت ہے؟ دوسرا اہم موضوع جس پر اس آیت کے حوالے سے تحقیق کیا جانا چاہیے اور درحقیقت جس میں ایک اچھی بحث متمرکز ہے، یہ ہے کہ لفظ غنیمت جو زیرِ نظر آیت میں آیا ہے کیا فقط جنگی مال غنیمت کے بارے میں ہے یا اس کے مفہوم میں ہر طرح کی آمدن شامل ہے۔

پہلی صورت میں آیت فقط جنگی غنائم کے خمس کے بارے میں بیان کررہی ہے اور دیگر امور میں خمس کے بارے میں ہمیں صحیح و معتبر سنت اور روایات سے استفادہ کرنا چاہیے اور اس بات میں کوئی امر مانع نہیں کہ قرآن نے جہاد کے مسائل کے ذیل میں خمس کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا ہے اور دوسرے حصے کے بارے میں سنت سے وضاحت کی جائے۔

مثلاً قرآن مجید میں ہر روز کی پنجگانہ نماز کا صریحاً ذکر ہے اور اسی طرح واجب نمازوں میں سے طواف کی نمازوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن نمازِ آیات جس پر شیعہ سنی تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا۔ اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ نمازِ آیات کا چونکہ قرآن میں ذکر نہیں اور اس کا تذکرہ فقط سنت پیغمبرؐ میں آیا ہے لہٰذا اس پر عمل نہیں کیا جانا چاہیے۔

اسی طرح قرآن میں بعض غسلوں کی طرف اشارہ ہوا ہے اور بعض کا ذکر نہیں کیا گیا۔ کیا ان سے صرفِ نظر کرلیا جائے۔ یہ ایسی منطق ہے جسے کوئی مسلمان قبول نہیں کرتا۔

لہٰذا اس امر میں کوئی اشکال نہیں کہ قرآن خمس کے مواقع میں سے صرف ایک کی طرف اشارہ کرے اور باقی کو سنت پر چھوڑ دے۔ فقہ اسلام میں ایسی مثالیں بہت زیادہ ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں دیکھنا چاہیے کہ لفظ غنیمت لغت میں اور عرف میں کیا معنی دیتا ہے۔ کیا واقعاً یہ لفظ جنگی غنائم میں منحصر ہے یا ہر قسم کی آمدن اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ جو کچھ لغت کی کتب سے معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اس لفظ کی اصل جنگ کے حوالے سے نہیں اور نہ یہ اُس چیز ہی کو کہتے ہیں جو دشمن سے ہاتھ لگے بلکہ ہر قسم کی درآمد اور وصولی کو کہتے ہیں۔ بطور شاہد ہم چند ایک ایسی مشہور لغت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو علماء اور ادباء عرب کی مورد استناد ہیں۔

"لسان العرب" کی جلد ۱۲ میں ہے:

و الغنم الفوز بالشئ من غير مشقة .... و الغنم و الغنيمة و المغنم الفيئ .... و فی الحديث الرهن لمن رهنه له غنمه وعليه غرمه، غنمه زيادته و نماؤه و فاضل قيمته .... مغنم الشئ فاز به ......

"غنم" یعنی مشقت اور زحمت کے بغیر کسی چیز پر دسترس حاصل کرنا۔ نیز "غنم" "غنیمت" اور "مغنم" "فیئ" کے معنی میں ہیں (فیئ بھی لغت میں ایسی چیزوں کے معنی میں ہے جو زحمت اور تکلیف اٹھائے بغیر انسان تک پہنچ جائیں) اور حدیث میں آیا ہے کہ "رھن" اس کے لیے ہے جس نے اُسے اپنے پاس رہن رکھا ہے، غنیمت اور

حاشیہ صفحہ سابقہ: ۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۶ خمس کی بحث کے ذیل میں اور مجمع البیان زیرِ نظر آیت کے ذیل میں اہل سنت کے طرق سے نیز اس سلسلے میں منقول روایات کی طرف ہم جلد اشارہ کریں گے۔

اس کے منافع اس کے لیے ہیں اور اس کا نقصان بھی اسی کے لیے ہوگا۔ نیز "غنم" زیادتی، نمو اور قیمت میں اضافہ کے معنی میں ہے اور فلاں چیز کو غنیمت کے طور پر پایا یعنی اس تک دسترس حاصل کی۔

"تاج العروس" جلد ۹ میں ہے:

و الغنم الفوز بالشیٔ بلا مشقة

غنیمت اس چیز کو کہتے جس پر انسان بغیر مشقت کے دسترس حاصل کرے کتاب "قاموس" میں بھی "غنیمت" اسی مذکورہ معنی میں ذکر ہوا ہے۔

مفرداتِ راغب میں ہے:

"غنیمت" "غنم" کی اصل سے گوسفند کے معنی سے لیا گیا ہے۔

راغب مزید کہتا ہے:

ثم استعملوا فی کل مظفور بہ من جهة العدی وغیرهم

بعد ازاں یہ لفظ ہر اس چیز کے لیے استعمال ہونے لگا جو دشمن سے یا غیر دشمن سے حاصل کی جائے۔

یہاں تک کہ جن لوگوں نے "غنیمت" کے معانی میں سے ایک معنی "جنگی غنائم" بیان کیا ہے وہ بھی اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ اس کا اصلی معنی ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جو ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو انسان بغیر مشقت کے حاصل کرے۔

عام استعمال میں بھی "غنیمت" "غرامت" کے مقابلے میں ذکر ہوتا ہے۔ تو جس طرح غرامت کا معنی وسیع ہے اور ہر قسم کے تاوان اور ادائیگی پر محیط ہے اسی طرح غنیمت بھی وسیع معنی رکھتا ہے اور ہر ایسی درآمد اور وصولی پر محیط ہے جو قابل ملاحظہ ہو۔ نہج البلاغہ میں بہت سے مواقع پر یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔ خطبہ ۷۶ میں ہے:

اغتنم المهل

مہلتوں اور مواقع کو غنیمت سمجھو۔

خطبہ ۱۲۰ میں ہے:

من اخذها لحق وغنم

جو شخص دین خدا پر عمل کرے گا وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے اور فائدہ اٹھائے گا۔

خطبہ ۵۳ میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام مالک اشتر سے فرماتے ہیں:

ولا تکونن علیهم سبعا ضاریا تغتنم اکلهم

مصر کے لوگوں کے لیے درندے کی طرح نہ ہو جانا کہ انہیں کھا جانا اپنے لیے غنیمت اور درآمد سمجھنے لگو۔

خطبہ ۴۵ میں عثمان بن حنیف سے فرماتے ہیں:

فواللہ ما کنزت من دنیاکم تبرا ولا ادخرت من غنائمها وفرا

خدا کی قسم میں نے تمہارے سونے سے ذخیرہ اکٹھا نہیں کیا اور اس کے غنائم اور درآمدات سے زیادہ مال جمع نہیں کیا۔

نیز کلمات قصار کے جملہ ۳۳۱ میں آپ فرماتے ہیں:

ان اللہ جعل الطاعۃ غنیمۃ الاکیاس

خدا نے اطاعت کو عقلمندوں کے لیے غنیمت اور فائدہ قرار دیا ہے۔

خطبہ ۳۱ میں ہے:

واغتنم من استقرضک فی حال غناک

اگر کوئی شخص تیری تونگری کی حالت میں تجھ سے قرض چاہے تو اسے غنیمت سمجھ۔

اس قسم کی دیگر تعبیریں بہت زیادہ ہیں جو سب کی سب نشاندہی کرتی ہیں کہ لفظ غنیمت جنگی غنائم میں منحصر نہیں ہے۔

باقی رہے مفسرین —— تو بہت سے مفسرین کہ جنہوں نے اس آیت کے بارے میں بحث کی ہے صراحت کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ "غنیمت" اصل میں ایک وسیع معنی رکھتا ہے اور اس میں جنگی غنائم اور ان کے علاوہ غنائم اور کلی طور پر ہر وہ چیز شامل ہے جسے انسان زیادہ مشقت کے بغیر حاصل کرے۔ یہاں تک کہ جنہوں نے فقہاء اہل سنت کے فتوی کی بناء پر آیت کو جنگی غنائم کے ساتھ مخصوص کیا ہے وہ پھر بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس کے اصلی معنی میں یہ قید موجود نہیں ہے بلکہ انہوں نے ایک اور دلیل کی وجہ سے یہ قید لگائی ہے۔

اہل سنت کے مشہور مفسر قرطبی اپنی تفسیر میں آیت کے ذیل میں یوں رقم طراز ہے:

جان لو کہ (علماء اہل سنت) کا اس پر اتفاق ہے کہ آیت (واعلموا انما غنمتم) میں غنیمت سے مراد وہ اموال ہیں کہ جو جنگ میں قہر و غلبہ کی وجہ سے لوگوں کو ملیں لیکن توجہ رہے کہ یہ قید جیسا کہ ہم نے کہا ہے اس کے لغوی معنی میں موجود نہیں ہے لیکن عرف شرع میں یہ قید آئی ہے[1]

فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں تصریح کرتے ہیں:

الغنم الفوز بالشیء

غنیمت یہ ہے کہ انسان کسی چیز کے حصول پر کامیاب ہو جائے۔

لغت کے لحاظ سے اس معنی کے ذکر کے بعد کہتے ہیں:

غنیمت کا شرعی معنی (فقہاء اہل سنت کے نظریے کے مطابق) وہی جنگی غنائم ہیں[2]

نیز تفسیر المنار میں غنیمت کا ایک وسیع معنی ذکر کیا گیا ہے اور اسے جنگی غنائم سے مخصوص نہیں کیا گیا اگرچہ صاحب تفسیر کا عقیدہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کے وسیع معنی کو قید شرعی کی وجہ سے جنگی غنائم ہی میں محدود سمجھنا چاہیے[3]

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۴ صفحہ ۲۸۹۵

[2] تفسیر فخر الدین رازی جلد ۱۵ صفحہ ۱۶۴

[3] تفسیر المنار جلد ۱۰ صفحہ ۳

مشہور سنی مفسر آلوسی کی تفسیر روح المعانی میں بھی ہے کہ:

غنمہ اصل میں ہر قسم کے فائدے اور منفعت کے معنی میں ہے [1]

تفسیر مجمع البیان میں پہلے تو غنیمت کو جنگی غنائم کے ساتھ تفسیر کیا گیا ہے لیکن آیت کی تشریح کے موقع پر لکھا ہے:

قال اصحابنا ان الخمس واجب فی کل فائدة تحصل للانسان من المکاسب و ارباح التجارات و فی الکنوز والمعادن والغوص وغیر ذٰلك مما هو مذکور فی الکتب ویمکن ان یستدل علی ذٰلك بهٰذه الاٰیة فان فی عرف اللغة یطلق علی جمیع ذٰلك اسم الغنم و الغنیمة [2]

علماء شیعہ کا یہ نظریہ ہے کہ خمس ہر اس فائدے پر واجب ہے جو انسان حاصل کرتا ہے چاہے وہ کسب و تجارت کے طریق سے ہو یا خزانہ اور معدنیات سے یا دریا میں غوطہ کے ذریعے سے اور دیگر وہ امور جو کتب فقہ میں مذکور ہیں اور اس آیت سے بھی اس دعویٰ پر استدلال پیش کیا جا سکتا ہے کیونکہ عرف لغت میں ان تمام چیزوں کو غنیمت کہا جاتا ہے۔

حیرانگی کی بات ہے کہ ایک خود غرض شخص جو عوام کے افکار میں سم پاشی کے لیے خاص طور پر ماہر ہے اس نے خمس کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اس میں اس نے تفسیر مجمع البیان کی عبارت میں رسوا کنندہ تحریف کی ہے۔ اس کی عبارت کے پہلے حصے کو جس میں غنیمت کی تفسیر کے لیے جنگی غنائم کا ذکر کیا گیا ہے بیان کر دیا گیا ہے لیکن اس توضیح کو جو اس کے لغوی معنی کی عمومیت کے لیے اور آیت کے معنی کے حوالے سے آخر میں کی گئی ہے اسے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس عظیم اسلامی مفسر کی طرف ایک جھوٹے مطلب کی نسبت دی گئی ہے۔ گویا اس کے خیال میں تفسیر مجمع البیان صرف اسی کے پاس ہے اور کوئی دوسرا اس کا مطالعہ نہیں کرے گا اور تعجب کی بات یہ ہے کہ اس خیانت کا وہ صرف اسی موقع پر مرتکب نہیں ہوا بلکہ دوسرے مواقع پر بھی جو کچھ اس کے فائدے میں تھا اسے لے لیا ہے اور جو اس کے نقصان میں تھا اسے نظر انداز کر دیا ہے۔

تفسیر المیزان میں بھی علماء لغت کے کلمات کے حوالے سے تصریح کی گئی ہے کہ "غنیمت" ہر قسم کے فائدہ کو کہتے ہیں کہ جو تجارت یا کسب و کار یا جنگ کے ذریعے انسان کے ہاتھ لگے اور زیر نظر آیت کا محل نزول اگرچہ جنگی غنائم ہے تاہم ہم جانتے ہیں کہ محل نزول آیت کے مفہوم کی عمومیت کو مخصوص نہیں کر سکتا [3]

جو کچھ کہا جا چکا ہے اس تمام سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ:

آیت غنیمت ایک وسیع معنی رکھتی ہے اور ہر قسم کی آمدن، فائدے اور منفعت پر محیط ہے کیونکہ اس لفظ کا لغوی معنی عام ہے اور اسے کسی خاص معنی میں محدود کرنے کے لیے کوئی واضح دلیل موجود نہیں ہے۔ وہ واحد چیز جس کا بعض اہل سنت مفسرین نے

---

[1] تفسیر روح المعانی جلد ۱۰ صفحہ ۲

[2] تفسیر مجمع البیان جلد ۴ صفحہ ۵۴۳-۵۴۴

[3] المیزان جلد ۹ صفحہ ۸۹۔

سہارا لیا ہے یہ ہے کہ قبل و بعد کی آیات جہاد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور یہ امر اس بات کا قرینہ ہے کہ آیت غنیمت میں بھی جنگی غنائم کی طرف اشارہ ہے جب کہ ہم جانتے ہیں کہ آیتوں کی شان نزول اور سیاق و سباق آیت کی عمومیت کو محدود نہیں کرتے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں کوئی مانع نہیں کہ آیت کا مفہوم عمومی ہو جب کہ اس کا محل نزول جنگی غنائم ہوں کہ جو اس کلی حکم کا ایک جزوی مصداق ہیں۔ مثلاً سورہ حشر کی آیت ، میں ہے :

ما اٰتٰکم الرسول فخذوہ و ما نھٰکم عنہ فانتھوا

جو کچھ پیغمبر تمہارے لیے لائے اسے قبول کرو اور جس سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔

فرامین پیغمبر کی پیروی کے لازمی ہونے کے بارے میں یہ آیت ایک عمومی حکم بیان کر رہی ہے حالانکہ اس کا محل نزول ایسے اموال ہیں کہ جو دشمنوں سے بغیر جنگ کے مسلمانوں کے ہاتھ لگیں (اور اصطلاح میں اسے "فیئ" کہتے ہیں)۔

نیز سورہ بقرہ کی آیہ ۲۳۳ میں یہ قانون ایک عمومی صورت میں بیان ہوا ہے :

لا تکلف نفس الا وسعھا

کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں دی جاسکتی۔

حالانکہ اس آیت کا محل نزول دودھ پلانے والی عورتوں کی اجرت ہے اور نومولود بچے کے باپ کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق انہیں اجرت دے۔ تو کیا ایسے خاص موقع پر آیت کا نازل ہونا اس قانون (جس کی طاقت نہ ہو وہ ذمہ داری نہیں ہے) کی عمومیت کو ختم کر دیتا ہے ؟

خلاصہ یہ ہے کہ آیت جہاد کی آیات کے ضمن میں آئی ہے لیکن کہتی ہے کہ ہر فائدہ جو تمہیں کسی بھی مقام سے حاصل ہو کہ جس میں ایک جنگی مال غنیمت ہے اس کا خمس ادا کرو۔ خصوصاً لفظ "ما" جو موصولہ ہے اور لفظ "شیئ" دونوں عام ہیں اور کوئی قید و شرط نہیں رکھتے اس امر کی تائید کرتے ہیں۔

۶۔ کیا نصف خمس کا بنی ہاشم کے لیے مخصوص ہونا ترجیح نہیں ہے ؟ بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام کا یہ مالیاتی حکم بیس فیصد اموال پر مشتمل ہے اس میں سے آدھا یعنی دس فیصد سادات اور اولادِ پیغمبر کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ ایک قسم کا نسلی اور خاندانی امتیاز ہے اور اس میں یوں رشتہ داری کو ترجیح دی گئی نظر آتی ہے اور یہ بات اسلام کی عدالتِ اجتماعی اور اس کے عالمی ہونے کی روح کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ ایسی سوچ رکھتے ہیں انہوں نے اس اسلامی حکم کی شرائط اور خصوصیات کا مطالعہ نہیں کیا کیونکہ اس اعتراض کا مکمل جواب خود انہی شرائط میں پوشیدہ ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ :

پہلی بات تو یہ ہے کہ آدھا خمس جو سادات اور بنی ہاشم سے مربوط ہے وہ ان میں سے صرف حاجت مندوں کو دیا جانا چاہیے وہ بھی ایک سال کی ضروریات کے مطابق اور اس سے زیادہ نہیں۔ اس بنا پر صرف وہی افراد اس سے استفادہ کر سکتے ہیں جو بالکل کام نہیں کر سکتے اور بیمار ہیں یا چھوٹے یتیم بچے ہیں اور یا وہ ہیں جو کسی وجہ سے زندگی کے خارج کے لحاظ سے تنگی اور سختی سے دوچار ہیں

لہٰذا وہ لوگ جو کام کرنے کی قدرت رکھتے ہیں (بالفعل یا بالقوہ) ان کی ایسی آمدن ہے جو ان کے کاروبارِ زندگی کو چلا سکے تو وہ خمس کے اس حصے سے ہرگز استفادہ نہیں کر سکتے اور یہ بات جو بعض عوام میں مشہور ہے کہ سادات خمس لے سکتے ہیں چاہے ان کے گھر کا پرنالہ سونے کا ہو ـــ دراصل یہ ایک جاہلانہ عوامی بات سے زیادہ قیمت نہیں رکھتی اور اس کی کوئی بنیاد نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ سادات اور بنی ہاشم کے فقرا و مساکین حق نہیں رکھتے کہ زکوٰۃ میں سے کوئی چیز صرف کریں اور اس کی بجائے صرف خمس کے اسی حصے سے صرف کر سکتے ہیں[1]

تیسری بات یہ ہے کہ اگر سہم سادات جو کہ خمس کا آدھا حصہ ہے موجود سادات کی ضروریات سے زیادہ ہو تو اسے بیت المال میں داخل کرنا ہوگا اور اسے دوسرے مخارج میں صرف کیا جائے گا۔ جیسا کہ اگر سہم سادات ان کی کفایت نہ کرے تو بیت المال یا سہم زکوٰۃ میں سے ان کی ضروریات پوری کی جائیں گی۔

مندرجہ بالا تینوں پہلوؤں کی طرف توجہ کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ حقیقت میں مادی لحاظ سے سادات اور غیر سادات میں کوئی فرق نہیں رکھا گیا۔

غیر سادات محتاج اپنے سال بھر کے مخارج زکوٰۃ سے لے سکتے ہیں لیکن وہ خمس سے محروم ہیں اور سادات میں سے جو محتاج ہیں وہ صرف خمس سے استفادہ کر سکتے ہیں لیکن زکوٰۃ سے استفادہ کا حق نہیں رکھتے۔

درحقیقت یہاں دو صندوق موجود ہیں۔ خمس کا صندوق اور زکوٰۃ کا صندوق ۔ ان دو گروہوں میں سے ہر ایک کا حق ہے کہ ان دو میں سے صرف ایک سے استفادہ کرے وہ بھی مساوی مقدار میں یعنی ایک سال کی ضرورت کے برابر (غور کیجیے گا)۔

لیکن جن لوگوں نے ان شرائط اور خصوصیات میں غور نہیں کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ سادات کے لیے بیت المال سے زیادہ حصہ مقرر کیا گیا ہے یا وہ مخصوص امتیاز سے نوازے گئے ہیں۔

صرف ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ان دو کے درمیان نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے تو پھر ایسے مختلف پروگرام کا کیا مقصد ہے ؟

ایک مطلب پر توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب بھی معلوم ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ خمس اور زکوٰۃ میں ایک اہم فرق ہے اور وہ یہ کہ زکوٰۃ ایسے مالیات میں سے ہے جو دراصل عام اسلامی معاشرے کے اموال کا جزو شمار ہوتے ہیں لہٰذا ان کے مصارف بھی عموماً اسی حصہ میں ہوتے ہیں لیکن خمس ایسے مالیات میں سے ہے جو حکومتِ اسلامی سے مربوط ہیں یعنی اسلامی حکومت چلانے والوں کے مخارج و مصارف اس سے پورے ہوتے ہیں۔

اس بنا پر سادات کا عمومی اموال (زکوٰۃ) سے دور ہونا درحقیقت اس لیے ہے کہ اس حصہ سے پیغمبر کے رشتہ داروں کو دور رکھا جائے تاکہ مخالفین کے ہاتھ یہ بہانہ نہ آئے کہ پیغمبر نے اپنے رشتہ داروں کو عمومی اموال پر مسلط کر دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف محتاج سادات

---

[1] بنی ہاشم کا زکوٰۃ سے محروم ہونا ایک ایسی مسلم چیز ہے جو حدیث اور فقہ کی بہت سی کتب میں موجود ہے۔ کیا یہ بات باور کی جا سکتی ہے کہ اسلام نے بنی ہاشم کے علاوہ محتاجوں، یتیموں اور محروموں کے لیے تو فکر کی ہو لیکن بنی ہاشم کے محتاجوں کو ان کا کوئی انتظام کیے بغیر چھوڑ دیا ہو

کا بھی کسی طرح گزارہ ہونا چاہیے تو اس کا اسلامی قوانین میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت کے فنڈ سے ان کی ضروریات پوری کردی جائیں نہ کہ عام لوگوں کے فنڈ سے۔ حقیقت میں خمس نہ صرف یہ کہ سادات کے لیے ایک امتیاز نہیں ہے بلکہ انہیں عام لوگوں کے مفاد سے ایک طرف رکھنے کے لیے اور کسی قسم کے بُرے گمان کے پیدا ہونے سے بچنے کے لیے بھی ایک اقدام ہے۔[1]

یہ بات جاذب نظر ہے کہ اس امر کی طرف شیعہ اور سنی کتب میں اشارہ ہوا ہے۔ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے:

> بنی ہاشم کا ایک گروہ پیغمبر کی خدمت میں پہنچا اور تقاضا کیا کہ انہیں چوپایوں کی زکوٰۃ جمع کرنے پر مامور کریں اور کہا کہ یہ حصہ جو خدا نے زکوٰۃ جمع کرنے والوں کے لیے معین کیا ہے ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں۔
>
> پیغمبرِ خدا نے فرمایا اے بنی عبدالمطلب، زکوٰۃ نہ میرے لیے حلال ہے اور نہ تمہارے لیے لیکن میں تمہیں اس محرومیت کے بدلے شفاعت کا وعدہ کرتا ہوں۔ تم اس پر جو خدا اور رسول نے تمہارے لیے معین کیا ہے راضی رہو (اور زکوٰۃ سے سروکار نہ رکھو)۔
>
> وہ کہنے لگے، ہم راضی ہیں۔[2]

اس حدیث سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ بنی ہاشم اس چیز کو اپنے لیے ایک قسم کی محرومیت سمجھتے تھے اور پیغمبر اسلامؐ نے انہیں اس کے بدلے شفاعت کا وعدہ دیا۔

صحیح مسلم جو اہل سنت کی نہایت مشہور کتاب ہے اس میں سے ایک حدیث کا خلاصہ یہ ہے:

> عباس اور ربیعہ بن حارث پیغمبر کی خدمت میں آئے اور انہوں نے تقاضا کیا کہ ان کے بیٹے یعنی عبدالمطلب بن ربیعہ اور فضل بن عباس کو جو دو نوجوان تھے زکوٰۃ کی جمع آوری پر مامور کیا جائے تاکہ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی زکوٰۃ سے حصہ لے سکیں اور یوں اپنی شادی کے مصارف اس طرح سے فراہم کر سکیں۔
>
> پیغمبر نے انہیں اس سے روکا اور حکم دیا کہ کسی اور طریقے سے ان کی شادیوں کے اسباب فراہم کیے جائیں اور محل خمس سے ان کی بیویوں کا حق مہر دیا جائے۔[3]

---

[1] اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں یہ عبارت آئی ہے:

کرامة لهم عن اوساخ الناس

تو اس کا مقصد یہ تھا کہ سادات زکوٰۃ سے جو ایک طرح سے لوگوں کے مال کی میل کچیل ہے، الگ رہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک طرف تو سادات کو اس ممنوعیت اور محرومیت پر قانع کیا جائے اور دوسری طرف سے لوگوں کو سمجھایا جائے کہ جتنا ہو سکے بیت المال پر بوجھ نہ بنیں اور زکوٰۃ ایسے لوگوں کے لیے چھوڑ دیں جو شدید ضرورت رکھتے ہیں۔

[2] وسائل جلد ۶ صفحہ ۱۸۶۔

[3] صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۷۵۲۔

اس حدیث سے بھی کہ جس کی تشریح بڑی طویل ہے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ اصرار کرتے تھے کہ اپنے رشتہ داروں کو زکوٰۃ (کہ جو عام لوگوں کا مال تھا) لینے سے دور رکھیں۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے مجموعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خمس نہ صرف سادات کے لیے کوئی امتیاز اور خصوصیت شمار نہیں ہوتا بلکہ عمومی مصالح کی حفاظت کے لیے ایک طرح کی محرومی ہے۔

۷۔ خدا کے حصے سے کیا مراد ہے؟ "للہ" کہہ کر خدا کا حصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح سے اصل مسئلہ خمس کی زیادہ اہمیت بیان کی گئی ہے نیز پیغمبر اکرمؐ اور اسلامی حکومت کے رہبر و رہنما کی ولایت و حاکمیت کی تاکید و تثبیت کی گئی ہے۔ یعنی جیسے خدا تعالیٰ نے اپنے لیے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور خود کو اس میں تصرف کا زیادہ حق دار قرار دیا ہے اسی طرح اس نے پیغمبر اور امام کو بھی ولایت در رکھتی اور تصرف کا حق دیا ہے ورنہ خدا کا حصہ تو پیغمبر ہی کے اختیار میں ہوگا اور وہ جن مصارف میں پیغمبر یا امام مصلحت سمجھیں گے صرف ہوگا اور خدا کو تو کسی حصے کی ضرورت نہیں ہے۔

۴۲۔ اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِى الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِىَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَىَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۙ

۴۳۔ اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِىْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰٮكَهُمْ كَثِيْرًا لَّـفَشِلْتُمْ وَلَـتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ

۴۴۔ وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِىْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِىْۤ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِىَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ع

ترجمہ

۴۲۔ اس وقت تم نچلی طرف تھے اور وہ اُوپر کی طرف تھے (اور اس طرح سے دشمن تم پر برتری رکھتا تھا) اور (قریش کا) قافلہ تم سے نچلی طرف تھا اور ان پر دسترس ممکن نہ تھی اور ظاہراً کیفیت ایسی تھی کہ اگر تم ایک دوسرے سے وعدہ کرتے (کہ میدانِ جنگ میں حاضر ہوں گے) تو بالآخر اپنے وعدے میں اختلاف کرتے لیکن (یہ تمام مقدمات اس لیے تھے کہ) اللہ اس کام کو کہ جسے انجام پانا چاہیے عملی صورت بخشے تاکہ وہ جو ہلاک (اور گمراہ) ہوتے ہیں اتمامِ حجت کے طور پر ہوں اور جو زندہ رہتے ہیں (اور ہدایت حاصل کرتے ہیں) واضح دلیل کے طور پر ہوں اور خدا سننے والا جاننے والا ہے۔

۴۳۔ اس وقت خدا نے عالمِ خواب میں تمہیں ان کی تعداد کم کرکے دکھائی اور اگر زیادہ کرکے دکھاتا تو مسلماً تم سست ہو جاتے اور (ان سے جنگ شروع کرنے کے سلسلے میں) تم میں اختلاف پڑ جاتا لیکن خدا نے (تمہیں ان سب سے) محفوظ رکھا۔ جو کچھ سینوں کے اندر ہے خدا اس سے دانا اور آگاہ ہے۔

۴۴۔ اور اس وقت کہ جب تم (میدانِ جنگ میں) ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئے تو انہیں تمہاری نظر میں کم کرکے دکھاتا تھا اور تمہیں (بھی) ان کی نظر میں کم کرکے دکھاتا تھا تاکہ خدا اس کام کو عملی صورت بخشے جسے انجام پانا چاہیے (یہ اس لیے تھا تاکہ تم ڈرو نہیں اور جنگ کے لیے اقدام کرو اور انہیں بھی وحشت نہ ہو تاکہ وہ جنگ کے لیے تیار ہوں اور یوں وہ آخرکار شکست کھا جائیں) اور تمام کاموں کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔

تفسیر

وہ کام جو ہونا چاہیے

اس بات کی مناسبت سے جو "یوم الفرقان" (جنگ بدر کے دن) کے متعلق گذشتہ آیت میں آئی ہے اور جو کامیابیاں اس خطرناک صورتِ حال میں مسلمانوں کو نصیب ہوئی تھیں، قرآن دوبارہ ان آیات میں اس جنگ کے بعض پہلو مسلمانوں کو یاد دلاتا ہے تاکہ نعمتِ

فتح کی اہمیت سے زیادہ آگاہ ہوسکیں پہلے ارشاد ہوتا ہے: اس روز تم نچلی طرف اور مدینہ کے قریب تھے اور وہ اوپر کی طرف اور زیادہ دُور تھے (اذ انتم بالعدوۃ الدنیا وھم بالعدوۃ القصوٰی)۔

"عدوۃ" "مادہ" عدو" (بروزن "سرو") سے ہے اس کا معنی ہے "تجاوز کرنا"۔ تاہم ہر چیز کے حاشیے اور اطراف کو بھی "عدوہ" کہتے ہیں کیونکہ حدِ وسط سے یہ ایک طرف کو تجاوز ہوتا ہے۔ محلِ بحث آیت میں یہ لفظ طرف اور جانب ہی کے معنی میں آیا ہے۔
لفظ "دنیا" مادہ "دنو" (بروزن "علو") سے ہے۔ یہ "زیادہ نیچے" اور "زیادہ نزدیک" کے معنی میں آتا ہے اور اس کے برخلاف "اقصی" اور "قصوٰی" "دُور تر" کے معنی میں ہے۔

اس میدان میں مسلمان شمال کی جانب تھے۔ یہ طرف مدینہ سے زیادہ قریب تھی۔ دشمن جنوب کی طرف تھا۔ یہ جگہ زیادہ دور تھی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ وہ جگہ جسے مسلمانوں نے مجبوری کی حالت میں دشمن سے جنگ کرنے کے لیے منتخب کیا تھا بہت نشیب میں تھی اور دشمن کی جگہ بلند تر تھی۔ یہ صورتِ حال دشمن کے لیے ایک برتری کی حیثیت رکھتی تھی۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: (قریش اور ابوسفیان کا) وہ قافلہ جس کے تم تعاقب میں تھے وہ زیادہ نشیب میں تھے (والرکب اسفل منکم)۔

کیونکہ جیسے ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ابوسفیان کو جب مسلمانوں کی روانگی کا علم ہوا تو اس نے قافلے کا راستہ بدل لیا اور وہ اپنا راستہ چھوڑ کر دریائے احمر کے کنارے کنارے تیز رفتاری سے چلتے ہوئے مکہ کے نزدیک ہوگیا اور اگر مسلمان قافلے کے راستے سے ہٹ نہ جاتے تو ممکن تھا کہ اس کا تعاقب کرتے اور دشمن کے لشکر سے جنگ کرنے سے رہ جاتے جو کہ آخر کار عظیم فتح و کامرانی کا سبب بنی۔

ان تمام چیزوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر ہم مسلمانوں کی تعداد اور دشمن کے مقابلے میں ان کے جنگی ساز و سامان کو دیکھیں تو وہ ہر لحاظ سے کمتر اور ضعیف تر تھا جب کہ مسلمان ٹھہرے ہوئے بھی نشیب کی طرف تھے اور دشمن بلندی کی طرف تھا۔ لہٰذا قرآن مزید کہتا ہے: حالات ایسے تھے کہ اگر پہلے سے تمہیں معلوم ہوتا اور تم چاہتے کہ اس سلسلے میں ایک دوسرے سے وعدہ اور قول و قرار کرتے تو حتماً اس عہد و میعاد میں اختلاف میں گرفتار ہوتے (ولو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد) کیونکہ تم میں سے بہت سے ظاہری کیفیت اور دشمن کے مقابلے میں اپنی کمزور حیثیت کے زیر اثر آجاتے اور اس قسم کی جنگ کی اصولاً مخالفت کرتے۔

لیکن خدا تمہیں ایک انجام پانے والے عمل کی طرف لے گیا تاکہ جس کام کو ہونا چاہیے وہ انجام پائے (ولکن لیقضی اللہ امرا کان مفعولا)۔ یہ اس لیے تھا کہ اس غیر متوقع معجزہ نما کامیابی کے ذریعے حق اور باطل میں تمیز ہوسکے "اور وہ جو گمراہ ہوں اتمام حجت کے ساتھ ہوں اور وہ جو راہِ حق قبول کریں آگاہی اور واضح دلیل کے ساتھ کریں (لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحیی من حی عن بینۃ)۔

یہاں "حیات" اور "ہلاکت" سے مراد وہی "ہدایت" اور "گمراہی" ہے کیونکہ بدر کے دن نے کہ جس کا دوسرا نام "یوم الفرقان" ہے، واضح طور پر نصرتِ الٰہی سے سب کو مسلمانوں کی قوت دکھائی اور ثابت کیا کہ یہ گروہ خدا سے راہ و رسم رکھتا ہے اور حق اس کے ساتھ ہے۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے: خدا سننے اور جاننے والا ہے (وان اللہ لسمیع علیم)۔ یعنی اس نے تمہاری فریاد

سستی، تمہاری ہمتوں کو جاتا اور اسی بناء پر اس نے تمہاری مدد کی یہاں تک کہ تم دشمن پر کامیاب ہو گئے۔

تمام قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں ایک گروہ کم از کم ایسا تھا کہ اگر اسے دشمن کی طاقت اور اس کی فوج کی کیفیت معلوم ہوتی تو وہ اس جنگ کے لیے تیار نہ ہوتا اگرچہ مخلص مومنین کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جس کا ہر طرح کے حوادث میں رسول اللہؐ کے ارادے کے سامنے سر تسلیم خم تھا۔ اسی بناء پر خدا نے کچھ ایسے واقعات پیش کیے کہ دونوں گروہ خواہ ناخواہ دشمن کے مقابلے میں نکل آئیں اور اس حیات بخش جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔

ان واقعات میں سے ایک یہ تھا کہ رسول اللہؐ نے پہلے سے خواب میں اس جنگ کا منظر دیکھا تھا۔ آپؐ نے دیکھا کہ دشمن کی ایک قلیل سی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں آئی ہے۔ یہ در اصل کامیابی کی ایک بشارت تھی آپؐ نے بعینہٖ یہ خواب مسلمانوں کے سامنے بیان کر دیا۔ یہ بات مسلمانوں کے میدانِ بدر کی طرف پیش روی کے لیے ان کے جذبے اور عزم کی تقویت کا باعث بنی۔

البتہ پیغمبر اکرمؐ نے یہ خواب صحیح دیکھا تھا کیونکہ دشمن کی قوت اور تعداد اگرچہ ظاہراً بہت زیادہ تھی لیکن باطناً کم ضعیف اور ناتواں تھی اور ہم جانتے ہیں کہ خواب عام طور پر اشارے اور تعبیر کا پہلو رکھتے ہیں اور ایک صحیح خواب میں کسی مسئلے کا باطنی چہرہ آشکار ہوتا ہے۔

رسول اللہؐ نے یہ خواب مسلمانوں سے بیان کیا لیکن آخر یہ سوال تو شاید ذہنوں کی گہرائیوں میں باقی رہا ہوگا کہ پیغمبرؐ نے خواب میں ان کا ظاہری چہرہ کیوں نہیں دیکھا اور اسے مسلمانوں سے کیوں بیان نہیں کیا۔

زیرِ نظر دوسری آیت میں اس نعمت کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے جو خدا تعالیٰ نے اس طریقے سے مسلمانوں کو عنایت کی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے: اس وقت خدا نے خواب میں دشمن کی تعداد تمہیں کم کر کے دکھائی اور اگر انہیں زیادہ کر کے دکھاتا تو یقیناً تم لوگ سستی دکھاتے (اذ یریکھم اللہ فی منامک قلیلا ولو اراکھم کثیرا لفشلتم)۔

نہ صرف یہ کہ تم سست ہو جاتے بلکہ تمہارا معاملہ اختلاف تک جا پہنچتا اور ایک گروہ میدان کی طرف جانے کا موافق ہوتا اور دوسرا مخالف ہوتا (ولتنازعتم فی الامر)۔

لیکن خدا نے تمہیں اس سستی، اختلاف کلمہ، نزاع اور جھگڑے سے اس خواب کے ذریعے نجات دی اور محفوظ رکھا کہ جس میں ان کے باطنی رخ کی نشاندہی کی گئی تھی نہ کہ ظاہری صورت کی (ولکن اللہ سلم)۔ کیونکہ خدا تم سب کی روحانی حالت اور تمہارے باطن سے آگاہ تھا اور جو کچھ سینوں کے اندر ہے وہ اس سے باخبر ہے (انہ علیم بذات الصدور)۔

بعد والی آیت میں جنگ بدر کے ایک اور مرحلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ یہ مرحلہ پہلے مرحلے سے مختلف تھا۔

یہ وہ مرحلہ تھا جب رسول اللہؐ کے حرارت بخش بیانات کے زیرِ اثر، خدا کے وعدوں کی طرف توجہ کے باعث اور مختلف واقعات کے مشاہدے سے مثلاً تشنگی دور کرنے کے لیے بر محل باراں کا نزول، میدانِ جنگ کی ریتلی اور سنگریزوں والی زمین کا سخت ہو جانا — ان سب امور نے مل کر مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی اور انہیں ایک حقیقی کامیابی کے لیے پر امید کر دیا۔ ان کے جوش اور ولولے کا یہ عالم تھا کہ دشمن کا لشکرِ کثیر بھی انہیں چھوٹا معلوم ہو رہا تھا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے: اس وقت خدا نے آغازِ جنگ میں انہیں تمہاری نگاہ میں کم کر دیا (واذ یریکموھم اذ التقیتم فی اعینکم قلیلا) لیکن

دشمن چونکہ مسلمانوں کے اس مقام اور جذبے سے آگاہ نہیں تھا اس لیے وہ ان کی ظاہری تعداد ہی کو دیکھتا تھا۔ اسے مسلمان ناچیز دکھائی دیتے تھے یہاں تک کہ اس سے بھی کم معلوم ہوتے تھے جتنے وہ تھے۔ اسی لیے ارشاد ہوتا ہے: اور تمہیں ان کی نگاہ میں کم دکھاتا تھا (ویقللکم فی اعینھم) یہاں تک کہ ابوجہل کے بارے میں ہے کہ وہ کہتا تھا:

انما اصحاب محمد اکلة جزور

محمد کے ساتھی تو صرف ایک اونٹ کی خوراک ہیں۔

یہ ان کی نہایت کم تعداد کی طرف اشارہ ہے یا اس طرف اشارہ ہے کہ صبح سے لے کر شام تک ان کا کام تمام کر دیں گے۔ کیونکہ جنگ بدر سے متعلقہ روایات میں آیا ہے کہ قریش کا لشکر ہر دن دس اونٹ نحر کرتا تھا اور یہ ایک ہزار کے لشکر کی ایک دن کی خوراک تھی۔

بہر حال یہ دونوں امور مسلمانوں کی کامیابی کے لیے بہت مؤثر تھے کہ ایک طرف سے دشمن ان کی نگاہ میں کم معلوم ہوتے تھے تاکہ اقدام جنگ میں انہیں کوئی خوف اور وہم نہ ہو اور دوسری طرف سے مسلمانوں کی تعداد دشمن کو کم دکھائی دیتی تھی تاکہ وہ اس جنگ سے صرفِ نظر نہ کریں جس کا انجام ان کی شکست تھی علاوہ ازیں اس سلسلے میں زیادہ طاقت بھی حاصل نہ کریں اور اس گمان میں کہ لشکر اسلام کوئی اہمیت نہیں رکھتا، جنگ کے لیے مزید پسپائی حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ لہٰذا قرآن مندرجہ بالا جملوں کے بعد کہتا ہے: یہ سب کچھ اس بناء پر تھا کہ خدا اس امر کو انجام دے جسے ہر حالت میں متحقق ہونا چاہیے (لیقضی اللہ امرًا کان مفعولًا)۔

نہ صرف یہ جنگ اس کے مطابق انجام پائی کہ جو خدا چاہتا تھا بلکہ اس جہان میں تمام کام اور تمام چیزیں اس کے حکم اور ارادے کی طرف بازگشت رکھتی ہیں اور اس کا ارادہ تمام چیزوں میں نفوذ رکھتا ہے (والی اللہ ترجع الامور)۔

سورہ آلِ عمران کی آیہ ۱۳ جو جنگ بدر کے تیسرے مرحلے کی طرف اشارہ ہے میں ہے کہ دشمن آغاز جنگ اور سپاہِ اسلام کی کاری ضربیں کہ جو بجلی کی طرح ان کے سروں پر پڑتی تھیں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ وہ اس وقت یہ محسوس کرنے لگے کہ جیسے لشکرِ اسلام میں اضافہ ہو گیا ہے یہاں تک کہ انہیں لگتا تھا جیسے دوگنا ہو گیا ہے۔ اس طرح ان کی ہمت متزلزل ہو گئی جو ان کی شکست کا ایک باعث بنی۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ نہ تو ان مندرجہ بالا آیات میں کوئی تضاد ہے اور نہ ہی ان کے اور آلِ عمران کی تیرہویں آیت کے درمیان کوئی تضاد ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک آیت جنگ کے ایک ایک مرحلے کی طرف اشارہ ہے۔

پہلا مرحلہ ـــــ میدانِ جنگ میں پہنچنے سے پہلے کا ہے۔ خواب میں رسول اللہؐ کو ان کی تعداد کم دکھائی گئی۔

دوسرا مرحلہ ـــــ سرزمینِ بدر میں پہنچنے کے وقت کا ہے۔ مسلمان دشمن کے لشکر کی زیادہ تعداد سے آگاہ ہوئے۔ اس سے بعض افراد خوف اور پریشانی میں مبتلا ہوئے۔

تیسرا مرحلہ ـــــ جنگ شروع ہونے کے وقت کا ہے۔ پروردگار کے لطف و کرم سے امید افزاء حالات پیدا ہو گئے اور دشمن کی تعداد انہیں کم معلوم ہونے لگی۔ (غور کیجئے گا)

۴۵۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا
اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝
۴۶۔ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ
رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝
۴۷۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ
النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ
مُحِيْطٌ ۝

ترجمہ

۴۵۔ اے ایمان لانے والو! جب (میدانِ جنگ میں) کسی گروہ کا سامنا کرو تو ثابت قدم رہو اور خدا کو زیادہ یاد کرو تاکہ فلاح پا جاؤ۔

۴۶۔ اور خدا اور اس کے رسول (کے فرمان) کی اطاعت کرو اور نزاع (اور جھگڑا) نہ کرو تاکہ (کمزور اور سست نہ ہو جاؤ اور تمہاری طاقت (اور شوکت وہیبت ختم نہ ہو جائے اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کرو اور کہ خدا صبر و استقامت کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

۴۷۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اپنے علاقے سے ہوا پرستی، غرور اور لوگوں کے سامنے خود نمائی کے لیے (میدان بدر کی طرف) نکلے ہیں اور وہ (لوگوں کو) راہ خدا سے روکتے تھے (اور آخرکار ان کا انجام شکست اور نابودی تھا) اور جو وہ عمل کرتے ہیں خدا اس پر احاطہ (اور آگاہی) رکھتا ہے۔

تفسیر

جہاد کے بارے میں چھ اور احکام

مفسرین نے لکھا ہے کہ ابوسفیان جب بڑی چالبازی سے قریش کے تجارتی قافلے کو مسلمانوں کے علاقے سے صحیح سالم بے کر نکل گیا تو اس نے کسی کو لشکر قریش کی طرف بھیجا جو میدانِ بدر کی طرف عازم تھا اور کہلا یا کہ اب تمہیں جنگ کرنے کی ضرورت نہیں رہی لہٰذا واپس آجاؤ۔ لیکن ابوجہل خاص غرور، تکبر اور تعصب رکھتا تھا۔ اس نے قسم کھائی کہ ہم ہرگز نہیں پلٹیں گے جب تک سرزمین بدر میں نہ جا پہنچیں (بدر اس واقعہ سے پہلے اجتماع عرب کا ایک مرکز تھا۔ ہر سال یہاں ایک تجارتی بازار لگتا تھا)۔ اُس نے کہا کہ ہم تین دن تک وہاں رہیں گے، اونٹ ذبح کریں گے، خوب کھائیں گے، شراب پئیں گے اور گانے بجانے والے گائیں گے بجائیں گے تاکہ ہماری آواز تمام دنیائے عرب کے کانوں تک پہنچے اور طاقت ثابت ہو جائے۔

لیکن آخر کار انہیں شکست ہوئی۔ شراب نوشی کی بجائے انہوں نے موت کے گھونٹ پیے اور گانے والوں کی بجائے نوحہ کرنے والی عورتیں ان کے غم میں بیٹھیں۔

مندرجہ بالا آیات بھی اسی امر کی طرف اشارہ کر رہی ہیں اور مسلمانوں کو ایسے کاموں سے منع کرتی ہیں اور گذشتہ احکام کے بعد ان آیات میں جہاد کے بارے میں مزید احکام جاری کیے گئے ہیں۔ زیر نظر آیات میں کل چھ اہم احکام مسلمانوں کو دیئے گئے ہیں:

۱۔ پہلے قرآن کہتا ہے: اے ایمان لانے والو! جب دشمنوں کے کسی گروہ کو میدان جنگ میں اپنے سامنے دیکھو تو ثابت قدم رہو (یاایها الذین اٰمنوا اذا لقیتم فئة فاثبتوا)۔ یعنی ایمان کا ایک واضح نشانی ہر معاملے میں خصوصاً دشمنانِ حق سے برسرپیکار ہونے کی صورت میں ثابت قدمی ہے۔

۲۔ خدا کو بہت زیادہ یاد کرو تاکہ رستگار اور کامیاب ہو جاؤ (واذکروا الله کثیرا لعلکم تفلحون)۔

اس میں شک نہیں کہ یادِ خدا سے مراد صرف لفظی ذکر نہیں ہے بلکہ روح کے اندر خدا کا مشاہدہ ہے اور اس کے بے انتہا علم و قدرت اور وسیع رحمت کو یاد رکھنا ہے۔ خدا کی طرف ایسی توجہ مجاہد سپاہی کی ہمت اور جذبے کو تقویت دیتی ہے اور اس کے سائے میں وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ میدانِ جہاد میں اکیلا نہیں ہے۔ اس کی ایک طاقتور پناہ گاہ اور سہارا ہے کہ جس کے مقابلے میں کوئی طاقت کھڑی نہیں ہو سکتی اور اگر وہ مارا بھی گیا تو اُسے شہادت جیسی عظیم سعادت حاصل ہوگی اور وہ جوارِ رحمتِ حق میں رستگار ہوگا اور فلاح پائے گا۔ خلاصہ یہ کہ یادِ خدا اُسے طاقت، اطمینان اور پامردی عطا کرتی ہے۔

علاوہ ازیں خدا کی یاد اور اس کا عشق اس کے دل سے بیوی، اولاد، مال اور مقام سے لگاؤ کو نکال دیتا ہے اور خدا کی طرف توجہ ان چیزوں کو دل سے باہر نکال دیتی ہے جو مقابلے اور جہاد کے معاملے میں سستی اور کمزوری کا باعث بنتی ہیں۔

چنانچہ امام سجاد زین العابدین علیہ السلام کے صحیفہ کی مشہور دعا جو اسلام کی سرحدوں کے مسلمان محافظین اور مدافعین کے بارے میں ہے، میں آپ خدا کی بارگاہ میں یوں عرض کرتے ہیں:

وانسھم عند لقآئھم العدو ذکر دنیا ھم الخداعۃ و امح عن قلوبھم خطرات المال

الفتون واجعل الجنۃ نصب اعینھم

پروردگارا! (اپنی یاد کے سامنے میں) فریب دینے والی دنیا کی یاد ان محافظ سپاہیوں کے دل سے نکال دے اور زرق برق اموال کی طرف سے ان کے دل پھیر دے اور بہشت کو ان کی نگاہ پلنگ کے سامنے کردے۔[1]

۳۔ جنگ سے متعلق دوسرا اہم ترین مسئلہ رہبری ہے پیشوا اور رہبر کے حکم کی اطاعت کا ہے۔ یہی وہ اہم معاملہ ہے کہ اگر اس پر عمل نہ کیا جاتا تو جنگ بدر کا انجام مسلمانوں کی مکمل شکست کی صورت میں سامنے آتا۔ اسی لیے دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے اخدا اور اس کے رسول کی اطاعت (و اطیعوا اللہ و رسولہ)۔

۴۔ اور پراگندگی، نزاع اور اختلاف سے پرہیز کرو (و لا تنازعوا)۔ کیونکہ دشمن کے سامنے مجاہدین کے مابین کشمکش، نزاع اور اختلاف کا پہلا اثر جنگ میں سستی، ناتوانی اور کمزوری ہے (فتفشلوا)۔ اور اس کمزوری کے نتیجے میں تمہاری طاقت، قوت، ہیبت اور عظمت ختم ہو جائے گی (و تذھب ریحکم)۔

"ریح" کا معنی ہے "ہوا"۔ اور یہ جو کہتے ہیں کہ اگر ایک دوسرے سے جھگڑو گے تو سست اور کمزور ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، یہ اس معنی کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ قوت و عظمت اور امور تمہاری مراد اور مقصود کے موافق جاری نہیں رہیں گے چونکہ موافق ہواؤں کے چلنے کی وجہ سے کشتیاں منزل مقصود کی طرف چلتی رہتی ہیں اور اس زمانے میں جب کہ کشتی کو چلانے کے لیے واحد محرک ہوا ہی تھی، اس لحاظ سے یہ مطلب بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔

علاوہ ازیں ہوا کا چلنا جھنڈوں کے ساتھ جھنڈے قائم رہنے کی نشانی ہے جو کہ قدرت و حکومت کی رمز ہے اور مندرجہ بالا تعبیر اس معنی کے لیے کنایہ ہے۔

۵۔ اس کے بعد قرآن دشمن کے مقابلے میں اور سخت حوادث کے مقابلے میں استقامت اور صبر کا حکم دیتا ہے اور کہتا ہے: صبر و استقامت اختیار کرو کہ خدا صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنے والوں کے ساتھ ہے (واصبروا ان اللہ مع الصٰبرین)۔

پہلے حکم میں ثبات قدم کا ذکر ہے اور پانچویں حکم میں صبر و استقامت کا۔ ان میں اس لحاظ سے فرق ہے کہ ثبات قدم زیادہ تر جسمانی اور ظاہری پہلو رکھتا ہے جب کہ استقامت اور صبر زیادہ تر نفسیاتی اور باطنی پہلو رکھتا ہے۔

۶۔ آخری آیت میں مسلمانوں کو احمقانہ کاموں، متکبرانہ افعال اور اہل غرور دشمن کی پیروی سے روکا گیا ہے۔ نیز ابوجہل، اس کے طرفدار اور اس کے یار و انصار کے انجام کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان افراد کی طرح نہ ہو جانا جو اپنے علاقے سے مغرور، ہوا پرستی اور خود نمائی کے لیے نکلے تھے (ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرا و رئاء الناس)۔

وہی کہ جن کا ہدف اور مقصد لوگوں کو راہ خدا سے روکنا تھا (و یصدون عن سبیل اللہ)۔ ان کا ہدف بھی ناپاک تھا اور اس تک پہنچنے کے اسباب بھی ناپاک تھے اور ہم نے دیکھا کہ آخر کار اتنی قوت اور جنگی ساز و سامان کے باوجود انہیں

---

[1] صحیفہ سجادیہ

شکست ہوئی ۔ عیش و عشرت اور طرب و سرور کی بجائے ان میں سے کچھ خاک و خون میں غلطاں ہوئے اور کچھ ان کے غم میں اشکبار ہوئے ۔ اور جو کام یہ لوگ انجام دیتے ہیں خدا ان پر محیط ہے اور ان کے اعمال سے باخبر ہے (واللہ بما یعملون محیط)۔

۴۸۔ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ
الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ
نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ
اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۚ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ع
۴۹۔ اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝
۵۰۔ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ
وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝
۵۱۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝

ترجمہ

۴۸۔ اور وہ وقت (یاد کرو) جب شیطان نے ان (مشرکین) کے اعمال کو ان کی نظر میں مزین کیا اور کہا کہ لوگوں میں سے کوئی بھی تم پر کامیاب نہیں ہوگا اور میں تمہارا ہمسایہ (اور تمہیں پناہ دینے والا) ہوں لیکن جب اس نے دو گروہوں (مجاہد مسلمانوں اور ان کے حامی فرشتوں) کو دیکھا تو پیچھے کی طرف پلٹا اور کہا کہ میں تم (دوستوں اور پیروکاروں) سے بیزار ہوں ۔ میں ایسی چیز دیکھ رہا ہوں جسے تم نہیں دیکھتے ۔ میں خدا سے ڈرتا ہوں اور خدا شدید العقاب ہے ۔

۴۹۔ جس وقت منافقین اور وہ کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگے: (مسلمانوں کے) اس گروہ کو ان کے دین نے مغرور کیا (اور دھوکا دیا) ہے اور جو شخص خدا پر توکل کرے (کامیاب ہوگا کہ) خدا عزیز و حکیم ہے۔

۵۰۔ اور اگر تو کفار کو دیکھے کہ جب (موت کے) فرشتے ان کی روح نکال رہے ہوتے ہیں اور ان کے چہرے اور پشت پر مار رہے ہوتے ہیں اور (کہتے ہیں کہ) چکھو جلانے والے عذاب کو (تو ان کی حالت پر تجھے افسوس ہوگا)۔

۵۱۔ یہ ان کاموں کے بدلے میں ہے کہ جو آگے بھیج چکے ہو اور خدا اپنے بندوں پر کبھی ظلم و ستم روا نہیں رکھتا۔

تفسیر

مشرک، منافق اور شیطانی وسوسے

ان آیات میں گذشتہ آیات کی مناسبت سے جنگ بدر کے ایک اور منظر کی تصویر کشی کی گئی ہے یا پھر یہ آیات گذشتہ آخری آیت کی مناسبت سے ہیں کہ جس میں جنگ بدر میں مشرکین کے شیطانی عمل کے بارے میں گفتگو تھی۔

جیسے مردانِ حق کو راہ حق میں پروردگار اور اس کے فرشتوں کی تائید حاصل ہوتی ہے اسی طرح باطل کی طرف میلان رکھنے والے اور بد اندیش لوگ شیطانی وسوسوں اور گمراہ کن طاغوتی سائبان کے نیچے رہتے ہیں۔

بعض گذشتہ آیات میں مجاہدین بدر کے لیے فرشتوں کی حمایت کی کیفیت اور اس کی تفسیر بیان کی جا چکی ہے۔ یہاں زیر بحث پہلی آیت میں مشرکین کے لیے شیطان کی بد انجام حمایت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: اور اس دن شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے سامنے آراستہ کیا اور زینت دی تاکہ وہ اپنی کارگزاری پر خوش، پرجوش اور پُر اُمید ہوں (واذ زین لھم الشیطٰن اعمالھم)۔

شیطان کی طرف سے زینت دینا اور آراستہ کرنا اس طرح سے ہے کہ وہ انسان کو شہوات، ہوسناکیوں اور قبیح و ناپسندیدہ صفات کی تحریک دیتا ہے اور اس طریق سے انسان کے عمل کو اس کی نظر میں اچھا بنا کر پیش کرتا ہے کہ وہ شدت سے اس کی طرف کھنچ جاتا ہے اور ہر لحاظ سے اسے ایک عاقلانہ، منطقی اور پسندیدہ عمل خیال کرتا ہے" اور انہیں اس طرح سمجھاتا ہے کہ تمہاری اتنی افرادی قوت اور جنگی وسائل کی وجہ سے لوگوں میں سے کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا اور تم ناقابل شکست فوج ہو" (وقال لا غالب لکم الیوم من الناس)۔ "علاوہ ازیں میں تمہارا ہمسایہ ہوں اور تمہارے پاس رہتا ہوں" اور ایک وفادار اور ہمدرد ہمسائے کی طرح ضرورت کے وقت کسی قسم کی حمایت سے دریغ نہیں کروں گا (وانی جار لکم)۔

اس جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ لفظ "جار" سے مراد ہمسایہ نہیں ہے بلکہ ایسا شخص مراد ہے جو امان اور پناہ دیتا ہے کیونکہ عربوں کی یہ عادت تھی کہ طاقت ور افراد اور قبائل بوقت ضرورت اپنے دوستوں کو اپنی پناہ میں لے لیتے تھے اور اس موقع پر اپنے تمام وسائل کے ساتھ اس کا دفاع کرتے تھے۔ شیطان نے اپنے مشرک دوستوں کو امان نامہ دیا۔

لیکن جب دونوں لشکر ایک دوسرے سے ٹکرائے اور فرشتے لشکر توحید کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور اس نے مسلمانوں کی قوت ایمان اور پامردی کا مشاہدہ کیا تو الٹے پاؤں لوٹ گیا اور اس نے پکار کر کہا کہ میں تم سے (یعنی مشرکین سے) بیزار ہوں (فلما تراءت الفئتان نکص علی عقبیه و قال انی برئ منکم) اس نے اپنے وحشت زدہ فرار کی دو دلیلیں پیش کیں پہلی یہ کہ اس نے کہا: میں ایسی چیز دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے (انی اریٰ ما لا ترون)۔ میں مسلمانوں کے ان پُر جلال باایمان چہروں پر کامیابی کے واضح آثار دیکھ رہا ہوں، ان میں الٰہی حمایت، غیبی امداد اور فرشتوں کی کمک کے آثار مشاہدہ کر رہا ہوں اور اصولی طور پر جہاں پروردگار کی خاص مدد اور غیبی قوتوں کی کمک کارفرما ہو میں وہاں سے فرار ہی اختیار کروں گا۔

دوسری دلیل پیش کرتے ہوئے اس نے کہا کہ "میں اس منظر میں پروردگار کی دردناک سزا سے ڈرتا ہوں" اور اسے اپنے نزدیک دیکھتا ہوں (انی اخاف الله)۔

خدا کی سزا کوئی معمولی سی بات نہیں کہ جس کا سامنا کیا جاسکے بلکہ "اللہ کی سزا شدید اور سخت ہے" (و الله شدید العقاب)۔

شیطان وسوسے ڈالتا ہے یا بہروپ اختیار کرتا ہے؟

اس سلسلے میں کہ جنگ بدر کے موقع پر شیطان نے مشرکین کے دل میں کیسے نفوذ کیا اور اس نے یہ گفتگو کیونکر کی متقدمین اور موجودہ مفسرین میں اختلاف ہے اور تقریباً دو نظریے موجود ہیں:

۱۔ بعض کا عقیدہ ہے کہ یہ کام باطنی وسوسوں کی صورت میں انجام پایا۔ شیطان نے اپنے وسوسوں سے اور مشرکین کی شیطانی منفی اور قبیح صفات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے اعمال ان کی نظر میں پسندیدہ بنا دیے اور انہیں یہ اعتماد دلایا کہ تمہارے پاس ایسی قوت ہے جسے شکست نہیں ہو سکتی اور یوں ایک طرح کی باطنی پناہ گاہ اور سہارا ان کے لیے پیدا کر دیا۔

دوسری طرف مسلمانوں کو شدید جہاد اور پُر اعجاز واقعات کے سبب کامیابی حاصل ہوئی اور جہاد اور انہی معجزانہ واقعات سے مشرکین کے دلوں سے ان وسوسوں کے آثار ختم ہو گئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ شکست ان کے سامنے کھڑی ہے اور ان کے لیے کوئی سہارا اور امان نہیں بلکہ نہایت سخت عذاب اور سزا ان کے انتظار میں ہے۔

۲۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ شیطان انسانی شکل میں مجسم ہوا اور ان کے سامنے ظاہر ہوا۔ ایک روایت جو بہت سی کتب میں نقل ہوئی ہے یوں ہے:

> قریش نے جب میدانِ بدر کی طرف جانے کا پختہ ارادہ کر لیا تو وہ بنی کنانہ کے حملے سے ڈرتے تھے کیونکہ ان کے ساتھ ان کا پہلے ہی سے جھگڑا تھا۔ اس موقع پر ابلیس سراقہ بن مالک کی شکل میں ان کے پاس آیا۔ سراقہ بنی کنانہ کا ایک جانا پہچانا آدمی تھا۔ اس نے انہیں اطمینان دلایا کہ میں تم سے موافق ہوں اور تمہارے ساتھ ہم آہنگ اور

کوئی شخص تم پر غالب نہیں ہوگا اور اس نے میدانِ بدر میں شرکت کی۔ لیکن جب اس نے ملائکہ کو نازل ہوتے دیکھا تو پیچھے پلٹ آیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ قریش بھی جو مسلمانوں سے سخت شکست کھا چکی تھی ابلیس کی حالت دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوئی جب وہ مکہ میں پلٹ کر آئے تو کہنے لگے کہ سراقہ بن مالک قریش کے فرار کا سبب بنا ہے۔ جب یہ بات سراقہ تک پہنچی تو اس نے قسم کھائی کہ مجھے اس بات کی قطعاً کوئی خبر نہیں ہے۔ جب انہوں نے میدانِ بدر میں اس کی مختلف نشانیاں اور کیفیتیں یاد دلانا چاہیں تو اس نے سب کا انکار کیا اور قسم کھائی کہ ایسی حتماً کوئی بات نہیں ہوئی اور اس نے کہا کہ میں مکہ سے باہر گیا ہی نہیں۔ اس طرح سے معلوم ہوا کہ وہ شخص سراقہ بن مالک نہیں تھا۔[1]

پہلی تفسیر کے طرفداروں کی دلیل یہ ہے کہ ابلیس انسانی شکل میں ظاہر نہیں ہو سکتا جب کہ دوسری تفسیر کے طرفدار کہتے ہیں کہ اس کے محال ہونے پر کوئی دلیل میسر نہیں ہے خصوصاً جب کہ اس کی نظیر یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے ہجرت کے موقع پر ایک بوڑھا نجدی لوگوں کے بھیس میں دارالندوہ میں آیا تھا۔ علاوہ ازیں ظاہری تعبیرات اور باتیں جو مندرجہ بالا آیت میں آئی ہیں ابلیس کے مجسم ہونے کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتی ہیں۔

بہرحال مندرجہ بالا آیت نشاندہی کرتی ہے کہ خاص طور پر جب کوئی گروہ حق و باطل کی راہ پر گامزن ہو تو خدائی قوتوں اور امداد کا یا شیطانی قوتوں اور امداد کا ایک سلسلہ فعالیت کرتا ہے اور یہ قوتیں اور امداد مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ راہ خدا پر چلنے والوں کو یہ امر ہمیشہ نظر میں رکھنا چاہیے۔

بعد والی آیت میں معرکۂ بدر میں شریک مشرکوں اور بت پرستوں کی فوج کے طرفداروں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: اس وقت منافقین اور وہ کہ جن کے دل میں بیماری تھی کہتے تھے کہ یہ مسلمان اپنے دین پر مغرور ہوگئے ہیں اور اس تھوڑی سی تعداد اور معمولی اسلحہ کے ساتھ انہوں نے کامیابی کے گمان میں یا راہ خدا میں شہادت اور حیات جاوید کے خیال میں اس خطرناک مہم میں قدم رکھا ہے کہ جس کا انجام موت ہے (اذ یقول المنافقون و الذین فی قلوبھم مرض غرّ ھٰؤلاء دینھم)۔

لیکن وہ ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے اور الطاف الٰہی اور اس کی غیبی امداد سے آگاہی نہ رکھنے کے سبب اس حقیقت سے باخبر نہیں ہیں کہ جو شخص خدا پر توکل کرے اور اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کرنے کے بعد خود کو اس کے سپرد کردے تو خدا اس کی مدد کرے گا کیونکہ خدا قادر و قوی ہے کہ کوئی شخص اس کے مقابلے میں کھڑا ہونے کا یارا نہیں رکھتا اور وہ ایسا حکیم ہے کہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے دوستوں اور اپنی راہ میں جہاد کرنے والوں کو تنہا چھوڑ دے۔ (و من یتوکل علی اللہ فان اللہ عزیز حکیم)۔

اس سلسلے میں کہ "منافقین" اور "الذین فی قلوبھم مرض" سے کون سے افراد مراد ہیں، مفسرین میں بہت اختلاف ہے لیکن بعید نہیں کہ دونوں عبارتیں منافقینِ مدینہ کی طرف اشارہ ہوں کیونکہ قرآن مجید منافقین کے بارے میں جن کی تفصیلی حالت سورہ بقرہ کی ابتداء میں آئی ہے کہتا ہے:

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضاً

---

[1] تفسیر مجمع البیان، نورالثقلین اور دیگر تفاسیر، مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

ان کے دلوں میں بیماری ہے۔ خدا بھی ان کی بیماری میں اضافہ کرتا ہے۔ (بقرہ — ۱۰)

یا پھر یہ وہ منافق ہیں جو مدینہ میں اگر مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو گئے تھے اور اظہارِ اسلام و ایمان کرتے تھے مگر باطنی طور پر وہ مسلمانوں کے ساتھ نہیں تھے۔

یا یہ وہ منافق ہیں جو مکہ میں ظاہراً ایمان لائے تھے لیکن انہوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے سے روگردانی کی تھی اور میدان بدر میں مشرکوں کی صفوں سے وابستہ تھے اور جب انہوں نے لشکرِ کفر کے مقابلے میں مسلمانوں کی کم تعداد دیکھی تو انہیں تعجب ہوا اور وہ کہنے لگے کہ ان مسلمانوں نے اپنے دین و آئین سے دھوکا کھایا ہے اور جبھی اس میدان میں قدم رکھا ہے۔

بہر حال خدا ان منافقین کی باطنی کیفیت کی خبر دیتا ہے اور ان کی اور ان کے ہم فکروں کی غلطی واضح کرتا ہے۔

اگلی آیت کفار کی موت اور ان کی بدبخت زندگی کے اختتام کی منظر کشی کرتی ہے۔ پہلے روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: اگر تم کفار کی عبرت انگیز کیفیت کو دیکھتے کہ جب موت کے فرشتے ان کے چہروں اور پشتوں پر مارتے تھے اور انہیں کہتے تھے کہ جلانے والے عذاب کا مزہ چکھو تو ان کے رقت آمیز انجام سے آگاہ ہوتے (ولو ترٰی اذ یتوفی الذین کفروا الملآئکۃ یضربون وجوھھم و ادبارھم و ذوقوا عذاب الحریق)۔

اگرچہ "ترٰی" فعل مضارع ہے لیکن "لو" کے ہونے کی وجہ سے ماضی کا معنی دیتا ہے۔ اس بنا پر مندرجہ بالا آیت کفار کی گذشتہ کیفیت اور ان کی دردناک موت کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین اسے میدان بدر میں فرشتوں کے ہاتھوں ان کی موت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور وہ اس سلسلے میں کچھ ایسی روایات بھی نقل کرتے ہیں جن کی تائید نہیں ہوتی۔ لیکن جیسا کہ ہم بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ ایسے قرائن موجود ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے میدان بدر کی جنگ میں براہِ راست دخل نہیں دیا لہٰذا مذکورہ آیت میں موت کے فرشتوں اور قبضِ روح کے وقت اور اس دردناک سزا کی طرف اشارہ ہے جو دشمنانِ حق اور بے ایمان گنہگاروں کو اس وقت ہوگی۔ "عذاب الحریق" سوزِ قیامت کی سزا کی طرف اشارہ ہے کیونکہ قرآن کی دوسری آیات میں مثلاً سورہ حج کی آیہ ۹ اور ۲۲ اور بروج کی آیہ ۱۰ میں بھی یہی معنی آیا ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: ان سے کہا جائے گا کہ یہ دردناک سزا جو اس وقت چکھ رہے ہو ان امور کی وجہ سے ہو جو تمہارے ہاتھوں نے اس سے پہلے فراہم کیے ہیں اور اس جہان میں بھیجے ہیں (ذٰلک بما قدمت ایدیکم)۔

"ہاتھ" کی تعبیر اس بنا پر ہے کہ انسان عام طور پر اپنے اعمال ہاتھ کی مدد سے انجام دیتا ہے ورنہ مندرجہ بالا آیت تمام جسمانی اور روحانی اعمال پر محیط ہے۔

آیت کے آخر میں مزید ارشاد ہوتا ہے: "خدا کبھی بھی اپنے بندوں پر ظلم و ستم روا نہیں رکھتا" اور اس جہان میں یا اُس جہان میں جو بھی سزا یا عذاب انہیں دامن گیر ہو گا وہ خود انہی کی طرف سے ہے (و ان اللہ لیس بظلام للعبید)۔

لفظ "ظلام" مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس کا معنی ہے "بہت ظلم کرنے والا"۔

اس جگہ اور دوسری جگہوں پر اس لفظ کے استعمال کی وجہ اور اسی طرح ظلم سے متعلق دیگر مباحث ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۲۱۸ (اردو ترجمہ) پر ذکر کیے ہیں۔

۵۲۔ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○

۵۳۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى
يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○

۵۴۔ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ
فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا
ظٰلِمِيْنَ ○

ترجمہ

۵۲۔ (مشرکین کے اس گروہ کی حالت) فرعون کے رشتہ داروں اور ان سے پہلے والوں کی سی ہے۔ انہوں نے آیاتِ الٰہی کا انکار کیا۔ خدا نے بھی انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے سزا دی۔ اللہ قوی ہے اور اس کی سزا سخت ہے۔

۵۳۔ یہ اس بناء پر ہے کہ خدا جو نعمت بھی کسی گروہ کو دیتا ہے اسے متغیر نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ گروہ خود اپنے آپ کو متغیر کریں اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۵۴۔ اور یہ بالکل فرعونیوں اور ان سے قبل کے لوگوں کی طرح ہیں کہ جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات کو جھٹلایا اور ہم نے بھی ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں ہلاک کیا اور فرعونیوں کو غرق کیا اور یہ سب ظالم (اور ستمگر) گروہ تھے۔

تفسیر

متغیر نہ ہونے والی ایک سنت

ان آیات میں دنیا کی اقوام و ملل کے بارے میں خدا تعالیٰ کی ایک دائمی سنت کی طرف اشارہ ہوا ہے تاکہ کہیں یہ خیال نہ ہو کہ جو

کچھ میدانِ بدر کے مشرکین کے بُرے انجام کے بارے میں بیان ہوا ہے ایک استثنائی اور اختصاصی حکم تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایسے اعمال گذشتہ زمانے میں جس سے بھی سرزد ہوئے یا آئندہ جس سے بھی سرزد ہوں گے ایسے ہی نتائج کے حامل ہوئے اور ایسے ہی نتائج کے حامل ہوں گے۔

پہلے قرآن کہتا ہے، مشرکین کے حالات کی کیفیت فرعون کے خاندان اور ان سے پہلے کے لوگوں جیسی ہے (کدأب آل فرعون والذین من قبلھم)۔ وہی کہ جنہوں نے آیاتِ خدا کا انکار کیا اور خدا انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے پکڑا (کفروا بایٰت اللہ فاخذھم اللہ بذنوبھم)۔ کیونکہ خدا قوی اور صاحبِ قدرت ہے اور اس کا عذاب بھی شدید اور سخت ہے" (ان اللہ قوی شدید العقاب)۔

اس بناء پر صرف قریش اور مکہ کے مشرکین اور بت پرست ہی نہ تھے جو آیات الٰہی کے انکار، حق کے مقابلے میں ہٹ دھرمی اور انسانیت کے سچے رہبروں سے دشمنی کی وجہ سے اپنے گناہوں کے عذاب میں گرفتار ہوئے بلکہ یہ ایک دائمی قانون ہے جو فرعونوں جیسی طاقتور قوموں اور بہت کمزور قوموں پر بھی محیط ہے۔

اس کے بعد اس مسئلے کی بنیاد کا ذکر کر کے اسے زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ خدا کسی قوم ملت پر جو نعمت اور عنایت کرتا ہے اسے کبھی دگرگوں نہیں کرتا مگر یہ کہ وہ جمعیت اور قوم خود دگرگوں اور متغیر ہو جائے (ذٰلک بان اللہ لم یک مغیرا نعمۃ انعمھا علی قوم حتی یغیروا ما بانفسھم)۔

بالفاظِ دیگر خدا کا بے کنار فیض وکرم عمومی اور سب کے لیے ہوتا ہے لیکن وہ لوگوں کی لیاقت اور اہلیت کی مناسبت سے ان تک پہنچتا ہے۔ ابتداء میں خدا اپنی مادی اور روحانی نعمتیں اقوامِ عالم کے شاملِ حال کر دیتا ہے اب اگر وہ خدائی نعمتوں کو اپنے تکامل اور ارتقاء کا ذریعہ بنائیں اور راہِ حق میں ان سے مدد حاصل کریں اور ان سے صحیح استفادہ کی صورت میں ان کے لیے شکر ادا کریں تو وہ اپنی نعمتوں کو پائیدار کرتا ہے بلکہ اس میں اضافہ کرتا ہے لیکن یہ عنایات اور نعمات اگر طغیان و سرکشی، ظلم و بیدادگری، ترجیح و تبعیض، ناشکری و غرور اور آلودگی و گناہ کا سبب بنیں تو اس صورت میں وہ یہ نعمتیں واپس لے لیتا ہے یا انہیں بلاء و مصیبت میں بدل دیتا ہے۔ لہٰذا جو بھی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں دراصل ہماری وجہ سے ہوتی ہیں نعماتِ الٰہی تو زوال پذیر نہیں ہیں۔

اس ہدف کے بعد قرآن دوبارہ فرعونیوں اور ان سے پہلے کی طاقت ور اقوام کے ایک گروہ کی حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے، نعمتوں کے سلب ہونے اور سخت قسم کے عذابوں کے چنگل میں گرفتار ہونے سے متعلق بت پرستوں کی کیفیت فرعونیوں اور ان سے پہلے کی قوموں جیسی ہے (کدأب آل فرعون والذین من قبلھم)۔ "انہوں نے بھی پروردگار کی آیات کی تکذیب کی" اور انہیں پاؤں تلے روندا جب کہ یہ آیات ان کی ہدایت، تقویت اور سعادت کے لیے نازل ہوئی تھیں (کذبوا بایٰت ربھم)۔ "ہم نے بھی ان کے گناہوں کی وجہ سے انہیں ہلاک کر دیا" (فاھلکنٰھم بذنوبھم)۔ "اور فرعونیوں کو ہم نے دریا کی موجوں میں غرق کر دیا" (واغرقنا آل فرعون)۔ "اور یہ تمام قومیں اور ان کے افراد ظالم اور ستمگر تھے، اپنے لیے بھی ظالم تھے اور دوسروں کے لیے بھی (وکل کانوا ظالمین)

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اتنے مختصر سے فاصلے میں "کدأب آل فرعون ...." کا مختصر سے طرق کے ساتھ تکرار کیوں ہوا ہے؟

اس سوال کے جواب میں اس نکتے کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ اگرچہ حساس اور زندہ میں تکرار اور تاکید ایک اصولِ بلاغت ہے جو فصحاء اور بلغاء کی گفتگو میں ہمیشہ دکھائی دیتا ہے لیکن مندرجہ بالا آیات میں ایک اہم فرق بھی موجود ہے جو عبارت کو صورتِ تکرار سے خارج کر دیتا ہے اور وہ یہ کہ پہلی آیت آیاتِ حق کے انکار کے بدلے میں خدائی سزاؤں کی طرف اشارہ کرتی ہے اور اس کے بعد ان کی اس حالت کو فرعونیوں اور ان سے پہلے کی قوموں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جب کہ دوسری آیت میں خداوند تعالیٰ کی نعمتوں اور عنایتوں کے متغیر ہونے یعنی کامیابیوں، قدرتوں اور دیگر افتخارات و اعزازات کے خاتمے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کے بعد ان کی حالت کو فرعونیوں اور گذشتہ اقوام سے تشبیہ دی گئی ہے۔

درحقیقت ایک مقام پر گفتگو نعمتوں کے سلب ہونے اور اس سے پیدا ہونے والی سزا کے بارے میں ہے اور دوسرے مقام پر نعمتوں کے متغیر اور دگرگوں ہونے سے متعلق بحث ہے۔

دو اہم نکات

ان آیات میں دو اہم نکات کی طرف اشارہ ہوا ہے جو ہر لحاظ سے توجہ طلب ہیں:

۱۔ قوموں کی زندگی اور موت کے عوامل: تاریخ میں طرح طرح کی قوموں اور ملتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ کوئی قوم ترقی کے مراحل تیزی سے طے کر گئی کوئی قوم پستی کے سب سے نچلے مرحلے تک پہنچ گئی۔ کوئی گروہ جو ایک دن پراگندہ، درماندہ اور شکست خوردہ تھا دوسرے دن طاقتور اور سربلند تھا اور کوئی گروہ اس کے برعکس کبھی فخر و مباہات کے اعلیٰ ترین مرحلے پر تھا لیکن ذلت و خواری کے گڑھے میں جا گرا۔

بہت سے ایسے اشخاص ہیں جو تاریخ کے مختلف مناظر کے سامنے سے بڑی آسانی سے گزر گئے ہیں اور اس میں انہوں نے ذرہ بھر غور و فکر نہیں کیا۔ بہت سے لوگ قوموں کی موت و حیات کے اصلی عوامل اور علل کا مطالعہ کرنے کی بجائے کم اہمیت عوامل جن کا کوئی بنیادی کردار نہیں ہوتا یا موہوم، بے ہودہ اور خیالی عوامل ہی کے درپے ہو جاتے ہیں اور سب کچھ انہی کے ذمہ ڈال دیتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنی بدبختی کا تمام تر ذمہ دار غیروں کی بری سیاست کو ٹھہراتے ہیں اور کچھ لوگ ان تمام حوادث کو افلاک کی موافق یا مخالف گردش کی نتیجہ سمجھتے ہیں۔ ایک گروہ قضا و قدر کے تحریف شدہ مفہوم سے وابستہ ہے اور قسمت و تقدیر اور اتفاقات کو ہی تمام تلخ و شیریں حوادث کی وجہ قرار دیتا ہے۔

یہ سب کچھ اس بنا پر ہے کہ لوگ حقیقی علل کے ادراک سے گھبراتے اور پریشان ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا آیات میں قرآن درد اور دوا، کامیابی اور شکست کے عوامل کے اصلی نقطہ پر انگشت رکھتا ہے اور کہتا ہے کہ

اصل عامل کی تلاش کے لیے آسمانوں اور زمینوں کو چھان مارنا ضروری نہیں اور نہ اس کے لیے موہوم اور خیالی عوامل کے پیچھے جانے کی ضرورت ہے بلکہ اتنا ہی کافی ہے اپنے ہی وجود، فکر، ہمت، اخلاق اور اجتماعی نظام کی جستجو کی جائے اور اس پر نظر کی جائے ۔ جو کچھ ہے اسی جگہ ہے۔

جن اقوام و ملل نے اپنی فکر و نظر کو استعمال کیا، ایک دوسرے کی طرف اتحاد، اتفاق اور برادری کا ہاتھ بڑھایا اور ان کی سعی و کوشش پیہم تھی اور ان کا عزم و ارادہ قوی تھا، ضرورت کے وقت انہوں نے جانبازی اور فداکاری سے کام لیا اور قربانی پیش کی وہ قطعاً اور یقیناً کامیاب و کامران ہوئیں دوسری طرف جب سعی و کوشش کی جگہ رکود و جمود اور سستی و کاہلی نے لے لی، آگاہی کی بجائے وہ بے خبری میں جا پڑے، عزم و ارادہ کی بجائے وہ تردد اور بے دلی کا شکار ہو گئے ۔ ان میں بزدلی نے بہادری کی، نفاق نے اتحاد کی، تن پروری نے فداکاری کی اور ریاکاری نے خلوص و ایمان کی جگہ لے لی تو ان میں سقوط، شکست اور بدحالی کا دور شروع ہو گیا ۔ درحقیقت " ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ " میں انسانوں کی زندگی کا بلند ترین قانون بیان کیا گیا ہے ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مکتبِ قرآن معاشروں کی زندگی کے لیے اصیل ترین اور روشن ترین مکتب ہے ۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو جو ایٹم اور خلا کی دنیا میں داخل ہو کر انسان کو بھول چکے ہیں اور اقتصادی مسائل اور ساز و سامان کی تولید کو گردشِ تاریخ کا سبب سمجھتے ہیں جو کہ خود انسان کی پیداوار ہیں انہیں بتا دیا ہے کہ تم سخت اشتباہ میں ہو ۔ تم نے معلول کو لے لیا ہے اور اصل علت کو جو خود انسان اور انسانی تغیرات ہیں انہیں فراموش کر دیا ہے ۔ تم شاخوں سے چپٹے ہوئے ہو بلکہ ایک ہی شاخ سے اور جڑ کو تم نے فراموش کر دیا ہے ۔

دور نہ جائیں تاریخ اسلام یا زیادہ صحیح لفظوں میں مسلمانوں کی تاریخ ابتدا میں روشن کامیابیوں اور اس کے بعد تلخ اور دردناک شکستوں کی شاہد ہے ۔

پہلی صدیوں میں اسلام بڑی تیزی سے دنیا میں پیش رفت کرتا رہا اور ہر جگہ علم و آزادی کا نور بکھیرتا رہا اور اقوامِ عالم کے سروں پر علم و دانش کا سایہ کرتا رہا ۔ اس دور میں اسلام قوت آفریں، قدرت بخش، ہلا دینے والا اور آباد کرنے والا تھا ۔ اس نے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے تمدن کو وجود بخشا، جس کی مثال گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی لیکن چند صدیوں سے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا ۔ تفرقہ و انتشار، پراگندگی، کنارہ کشی، گوشہ نشینی، ضعف و ناتوانی اور اس کے نتیجے میں پسماندگی اور پے در پے شکست نے ان تمام کامیابیوں اور ترقیوں کی جگہ لے لی ۔ اب حالت یہ ہے کہ دنیا کے مسلمان بنیادی ضرورتوں کے لیے دوسروں کے دستِ نگر ہیں اور مجبور ہیں کہ علم و دانش کے حصول کے لیے اپنی اولاد کو دیارِ غیر میں بھیجیں جب کہ ایک وقت وہ تھا کہ مسلمانوں کی یونیورسٹیاں بلند ترین سمجھی جاتی ہیں اور دنیا کی عظیم ترین یونیورسٹیوں کی حیثیت سے اپنے اور بیگانے تمام طالب علموں کے لیے مرکزِ تعلیم تھیں۔ معاملہ یہاں تک پہنچا ہے کہ اب نہ صرف یہ کہ مسلمان علم و صنعت اور ٹیکنالوجی برآمد نہیں کرتے بلکہ ابتدائی غذائی مواد بھی باہر کے ممالک سے درآمد کرتے ہیں ۔

آج مسلمانوں کی سرزمین جو ایک دن مسلمانوں کی عظمت کا مرکز تھی ـــ یہاں تک کہ دو سو سال تک صلیبی فوجیں جس کے لیے لڑتی رہیں اور انہوں نے کئی ملین مقتول اور زخمی دیئے لیکن اسلام کے غازیوں کے ہاتھ سے اسے نہ لے سکیں ـــ آج مسلمان بڑے آرام سے چند دن میں اسے ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں جب کہ اب اس کی ایک بالشت بھی دشمن سے واپس لینے کے لیے

اورانسان کے لیے حیات ساز عامل تغیرات ہیں جو اس کی روش، اخلاق اور فکر و روح میں اس کے اپنے ارادے سے پیدا ہوجاتے ہیں۔ اس بناء پر جو لوگ جبری قضاء و قدر کا اعتقاد رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام واقعات پروردگار کے جبری ارادے اور مشیت سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، ایسے لوگ مندرجہ بالا آیت سے مغلوب ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح مادی جبر کے قائل کہ جو انسان کو ناقابل تغیر غرائز اور اصل وراثت کے ہاتھوں کھلونا سمجھتے ہیں یا جبر ماحول کے قائل کہ جو انسان کو اقتصادی اور تولیدی حالات کا پابند سمجھتے ہیں مکتب اسلام کی نظر میں ان کا عقیدہ بے قیمت اور غلط ہے۔ انسان آزاد ہے اور اپنی سرنوشت اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے۔ آیات مذکورہ بالا کی طرف توجہ کرتے ہوئے انسان اپنی سرنوشت اور تاریخ کی زمام اپنے ہاتھ میں رکھتا اور اپنے لیے افتخار، اعزاز اور کامیابی پیدا کرتا ہے اور وہ خود ہی اپنے آپ کو شکست اور ذلت میں گرفتار کرتا ہے۔ اس کی باگ ڈور اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ جب تک خود انسان کی کیفیت میں تغیر پیدا نہ ہو اور وہ خود سازی سے کام نہ لے اس کی سرنوشت میں تغیر پیدا نہیں ہوسکتا۔

۵۵۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

۵۶۔ اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝

۵۷۔ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

۵۸۔ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۝

۵۹۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۵۔ خدا کے نزدیک زمین پر چلنے والے بدترین جانور وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کر رکھی ہے اور ایمان نہیں لاتے۔

۵۶۔ وہ لوگ کہ جن سے تم نے پیمان لیا پھر وہ ہر مرتبہ اپنے عہد کو توڑتے ہیں (اور پیمان شکنی اور خیانت سے پرہیز نہیں کرتے۔

۵۷۔ اگر انہیں میدانِ جنگ میں پاؤ تو ان پر اس طرح سے حملہ کرو کہ وہ گروہ جو ان کے پیچھے ہیں منتشر ہو جائیں اور بکھر جائیں شاید وہ متذکر ہوں (اور عبرت حاصل کریں)۔

۵۸۔ اور جس وقت (نشانیاں ظاہر ہونے پر) تجھے کسی گروہ کی خیانت کا خوف ہو (کہ وہ اپنے عہد کو توڑ کر اچانک حملہ کر دے گا) تو انہیں عادلانہ طور پر بتلا دو (کہ ان کا پیمان لغو ہو گیا ہے) کیونکہ خدا خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

۵۹۔ اور وہ کہ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے یہ تصور نہ کریں کہ وہ ان اعمال کے ہوتے ہوئے کامیاب ہو جائیں گے (اور وہ ہماری قلمرو کی سزا سے نکل جائیں گے) وہ ہمیں کبھی عاجز نہیں کر سکتے۔

تفسیر

شدتِ عمل ــــ پیمان شکنوں کے مقابلے میں

یہ آیات دشمنانِ اسلام کے ایک اور گروہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی پوری پُرحوادث تاریخ میں مسلمانوں پر سخت ضربیں لگائیں اور بالآخر اپنے کے دردناک انجام کا سامنا کیا۔

یہ گروہ ــــ وہی مدینہ کے یہودی تھے جنہوں نے بار بار رسول اللہؐ کے ساتھ عہد و پیمان باندھا اور پھر بزدلانہ طور پر اسے توڑ دیا۔

یہ آیات ایک مستحکم طریقہ بیان کر رہی ہیں جو پیغمبر اکرمؐ کو اس پیمان شکن گروہ کے بارے میں اختیار کرنا چاہیے۔ ایسا طریقہ کہ جو دوسروں کے لیے باعثِ عبرت ہو اور اس گروہ کے خطرے کو بھی دور کرے۔

پہلے قرآن اس جہان کے زندہ موجودات میں سے بے وقعت ترین اور گھٹیا ترین وجود کا تعارف کرواتے ہوئے کہتا ہے:

زمین پر چلنے والے بدترین لوگ خدا کے نزدیک وہ ہیں جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے اور اسی طرح اس پر چلتے رہتے ہیں اور کسی طرح ایمان نہیں لاتے (ان شر الدوآب عند اللہ الذین کفروا فھم لا یؤمنون)۔

"الذین کفروا" کی تعبیر شاید اس طرف اشارہ ہے کہ مدینہ کے بہت سے یہودی پیغمبر اسلامؐ کے ظہور سے پہلے اپنی کتب کی روشنی میں آپ سے لگاؤ اور ایمان کا اظہار کرتے تھے بلکہ آپ کے مبلغ اور لوگوں کو آپ کے ظہور کے لیے تیار کرتے تھے لیکن آپ کے ظہور کے بعد چونکہ انہیں اپنے مادی مفادات خطرے میں نظر آئے تو کفر کی طرف جھک گئے اور اس راہ میں انہوں نے ایسی شدت کا مظاہرہ کیا کہ ان کے ایمان کی کوئی اُمید باقی نہ رہی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "فھم لا یؤمنون"۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے یہ وہی لوگ تھے جن سے تم نے عہد و پیمان باندھا تاکہ کم از کم غیر جانبداری ہی کا لحاظ رکھیں اور مسلمانوں کو آزار اور تکلیف پہنچانے کے درپے نہ ہوں اور دشمنانِ اسلام کی مدد نہ کریں لیکن انہوں نے ہر مرتبہ اپنا پیمان توڑ دیا (الذین عٰھدت منھم ثم ینقضون عھدھم فی کل مرة)[1]۔

نہ انہیں خدا سے کوئی شرم و حیا آتی تھی اور نہ وہ اس کے فرمان کی مخالفت سے ڈرتے تھے اور نہ ہی وہ انسانی اصولوں کو پامال کرتے ہوئے کوئی پرواہ کرتے تھے (وھم لا یتقون)۔

"ینقضون" اور "یتقون" فعل مضارع کا صیغہ ہیں اور استمرار پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے کئی مرتبہ پیغمبر اکرمؐ سے کیے ہوئے عہد و پیمان توڑے تھے۔

اگلی آیت میں اس پیمان شکن بے ایمان اور ہٹ دھرم گروہ سے طرزِ سلوک کے بارے میں قرآن اس طرح بیان کرتا ہے: اگر انہیں میدانِ جنگ میں پاؤ اور وہ مسلح ہو کر تمہارے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں تو ان کی ایسے سرکوبی کرو کہ جو گروہ ان کے پیچھے ہوں وہ عبرت حاصل کریں اور منتشر ہو جائیں اور اپنے آپ کو پیش نہ کریں (فاما تثقفنھم فی الحرب فشرد بھم من خلفھم)۔

"تثقفنھم" "ثقف" (بروزن "سقف") کے مادہ سے ہے اس کا مطلب ہے "کسی چیز کو دقت نظر سے اور تیزی سے سمجھنا"۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کی تنقید اور اعتراضات سے تیزی سے اور دقتِ نظر سے آگاہی حاصل کرو اور اس سے پہلے کہ تم پر وہ بے خبری میں کوئی جنگ ٹھونس دیں بجلی کی طرح ان پر جا پڑو۔

"شرد" "تشرید" کے مادہ سے "حالت اضطراب میں منتشر کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی ان پر اس طرح سے حملہ کرو کہ دشمنوں اور پیمان شکنوں کے دیگر گروہ منتشر ہو جائیں اور حملہ کرنے کی نہ سوچیں۔ یہ حکم اس بنا پر ہے کہ دوسرے دشمن بلکہ آئندہ کے دشمن عبرت حاصل کریں اور جنگ کی طرف بڑھنے سے اجتناب کریں اور اسی طرح جو لوگ مسلمانوں سے عہد و پیمان رکھتے ہیں یا آئندہ کوئی پیمان باندھیں تو عہد و پیمان توڑنے سے اجتناب کریں اور شاید سب کے سب سمجھ سکیں اور متذکر ہوں (لعلھم یذکرون)۔

"اور اگر وہ تیرے سامنے میدان میں نہ آئیں لیکن ان سے ایسے آثار و قرائن ظاہر ہوں کہ وہ پیمان شکنی کے درپے ہیں اور اس بات کا خوف ہو کہ وہ خیانت کریں گے اور بغیر اطلاع کے یک طرفہ طور پر پیمان توڑ دیں گے تو تم پیش قدمی کرو اور انہیں بتا دو کہ ان کا پیمان لغو ہو چکا ہے (واما تخافن من قوم خیانة فانبذ الیھم علیٰ سواء)۔

ایسا نہ ہو کہ ان کا پیمان لغو ہونے کی اطلاع دیئے بغیر ان پر حملہ کر دو کیونکہ خدا خیانت کرنے والوں اور ان لوگوں کو جو اپنے پیمان میں خیانت کی راہ اختیار کریں دوست نہیں رکھتا (ان اللہ لا یحب الخائنین)۔

اگرچہ مندرجہ بالا آیت میں رسول اللہؐ کو اجازت دی گئی ہے کہ دشمن کی طرف سے خیانت اور ایمان شکنی کے خوف کے موقع

---

[1] "من" "عاھدت منھم" میں یا تبعیض کے معنی میں ہے یعنی جزیرہ نمائے عرب کے یہودیوں کے ایک گروہ یا مدینہ کے یہودیوں کے سرداروں سے تم نے پیمان باندھا تھا یا اصطلاح کے مطابق نشو کے لیے ہے اس کا معنی "عاھدتھم" (تو نے ان سے عہد کیا) ہو گا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ "اخذت العھد منھم" (تو نے ان سے عہد لیا) کے معنی میں ہو۔

اصل عامل کی تلاش کے لیے آسمانوں اور زمینوں کو چھان مارنا ضروری نہیں اور نہ اس کے لیے موہوم اور خیالی عوامل کے پیچھے جانے کی ضرورت ہے بلکہ اتنا ہی کافی ہے اپنے ہی وجود، فکر، ہمت، اخلاق اور اجتماعی نظام کی جستجو کی جائے اور اس پر نظر کی جائے ۔ جو کچھ جانے کی جگہ ہے

جن اقوام و ملل نے اپنی فکر و نظر کو استعمال کیا، ایک دوسرے کی طرف اتحاد، اتفاق اور برادری کا ہاتھ بڑھایا اور ان کی سعی و کوشش پیہم تھی اور ان کا عزم و ارادہ قوی تھا، ضرورت کے وقت انھوں نے جانبازی اور فداکاری سے کام لیا اور قربانی پیش کی وہ قطعاً اور یقیناً کامیاب و کامران ہوئیں دوسری طرف جب سعی و کوشش کی جگہ رکود و جمود اور سستی و کاہلی نے لے لی، آگاہی کی بجائے وہ بے خبری میں جا پڑے عزم و ارادہ کی بجائے وہ تردد اور بے دلی کا شکار ہو گئے ۔ ان میں بزدلی نے بہادری کی، نفاق نے اتحاد کی تن پروری نے فداکاری کی اور ریاکاری نے خلوص و ایمان کی جگہ لے لی تو ان میں سقوط شکست اور بدحالی کا دور شروع ہو گیا۔ درحقیقت " ذلك بان الله لم يك مغيرا نعمة انعمها على قوم حتى يغيروا ما بانفسهم " میں انسانوں کی زندگی کا بلند ترین قانون بیان کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مکتب قرآن معاشروں کی زندگی کے لیے اصیل ترین اور روشن ترین مکتب ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو جو ایٹم اور خلاء کی دنیا میں داخل ہو کر انسان کو بھول چکے ہیں اور اقتصادی مسائل اور ساز و سامان کی تولید کو گردش تاریخ کا سبب سمجھتے ہیں جو کہ خود انسان کی پیداوار ہیں انہیں بتا دیا ہے کہ تم سخت اشتباہ میں ہو۔ تم نے معلول کو لے لیا ہے اور اصل علت کو جو خود انسان اور انسانی تغیرات ہیں انہیں فراموش کر دیا ہے۔ تم شاخوں سے چمٹے ہوئے ہو بلکہ ایک ہی شاخ سے اور جڑ کو تم نے فراموش کر دیا ہے۔

دور نہ جائیں تاریخ اسلام یا زیادہ صحیح لفظوں میں مسلمانوں کی تاریخ ابتدا میں روشن کامیابیوں اور اس کے بعد تلخ اور دردناک شکستوں کی شاہد ہے۔

پہلی صدیوں میں اسلام بڑی تیزی سے دنیا میں پیش رفت کرتا رہا اور ہر جگہ علم و آزادی کا نور نچھاور کرتا رہا اور اقوام عالم کے سروں پر علم و دانش کا سایہ کرتا رہا۔ اس دور میں اسلام قوت آفریں، قدرت بخش، ہلا دینے والا اور آباد کرنے والا تھا۔ اس نے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے تمدن کو وجود بخشا، جس کی مثال گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی لیکن چند صدیوں سے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ تفرقہ و انتشار، پراگندگی، کنارہ کشی، گوشہ نشینی، ضعف و ناتوانی اور اس کے نتیجے میں پسماندگی اور پیچھے شکست نے ان تمام کامیابیوں اور ترقیوں کی جگہ لے لی۔ اب حالت یہ ہے کہ دنیا کے مسلمان بنیادی ضرورتوں کے لیے دوسروں کے دست نگر ہیں اور مجبور ہیں کہ علم و دانش کے حصول کے لیے اپنی اولاد کو دیار غیر میں بھیجیں جب کہ ایک وقت وہ تھا کہ مسلمانوں کی یونیورسٹیاں بلند ترین سمجھی جاتی ہیں اور دنیا کی عظیم ترین یونیورسٹیوں کی حیثیت سے اپنے اور بیگانے تمام طالب علموں کے لیے مرکز تھیں۔ معاملہ یہاں تک آپہنچا ہے کہ اب نہ صرف یہ کہ مسلمان علم و صنعت اور ٹیکنالوجی برآمد نہیں کرتے بلکہ ابتدائی غذائی مواد بھی باہر کے ممالک سے درآمد کرتے ہیں۔

آج مسلمانوں کی سرزمین جو ایک دن مسلمانوں کی عظمت کا مرکز تھی ــــ یہاں تک کہ دو سو سال تک صلیبی فوجیں جس کے لیے لڑتی رہیں اور انہوں نے کئی ملین مقتول اور زخمی دیئے لیکن اسلام کے غازیوں کے ہاتھ سے اسے نہ لے سکیں ــــ آج مسلمان بڑے آرام سے چھ دن میں اسے ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں جب کہ اب اس کی ایک بالشت بھی دشمن سے واپس لینے کے لیے

مہینوں اور سالوں تک لڑائی ہوگی اور اس جنگ کا تجزبہ نہیں کیا انجام ہوگا۔
کیا خدا کا یہ وعدہ نہیں ـــــ کہ

وکان حقا علینا نصر المؤمنین

مومنین کی مدد کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ (روم ـ ۴۷)
کیا اس وعدے کی خلاف ورزی ہو رہی ہے؟
اور کیا قرآن نہیں کہتا کہ:

وللّٰہ العزۃ ولرسولہ وللمؤمنین

عزت و سربلندی اللہ، اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے۔ (منافقون ـ ۸)
کیا یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے؟
اسی طرح قرآن کہتا ہے:

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون

گزشتہ کتب میں ہم نے لکھ دیا ہے کہ زمین ہمارے صالح بندوں کا ورثہ ہے (انبیاء ـ ۱۰۵)
کیا یہ حکم تبدیل ہو گیا ہے؟
کیا ـ معاذ اللہ ـ خدا اپنے وعدوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے یا وہ اپنے وعدوں کو بھول چکا ہے یا انہیں تبدیل کر دیا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ عظمت، سربلندی اور افتخار کیوں ختم ہو گیا ہے؟

قرآن مجید مندرجہ بالا مقدس آیت میں ان تمام سوالات کا اور ایسے سینکڑوں سوالات کا ایک ہی جواب دیتا ہے اور وہ یہ کہ اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھو اور اپنے معاشرے میں نگاہ دوڑاؤ تو تم دیکھو گے کہ تغیرات اور تبدیلیاں خود تمہاری طرف سے شروع ہوتی ہیں۔ خدا کا لطف، کرم اور رحمت تو سب کے لیے وسیع ہے۔ خود تمہی اہلیت اور صلاحیت کھو بیٹھے ہو اور ایسے غم انگیز دنوں تک آپہنچے ہو۔

یہ آیت صرف گزشتہ زمانے کی بات نہیں کرتی کہ ہم کہیں کہ گزشتہ زمانہ تمام تلخیوں اور شیرینیوں کے ساتھ گزر گیا ہے اور اب پلٹ کر نہیں آئے گا اور اس کے متعلق بات کرنا فضول ہے ـــ بلکہ آج اور آئندہ زمانے کی بات کرتی ہے کہ اگر خدا کی طرف پھر لوٹ آؤ اور ایمان کے ستون محکم کرو، اپنے افکار کو بیدار کرو، اپنے وعدوں اور ذمہ داریوں کو یاد رکھو، ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لو، اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ اور اپنی آواز بلند کرو، جوش و جذبے سے کام لو، قربانی دو، جہاد کرو اور تمام امور میں سعی و کوشش سے کام لو ـــ پھر چشمے بہنے لگیں گے، تیرہ و تاریک دن کٹ جائیں گے، افق درخشاں اور روشن سرنوشت تمہارے سامنے آشکار ہو جائے گی اور اعلیٰ ترین سطح پر عظمت رفتہ پھر سے لوٹ آئے گی۔

آئیے اپنے آپ کو بدلیں ـــ علماء اور دانشور بات کریں اور لکھیں۔ مجاہد جہاد کریں۔ تاجر اور مزدور محنت کریں۔ جوان زیادہ سے زیادہ علم حاصل کریں اور پاک و پاکیزہ بن جائیں اور پوری محنت سے علم و آگاہی حاصل کریں تاکہ معاشرے کی رگوں میں تازہ

خون دوڑنے لگے اور وہ قدرت و طاقت پیدا کریں کہ وہ سخت دشمن جو آج ایک بالشت زمین منت و التماس سے واپس نہیں کرتا تمام زمینیں ہاتھ جوڑ کر واپس کر دے۔

لیکن یہ ایسے حقائق ہیں جن کا کہنا تو آسان ہے مگر انہیں جاننا اور باور کرنا مشکل ہے اور ان پر عمل کرنا تو بہت زیادہ مشکل ہے پھر بھی نورِ امید کے سائے میں پیش رفت کرنا چاہیے۔

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ دستورِ رہبری و رہنمائی قوموں اور ملتوں کی زندگی میں بہت ہی موثر نقش رکھتا ہے اور اسے ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ بیدار قومیں ہمیشہ لائق رہبروں اور رہنماؤں کو اپنی رہبری کے لیے قبول کرتی ہیں اور نالائق، باتونی اور ظالم لیڈر قوموں کے آہنی ارادے کے سامنے ہمیشہ سرنگوں ہو جاتے ہیں۔

اسے بھی ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ظاہری عوامل و اسباب کے ماوراء غیبی امداد اور الطافِ الٰہی کا ایک سلسلہ ہے جو باایمان پُرجوش اور پُرخلوص بندوں کے انتظار میں ہے اور وہ سب کچھ بغیر شرط اور قید کے نہیں ہے بلکہ اس کے لیے آمادگی اور اہلیت ضروری ہے۔

دو روایات پیش کر کے ہم یہ بحث تمام کرتے ہیں۔

پہلی یہ کہ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:

ما انعم اللّٰہ علی عبد بنعمة فسلبها ایاه حتّٰی یذنب ذنبا یستحق بذالک السلب

خدا کوئی نعمت جو کسی بندے کو دیتا ہے اس سے واپس نہیں لیتا مگر یہ کہ وہ ایسا گناہ کرے جس کی وجہ سے اس نعمت کے سلب ہونے کا مستحق ہو جائے۔[1]

دوسری حدیث بھی امام صادق علیہ السلام ہی سے منقول ہے:

خدا نے ایک پیغمبر کو مامور کیا کہ وہ اپنی قوم سے یہ بات کہہ دے کہ جو جماعت اور گروہ میری اطاعت کے سائے میں خوشی اور آسائش میں ہو۔ وہ مجھ اس حالت کو جو میری رضا کا باعث ہے جب بھی تغیر کریں گے میں بھی جس حالت کو وہ پسند کرتے ہیں اس کی بجائے انہیں اس حالت میں بدل دوں گا جسے وہ ناپسند کرتے ہیں۔ اور جو گروہ معصیت گناہ کی وجہ سے تکلیف و ناراحتی میں گرفتار ہو اس کے بعد اپنی اس حالت کو جو میری عدم رضایت کا سبب ہے بدل دے تو میں بھی اسے اس حالت کی طرف لے جاؤں گا جسے وہ دوست رکھتے ہیں اور ان کی حالت کو بدل دوں گا۔[2]

۲۔ تقدیر، تاریخ یا کوئی اور جبر نہیں ہے: ایک اور بات جو مندرجہ بالا آیات سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ انسان کی پہلے سے معین شدہ کوئی خاص تقدیر نہیں ہے اور انسان جبرِ تاریخ، جبرِ زمان اور جبرِ ماحول کے زیرِ اثر نہیں ہے بلکہ تاریخ سازہ

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۶۳ بحوالہ اصولِ کافی۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۶۳ بحوالہ اصولِ کافی۔

اور انسان کے لیے حیات ساز عامل تغیرات ہیں جو اس کی روش، اخلاق اور فکر و روح میں اس کے اپنے ارادے سے پیدا ہو جاتے ہیں اس بنا پر جو لوگ جبری قضاء و قدر کا اعتقاد رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تمام واقعات پروردگار کے جبری ارادے اور مشیت سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، ایسے لوگ مندرجہ بالا آیت سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مادی جبر کے قائل کہ جو انسان کو ناقابل تغیر غرائز اور اصل وراثت کے ہاتھوں کھلونا سمجھتے ہیں یا جبر ماحول کے قائل کہ جو انسان کو اقتصادی اور تولیدی حالات کا پابند سمجھتے ہیں مکتب اسلام کی نظر میں ان کا عقیدہ بے قیمت اور غلط ہے۔ انسان آزاد ہے اور اپنی سرنوشت اپنے ہاتھ سے لکھتا ہے۔ آیات مذکورہ بالا کی طرف توجہ کرتے ہوئے انسان اپنی سرنوشت اور تاریخ کی لگام اپنے ہاتھ میں رکھتا اور اپنے لیے افتخار، اعزاز اور کامیابی پیدا کرتا ہے اور وہ خود ہی اپنے آپ کو شکست اور ذلت میں گرفتار کرتا ہے۔ اس کی باگ ڈور اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ جب تک خود انسان کی کیفیت میں تغیر پیدا نہ ہو اور وہ خود سازی سے کام نہ لے اس کی سرنوشت میں تغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔

۵۵۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

۵۶۔ اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ۝

۵۷۔ فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝

۵۸۔ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ۝

۵۹۔ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ؕ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۵۔ خدا کے نزدیک زمین پر چلنے والے بدترین جانور وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کر رکھی ہے اور ایمان نہیں لاتے۔

۵۶۔ وہ لوگ کہ جن سے تم نے پیمان لیا پھر وہ ہر مرتبہ اپنے عہد کو توڑتے ہیں (اور پیمان شکنی اور خیانت سے پرہیز نہیں کرتے۔

۵۷۔ اگر انہیں میدانِ جنگ میں پاؤ تو ان پر اس طرح سے حملہ کرو کہ وہ گروہ جو ان کے پیچھے ہیں منتشر ہو جائیں اور بکھر جائیں شاید وہ متذکر ہوں (اور عبرت حاصل کریں)۔

۵۸۔ اور جس وقت (نشانیاں ظاہر ہونے پر) تجھے کسی گروہ کی خیانت کا خوف ہو (کہ وہ اپنے عہد کو توڑ کر اچانک حملہ کردے گا) تو انہیں عادلانہ طور پر بتلا دو (کہ ان کا پیمان لغو ہو گیا ہے) کیونکہ خدا خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

۵۹۔ اور وہ کہ جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے یہ تصور نہ کریں کہ وہ ان اعمال کے ہوتے ہوئے کامیاب ہو جائیں گے (اور وہ ہماری قلم رو کی سزا سے نکل جائیں گے) وہ ہمیں کبھی عاجز نہیں کر سکتے۔

تفسیر

شدتِ عمل ـــــ پیمان شکنوں کے مقابلے میں

یہ آیات دشمنانِ اسلام کے ایک اور گروہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کی پوری پر حوادث تاریخ میں مسلمانوں پر سخت ضربیں لگائیں اور بالآخر اپنے دردناک انجام کا سامنا کیا۔

یہ گروہ ـــــ وہی مدینہ کے یہودی تھے جنہوں نے بار بار رسول اللہؐ کے ساتھ عہد و پیمان باندھا اور پھر بزدلانہ طور پر اسے توڑ دیا۔

یہ آیات ایک مستحکم طریقہ بیان کر رہی ہیں جو پیغمبر اکرمؐ کو اس پیمان شکن گروہ کے بارے میں اختیار کرنا چاہیے۔ ایسا طریقہ کہ جو دوسروں کے لیے باعثِ عبرت ہو اور اس گروہ کے خطرے کو بھی دور کرے۔

پہلے قرآن اس جہاں کے زندہ موجودات میں سے بے وقعت ترین اور گھٹیا ترین وجود کا تعارف کرواتے ہوئے کہتا ہے:

زمین پر چلنے والے بدترین لوگ خدا کے نزدیک وہ ہیں جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے اور اسی طرح اس پر چلتے رہتے ہیں اور کسی طرح ایمان نہیں لاتے (ان شر الدواب عند الله الذين كفروا فهم لا يؤمنون)۔

"الذين كفروا" کی تعبیر شاید اس طرف اشارہ ہے کہ مدینہ کے بہت سے یہودی پیغمبر اسلامؐ کے ظہور سے پہلے اپنی کتب کی روشنی میں آپ سے لگاؤ اور ایمان کا اظہار کرتے تھے بلکہ آپ کے مبلغ اور لوگوں کو آپ کے ظہور کے لیے تیار کرتے تھے لیکن آپ کے ظہور کے بعد چونکہ انہیں اپنے مادی مفادات خطرے میں نظر آئے تو کفر کی طرف جھک گئے اور اس راہ میں انہوں نے ایسی شدت کا مظاہرہ کیا کہ ان کے ایمان کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: "فهم لا يؤمنون"۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: یہ وہی لوگ تھے جن سے تم نے عہدو پیمان باندھا تا کہ کم از کم غیر جانبداری ہی کا لحاظ رکھیں اور مسلمانوں کو آزار اور تکلیف پہنچانے کے درپے نہ ہوں اور دشمنانِ اسلام کی مدد نہ کریں لیکن انہوں نے ہر مرتبہ اپنا پیمان توڑ دیا (الذین عٰھدت منھم ثم ینقضون عھدھم فی کل مرة)[1]

نہ انہیں خدا سے کوئی شرم و حیا آتی تھی اور نہ وہ اس کے فرمان کی مخالفت سے ڈرتے تھے اور نہ ہی وہ انسانی اصولوں کو پامال کرتے ہوئے کوئی پرواہ کرتے تھے (وھم لا یتقون)۔

"ینقضون" اور "یتقون" فعل مضارع کا صیغہ ہیں اور استمرار پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے کئی مرتبہ پیغمبر اکرمؐ سے کیے ہوئے عہدو پیمان توڑے تھے۔

اگلی آیت میں اس پیمان شکن بے ایمان اور ہٹ دھرم گروہ سے طرز سلوک کے بارے میں قرآن اس طرح بیان کرتا ہے: اگر انہیں میدانِ جنگ میں پاؤ اور وہ مسلح ہو کر تمہارے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں تو ان کی ایسے سرکوبی کرو کہ جو گروہ ان کے پیچھے ہوں وہ عبرت حاصل کریں اور منتشر ہو جائیں اور اپنے آپ کو پیش نہ کریں (فاما تثقفنھم فی الحرب فشرد بھم من خلفھم)۔

"تثقفنھم" "ثقف" (بروزن "سقف") کے مادہ سے ہے اس کا مطلب ہے "کسی چیز کو دقت نظر سے اور تیزی سے سمجھنا"۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان کی تنقید اور اعتراضات سے تیزی سے اور دقتِ نظر سے آگاہی حاصل کرو اور اس سے پہلے کہ تم پر وہ بے خبری میں کوئی جنگ ٹھونس دیں بجلی کی طرح ان پر جا پڑو۔

"شرد" "تشرید" کے مادہ سے "حالت اضطراب میں منتشر کرنے کے معنی میں ہے۔ یعنی ان پر اس طرح سے حملہ کرو کہ دشمنوں اور پیمان شکنوں کے دیگر گروہ منتشر ہو جائیں اور حملہ کرنے کی نہ سوچیں۔ یہ حکم اس بنا پر ہے کہ دوسرے دشمن بلکہ آئندہ کے دشمن عبرت حاصل کریں اور جنگ کی طرف بڑھنے سے اجتناب کریں اور اسی طرح جو لوگ مسلمانوں سے عہدو پیمان رکھتے ہیں یا آئندہ کوئی پیمان باندھیں تو عہدو پیمان توڑنے سے اجتناب کریں اور شاید سب کے سب سمجھ سکیں اور متذکر ہوں (لعلھم یذکرون)۔

"اور اگر وہ تیرے سامنے میدان میں نہ آئیں لیکن ان سے ایسے آثار و قرائن ظاہر ہوں کہ وہ پیمان شکنی کے درپے ہیں اور اس بات کا خوف ہو کہ وہ خیانت کریں گے اور بغیر اطلاع کے یک طرفہ طور پر پیمان توڑ دیں گے تو تم پیش قدمی کرو اور انہیں بتا دو کہ ان کا پیمان لغو ہو چکا ہے (واما تخافن من قوم خیانة فانبذ الیھم علیٰ سوآء)۔

ایسا نہ ہو کہ ان کا پیمان لغو ہونے کی اطلاع دیئے بغیر ان پر حملہ کر دو کیونکہ خدا خیانت کرنے والوں اور ان لوگوں کو جو اپنے پیمان میں خیانت کی راہ اختیار کریں دوست نہیں رکھتا (ان اللہ لا یحب الخآئنین)۔

اگرچہ مندرجہ بالا آیت میں رسول اللہؐ کو اجازت دی گئی ہے کہ دشمن کی طرف سے خیانت اور پیمان شکنی کے خوف کے موقع

---

[1] "من" "عاھدت منھم" میں یا تبعیض کے معنی میں ہے یعنی جزیرہ نمائے عرب کے یہودیوں کے ایک گروہ یا مدینہ کے یہودیوں کے سرداروں سے تم نے پیمان باندھا تھا یا اصطلاح کے مطابق شاید کے لیے ہے اس کا معنی "عاھدت ھم" (تو نے ان سے عہد کیا) ہوگا۔ یہ بھی احتمال ہے کہ یہ "اخذت العھد منھم" (تو نے ان سے عہد لیا) کے معنی میں ہو۔

پیمان کے پیمان کو لغو قرار دے دیں لیکن واضح ہے کہ یہ خوف بغیر دلیل کے نہیں ہو سکتا لہٰذا اس سلسلے میں یہ بات حتمی ہے کہ جب وہ کچھ ایسے اعمال کے مرتکب ہوں جو نشاندہی کریں کہ وہ پیمان شکنی، دشمن سے مل کر سازش کرنے اور غفلت کی حالت میں حملہ کرنے کی فکر میں ہیں تو پھر اتنے قرائن اور علامات مہیا ہو جانے پر اس بات کی اجازت ہے کہ پیغمبر ان کے پیمان کے لغو ہو جانے کا اعلان کریں۔

"فانبذ الیھم" "انباذ" کے مادہ سے پھینکنے یا اعلان کرنے اور بتلانے کے معنی میں ہے یعنی ان کا پیمان ان کی طرف پھینک دو اور لغو قرار دے دو اور اس کے لغو ہونے کی انہیں اطلاع دے دو۔

"علیٰ سواء" کی تعبیر یا تو اس معنی میں ہے کہ جس طرح انہوں نے اپنے پیمان کو لغو کر دیا ہے تم بھی اپنی طرف سے لغو قرار دے دو۔ یہ ایک عادلانہ اور مساویانہ حکم ہے یا یہ اس معنی میں ہے کہ ایک واضح غیر مخفی اور ہر قسم کے مکر و فریب سے پاک طریقے سے اعلان کر دو۔

بہر حال زیر نظر آیت جہاں مسلمانوں کو تنبیہ کر رہی ہے کہ وہ کوشش کریں کہ پیمان شکن ان پر حملہ آور نہ ہو جائیں وہاں انہیں معاہدے کی حفاظت کرنے یا عہد و پیمان کو لغو کرنے کے سلسلے میں انسانی اصولوں کو ملحوظ رکھنے کے بارے میں بھی کہہ رہی ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں روئے سخن پیمان شکن گروہ کی طرف کرتے ہوئے انہیں تنبیہ کی گئی ہے کہ "کہیں یا ایسا نہ ہو کہ کفر اختیار کرنے والے لوگ یہ تصور کریں کہ وہ اپنے خیانت آمیز اعمال کے ذریعے کامیاب ہو گئے ہیں اور ہماری قدرت اور سزا و عذاب کے قلمرو سے نکل گئے ہیں" (ولا یحسبن الذین کفروا سبقوا)۔ "وہ ہمیں ہرگز عاجز نہیں کر سکتے اور ہمارے احاطۂ قدرت سے نہیں نکل سکتے" (انھم لا یعجزون)۔

۶۰۔ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ○

۶۱۔ وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○

۶۲۔ وَإِن يُرِيدُوا أَن يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللَّهُ ۚ هُوَ الَّذِي أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ ○

۶۳۔ وَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِى الۡاَرۡضِ جَمِيۡعًا
مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَيۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيۡنَهُمۡ ؕ اِنَّهٗ
عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ○
۶۴۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ حَسۡبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ○

ترجمہ

۶۰۔ ان دشمنوں کے مقابلے کے لیے جتنی "قوت" ممکن ہو سکے مہیا اور تیار رکھو اسی طرح (میدان جنگ کے لیے) طاقتور اور تجربہ کار گھوڑے (بھی تیار رکھو) تاکہ اس سے خدا کے اور اپنے دشمن کو ڈرا سکو اور (اسی طرح) ان کے علاوہ دوسرے گروہ کو کہ جنہیں تم نہیں پہچانتے اور خدا انہیں پہچانتا ہے اور جو کچھ تم راہ خدا میں (اسلامی دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے) خرچ کرو گے تمہیں لوٹا دیا جائے گا اور تم پر ظلم و ستم نہیں ہو گا۔

۶۱۔ اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی باب صلح کی طرف سے داخل ہوا اور خدا پر تکیہ کرو کہ وہ سننے اور جاننے والا ہے۔

۶۲۔ اور اگر وہ تمہیں دھوکا دینا چاہیں تو خدا تمہارے لیے کافی ہے اور وہ وہی ہے کہ جس نے تمہیں اپنی اور مومنین کی مدد سے تقویت پہنچائی۔

۶۳۔ اور ان کے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی اور اگر وہ دلوں میں الفت پیدا کرنے کے لیے روئے زمین کی تمام چیزوں کو صرف کر دیتے تو ایسا نہ کر سکتے لیکن خدا نے ان کے درمیان الفت پیدا کر دی وہ توانا اور رحیم ہے۔

۶۴۔ اے نبی! خدا اور وہ مومنین جو تیری پیروی کرتے ہیں تیری حمایت کے لیے کافی ہیں۔

تفسیر

جنگی طاقت میں اضافہ اور اس کا مقصد

اسلامی جہاد کے سلسلے میں گذشتہ احکام کی مناسبت سے زیر نظر پہلی آیت میں مسلمانوں کی توجہ زندگی کے ایک ایسے بنیادی قانون

کی طرف دلائی گئی ہے جو ہر زمانے میں اور ہر وقت نظر میں رہنا چاہیے اور وہ ہے دشمن کے مقابلے میں کافی دفاعی تیاری کا لزوم۔
پہلے قرآن کہتا ہے: اور دشمن کے مقابلے میں جس قدر ممکن ہو سکے قوت تیار رکھو (واعدوا لهم ما استطعتم من قوة)۔
یعنی اس انتظار میں نہ رہو کہ جب دشمن تم پر حملہ کرے گا اس وقت اس کے مقابلے میں تیاری کروگے بلکہ پہلے ہی سے دشمن کے احتمالی حملے کے مقابلے میں کافی تیاری ہونا چاہیے۔
اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور اسی طرح طاقتور اور آزمودہ کار گھوڑے میدانِ جہاد کے لیے فراہم رکھو (ومن رباط الخیل)۔
"رباط" کا معنی ہے "باندھنا اور پیوند لگانا" زیادہ تر یہ لفظ کسی جگہ سے کسی جانور کے حفاظت کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ بعدازاں اسی مناسبت سے حفاظت اور نگرانی کرنے کے عمومی معنی میں استعمال ہونے لگا۔ "مرابطہ" سرحدوں کی حفاظت کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ہر چیز کی حفاظت کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور جانوروں کے باندھنے اور حفاظت کرنے کی جگہ کو "رباط" کہتے ہیں۔ اسی طرح سرائے کو عرب "رباط" کہتے ہیں۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ "قوۃ" کا مفہوم: ایک مختصر سے جملے کے ذریعے زیرِ نظر آیت میں اسلامی جہاد، مسلمانوں کی بقاء اور ان کی عظمت و افتخار کی حفاظت کے لیے ایک بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے۔ آیت کی تعبیر اس قدر وسیع ہے کہ ہر زمان و مکاں پر پوری طرح سے منطبق ہوتی ہے۔
"قوۃ" کس قدر چھوٹا اور پرمعنی لفظ ہے۔ یہ نہ صرف ہر زمانے کے جنگی وسائل اور جدید اسلحہ پر محیط ہے بلکہ ان تمام توانائیوں اور طاقتوں کا مفہوم بھی لیے ہوئے ہے جو کسی نہ کسی شکل میں دشمن پر کامیابی کے لیے مؤثر ہیں چاہیے وہ مادی قوتیں ہوں یا معنوی۔
جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ دشمن پر کامیابی اور اپنی بقا کی حفاظت صرف جنگی ہتھیاروں کی تعداد سے وابستہ ہے وہ انتہائی غلطی پر ہیں کیونکہ ہم نے اپنے زمانے کے انہی میدانوں میں ایسی قوموں کو دیکھا ہے جو تھوڑی سی تعداد اور کم اسلحہ سے زیادہ طاقتور اور زیادہ اسلحہ کی مالک قوموں کے مقابلے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ مثلاً الجزائر کی مسلمان قوم فرانس کی طاقتور حکومت کے مقابلے میں۔ لہٰذا ہر زمانے کے نہایت بہترین ہتھیاروں سے ایک قطعی اسلامی فریضے کے طور پر فائدہ اٹھانے کے علاوہ مجاہدین کی ہمتِ مردانہ اور قوتِ ایمان کو بھی بروئے کار لایا جانا چاہیے جو کہ اہم ترین قوت و طاقت ہے۔
اقتصادی، ثقافتی اور سیاسی قوتیں بھی "قوۃ" کے مفہوم میں داخل ہیں اور دشمن پر کامیابی کے حصول کے لیے بہت مؤثر ہیں ان سے بھی غفلت نہیں برتنا چاہیے۔
یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ اسلامی روایات میں لفظ "قوۃ" کی کئی تفاسیر کی گئی ہیں کہ جو اس لفظ کے مفہوم کی وسعت کی ترجمان ہیں۔
مثلاً بعض روایات میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:
قوت سے مراد تیر ہے[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۵

دوسری روایت جو تفسیر علی بن ابراہیم میں آئی ہے اس میں ہے کہ:

"قوۃ" سے مراد ہر قسم کا اسلحہ ہے۔[1]

ایک اور روایت جو تفسیر عیاشی میں آئی ہے میں ہے:

"قوۃ" سے مراد تلوار اور ڈھال ہے۔[2]

ایک اور روایت جو "من لا یحضرہ" میں آئی ہے میں ہے:

منہ الخضاب السواد

آیت میں "قوۃ" کا ایک مصداق سفید بالوں کو سیاہ خضاب کرنا بھی ہے۔[3]

یعنی اسلام نے سن رسیدہ مجاہد کے بالوں کے خضاب تک کو نظر انداز نہیں کیا تاکہ دشمن اس سے مرعوب ہو۔ یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ زیر نظر آیت میں "قوۃ" کا مفہوم کس قدر وسیع ہے۔

اس بنا پر وہ لوگ جنہوں نے صرف کچھ روایات دیکھی ہیں اور انہوں نے لفظ "قوۃ" کو صرف ایک مصداق میں محدود سمجھا ہے وہ عجیب اشتباہ میں گرفتار ہوئے ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ مسلمان ایسے صریح اور واضح فرمان کے باوجود گویا ہر چیز ہاتھ سے دے بیٹھے ہیں۔ انہیں دشمنوں کے مقابلے میں نہ تو معنوی اور روحانی قوتیں فراہم کرنے سے کوئی سروکار ہے اور نہ ہی اقتصادی، سیاسی، ثقافتی اور فوجی قوتیں مہیا کرنے سے دلچسپی۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس عظیم غفلت اور ایسے صریح حکم کو پس پشت ڈالنے کے باوجود ہم اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں اور اپنی پسماندگی کا گناہ اسلام کی گردن پر ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر اسلام ہیل رفت اور کامیابی کا دین ہے تو پھر ہم مسلمان کیوں پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہیں۔

ہمارا نظریہ ہے کہ اگر اس عظیم اسلامی حکم ——— واعدوالھم مااستطعتم من قوۃ ——— کی ہر جگہ ایک عمومی اور عوامی شعار کی حیثیت سے تبلیغ ہو اور چھوٹے بڑے عالم و جاہل، مؤلف و مقرر، فوجی اور افسر، کسان اور تاجر یعنی تمام مسلمان اپنی زندگی میں اس پر عمل کریں تو ان کی اس پس ماندگی کی تلافی کے لیے کافی ہے۔

پیغمبر اکرم اور اسلام کے عظیم راہنماؤں کی عملی سیرت بھی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ دشمن کے مقابلے سے کبھی غفلت نہ برتتے تھے۔ وہ ہتھیار اور افراد مہیا کرنے، سپاہیوں کی ہمت بڑھانے، لشکر کے لیے جگہ منتخب کرنے، دشمن پر حملے کے لیے مناسب وقت کا انتخاب کرنے اور ہر قسم کی جنگی تکنیک کو اپنانے میں سے کسی چھوٹے یا بڑے پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے تھے۔

مشہور ہے کہ جنگ حنین کے دنوں میں لوگوں نے رسول اللہ کو خبر دی کہ یمن میں نیا مشینی ہتھیار تیار ہوا ہے۔ آپ نے فوراً کسی کو یمن کی طرف بھیجا تاکہ وہ اسے لشکر اسلام کے لیے مہیا کرے۔

جنگ احد کے واقعات میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب بت پرستوں کا یہ نعرہ سنا کہ:

---

[1]، [2] اور [3] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۶۳ اور صفحہ ۱۶۵۔

اعل ھبل ، اعل ھبل

یعنی - ہبل کی جے ، ہبل کی جے -

—— تو اس کے مقابلے میں مسلمانوں کو اس کی سرکوبی کرنے والا اور زیادہ موثر نعرہ سکھایا اور ان سے یہ نعرہ بلند کرنے کو کہا :

اللہ اعلیٰ و اجل

خدا ہر چیز سے برتر اور بالا تر ہے -

اور جب بت پرستوں نے یہ نعرہ لگایا کہ :

ان لنا العزّٰی ولا عزّٰی لکم

ہمارے لیے عزیٰ بت ہے تمہارے لیے عزیٰ نہیں ہے -

—— تو اس کے مقابلے میں آپ نے مسلمانوں کو اس نعرے کی تعلیم دی :

اللہ مولانا و لا مولا لکم

خدا ہمارا ولی اور سہارا ہے اور تمہارا کوئی سہارا نہیں -

یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ رسول اللہ اور مسلمان دشمن کے مقابلے میں ایک زوردار نعرے کی تاثیر تک سے غافل نہ تھے اور اپنے لیے بہترین نعرے کا انتخاب کرتے تھے -

اسلام کا ایک اہم فقہی حکم تیر اندازی اور گھڑ دوڑ کے مقابلے کے بارے میں ہے - یہاں تک کہ اس سلسلے مالی فتح و شکست تجویز کی گئی ہے اور اس مقابلے کی دعوت دی گئی ہے - دشمن کے مقابلے میں تیار رہنے سے متعلق اسلام کی گہری نظر کا یہ ایک اور نمونہ ہے -[1]

۲ - "اسلام" کے دائمی ہونے کی ایک دلیل : ایک اور اہم نکتہ مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے جو کہ دین اسلام کے عالمی ، دائمی اور جاودانی ہونے پر ایک دلیل ہے - اس دین کے مفاہیم ، معانی اور مضامین اس طرح پھیلے ہوئے اور وسیع ہیں کہ اتنا طویل زمانہ گزرنے کے باوجود ان میں کہنگی اور فرسودگی کا نشان نظر نہیں آتا " واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ " کا جملہ ہزار سال پہلے بھی ایک زندہ مفہوم رکھتا تھا اور آج بھی اسی طرح ہے اور دس ہزار سال آئندہ کے لیے بھی اسی طرح زندہ باقی رہے گا کیونکہ جو ہتھیار اور طاقت آئندہ پیدا ہوگی وہ " قوۃ " کے جامع لفظ میں پوشیدہ ہے " ما استطعتم " عام ہے اور " قوۃ " جو کہ نکرہ کی شکل میں آیا ہے اس کی عمومیت کو تقویت دیتا ہے اور ہر قسم کی قوت و طاقت پر محیط ہے -

۳ - " قوۃ " کے بعد گھوڑوں کے ذکر کا مقصد : یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ لفظ " قوۃ " کے ذکر کے بعد کہ جو اس قسم کا وسیع مفہوم رکھتا ہے تجربہ کار جنگی گھوڑوں کا ذکر کیوں کیا گیا ہے -

---

[1] ہمارے ہاں جو ریس وغیرہ مروج ہے اس کا اسلامی سبق و رمایہ سے دور کا بھی تعلق نہیں کیونکہ وہاں تو اصل مقابلہ ہی دشمن کے مقابلے میں جنگی مشق کے طور پر ہوتا ہے وہاں پہلے سے دونوں طرف سے یا ایک طرف سے انعام مقرر کیا جاتا ہے کہ جو جیت جائے گا صرف اسے اتنا انعام ملے گا جبکہ مغرب کی شیطانی تہذیب سے آئی ہوئی اس ریس میں تو لوگ آپس میں جوا کھیلتے ہیں - (مترجم) -

اس سوال کا جواب ایک جملے سے واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ مندرجہ بالا آیت نے جہاں تمام زمانوں کے لیے ایک وسیع حکم بیان کیا ہے وہاں ایک خاص حکم رسول اللہؐ کے زمانہ اور نزولِ قرآن کے وقت کا بھی بیان کر دیا ہے درحقیقت ایک کلی اور عمومی مفہوم کو ایک واضح عملی مثال سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ گھوڑا آج کے میدانِ جنگ میں ٹینکوں بکتر بند گاڑیوں، ہوائی جہازوں اور ریل کی پٹڑیوں کے ہوتے ہوئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس زمانے میں بہادر و شجاع جنگجو سپاہیوں کے لیے یہ ایک چست اور تیز رفتار ذریعہ شمار ہوتا تھا۔

جنگی طاقت میں اضافے کا اصلی مقصد

اس حکم کے بعد قرآن اس موضوع کے منطقی اور انسانی ہدف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مقصد یہ نہیں ہے کہ اصل دنیا کو یا اپنی قوم کو طرح طرح کے تباہ کن اور ویران گر ہتھیاروں سے تباہ و برباد کر دو اور آبادیوں اور زمینوں کو ویران کر دو۔ مقصد یہ نہیں کہ دوسروں کی زمینوں اور مال و اسباب کو لوٹو اور یہ بھی مقصد نہیں کہ دنیا میں غلامی اور استعمار کے اصول رائج کر دو بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان وسائل کے ذریعے خدا کے اور اپنے دشمن کو ڈراؤ (ترهبون به عدوا الله و عدو کم) کیونکہ زیادہ تر دشمن ایسے ہیں کہ جن کے کان منطقی حرف اور انسانی اصول نہیں سنتے وہ قوت و طاقت کی زبان کے سوا دوسری کوئی زبان نہیں سمجھتے
اگر مسلمان کمزور ہوں تو تمام تر بوجھ انہی پر ڈالے جائیں گے لیکن اگر وہ کافی مقدار میں قوت و طاقت حاصل کر لیں تو پھر حق و عدالت اور استقلال و آزادی کے دشمن پریشان ہو جائیں گے اور اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں گے۔
اس وقت جب کہ میں اس آیت کی تفسیر لکھ رہا ہوں فلسطین اور دیگر اسلامی ممالک کے اہم حصے اسرائیل فوجوں کے زیرِ تسلط آ چکے ہیں۔
حالیہ دنوں میں جنوبی لبنان پر جو بزدلانہ حملہ ہوا ہے اس سے ہزارہا خاندان دربدر ہو گئے ہیں، سینکڑوں قتل ہوئے، آبادیاں وحشت ناک ویرانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں اس سے اس غم انگیز داستان میں نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔
دنیا کے عام لوگوں کے افکار نے اس پورے عمل کی مذمت کی ہے یہاں تک کہ اسرائیل کے دوست نے بھی دوسروں ہی کی آواز میں آواز ملائی ہے۔ اقوام متحدہ نے اپنے فیصلوں کے ذریعے اسرائیل کو یہ سب زمینیں خالی کرنے کا حکم دیا ہے لیکن چند ملین پر مشتمل اس قوم کے کان ان میں سے کوئی بات سننے کو تیار نہیں ہیں ـــــ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ ان کے پاس طاقت و قوت ہے، اسلحہ ہے، بڑے پیمانے پر جنگی تیاری ہے اور طاقتور حامی ہیں۔ اس جارحیت کے لیے انہوں نے سالہا سال سے تیاری کی ہوئی ہے ـــــ وہ واحد منطق جس کے ذریعے انہیں جواب دیا جا سکتا ہے، یہی ہے:

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ...... ترهبون به عدو الله وعدوكم

یوں لگتا ہے جیسے یہ آیت ہمارے زمانے اور ہماری آج کی کیفیت کے بارے میں نازل ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ اس طرح طاقتور بنو کہ دشمن دہشت اور حیرت میں پڑ جائے اور غصب شدہ زمینوں کو واپس کر دے اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جائے۔
یہ جاذب توجہ ہے کہ لفظ "عدو الله" کو "عدوکم" سے پہلے لا کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے جہاد اور اسلامی دفاع میں شخصی

اغراض کا کوئی دخل نہیں بلکہ مقصد اسلام کے مکتب انسانی کی حفاظت ہے۔ ۔ وہ کہ جن کی تم سے دشمنی خدا سے دشمنی کی شکل میں ہے یعنی جو حق و عدالت، ایمان و توحید انسانی پروگراموں سے دشمنی رکھتے ہوں وہ تمہارے حملوں اور تمہاری دفاعی تیاریوں کا ہدف ہوں۔

درحقیقت یہ تعبیر " فی سبیل اللہ " یا " جہاد فی سبیل اللہ " کی تعبیر سے مشابہ ہے جو نشاندہی کرتی ہے کہ اسلامی جہاد اور دفاع نہ تو گذشتہ سلاطین کی کشور کشائی کی مانند ہے اور نہ آج کی سامراجی اور استعماری طاقتوں کی توسیع طلبی کی طرح ہے بلکہ سب کچھ خدا کے لیے، خدا کی راہ میں اور حق و عدالت کے احیاء کے راستے میں ہے۔

پھر مزید فرمایا گیا ہے: ان دشمنوں کے علاوہ جنہیں تم پہچانتے ہو تمہارے اور دشمن بھی ہیں جنہیں تم نہیں پہچانتے اور وہ تمہاری زیادہ جنگی تیاری سے ڈر جائیں گے اور اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں گے (و آخرین من دونھم لا تعلمونھم)۔

دو قابلِ توجہ نکات

۱۔ دوسرے دشمن کونسے تھے؟ مفسرین نے دوسرے گروہ سے متعلق کئی ایک احتمالات ذکر کیے ہیں۔ بعض نے اسے مدینہ کے یہودیوں کے ایک گروہ کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو اپنی دشمنی کو چھپائے رکھتے تھے۔ بعض دوسرے مفسرین نے مسلمانوں کے آئندہ دشمنوں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جیسا کہ رومی اور ساسانی سلطنتیں تھیں کہ جن سے جنگ کے متعلق ان دنوں مسلمانوں کو احتمال ہی تھا لیکن جو کچھ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ اس سے مراد منافق ہیں کیونکہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں ناشناختہ طور پر موجود تھے اور سپاہِ اسلام کی مکمل تیاری کی صورت میں وہ بھی پریشان ہو جاتے تھے اور اپنے ہاتھ پاؤں سمیٹنے لگتے تھے۔ اس امر کی شاہد سورہ توبہ کی آیہ ۱۰۱ ہے جس میں ہے:

و من اھل المدینۃ مردوا علی النفاق لا تعلمھم نحن نعلمھم

بعض اہلِ مدینہ نفاق اور دورنگی پالیسی میں جسور اور سرکش ہیں کہ جنہیں تم نہیں جانتے لیکن ہم انہیں جانتے ہیں۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے اسلام کے تمام چھپے ہوئے دشمن مراد ہوں چاہے وہ منافقین ہوں یا غیر منافقین۔

۲۔ دورِ حاضر کے لیے ایک حکم: یہ آیت آج کے مسلمانوں کے لیے بھی اپنے اندر ایک حکم لیے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ نہ صرف اپنے ظاہری دشمنوں پر نظر رکھو اور اپنی تیاری کو انہی سے جنگ تک محدود رکھو بلکہ احتمالی اور بالقوۃ دشمنوں کو بھی نظر میں رکھو اور جس قدر طاقت و قوت لازمی ہے زیادہ سے زیادہ فراہم کرو۔

اگر مسلمان فی الحقیقت اس نکتہ کو نظر میں رکھتے تو کبھی طاقتور دشمنوں کے غافلانہ حملوں کا شکار نہ ہوتے۔

آیت کے آخر میں ایک اور اہم موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ قوت و طاقت، سازوسامان، اسلحہ اور مختلف قسم کے ضروری دفاعی وسائل کے لیے سرمائے کی ضرورت ہے لہٰذا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تمام افراد کے تعاون و ہمکاری سے یہ مالی سرمایہ اکٹھا کریں۔ فرمایا گیا ہے: جان لو کہ جو کچھ تم راہِ خدا میں خرچ کرتے ہو تمہیں پلٹا دیا جائے گا (و ما تنفقوا من شیء فی سبیل اللہ یوف الیکم)۔ اور وہ سارے کا سارا تمہیں پہنچے گا اور تم پر کسی قسم کا کوئی ظلم نہیں ہوگا (و انتم لا تظلمون)۔

یہ جزا تمہیں اس جہان کی زندگی میں بھی، اسلام کی کامیابی اور شوکت و عظمت کی صورت میں ملے گی کیونکہ ایک کمزور قوم کا مالی

سرمایہ بھی خطرے میں پڑجائے گا اور وہ اپنے امن وامان، راحت و آرام اور استقلال و استحکام کو بھی ہاتھ سے دے بیٹھے گی۔ اس بناء پر وہ سرمایہ جو اس راہ میں صرف ہوگا وہ ایک اور راستے سے بالآخر صلح پر خرچ کرنے والوں کی طرف پلٹ آئے گا۔ نیز دوسرے جہان میں رحمتِ پروردگار کے جوار میں عظیم ترین ثواب و جزا تمہارے انتظار میں ہوگی لہٰذا اس صورت میں نہ صرف یہ کہ تم پر ظلم وستم نہیں ہوگا بلکہ تمہیں بہت زیادہ فائدہ اور نفع بھی حاصل ہوگا

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا جملے میں لفظ "شیء" استعمال ہوا ہے جو ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے یعنی ہر قسم کی چیز چاہے وہ جان ہو یا مال، قوتِ فکر ہو یا قدرتِ منطق یا کوئی بھی دوسرا سرمایہ مسلمانوں کی دفاعی اور فوجی بنیادوں کی تقویت کے لیے دشمن کے مقابلے میں خرچ کیا جائے تو وہ خدا سے پوشیدہ نہیں رہے گا اور خدا اسے محفوظ رکھے گا اور بوقتِ ضرورت تمہیں دے گا۔

"وانتم لا تظلمون" کے جملے کی تفسیر میں بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی بیان کیا ہے کہ اس کا عطف "ترھبون" پر ہے یعنی اگر دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی توانائی فراہم کرو تو وہ تم پر حملہ کرنے سے گھبرائیں گے اور تم پر ظلم کرنے کی قدرت ان میں نہیں ہوگی لہٰذا تم پر ظلم وستم نہیں ہوگا۔

جہادِ اسلامی کا مقصد اور اس کے ارکان

دوسرا نکتہ جو زیرِ بحث آیت سے معلوم ہوتا ہے اور بہت سے سوالات اور معترضین اور بے خبر لوگوں کے اعتراضات کا جواب ہوسکتا ہے وہ اسلامی جہاد کی صورت، ہدف اور پروگرام ہے۔ آیت واضح طور پر کہتی ہے کہ مقصد یہ نہیں ہے کہ انسانوں کو قتل کرو اور نہ یہ ہدف ہے کہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالو بلکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اصلی ہدف یہ ہے کہ دشمن ڈریں اور وہ تم پر زیادتی نہ کریں، زبردستی کوئی بات نہ منوائیں نیز تمہاری ساری کوشش کا نتیجہ خدا اور حق و عدالت کے دشمنوں کے شر کو کم کرنا ہو۔

کیا مخالفینِ جہادِ اسلامی کے بارے میں قرآن کی اس صراحت کو نہیں سنتے کہ جو اس آیت میں موجود ہے۔ یہ لوگ پے در پے اسلامی قانون پر حملہ کرتے رہتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کا دین ہے، کبھی کہتے ہیں کہ اسلام اپنے عقیدے اور نظریے کو ٹھونسنے کے لیے ہتھیاروں کو ذریعہ بناتا ہے اور کبھی پیغمبرِ اسلام کی تاریخ کو کشور کشائی کرنے والوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ہمارے نظریے کے مطابق پر ایسے سب اعتراضات کا جواب یہ ہے کہ وہ قرآن کی طرف پلٹیں اور اس پروگرام کے اصلی ہدف پر غور و فکر کریں تاکہ ان پر تمام چیزیں واضح ہوجائیں۔

صلح کے لیے آمادگی

گذشتہ آیت میں اگرچہ اسلامی جہاد کے مقصد کو کافی حد تک نمایاں کرتی ہے تاہم بعد والی آیت کہ جو دشمن سے صلح کے بارے میں بحث کرتی ہے اس حقیقت کو واضح کررہی ہے۔ فرمایا گیا ہے: اگر وہ صلح کی طرف میلان ظاہر کریں تو تم بھی ان کا ہاتھ جھٹک دو اور آمادگی ظاہر کرو (وان جنحوا للسلم فاجنح لہا)۔

مندرجہ جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ اگر وہ صلح کی طرف پر پھیلائیں تو تم بھی اس کی طرف پر پھیلاؤ کیونکہ "جنحوا"

" جنوح " کے مادہ سے مائل ہونے کے معنی میں بھی آیا ہے اور پرندوں کے پروں کو بھی " جناح " کہا جاتا ہے کیونکہ ان کا ہر پربال ایک طرف مائل ہوتا ہے۔ اس احتمال کے پیشِ نظر آیت کی تفسیر کے لیے اصل لغت سے بھی استفادہ ہوسکتا ہے اور اس لفظ کے ثانوی مفہوم سے بھی۔

چونکہ عام طور پر پیمانِ صلح پر دستخط کرتے وقت لوگ تردد میں گرفتار ہو جاتے ہیں لہٰذا پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ صلح کی تجویز قبول کرنے میں شک و تردد کو اپنے میں راہ نہ دو اگر اس کی شرائط منطقی، عاقلانہ اور عادلانہ ہوں تو انہیں قبول کرو، اور خدا پر توکل کرو کیونکہ خدا تمہاری گفتگو بھی سنتا ہے اور تمہاری نیتوں سے بھی آگاہ ہے (و توکل علی اللہ انہ ھو السمیع العلیم)۔

لیکن اس کے باوجود رسول اللہؐ اور مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے صلح کی تجاویز میں مکر و فریب بروئے کار لایا گیا ہو اور صلح کو دشمن اچانک حملے کے لیے مقدمہ کے طور پر استعمال کریں یا ان کا مقصد جنگ میں تاخیر کرنے سے زیادہ قوت فراہم کرنا ہو تاہم اس امر سے بھی پریشان نہ ہو کیونکہ خدا تمہارے کام کی کفایت کرے گا اور وہ ہر حالت میں تمہارا پشتی بان ہے (و ان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ)۔ تمہاری سابقہ زندگی بھی اس حقیقت پر گواہ ہے کیونکہ " وہی ہے جس نے اپنی مدد سے اور پاک دل مومنین کی مدد سے تمہاری تقویت کی تھی (ھو الذی ایدک بنصرہ و بالمومنین)۔ انہوں نے بارہا تمہارے لیے عظیم خطرے پیدا کیے اور ایسی خطرناک سازشیں کیں کہ عام طریقے سے انہیں ناکام بنانا ممکن نہیں تھا لیکن اس نے ان تمام مواقع پر تمہاری حفاظت کی۔ علاوہ ازیں یہ مخلص مومنین کہ جو تمہارے گرد و پیش تھے کسی قسم کی فداکاری سے دریغ نہیں کرتے۔ پہلے یہ بکھرے ہوئے اور ایک دوسرے کے دشمن تھے خدا نے ان پر نورِ ہدایت کا چھڑکاؤ کیا " اور ان کے دلوں کے اندر الفت پیدا کی (و الف بین قلوبھم)۔

سالہا سال سے مدینہ میں اوس اور خزرج قبائل میں خون ریزی جاری تھی اور ان کے سینے بغض و عداوت سے بھرے ہوئے تھے۔ حالت یہ تھی کہ کسی شخص کو یہ یقین نہ تھا کہ وہ کسی روز ایک دوسرے کی طرف دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھائیں گے اور ایک ہی صف میں شامل ہوں گے لیکن خداوند متعال نے اسلام کے پرتو اور نزولِ قرآن کے سائے میں یہ کام انجام دیا۔ اوس و خزرج کہ جو انصار میں سے تھے انہی کے درمیان ایسی کش مکش نہ تھی بلکہ رسول اللہؐ کے مہاجر اصحاب جو مکہ سے آئے تھے وہ بھی اسلام سے پہلے ایک دوسرے سے الفت اور دوستی نہیں رکھتے تھے اور اکثر ان کے سینے ایک دوسرے کے لیے کینے سے بھرے رہتے تھے لیکن خدا تعالیٰ نے ان سب کینوں کو دھو ڈالا اور اس طرح ختم کر دیا کہ بدر کے تین سو تیرہ مجاہدین کہ جن میں تقریباً اسی مہاجرین اور باقی انصار تھے اگرچہ ایک چھوٹا سا گروہ تھے لیکن وہ ایک جسم کی مانند ہو گئے اور ایک ایسا طاقتور اور متحد لشکر بن گئے کہ جس نے اپنے نہایت قوی دشمن کو شکست سے دوچار کر دیا۔

اس کے بعد مزید ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس الفت اور دلوں کے رشتے قائم کرنا معمول کے مادی طریقوں سے ممکن نہ تھا " اگر وہ تمام کچھ جو روئے زمین میں ہے تم خرچ کر دیتے تو ان کے دلوں میں الفت و محبت پیدا نہ کر سکتے (لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم)۔

لیکن یہ خدا ہی تھا جس نے ان کے درمیان ایمان کی وجہ سے اور ایمان کے ذریعے سے الفت پیدا کر دی (و لکن اللہ

الف بینھم)۔

وہ لوگ جو ہٹ دھرم اور کینہ پرور افراد خصوصاً جاہل قوموں اور زمانہ جاہلیت کے سے لوگوں کی روحانی اور جذباتی کیفیت سے آشنا ہیں، جانتے ہیں کہ ایسے کینوں اور عداوتوں کو نہ تو مال و دولت سے دھویا جاسکتا ہے اور نہ جاہ و مقام سے۔ انہیں ختم کرنے اور دبانے کی ایک راہ ہے اور وہ ہے انتقام۔ وہی انتقام جو ایک بار آواز کی صورت میں دہرایا جائے گا اور ہر مرتبہ اس کا قبیح چہرہ زیادہ ہولناک ہوگا اور اس کا دامن زیادہ وسیع ہوتا چلا جائے گا۔ واحد چیز جو ان راسخ اور جڑ پکڑ لینے والے کینوں کو ختم کرسکتی ہے وہ افکار، خیالات اور نفوس میں پیدا ہونے والا ایک انقلاب ہے۔ ایسا انقلاب جو شخصیتوں کو تبدیل کر دے طرز افکار بدل دے اور جس سے لوگ اپنی پہلی سطح سے بہت بالا ہو جائیں اس طرح سے کہ گذشتہ اعمال ان کی نظر میں پست، حقیر اور احمقانہ ہو جائیں اور اس کے بعد وہ اپنے وجود کی گہرائیوں کے نہاں خانے سے کینہ، قساوت، انتقام جوئی، قبائلی تعصبات وغیرہ کی سیاہ غلاظت کو نکال باہر پھینکیں اور یہ ایسا کام ہے جو روپے پیسے اور دولت و ثروت سے نہیں ہوسکتا بلکہ صرف حقیقی ایمان و توحید کے ذریعے ہی سے ایسا ممکن ہے۔

اور آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: خدا عزیز و حکیم ہے (انه عزیز حکیم)۔ اس کی عزت کا تقاضا ہے کہ کوئی اس کے سامنے ٹھہرنے کی تاب نہیں رکھتا اور اس کی حکمت سبب بنتی ہے کہ اس کے تمام کام حساب و کتاب کے تابع ہوں، اسی لیے حساب شدہ پروگرام سے پراگندہ دلوں کو متحد کردیا اور انہیں پیغمبر سے منسلک کردیا تاکہ آپ ان کے ذریعے اسلام کا نورِ ہدایت پوری دنیا میں پھیلا دیں۔

دو توجہ طلب نکات

۱۔ آیت کا مفہوم عمومی ہے: بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت کو صرف اوس و خزرج کے اختلافات کے خاتمے کی طرف اشارہ سمجھا ہے کہ جو انصار میں سے تھے لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ مہاجرین و انصار دونوں ایک ہی صف میں رسول اللہ کی نصرت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے واضح ہوتا ہے کہ آیت کا مفہوم وسیع ہے۔ شاید انہوں نے سمجھا ہے کہ صرف اوس و خزرج کے درمیان قبائلی اختلاف تھا۔ حالانکہ اختلافات ہزار گنا تھے اور اجتماعی شگاف موجود تھے۔ امیر اور غریب کے درمیان اختلاف اور اس قبیلے اور اس قبیلے کے چھوٹے بڑے سردار کے درمیان اختلاف۔ یہ شگاف اسلام کے سائے میں پُر ہوئے اور ان کے آثار محو ہوئے۔ اس طرح سے قرآن ایک دوسری جگہ کہتا ہے:

واذکروا نعمة الله علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا

خدا کی اس عظیم نعمت کو یاد کرو کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں میں الفت و محبت پیدا کی اور اس کی نعمت کے سائے میں تم ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے۔ (آل عمران، ۱۰۳)

۲۔ یہ قانون دائمی ہے: یہ قانون صرف پہلے مسلمانوں کے ساتھ مربوط نہیں تھا آج بھی جب کہ اسلام ای کروڑ مسلمانوں پر

سایہ فگن ہے اور وہ مختلف نسلوں اور قوموں اور مختلف گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں کوئی حلقہ اتصال انہیں متحد نہیں کر سکتا سوائے ایمان توحید کے حلقے سے مال و ثروت، مادی تشویق، سیمینار، کانفرنسیں تنہا کوئی کام نہیں کر سکتیں۔ وہ شعلہ دل میں بھڑکنا چاہیے جو پہلے مسلمانوں کے دل میں تھا۔ نصرت و کامیابی بھی صرف اسی اسلامی اخوت کی راہ سے ممکن ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں رسول اللہ کی پاک ہمت اور جذبے کی تقویت کے لیے ان کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: "اے پیغمبر! خدا اور یہ مومنین کہ جنہوں نے تمہاری پیروی کی ہے تمہاری حمایت کے لیے کافی ہیں" اور ان کی مدد سے تم اپنے مقصد کو پا لوگے (یا ایھا النبی حسبك الله ومن اتبعك من المؤمنین)۔

بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب بنی قریظہ اور بنی نضیر کے یہودی قبائل نے رسول اللہؐ سے کہا کہ ہم آپ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو اور آپ کی پیروی کرنے کو تیار ہیں (اور ہم آپ کی مدد بھی کریں گے)۔

اس آیت نے آپ کو متنبہ کیا کہ ان پر اعتماد اور بھروسہ نہ کیجیے بلکہ صرف خدا اور مومنین کو اپنا سہارا قرار دیجیے۔[1]

حافظ ابونعیم جو مشہور علماء اہل سنت میں سے ہیں کتاب فضائل الصحابہ میں اپنی سند کے ساتھ نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی بن ابی طالب کی شان میں نازل ہوئی اور لفظ مومنین سے مراد حضرت علیؑ ہیں۔[2]

ہم نے بارہا کہا ہے کہ ایسی تفاسیر اور شان نزول آیت کو منحصر اور محدود نہیں کرتیں بلکہ مراد یہ ہے کہ حضرت علی جیسی شخصیت کہ جو صف اول مومنین میں ہیں مسلمانوں کے درمیان پیغمبر خدا کا پہلا سہارا ہیں اگرچہ دوسرے مومنین بھی رسول اللہ کے یار و مددگار ہیں۔

۶۵۔ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝

۶۶۔ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

---

[1] تفسیر تبیان جلد ۵ صفحہ ۱۵۲۔

[2] الغدیر جلد ۲ صفحہ ۵۱۔

ترجمہ

۶۵۔ اے پیغمبر! مومنین کو (دشمن سے) جنگ کرنے کی تحریک کیجئے۔ اگر تم میں سے صبر و استقامت کرنے والے بیس افراد ہوں تو وہ دو سو افراد پر غالب آجائیں گے اور اگر سو افراد ہوں تو کافروں میں سے ایک ہزار افراد پر کامیابی حاصل کریں گے کیونکہ وہ ایسی قوم ہیں جو سمجھتے نہیں۔

۶۶۔ اب اس وقت خدا نے تمہیں تخفیف دی ہے اور جان لیا ہے کہ تم میں کمزوری ہے اس بناء پر جب تم میں سے سو افراد با استقامت اور صابر ہوں تو دو سو افراد پر کامیاب ہوں گے اور اگر ایک ہزار ہوں تو حکم خدا سے دو ہزار پر غالب آئیں گے اور خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

تفسیر

برابر کی قوت کے انتظار میں نہ رہو

ان دو آیات میں بھی اسلامی جہاد کے متعلق اور فوجی احکام کا سلسلہ جاری رکھا گیا ہے۔

پہلی آیت میں رسولِ اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ اے پیغمبر! مسلمانوں کو دشمن سے جہاد کرنے کی ترغیب ــــ دیجئے اور تحریک کیجئے (یا ایھا النبی حرض المؤمنین علی القتال)۔

فوجی سپاہی جس قدر بھی تیار ہوں پھر بھی جنگ شروع ہونے سے پہلے ان کی روحانی تقویت درکار ہوتی ہے یعنی ذمہ داری کا احساس اجاگر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیز ساری دنیا کی آگاہ اور تربیت یافتہ فوجوں میں بھی ہوتی ہے کہ کمانڈر اور فوج کے افسر میدانِ جنگ کی طرف جانے سے پہلے یا میدانِ جنگ میں حملہ شروع کرنے سے پہلے مناسب مطالب کے ذکر سے ان کے جنگی جذبے کو ابھارتے ہیں اور شکست کے خطرے سے ڈراتے ہیں۔

البتہ مادی اور ان جیسے مکاتب فکر میں تشویق و ترغیب کا دامن محدود ہوتا ہے لیکن آسمانی مکاتب و مذاہب میں بہت ہی زیادہ وسیع ہے۔ فرمانِ الٰہی کی طرف توجہ، خدا پر ایمان کی تاثیر اور شہدائے راہِ حق کے مقام کی یاد اور فضیلت و بے حساب ثواب جو ان کے انتظار میں ہے نیز معنوی افتخار و اعزاز اور احسانات و عنایات جو میدانِ جنگ میں دشمن پر کامیابی میں موجود ہیں غازیوں میں بہادری، استقامت اور پامردی کی روح پھونکنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ اسلامی جنگوں میں بعض اوقات قرآن مجید کی چند آیات کی تلاوت مجاہدینِ اسلام کو اس طرح سے آمادہ کر دیتی تھیں کہ وہ برق آسا ہو جاتے تھے اور عشق و جنون اور جذبے کی کامل تصویر بن جاتے۔

بہرحال آیت کا یہ حصہ جہاد کی زیادہ سے زیادہ تبلیغ اور مجاہدین کے جذبہ کی تقویت کی اہمیت کو ایک اسلامی حکم کے طور پر واضح کرتا ہے۔

اس کے بعد آیت ایک دوسرا حکم دیتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر تم میں سے بیس افراد صاحب استقامت ہوں تو وہ دوسو افراد پر غلبہ حاصل کرلیں گے اور اگر تم میں سے سو افراد ہوں تو ہزار کافروں پر غالب آئیں گے (ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین و ان یکن منکم مائة یغلبوا الفا من الذین کفروا)۔ آیت اگرچہ ایک شخص کے دس افراد پر غالب آنے کے متعلق خبر کی صورت میں ہے لیکن بعد والی آیت کہتی ہے:

الآن خفف الله عنکم

اب سے تم پر اس ذمہ داری میں تخفیف کر دی گئی ہے

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس سے مراد فرض اور حکم کا تعین ہے نہ کہ صرف ایک عام سی خبر ہے

لہٰذا مسلمان اس بات کے منتظر نہ رہیں کہ فوج کی تعداد دشمن کی فوج کے مساوی ہو جائے بلکہ یہاں تک کہ ان کی تعداد اگر دشمن کا دسواں حصہ ہو تو بھی جہاد ان پر فرض ہے اس کے بعد اس حکم کی علت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: یہ اس بناء پر ہے کہ تمہارے بے ایمان دشمن ایسے ہیں جو سمجھتے ہی نہیں۔ (بانھم قوم لا یفقھون)۔

یہ تاویل ابتداء میں عجیب و غریب نظر آتی ہے کہ علم و آگاہی اور کامیابی کے درمیان یا عدم آگہی اور شکست کے درمیان کیا ربط ہے لیکن فی الحقیقت ان دونوں کے درمیان بہت ہی نزدیکی اور مستحکم رابطہ ہے کیونکہ مومنین اپنے راستے کو اچھی طرح پہچانتے ہیں، اپنی خلقت کے ہدف کا ادراک رکھتے ہیں اور اس جہان میں جہاد کے مثبت نتائج اور دوسرے جہان میں جو زیادہ ثواب مجاہدین کے انتظار میں ہے اس سے باخبر ہیں۔

وہ جانتے ہیں کہ کس لیے لڑ رہے ہیں اور کس کے لیے برسرپیکار ہیں اور کس مقدس مقصد کے لیے فداکاری کر رہے ہیں اور اگر اس راہ میں قربان اور شہید ہو جائیں تو ان کا حساب کتاب کس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ واضح راستہ اور یہ آگاہی انہیں صبر و استقامت اور پامردی سکھاتی ہے۔ لیکن بے ایمان اور بت پرست ٹھیک طور پر نہیں جانتے کہ وہ کس لیے جنگ کر رہے ہیں اور کس کے لیے لڑ رہے ہیں اور اگر اس راہ میں مارے جائیں تو ان کے خون کی تلافی کون کرے گا۔ صرف ایک عادت اور اندھی تقلید یا خشک اور بے منطق تعصب کی وجہ سے اس مکتب کے پیچھے لگے ہوئے ہیں راستے کی یہ تاریکی، ہدف سے ناآگاہی اور جنگ کے انجام اور نتیجے سے بے خبری اُن کے اعصاب کو کمزور کر دیتی ہے۔ ان کی توانائی اور استقامت کو لے جاتی ہے اور ان کا کمزور سا وجود رہ جاتا ہے۔

لیکن مذکورہ بالا سنگین حکم کے بعد خدا تعالیٰ انہیں کئی وجوہ سے تخفیف دیتا ہے اور کہتا ہے: اسی وقت سے خدا نے تمہیں تخفیف دی اور اس نے جانا کہ تمہارے درمیان کمزور اور سست افراد موجود ہیں (الآن خفف الله عنکم وعلم ان فیکم ضعفا)۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ ان حالات میں اگر تم میں سے سو صبر و استقامت والے مجاہد ہوں تو وہ دوسو افراد پر غالب آئیں گے اور اگر ہزار آدمی ہوں تو دو ہزار پر حکم خدا سے کامیاب ہوں گے (فان یکن منکم مائة صابرة یغلبوا مائتین و ان یکن منکم الف یغلبوا الفین باذن الله)۔ لیکن یہ بات کسی حالت میں فراموش نہ کریں کہ "خدا صابرین کے ساتھ ہے

و اللہ مع الصّٰبرین)۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا پہلی آیت منسوخ ہو چکی ہے: جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ پہلی آیت مسلمانوں کو حکم دے رہی ہے کہ اگر دشمن کا لشکر دس گنا بھی زیادہ ہو تو ان کے مقابلے سے منہ نہ پھیریں جب کہ دوسری آیت میں یہ نسبت گھٹا کر دو گن کر دی گئی ہے۔ اس ظاہری اختلاف کے سبب بنا کر بعض مفسرین نے پہلی آیت کے حکم کو دوسری آیت کے حکم کے ذریعے منسوخ سمجھا یا پہلی کو مستحب حکم اور دوسری کو واجب حکم قرار دیا یعنی اگر دشمنوں کی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے دوگنی ہو تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ میدانِ جنگ سے پیچھے نہ ہٹیں اور اگر دشمن اس سے زیادہ ہوں یہاں تک کہ دس گن ہوں تو پھر جہاد سے ہاتھ اٹھا سکتے ہیں اور بچ سکتے ہیں لیکن بہتر یہ ہے کہ پھر بھی جہاد سے دستبردار نہ ہوں۔

لیکن بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ ظاہری اختلاف جو آیات کے درمیان نظر آرہا ہے نسخ کی دلیل ہے نہ استحباب کی بلکہ ان دو احکام میں سے ہر ایک کا ایک مقام الگ معین ہے۔ جب مسلمان ضعیف و کمزور ہوں اور ان میں نئے، ناتجربہ کار اور غیر آزمودہ افراد ہوں کہ جن کی ابھی صحیح تربیت اور اصلاح نہیں ہوئی تو پھر مقیاس کا معیار دوگنا ہے لیکن اگر تربیت یافتہ، تجربہ کار اور قوی ایمان والے افراد مجاہدین بدر کے سے موجود ہوں تو پھر یہ نسبت دس گن تک جا پہنچتی ہے۔

اس بناء پر یہ دونوں حکم جو دو الگ آیات میں مذکور ہیں دو مختلف گروہوں سے متعلق ہیں اور ان کا مختلف حالات سے تعلق ہے اس لیے یہاں نسخ والی کوئی بات نہیں اور اگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعض روایات میں نسخ کی تعبیر ہوئی ہے تو ہمیں توجہ رکھنا چاہیے کہ لفظ "نسخ" روایات کی زبان میں ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے جس میں تخصیص بھی شامل ہے۔

۲۔ قوتوں کے موازنہ کی داستان: مندرجہ بالا آیات بہرحال اس حکم کی حامل ہیں کہ مسلمان کبھی دشمن سے ظاہری قوتوں کی برابری کے انتظار میں نہ رہیں بلکہ کبھی اپنے سے دوگنا اور کبھی دس گنا دشمن کے مقابلے میں بھی اٹھ کھڑے ہوں اور تعداد کی کمی کے بہانے دشمن کے مقابلے سے فرار اختیار نہ کریں۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ بہت سی اسلامی جنگوں میں قوتوں کا توازن دشمن کے مفاد میں نظر آتا ہے مسلمان عموماً کم تعداد میں ہوتے تھے۔ جنگیں جو رسول اللہؐ کے زمانے میں ہوئیں مثلاً بدر، اور احزاب وغیرہ کی جنگیں بلکہ جنگ موتہ میں تو مسلمانوں کی تعداد تین ہزار تھی اور دشمن کے لشکر کی جو کم از کم تعداد لکھی گئی ہے وہ ڈیڑھ لاکھ تھی۔ یہ صورت صرف رسول اللہؐ کے دور ہی میں نہ تھی بلکہ وہ جنگیں جو آپؐ کے بعد پیش آئیں یہ فرق حیرت انگیز صورت میں موجود تھا۔ مثلاً ساسانی فوج سے جنگ کے موقع پر اسلام کے آزادی بخش لشکر کی تعداد پچاس ہزار تھی جب کہ خسرو پرویز کے لشکر کی تعداد پانچ لاکھ تھی۔ جنگ یرموک جو کہ لشکرِ اسلام کی رومی فوج کے خلاف بہت بڑی جنگ تھی کے بارے میں مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ ہرقل کا لشکر تقریباً دو لاکھ افراد پر مشتمل تھا لیکن مسلمان فوج کی تعداد چوبیس ہزار سے زیادہ نہ تھی اور زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ لکھا ہے کہ دشمن کے جو لوگ اس جنگ میں ہلاک ہوئے وہ ستر ہزار افراد سے زیادہ تھے۔

اس میں شک نہیں کہ ظاہری موازنہ اور قوتوں کی برتری کامیابی کے عوامل میں سے ایک ہے لیکن پھر کونسی چیز سبب بنتی تھی کہ اتنا عظیم فرق جو صاف نظر آتا تھا اس کے باوجود مسلمان کامیاب رہتے۔ اس اہم سوال کا جواب قرآن نے ان آیات میں تین تعبیروں میں دیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے: "عشرون صابرون" یعنی بیس صاحب استقامت اور صبر کرنے والے اور "مائة صابرة" ایک سو با استقامت یعنی استقامت اور پامردی جو شجر ایمان کا ثمر ہے اس بات کا سبب بنتی ہے کہ ایک آدمی دس افراد کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے، ڈٹا رہے اور کامیابی حاصل کرے۔

دوسری جگہ قرآن کہتا ہے:

بانھم قوم لا یفقھون

یعنی اپنے ہدف سے ان کی عدم آگہی اور تمہارا اپنے مقدس مقصد سے باخبر ہونا تعداد کی کمی کی تلافی کر دیتا ہے۔

ایک اور جگہ پر ہے:

باذن اللہ

یعنی خدائی امداد، غیبی اور معنوی نصرتیں اور اللہ کا لطف و رحمت ان صاحب ایمان اور با استقامت لوگوں کے شامل حال ہیں۔

آج بھی مسلمان طاقتور دشمنوں کے مقابلے میں کھڑے ہیں لیکن تعجب کی بات ہے کہ بہت سے جنگی میدانوں میں مسلمانوں کی تعداد دشمن سے کہیں زیادہ ہے لیکن پھر بھی کامیابی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اور آج مسلمانوں کی حالت پہلے زمانے کے مسلمانوں سے یکسر برعکس ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ اس بنا پر ہے کہ مسلمانوں میں آج کافی آگاہی اور علم نہیں ہے۔ فساد اور مادی زرق برق کے عوامل کے مقابلے میں وہ صبر و استقامت کی روح گنوا بیٹھے ہیں۔ گناہ آلودہ ہونے کی وجہ سے خدائی حمایت بھی ان سے سلب ہو چکی ہے۔ نتیجتاً وہ اس انجام کو پہنچ گئے ہیں۔

لیکن پھر بھی لوٹ آنے کا راستہ کھلا ہے اور ہمیں توقع اور انتظار ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ مندرجہ بالا آیات کا مفہوم ایک دفعہ پھر مسلمانوں میں زندہ ہو گا اور وہ اپنی موجودہ ذلت بار کیفیت سے نکل آئیں۔

۳۔ دو آیتوں میں مثال کا فرق: یہ بات توجہ طلب ہے کہ پہلی آیت کہ جس میں گفتگو ایک اور دس کی نسبت کے بارے میں ہے مثال کے لیے "عشرون" یعنی بیس اور "مائتین" یعنی دو سو کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں لیکن دوسری آیت میں جہاں دوگنا کی نسبت بیان ہوئی ہے مثال کے لیے ایک سو افراد دو سو کے مقابلے میں اور ایک ہزار کا دستہ دو ہزار کے مقابلے میں کہا گیا ہے۔

مثال کا یہ فرق گویا اس حقیقت کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ قوی ارادے والے اہل ایمان بیس افراد کا بھی ایک لشکر بنا سکتے ہیں لیکن کمزور افراد اتنی کم تعداد کا لشکر مہیا نہیں کر سکتے بلکہ انہیں اس سے کئی گنا زیادہ افراد سے لشکر بنانے کی ضرورت

پڑے گی ۔

۶۷۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ
تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖۗ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ
عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝
۶۸۔ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ۝
۶۹۔ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖۗ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
۷۰۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّمَنْ فِىْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ
فِىْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ
لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
۷۱۔ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ
مِنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

ترجمہ

۶۷۔ کوئی پیغمبر یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ (دشمنوں کے افراد) قیدی بنائے تاکہ ان پر کامیابی حاصل کرے (اور زمین پر مستحکم قدم جمائے) تم لوگ تو ناپائیدار دنیا کی متاع چاہتے ہو (اور چاہتے ہو کہ زیادہ سے زیادہ قیدی بناؤ اور مال لے کر انہیں آزاد کرو) لیکن خدا (تمہارے لیے) آخرت چاہتا ہے اور خدا قادر و حکیم ہے۔

۶۸۔ اگر پہلے سے خدا کا حکم نہ ہوتا (کہ تبلیغ کے بغیر کسی اُمت کو سزا نہ دے گا تو (اسیر بنانے کا) جو کام تم نے کیا اُس پر تمہیں بہت بڑی سزا دیتا۔

۶۹۔ اب جو کچھ مالِ غنیمت تم لے چکے ہو اس میں سے حلال و پاکیزہ کھاؤ اور خدا سے ڈرو خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

۷۰۔ اے نبی! تمہارے پاس جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر خدا تمہارے دلوں میں کوئی اچھائی دیکھے گا (اور تمہاری نیتیں نیک اور پاکیزہ ہوں) تو جو کچھ تم سے لیا ہے اس سے بہتر تمہیں دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

۷۱۔ اور اگر وہ تم سے خیانت کرنا چاہیں تو (یہ کوئی نئی بات نہیں) انہوں نے اس سے پہلے (بھی) خدا سے خیانت کی ہے اور خدا نے (تمہیں) ان پر کامیابی دی اور خدا دانا و حکیم ہے۔

تفسیر

جنگی قیدی

گزشتہ آیات میں جہاد اور دشمن سے جنگ کرنے کے متعلق احکام کے اہم حصے بیان ہوئے ہیں۔ اب زیر بحث آیات میں جنگی قیدیوں کے بارے میں کچھ احکام ذکر کرکے اس جاری بحث کی تکمیل کی گئی ہے کیونکہ جنگوں میں عموماً قیدیوں اور اسیروں کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ جنگی قیدیوں سے انسانی حوالوں سے سلوک اور اسی طرح مقاصد جہاد بہت اہم موضوعات ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے جو مطلب بیان ہوا ہے اس کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے: کوئی نبی یہ حق نہیں رکھتا کہ اس کے پاس جنگی قیدی ہوں تا کہ وہ زمین میں اپنے پاؤں خوب محکم کرلے اور دشمن کے پیکر پر کاری اور اطمینان بخش ضربیں لگا سکے (ما کان لنبی ان یکون لہٗ اسرٰی حتّٰی یثخن فی الارض)۔

"یثخن" اصل میں "ثخن" (بروزن "شکن") کے مادہ سے ضخامت، سختی اور سنگینی کے معنی میں آیا ہے۔ بعد ازاں اسی مناسبت سے کامیابی، واضح غلبہ، قوت، قدرت اور شدت کے مفہوم میں بولا جانے لگا۔ بعض مفسرین نے "حتّٰی یثخن فی الارض" کو دشمن کو قتل کرنے میں مبالغہ اور شدت کے معنی میں لیا ہے اور کہا ہے کہ اس جگہ کا معنی یہ ہے کہ جنگی قیدی بنانے کا عمل دشمن کے بہت سے افراد قتل کرنے کے بعد ہو لیکن "فی الارض" (زمین میں) کو نظر

میں رکھتے ہوئے اور اس لفظ کی اصل کو لحاظ رکھتے ہوئے کہ جو شدت و سختی کے معنی میں ہے واضح ہو جاتا ہے کہ اس جملے کا حقیقی معنی یہ نہیں ہے بلکہ اس سے اصل مراد دشمن پر مکمل فوقیت حاصل کرنا، قوت و قدرت کا مظاہرہ کرنا اور کسی علاقے پر اپنے تسلط کو مستحکم بنانا ہے لیکن چونکہ بعض اوقات دشمن کی سرکوبی اور اُسے قتل و غارت کرنا مسلمانوں کے مقام کے استحکام کا سبب بنتا ہے لہٰذا اس جملے کا ایک مصداق خاص حالات میں دشمن کو قتل کرنا بھی ہو سکتا ہے نہ کہ یہی اس جملے کا اصلی مفہوم ہے۔

بہر حال محلِ بحث آیت مسلمانوں کو ایک حساس جنگی نکتے کی طرف متوجہ کرتی ہے اور وہ یہ کہ مسلمان کبھی بھی دشمنوں کی مکمل شکست کے بغیر انہیں قیدی بنانے کی فکر میں نہ پڑیں کیونکہ جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے بعض نئے مسلمان میدانِ بدر میں اس کوشش میں تھے کہ جتنا ممکن ہو دشمنوں کو قید کیا جائے کیونکہ اس زمانے کی جنگوں کے رواج کے مطابق جنگ ختم ہونے پر ایک اہم رقم "فدیہ" یا "فدا" کے نام پر دے کر انہیں آزاد کروایا جاتا تھا۔

ہو سکتا ہے یہ کام بعض مواقع پر اچھا شمار ہو لیکن دشمن کی شکست کے بارے میں مکمل اطمینان کر لینے سے پہلے یہ کام خطرناک ہے کیونکہ قیدیوں کو پکڑنے اور ان کے ہاتھ باندھنے میں مشغول ہونا اور انہیں کسی مناسب جگہ کی طرف منتقل کرنا بہت سے مواقع پر مجاہدین کو جنگ کے اصل مقصد سے باز رکھتا ہے اور بسا اوقات تو زخم خوردہ دشمن کے لیے راہ ہموار کرتا ہے کہ وہ اپنے حملوں میں شدت پیدا کرے اور مجاہدین کو شکست دے دے جیسا کہ جنگ اُحد کے واقعہ میں غنائم کی جمع آوری نے مسلمانوں کے ایک گروہ کو اپنی طرف مشغول رکھا اور دشمن نے موقع غنیمت پا کر ان پر کاری اور آخری ضرب لگائی۔

لہٰذا قیدی بنانا صرف اسی صورت میں جائز ہے کہ جب دشمن پر کامیابی کے حصول کے بارے میں کامل اطمینان ہو ورنہ قاطع، تباہ کن اور پے در پے حملوں سے عملاً اور دشمن کی طاقت کو بے کار کیا جائے۔ لیکن اطمینان حاصل ہو جانے کے بعد انسانی ہدف ضروری قرار دیتا ہے کہ قتل کرنے سے ہاتھ اٹھا لیا جائے اور انہیں قید کر لینے پر اکتفا کی جائے۔ یہ دونوں اہم فوجی اور انسانی نکات زیر نظر آیت کی مختصر سی عبارت میں بیان ہوئے ہیں۔

اس کے بعد قرآن اس گروہ کو جس نے اس حکم کے خلاف عمل کیا مورد ملامت قرار دیتے ہوئے کہتا ہے، تم صرف مادی امور کی فکر میں ہو اور دنیا کی ناپائیدار متاع چاہتے ہو حالانکہ خدا تمہارے لیے عالم جاوداں اور دائمی سعادت چاہتا ہے (تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاٰخرۃ)۔

"عَرَض" کا معنی ہے "ناپائیدار امور" اور چونکہ اس دنیا کے مادی سرمایے پائیدار نہیں ہیں لہٰذا انہیں "عرض الدنیا" کہا جاتا ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں جنگی قیدیوں کے مادی پہلوؤں کی طرف توجہ اور اصلی اہداف و مقاصد سے غفلت یعنی دشمن پر کامیابی حاصل کرنا نہ صرف سعادت اور اخروی جزا پر ضرب لگاتی ہے بلکہ اس جہان کی زندگی، سربلندی، عزت اور آرام کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ حقیقت میں یہ اصلی مقاصد اس جہان کے پائیدار امور میں شمار ہوتے ہیں اور دوسرے لفظوں میں وقتی اور جلدی گزر جانے والے منافع کے لیے آئندہ کے دائمی منافع کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ یہ حکم اصل میں عزت و کامیابی اور حکمت و تدبیر کا حامل ہے چونکہ یہ خدا کی طرف سے صادر ہوا ہے۔ "اور

خدا عزیز و حکیم ہے (و اللہ عزیز حکیم) ۔

اگلی آیت میں دوبارہ ان لوگوں کو سرزنش کرتے ہوئے کہ جو وقتی اور مادی مفادات کے لیے اہم اجتماعی مصالح کو خطرے میں ڈالتے ہیں ارشاد فرمایا گیا ہے، اگر خدا کا فرمان سابق نہ ہوتا تو تمہیں ان قیدیوں کو قیدی بنانے پر بہت بڑی سزا اور عذاب سے دوچار ہونا پڑتا (لولا کتاب من اللہ سبق لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم) ۔

" لولا کتاب من اللہ سبق " کے بارے میں مفسرین نے مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن جو چیز پوری آیت کی تفسیر کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے یہ ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا کہ خدا نے پہلے سے مقرر کیا ہوا ہے کہ جب تک کوئی حکم وہ پیغمبر کے ذریعے اپنے بندوں سے بیان نہ کرے انہیں سزا نہیں دے گا تمہیں اس بنا پر کہ تم مادی منافع کے حصول کے لیے قیدی بنانے کے پیچھے لگ گئے اور لشکر اسلام کی حیثیت اور اس کی مکمل کامیابی کو خطرے میں ڈال دیا تو سخت سزا دیتا لیکن جیسا کہ قرآن کی دوسری آیات میں تصریح ہوئی ہے کہ پروردگار کی سنت یہ ہے کہ وہ پہلے احکام بیان کرتا ہے پھر ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دیتا ہے مثلاً

و ما کنا معذبین حتٰی نبعث رسولاً

(بنی اسرائیل ـ ۱۵)

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ ایک وضاحت : جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں مندرجہ بالا آیات کا ظہور جنگی قیدی بنانے کے بارے میں ہے نہ کہ جنگ کے بعد " فدیہ " لینے کے مسئلے سے اس کا کوئی تعلق ہے اسی طرح سے بہت سے اعتراضات جو اس آیت کی تفسیر سمجھنے کے سلسلے میں کچھ مفسرین کی نظر میں پیدا ہوئے ہیں خود بخود حل ہو جاتے ہیں ۔

نیز ملامت اور سرزنش ان لوگوں کی گئی ہے جو مکمل کامیابی سے پہلے مادی اغراض کی وجہ سے قیدی بنانے میں مشغول ہو گئے تھے اور اس کا رسول اللہ کی ذات اور مقاصد جہاد کی تکمیل میں مصروف مومنین سے کوئی نہیں ہے ۔ لہٰذا یہ بحثیں کہ آیا پیغمبر اس موقع پر گناہ کے مرتکب ہوئے تھے اور یہ گناہ آپ کے مقام عصمت سے کیسے مناسبت رکھتا ہے ، سب بے محل ہیں ۔

اسی طرح وہ احادیث جو آیت کی تفسیر کے سلسلے میں اہل سنت کی بعض کتب[1] میں آئی ہیں جن میں ہے کہ آیت کا ربط رسول اللہ اور مسلمانوں کی طرف سے خدا کی اجازت سے پہلے جنگ بدر کے بعد جنگی قیدیوں سے فدیہ لینے سے ہے ، بے بنیاد ہیں ۔ ان روایات میں ہے کہ وہ واحد شخص جو فدیہ لینے کے مخالف تھا اور جنگی قیدیوں کے قتل کا حامی تھا عمر یا سعد بن معاذ تھا اور پیغمبر نے اس کے بارے میں فرمایا کہ اگر خدا کی طرف سے عذاب نازل ہوتا تو کوئی شخص عمر یا سعد بن معاذ کے سوا اس سے نجات نہ پاتا ۔ ایسی روایات کا آیت کی تفسیر سے قطعاً کوئی تعلق نہیں خصوصاً جب کہ ان روایات کا من گھڑت ہونا بالکل واضح ہے کیونکہ ان میں عمر یا سعد بن معاذ کا مقام پیغمبر اکرم کے مقام سے بھی بالاتر قرار دیا گیا ہے ۔

---

[1] تفسیر المنار جلد ۱۰ صفحہ ۹۰ ، تفسیر روح المعانی جلد ۱۰ صفحہ ۳۲ اور تفسیر رازی جلد ۱۵ صفحہ ۱۹۸ ۔

۲۔ جنگی قیدیوں سے فدیہ لینے کا مسئلہ: مندرجہ بالا آیات جنگی قیدیوں سے جب کہ اسلامی معاشرے کی مصلحت ضروری قرار دے فدیہ لینے کے خلاف نہیں ہے بلکہ کہتی ہیں کہ مجاہدین کو اس مقصد کے لیے قیدی بنانے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھانا چاہیے۔ اس بنا پر یہ آیات سورہ محمد کی آیت ۴ سے ہر لحاظ سے موافقت رکھتی ہیں جہاں فرمایا گیا ہے:

فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد و اما فداء

جس وقت کافروں (اور ان دشمنوں سے جو تمہارے لیے زندہ رہنے کے حق کے قائل نہیں ہیں) سے میدان جنگ میں اٰمنا سامنا ہو تو ان کی گردنوں پر ضربیں لگاؤ یہاں تک کہ غلبہ حاصل کر لو پھر اس وقت انہیں قتل نہ کرو بلکہ انہیں باندھ دو قیدی بنا لو اس کے بعد انہیں فدیہ لے کر یا بغیر فدیہ لیے آزاد کر دو۔

لیکن یہاں ایک نکتے کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ اگر جنگی قیدیوں میں خطرناک قسم کے افراد موجود ہوں کہ جن کی آزادی دوبارہ جنگ کی آگ بھڑک اُٹھنے اور مسلمانوں کی کامیابی کے خطرے میں پڑ جانے کا سبب ہو تو پھر مسلمان حق رکھتے ہیں کہ ایسے افراد کو ختم کر دیں۔ اس امر کی دلیل خود آیت میں اور "یثخن" اور "اثخنتموھم" میں چھپی ہوئی ہے۔

اسی بنا پر چند ایک روایات میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے حکم دیا کہ جنگ بدر کے قیدیوں میں سے دو افراد عقبہ بن ابی معیط اور نضر بن حارث کو قتل کر دیا جائے اور ان سے کسی قسم کا فدیہ قبول نہ کیا جائے[۱]

۳۔ نظریہ جبر کی نفی: مندرجہ بالا آیات میں دوبارہ انسان کے ارادے کی آزادی کے مسئلہ اور نظریہ جبر کی نفی پر تاکید نظر آتی ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے کہ خدا تمہارے لیے ہمیشہ کا گھر چاہتا ہے حالانکہ تم میں سے ایک گروہ وقتی مادی مفادات کی قید میں پھنسا ہوا ہے۔

بعد والی آیت میں جنگی قیدیوں سے متعلق ایک اور مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے فدیہ لینے کا مسئلہ۔

جیسا کہ بعض روایات میں جو زیرِ بحث آیات کی شانِ نزول کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان میں ہے کہ جنگ بدر کے خاتمے پر جب جنگی قیدی بنا لیے گئے اور پیغمبر اکرمؐ نے یہ حکم دیا کہ قیدیوں میں سے دو خطرناک افراد عقبہ اور نضر کو قتل کر دیا جائے تو اس پر انصار گھبرا گئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ حکم تمام قیدیوں کے متعلق جاری ہو جائے (اور وہ فدیہ لینے سے محروم ہو جائیں) لہٰذا انہوں نے رسول اللہؐ کی خدمت میں عرض کیا: ہم نے ستر آدمیوں کو قتل کیا ہے اور ستر ہی کو قیدی بنایا ہے اور یہ آپ کے قبیلے میں سے آپ ہی کے قیدی ہیں، یہ ہمیں بخش دیجیے تاکہ ہم ان کی آزادی کے بدلے فدیہ لے سکیں۔

(رسول اللہؐ اس کے لیے وحی آسمانی کے منتظر تھے) اس موقع پر زیرِ بحث آیات نازل ہوئیں اور قیدیوں کی آزادی کے بدلے میں فدیہ لینے کی اجازت دی گئی[۲]

تعجب کی بات یہ ہے کہ رسول اللہؐ کا داماد ابوالعاص بھی ان قیدیوں میں تھا۔ رسولؐ کی بیٹی یعنی زینب جو ابوالعاص کی بیوی

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۶۹۔

۲۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۶۹ بحوالہ تفسیر علی بن ابراہیم۔

بقیہ حواشی بر صفحہ آئندہ

تھی نے وہ گلوبند جو جناب خدیجہؓ نے ان کی شادی کے وقت انہیں دیا تھا فدیہ کے طور پر رسول اللہؐ کے پاس بھیجا۔ جب پیغمبر اکرمؐ کی نگاہ گلوبند پر پڑی تو جناب خدیجہؓ جیسی فداکار اور مجاہدہ خاتون کی یادیں ان کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہوگئیں۔ آپؐ نے فرمایا، خدا کی رحمت ہو خدیجہ پر، یہ وہ گلوبند ہے جو اس نے میری بیٹی زینب کو جہیز میں دیا تھا (اور بعض دوسری روایات کے مطابق جناب خدیجہؓ کے احترام میں آپ نے گلوبند قبول کرنے سے احتراز کیا اور حقوقِ مسلمین کو پیشِ نظر کرتے ہوئے اس میں ان کی موافقت حاصل کی)[1]

اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے ابوالعاص کو اس شرط پر آزاد کر دیا کہ وہ زینب کو (جو اسلام سے پہلے ابوالعاص کی زوجیت میں تھیں) مدینہ پیغمبرؐ کے پاس بھیج دے۔ اس نے بھی اس شرط کو قبول کر لیا اور بعد میں اسے پورا بھی کیا[2]

بہرحال مندرجہ بالا آیت مسلمانوں کو یہ اجازت دیتی ہے کہ وہ اس جنگی غنیمت (یعنی وہ رقم جو وہ قیدیوں سے رہائی کے بدلے لیتے تھے) سے استفادہ کریں اور ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ تم نے غنیمت میں لیا ہے اس میں سے حلال اور پاکیزہ کھاؤ اور اس سے فائدہ اٹھاؤ (فکلوا مما غنمتم حلالاً طیبا)۔

ممکن ہے اس جملے کا ایک وسیع معنی ہو اور یہ فدیہ کے علاوہ دیگر غنائم کے بارے میں بھی ہو۔

اس کے بعد انہیں حکم دیا گیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور فرمانِ خدا کی مخالفت سے پرہیز کرو (واتقوا اللہ)۔

اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ ایسے غنائم کا مباح ہونا اس بات کا سبب نہیں بننا چاہیے کہ مجاہدین کا ہدف جہاد کے میدان میں ہدف مالِ غنیمت جمع کرنا یا فدیہ حاصل کرنا ہو جائے اور اگر پہلے ان کے دل میں ایسے پست خیالات تھے تو انہیں دل سے نکال دیں نیز اس سلسلے میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کی عفو و بخشش کا وعدہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا غفور و رحیم ہے (ان اللہ غفور رحیم)۔

کیا فدیہ لینا ایک منطقی اور عادلانہ کام ہے

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیدیوں کو آزاد کرنے کے بدلے فدیہ لینا اصولِ عدالت سے کس طرح مطابقت رکھتا ہے اور کیا ایسا کام انسان فروشی کے مترادف نہیں؟

لیکن تھوڑے سے غور و فکر سے واضح ہو جاتا ہے کہ فدیہ حقیقت میں ایک قسم کا تاوانِ جنگ ہے کیونکہ ہر جنگ میں بہت سا اقتصادی سرمایہ اور انسانی قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ حق کے لیے جنگ کرنے والے لوگ یہ حق رکھتے ہیں کہ جنگ ختم ہونے کے بعد دشمن سے

بقیہ حواشی از صفحہ سابقہ: ظاہری طور پر جناب خدیجہؓ کی بہن کی بیٹی جو رسول اللہؐ کی لے پالک تھیں کا شوہر۔ (مترجم)

ے لے پالک بیٹی مراد ہے مترجم۔

[1] حواشی اعلام الوریٰ (؟) / کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۱۳۴ پر ہے:

فلما رأها رسول اللہ (ص) رق لها رقة شديدة وقال ان رأيتم ان تطلقوا لها اسيرها، و تردوا عليها الذی لها فافعلوا، فاطلقوا لها اسيرها و ردوا القلادة

[2] تفسیر المیزان جلد ۹ صفحہ ۱۴۱۔

اپنے جنگی خسارے کی تلافی کر دیں اور اس کا ایک طریقہ یہ فدیہ لینا بھی ہے۔

نیز اس طرف توجہ کی جائے کہ ان دنوں مالدار قیدیوں کے لیے فدیہ کی رقم چار ہزار درہم اور باقیوں کے لیے ایک ہزار درہم مقرر ہوئی تھی، تو معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح سے قریش سے جو کل مال حاصل کیا گیا وہ کوئی اتنا زیادہ نہیں تھا کہ ان مالی اور جانی نقصانات کی تلافی کر سکتا جو اسلامی لشکر کو اٹھانا پڑا تھا۔

علاوہ ازیں جب مسلمان قریش کے دباؤ سے تنگ آکر مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے ان کا بہت سا مال مکہ میں دشمنوں کے ہاتھ میں باقی رہ گیا تھا۔ اس لحاظ سے بھی مسلمانوں کو حق پہنچتا تھا کہ وہ ان اموال کی تلافی کریں۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ فدیہ لینا کوئی لازمی بھی نہیں اور اسلامی حکومت اگر مصلحت سمجھے تو جنگی قیدیوں کا تبادلہ کر سکتی ہے یا کوئی چیز لیے بغیر ہی آزاد کر سکتی ہے جیسا کہ سورہ محمد کی آیت ۴ میں اس طرف اشارہ ہوا ہے۔ اس کی تفسیر انشاء اللہ آئے گی۔

ایک اور اہم مسئلہ جنگی قیدیوں کے حوالے سے، ان کی اصلاح، تربیت اور ہدایت ہے۔ ہو سکتا ہے یہ امر مادی مکاتب میں پیش نظر نہ ہو لیکن وہ جہاد کہ جو انسانوں کی آزادی، اصلاح اور حق و عدالت کے رواج دینے کے لیے ہو حتمی طور پر اسے اہمیت دیتا ہے۔

اسی لیے زیر نظر چوتھی آیت میں رسول اللہ کو حکم دیا گیا ہے کہ قیدیوں کو دل خوش کن بیان کے ذریعے ایمان اور اصلاحِ اعمال کی دعوت دیں اور انہیں تشویق دلائیں۔ ارشاد ہوتا ہے: اے پیغمبر! ان قیدیوں کو جو تمہارے ہاتھ میں ہیں کہہ دو! اگر خدا تمہارے دلوں میں خیر اور نیکی جان لے تو تمہیں اس سے بہتر عطا کرے جو تم سے لیا ہے (یا ایھا النبی قل لمن فی ایدیکم من الاسرٰی ان یعلم الله فی قلوبکم خیرا یؤتکم خیرا مما اخذ منکم)۔

"ان یعلم الله فی قلوبکم خیرا" میں "خیرا" سے مراد وہی ایمان اور اسلام قبول کرنا ہے اور بعد میں آنے والے لفظ "خیرا" سے مراد مادی اور معنوی جزا اور احسان ہے کہ جو انہیں اسلام اور ایمان کے سائے میں میسر آتا ہے اور وہ اس رقم سے کہیں بالاتر ہے جو وہ فدیہ کے طور پر دے چکے ہیں۔ ان جزاؤں اور احسانوں کے علاوہ اس نے تمہارے لیے ایک اور لطف و کرم کیا ہے اور وہ گناہ کہ جن کے تم اسلام قبول کرنے سے پہلے گذشتہ زمانے میں مرتکب ہوئے تھے انہیں بخش دے گا اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے (و یغفر لکم والله غفور رحیم)۔

اور چونکہ یہ ممکن تھا کہ بعض قیدی اس پروگرام سے غلط فائدہ اٹھائیں اور خیانت اور انتقام کے ارادہ سے اظہارِ اسلام کرتے ہوئے مسلمانوں کی صفوں میں گھس آئیں لہٰذا اگلی آیت میں قرآن انہیں بھی خطرے سے خبردار کرتا ہے اور مسلمانوں کو تنبیہ کرتا ہے اور کہتا ہے: اگر وہ چاہیں کہ تجھ سے خیانت کریں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے انہوں نے اس سے پہلے بھی خدا سے خیانت کی ہے (وان یریدوا خیانتک فقد خانوا الله من قبل)۔

اس سے بالاتر خیانت کیا ہو گی کہ انہوں نے ندائے فطرت کو سنا ان سنا کر دیا، حکم عقل کو پس پشت ڈال دیا، خدا کے لیے شریک و شبیہ کے قائل ہوئے اور بت پرستی کے بے ہودہ مذہب کو انہوں نے توحید پرستی کا جانشین قرار دے دیا لیکن انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ "خدا نے تجھے اور تیرے ساتھیوں کو ان پر فتح و کامیابی بخشی" (فامکن منھم)۔ آئندہ بھی اگر وہ خیانت کی راہ چلے تو کامیاب نہیں ہوں گے پھر بھی وہ شکست ہی سے دوچار ہوں گے۔ خدا ان کی نیتوں سے آگاہ ہے اور جو احکام اس

نے قیدیوں کے بارے میں دیئے ہیں وہ حکمت کے مطابق ہیں کیونکہ "خدا علیم وحکیم ہے" (و اللہ علیم حکیم)۔

شیعہ اور سنی تفاسیر میں مندرجہ بالا آیات کے ذیل میں منقول ہے:

انصار کے کچھ آدمیوں نے رسول اللہ سے اجازت چاہی کہ آپ کے چچا عباس جو قیدیوں میں سے تھے سے آپ کے احترام میں فدیہ نہ لیا جائے لیکن پیغمبر نے فرمایا:

و اللہ لا تذرون منہ درھما

خدا کی قسم اس کے ایک درہم سے بھی صرفِ نظر نہ کرو (یعنی — اگر فدیہ لینا خدائی قانون ہے تو اسے سب پر یہاں تک کہ میرے چچا پر بھی جاری ہونا چاہیے۔ اس کے اور دوسروں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے)۔

پیغمبر اکرمؐ عباس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: اپنی طرف سے اور اپنے بھتیجے (عقیل بن ابی طالب) کی طرف سے آپ کو فدیہ ادا کرنا چاہیے۔

عباس (جو مال سے بڑا لگاؤ رکھتے تھے) کہنے لگے: اے محمد! کیا تم چاہتے ہو کہ مجھے ایسا فقیر اور محتاج کردو کہ میں اہلِ قریش کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلاؤں۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: اس مال میں سے فدیہ ادا کریں جو آپ نے اپنی بیوی ام الفضل کے پاس رکھا تھا اور اس سے کہا تھا کہ اگر میں میدانِ جنگ میں مارا جاؤں تو اس مال کو اپنے اور اپنی اولاد کے مصارف کے لیے سمجھنا۔

عباس یہ بات سن کر بہت متعجب ہوئے اور کہنے لگے آپ کو یہ بات کس نے بتائی (حالانکہ یہ تو بالکل محرمانہ تھی)؟

رسول اللہؐ نے فرمایا: جبرئیل نے، خدا کی طرف سے۔

عباس بولے: اس کی قسم کہ جس کی محمد قسم کھاتا ہے کہ میرے اور میری بیوی کے علاوہ اس راز سے کوئی آگاہ نہ تھا۔

اس کے بعد وہ پکار اٹھے: اشھد انک رسول اللہ (یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں)۔

اور یوں وہ مسلمان ہو گئے۔

آزادی کے بعد بدر کے تمام قیدی مکہ لوٹ گئے لیکن عباس، عقیل اور نوفل مدینہ ہی میں رہ گئے کیونکہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مندرجہ بالا آیات میں ان کی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے[1]

عباس کے اسلام لانے کے بارے میں بعض تواریخ میں ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد وہ مکہ کی طرف پلٹ گئے تھے اور خط

---

[1] زیربحث آیت کے ذیل میں تفسیر نور الثقلین، روضۃ الکافی، تفسیر قرطبی اور تفسیر المنار کی طرف رجوع کیجیے۔

کے ذریعے رسول اللہ کو سازش سے باخبر رکھتے تھے۔ پھر ۸ ھ سے پہلے فتح مکہ کے سال مدینہ کی طرف ہجرت کر آئے۔

کتاب قرب الاسناد میں امام باقر علیہ السلام کے واسطے سے ان کے والد امام سجاد علیہ السلام سے منقول ہے:

ایک روز رسول اللہ کے پاس بڑی مقدار میں مال لایا گیا۔ آپ نے عباس کی طرف رخ کیا اور ارشاد فرمایا:

اپنی عبا پھیلا دو اور اس مال میں سے کچھ لے لو۔

عباس نے ایسا کیا۔

پھر رسول اللہ نے فرمایا:

یہ اسی میں سے ہے کہ جس کے بارے میں اللہ فرماتا ہے، پھر آپ نے آیہ

یا ایھا النبی قل لمن فی اید یکم...... کی تلاوت کی۔ (تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۶۸)

یہ گویا اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ جو مال تم سے لیا گیا تھا اس کی تلافی کے بارے میں اس طرح خدا کا وعدہ اب پورا ہوگیا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ اس کوشش میں تھے کہ جو قیدی مسلمان ہو گئے ہیں انہیں احسن طریقے سے تشویق کی جائے اور جو مال انہوں نے دیئے ہیں ان کی بہتر طور پر تلافی کی جائے۔

۷۲۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ هَاجَرُوۡا وَ جٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَ اَنۡفُسِهِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّ نَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِكَ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ‌ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ لَمۡ یُهَاجِرُوۡا مَا لَكُمۡ مِّنۡ وَّلَایَتِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوۡا‌ ۚ وَ اِنِ اسۡتَنۡصَرُوۡكُمۡ فِی الدِّیۡنِ فَعَلَیۡكُمُ النَّصۡرُ اِلَّا عَلٰی قَوۡمٍۭ بَیۡنَكُمۡ وَ بَیۡنَهُمۡ مِّیۡثَاقٌ‌ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ۝

۷۳۔ وَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ‌ؕ اِلَّا تَفۡعَلُوۡهُ تَكُنۡ فِتۡنَةٌ فِی الۡاَرۡضِ وَ فَسَادٌ كَبِیۡرٌؕ ۝

۷۴۔ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ هَاجَرُوۡا وَ جٰهَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیۡنَ اٰوَوۡا وَّ نَصَرُوۡۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا‌ ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ

وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝

۷۵۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ
مِنْكُمْ ۚ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ
اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

ع ۱۰

ترجمہ

۷۲۔ وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا اور وہ کہ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی ایک دوسرے کے اولیاء (دوست، جوابدہ اور دفاع کرنے والے) ہیں اور وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت نہیں کی تم ان کے بارے میں کسی قسم کی ولایت (تعہد اور جوابدہی) نہیں رکھتے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں اور (صرف اس صورت میں کہ) جب وہ تم سے (اپنے) دین (کی حفاظت) کے لیے مدد طلب کریں (تو پھر) تم پر لازم ہے کہ ان کی مدد کرو مگر ایسے گروہ کے خلاف نہیں کہ جس کے ساتھ تمہارا (جنگ نہ کرنے کا) معاہدہ ہو اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو خدا اسے دیکھتا ہے۔

۷۳۔ وہ جو کافر ہو گئے ہیں ایک دوسرے کے اولیاء (دوست اور پشت پناہ) ہیں اگر تم (اس حکم کو) انجام نہ دو تو زمین میں عظیم فتنہ فساد برپا ہو جائے۔

۷۴۔ اور وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور راہ خدا میں جہاد کیا اور وہ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی تحقیق مومن ہیں۔ ان کے لیے بخشش (اور خدا کی رحمت) اور مناسب رزق ہے۔

۷۵۔ اور وہ جو بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ شامل ہو کر جہاد کیا وہ تم میں سے ہیں اور رشتہ دار ایک دوسرے کے ساتھ (غیروں کی نسبت) خدا کے مقرر کردہ احکام میں زیادہ حق دار ہیں۔ خدا تمام چیزوں کو جانتا ہے۔

تفسیر

چار مختلف گروہ

یہ آیات سورہ انفال کا آخری حصہ ہیں۔ ان میں مہاجرین وانصار اور مسلمان کے دوسرے گروہوں کے مقام اور مرتبے کا ذکر ہے نیز جہاد اور مجاہدین کے بارے میں جاری بحث کی بھی ان آیات میں تکمیل ہوتی ہے۔

ان آیات میں مختلف رشتوں کے حوالے سے اسلامی معاشرے کا نظام بیان کیا گیا ہے کیونکہ جنگ اور صلح کا پروگرام دوسرے عمومی پروگراموں کی طرح صحیح اجتماعی اور معاشرتی رشتوں کو ملحوظ رکھے بغیر نہیں بن سکتے۔

ان آیات میں پانچ گروہوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان میں سے چار مسلمان ہیں اور ایک گروہ غیر مسلموں کا ہے مسلمانوں کے چار گروہ یہ ہیں:

۱۔ مہاجرین اوّلین۔

۲۔ انصار ــــ اہلِ مدینہ میں سے یاروانصار۔

۳۔ وہ جو ایمان تو لے آئے لیکن انہوں نے ہجرت نہ کی۔

۴۔ وہ جو بعد میں ایمان لائے اور مہاجرین سے آملے۔

زیرِ بحث پہلی آیت میں کہا گیا ہے: وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اپنے مال وجان سے راہِ خدا میں جہاد کیا اور وہ لوگ کہ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہ ایک دوسرے کے اولیاء، ہم پیمان اور ایک دوسرے کا دفاع اور محافظت کرنے والے ہیں (ان الذین اٰمنوا وھاجروا وجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ والذین اٰووا ونصروا اولٰئک بعضھم اولیاء بعض)۔

آیت کے اس حصے میں پہلے اور دوسرے گروہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ یعنی وہ مومنین جو مکہ میں ایمان لائے اور اس کے بعد انہوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور وہ مومنین جو مدینہ میں رسول اللہ پر ایمان لائے اور آپ کی اور مہاجرین کی مدد اور حمایت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا ایک دوسرے کے اولیاء، حامی اور متعہد کے طور پر تعارف کروایا گیا ہے۔

یہ بات جالبِ توجہ ہے کہ پہلے گروہ کی چار صفات بیان کی گئی ہیں۔ پہلی ایمان، دوسری ہجرت، تیسری مالی واقتصادی جہاد (مکہ میں موجود اپنے مال سے صرف نظر کرتے ہوئے یا جنگِ بدر میں اپنے مال کی پرواہ نہ کرنے کی صورت میں) اور چوتھی اپنے خون اور جان کے ساتھ راہِ خدا میں جہاد کرنا۔

انصار کے دو وصف بیان ہوئے ہیں پہلا "ایواء (پناہ دینا) اور دوسرا مدد کرنا۔

نیز "بعضھم اولیاء بعض" کے جملے کے ذریعے سب کو ایک دوسرے کے بارے میں جوابدہ قرار دیا گیا ہے۔ حقیقت میں یہ دونوں گروہ اسلامی معاشرے کے تانے بانے کی بنیادی اجزاء کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک تانے کی اور

دوسرا بانے کی حیثیت کا حامل تھا۔ ان میں سے کوئی بھی دوسرے سے بے نیاز نہ تھا۔
اس کے بعد تیسرے گروہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: وہ جو ایمان لائے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی اور تمہارے نئے معاشرے سے وابستہ نہیں ہوئے ان کے بارے میں تم کوئی ذمہ داری، جوابدہی اور ولایت نہیں رکھتے جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں (والذین اٰمنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شیءٍ حتّٰی یھاجروا)۔
البتہ اگلے میں اس گروہ کی حمایت اور مسئولیت سے متعلق ایک استثنائی حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس وقت یہ لوگ (غیر مہاجر مومنین) تم سے اپنے دین و آئین کی حفاظت کے لیے مدد طلب کریں (یعنی دشمنوں کے شدید دباؤ میں گھرے ہوں) تو تم پر لازم ہے کہ ان کی مدد کے لیے فوراً جاؤ (وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر)۔ مگر اس وقت کہ جب ان کے مخالف وہ لوگ ہوں کہ تمہارے اور ان کے درمیان لڑائی نہ کرنے کا عہد و پیمان موجود نہ ہو (الا علٰی قوم بینکم و بینھم میثاق)۔
دوسرے لفظوں میں ان کا دفاع اس صورت میں لازم ہے جب وہ مشترک دشمن کے مقابل ہوں اور اگر وہ ایسے کفار کے مقابل ہوں جنہوں نے تم سے معاہدہ کر رکھا ہے تو معاہدے کا احترام اس بدحال گروہ کے دفاع کی نسبت زیادہ ضروری ہے۔
آیت کے آخر میں ان ذمہ داریوں کی حدود کو ملحوظ رکھنے اور ان فرائض کی انجام دہی میں دقتِ نظر سے کام لینے کے لیے کہا گیا ہے: جو کچھ تم انجام دیتے ہو خدا اس سے بصیر و بینا ہے (واللہ بما تعملون بصیر)۔
وہ تمہارے تمام اعمال کو دیکھتا ہے اور تمہاری تمام تر سعی و کاوش اور احساسِ ذمہ داری سے آگاہ ہے۔ اسی طرح اس عظیم ذمہ داری کے بارے میں بے اعتنائی، سستی، تساہل اور عدم احساس سے بھی باخبر ہے۔
دوسری آیت میں اسلامی معاشرے کے مدمقابل یعنی کفر اور اسلام دشمن معاشرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ جو کافر ہوگئے ہیں ان میں سے بعض دوسرے بعض کے اولیاء اور سرپرست ہیں (والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض)۔
یعنی ان کا تعلق اور پیوند صرف خود انہی کے ساتھ ہے اور تمہیں کوئی حق نہیں کہ ان سے کوئی تعلق قائم کرو اور ان کی حمایت کرو یا انہیں اپنی حمایت کی دعوت دو۔ نہ انہیں پناہ دو اور نہ ان سے پناہ لو۔ خلاصہ یہ کہ اسلامی معاشرے کے تار و پود اور تانے بانے میں انہیں دخیل نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی تم ان کے معاشرے کے تار و پود میں دخل دو۔
اس کے بعد مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے اگر تم نے اس اسلامی حکم کو نظر انداز کر دیا تو زمین میں اور تمہارے معاشرے کے گرد و پیش میں عظیم فتنہ و فساد برپا ہوگا (الا تفعلوہ تکن فتنۃ فی الارض و فساد کبیر)۔
اس سے بڑھ کر فتنہ و فساد کیا ہوگا کہ تمہاری کامیابی کے نقوش محو ہو جائیں گے اور تمہارے معاشرے میں دشمنوں کی سازشیں کارگر ہوں گی اور دینِ حق و عدالت کی راہ کو دور کر دینے کے لیے ان کے منحوس اور بدبخت منصوبے مؤثر ہونے لگیں گے۔
اگلی آیت میں دوبارہ مہاجرین و انصار کے مقام کی اہمیت اور اسلامی معاشرے کے اہداف کی پیش رفت میں ان کے کردار کے احترام کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے ہجرت کی ہے اور راہِ خدا میں جہاد کیا ہے اور وہ کہ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی ہے وہی حقیقی اور سچے مومن ہیں (والذین اٰمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ

والذین اٰووا ونصروا اولٰئک ھم المؤمنون حقا) کیونکہ ان میں سے ہر ایک اسلام کے سخت، دشوار اور غربت کے دنوں میں دین خدا اور رسول اللہ کی مدد کے لیے کسی نہ کسی صورت میں آگے بڑھا ہے اور "انہیں اس عظیم فدا کاری کی وجہ سے بخشش اور شائستہ رزق نصیب ہوگا" (لھم مغفرۃ ورزق کریم)۔ وہ خدا کی بارگاہ میں اور دوسرے جہان میں بھی عظیم نعمات سے بہرہ ور ہوں گے اور اس جہان میں بھی نفع عظمت، سربلندی، کامیابی، امن وامان اور اطمینان کا شائستہ حصہ حاصل کریں گے۔

آخری آیت میں مسلمانوں کے چوتھے گروہ یعنی "بعد کے مہاجرین" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ جو اس کے بعد ایمان لے آئیں اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ شریک جہاد ہوں وہ بھی تم میں سے ہیں (والذین اٰمنوا من بعد وھاجروا وجاھدوا معکم فاولٰئک منکم)۔ یعنی اسلامی معاشرے کا دائرہ تنگ یا کسی گروہ پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کے دروازے آئندہ کے تمام مومنین، مہاجرین اور مجاہدین کے لیے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ پہلے مہاجرین اگرچہ ایک خاص مقام ومرتبہ رکھتے ہیں لیکن یہ برتری اس معنی میں نہیں کہ آئندہ کے مومنین اور مہاجرین جو اسلام کے نفوذ اور پیش رفت کے وقت اس کی طرف جھکے اور اس سے آملے ہیں وہ اسلامی معاشرے کی بن وبافت کا جزء نہیں ہیں۔

آیت کے آخر میں رشتہ داروں اور عزیزوں کی ایک دوسرے کے لیے ولایت واولویت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: رشتہ دار (بھی) ایک دوسرے کے لیے اور ان احکام میں کہ جو خدا نے اپنے بندوں کے لیے مقرر کیے ہیں اولویت رکھتے ہیں (واولوا الارحام بعضھم اولٰی ببعض فی کتاب اللّٰہ)۔

درحقیقت گذشتہ آیات میں مسلمانوں کی ایک دوسرے کے بارے میں عمومی ولایت واولویت کے متعلق گفتگو تھی اور اس آخری آیت میں خدا تعالیٰ تاکید کرتا ہے کہ یہ ولایت واولویت رشتہ داروں کے لیے زیادہ قوی اور زیادہ جامع صورت میں ہے کیونکہ مسلمان رشتہ دار ایمان وہجرت کی ولایت کے علاوہ رشتہ داری کی ولایت بھی رکھتے ہیں۔

اسی بناء پر وہ ایک دوسرے کی میراث لیتے ہیں جب کہ رشتہ داروں کے علاوہ دوسرے شریک میراث نہیں ہوتے۔

لہٰذا آخری آیت صرف میراث کا حکم بیان نہیں کرتی بلکہ ایک وسیع معنی کی حامل ہے کہ جس کا ایک جزء میراث بھی ہے۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی روایات اور تمام فقہی کتب میں احکام ارث کے لیے اس آیت اور سورہ احزاب کی اس سے ملتی جلتی آیت سے استدلال ہوا ہے تو یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ یہ آیت مسئلہ ارث میں منحصر ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ آیت ایک عمومی قانون بیان کر رہی ہو جس کا ایک حصہ میراث بھی ہے۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ کی جانشینی کے مسئلہ میں کہ جو مالی میراث کے مفہوم میں داخل نہیں ہے بعض اسلامی روایات میں اس آیت سے استدلال کیا گیا ہے نیز غسل میت وغیرہ کے مسائل میں بھی رشتہ داروں کی اولویت کے لیے بھی اسی آیت سے استدلال کیا گیا ہے۔

جو کچھ سطور بالا میں بیان کیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ جو بعض مفسرین نے اصرار کیا ہے کہ یہ آیت صرف میراث کے بارے میں ہے بے وجہ اور بے دلیل ہے۔ اگر ہم اس آیت کی ایسی تفسیر کرنا چاہیں تو اس کا صرف یہی طریقہ ہے کہ اسے گذشتہ آیت میں مہاجرین وانصار کے مابین بیان شدہ "ولایت مطلقہ" سے ایک استثناء سمجھیں اور کہیں کہ آخری آیت کہتی ہے کہ مسلمان

کی عمومی ولایت میں ایک دوسرے کی میراث لینا شامل نہیں ہے۔

باقی رہا یہ احتمال کہ گذشتہ آیات میراث کے بارے میں ہی ہیں اور اس کے بعد آخری آیت نے اس حکم کو نسخ کردیا ہے یہ بہت بعید نظر آتا ہے کیونکہ ان آیات کا مفہوم کے اعتبار سے اور معنوی لحاظ سے آپس میں ارتباط یہاں تک کہ لفظی مشابہت بھی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ سب کی سب ایک ساتھ نازل ہوئی ہیں اور اس لحاظ سے یہ ناسخ و منسوخ نہیں ہو سکتیں۔

بہرحال آیات کے مفہوم کے ساتھ زیادہ مطابقت وہی تفسیر رکھتی ہے جو ہم نے ابتداء میں ذکر کی ہے۔

آیت کے آخری جملہ میں جو کہ سورہ انفال کا آخری جملہ ہے فرمایا گیا ہے: خدا ہر چیز کو جانتا ہے (ان الله بكل شيء عليم)۔

انفال، جنگی غنائم، نظامِ جہاد، صلح، جنگی قیدی اور ہجرت وغیرہ سے مربوط تمام احکام جو اس سورہ میں نازل ہوئے ہیں سب دقیق منصوبہ بندی اور حساب و کتاب کے ماتحت ہیں جو کہ انسانی معاشرے، بشری تقاضوں اور ہر پہلو سے ان مصالح سے مطابقت رکھتے ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ ہجرت اور جہاد، تاریخ اسلام کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ طاقتور دشمن کے مقابلے میں اسلام کی کامیابی کے لیے ہجرت اور جہاد دو بنیادی عوامل تھے۔ ہجرت نہ ہوتی تو اسلام مکہ کے گھٹے ہوئے ماحول میں ختم ہو کے رہ جاتا اور جہاد نہ ہوتا تو اسلام کو کبھی رشد اور نشوونما حاصل نہ ہوتی۔

ہجرت نے اسلام کو مخصوص علاقائی صورت سے نکال کر عالمی دین کی شکل دی اور جہاد نے مسلمانوں کو یہ بات سکھائی کہ اگر انہوں نے طاقت کا سہارا نہ لیا تو وہ دشمن جو منطق، حرفِ حسابی اور سنجیدہ بات چیت کے پابند نہیں ہیں ان کے لیے کسی قسم کے حق کے قائل نہیں ہوں گے۔

آج بھی اسلام کو سرحدوں کی بندش سے نجات دلانے اور ان مختلف رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے کہ جنہیں ہر طرف دشمنوں نے کھڑا کر رکھا ہے ہجرت اور جہاد کو زندہ کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔

ہجرت مسلمانوں کی آواز کو پوری دنیا کے کانوں تک پہنچائے گی اور آمادہ دلوں، اسلامی قوتوں اور حق و عدالت کی پیاسی قوموں کو ان کی طرف مائل کردے گی۔ جب کہ جہاد انہیں حرکت اور حیات بخشے گا اور ہٹ دھرم دشمنوں کو کہ جن کے کانوں کو طاقت کی آواز کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دیتا اپنے راستے سے ہٹا دے گا

اسلام اور ہجرتیں

مکہ کے مسلمانوں کی حبشہ کی طرف ہجرت سے ایک تو جزیرہ عرب سے باہر اسلام کا بیج چھڑکا اور ساتھ ہی ساتھ جو پہلے معدودے چند مسلمان تھے اور دشمن کے سخت دباؤ میں تھے ان کے لیے اس نے ایک مورچے کا کام بھی دیا۔

پھر رسول اللہؐ اور پہلے مسلمانوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ یہ مہاجرین جنہیں بعض اوقات مہاجرینِ بدریبی کہتے ہیں

تاریخ اسلام میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ بظاہر تو یہ ایک بالکل تاریک مستقبل کی طرف چل پڑے تھے اور در حقیقت انہوں نے خدا کے لیے تمام مادی سرمائے سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ مہاجرین کو جنہیں مہاجرین اوّلین سے تعبیر کیا جاتا ہے انہوں نے در حقیقت اسلام کے پر شکوہ محل کی بنیاد کی پہلی اینٹ رکھی۔ قرآن ان کے لیے ایک مخصوص عظمت کا قائل ہے کیونکہ وہ تمام مسلمانوں کی نسبت زیادہ باایثار سمجھے جاتے ہیں۔

ایک اور ہجرت صلح حدیبیہ کے بعد نسبتاً امن و امان کے ماحول میں ہوئی۔ کچھ مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ بعض اوقات ان تمام مسلمانوں کی ہجرت کو جنہوں نے واقعہ بدر سے لے کر فتح مکہ کے دوران مدینہ کی طرف ہجرت کی ایک ہی ہجرت شمار کیا جاتا ہے اور اسے "ہجرت ثانیہ" کا نام دیا جاتا ہے۔

فتح مکہ کے بعد پہلے کی سی ہجرت کا سلسلہ ختم ہو گیا یعنی مکہ سے مدینہ کی طرف آنا ختم ہو گیا کیونکہ اب مکہ ایک اسلامی شہر میں تبدیل ہو چکا تھا اور رسول اللہ سے جو یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ

لا هجرة بعد الفتح

یعنی — فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔

—— یہ اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔

لیکن اس گفتگو کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ اسلام نے ہجرت کی آئندہ کے لیے بالکل نفی کر دی ہے جیسا کہ بعض نے خیال کر رکھا ہے بلکہ مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی نفی کی گئی ہے ورنہ جب بھی مسلمانوں کے لیے پہلے مسلمانوں کے سے حالات پیدا ہوں ان کے لیے قانونِ ہجرت اپنی قوت کے ساتھ باقی ہے اور جب تک اسلام کا پوری دنیا پر قبضہ نہیں ہو جاتا یہ قانون برقرار ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج کے مسلمان اس اہم اسلامی بنیاد کو بھلا دینے کی وجہ سے زیادہ تر اپنے محیط میں بند ہیں جب کہ مسیحی مبلغ، گمراہ فرقوں کے نمائندے اور سامراجی مذاہب کے مبلغ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی طرف ہجرت کرتے ہیں یہاں تک کہ یہ لوگ وحشی اور آدم خور قبائل میں جاتے ہیں بلکہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کے علاقوں میں جاتے ہیں۔ در حقیقت یہ حکم تو مسلمانوں کے لیے تھا اور اس پر عمل دوسرے کر رہے ہیں۔

زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے بڑے بڑے شہروں کے اطراف میں بہت سے ایسے دیہات ہیں جو بعض اوقات چند میلوں کے فاصلے پر ہونے کے باوجود اسلامی مسائل سے بے خبر ہیں اور بعض تو ایسے ہیں کہ انہوں نے کبھی کسی اسلامی مبلغ کی صورت تک نہیں دیکھی۔ اسی لیے ان کا ماحول فساد کے جراثیم اور جعلی و سامراجی مذاہب کے لیے آمادہ اور تیار ہے۔

نہ جانے آج کے مسلمانوں نے جو مہاجرین اوّلین کے وارث ہیں خدا کے سامنے اس کیفیت کے لیے کیا جواب سوچ رکھا ہے۔ حالیہ دنوں میں اگرچہ اس سلسلے میں کچھ حرکت نظر آنے لگی ہے لیکن یہ ہرگز کافی و وافی نہیں ہے۔

بہرحال تاریخ اور مسلمانوں کی سرنوشت میں ہجرت کا موضوع اور اس کے نقوش اس سے کہیں زیادہ اہم ہیں کہ اس مختصر سے اس کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ اور تحقیق ہو سکے۔

(تفسیر نمونہ جلد دوم سورہ نساء آیت نمبر ۹۷ میں اس سلسلے میں ہم کچھ باتیں کر آئے ہیں۔ آئندہ بھی انشاء اللہ متعلقہ آیات کے ذیل

میں پھر گفتگو کریں گے)۔

۲۔ صحابہ کے بارے میں مبالغہ: قرآن مہاجرین اوّلین کے بارے میں جس احترام اور اہمیت کا قائل ہے اس سے ہمارے کچھ اہل سنت بھائیوں نے یہ مطلب نکالنا چاہیے کہ وہ حضرات آخر عمر تک کسی غلطی اور خلاف شریعت امر کے مرتکب نہیں ہوئے۔ لہٰذا ان کے خیال میں بلاچون وچراسب کو بلا استثناء محترم سمجھنا چاہیے۔ پھر قرآن نے بیعتِ رضوان وغیرہ کے واقعہ میں ان کی جو تعریف وستائش کی ہے اس کی وجہ سے وہ اس احترام میں تمام صحابہ کو شامل سمجھتے ہیں اور عملی طور پر وہ صحابہ کو ان کے اعمال وکردار کو مدنظر رکھے بغیر استثنائی انسان شمار کرتے ہیں اور اس طرح انہوں نے ان کے کردار پر کسی قسم کی تنقید اور بحث وتمحیص کا اپنے حق کو سلب کرلیا ہے۔

ان میں سے المنار کے مؤلف مشہور مفسر نے زیر بحث آیات کے ذیل میں شیعوں پر سخت حملہ کیا ہے کہ وہ بعض مہاجرین اوّلین پر کیوں انگلی رکھتے ہیں اور ان پر کیوں تنقید کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں شیعہ اس طرف متوجہ نہیں ہیں کہ صحابہ کے بارے میں ایسا نظریہ رکھنا روح اسلام اور تاریخ اسلام سے بہت متضاد ہے۔

اس میں شک نہیں کہ صحابہ، خصوصاً مہاجرین اوّلین بڑی عزت اور احترام کے حامل ہیں لیکن یہ احترام اس وقت ہے جب تک وہ صحیح راستے پر گامزن رہے اور انہوں نے فداکاری کی۔ لیکن جس روز سے صحابہ کا ایک گروہ اسلام کے حقیقی راستے سے ہٹ گیا مسلمان ان کے بارے میں قرآن کا دوسرا فیصلہ ہوگا۔

مثلاً ہم طلحہ اور زبیر کو کیسے بری الذمہ قرار دے سکتے ہیں جنہوں نے بیعت توڑی، ایسے امام کی مخالفت کی جو اس کے علاوہ کہ رسول اللہ کے ارشادات کے مطابق پیشوا تھا بلکہ تمام مسلمانوں حتیٰ کہ خود ان کی طرف سے منتخب ہوا تھا۔ ہم کیسے ان کے دامن سے ان ستر ہزار مسلمانوں کا خون دھوسکتے ہیں جو جنگِ جمل میں مارے گئے۔ جو شخص کسی ایک بے گناہ کا خون بہادے وہ بھی دربارِ الٰہی میں کوئی عذر پیش نہیں کرسکے گا چاہے کوئی بھی ہو چہ جائیکہ مسلمانوں کی اتنی کثیر تعداد کا خون ہو۔

کیا اصولی طور پر جنگِ جمل کے میدان میں حضرت علیؑ اور ان کے ساتھیوں کو اور دوسری طرف طلحہ و زبیر اور دوسرے صحابہ جو ان کے ساتھ تھے طرفین کو بیک وقت حق پر قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا کوئی منطق اور عقل اس واضح تضاد کو قبول کرسکتی ہے؟ کیا ہم ایسا کرسکتے ہیں کہ تقدسِ صحابہ کے نام پر آنکھیں بند کرلیں اور انہیں ہر قانون سے بالاتر سمجھ لیں، رسول اللہ کے بعد کی تمام تر تاریخ اسلام فراموش کردیں اور اسلامی ضابطہ" ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم " (اللہ کے نزدیک زیادہ محترم وہ ہے جو زیادہ متقی ہے) کو پامال کردیں؟ یہ کیا غیر منطقی فیصلہ ہے؟

اصولی طور اس امر میں کیا مانع اور رکاوٹ ہے کہ ایک شخص یا چند اشخاص ایک دن بہشتیوں کی صف میں کھڑے ہوں اور حق کے طرفدار ہوں اور دوسرے دن دوزخیوں اور حق دشمنوں کی صف میں شامل ہوجائیں؟

کیا سب لوگ معصوم ہیں؟ کیا ہم نے ایسی تبدیلیاں اور اختلافات نظر لوگوں کے حالات میں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے؟ کیا واقعہ ردّہ" رسول اللہ کے زمانے میں رونما نہیں ہوا جب کہ اصحاب پیغمبرؐ میں سے کچھ لوگ مرتد ہوگئے تھے؟ کیا یہ واقعہ شیعہ سنی کتب میں منقول نہیں ہے؟ کیا یہ مرتد ہونے والے صحابہ کی صف میں شامل نہیں تھے؟

زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ اس تضاد اور عجیب کشمکش سے بچنے کے لیے بعض نے "اجتہاد" کو دستاویز بنا رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں طلحہ، زبیر، معاویہ، ان کے ساتھی اور ان جیسے افراد مجتہد تھے، ان سے اشتباہ اور غلطی تو ہوئی ہے لیکن ان سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا بلکہ ان اعمال کے بدلے میں وہ خدا سے اجر و ثواب پائیں گے۔

واقعاً کیسی رسوا کنندہ منطق ہے۔ کیا جانشینِ پیغمبر کے خلاف قیام کرنا، عہد و پیمان توڑنا اور ہزاروں بے گناہوں کا خون بہانا وہ بھی جاہ طلبی اور مال و مقام کے حصول کے لیے ایسا پیچیدہ اور نامعلوم معاملہ ہے کہ جس کی قباحت اور برائی سے کوئی شخص باخبر نہیں؟ کیا اتنے بے گناہوں کا خون بہانے پر بھی خدا کے ہاں سے اجر و ثواب ملے گا؟

اگر اس طرح سے ہم چاہیں کہ کچھ صحابہ کو جو ایسے جرائم کے مرتکب ہوئے ہیں بری الذمہ قرار دیں تو یقیناً دنیا میں کوئی گنہگار باقی نہیں رہے گا اور اس منطق کے ذریعے ہم تمام قاتل اور ظالم افراد کو بری الذمہ قرار دے سکتے ہیں۔

صحابہ کے ایسے بے سوچے سمجھے دفاع سے حقیقتِ اسلام پر حرف آتا ہے لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ ہی نہیں کہ سب کے لیے خصوصاً اصحابِ پیغمبر کے لیے ہم عزت و احترام کے قائل تو ہوں مگر اس دن تک جب تک وہ حق و عدالت اور اسلامی منطق سے منحرف نہ ہوں۔

۳۔ میراث ــــ اسلامی نظام قانون میں: جیسا کہ سورۂ نساء کی تفسیر میں ہم اشارہ کر چکے ہیں زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے ہاں میراث کے تین طریقے تھے۔ ایک نسب کا طریقہ (ان کے ہاں نسب صرف اولادِ مذکورہ کے لیے تھا۔ چھوٹے بچے اور عورتیں میراث سے محروم رہتے تھے)۔ دوسرا ان کے ہاں متبنیٰ (لے پالک) کا طریقہ تھے تیسرا طریق عہد و پیمان کا تھا جسے "ولاء" کہا جاتا تھا[1]

ابتدائے اسلام میں جب کہ ابھی میراث کا قانون نازل نہیں ہوا تھا اسی طریقے پر عمل ہوتا تھا لیکن جلد ہی اس کی جگہ "اخوتِ اسلامی" نے لے لی اور صرف مہاجرین و انصار جنہوں نے ایک دوسرے سے پیمانِ اخوت باندھ رکھا تھا ایک دوسرے کی میراث لیتے تھے۔ ایک عرصے کے بعد جب اسلام میں زیادہ وسعت پیدا ہو گئی تو میراث نسبی اور نسبی رشتہ داروں کی طرف منتقل ہو گئی اور میراث کے بارے میں اخوتِ اسلامی کا حکم منسوخ ہو گیا اور میراث کا آخری اور اصلی قانون نازل ہوا کہ جس کی طرف مندرجہ بالا آیات اور سورہ احزاب کی آیہ ۶ میں اشارہ ہوا ہے۔ سورہ احزاب کی آیہ ۶ میں ہے:

واولوا الارحام بعضهم اولی ببعض فی کتاب اللّٰه۔

یہ سب چیزیں تاریخی لحاظ سے مسلم ہیں لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں لفظ "واولوا الارحام" جو محلِ بحث آیات میں آیا ہے مسئلہ میراث ہی سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک وسیع معنی کے لیے کہ میراث جس کا ایک جزء ہے[2]

۴۔ فتنہ اور فسادِ کبیر سے کیا مراد ہے؟ ان دو الفاظ کے بارے میں کہ جو زیرِ بحث آیات میں آئے ہیں مفسرین نے

---

[1] ولاء کے طریقے سے میراث کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۳۵۳ پر تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔

[2] میراث کے بارے میں بھی تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۳۸۰ سے ۳۸۷ تک تفصیلی مطالب موجود ہیں۔

مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن جو چیز مفہوم آیت سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے یہ ہے کہ "فتنة" سے مراد اختلاف و انتشار اور مسلمانوں کے عقائد کی بنیادوں کا دشمنوں کے وسوسوں کے زیر اثر متزلزل ہونا ہے اور "فساد" کے مفہوم میں ہر طرح کی بے سروسامانی اور معاشرے کے مختلف نظاموں کی خرابی شامل ہے خصوصاً بے گناہوں کے خون بہہ جانے اور بدامنی وغیرہ فساد کے مفہوم میں شامل ہے۔

درحقیقت قرآن مجید مسلمانوں کو تنبیہ کر رہا ہے کہ اگر وہ آپس میں ارتباط و تعاون اور برادری کے رشتے کو محکم اور مضبوط نہیں بنائیں گے اور دشمنوں سے تعلق اور ہم کاری ترک نہیں کریں گے تو دن بدن ان کی صفوں میں اختلاف و انتشار زیادہ ہوگا، دشمنوں کا نفوذ اسلامی معاشرے میں زیادہ ہوگا اور ان کے تباہ کن وسوسوں سے ایمان کی بنیادیں کمزور اور متزلزل ہو جائیں گی اور اس طرح سے انہیں ایک عظیم فتنہ آلے گا۔

اسی طرح محکم و مضبوط معاشرتی ارتباط اور رشتے نہ ہونے کے باعث اور ان کی صفوں میں دشمنوں کی رخنہ اندازی کے سبب طرح طرح کے مفاسد، بدامنی، خون ریزی، مال و اولاد کی تباہی اور معاشرے کی بے سروسامانی کا سامنا کرنا پڑے گا اور فسادِ کبیر تمام جگہوں پر چھا جائے گا۔

پروردگارا!

ہمارے اسلامی معاشرے کو بیداری عطا فرما۔

مسلمانوں کو دشمنوں کے ساتھ ربط، تعلق اور ہم کاری کے خطرات سے آگاہ فرما۔

اور خود آگاہی اور وحدتِ کلمہ کے سائے میں ہمارے معاشرے کو "فتنہ و فساد" سے پاک کر دے۔

سورۂ انفال کی تفسیر اختتام کو پہنچی

سورۂ توبہ

میں

۱۲۹ آیات ہیں

جو سب کی سب مدینہ میں نازل ہوئی ہیں

سورۂ توبہ کے بارے میں چند اہم نکات

اس سورہ کی تفسیر شروع کرنے سے پہلے ان نکات کی طرف توجہ ضروری ہے:

۱۔ سورہ کا نام: مفسرین نے اس سورہ کے کئی نام ذکر کیے ہیں جن کی تعداد دس سے زیادہ ہے۔ ان میں سے زیادہ مشہور یہ ہیں: براءت، توبہ اور فاضحہ۔

ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک واضح دلیل ہے۔ "براءت" نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کی ابتداء پیمان شکن مشرکین سے خدا کی براءت اور بیزاری سے ہوئی ہے۔

اسے "توبہ" اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں توبہ کے متعلق بہت گفتگو کی گئی ہے۔

اس کا نام "فاضحہ" اس جہت سے ہے کہ اس کی مختلف آیات منافقین کی رسوائی، فضاحت اور ان کے اعمال سے پردہ اٹھانے کا سبب بنیں۔

۲۔ مختصر تاریخِ نزول: مدینہ میں رسول اللہ پر نازل ہونے والی یہ آخری سورہ ہے یا آخری سورتوں میں سے ہے اور جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس کی ۱۲۹ آیات ہیں۔

اس کے نزول کی ابتداء ۹ھ میں بیان کی جاتی ہے۔ سورہ کی آیات کا مطالعہ نشاندہی کرتا ہے کہ اس کا کچھ حصہ جنگ تبوک سے پہلے، کچھ جنگ کی تیاری کے وقت اور کچھ جنگ سے واپسی پر نازل ہوا۔

شروع سے لے کر آیہ ۲۸ تک کا حصہ مراسم حج کا موقع آنے سے پہلے نازل ہوا اور جیسا کہ انشاء اللہ اس کی تشریح میں آئے گا اس کی ابتدائی آیات جو باقی ماندہ مشرکین سے متعلق تھیں مراسم حج میں امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے توسط سے لوگوں کو پہنچائی گئیں اور آپ نے ان کی تبلیغ فرمائی۔

۳۔ مضامین و مشتملات: یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب اسلام جزیرہ عرب میں اوج و بلندی حاصل کر چکا تھا اور مشرکین آخری شکست کھا چکے تھے۔ اس لیے اس کے مضامین خاص اہمیت کے حامل ہیں اور اس میں حساس اور بلند امور زیرِ بحث آئے ہیں۔

اس کے اہم حصے بچے کھچے مشرکین اور بت پرستوں کے بارے میں ہیں۔ ان سے رابطہ توڑنے کا حکم دیا گیا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ ان کے جو معاہدے تھے انہیں لغو قرار دینے کے سلسلے میں گفتگو ہے کیونکہ وہ بار بار اپنے معاہدوں کو توڑ چکے تھے۔ یہ احکام اس لیے ہیں تاکہ باقی ماندہ بت پرستی اسلامی ماحول سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

نیز اسلام نے چونکہ وسعت پیدا کر لی تھی اور دشمنوں کی صفیں تتر بتر ہو چکی تھیں لہٰذا کچھ لوگوں نے اپنے چہرے بدل لیے اور مسلمانوں کی صفوں میں داخل ہو گئے تاکہ وہ موقع ہاتھ آتے ہی اسلام پر ضرب کاری لگائیں۔ اسی صورت حال کے پیش نظر اس سورہ کا دوسرا اہم حصہ منافقین اور ان کی سرنوشت کے بارے میں ہے۔ اس میں مسلمانوں کو شدت سے متنبہ کیا گیا ہے اور منافقین کی نشانیاں گنوائی گئی ہیں۔

اس سورہ کا ایک اور حصہ راہِ خدا میں جہاد کے بارے میں ہے کیونکہ اس حساس موقع پر اس حیات بخش امر سے غافل رہنا مسلمانوں کے ضعف، پسماندگی یا شکست کا باعث ہو سکتا تھا۔

ایک اور اہم حصہ اس سورہ کا گذشتہ مباحث کی تکمیل کے حوالے سے ہے۔ اس میں ان کے حقیقتِ توحید سے انحراف کے بارے میں گفتگو ہے اور ان کے علماء نے رہبری اور ہدایت کے فریضے سے جو رُخ پھیر رکھا ہے اس سے متعلق ہے۔

نیز کچھ آیات میں جہاد سے مربوط مباحث کی مناسبت سے مسلمانوں کو اتحاد اور اپنی صفوں کو مجتمع کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

کمزور دل اور سست قسم کے افراد جو مختلف بہانوں سے فریضۂ جہاد سے کتراتے تھے انہیں شدید سرزنش اور ملامت کی گئی ہے اور اس کے برعکس پہلے مہاجرین اور دیگر سچے مومنین کی مدح و ثنا کی گئی ہے۔

اسلامی معاشرہ اس وقت وسعت اختیار کر چکا تھا اور ابھی کئی امور کی اصلاح کی ضرورت تھی اسی مناسبت سے اس سورہ میں زکوٰۃ سے متعلق بحث بھی ہے۔ ذخیرہ اندوزی، ارتکازِ دولت اور خزانہ سازی سے پرہیز کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تحصیلِ علم کے لازمی ہونے کا ذکر ہے اور جاہل و نادان افراد کے لیے وجوبِ تعلیم کی یاد دہانی کروائی گئی ہے

مندرجہ بالا مباحث کے علاوہ کچھ اور مباحث بھی ہیں مثلاً رسول اللہ کی ہجرت کا واقعہ، حرام مہینوں کا مسئلہ جن میں جنگ کرنے کی ممانعت ہے، اقلیتوں سے جزیہ لینے کا معاملہ اور اس قسم کے دیگر مسائل کسی مناسبت سے بیان ہوئے ہیں۔

۴۔ سورہ کی ابتداء میں "بسم اللہ" کیوں نہیں ہے؟ جس کیفیت میں سورہ شروع ہو رہی ہے وہ خود اس سوال کا جواب ہے۔ درحقیقت اس سورہ کا آغاز پیمان شکن دشمنوں سے اعلان جنگ اور اظہارِ بیزاری کے ساتھ ہوا ہے اور ان کے خلاف ایک محکم اور سخت روش اختیار کی گئی ہے اور اس گروہ کے بارے میں خدا کے غیظ و غضب کو بیان کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ صورتِ حال "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے مناسبت نہیں رکھتی جو صلح، دوستی، محبت، خدا کی رحمانیت و رحیمیت کا اظہار ہے۔ یہ بات ایک روایت میں حضرت علیؑ سے منقول ہے [1]

بعض حضرات کا نظریہ ہے کہ یہ سورت درحقیقت سورہ انفال کا تسلسل ہے کیونکہ سورہ انفال میں عہد و پیمان کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور اس سورہ میں پیمان شکنوں کے معاہدوں کو لغو قرار دینے کی بات کی گئی ہے لہٰذا ان دو کے درمیان "بسم اللہ" نہیں آئی۔ اس سلسلے میں امام صادق علیہ السلام سے ایک روایت بھی منقول ہے [2]

---

[1] مرحوم طبرسی حضرت علی علیہ السلام سے نقل کرتے ہیں:

لم تنزل بسم الله الرحمٰن الرحيم على رأس سورة برآءة، لان بسم الله للامان والرحمة ونزلت برآءة لرفع الامان والسيف فيه

اس سورہ کی ابتداء میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے نازل نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بسم اللہ امان و رحمت کے لیے ہے اور یہ سورہ امان کے خاتمے اور تلوار اٹھانے کے لیے ہے۔

[2] مرحوم طبرسی نے امام صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے:

بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ

اس میں کوئی مانع نہیں کہ "بسم اللہ" کے ترک کرنے کی دونوں علتیں ہوں جن میں سے ایک کی طرف پہلی روایت میں اور دوسری کی طرف دوسری روایت میں اشارہ ہوا ہے۔

۵۔ سورہ کی فضیلت اور تعمیری اثرات: اسلامی روایات میں اس سورہ اور سورہ انفال کی تلاوت کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ ان میں سے ایک روایت حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے آپ نے فرمایا:

من قرأ برآئة والانفال فی کل شهر لم یدخله نفاق ابدًا وکان من شیعة امیر المؤمنین حقًا

جو شخص ہر ماہ انفال اور برائت پڑھے اس میں روحِ نفاق داخل نہیں ہوگی اور وہ امیرالمومنین کے حقیقی شیعوں میں سے ہوگا۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ روایات میں مختلف سورتوں کو پڑھنے کی جو بہت زیادہ اہمیت بیان کی گئی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ سوچ بچار کیے بغیر اور عمل کے بغیر بس پڑھ لینے ہی سے غیر معمولی آثار مرتب ہو جائیں گے۔ مثلاً جو شخص برائت اور انفال کے الفاظ ان کے تھوڑے بہت معانی اور مفہوم سمجھے بغیر پڑھے یہ نہیں ہے کہ وہ نفاق سے دور اور حقیقی شیعوں کی صف میں شامل ہو جائے گا بلکہ درحقیقت یہ روایت فرد اور معاشرے کے لیے سورۃ کے تعمیری، اصلاحی اور تربیتی مضامین کے اثر کی طرف اشارہ ہے کہ جو معنی سمجھے بغیر اور عمل کے لیے آمادگی کے بغیر ممکن نہیں ہے ان دونوں سورتوں میں حقیقی مسلمانوں اور منافقوں کی صفوں اور ان کی زندگی کے اصلی خطوط کو واضح کیا گیا ہے اور جو عمل کے مردِ میدان ہیں نہ کہ باتوں کے ان کے راستے کو مکمل طور پر واضح کیا گیا ہے اس بنا پر ان کی تلاوت ان کے مضامین سمجھنے اور عملی زندگی میں انہیں اپنانے پر ہی غیر معمولی اثر پیدا کر سکتی ہے۔

اور جو لوگ قرآن اور اس کی نورانی آیات کو ایک جادو اور منتر کی طرح سمجھتے ہیں درحقیقت وہ اس تربیت کنندہ اور انسان ساز کتاب سے بے گانہ اور ناواقف ہیں۔

جن مختلف نکات کی طرف اس سورۃ میں اشارہ ہوا ہے ان کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

سورہ برائت اور سورہ توحید ستر ہزار ملائکہ کی معیت میں مجھ پر نازل ہوئیں اور ان میں سے ہر ایک ان دونوں سورتوں کی اہمیت کے بارے میں وصیت کرتا تھا۔

۶۔ ایک حقیقت جسے چھپانے کی کوشش ہوتی ہے: تقریباً تمام مفسرین اور مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب یہ سورت ابتدائی آیات کے ساتھ نازل ہوئی اور اس میں ان معاہدوں کو لغو قرار دیا گیا جو مشرکین نے رسول اللہؐ سے کر رکھے تھے تو

بقیہ حاشیہ از صفحہ سابقہ: الانفال وبرآئة واحدة

انفال اور برائت ایک ہی سورہ ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے اس فرمان کی تبلیغ کے لیے یہ سورۃ حضرت ابوبکر کو دی تاکہ وہ حج کے موقع پر مکہ جا کر عوام کے سامنے پڑھیں۔ بعد ازاں یہ سورہ آپؐ نے اُن سے لے کر حضرت علیؑ کو دے دی اور حضرت علیؑ اس تبلیغ پر مامور ہوئے اور انہوں نے مراسمِ حج میں تمام لوگوں کے سامنے ابلاغِ رسالت کی۔

اس واقعہ کی اگرچہ مختلف جزئیات اور شاخیں بیان کی گئی ہیں لیکن اگر ہم ذیل کے چند نکات کی طرف توجہ کریں تو ہم پر حقیقت واضح ہو جائے گی:

۱۔ احمد بن حنبل کی ایک روایت: اہلِ سنت کے مشہور امام احمد ابن حنبل اپنی کتاب مسند میں ابن عباس سے نقل کرتے ہیں:

رسول اللہ نے فلاں شخص (مراد حضرت ابوبکر ہیں جیسا کہ آئندہ روایات میں واضح ہوگا) کو بھیجا اور اسے سورہ توبہ دی (تاکہ حج کے موقع پر وہ اسے لوگوں تک پہنچائے) پھر علیؑ کو اس کے پیچھے بھیجا اور وہ سورہ اس سے لے لی اور فرمایا:

لا یذھب بھآ الا رجل منی و انا منہ

اس سورہ کی تبلیغ صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں[1]

۲۔ احمد بن حنبل کی ایک اور روایت: اسی کتاب میں انس بن مالک سے منقول ہے:

رسول اللہ نے ابوبکر کو سورہ برائت کے ساتھ بھیجا لیکن جب وہ ذی الحلیفہ (جس کا دوسرا نام مسجد شجرہ ہے جو مدینہ سے ایک فرسخ پر واقع ہے) پہنچے تو فرمایا:

لا یبلغھا الا انا او رجل من اھل بیتی فبعث بھا مع علی

اس سورہ کا ابلاغ سوائے میرے یا اس شخص کے جو میرے اہلِ بیت میں سے ہو کوئی نہیں کر سکتا۔ پھر آپ نے وہ سورہ علیؑ کو دے کر بھیجا[2]

۳۔ ایک مزید روایت: اسی کتاب میں ایک اور سند کے ساتھ حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ جب رسول اللہ نے سورہ برائت ان کے ساتھ بھیجی تو آپ نے عرض کیا: میں خطیب نہیں ہوں۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: اس کے بغیر چارہ نہیں کہ میں اسے لے کر جاؤں یا تم۔

حضرت علیؑ نے کہا: جب معاملہ اس طرح ہے تو پھر میں لے کر جاتا ہوں۔

اس پر رسول اللہ نے فرمایا:

انطلق فان اللہ یثبت لسانک و یھدی قلبک

---

[1] مسند احمد جلد ۱ صفحہ ۲۳۱ طبع مصر۔

[2] مسند احمد بن حنبل جلد ۳ صفحہ ۲۱۲۔

جاؤ خدا تمہاری زبان کو ثابت رکھے گا اور دل کو ہدایت کرے گا۔

پھر رسول اللہ نے اپنا ہاتھ علیؑ کے منہ پر رکھا (تاکہ اس کی برکت سے ان کی زبان گویا اور فصیح ہو)۔[1]

۴۔ خصائص نسائی کی روایت: اہل سنت کے مشہور امام نسائی اپنی کتاب خصائص میں زید بن سبیع سے ایک روایت نقل کرتے ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

رسول اللہؐ نے سورہ برائت ابوبکر کے ساتھ اہل مکہ کی طرف بھیجی پھر انہیں (حضرت علیؑ کو) اُن کے پیچھے بھیجا اور کہا: اس سے خط لے لو۔ علیؑ نے راستے میں ابوبکر کو جا لیا اور ان سے خط لے لیا۔ ابوبکر محزون و مغموم واپس آئے اور پیغمبرؐ سے عرض کی: انزل فیّ شیء (کیا میرے بارے میں کوئی آیت نازل ہوئی ہے کہ آپ نے مجھے اس کام سے معزول کر دیا ہے)۔

رسول اللہ نے فرمایا: نہیں اور مزید فرمایا کہ:

الا انی امرت ان ابلغہ انا او رجل من اهل بیتی

(مگر یہ کہ مجھے مامور کیا گیا ہے کہ میں خود تبلیغ کروں یا میرے اہل بیت میں سے کوئی مرد تبلیغ کرے)۔[2]

۵۔ نسائی کی ایک اور روایت: نسائی ہی نے خصائص میں اور سند کے ساتھ عبداللہ بن ارقم سے یوں نقل کیا ہے:

رسول اللہ نے سورہ برائت حضرت ابوبکر کے ساتھ بھیجی جب وہ کچھ راستہ طے کر چکا تو علیؑ کو بھیجا اور انہوں نے ابوبکر سے سورت لے لی اور اسے اپنے ساتھ (مکہ کی طرف) لے گئے اور ابوبکر نے اپنے دل میں ایک طرح کی پریشانی محسوس کی (اور خدمتِ پیغمبرؐ میں پہنچے تو) رسول اللہ نے فرمایا:

لا یؤدی عنی الا انا او رجل منی[3]

۶۔ ابن کثیر کی روایت: مشہور عالم ابن کثیر اپنی تفسیر میں احمد بن حنبل سے اور وہ حنش سے اور وہ حضرت علی علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں:

جس وقت سورہ برائت کی دس آیات رسول اللہ پر نازل ہوئیں تو آپ نے ابوبکر کو بلایا اور انہیں ان آیات کی تلاوت کے لیے اہل مکہ کی طرف بھیجا۔ پھر آپ نے کسی کو بھیج کر مجھے بلوایا اور فرمایا ابوبکر کے پیچھے جاؤ اور جہاں کہیں اس سے جا لو اس سے خط لے لو...... ابوبکر پیغمبرؐ کی طرف پلٹ آئے اور پوچھا کہ کیا میرے بارے میں کوئی چیز نازل ہوئی ہے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا: نہیں ولکن جبرئیل جاءنی فقال لن یؤدی الا انت او رجل منک (لیکن جبرئیل میرے پاس آئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے کہ یہ ذمہ داری آپ

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۱ صفحہ ۱۵۰۔

[2] خصائص نسائی صفحہ ۲۸۔

[3] خصائص نسائی صفحہ ۲۸

یا وہ مرد جو آپ سے ہے کے علاوہ کوئی اور ادا نہیں کرسکتا)[1]

۷۔ ابن کثیر کی ایک اور روایت: بعینہٖ یہی مضمون ابن کثیر نے زید بن یثیغ سے بھی نقل کیا ہے[2]

۸۔ ایک روایت مزید: اہل سنت کے اسی عالم (ابن کثیر) ہی نے اس حدیث کو دوسری سند سے حضرت ابو جعفر محمد بن علی بن حسین بن علی (امام باقرؑ) سے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے[3]

۹۔ علامہ ابن اثیر کی روایت: اہل سنت کے ایک اور عالم ابن اثیر نے جامع الاصول میں ترمذی کی وساطت سے انس بن مالک سے نقل کیا ہے:

رسولؐ اللہ نے سورہ برائت ابوبکر کے ساتھ روانہ کی۔ پھر انہیں بلایا اور فرمایا:

لا ینبغی لاحد ان یبلغ ھٰذہٖ الا رجل من اھلی، فدعا علیًا فاعطاہ ایاہ

کسی کے لیے مناسب نہیں کہ اس سورہ کی تبلیغ کرے مگر وہ شخص جو میرے اہل بیت میں سے ہو۔

پھر آپ نے علیؑ کو بلایا اور سورہ ان کے سپرد کی[4]

۱۰ محب الدین طبری کی روایت: اہل سنت کے عالم محب الدین طبری کتاب ذخائر العقبیٰ میں ابو سعید یا ابو ہریرہ سے نقل کرتے ہیں:

رسول اللہ نے ابوبکر کو امیر حج کی نظارت پر مامور کیا۔ جس وقت وہ ضجنان کے مقام پر پہنچے تو علیؑ کے اونٹ کی آواز سنی اور انہیں پہچان لیا اور سمجھ لیا کہ وہ انہی کی تلاش میں آئے ہیں اور کہا کہ آپ کس لیے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا: خیریت ہی ہے، رسول اللہ نے سورہ برائت کو میرے ساتھ بھیجا ہے۔ اس وقت ابوبکرؓ واپس آگئے (اور پیغام رسانی کی اس تبدیلی پر پریشانی کا اظہار کیا) تو رسول اللہ نے فرمایا:

لا یبلغ عنی غیری او رجل منی یعنی علیًا

میری طرف سے میرے علاوہ کوئی تبلیغ نہیں کرسکتا مگر وہ شخص جو مجھ سے ہے آپ کی مراد علیؑ تھے[5]

دوسری روایات میں تصریح ہوئی ہے کہ رسول اللہ نے اپنا مخصوص اونٹ حضرت علیؑ کو دیا تاکہ اس پر سوار ہو کر آپ مکہ جائیں اور اس دعوت کی تبلیغ کریں۔ اثنائے راہ میں جب ابوبکر نے اونٹ کی آواز سنی تو پہچان لیا۔

---

[1] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صـ۳۳۳۔

[2] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صـ۳۳۳۔

[3] تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صـ۳۳۳۔

[4] جامع الاصول جلد ۹ صـ۴۷۵۔

[5] ذخائر العقبیٰ صـ۶۹۔

یہ روایات اور مندرجہ بالا حدیث دراصل ایک ہی مطلب پیش کرتی ہیں اور وہ یہ کہ وہ اونٹ خود پیغمبر اکرمؐ کا تھا جو اس موقع پر حضرت علی علیہ السلام کو دیا گیا تھا کیونکہ ان کی ذمہ داری نہایت اہم تھی۔

اہل سنت کی دوسری بہت سی کتب میں یہ حدیث بعض اوقات مسند اور گاہے مرسل نقل ہوئی ہے۔ اور یہ ایسی حدیث ہے جس کی اصل میں کسی نے اعتراض نہیں کیا۔

بعض روایات کے مطابق جو طرق اہل سنت سے وارد ہوئی ہیں ان میں کہا گیا ہے کہ حضرت ابوبکر جب ان آیات کی تبلیغ کے منصب سے معزول ہوئے تو "امیر الحاج" کی حیثیت سے گئے اور وہ حج کے معاملے پر نگران تھے۔

توضیح اور تحقیق

یہ حدیث بڑی وضاحت سے حضرت علیؑ کی ایک عظیم فضیلت ثابت کرتی ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کی دوسری احادیث کی طرح یہ بھی سرد مہری کا شکار ہوئی ہے۔ بعض لوگوں کی کوشش ہے کہ اس کی قیمت بالکل گرا دیں یا اس کی اہمیت کم کر دیں۔ اس کے لیے انہوں نے ادھر ادھر بہت ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔ مثلاً

۱۔ کبھی تو مؤلف المنار کی طرح احادیث میں سے صرف وہ حصہ بیان کیا گیا ہے جس میں مراسم حج پر حضرت ابوبکر کی نظارت سے متعلق گفتگو ہے لیکن حضرت ابوبکر سے سورہ برائت لینے کے بارے میں اور وہ گفتگو جو رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کے بارے میں کی ہے سے متعلق خاموشی اختیار کی ہے حالانکہ ان احادیث میں سے اگر بعض اس بارے میں خاموش ہیں تو یہ بات اس امر کی دلیل نہیں بنتی کہ جو احادیث اس سلسلے میں بحث کرتی ہیں ان سب کو نظر انداز کر دیا جائے۔ تحقیقی روش کا تقاضا ہے کہ وہ تمام احادیث پر توجہ دیں چاہے وہ ان کے میلان اور پہلے سے کیے گئے فیصلے کے برخلاف ہی کیوں نہ ہوں۔

۲۔ کبھی کچھ حضرات ان میں سے بعض احادیث کی سند کو ضعیف قرار دیتے ہیں مثلاً وہ حدیث جو سماک اور حنش تک جا پہنچی ہے (اس سلسلے میں بھی مفسر مذکور کا نام بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے) حالانکہ اس حدیث کے ایک یا دو ہی طریق سے سند تو نہیں اور اس کے راوی سماک اور حنش پر ہی تو منحصر نہیں ہیں بلکہ یہ حدیث متعدد طرق سے ان کی معتبر کتب میں آئی ہے۔

۳۔ کبھی بعض لوگ متن حدیث کے بارے میں تعجب انگیز توجیہیں کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں اگر رسول اللہؐ نے سورہ کی تبلیغ کا حکم حضرت علیؑ کو دیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں میں یہ رسم تھی کہ معاہدے کو لغو قرار دینے کا اعلان خود متعلقہ شخص کرے یا اس کے خاندان کا کوئی فرد۔

حالانکہ اول تو متعدد طرق حدیث میں تصریح ہوئی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جبرئیل میرے لیے یہ حکم لے کر آیا ہے یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کے بعض طرق میں جو سطور بالا میں ذکر ہوئے ہیں ہم پڑھتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

اگر تم یہ کام نہ کرو تو پھر مجھے خود یہ کام کرنا پڑے گا۔

تو کیا پیغمبر اکرمؐ کے چچا یا آپ کے رشتہ داروں میں سے کوئی اور مسلمانوں میں موجود نہیں تھا کہ اگر علیؑ رہ جاتے تو پھر خود پیغمبر اکرمؐ ہی یہ اقدام کرتے۔

تیسری بات یہ ہے کہ خود اس امر کے لیے کہ یہ عربوں کی رسم تھی انہوں نے کسی قسم کا کوئی مدرک، حوالہ یا دلیل پیش نہیں کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذکورہ حدیث میں توجیہ کے لیے اپنے بیان کے مطابق تخمینے قائم کیے گئے ہیں۔

چوتھی بات یہ ہے کہ اس حدیث کے بعض معتبر طرق میں ہے:

لا یذھب بھا الا رجل منی و انا منہ

اسے نہیں لے جا سکتا مگر میں یا جو مرد مجھ سے ہو۔

یہ اور اس جیسے اور جملے جو تین روایات میں موجود ہیں نشاندہی کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ حضرت علیؑ کو اپنی طرح اور اپنے آپ کو ان کی طرح جانتے تھے (جیسا کہ آیہ مباہلہ میں آیا ہے)۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر تعصبات اور پہلے سے کیے گئے فیصلے اور ذہنوں میں بٹھائے گئے عقائد ایک طرف کر دیئے جائیں تو ــــــ رسول اللہؐ نے اس کام سے تمام صحابہ پر علیؑ کی فضیلت و برتری کو مشخص و معین کیا ہے۔ "ان ھذا الا بلاغ"

۱۔ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○

۲۔ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ○

ترجمہ

۱۔ خدا اور اس کے رسول کا یہ اعلانِ بیزاری ان مشرکین کے لیے ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا۔

۲۔ اس کے باوجود چار ماہ (تک تمہیں مہلت ہے کہ) زمین میں (آزادانہ) چلو پھرو (اور جہاں چاہو جاؤ اور جو چاہو سوچ بچار کرو) اور جان لو کہ تم خدا کو عاجز و ناتواں نہیں کر سکتے (اور اس کی قدرت سے فرار نہیں کر سکتے اور یہ بھی جان لو) کہ خدا کافروں کو ذلیل و خوار کرنے والا ہے۔

تفسیر

مشرکین کے معاہدے لغو ہو جاتے ہیں

دعوتِ اسلام کے گرد و پیش مختلف گروہ موجود تھے جن میں سے ہر ایک کے ساتھ پیغمبرِ اسلام اس کے حالات مدنظر رکھ کر سلوک کرتے تھے۔

ایک گروہ ایسا تھا کہ جس کا پیغمبرِ اکرم سے کوئی پیمان نہ تھا اور رسول اللہ کا بھی اس سے کوئی عہد و پیمان نہ تھا۔

کچھ دوسرے گروہوں نے حدیبیہ وغیرہ میں رسول اللہ سے دشمنی ترک کرنے کا پیمان باندھ لیا تھا۔ ان معاہدوں میں سے بعض تو معینہ مدت کے حامل تھے اور بعض کی کوئی مدت نہ تھی۔

اس دوران بعض قبائل کہ جنہوں نے پیغمبرِ اسلام سے پیمان باندھا تھا یک طرفہ طور پر بغیر کسی جواز اور وجہ کے اسلام دشمنوں سے واضح طور پر تعاون کر کے اپنے معاہدے توڑ دیئے تھے یا رسولِ اسلام کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے تھے۔ مثلاً بنی نضیر اور بنی قریظہ کے یہودیوں نے یہی طرزِ عمل اختیار کر لیا تھا۔ رسول اللہ نے بھی ان کے مقابلے میں شدتِ عمل کا رویہ اختیار کر لیا تھا اور ان تمام کو مدینہ سے نکال باہر کیا تھا لیکن کچھ معاہدے ایسے تھے جو ابھی تک پوری طرح باقی تھے چاہے وہ محدود مدت والے ہوں یا بغیر مدت کے تعین کے۔

زیرِ نظر پہلی آیت تمام بت پرستوں کے لیے اعلان کرتی ہے کہ ان کا مسلمانوں سے جو معاہدہ ہے وہ لغو ہو گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا اور اس کے پیغمبر کا یہ اعلانِ بیزاری ان مشرکین سے ہے کہ جن کے ساتھ عہد و پیمان باندھا گیا تھا (براءۃ من اللہ ورسولہ الی الذین عاھدتم من المشرکین)۔

اس کے بعد انہیں چار ماہ کی مہلت دی گئی ہے تاکہ وہ اس مدت میں سوچ بچار کر لیں اور اپنی کیفیت کو واضح کر لیں اور چار ماہ بعد یا تو بت پرستی کے مذہب سے دستبردار ہو جائیں یا جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ فرمایا گیا ہے: چار ماہ آزادانہ طور پر زمین میں جہاں چاہو چلو پھرو، لیکن اس کے بعد حالات مختلف ہو جائیں گے (فسیحوا فی الارض اربعۃ اشھر)۔[1]

"لیکن یہ جان لو کہ تم خدا کو ناتواں اور عاجز نہیں کر سکتے اور نہ اس کی قدرت کی قلمرو سے نکل سکتے ہو" (واعلموا انکم غیر معجزی اللہ)۔

نیز یہ بھی جان لو کہ بالآخر خدا کفار و مشرکین اور بت پرستوں کو ذلیل و خوار اور رسوا کر دے گا" (وان اللہ مخزی الکافرین)۔

---

[1] "سیحوا" "سیاحت" کے مادہ سے ہے اس کا معنی ہے اطمینان سے چلنا پھرنا اور گردش کرنا۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ کیا یک طرفہ طور پر معاہدہ کالعدم کر دینا صحیح ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ اسلام میں ایفائے عہد اور معاہدوں کی پابندی کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ ان حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کیونکر یہ حکم دے رہا ہے کہ مشرکین سے کیا گیا معاہدہ یکطرفہ طور پر منسوخ ہو گیا ہے۔

ذیل کے امور کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ جیسے اسی سورہ کی آیت ۰ اور ۸ میں تصریح ہوئی ہے کہ بلاوجہ اور بلا تمہید معاہدوں کو اس طرح لغو قرار نہیں دیا گیا تھا بلکہ ان کی طرف سے معاہدہ توڑنے کے واضح قرائن اور نشانیاں موجود تھیں اور وہ اس بات پر تیار تھے کہ طاقت حاصل ہونے کی صورت میں مسلمانوں سے کیے گئے معاہدوں کی ذرہ بھر پرواہ کیے بغیر ان پر کاری ضرب لگائیں۔

یہ بات بالکل منطقی ہے کہ اگر انسان دیکھے گا کہ دشمن اپنے آپ کو عہد شکنی کے لیے تیار کر رہا ہے اور اس کے اعمال میں ایسی کافی علامات اور قرائن نظر آرہے ہوں تو اس سے پہلے کہ وہ غفلت میں پکڑا جائے معاہدے کی منسوخی کا اعلان کر کے اس کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو معاہدے خاص حالات میں کسی قوم یا ملت پر ٹھونسے جائیں اور وہ انہیں قبول کرنے پر مجبور ہو تو کیا حرج ہے کہ طاقت حاصل ہونے کے بعد ایسے معاہدے یکطرفہ طور پر لغو کر دے۔

بت پرستی کوئی دین تھا نہ کوئی عاقلانہ مکتبِ فکر بلکہ ایک بے ہودہ، موہوم اور خطرناک روش تھی کہ جسے آخر کار معاشرے سے ختم کیا جانا تھا۔ اب اگر بت پرستوں کی طاقت ابتداء میں جزیرۂ عرب میں اس قدر تھی کہ پیغمبر اسلام مجبور تھے کہ ان سے صلح اور عہد و پیمان کریں تو یہ اس امر کی دلیل نہیں کہ طاقت کے حصول کے بعد ایسے ٹھونسے ہوئے عہد و پیمان کہ جو منطق، عقل اور درایت کے خلاف ہیں وہ قائم رہیں۔ یہ بالکل اس طرح ہے کہ ایک حلیم مصلح گاؤ پرستوں میں ظاہر ہو اور اس طریقے کو ختم کرنے کے لیے وسیع تبلیغات شروع کرے اور جب دباؤ میں ہو تو مجبوراً ان سے ترکِ مخاصمت اور ترکِ جنگ کا معاہدہ کرے لیکن جب اس کے کافی پیروکار ہو جائیں تو قیام کرے اور ان کہنہ افکار کو صاف کرنے کے لیے فعالیت کرے اور اپنے معاہدے کے منسوخ ہونے کا اعلان کر دے۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حکم صرف مشرکین کے ساتھ مخصوص تھا اور اہل کتاب یا دیگر قومیں جو جزیرۂ عرب کے اطراف میں آباد تھیں ان سے کیے گئے معاہدوں کا رسول اللہؐ کی آخر عمر تک احترام کیا گیا۔

علاوہ ازیں ہم دیکھتے ہیں کہ مشرکین کے معاہدوں کو غفلت کی حالت میں منسوخ نہیں کر دیا گیا بلکہ انہیں چار مہینوں کی مہلت دی گئی اور حجاز کے عوامی اجتماع کے مرکز میں یعنی عید قربان کے دن خانہ کعبہ کے پاس اس امر سے تمام لوگوں کو باخبر کیا گیا تا کہ انہیں غور و فکر کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مہلت اور موقع مل جائے اور شاید اس طرح وہ اس بے ہودہ مذہب سے دستبردار ہو جائیں جو پس ماندگی، پراگندگی، جہالت اور خباثت کا سبب ہے۔ خدا تعالیٰ ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ انہیں غفلت میں رکھے اور ان سے فکر و نظر کی مہلت سلب کرے یہاں تک کہ اگر وہ اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو انہیں اپنے دفاع کے لیے قوت و طاقت

مہیا کرنے کے لیے کوئی وقت دیا جائے تاکہ وہ ایک غیر عادلانہ جنگ میں گرفتار نہ ہو جائیں۔

اگر پیغمبر اکرمؐ تربیت اور اصولِ انسانی کو ملحوظ نہ رکھتے تو چار ماہ کی مہلت دے کر کبھی دشمن کو بیدار نہ کرتے اور جنگی طاقت مہیا کرنے اور تیاری کے لیے انہیں کوئی وقت نہ دیتے بلکہ کسی ایک دن یکطرفہ طور پر معاہدہ توڑ کر بغیر کسی تمہید کے ان پر حملہ کرکے ان کی بساط اُلٹ دیتے۔

اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے بت پرستوں نے ان چار ماہ کی مہلت سے فائدہ اٹھایا اور اسلامی تعلیمات کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرکے آغوشِ اسلام میں آگئے۔

۲۔ یہ چار مہینے کب سے شروع ہوئے، اس سوال کے جواب میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن جو کچھ مندرجہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے یہ ہے کہ ان کی ابتدا اس وقت ہوئی جب یہ اعلان عام لوگوں کے سامنے پڑھا گیا اور ہم جانتے ہیں کہ یہ عید قربان کے روز دس ذی الحجہ کو پڑھا گیا تھا۔ اس بنا پر اس کی مدت اگلے سال کے ماہ ربیع الثانی کی دس تاریخ کو ختم ہوئی تھی۔ امام صادقؑ سے جو حدیث نقل ہوئی ہے وہ بھی اسی مطلب کی تائید کرتی ہے۔[1]

۳۔ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ
بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ
اِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ ۝
۴۔ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا
وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى
مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

ترجمہ

۳۔ یہ آگاہی ہے خدا اور اس کے پیغمبر کی طرف سے (تمام) لوگوں کو حجِ اکبر (عید قربان) کے دن کہ خدا اور اس

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۰۳۔

کا رسول مشرکین سے بے زار ہے۔ ان حالات میں اگر توبہ کرو تو تمہارے نفع میں ہے اور اگر روگردانی کرو تو جان لو کہ تم خدا کو ناتواں اور عاجز نہیں کر سکتے (اور اس کی قدرت کی قلمرو سے نہیں نکل سکتے) اور کافروں کو دردناک سزا اور عذاب کی خوشخبری دے۔

۴۔ مگر مشرکین میں سے وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے اور اس میں ان سے کوئی فروگزاشت نہیں ہوئی اور تمہارے خلاف انہوں نے کسی کو تقویت نہیں پہنچائی ان کا معاہدہ اس کی مدت ختم ہونے تک محترم شمار کرو کیونکہ خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

تفسیر

جن کا معاہدہ قابلِ احترام ہے

ان آیات میں مشرکین کے معاہدوں کے منسوخ ہونے کی بات بہت زیادہ تاکید کے ساتھ دھرائی گئی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن انہیں آگاہ کرنے کی تاریخ بھی معین کرتے ہوئے کہتا ہے: یہ آگاہی خدا اور اس کے رسول کی طرف سے تمام لوگوں کو حج اکبر کے دن کہ خدا اور اس کا رسول مشرکین سے بیزار ہیں (واذان من اللہ ورسولہٗ[1] الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بریٓءٌ من المشرکین ورسولہٗ)۔

درحقیقت خدا چاہتا ہے کہ سرزمین مکہ میں اس عظیم دن میں عمومی اعلان کے ذریعے دشمن کے لیے بہانہ جوئی کے تمام راستے بند کر دے اور بدگوئی کرنے والوں اور فسادیوں کی زبان کاٹ دے تاکہ یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں غفلت میں رکھا گیا اور ہم پر بزدلانہ حملہ کر دیا گیا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ "الی المشرکین" کی بجائے "الی الناس" کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ یہ نشاندہی کرتی ہے کہ ضروری تھا کہ وہ تمام لوگ جو اس دن مکہ میں تھے یہ پیغام سن لیں تاکہ مشرکین کے علاوہ دوسرے بھی اس امر پر گواہ ہوں۔

اس کے بعد روئے سخن خود مشرکین کی طرف کرتے ہوئے تشویق و تہدید کے ذریعے ان کی ہدایت کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: اگر توبہ کرو اور خدا کی طرف پلٹ آؤ اور بت پرستی کے مذہب سے دستبردار ہو جاؤ تو تمہارے فائدے میں ہے (فان تبتم فھو خیر لکم)۔ یعنی دین توحید کو قبول کرنا تمہارے لیے، تمہارے معاشرے کے لیے اور

---

[1] واذان .... کے جملہ کا عطف "براءۃ من اللہ" پر ہے۔ اس جملے کی ترکیب میں اور احتمالات بھی ہیں لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے وہ زیادہ ظاہر ہے۔

تمہاری دنیا و آخرت کے لیے فائدہ مند ہے اور اگر اچھی طرح سوچ بچار کرلو تو اس کے سائے میں تمہاری تمام بے سروسامانیاں ختم ہوجائیں گی اور یہ نہیں کہ اس میں خدا اور اس کے رسول کا کوئی فائدہ ہے۔

اس کے بعد متعصب اور ہٹ دھرم مخالفین کو تنبیہ کے طور پر کہا گیا ہے: اگر اس فرمان سے جو خود تمہاری سعادت کا ضامن ہے روگردانی کرو تو جان لو کہ تم خدا کو ہرگز عاجز و ناتواں نہیں کرسکتے اور اس کے احاطۂ قدرت سے نہیں نکل سکتے (وان تولیتم فاعلموا انکم غیر معجزی الله) اور اس آیت کے آخر میں ان لوگوں کو جو مقابلے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: بت پرست کافروں کو دردناک عذاب کی بشارت دے (و بشرالذین کفروا بعذاب الیم)۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جاچکا ہے یہ ان مشرکین کے معاہدوں کو یک طرفہ طور پر منسوخ کیا گیا تھا جن سے معاہدہ شکنی پر آمادگی کی نشانیاں ظاہر ہوچکی تھیں۔ لہٰذا بعد والی آیت میں ایک گروہ کو مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: مگر مشرکین کا وہ گروہ کہ جس سے تم نے معاہدہ کیا ہے اور اس نے معاہدے کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی اور نہ ہی تمہارے کسی مخالف کو انہوں نے تقویت پہنچائی ہے (الا الذین عاهدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئا ولم یظاهروا علیکم احدا) ان معاہدے کی مدت تمام ہونے تک اس گروہ کے ساتھ وفا کرو" (فاتموا الیهم عهدهم الی مدتهم)۔

"کیونکہ خدا پرہیزگاروں کو اور انہیں جو ہر قسم کی پیمان شکنی اور تجاوز سے اجتناب کرتے ہیں دوست رکھتا ہے" (ان الله یحب المتقین)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ حجِ اکبر کونسا ہے؟ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ حج اکبر سے مراد کونسا دن ہے اور بہت سی روایات جو اہلِ بیتؑ سے اور اہلِ سنت کے طرق سے منقول ہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دسویں ذی الحجہ اور عید قربان کا دن مراد ہے۔ دوسرے لفظوں میں "یوم النحر" (قربانی کا دن) مراد ہے۔

چار ماہ کی مدت کا ربیع الثانی دس تاریخ کو ختم ہونا اس کے مطابق جو اسلامی منابع اور کتب میں آیا ہے، اس پر ایک اور دلیل ہے۔ علاوہ ازیں عید قربان کے دن اصل میں اعمالِ حج کا اصلی اور بنیادی حصہ ختم ہوجاتا ہے۔ اس بنا پر اسے روز حج کہا جاسکتا ہے۔

باقی رہا یہ کہ اسے "اکبر" کیوں کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سال تمام گروہ چاہے وہ مسلمان ہوں یا بت پرست (اپنے رواج کے مطابق) سب نے مراسم حج میں شرکت کی تھی لیکن یہ کام اس کے بعد بالکل موقوف ہوگیا۔

مندرجہ بالا تفسیر جو کہ اسلامی روایات میں آئی ہے[1] اس کے علاوہ ایک اور تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ اس سے مراد مراسم حج

---

[1] تفسیر نور الثقلین میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

انما سمی الاکبر لانها کانت سنة حج فیها المسلمون والمشرکون ولم یحج المشرکون بعد تلک السنة۔ (جلد ۲ صفحہ ۱۸۶)

ہیں مراسمِ عمرہ کے مقابلے میں کہ جسے "حج اصغر" کہا جاتا ہے۔

کچھ روایات میں یہ تفسیر بھی بیان ہوئی ہے اور کوئی مانع نہیں کہ "حج اکبر" کہنے کی دونوں وجوہ ہوں۔[1]

۲۔ اس روز جن چار چیزوں کا اعلان کیا گیا: قرآن نے خدا کی مشرکین سے بیزاری کو اگرچہ اجمالی طور پر بیان کیا ہے لیکن اسلامی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ لوگوں میں یہ چار اعلانات کر دیں:

۱ مشرکین کے ساتھ معاہدے منسوخ ہو گئے ہیں۔

۲ مشرکین آئندہ سال مراسم حج میں شرکت کا حق نہیں رکھتے۔

۳ ننگے لوگوں کا طواف کرنا ممنوع ہے (یہ کام اس وقت تک مشرکین میں رائج تھا)۔

۴ خانۂ خدا میں مشرکین کا داخلہ ممنوع ہے۔[2]

تفسیر مجمع البیان میں امام محمد باقرؑ سے منقول ہے کہ حضرت علیؑ نے اس سال مراسم حج میں خطبہ پڑھا اور فرمایا: "لا یطوفن بالبیت عریان ولا یحجن البیت مشرک و من کان له مدة فهو الی مدته و من لم یکن له مدة فمدته اربعة اشهر"، کہ حج کے بعد کوئی برہنہ خانۂ خدا کا طواف نہیں کر سکتا اور کوئی بت پرست مراسم حج میں شریک ہونے کا حق نہیں رکھتا۔ وہ لوگ جن کا پیغمبر سے کیا ہوا معاہدہ اپنی مدت باقی رکھتا ہے وہ معاہدہ اپنی معینہ مدت تک قابلِ احترام ہے۔ وہ لوگ جن کے معاہدوں کی میعاد ختم ہو چکی ہے ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔

بعض دوسری روایات میں چوتھے موضوع یعنی بت پرستوں کے خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکنے کی طرف اشارہ ہوا ہے۔[3]

۳۔ کن کا معاہدہ وقتی تھا: مؤرخین اور بعض مفسرین کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی کنانہ اور بنی ضمرہ کے ایک گروہ سے ترکِ مخاصمت اور ترکِ جنگ کے معاہدے کی مدت میں نو ماہ باقی تھے اور چونکہ وہ پیمان کے وفادار رہے تھے اور انہوں نے دشمنانِ اسلام کی مدد نہیں کی تھی للہٰذا رسول اللہ نے بھی معاہدے کی مدت ختم ہونے تک اسے نبھایا۔[4]

بعض دوسرے علماء نے قبیلہ بنی خزاعہ کو بھی اس گروہ کا حصہ قرار دیا ہے کہ جس کا عہد و پیمان ایک مدت کے لیے تھا۔[5]

۵۔ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا

---

[1] اسی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

هو يوم النحر و الاصغر العمرة (جلد ۲ صفحہ ۱۸۰)

[2] بعض روایات میں چوتھا اعلان یہ بیان کیا گیا ہے کہ مشرکین بہشت میں داخل نہیں ہوں گے۔

[3] تفسیر مجمع البیان جلد ۵ زیرِ بحث آیہ کے ذیل میں۔

[4] تفسیر المنار جلد ۱۰ زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

سَبِيۡلَهُمۡ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ‏ ○

۶۔ وَاِنۡ اَحَدٌ مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ اسۡتَجَارَكَ فَاَجِرۡهُ حَتّٰى يَسۡمَعَ كَلٰمَ
اللّٰهِ ثُمَّ اَبۡلِغۡهُ مَاۡمَنَهٗ‌ ؕ ذٰ لِكَ بِاَنَّهُمۡ قَوۡمٌ لَّا يَعۡلَمُوۡنَ ○

ترجمہ

۵۔ جب حرام مہینے ختم ہو جائیں تو مشرکین کو جہاں کہیں پاؤ قتل کر دو اور انہیں قید کر لو اور ان کا محاصرہ کرو اور ہر کمین گاہ میں ان کی راہ میں بیٹھ جاؤ اور جب وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انہیں چھوڑ دو کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۶۔ اور اگر مشرک تم سے پناہ چاہے تو اسے پناہ دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سن سکے (اور اس میں غور و فکر کر سکے) پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دو کیونکہ وہ بے علم اور ناآگاہ گروہ ہے۔

تفسیر

شدت عمل اور سختی ساتھ ساتھ

یہاں مشرکین کے لیے دی گئی چار ماہ کی مہلت ختم ہونے کے بعد مسلمانوں کی ذمہ داری بیان کی گئی ہے اور مشرکین کے بارے میں سخت ترین حکم صادر ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جب حرام مہینے ختم ہو جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو (فاذا انسلخ الاشھر الحرم فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم)[1]

اس کے بعد حکم دیا گیا ہے: "انہیں قید کر لو" (وخذوھم)، "اور ان کا محاصرہ کرو" (واحصروھم) "اور ہر جگہ ان کی کمین میں بیٹھ جاؤ اور ان کے راستے مسدود کر دو" (واقعدوا لھم کل مرصد)[2]۔

یہاں ان کے بارے میں چار سخت احکام نظر آتے ہیں:

۱۔ ان کے راستے مسدود کر دو۔

۲۔ ان کا محاصرہ کرو۔

۳۔ انہیں قید کر لو اور

۴۔ انہیں قتل کر دو۔

---

[1] "انسلخ" مادہ "انسلاخ" سے باہر جانے کے معنی میں ہے اور اس کی اصل ہے "سلخ الشاۃ" یعنی اس نے بکری کو چمڑا اتارا ہے۔

[2] "مرصد" "رصد" کے مادہ سے راہ یا کمین گاہ کے معنی میں ہے۔

ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ چاروں امور ایک حکم تخییری کی صورت میں نہیں ہیں بلکہ گرد و پیش، زمان و مکان اور لوگوں کے حالات وا دو ضاع دیکھ کر فیصلہ کیا جانا چاہیے اور ان امور میں سے جو مناسب سمجھا جائے اس پر عمل کیا جانا چاہیے۔ اگر ان پر دباؤ ڈالنے کے لیے انہیں قید کرنا، ان کا محاصرہ کرنا اور ان کے راستے مسدود کرنا کافی ہو تو یہی طرزِ عمل اختیار کیا جانا چاہیے اور اگر قتل کرنے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار نہ ہو تو انہیں قتل کرنا جائز ہے۔

یہ شدید طرزِ عمل اس بنا پر ہے کہ اسلام کا منصوبہ یہ ہے کہ روئے زمین سے بت پرستی کی جڑ اکھاڑ پھینکی جائے اور جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ آزادیٔ مذہب کا معاملہ یعنی دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کرنا آسمانی ادیان اور اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ وغیرہ پر منحصر ہے اور اس میں بت پرست شامل نہیں ہیں کیونکہ بت پرستی کوئی دین و مذہب نہیں کہ جس کا احترام کیا جائے بلکہ یہ تو پستی، بے ہودگی، کجروی اور بیماری ہے جسے ہر حالت میں اور ہر قیمت پر جڑ سے نکال پھینکنا چاہیے۔

لیکن یہ شدت و سختی اس معنی میں نہیں کہ ان کے لیے لوٹ آنے کا راستہ ہی بند کر دیا جائے بلکہ وہ جس حالت میں اور جس وقت چاہیں اپنی جہت اور نظریہ بدل سکتے ہیں لہٰذا فوراً ہی مزید حکم دیا گیا ہے: اگر وہ توبہ کریں، حق کی طرف پلٹ آئیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انہیں چھوڑ دو اور ان سے مزاحمت نہ کرو (فان تابوا و اقاموا الصلوٰة و اٰتوا الزکوٰة فخلوا سبیلهم)۔ اور اس صورت میں پھر وہ باقی مسلمانوں سے بالکل مختلف نہیں ہیں اور تمام احکام اور حقوق میں ان کے ساتھ شریک ہیں کیونکہ "خدا بخشنے والا اور مہربان ہے" اور جو کوئی اس کی طرف پلٹ آئے وہ اسے اپنے درِ رحمت سے نہیں دھتکارتا (ان الله غفور رحیم)۔

ایک اور حکم کے ذریعے اگلی آیت میں اس موضوع کی تکمیل کی گئی ہے تاکہ اس میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہ جائے کہ اس حکم سے اسلام کا ہدف توحید اور حق و عدالت کے دین کو عام کرنا ہے نہ کہ استعمار و استثمار اور دوسروں کے اموال اور زمینوں پر قبضہ کرنا لہٰذا فرمایا گیا ہے: اگر کوئی بت پرست تم سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دو تاکہ وہ خدا کی بات سنے (و ان احد من المشرکین استجارك فاجره حتی یسمع کلام الله)۔ یعنی ان سے انتہائی نرمی کا سلوک کرو اور انہیں سوچ بچار کا موقع دو تاکہ وہ آزادانہ طور پر تمہاری دعوت کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرے اب اگر اس کے دل میں نورِ ہدایت چمکا تو اسے قبول کرے گا۔ مزید فرمایا گیا ہے: "مدتِ مطالعہ ختم ہونے پر اسے اس کی جائے امان تک پہنچا دو" تاکہ اثنائے راہ میں کوئی اس سے متعرض نہ ہو (ثم ابلغه مأمنه)۔

آخر میں اس اسلامی حکم کی علت یوں بیان کی گئی ہے: یہ اس لیے ہے کہ وہ بے خبر اور بے علم گروہ ہے (ذٰلك بانهم قوم لایعلمون)۔

اس بنا پر اگر علم و آگہی کے حصول کے دروازے ان پر کھل جائیں تو یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ بت پرستی سے جو کہ جہالت و نادانی کی پیداوار ہے نکل آئیں اور خدا اور توحید کی راہ پر گامزن ہو جائیں جو کہ علم و دانش کا تقاضا ہے۔

شیعہ اور سنی کتب میں منقول ہے:

> جب بت پرستوں کے معاہدے منسوخ ہونے کا اعلان ہو گیا تو ایک بت پرست نے حضرت علیؑ سے کہا: اے فرزندِ ابوطالب! اگر یہ چار مہینے گزر جانے کے بعد ہم میں سے کوئی شخص پیغمبر سے ملاقات کرنا چاہے اور ان کے سامنے کچھ مسائل پیش کرے یا خدا کا کلام سنے تو کیا وہ امان میں ہے؟
>
> حضرت علیؑ نے فرمایا: ہاں کیونکہ خدا فرماتا ہے:

وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ ......

اس طرح سے پہلی آیت سے جو بہت زیادہ سخت معلوم ہوتی ہے دوسری آیت کے نرمی کے ساتھ مل کر ایک اعتدال کی صورت پیش کرتی ہے تربیت کا طریقہ یہی ہے کہ ہمیشہ سختی اور نرمی کو باہم ملایا جاتا ہے تاکہ اس سے ایک شفا بخش معجون تیار کی جائے

چند اہم نکات

۱۔ "اشہر حرم" سے یہاں کیا مراد ہے؟ اگرچہ مفسرین نے یہاں بہت کچھ کہا ہے لیکن گذشتہ آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ظاہری مفہوم یہ نکلتا ہے کہ یہ وہی مہلت کے چار مہینے ہیں جو مشرکین کے لیے مقرر کیے گئے ہیں جن کی ابتداء دس ذی الحجہ ۹ھ سے ہوتی ہے اور انتہا ۱۰ ربیع الثانی ۱۰ھ کو ہوتی ہے۔ بہت سے محققین نے اسی تفسیر کو اپنایا ہے اور زیادہ اہمیت کی بات اس ضمن میں یہ ہے کہ کئی ایک روایات میں بھی اس کی تصریح ہوئی ہے۔[1]

۲۔ کیا نماز اور زکوٰۃ قبولیت اسلام کی شرط ہے؟ مندرجہ بالا آیات سے پہلی نظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بت پرستوں کی توبہ کی قبولیت کے لیے نماز اور زکوٰۃ ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی بناء پر اہلِ سنت کے بعض فقہاء نے نماز اور زکوٰۃ ترک کرنے کو کفر کی دلیل سمجھا ہے۔

لیکن حق یہ ہے کہ ان دو عظیم اسلامی احکام کے ذکر کا مقصد یہ ہے کہ وہ تمام مواقع جہاں اسلام کا دعویٰ مشکوک نظر آئے جیسا کہ اس زمانے میں بت پرستوں کے معاملے میں عام طور پر ایسا ہی تھا، وہاں ان دو عظیم اسلامی فرائض کی انجام دہی کو ان کے اسلام کی نشانی سمجھا جائے۔

یا ہو سکتا ہے یہ مراد ہو کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کو دو خدائی قوانین کے طور پر قبول کریں اور ان کے سامنے سر جھکائیں اور انہیں باقاعدہ تسلیم کریں اگرچہ عملی طور پر وہ کوتاہی کرتے ہوں۔ یہ مفہوم اس لیے سمجھا گیا ہے کیونکہ ہمارے پاس بہت سے دلائل موجود ہیں کہ انسان صرف نماز یا زکوٰۃ ترک کرنے سے کفار کی صف میں شمار نہیں کیا جا سکتا اگرچہ اس کا اسلام بہت ہی ناقص ہوتا ہے۔

البتہ اگر ترک زکوٰۃ اسلامی حکومت کے خلاف قیام کے طور پر ہو تو وہ سبب کفر ہے لیکن یہ ایک الگ بحث ہے جو ہمارے زیر بحث موضوع سے مربوط نہیں ہے۔

۳۔ ایمان علم کا ثمر ہے: مندرجہ بالا آیات سے یہ نکتہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بے ایمانی کا اہم عامل جہالت ہے اور ایمان کا بنیادی سرچشمہ علم و آگہی ہے لہٰذا لوگوں کی ہدایت کے لیے ضروری ہے کہ انہیں مطالعہ اور غور و فکر کے کافی وسائل مہیا کیے جائیں تاکہ وہ راہ حق کو سمجھ سکیں نہ یہ کہ اندھا دھند اور کورانہ تقلید میں اسلام قبول کریں۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۱۰۳ اور تفسیر فخر الدین رازی جلد ۱۵ صفحہ ۲۲۶۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۱۸۳ زیر بحث آیت کے ذیل میں اس ضمن میں چند احادیث نقل کی گئی ہیں۔

۷۔ كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ
عَاهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا
لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○

۸۔ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ
يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ
فٰسِقُوْنَ ○

۹۔ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ
سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

۱۰۔ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ
الْمُعْتَدُوْنَ ○

ترجمہ

۷۔ مشرکین کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے ہاں کس طرح عہدوپیمان ہوگا (جب کہ وہ بار ہا اپنا معاہدہ توڑنے کے لیے تیار ہوئے ہیں) مگر وہ کہ جن کے ساتھ تم نے مسجد الحرام کے پاس معاہدہ کیا ہے (یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے معاہدے کو محترم سمجھا ہے) جب تک وہ تمہارے ساتھ وفادار رہیں تم بھی وفاداری کرو کیونکہ خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔

۸۔ کس طرح (ان کے معاہدے کی کوئی قدروقیمت ہو) حالانکہ اگر وہ تم پر غالب آجائیں تو نہ تم سے رشتہ داری کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ عہدوپیمان کا۔ اپنی زبان سے تو تمہیں خوش رکھتے ہیں لیکن ان کے دل انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔

۹۔ انہوں نے خدا کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ ڈالا اور (لوگوں کو) اس کی راہ سے منحرف کردیا۔ وہ برے اعمال بجالاتے تھے۔

۱۰۔ (نہ صرف تمہارے بارے میں بلکہ) ہر با ایمان شخص کے بارے میں وہ رشتہ داری اور عہد و پیمان کا لحاظ نہیں رکھتے اور وہ تجاوز کرنے والے ہیں۔

تفسیر

حد سے بڑھ جانے والے پیمان شکن

جیسا کہ آپ گذشتہ آیات میں دیکھ چکے ہیں کہ ایک خاص گروہ کے علاوہ اسلام نے تمام مشرکین اور بت پرستوں کے معاہدوں کو فسخ کردیا۔ انہیں صرف چار ماہ کی مہلت دی گئی تاکہ وہ اپنا ارادہ واضح کریں۔ اب ان محل بحث آیات میں اس کام کی علت بیان کی گئی ہے۔ پہلے استفہام انکاری کے طور پر قرآن کہتا ہے: کیسے ممکن ہے کہ خدا اور اس کے رسول کے ہاں مشرکوں کا کوئی پیمان ہو (کیف یکون للمشرکین عھد عند اللہ وعند رسولہ)۔ یعنی وہ ان اعمال اور ایسے غلط افعال کے ہوتے ہوئے یہ توقع نہ رکھیں کہ پیغمبر یک طرفہ طور پر ان کے معاہدوں کی پابندی کریں گے۔ اس کے بعد فوراً ہی ایک گروہ جو ان کے غلط کردار اور پیمان شکنی میں شریک نہیں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: مگر وہ لوگ کہ جن کے ساتھ تم نے مسجد الحرام کے پاس عہد کیا (الا الذین عاھدتم عند المسجد الحرام)۔ "جب تک یہ لوگ تمہارے ساتھ کیے گئے اپنے معاہدے کے وفادار رہیں تو تم بھی عہد نبھاؤ" (فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم) کیونکہ خدا پرہیزگاروں اور ان لوگوں کو جو ہر قسم کی پیمان شکنی سے اجتناب کرتے ہیں دوست رکھتا ہے (ان اللہ یحب المتقین)۔

اگلی آیت میں یہی بات زیادہ وضاحت اور تاکید سے بیان ہوئی ہے اور دوبارہ استفہام انکاری کی صورت میں کہا گیا ہے کیسے ممکن ہے کہ ان کے پیمان کا احترام کیا جائے حالانکہ اگر وہ آپ پر غالب آجائیں تو نہ تو تم سے کسی رشتہ داری کا لحاظ کریں گے اور نہ عہد و پیمان کا پاس کریں گے (کیف وان یظھروا علیکم لا یرقبوا فیکم الا ولا ذمۃ)۔

"ال" "رشتہ داری اور عزیزداری" کے معنی میں ہے۔ بعض نے اس کا معنی "عہد و پیمان" بیان کیا ہے۔ پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ قریش اگرچہ رسول اللہ اور کچھ مسلمانوں کے رشتہ دار تھے لیکن جب وہ خود اس بات کی ذرہ بھر پرواہ بھی نہیں کرتے اور رشتہ داری کا احترام نہیں کرتے تو پھر کیسے یہ توقع رکھتے ہیں کہ رسول اللہ اور مسلمان ان کا لحاظ کریں اور دوسری صورت میں لفظ "ذمۃ" کی تاکید ہے کہ جو عہد و پیمان کے معنی میں شمار ہوتا ہے۔

راغب کتاب مفردات میں اس لفظ کی اصل "الیل" بمعنی درخشندگی اور روشنائی قرار دیتا ہے کیونکہ مستحکم معاہدے اور نزدیک

کی رشتہ داریاں خاص درخشندگی کی حامل ہوتی ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: ان کی دلنشین باتوں اور بظاہر خوبصورت الفاظ سے کبھی دھوکا نہ کھانا کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اپنے منہ سے راضی کریں لیکن ان کے دل اس کا انکار کرتے ہیں (یرضونکم بافواھھم و تأبی قلوبھم)۔ ان کے دل کینہ، انتقام جوئی، سنگدلی، عہد شکنی اور رشتہ داری سے بے اعتنائی سے معمور ہیں اگرچہ وہ اپنی زبان سے دوستی اور محبت کا اظہار کرتے ہیں۔

آیت کے آخر میں اس امر کی بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: اور ان میں سے زیادہ تر فاسق اور نافرمان ہیں (واکثرھم فسقون)۔

اگلی آیت میں ان کے فسق اور نافرمانی کی ایک نشانی کی اس طرح وضاحت کی گئی ہے: انہوں نے آیاتِ خدا کو کم قیمت پر سودا کیا ہے اور اپنے وقتی مادی اور حقیر مفادات کے لیے لوگوں کو راہِ خدا سے باز رکھا ہے (اشتروا بایات اللہ ثمنا قلیلا فصدوا عن سبیلہ)۔

ایک روایت میں اس طرح آیا ہے کہ ابوسفیان نے ایک کھانا تیار کیا اور کچھ لوگوں کو دعوت دی تاکہ اس طریقے سے رسول اللہ کے خلاف ان کی عداوت کو ابھار سکے۔

بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیت کو اس واقعے کی طرف اشارہ سمجھا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ آیت کا ایک وسیع مفہوم ہے جس میں یہ واقعہ اور ان بت پرستوں کے دیگر واقعات بھی شامل ہیں کہ جنہوں نے اپنے وقتی مادی مفادات کی حفاظت کے لیے آیاتِ خدا سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔

بعد میں مزید فرمایا گیا ہے: وہ کس قدر برا عمل بجا لاتے ہیں (انھم ساء ما کانوا یعملون) انہوں نے خود کو بھی سعادت، ہدایت اور خوش بختی سے محروم کیا اور دوسروں کے لیے بھی سدِ راہ ہوئے اور اس سے بدتر کون سا عمل ہوگا کہ انسان اپنے گناہ کا بوجھ بھی اپنے دوش پر لے اور دوسروں کے گناہوں کا وزن بھی خود ہی اٹھالے۔

زیر نظر آخری آیت میں گذشتہ گفتگو کی پھر تاکید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے: یہ مشرک ایسے ہیں کہ اگر ان کے ہاتھ پہنچ سکیں تو کسی صاحب ایمان شخص کے بارے میں یہ رشتہ داری اور پیمان کا تھوڑا سا بھی پاس نہیں کریں گے (لا یرقبون فی مؤمن الا ولا ذمۃ)۔

کیونکہ اصولی طور پر یہ لوگ تجاوز اور زیادتی کرنے والے ہیں (واولئک ھم المعتدون) صرف تمہارے بارے میں ہی ان کا یہ رویہ نہیں بلکہ جس شخص پر بھی ان کا بس چلے گا یہ دستِ تجاوز دراز کریں گے۔

مندرجہ بالا آیت کا مضمون اگرچہ گذشتہ آیات کی بحث کی تاکید معلوم ہوتا ہے لیکن پھر بھی ایک فرق اور اضافہ موجود ہے اور وہ یہ کہ گذشتہ آیات میں گفتگو پیغمبر اکرم کے اصحاب اور ان مسلمانوں کے بارے میں تھی جو آپ کے گرد و پیش تھے لیکن اس آیت میں ہر صاحبِ ایمان شخص کے بارے میں بات ہو رہی ہے یعنی صرف تم ان کی نگاہ میں کوئی خصوصیت نہیں رکھتے بلکہ جو شخص بھی مومن ہو اور آئینِ توحید کا پیروہو یہ اس کے سخت دشمن ہیں اور پھر کسی چیز کا لحاظ نہیں کرتے لہٰذا اصل میں یہ ایمان اور حق کے دشمن ہیں اور یہ ایسا ہی ہے جیسے قرآن بعض گذشتہ اقوام کے بارے میں کہتا ہے:

و ما نقموا منھم الا ان یؤمنوا باللہ العزیز الحمید

وہ صرف اس بناء پر مومنین پر سختی کرتے تھے کہ وہ عزیز و حمید خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ (بروج۔ ۸)

دو اہم نکات

۱۔ "الا الذین عاھدتم عند المسجد الحرام" سے کون مراد ہیں؟ اس جملے میں معاہدے فسخ کرنے کے اعلان سے ایک گروہ کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اس سے کونسا گروہ مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن گذشتہ آیات کی طرف توجہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے وہی قبائل مراد ہیں جو اپنے عہد و پیمان کے وفادار رہے یعنی بنو ضمرہ اور بنو خزیمہ وغیرہ جیسے قبائل۔ درحقیقت یہ جملہ گذشتہ آیات کی تاکید کی حیثیت رکھتا ہے یعنی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ بیدار رہیں اور ان گروہوں کا معاملہ ان سے مختلف رکھیں جن کے معاہدے فسخ ہو گئے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ "جنہوں نے مسجد الحرام کے پاس معاہدہ کیا ہے" اس سے کیا مراد ہے؟

ممکن ہے کہ یہ اس بناء پر ہو کہ صلح حدیبیہ کے وقت مسلمانوں نے مشرکین مکہ کے ساتھ سرزمین حدیبیہ پر جو معاہدہ کیا تھا اس میں مشرکین عرب میں سے دوسرے گروہ بھی شامل ہو گئے تھے مثلاً وہ قبائل جن کی طرف سطور بالا میں اشارہ ہوا ہے اور یہ مقام مکہ سے پندرہ میل کے فاصلے پر ہے اور یہ معاہدہ ۶ ہجری میں ہوا۔ ان مشرکین نے اس معاہدے کے ذریعے مسلمانوں سے ترک مخاصمت کا عہد کیا لیکن مشرکین قریش نے اپنا معاہدہ توڑ دیا اور پھر فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہو گئے جب کہ ان سے وابستہ دوسرے گروہ مسلمان تو نہ ہوئے مگر معاہدہ بھی نہ توڑا اور چونکہ سرزمین مکہ اپنے اطراف میں ایک وسیع علاقہ پر مشتمل ہے جس کا نصف قطر تقریباً ۴۸ میل بنتا ہے لہٰذا یہ تمام علاقے مسجد الحرام کا جزء سمجھے جاتے ہیں چنانچہ سورہ بقرہ کی آیہ ۱۹۶ میں حج تمتع اور اس کے احکام کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

ذٰلك لمن لم يكن اهله حاضري المسجد الحرام

یہ احکام اس شخص سے مربوط ہیں کہ جس کا گھر اور گھر والے مسجد الحرام کے پاس نہ ہوں۔

روایات اور فقہا کے فتاویٰ کی تصریح کے مطابق حج تمتع کے احکام ان لوگوں کے لیے ہیں کہ جن کا فاصلہ مکہ سے ۴۸ میل سے زیادہ ہو۔ اس بناء پر کوئی مانع نہیں کہ صلح حدیبیہ جو مکہ سے ۱۵ میل کے فاصلے پر انجام پائی "عند المسجد الحرام" کے عنوان سے ذکر ہو۔

رہی وہ بات جو بعض مفسرین نے کہی ہے کہ مندرجہ بالا استثنیٰ مشرکین قریش سے مربوط ہے اور قرآن مجید نے ان کے معاہدے کو جو انہوں نے حدیبیہ میں کیا تھا محترم شمار کیا ہے، درست نظر نہیں آتی کیونکہ پہلے تو مشرکین قریش کی معاہدہ شکنی قطعی اور مسلم تھی۔ اگر وہ پیمان شکن نہیں تھے تو پھر کون پیمان شکن تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے چھٹے سال کا ہے جب کہ مشرکین قریش نے آٹھویں سال فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا اس لیے مندرجہ بالا آیات جو ہجرت کے نویں سال میں نازل ہوئیں وہ ان کے متعلق نہیں ہو سکتیں۔

۲۔ کیا پیمان شکنی کے ارادے پر ہی پیمان لغو کر دیا گیا؟ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ مندرجہ بالا آیات سے یہ مراد نہیں کہ انہوں نے صرف پیمان شکنی کا ارادہ ہی کیا تھا اور جب مسلمانوں کو طاقت و قدرت حاصل ہو گئی تو مشرکین کا پیمان شکنی کا ارادہ ہی معاہدے کے لغو قرار دیئے جانے کا جواز بن گیا بلکہ وہ بارہا اپنے اسی طرز فکر کا عملی مظاہرہ کر چکے تھے کہ جب بھی انہیں موقع ملے گا تو وہ

معاہدے کی طرف توجہ کیے بغیر مسلمانوں پر ضرب کاری لگائیں گے اور یہی صورتِ حال معاہدے کو لغو کرنے کے لیے کافی ہے۔

۱۱۔ فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي
الدِّينِ ۗ وَنُفَصِّلُ الْآيٰتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝
۱۲۔ وَإِنْ نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ مِنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوا فِي دِينِكُمْ فَقَاتِلُوا
أَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ إِنَّهُمْ لَا أَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُونَ ۝
۱۳۔ أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ
وَهُمْ بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَوْهُ
إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝
۱۴۔ قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ
عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ ۝
۱۵۔ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللّٰهُ
عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

ترجمہ

۱۱۔ اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اور ہم اپنی آیات کی تشریح ایسے لوگوں کے لیے کرتے ہیں جو جانتے ہیں۔

۱۲۔ اور اگر وہ معاہدے کے بعد اپنے عہد و پیمان کو توڑ دیں اور تمہارے دین پر طعن و طنز کریں تو آئمہ کفر سے جنگ کرو اس لیے کہ ان کا کوئی عہد و پیمان نہیں، شاید وہ دستبردار ہو جائیں۔

۱۳۔ کیا اس گروہ کے ساتھ کہ جس نے اپنا عہد و پیمان توڑ دیا ہے اور جو (شہر سے) پیغمبر کے اخراج کا پختہ ارادہ

کر چکے ہیں تم جنگ نہیں کرتے ہو حالانکہ پہلے انہوں نے (تم سے جنگ کی) ابتدا کی تھی، کیا ان سے ڈرتے ہو جب کہ خدا زیادہ سزاوار ہے کہ اس سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔

۱۴۔ ان سے جنگ کرو کہ خدا انہیں تمہارے ہاتھوں سزا دینا چاہتا ہے اور انہیں رسوا کرے گا اور مومنین کے ایک گروہ کے سینہ کو شفا بخشے گا (اور ان کے دل پر مرہم رکھے گا)۔

۱۵۔ اور ان کے دلوں کے غیظ و غضب کو لے جائے گا اور خدا جس شخص کی چاہتا ہے (اور اسے اہل سمجھتا ہے) توبہ قبول کر لیتا ہے اور خدا عالم و حکیم ہے۔

تفسیر

دشمن سے جنگ کرنے سے کیوں ڈرتے ہو

فصاحت و بلاغت کے فنون میں سے ایک یہ ہے کہ زیادہ اہمیت رکھنے والے مطالب کی تاکید کے لیے اور انہیں دل میں اتارنے کے لیے تکرار کی جاتی ہے۔ چونکہ اسلامی ماحول میں بت پرستی کے پیکر پر آخری ضرب لگانے اور اس کے بچے کھچے آثار ختم کرنے کا معاملہ بہت ہی اہم تھا اس لیے گذشتہ مطالب کو قرآن مجید میں مندرجہ بالا آیات میں نئے انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ان میں نئے نکات بھی موجود ہیں جو صورت تکرار سے بات کو نکال لیتے ہیں اگرچہ یہ تکرار درست ہی کیوں نہ ہو۔

پہلے ارشاد فرمایا گیا ہے، اگر مشرکین توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں (فان تابوا و اقاموا الصلوٰۃ و اٰتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین)۔

آیت کے آخر میں مزید کہا گیا ہے، ہم ان لوگوں کے لیے اپنی آیات کی تشریح کرتے ہیں جو علم و آگاہی رکھتے ہیں (و نفصل الاٰیات لقوم یعلمون)۔

گذشتہ آیات میں اس بارے میں گفتگو تھی کہ اگر وہ توبہ کریں اور نماز اور زکوٰۃ کے اسلامی فرائض بجا لائیں تو ان سے مزاحمت نہ کرو۔

فخلّوا سبیلھم

لیکن یہاں فرمایا گیا ہے، وہ تمہارے دینی بھائی ہیں یعنی دیگر مسلمانوں اور ان کے درمیان احترام و محبت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں جیسا کہ بھائیوں کے درمیان فرق نہیں ہوتا۔

یہ بات مشرکین کی روح، فکر اور جذبات کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے بہت مؤثر ہے کہ ایک مرحلے میں مزاحمت

ترک نے کی تلقین کی گئی ہے اور دوسرے مرحلے میں ان کے بارے میں ایک بھائی کے سے حقوق کی سفارش کی گئی ہے۔

لیکن اگر وہ اسی طرح اپنی عہد شکنی جاری رکھیں اور اپنے معاہدے روندڈالیں اور تمہارے دین کی مذمت کریں اور اپنا غلط پراپیگنڈا جاری رکھیں تو پھر تم اس کافر گروہ کے پیشواؤں سے جنگ کرو (وان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمۃ الکفر)۔ کیونکہ اب ان کے عہد و پیمان کی کچھ بھی قدر و قیمت نہیں ہے (انھم لا ایمان لھم)۔

یہ درست ہے کہ انہوں نے تم سے دشمنی ترک کرنے کا معاہدہ کررکھا ہے لیکن وہ یہ معاہدہ بار بار توڑ چکے ہیں اور آئندہ بھی اسے توڑنے کو تیار ہیں لہٰذا اس صورت میں اس معاہدے کا کوئی اعتبار اور قیمت نہیں ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ وہ اس شدتِ عمل پر نظر رکھیں اور اس طرف بھی توجہ دیں کہ ان کے لیے بازگشت کا راستہ کھلا ہوا ہے، وہ اپنے کیے پر نادم ہوں اور اس سے دستبردار ہو جائیں (لعلھم ینتھون)۔

اس سے اگلی آیت میں مسلمانوں میں تحریک پیدا کرنے کے لیے اور اس حیات بخش حکم کے سلسلے میں ان کی روح اور فکر سے ہر طرح کی سستی اور خوف و تردد دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے: تم ان لوگوں سے جنگ کیوں نہیں کرتے جنہوں نے اپنے معاہدے توڑ دیے ہیں اور انہوں نے پیغمبر کو اپنی سرزمین سے نکال دینے کا پختہ ارادہ کرلیا ہے (الا تقاتلون قوما نکثوا ایمانھم وھموا باخراج الرسول)۔

تم نے جنگ کی اور معاہدے کو لغو قرار دینے کی ابتداء نہیں کی کہ تم پریشان اور ناراحت ہو بلکہ "جنگ اور پیمان شکنی کی ابتداء تو انہوں نے کی ہے" (وھم بدءوکم اول مرۃ)۔

اور اگر تم میں سے بعض کا جنگ سے تردد خوف و ہراس کی وجہ سے ہے تو بالکل بے جا ہے "کیا تم ان بے ایمان افراد سے ڈرتے ہو حالانکہ خدا زیادہ سزاوار ہے کہ اس سے اور اس کی مخالفت سے ڈرو، اگر تم سچ مچ ایمان رکھتے ہو" (اتخشونھم فاللہ احق ان تخشوہ ان کنتم مؤمنین)۔

اگلی آیت میں مسلمانوں سے یقینی کامیابی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ان سے جنگ کرو کہ خدا انہیں تمہارے ہاتھوں سزا دے گا (قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم)۔ نہ صرف سزا دے گا بلکہ "انہیں رسوا اور ذلیل و خوار کرے گا (ویخزھم)۔ اور تمہیں ان پر کامیاب کرے گا (وینصرکم علیھم) اور اس طرح سے مومنین کے ایک گروہ کے دلوں کو شفا بخشے گا جو اس سنگدل گروہ کے دباؤ اور سخت مصیبت میں تھا اور اس راہ میں قربانیاں دے چکا تھا" اور ان کے دل کے زخموں پر اس طرح سے مرہم رکھے گا" (ویشف صدور قوم مؤمنین)۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ "قوم مومنین" سے مراد بنی خزاعہ کے مومنین کا ایک گروہ ہے جن پر قبیلہ بنی بکر کے بت پرستوں کے ایک گروہ نے بزدلانہ حملہ کیا تھا اور غفلت میں انہیں نقصان پہنچایا تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ یمن کے ایک گروہ کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے اسلام قبول کرلیا تھا لیکن جب مکہ میں آئے تو بت پرستوں کی طرف سے ان پر ظلم و ستم ڈھایا گیا ہے۔

بعید نہیں کہ یہ عبارت ان تمام لوگوں کے بارے میں ہو جو کسی طرح بھی بت پرستوں کی طرف سے ظلم اور ایذاء کا ہدف بنے

اور بت پرستوں نے جن کے دلوں کا خون کیا۔

اگلی آیت میں مزید کہا گیا ہے کہ تمہاری کامیابی اور ان کی شکست کے ذریعے "مومنین کے دلوں کا غیظ و غضب ٹھنڈا کرے گا" (ویذھب غیظ قلوبھم)۔ ہوسکتا ہے یہ جملہ گذشتہ جملے "ویشف صدور قوم مؤمنین" کی تاکید کے طور پر ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مختلف ہو اور گذشتہ جملہ اس طرف اشارہ ہو کہ اسلام کی کامیابی کے ذریعے وہ دل جو سالہا سال سے اسلام اور رسول اسلام کے لیے تڑپتے تھے ناراحت، پریشان اور بیمار تھے وہ اچھے ہو جائیں گے اور دوسرا جملہ اس طرف اشارہ ہو کہ وہ دل جو عزیز و اقرباء کو کھو دینے اور طرح طرح کے آزار اور ظلم سہنے کی وجہ سے ناراحتی اور بے آرامی میں تھے سنگدل دشمنوں کے مارے جانے سے راحت و آرام حاصل کریں گے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: خدا جس شخص کو چاہتا ہے (اور مصلحت دیکھتا ہے) اس کی توبہ قبول کرلیتا ہے (ویتوب اللہ علٰی من یشآء) اور خدا توبہ کرنے والوں کی نیتوں سے آگاہ ہے اور اس نے ان کے لیے اور پیمان شکنوں کے بارے میں جو احکام دیئے ہیں وہ حکیمانہ اور با مصلحت ہیں (و اللہ علیم حکیم)۔

ضمنی طور پر آخری جملے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ممکن ہے آئندہ ان میں سے بعض در توبہ میں داخل ہو جائیں لہٰذا متوجہ رہیں کہ خدا ان کی توبہ قبول کرے گا اور ان کے بارے میں شدت عمل جائز نہیں ہے نیز یہ ایک بشارت ہے کہ آئندہ اس قسم کے افراد مسلمانوں کی طرف آئیں گے اور ان کی روحانی آمادگی کی وجہ سے خدا کی توفیق ان کے شامل حال ہوگی۔

بعض مفسرین نے ان آخری آیات کو قرآن کی غیب کی خبروں میں سے قرار دیا ہے اور انہیں رسول اللہ کی دعوت کی صداقت کی نشانی سمجھا ہے کیونکہ ان میں جو کچھ قرآن نے بیان کیا ہے ویسا ہی عملاً ہوا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ عہد شکن گروہ کونسا ہے: اس گروہ سے کون سے افراد مراد ہیں، اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ بعض اسے یہودیوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔ بعض ان قوموں کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں جو بعد از اں مسلمانوں سے برسرپیکار ہوئیں مثلاً ایران اور روم کی حکومتیں۔ بعض یہاں کفار قریش مراد لیتے ہیں اور بعض نے ان افراد کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو مسلمان ہو کر مرتد ہوگئے۔

لیکن آیات کا ظاہر واضح گواہی دیتا ہے کہ موضوع سخن مشرکین اور بت پرستوں کا وہی گروہ ہے جس نے اس وقت بظاہر مسلمانوں سے دشمنی ترک کرنے کا عہد و پیمان کر رکھا تھا لیکن عملی طور پر اپنے معاہدے توڑ چکا تھا اور یہ اطراف مکہ یا جزیرہ کے باقی علاقوں کے مشرکین کا گروہ تھا۔

یہ احتمال کہ اس سے یہودی مراد ہوں بہت بعید ہے کیونکہ ان آیات کی تمام مباحث مشرکین کے گرد گھومتی ہیں۔

اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ اس سے مراد قبیلہ قریش ہو کیونکہ قریش اور ان کے سرغنہ ابوسفیان نے ۸ھ ہجری فتح مکہ کے بعد ظاہراً اسلام قبول کر لیا تھا جب کہ زیر بحث سورت ۹ھ ہجری میں نازل ہوئی ہے۔

نیز یہ احتمال بھی آیات کے مفہوم سے بہت بعید معلوم ہوتا ہے کہ ایران اور روم کی حکومتیں مراد ہوں کیونکہ آیات ایک موجود معاملے اور جنگ کے متعلق گفتگو کررہی ہیں نہ آئندہ کے کسی معاملے یا لڑائی جھگڑے کے متعلق۔ علاوہ ازیں انہوں نے رسول اللہ کو وطن سے بھی نہیں نکالا تھا۔

نیز یہ احتمال بھی بہت بعید ہے کہ اس سے مراد مرتدین ہوں کیونکہ اس وقت تاریخ مرتدین کے کسی طاقتور گروہ کی نشاندہی نہیں کرتی کہ جس سے مسلمان جنگ کرنا چاہتے ہوں۔ علاوہ ازیں لفظ "ایمان" (جو "یمین" کی جمع ہے) اور اسی طرح لفظ "عہد" ظاہراً ترکِ مخاصمت کے پیمان کے معنی میں ہے نہ کہ اسلام قبول کرنے کے معنی میں (غور کیجئے گا)۔

لہٰذا اگر بعض اسلامی روایات میں یہ آیت جنگ جمل کی آگ بھڑکانے والوں (ناکثین) اور ان جیسیوں پر منطبق کی گئی ہے تو وہ اس بنا پر نہیں کہ یہ آیات ان کے بارے میں نازل ہوئی ہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ آیت کی روح اور اس کا حکم ناکثین اور ان سے مشابہت رکھنے والے ایسے گروہوں پر صادق آتا ہے جو ان کے بعد ہوں گے۔

صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ اگر اس سے مراد وہ معاہدہ شکن بت پرست لوگ ہیں کہ جن کے متعلق گذشتہ آیات میں گفتگو ہوئی ہے تو یہاں کیوں کہا گیا ہے کہ: وان نکثوا ایمانھم (یعنی — اگر وہ اپنے معاہدوں کو توڑ دیں) حالانکہ انہوں نے تو عملاً اپنے عہد و پیمان توڑ دیئے تھے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ جملے سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ عہد شکنی جاری رکھیں اور اپنے کام سے دستبردار نہ ہوں تو پھر تمہیں ان سے جنگ کرنا چاہیے۔ جیسے ہم "اھدنا الصراط المستقیم" کا معنی کرتے ہیں کہ "خدایا! ہمیں اسی طرح سیدھے راستے پر گامزن رکھ اور ہماری ہدایت برقرار اور جاری رکھ"۔

ہماری اس بات کا شاہد یہ ہے کہ "ان نکثوا ایمانھم" کا جملہ "ان تابوا" کے مدمقابل ہے یعنی معاملہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہے۔ یا وہ توبہ کریں گے اور شرک و بت پرستی سے دستبردار ہو جائیں گے اور راہِ خدا پر آجائیں گے یا یہ کہ وہ اپنے طور طریقے جاری رکھیں گے۔ پہلی صورت میں وہ تمہارے بھائی ہیں جب کہ دوسری صورت میں تمہیں ان سے جنگ کرنا چاہیے۔

۲۔ کفر کے پیشواؤں سے جنگ: یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں یہ نہیں کہا گیا کہ کافروں سے جنگ کرو بلکہ فرمایا گیا ہے کہ ان کے لیڈروں اور پیشواؤں کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ عام لوگ تو اپنے لیڈروں اور زعماء کے پیروکار ہوتے ہیں لہٰذا نشانہ ہمیشہ پیشواؤں کو ہونا چاہیئے۔ تمہیں گمراہی، ضلالت اور ظلم و فساد کے سرچشموں کو بند کرنا چاہیے اور ایسے درختوں کی جڑوں کو کاٹنا چاہیے۔ جب تک وہ خود موجود ہیں ان کے پیروکاروں سے مقابلے اور جنگ کا کوئی فائدہ نہیں۔

علاوہ ازیں یہ تعبیر ایک طرح کی بلند نظری، عالی ہمتی اور شجاعت و مردانگی کی دلیل ہے کہ اصل مدمقابل پر نظر رکھی جائے۔ لہٰذا کہا گیا ہے کہ اپنے تئیں ان سے مقابلے کے لیے تیار کرو نہ کہ ان کے چھوٹے چھوٹے افراد سے مقابلے کے لیے۔

تعجب کی بات ہے کہ بعض نے اس تعبیر سے سردارانِ قریش کی طرف اشارہ سمجھا ہے حالانکہ ان میں سے کچھ تو جنگ بدر میں مارے گئے تھے اور (ابوسفیان جیسے) جو باقی رہ گئے تھے وہ فتح مکہ کے بعد ظاہراً اسلام لے آئے تھے اور جب یہ آیت نازل

ہوئی تو وہ مسلمانوں کی صفوں میں شامل تھے لہٰذا اس وقت ان سے مقابلے کا کوئی مفہوم ہی نہ تھا۔

آج بھی قرآن کا یہ اہم حکم اپنی پوری قوت سے باقی ہے کہ ظلم و فساد اور استعمار و استثمار کو ختم کرنے کے لیے ان کے سرغنوں اور پیشواؤں کے مقابلے میں اٹھ کھڑا ہونا چاہیے اور عام لوگوں کے مقابلے میں قیام کا کوئی فائدہ نہیں (غور کیجئے گا)

۳۔ اخوانکم فی الدین کا مفہوم: مندرجہ بالا آیات میں یہ ایک لطیف ترین تعبیر ہے جسے ایک معاشرے کے افراد میں مساوات کے لیے بیان کیا جا سکتا ہے اور یہ محبت و مہربانی کا محکم ترین رشتہ ہے کیونکہ واضح ترین اور نزدیک ترین رشتہ جو انسانوں میں مکمل مساوات کا حامل ہے وہ دو بھائیوں کا رشتہ ہے۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے طبقاتی شگافوں اور قومی و نسلی بتوں نے اس اسلامی اخوت کو ختم کر دیا ہے جو تمام دشمنوں کے لیے رشک اور حسد کا باعث تھا۔ کل کے بھائی آج ایک دوسرے سے اس طرح سے صف آرا ہیں کہ یقین نہیں آتا۔ بعض اوقات تو ایک دوسرے کو یوں قتل کرتے ہیں کہ جیسا سلوک ایک دشمن دوسرے دشمن سے نہیں کرتا۔ ہماری موجودہ پسماندگی کے اسرار میں سے ایک یہ صورتِ حال بھی ہے۔

۴۔ "اتخشونھم" کا مفہوم: اس کا مطلب ہے "کیا تم ان سے ڈرتے ہو"۔ اس سے اجمالی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو جہاد کے اس حکم سے ڈرتا تھا یا تو دشمن کی طاقت اور قوت سے خوفزدہ تھا یا پھر پیمان شکنی کے گناہ سے ڈرتا تھا۔

قرآن انہیں صراحت سے جواب دیتا ہے کہ تمہیں ان کمزور انسانوں سے نہیں ڈرنا چاہیے بلکہ حکمِ پروردگار کی نافرمانی سے ڈرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں اپنی پیمان شکنی سے ڈرنا بے جا ہے کیونکہ انہوں نے پہلے ہی خود اس کے مقدمات فراہم کر دیئے ہیں اور اس سلسلے میں انہی نے پیش قدمی کی ہے۔

۵۔ "ھموا باخراج الرسول" کا مطلب: اس کا معنی ہے "انہوں نے پیغمبر کو نکالنے کا ارادہ کیا"۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ ظاہراً یہ ہجرت کے موقع پر رسول اللہ کو مکہ سے مدینہ کی طرف نکالے جانے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ پہلے ہی ارادہ رکھتے تھے اس کے بعد ان کا ارادہ بدل گیا اور پھر انہوں نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا لیکن اللہ کے حکم سے رسول اللہ اسی رات مکہ سے نکل آئے۔ بہر حال اس معاملے کا ذکر ان کی پیمان شکنی کے طور پر نہیں بلکہ بت پرستوں کے جرائم میں سے ایک ہولناک ارادے کی وضاحت کے طور پر ہے کہ جس میں قریش بھی شریک تھے اور دوسرے قبائل بھی ورنہ بت پرستوں کی عہد شکنی تو دوسرے طرق سے واضح ہو چکی تھی۔

۶۔ ایک غلط استدلال: ایک تعجب خیز بات یہ ہے کہ جبری مکتبِ فکر کے پیروکاروں نے قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم سے اپنے نظریہ کے لیے استدلال کیا ہے حالانکہ اگر ہم اپنا ذہن تعصبات سے خالی کریں تو مندرجہ بالا آیت ان کے مقصود پر ذرہ بھر بھی دلالت نہیں کرتی اور اس کی صورت بالکل ایسی ہے جیسے ہم کسی کام کے لیے اپنے ایک دوست کے پاس جائیں اور کہیں کہ ہمیں امید ہے کہ خدا اس کام کی اصلاح تمہارے ہاتھ سے کرے گا۔ اس بات کا یہ مفہوم نہیں کہ تم یہ کام کرنے میں مجبور ہو بلکہ مراد یہ ہے کہ خدا نے اسے تمہارے اختیار میں رکھا ہے اور تمہیں پاک نیت دی ہے کہ جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تم ارادے کی

آزادی سے یہ کام انجام دے سکتے ہو۔

۱۶۔ اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تُتۡرَكُوۡا وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَلَمۡ يَتَّخِذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوۡلِهٖ وَلَا الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَلِيۡجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ع

ترجمہ

۱۶۔ کیا تم یہ گمان رکھتے ہو کہ تمہیں (تمہاری حالت پر) چھوڑ دیا جائے گا جب کہ ابھی جہاد کرنے والے اور خدا اور اس کے رسول کو چھوڑ کر محرم راز بنانے والے ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز نہیں ہوئے (تمہاری آزمائش ہونا چاہیے تاکہ تمہاری صفیں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں) اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے۔

تفسیر

اس آیت میں مسلمانوں کو ایک اور طریقے سے جہاد کی تشویق و ترغیب دلائی گئی ہے اس سلسلے میں ان کی اہم ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ تمہیں یہ تصور نہیں کرنا چاہیے کہ صرف ایمان کا دعویٰ کرنے سے تمام چیزیں درست اور ٹھیک ہو جاتی ہیں بلکہ صدق نیت، گفتار کی درستی اور ایمان کی حقیقت دشمنوں سے جنگ کر کے واضح ہوتی ہے، جنگ بھی ایسی جو ہر قسم کے نفاق سے پاک مخلصانہ طور پر ہو۔

پہلے فرمایا گیا ہے: کیا تم گمان کرتے ہو کہ تمہیں تمہاری حالت پر چھوڑ دیا جائے گا اور تم میدانِ آزمائش میں سے نہیں گزرو گے جب کہ ابھی تم میں سے مجاہدین اور وہ لوگ جنہوں نے خدا، رسول اور مومنین کو چھوڑ کر کسی اور کو محرم راز بنایا ہے ایک دوسرے سے مشخص اور ممتاز نہیں ہوئے (ام حسبتم ان تترکوا ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ولم یتخذوا من دون اللہ ولا رسولہ ولا المؤمنین ولیجۃ)۔[1]

"ولیجۃ" مادہ "ولوج" سے داخل ہونے کے معنی میں ہے اور ایسے اشخاص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی انسان کا محرم راز ہو اور اس کے کاموں کو چلانے والا ہو۔ اس کا معنی تقریباً "بطانۃ" جیسا ہے۔

---

[1] "ام" حرف عطف ہے۔ اس کے ذریعے ایک استفہامی جملے کو دوسرے استفہامی جملے سے ملاتے ہیں اور اس طرح سے وہ استفہام کا معنی دیتا ہے البتہ وہ ہمیشہ دوسرے استفہام کے پیچھے ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں اس کا عطف "الا تقاتلون ...." کے جملے پر ہے جو کہ ۱۳ ایں گزرا ہے۔

درحقیقت مندرجہ بالا جملہ مسلمانوں سے دو مطالب گوش گزار کرتا ہے اور وہ یہ کہ صرف اظہار ایمان سے کام ٹھیک نہیں ہوتے اور افراد کی شخصیت واضح نہیں ہوتی بلکہ اس سلسلے میں دو طرح سے لوگوں کی آزمائش کی جاتی ہے:

ایک تو راہ خدا میں شرک و بت پرستی کے آثار مٹانے کے لیے جہاد کرنا اور

دوسرا منافقوں اور دشمنوں سے ہر طرح کا رابطہ اور ہمکاری ترک کرنا کہ جس میں سے پہلا کام ہے خارجی دشمنوں کو باہر نکالنا ہے اور دوسرا ہے داخلی دشمنوں کو باہر نکالنا۔

«لما یعلم اللہ» (حالانکہ ابھی تک خدا نہیں جانتا) ـــ اس جملے کی نظیر دوسری آیات قرآنی میں بھی نظر آتی ہے۔ دراصل اس کا معنی ہے «ابھی تک ثابت نہیں ہوا» اور ایسی تعبیر عموماً تاکید کے مواقع میں استعمال ہوتی ہے ورنہ دلائل عقلی اور بہت سی آیات کے مطابق خدا تو ایسی تمام چیزوں سے آگاہ تھا، آگاہ ہے اور آگاہ رہے گا۔

یہ آیت درحقیقت سورہ عنکبوت کی پہلی آیت جیسی ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا اٰمنا وھم لایفتنون

کیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے گا اور ان کی آزمائش نہیں ہوگی۔

نیز جیسا کہ سورہ آلِ عمران کی تفسیر میں ہم کہہ چکے ہیں کہ خدائی آزمائشیں کوئی انجانی چیز جاننے کے لیے نہیں ہیں بلکہ تربیت، فروغِ استعداد اور انسان کی اندرونی صلاحیتوں اور اسرار کو ابھارنے اور آشکار کرنے کے لیے ہیں۔

آیت کے آخر میں خطرے سے خبردار کرتے ہوئے اور تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: جو کام بھی تم انجام دیتے ہو خدا اس سے باخبر ہے (واللہ خبیر بما تعملون)۔ مبادا کچھ لوگ یہ خیال کر بیٹھیں کہ خدا منافقین اور دشمنوں سے ان کے خفیہ روابط سے بےخبر ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ وہ سب چیزوں کو اچھی طرح سے جانتا ہے اور اس کے مطابق اپنے بندوں سے سلوک کرے گا۔

آیت کے طرزِ بیان سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے اسلامی ماحول میں کچھ لوگ نووارد تھے اور نفسیاتی طور پر وہ جہاد کے لیے تیار نہیں تھے، یہ گفتگو ان کے بارے میں ہے ورنہ سچے مجاہدین تو بارہا جہاد کے میدانوں میں اپنی کیفیت واضح کر چکے تھے۔

۱۷۔ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ
بِالْكُفْرِؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ
خٰلِدُوْنَ○

۱۸۔ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ

الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰٓی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِیْنَ ○

ترجمہ

۱۷۔ مشرکین یہ حق نہیں رکھتے کہ وہ خدا کی مسجدوں کو آباد کریں حالانکہ اپنے کفر کے ذریعے وہ اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں انہی کے اعمال نابود (اور بے قیمت) ہو گئے ہیں اور وہ (جہنم کی) آگ میں ہمیشہ رہیں گے۔

۱۸۔ اللہ کی مساجد کو صرف وہ شخص آباد کرتا ہے جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے، نماز قائم کرتا ہے زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور خدا کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتا، ہو سکتا ہے ایسا گروہ نجات پا جائے۔

تفسیر

مسجدیں آباد رکھنا ہر کسی کے بس میں نہیں

جب مشرکین سے معاہدہ فسخ ہونے کا اور ان سے جہاد کرنے کا حکم ملا تو اس کے بعد بعض لوگوں میں جو ممکنہ باتیں زیر بحث آسکتی تھیں ان میں سے ایک سوال بھی ممکن تھا کہ اس عظیم گروہ کو ہم کیوں دور کر دیں اور انہیں مراسم حج کی ادائیگی کے لیے مسجد الحرام میں قدم رکھنے کی اجازت کیوں نہ دیں حالانکہ ان میں ان کی شرکت ہر لحاظ سے رونق کا سبب ہے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مسجد الحرام کی عمارت میں رونق کی صورت میں ان کی طرف سے ایک اہم امداد حاصل ہے اور معنوی آبادی کے طور پر بھی ان کی طرف سے ایک کمک حاصل تھی کیونکہ خانہ کعبہ کے گرد ان کی جمعیت زیادہ ہے۔ مندرجہ بالا آیات ایسے بے ہودہ اور بے بنیاد افکار کا جواب دیتی ہیں پہلی ہی آیت میں تصریح کی گئی ہے، مشرکین یہ حق نہیں رکھتے کہ وہ اللہ کی مساجد کو آباد کریں جب کہ وہ صراحت سے اپنے کفر کی گواہی دیتے ہیں (ما کان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللہ شاھدین علی انفسھم بالکفر)۔

ان کا اپنے کفر کی گواہی دینا ان کی باتوں سے بھی آشکار ہے اور ان کے اعمال سے بھی، یہاں تک کہ ان کا طرز عبادت اور ان کے مراسم حج بھی اس امر پر شاہد ہیں۔

اس کے بعد اس حکم کی دلیل اور فلسفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، ایمان نہ رکھنے کی وجہ سے ان لوگوں کے اعمال نیست و نابود اور برباد ہو جائیں گے اور خدا کی درگاہ میں وہ کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے (اولٰئک حبطت اعمالھم)۔

اسی بناء پر وہ ہمیشہ کے لیے جہنم کی آگ میں رہیں گے (وفی النار ھم خالدون)

ان حالات میں نہ تو مسجد الحرام وغیرہ کی آبادی اور تعمیر کے لیے ان کی کوششیں کوئی قدر و قیمت رکھتی ہیں اور نہ ہی خانہ کعبہ کے

اطراف میں ان کا اژدحام کوئی حیثیت رکھتا ہے۔

خدا پاک اور منزہ ہے اور اس کے گھر کو بھی پاک و پاکیزہ ہونا چاہیے اور غلیظ اور گندے لوگوں کا ہاتھ خانہ خدا اور مسجد سے بالکل دور ہوجانا چاہیے۔

اگلی آیت میں اس گفتگو کی تکمیل کے لیے مساجد اور مراکز عبادت کو آباد کرنے والوں کے لیے پانچ اہم شرائط بیان کی گئی ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے، صرف وہ لوگ اللہ کی مساجد کو آباد کرتے ہیں جو خدا اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں (انما یعمر مساجد اللہ من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر)۔ اس میں پہلی اور دوسری شرط کی طرف اشارہ ہے۔ یہ شرائط اعتقادی اور بنیادی پہلو رکھتی ہیں۔ جب تک یہ دونوں نہ ہوں انسان سے کوئی بھی پاک، شائستہ اور خالص عمل سرزد نہیں ہوسکتا بلکہ اگر ظاہراً شائستہ ہو بھی تو باطن طرح طرح کی ناپاک اغراض سے آلودہ ہوگا۔

اس کے بعد تیسری اور چوتھی شرط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے (و اقام الصلوٰۃ واٰتی الزکوٰۃ) یعنی خدا اور روزِ جزا پر اس کا ایمان فقط دعویٰ کی حد تک اور زبانی نہ ہو بلکہ وہ اپنے پاک اعمال کے ذریعے اس کی تائید کرے۔ اس کا خدا سے رشتہ بھی مستحکم ہو اور نماز کو صحیح طریقے سے انجام دے، مخلوقِ خدا سے بھی اس کا تعلق ہو اور زکوٰۃ ادا کرے۔

آخر میں آخری شرط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے، اور خدا کے علاوہ کسی سے نہ ڈرے (و لم یخش الا اللہ)۔

اس کا دل عشقِ خدا سے معمور ہو اور صرف اس کے فرمان کے سامنے احساسِ ذمہ داری رکھتا ہو اور اس کے مقابلے میں کمزور بندوں کو اس سے بہت چھوٹا سمجھتا ہو کہ وہ اس کی سرنوشت، اس کے معاشرے، اس کے مستقبل، اس کی کامیابی، اس کی پیش رفت اور آخر میں اس کے مرکزِ عبادت کی آبادی میں کوئی تاثیر رکھتے ہوں۔

آخر میں مزید فرمایا گیا ہے، یہ گروہ جو ایسی صفات کا حامل ہے ہوسکتا ہے کہ ہدایت پالے اور اپنے مقصد تک پہنچ جائے اور مساجدِ خدا کی تعمیر اور آبادی کے لیے کوشش کرے اور اس کے عظیم نتائج سے بہرہ ور ہو (فعسیٰ اولٰئک ان یکونوا من المھتدین)۔

چند اہم نکات

۱۔ **مساجد کی آبادی سے کیا مراد ہے؟** کیا مساجد کی آبادی سے مراد ان کی تاسیس و تعمیر ہے یا ان میں اجتماع کرنا اور ان کے اجتماعات میں شرکت مراد ہے؟ اس آیت کو عمران مساجد کی آیت کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر کے سلسلے میں ان دو میں سے صرف ایک کو انتخاب کیا ہے حالانکہ اس لفظ کا مفہوم وسیع ہے جس میں یہ تمام امور شامل ہیں۔

مشرکین اور بت پرست نہ تو مساجد میں شرکت کا حق رکھتے ہیں اور نہ ہی ان کی تعمیر کا بلکہ یہ تمام امور مسلمانوں کے ہاتھوں انجام پانا چاہئیں۔

ان آیات سے ضمنی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو نہیں چاہیے کہ وہ مساجد کی تعمیر کے لیے مشرکین کی بلکہ غیر مسلموں میں سے کسی کی بھی مدد حاصل کریں کیونکہ پہلی آیت اگرچہ مشرکین کے بارے میں گفتگو کرتی ہے لیکن دوسری آیت کہ جو لفظ "انما" سے شروع ہوتی ہے مسجدوں کی تعمیر کو مسلمانوں کے ساتھ مخصوص کر دیتی ہے۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مساجد کے متولی اور نگران بھی پاکیزہ ترین افراد میں سے منتخب ہونے چاہییں نہ کہ ناپاک اور برے لوگ مال و ثروت، مقام و منصب یا معاشرے میں اثر و رسوخ کی وجہ سے منتخب ہو جائیں جیسا کہ بدقسمتی سے بعض علاقوں میں رائج ہے کہ ایسے لوگ ان مراکزِ عبادت اور اسلامی اجتماعات کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں۔ تمام ناپاک ہاتھوں کو ان تمام مقدس مراکز سے منقطع کیا جانا چاہیے۔ جس دن سے جابر حکمرانوں، گناہ آلود سرمایہ داروں اور بدکرداروں نے مساجد اور اسلامی مراکز کی تعمیر میں ہاتھ ڈالا ہے اس دن سے ان کی روحانیت اور اصلاحی پروگرام مسخ ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اب ایسی بہت سی مساجد نے مسجدِ ضرار کی صورت اختیار کر لی ہے۔

۲۔ عمل صالح کا سرچشمہ صرف ایمان ہے: ہو سکتا ہے بعض لوگ یہ سوچتے ہوں کہ اس میں کیا حرج ہے کہ غیر مسلموں کے سرمائے سے ان مراکز کی تعمیر اور آبادی کے لیے فائدہ اٹھایا جائے لیکن جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ اس بنیادی نکتے کی طرف توجہ نہیں کرتے کہ اسلام ہر مقام پر عمل صالح کو شجرِ ایمان کا ثمر شمار کرتا ہے۔ عمل ہمیشہ انسان کی نیت اور عقیدے کا سایہ ہوتا ہے اور وہ ہمیشہ اس کی شکل و صورت اور رنگ ڈھنگ کو اپناتا ہے۔ ناپاک نیتوں سے ممکن نہیں کہ پاک عمل وجود میں آئے اور اس کا نتیجہ اور ثمر مفید صورت میں نکلے کیونکہ عمل نیت کی بازگشت ہے۔

۳۔ بہادر محافظ: "لم یخش الا اللہ" (خدا کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتا) یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ مساجد کی تعمیر، آبادی اور نگہداری شجاعت و بہادری کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ مقدس اسلامی مراکز انسان سازی کے مراکز اور تربیت کی اعلیٰ درس گاہوں میں اسی صورت میں تبدیل ہوں گے جب ان کے بانی اور محافظ بہادر اور شجاع ہوں گے کہ جو خدا کے علاوہ کسی سے نہ ڈرتے ہوں گے، کسی مقام و مرتبہ اور قوت و طاقت سے متاثر نہیں ہوں گے اور جو ان میں خدائی پروگراموں کے علاوہ کوئی کام نہیں ہونے دیں گے۔

۴۔ کیا اس سے صرف مسجد الحرام مراد ہے: بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیات کو مسجد الحرام سے مخصوص قرار دیا ہے جب کہ آیت کے الفاظ عام ہیں اور ایسی تخصیص کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے اگرچہ مسجد الحرام جو کہ عظیم ترین اسلامی مسجد ہے اس کا مصداقِ اول ہے اور جب یہ آیت نازل ہوئی تھی زیادہ تر یہی مسجدِ محلِ نظر تھی لیکن یہ بات تخصیصِ آیات کی دلیل نہیں بن سکتی۔

۵۔ تعمیرِ مساجد کی اہمیت: مسجد بنانے کی اہمیت کے بارے میں اہلِ بیتِ رسول علیہم السلام سے اور اہلِ سنت کے طرق سے بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ ان سے تعمیرِ مسجد کی بے حد اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

من بنی مسجدا ولو کمفحص قطاۃ بنی اللہ لہ بیتا فی الجنۃ

جو شخص کوئی مسجد بنائے اگرچہ پرندے کے گھونسلے کے برابر ہو تو خدا جنت میں اس کے لیے ایک گھر بنائے گا۔[1]

---

[1] یہ حدیث کتاب وسائل کے باب ۸ میں ہے جو کہ احکام مساجد کے ابواب میں سے ہے اور اسی طرح المنار جلد ۱۰ ص ۲۱۲ پر ابن عباس سے منقول ہے۔

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

من اسرج فی مسجد سراجًا لم تزل الملآئکة وحملة العرش یستغفرون له ما دام فی ذٰلك المسجد ضوئه۔

جو شخص مسجد میں چراغ روشن کرے جب تک اس چراغ کی روشنی رہے گی فرشتے اور حاملینِ عرشِ الٰہی اس کے لیے استغفار اور دعائے خیر کرتے رہیں گے[1]

لیکن آج کے زمانے میں جس چیز کی زیادہ ضرورت ہے وہ مساجد کی معنوی آبادی اور معنوی تعمیر ہے۔ دوسرے لفظوں میں جتنی ہم مسجد بنانے کو اہمیت دیتے ہیں اس سے زیادہ اہلِ مسجد، نگران مسجد اور محافظینِ مسجد کو اہمیت دینا چاہیے۔ ہر طرف سے اسلامی تحریک مسجد سے اٹھنا چاہیے۔ مسجد کو تہذیبِ نفس اور لوگوں کی آگاہی و بیداری کے لیے استعمال ہونا چاہیے۔ ماحول کو پاکیزہ بنانے اور ورثۂ اسلامی کے دفاع کے لیے مسلمانوں کو آمادہ کرنے کا مرکز مسجد کو ہونا چاہیے۔

خصوصیت سے اس طرف توجہ کرنا چاہیے کہ مسجد صاحبِ ایمان نوجوانوں کے لیے مرکز بنے نہ کہ صرف آگے بیٹھنے والوں اور بیکار لوگوں کا مرکز ہی رہے۔ مسجد معاشرے کے فعال ترین طبقوں کا مرکز ہونا چاہیے نہ کہ ناکارہ اور خوابیدہ افراد کا مرکز۔

۱۹۔ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وقف لازم

۲۰۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝

۲۱۔ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ ۙ

۲۲۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

---

[1] کتاب کنز العرفان جلد ۱ صفحہ ۱۰۳ بحوالہ کتاب محاسن صفحہ ۵۷۔

ترجمہ

۱۹۔ کیا حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد الحرام کو آباد کرنے کا عمل اس شخص (کے عمل) کی طرح قرار پا سکتا ہے جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان لایا ہے اور اس نے اُس کی راہ میں جہاد کیا ہے۔ (یہ دونوں) خدا کے ہاں ہرگز برابر نہیں ہیں اور خدا ظالموں کو ہرگز ہدایت نہیں کرتا۔

۲۰۔ وہ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اپنے مال و جان سے راہِ خدا میں جہاد کیا، خدا کے ہاں ان کا مقام و منزلت بلند ہے اور وہ عظیم نعمت پر فائز ہیں۔

۲۱۔ پروردگار انہیں اپنی طرف سے رحمت، خوشنودی اور ایسے باغات بہشت کی بشارت دیتا ہے جن میں ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہیں۔

۲۲۔ وہ ہمیشہ ان باغوں میں (اور ان نعمتوں میں گھرے) رہیں گے کیونکہ خدا کے ہاں عظیم اجر و ثواب ہے

شانِ نزول

مندرجہ بالا آیات کے شانِ نزول کے بارے میں شیعہ اور سُنی کتب میں مختلف روایات نقل ہوئی ہیں۔ ان میں سے جو زیادہ صحیح نظر آتی ہے اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اہلِ سنت کے مشہور عالم حاکم ابو القاسم حسکانی نقل کرتے ہیں کہ شیبہ اور عباس میں سے ہر ایک دوسرے پر افتخار کر رہے تھے اس سلسلے میں ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کر رہے تھے کہ حضرت علیؑ ان کے پاس سے گزرے اور کہا کہ کس چیز پر فخر و مباہات کر رہے ہو۔ عباس نے کہا مجھے ایسا امتیاز حاصل ہے کہ جو کسی کے پاس نہیں اور وہ ہے خانۂ خدا کے حاجیوں کو پانی پلانا۔

شیبہ نے کہا کہ میں مسجد الحرام کو تعمیر کرنے والا ہوں اور (خانہ کعبہ کا کلید بردار ہوں)۔

حضرت علیؑ نے کہا، مجھے شرم آتی ہے کہ میں کم سن ہونے کے باوجود تم پر ایسا افتخار اور امتیاز رکھتا ہوں جو تم نہیں رکھتے۔

انہوں نے پوچھا، وہ کونسا افتخار اور امتیاز ہے؟

آپؑ نے فرمایا: میں نے تلوار سے جہاد کیا یہاں تک کہ تم خدا اور رسول پر ایمان لے آئے۔

عباس غصے میں آکر کھڑے ہو گئے اور دامن کھینچتے ہوئے رسول اللہؐ کی تلاش میں نکلے۔ (آپؐ ملے تو آپؐ سے شکایت کے طور پر) کہنے لگے، کیا آپ دیکھتے نہیں کہ علی مجھ سے اس قسم کی بات کرتا ہے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا، علی کو بلاؤ۔

جب حضرت علی علیہ السلام بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو آنحضرتؐ نے فرمایا: تم نے اپنے چچا (عباس) سے کوئی ایسی بات کیوں کی ہے۔

حضرت علیؑ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر مجھ سے انہیں تکلیف پہنچی ہے تو میں نے تو ایک حقیقت بیان کی تھی۔ کوئی حق بات پر ناراض ہوتا ہے تو ہوا اور کوئی خوش ہوتا ہے تو ہو۔

اس موقع پر جبرئیل نازل ہوئے اور کہا: یا محمد! آپ کے پروردگار نے آپ پر سلام بھیجا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیات ان کے سامنے پڑھیے: اجعلتم سقایۃ الحاج و...... (کیا حاجیوں کو سیراب کرنا اور مسجد الحرام کی آبادی خدا اور روز جزا پر ایمان لانے اور راہِ خدا میں جہاد کرنے کی مانند قرار دیتے ہو، یہ ہرگز ایک دوسرے کے مساوی نہیں ہیں)[1]

یہی روایت مضمون کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ اہلِ سنت کی بہت سی کتب میں منقول ہے۔ مثلاً تفسیر طبری، ثعلبی، اسباب النزول واحدی، تفسیر خازن بغدادی، معالم التنزیل علامہ بغوی، مناقب ابن مغازلی، جامع الاصول ابن اثیر، تفسیر فخر رازی اور دیگر کتب[2]

بہر حال مندرجہ بالا حدیث مشہور و معروف احادیث میں سے ہے۔ یہاں تک کہ متعصب افراد نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ ہم ان آیات کی تفسیر مکمل کر کے دوبارہ اس کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

تفسیر

معیارِ فضیلت

ان آیات کی اگرچہ مخصوص شانِ نزول ہے تاہم یہ گذشتہ آیات کی بحث کی بھی تکمیل کرتی ہیں اور ایسی مثالیں قرآن مجید میں بہت سی ہیں۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: کیا خانہ خدا کے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد الحرام کی تعمیر کرنے کو اس شخص کے کام کی طرح قرار دیتے ہو جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتا ہے اور راہِ خدا میں جہاد کرتا ہے، یہ دونوں خدا کے ہاں کسی طرح بھی برابر اور یکساں نہیں ہیں اور خدا ظالم و ستمگر قوم کو ہدایت نہیں کرتا (اجعلتم سقایۃ الحآج وعمارۃ المسجد الحرام کمن اٰمن باللہ والیوم الاٰخر و جاھد فی سبیل اللہ لا یستوون عند اللہ واللہ لا یھدی القوم الظّٰلمین)۔

"سقایۃ" مصدر بھی ہے جس کا معنی ہے پانی دینا اور اس وسیلے اور پیمانے کے معنی میں بھی ہے جس سے پانی پلاتے ہیں (جیسا کہ سورہ یوسف آیہ ۷۰ میں آیا ہے) نیز یہ بڑے برتن یا حوض کے معنی میں بھی آیا ہے کہ جس میں پانی ڈالتے ہیں۔ مسجد الحرام

---

[1] تفسیر مجمع البیان زیر بحث آیات کے ذیل میں۔

[2] حدیث کی مزید وضاحت کے پہلو اور اس کے مدارک کے مشخصات کے بارے میں احقاق الحق جلد ۳ ص ۱۲۲ تا ص ۱۲۷ کی طرف رجوع فرمائیں۔

میں چاہ زمزم اور خانہ کعبہ کے درمیان ایک جگہ ہے جو " سقایۃ العباس " کے نام سے مشہور ہے وہ یہاں ایک بڑا برتن رکھ دیتے تھے کہ جس میں سے حاجی پانی لیتے تھے۔

تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ اسلام سے پہلے " سقایۃ الحاج " کا منصب خانہ کعبہ کی کلید برداری کے منصب کے ہم پلہ تھا اور اہم ترین منصب شمار ہوتا تھا۔

ایام حج میں حاجیوں کو پانی کی شدید ضرورت ہوتی ہے جب کہ وہ سرزمین بھی ایسی ہے جہاں خشک اور جلا دینے والی گرمی ہے جہاں پانی کم ہے اور سال کے زیادہ تر دنوں میں جہاں گرم ہوا چلتی رہتی ہے۔ اس سے سقایۃ الحاج کے منصب کی خاص اہمیت واضح ہو جاتی ہے اور جو شخص اس معاملے کا سرپرست ہوتا وہ فطری طور پر خاص مقام و حیثیت کا حامل ہوتا کیونکہ حاجیوں کی خدمت ایک زندہ خدمت شمار ہوتی تھی۔

اسی طرح مسجد الحرام کی کلید برداری کا منصب رکھنے والے اور اس کی تعمیر و آبادی کی خدمت انجام دینے والے شخص یا اشخاص کا بے حد احترام کیا جاتا تھا کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں بھی مسجد الحرام کو مقدس ترین اور عظیم ترین مذہبی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔

ان تمام چیزوں کے باوجود قرآن مجید کہتا ہے کہ خدا پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا ان تمام کاموں سے برتر اور بالاتر ہے۔

اگلی آیت میں تاکید اور توضیح کے طور پر فرمایا گیا ہے، جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انہوں نے ہجرت کی ہے اور اپنے مال و جان سے راہِ خدا میں جہاد کر چکے ہیں وہ بارگاہِ خداوندی میں برتر اور عظیم تر مقام رکھتے ہیں (الذین اٰمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجۃ عند اللہ)۔ اور انہوں نے عظیم افتخار و اعزاز حاصل کیا ہے (واولٰئک ھم الفائزون)۔

اگلی آیت میں خدا ان تین اہم کاموں (ایمان، ہجرت اور جہاد) کے بدلے میں ان کے لیے تین اہم انعام بیان کرتا ہے۔

۱۔ انہیں اپنی وسیع رحمت کی بشارت دیتا ہے (یبشرھم ربھم برحمۃ منہ)۔

۲۔ انہیں اپنی رضامندی اور خوشنودی سے بہرہ مند کرتا ہے (ورضوان)۔

۳۔ جنت کے ایسے باغات ان کے اختیار میں دے دیتا ہے کہ جن کی نعمتیں دائمی ہیں (وجنّٰت لھم فیھا نعیم مقیم)۔

اگلی آیت میں زیادہ تاکید کے لیے فرمایا گیا ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان میں رہیں گے (خٰلدین فیھا ابدًا) کیونکہ خدا کے پاس عظیم اجر و ثواب ہے کہ جو وہ بندوں کے اعمال کے بدلے میں انہیں بخشے گا (ان اللہ عندہٗ اجر عظیم)۔

دو اہم نکات

۱۔ تحریف تاریخ: جیسا کہ ہم مندرجہ بالا آیات کی شانِ نزول میں پڑھ چکے ہیں، اس روایت کے مطابق کہ جو بہت سی مشہور ترین کتب اہل سنت میں منقول ہوئی ہے یہ آیات حضرت علیؑ کے بارے میں اور ان کے فضائل میں نازل ہوئی ہیں اگرچہ ان کا مفہوم عام اور وسیع ہے (اور ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ شانِ نزول آیات کے مفہوم کو محدود نہیں کرتی)۔ لیکن بعض مفسرین

اہلِ سنت نہیں چاہتے کہ حضرت علیؑ کے لیے جاذب نظر فضائل ثابت ہوں حالانکہ وہ آپ کو اپنا چوتھا عظیم پیشوا مانتے ہیں۔ گویا وہ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ اگر وہ ان مدارک و مآخذ کے سامنے جو حضرت علیؑ کی بے حد خصوصیات و امتیازات ثابت کرتے ہیں سر تسلیم خم کرلیں تو ممکن ہے شیعہ لوگ ان کے سامنے کھڑے ہو جائیں اور اس بات پر ہر طرف سے ان کا دائرہ تنگ کر دیں کہ کس بنا پر تم دوسروں کو حضرت علیؑ پر مقدم سمجھتے ہو۔ لہٰذا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ تاریخی حقائق سے چشم پوشی کر لیتے ہیں اور جتنا ان سے ممکن ہو ایسی احادیث پر سند کے حوالے سے اعتراضات کرتے ہیں اور اگر سند میں دست اندازی کی کوئی گنجائش نظر نہ آئے تو کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس کی دلالت کو مخدوش کر دیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایسے تعصبات ہمارے اس زمانے تک جاری ہیں یہاں تک کہ ان کے بعض روشن فکر علماء بھی ان سے بچ نہیں سکے۔

میں بھول نہیں سکتا وہ گفتگو جو میری ایک اہلِ سنت عالم سے ہوئی۔ جب بات چیت کے دوران اس قسم کی احادیث پر گفتگو چل نکلی تو انہوں نے ایک عجیب بات کہی۔ انہوں نے کہا: میرا یہ نظریہ ہے کہ شیعہ اپنے مذہب کے تمام اصول و فروع ہمارے منابع، مدارک اور کتب سے ثابت کر سکتے ہیں کیونکہ ان میں مذہب شیعہ کے لیے کافی مقدار میں احادیث موجود ہیں جو ان کے نفع میں ہیں۔

لیکن اس بنا پر کہ وہ ان تمام منابع و مدارک سے بالکل نجات حاصل کر لیں کہنے لگے: میرا نظریہ ہے کہ ہمارے سابقہ لوگ خوش باور افراد تھے اور جن احادیث کو وہ سن لیتے تھے اپنی کتب میں نقل کر دیتے تھے۔ اب ان تمام چیزوں کو جو وہ لکھ گئے ہیں ہم آسانی سے قبول نہیں کر سکتے (واضح ہے کہ ان کی گفتگو ان کی کتب صحاح، مسانیدِ معتبرہ اور درجۂ اوّل کی کتب کے بارے میں بھی تھی)۔

میں نے ان سے کہا: یہ منصفانہ طریقہ نہیں ہے کہ انسان کسی مذہب کو پہلے سے وراثتاً قبول کرلے اور اس کے بعد ہر وہ حدیث جو اس مذہب کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھے اور جو حدیث اس سے تطبیق نہ کرے اسے سابقین کی خوش باوری خیال کرے چاہے وہ معتبر حدیث ہی کیوں نہ ہو، کیا ہی اچھا ہو کہ اس طرز فکر کی بجائے آپ دوسری راہ انتخاب کریں۔ پہلے اپنے آپ کو ہر قسم کے موروثی عقائد سے پاک کریں پھر منطقی مدارک کو سامنے رکھ کر صحیح عقیدے کو اختیار کریں۔

آپ اچھی طرح سے ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ کیوں اور کس بنا پر ان مشہور و معروف احادیث کو جو حضرت علی علیہ السلام کے بلند و برتر مقام کے بارے میں ہیں اور دوسروں پر ان کی برتری ثابت کرتی ہیں کے بارے میں اس طرح سے سرد مہری اختیار کی جاتی ہے بلکہ ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کی جاتی ہے اور بعض اوقات تو انہیں بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور ان کے متعلق سرے سے بات ہی نہیں کی جاتی جیسے اس قسم کی احادیث اصلاً موجود ہی نہ ہوں۔

مندرجہ بالا گفتگو کی روشنی میں اب ہم مشہور مفسر صاحب المنار کی گفتگو بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے زیر نظر آیات کی شانِ نزول کے بارے میں مذکورہ مشہور روایت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اور اس کی بجائے ایک اور روایت جو آیات کے مضمون پر بالکل منطبق نہیں ہوتی اور جسے ایک مخالفِ قرآن روایت کے باعث پھینک دینا چاہیے تھا معتبر جانا ہے۔ یہ روایت وہ ہے جسے انہوں نے نعمان بن بشیر سے نقل کیا ہے۔

نعمان کہتا ہے کہ میں منبرِ رسول کے پاس چند صحابہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک کہنے لگا: میں اسلام لانے کے بعد کسی عمل کو اس سے بلند تر نہیں سمجھتا کہ خانۂ خدا کے حاجیوں کو سیراب کروں۔

دوسرا کہنے لگا: مسجد الحرام کی تعمیر اور اسے آباد کرنا ہر عمل سے بلند تر ہے۔

تیسرا بولا: راہِ خدا میں جہاد کرنا اس سے بہتر ہے جو تم نے کہا ہے۔

حضرت عمر نے انہیں یہ گفتگو کرنے سے منع کیا اور کہا: رسولِ خدا کے منبر کے پاس اپنی آواز بلند کرو، یہ جمعہ کا دن تھا۔

حضرت عمر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: لیکن جب میں نمازِ جمعہ پڑھ لوں گا تو رسول اللہ کے پاس جاؤں گا اور ان سے تمہارے اس مسئلہ کے بارے میں سوال کروں گا جس کے متعلق تم اختلاف کر رہے ہو۔

(نماز کے بعد حضرت عمر رسول اللہ کے پاس گئے اور سوال کیا) تو اس موقع پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں [1]

حالانکہ یہ روایت مختلف جہات سے زیرِ بحث آیات کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی اور ہم جانتے ہیں کہ جو روایت خلافِ قرآن ہو اسے دور پھینک دینا چاہیے۔ مذکورہ روایت کے ضمن میں مندرجہ ذیل پہلو قابلِ غور ہیں:

مندرجہ بالا آیات میں جہاد، سقایۃ الحاج اور تعمیر مسجد الحرام میں موازنہ نہیں ہوا بلکہ موازنہ میں ایک طرف سقایۃ الحاج اور تعمیر مسجد الحرام ہے اور دوسری طرف خدا اور روزِ جزا پر ایمان اور جہاد ہے۔ یہ چیز نشاندہی کرتی ہے کہ کچھ افراد ان اعمال کا جو وہ زمانہ جاہلیت میں انجام دے چکے تھے ایمان اور جہاد سے موازنہ کرتے تھے کہ جن کے بارے میں قرآن صراحت سے کہتا ہے: یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ یہ نہیں کہ جہاد کا موازنہ تعمیر مسجد الحرام اور سقایۃ الحاج سے ہے۔

ب دوسری بات یہ ہے کہ "واللہ لا یھدی القوم الظٰلمین" کا جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ پہلے گروہ کے اعمال ظلم سے ملے ہوئے تھے اور یہ اس صورت میں ہوگا جب وہ حالتِ شرک میں واقع ہوئے ہوں کیونکہ قرآن کہتا ہے:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ (لقمان ۔ ۱۳)

ج زیرِ بحث دوسری آیت کہتی ہے: وہ افراد جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا وہ بلند تر مقام رکھتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ افراد ان لوگوں سے جو ایمان، ہجرت اور جہاد نہیں رکھتے برتر ہیں۔ اور یہ صورت نعمان والی روایت سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ اس روایت کے مطابق گفتگو کرنے والے سب مومن اور مسلمان تھے اور شاید وہ ہجرت اور جہاد کے مرحلے میں شریک ہو چکے تھے۔

---

[1] تفسیر المنار جلد ۱۰ صفحہ ۲۱۵۔

د۔ گذشتہ آیات میں مساجد کی آبادی کے سلسلے میں مشرکین کے اقدام کرنے کے متعلق گفتگو تھی ـــ ماکان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللہ ـــ جب کہ زیرِ بحث آیات جو ان کے بعد آئی ہیں اسی موضوع کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ ان آیات کا موضوعِ بحث حالتِ شرک میں تعمیرِ مسجد الحرام اور سقایۃ الحاج ہے۔ یہ بات نعمان والی روایت کے مطابق نہیں ہے۔

ان تمام دلائل کے مقابلے میں جو بات کہی جاسکتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ "اعظم درجۃ" کی تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ عمل کے موازنہ اور مقابلہ میں شریک طرفین اچھے افراد ہیں اگرچہ ان میں سے ایک دوسرے سے بہتر ہے۔

لیکن اس کا جواب واضح ہے کیونکہ افعل التفضیل (صفت تفضیلی) زیادہ تر ایسے مواقع پر استعمال ہوتی ہے کہ جب موازنہ کی ایک طرف واجد فضیلت اور دوسری طرف صفر ہو مثلاً اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کہتے ہیں کہ دیر سے پہنچنا بالکل نہ پہنچنے سے بہتر ہے اب اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ مقصد تک بالکل نہ پہنچنا اور نابودی اچھی چیز ہے لیکن دیر سے پہنچنا اس سے بہتر ہے۔ یا یہ کہ ہم قرآن میں پڑھتے ہیں:

والصلح خیر

صلح جنگ سے بہتر ہے۔ (نساء ۱۲۸)

اس کا مطلب یہ نہیں کہ جنگ کوئی اچھی ہے۔

یا اسی طرح قرآن میں ہے:

ولعبد مؤمن خیر من مشرک

بندۂ مومن مشرک سے بہتر ہے۔ (بقرہ ۲۲۱)

تو کیا بت پرست بھی کوئی خیر اور فضیلت رکھتا ہے۔

اسی طرح سورہ توبہ آیہ ۱۰۸ میں ہے:

لمسجد اسس علی التقوٰی من اول یوم احق ان تقوم فیہ

وہ مسجد کہ جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے (مسجد ضرار سے جسے منافقین نے تفرقہ ڈالنے کے لیے بنایا تھا) عبادت کے لیے زیادہ حق رکھتی ہے اور زیادہ شائستہ ہے۔

حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ مسجد ضرار میں عبادت کرنے میں کوئی شائستگی نہیں ہے۔ اس قسم کی تعبیریں قرآن مجید، کلمات عرب اور دوسری زبانوں میں بہت زیادہ ہیں۔ جو کچھ کہا گیا ہے اس تمام گفتگو سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نعمان بن بشیر والی روایت چونکہ قرآن کے مضمون کے برخلاف ہے لہٰذا اسے پھینک دینا چاہیے اور جو ظاہر آیات کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے وہی مشہور حدیث ہے جو بحث کی ابتداء میں شانِ نزول کے زیرِ عنوان ہم نے بیان کی ہے اور یہ اسلام کے عظیم پیشوا حضرت علی علیہ السلام کے لیے ایک فضیلت ہے۔

خدا تعالیٰ ہم سب کو حق کی اور ایسے رہنماؤں کی پیروی پر ثابت قدم رکھے اور کھلی آنکھ اور کان عطا فرمائے اور تعصب

سے دُور فکر عنایت کرے۔

۲۔ مقامِ رضوان کیا ہے : مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مقامِ رضوان ان عظیم نعمات اور مقامات میں سے ہے جو خدا تعالیٰ مومنین اور مجاہدین کو بخشتا ہے۔ یہ مقام باغاتِ بہشت، جنت کی جاوداں نعمتوں اور پروردگار کی وسیع رحمت سے الگ ایک چیز ہے۔

اس مسئلے کی مزید تشریح انشاء اللہ اسی سورت کی آیہ ۷۲ کے ذیل میں آئے گی جس میں فرمایا گیا ہے :

ورضوان من اللہ اکبر

۲۳۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰبَآءَکُمۡ وَ اِخۡوَانَکُمۡ اَوۡلِیَآءَ اِنِ اسۡتَحَبُّوا الۡکُفۡرَ عَلَی الۡاِیۡمَانِ ؕ وَ مَنۡ یَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡکُمۡ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝

۲۴۔ قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَ اَبۡنَآؤُکُمۡ وَ اِخۡوَانُکُمۡ وَ اَزۡوَاجُکُمۡ وَ عَشِیۡرَتُکُمۡ وَ اَمۡوَالُ ۣ اقۡتَرَفۡتُمُوۡهَا وَ تِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَهَا وَ مَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَ جِهَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ۝ ع

ترجمہ

۲۳۔ اے ایمان والو! جس وقت تمہارے باپ اور بھائی کفر کو ایمان پر ترجیح دیں تو انہیں اپنا ولی (اور دوست، یاور اور سہارا) قرار نہ دو اور جو انہیں اپنا ولی قرار دیں وہ ستمگر ہیں۔

۲۴۔ کہہ دو، اگر تمہارے آباؤ اجداد، اولاد، بھائی، ازواج اور تمہارا قبیلہ اور وہ اموال جو تمہارے ہاتھ لگے ہیں اور وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں ڈر ہے وہ تمہارے پسندیدہ گھر تمہاری نظر میں خدا، اس کے پیغمبر اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تم پھر انتظار کرو کہ خدا تم

پر اپنا عذاب نازل کرے اور خدا نافرمانوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

تفسیر

ہدف اور خدا پر ہر چیز قربان ہے

آخری وسوسہ اور بہانہ جو بت پرستوں کے مقابلے میں حکم جنگ کے بارے میں ہو سکتا ہے اور بعض تفاسیر کے مطابق پیدا ہوا، یہ تھا کہ وہ سوچتے تھے کہ ایک طرف مشرکین اور بت پرستوں کے درمیان ان کے قریبی عزیز اور وابستہ لوگ موجود تھے۔ کبھی باپ مسلمان ہو جاتا اور بیٹا مشرک رہ جاتا اور کبھی اس کے برعکس اولاد راہِ توحید پر چل نکلتی اور باپ اسی طرح شرک تاریکی میں رہ جاتا۔ یونہی بھائیوں، میاں بیوی اور خاندان و قبیلے کے بارے میں صورت تھی۔ اب اگر تمام مشرکین کے ساتھ جنگ کرنا مقصود ہوتا تو پھر اس کا تقاضا یہ ہوتا کہ اپنے رشتہ داروں اور قوم قبیلہ کو بھول جائیں۔

دوسری طرف ان کا زیادہ تر سرمایہ اور تجارت مشرکین کے ہاتھ میں تھا لہٰذا وہ مکہ آتے جاتے اور اس کی ترقی کے لیے کام کرتے۔

تیسری بات یہ تھی کہ مکہ میں ان کے گھر تھے جو اچھی حالت میں اور نسبتاً آباد تھے کہ جو ہو سکتا تھا کہ مشرکین سے جنگ کی صورت میں ویران ہو جائیں یا ممکن تھا کہ مراسم حج سے مشرکین کے معطل ہو جانے کی وجہ سے ان کی کوئی قدر و قیمت نہ رہتی اور وہ بے سود ہو جاتے۔

مندرجہ بالا آیات کی نظر ایسے اشخاص ہی کی طرف ہے اور وہ لوگ انداز میں انہیں صریح جواب دیتی ہیں۔ پہلے فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! جب تمہارے باپ اور بھائی کفر کو ایمان پر مقدم رکھیں تو انہیں اپنا دوست، مددگار، ولی اور سرپرست قرار نہ دو (یآیھا الذین اٰمنوا لا تتخذوآ اٰباء کم و اخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان)۔

پھر تاکید کے طور پر مزید فرمایا گیا ہے: تم میں سے جو لوگ مدد اور دوستی کے لیے ان کا انتخاب کریں وہ ستمگر ہیں (ومن یتولھم منکم فاولٰئک ھم الظٰلمون)۔

اس سے بڑھ کر ظلم کیا ہوگا کہ انسان حق سے بیگانوں اور حق کے دشمنوں سے دوستی رکھ کر اپنے اوپر، اس معاشرے پر جس میں وہ رہتا ہے اور خدا کے بھیجے ہوئے رسول پر ظلم کرے۔

اگلی آیت میں اس امر کی انتہائی اہمیت کے پیش نظر اس کی تشریح تاکید اور تہدید کی صورت میں کی گئی ہے۔ روئے سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان سے کہہ دو اگر تمہارے باپ، اولاد، بھائی، ازدواج، خاندان اور قبیلہ اور تمہارے جمع کردہ اموال اور تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں خوف ہے اور اچھے مکانات جو تمہیں پسند ہیں تمہاری نظر میں خدا، اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو کہ خدا کی طرف سے سزا اور عذاب تمہیں آلے

(قل ان کان اٰباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و اموال اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مساکن ترضونھآ احب الیکم من اللہ و رسولہ و جھاد فی سبیلہ فتربصوا حتّٰی یاتی اللہ بامرہ)۔

ان امور کو رضا الٰہی اور جہاد پر ترجیح دینا چونکہ ایک قسم کی نافرمانی اور واضح فسق ہے اور مادی زندگی کے زرق برق سے وابستگی رکھنے والے ہدایت الٰہی کی اہلیت نہیں رکھتے لہٰذا آیت کے آخر میں مزید ارشاد ہوتا ہے، خدا فاسق گروہ کو ہدایت نہیں کرتا (واللہ لا یھدی القوم الفٰسقین)۔

تفسیر علی بن ابراہیم قمی میں اس طرح منقول ہے:

لما اذن امیر المؤمنین ان لا یدخل المسجد الحرام مشرک بعد ذٰلک جزعت قریش جزعًا شدیدا و قالوا ذھبت تجارتنا، و ضاعت عیالنا، و خربت دورنا، فانزل اللہ فی ذٰلک قل یا محمد) ان کان اٰبآئکم ....

جب حضرت امیر المومنین علی نے (مراسم حج کے دوران) اعلان کیا کہ اس کے بعد کوئی مشرک مسجد الحرام میں داخلے کا حق نہیں رکھتا تو قریش (کے مومنین) نے فریاد بلند کی اور کہنے لگے، ہماری تجارت ختم ہو گئی اور ہمارے اہل و عیال تباہ و برباد ہو گئے اور ہمارے گھر ویران ہو گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی ان کان اٰبائکم.......

مندرجہ بالا آیات میں اصل سچے ایمان کو شرک و نفاق سے آلودہ ایمان کو الگ الگ کر کے دکھا دیا گیا ہے اور حقیقی مومنین اور ضعیف الایمان افراد کے درمیان حد فاصل مقرر کر دی گئی ہے اور صراحت سے کہا گیا ہے کہ ہشت پہلو مادی زندگی کا سرمایہ کہ جس کے چار حصے نزدیکی رشتہ داروں (ماں باپ، اولاد، بہن بھائیوں اور میاں بیوی) سے مربوط ہیں، ایک حصہ گروہ اجتماعی اور عشیرہ و قبیلہ سے، ایک حصہ جمع کردہ اموال سے، ایک حصہ تجارت اور کاروبار سے اور آخر میں ایک حصہ اچھے مکانوں سے مربوط ہے انسان کی نظر میں خدا، رسول، جہاد اور فرمانِ خدا کی اطاعت سے بڑھ کر قیمتی اور گراں بہا ہے یہاں تک کہ وہ ان چیزوں کو دین پر قربان کرنے کو تیار نہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حقیقی اور کامل ایمان پیدا نہیں ہوا۔

حقیقتِ ایمان اور روحِ ایمان اپنی تمام قدروں کے ساتھ اسی دن روشن ہو گی جس روز ایسی فداکاری اور قربانی میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔

علاوہ ازیں جو لوگ ایسے ایثار اور فداکاری پر آمادہ نہیں ہیں درحقیقت اپنے اوپر اور معاشرے پر ظلم کرتے ہیں یہاں تک کہ جس چیز سے وہ ڈرتے ہیں اسی میں جا گریں گے کیونکہ جو قوم تاریخ کے ایسے لحوں اور مقامات پر ایسی فداکاریوں کے لیے تیار نہیں ہے جلد یا بدیر اسے شکست سے دوچار ہونا پڑے گا اور وہی عزیز و اقارب اور مال و دولت جن سے وابستگی کی وجہ سے جہاد سے اجتناب کرتے ہیں خطرے میں پڑ جائیں گے اور دشمن کے چنگل میں نیست و نابود ہو جائیں گے۔

قابلِ توجہ نکات

۱۔ ہدف عزیز ترہما: جو کچھ آیاتِ بالا میں فرمایا گیا ہے اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ عزیز و اقارب سے دوستی اور محبت

کے رشتے توڑ لیے جائیں اور اقتصادی سرمائے کی پرواہ نہ کی جائے اور نہ یہاں انسانی جذبات کو ترک پڑ جایا گیا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جب زندگی میں دوراہا آجائے تو بیوی، اولاد، مال و دولت، مقام و منزلت، گھر اور گھرانے کے عشق کو حکم خدا کے اجراء اور جہاد کی طرف رغبت سے مانع نہیں ہونا چاہیے اور ان چیزوں کو انسان کے مقدس ہدف اور مقصد میں حائل نہیں ہونا چاہیے۔

لہٰذا اگر انسان دوراہے پر نہ کھڑا ہوا ور ان دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا مرحلہ نہ ہو تو پھر دونوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

سورہ لقمان کی آیہ ۱۵ میں بت پرست ماں باپ کے بارے میں ہے:

وان جاهداك علیٰ ان تشرك بی ما لیس لك به علم فلا تطعهما و صاحبهما فی الدنیا معروفا

اگر وہ اصرار کریں کہ تو اس چیز کو خدا کا شریک نہیں جانتا اسے خدا کا شریک قرار دے تو ہرگز ان کی اطاعت نہ کرنا لیکن دنیاوی زندگی میں ان سے اچھا سلوک کرو۔

۲۔ فتربصوا حتیٰ یاتی الله بامره کا ایک اور مفہوم: اس کی ایک تفسیر تو وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یعنی خدا کی طرف سے ایسے لوگوں کے لیے تہدید ہے جو اپنے مادی مفاد کو رضائے الٰہی پر مقدم شمار کرتے ہیں اور چونکہ یہ تہدید اجمالی طور پر بیان ہوئی ہے لہٰذا اس کا اثر بیشتر اور زیادہ وحشت انگیز ہے اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے انسان اپنے کسی ماتحت سے کہے کہ اگر تو نے اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کی تو میں بھی اپنا کام کروں گا۔

اس جملے کی تفسیر میں ایک اور احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ خدا کہتا ہے کہ اگر تم اس قسم کے ایثار کے لیے تیار نہ ہوئے تو خدا اپنے پیغمبر کی فتح و کامرانی کا حکم اس راستے سے دے گا جسے وہ جانتا ہے اور جس طریقے سے اس نے ارادہ کیا ہے اس کی مدد کرے گا۔ جیسے سورہ مائدہ کی آیت ۵۴ میں ہے:

یاایها الذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینه فسوف یاتی الله بقوم یحبهم و یحبونه.....

اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص اپنے دین سے مرتد ہو جائے وہ خدا کو کوئی نقصان اور ضرر نہیں پہنچا تا کیونکہ خدا عنقریب ایک گروہ لائے گا جو خدا سے محبت کرتا ہے اور خدا بھی اس گروہ سے محبت کرتا ہے۔

۳۔ ماضی اور حال میں اس حکم کی کیفیت: ہو سکتا ہے کچھ لوگ یہ خیال کریں کہ جو کچھ مندرجہ بالا آیات میں بیان ہوا ہے وہ پہلے مسلمانوں سے مخصوص ہے اور اس کا تعلق گذشتہ تاریخ سے ہے حالانکہ یہ بہت بڑا اشتباہ ہے۔ یہ آیات گذشتہ، آج اور آئندہ سب ادوار کے مسلمانوں پر محیط ہیں۔ اگر وہ جہاد اور فداکاری کے لیے محکم ایمان نہ رکھتے ہوں، تیار نہ ہوں، ضرورت کے وقت ہجرت پر تیار نہ ہوں اور اپنے مادی مفاد کو رضائے الٰہی پر مقدم سمجھیں اور بیوی، اولاد، مال و دولت اور عیشِ حیات سے زیادہ وابستگی کی وجہ سے ایثار و قربانی سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں تو ان کا مستقبل تاریک ہے نہ صرف مستقبل بلکہ ان کا حال بھی خطرے میں ہے اور ان کا سب گذشتہ افتخار، میراث اور امتیاز ختم ہو جائے گا۔ ان کی زندگی

کے منابع اور مراکز دوسروں کے ہاتھ لگ جائیں گے اور ان کے لیے زندگی کا کوئی مفہوم نہیں ہوگا کیونکہ زندگی ایمان اور ایمان کے زیر سایہ جہاد سے عبارت ہے۔

مندرجہ بالا آیات کی ایک شعار کے طور پر تمام مسلمان بچوں اور جوانوں کو تعلیم دی جانا چاہیے اور ان میں فداکاری، مبارزہ اور ایمان کی روح زندہ ہونا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ وہ اپنی میراث کی حفاظت کریں۔

۲۵۔ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۚ

۲۶۔ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝

۲۷۔ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۵۔ خدا نے بہت سے میدانوں میں تمہاری مدد کی (اور تم دشمن پر کامیاب ہوئے) اور حنین کے دن (بھی مدد کی) جب کہ تمہارے لشکر کی کثرتِ تعداد نے تمہیں گھمنڈ میں ڈال دیا لیکن (اس کثرت نے) تمہاری کوئی مشکل حل نہ کی اور زمین پوری وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی پھر تو (دشمن کو) پشت دکھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

۲۶۔ پھر خدا نے اپنی "سکینہ" اپنے رسول اور مومنین پر نازل کی اور ایسے لشکر بھیجے جنہیں تم نہیں دیکھتے تھے اور کافروں کو عذاب دیا اور یہ ہے کافروں کی جزا۔

۲۷۔ پھر خدا جس شخص کی چاہے (اور اسے اہل دیکھے) توبہ قبول کرتا ہے اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

صرف کثرت کسی کام کی نہیں

گذشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ خدا تعالیٰ مسلمانوں کو راہِ جہاد میں شرک و بت پرستی کی جڑ اکھاڑ پھینکنے کے لیے ہر قسم کی فداکاری کی دعوت دیتا ہے اور وہ اشخاص کہ جن کی روح کو بیوی اولاد، قوم و قبیلہ اور مال و ثروت کی محبت نے اس طرح گھیر رکھا ہے کہ فداکاری اور جہاد کے لیے تیار نہیں ہیں انہیں شدید خطرے کا الارم دیتا ہے۔

اس کے بعد محل بحث آیات میں ایک اہم مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ہر رہبر و رہنما کو چاہیے کہ وہ حساس مواقع پر اپنے پیروکاروں کو اس کی طرف متوجہ کرے اور وہ یہ ہے کہ اگر مال و اولاد کا عشق ضعیف الاعتقاد گروہ کے کچھ افراد کو مشرکین کے خلاف عظیم جہاد کے لیے پیش قدمی سے روکے تو سچے مومنین کا گروہ اس امر سے پریشان نہ ہو کیونکہ جب ان کی تعداد کم تھی (مثلاً جنگ بدر میں) ان دنوں خدا نے انہیں تنہا نہیں چھوڑا اور نہ اس دن جس روز ان کی جمعیت زیادہ تھی (مثلاً جنگِ حنین کے میدان میں) اور کثرتِ تعداد نے ان کے درد کا مداوا نہ کیا بلکہ ہر حالت میں خدا کی مدد ان کی کامیابی کا سبب بنی۔ اسی لیے پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے، خدا نے بہت سے مقامات پر تمہاری مدد کی (لقد نصرکم اللہ فی مواطن کثیرۃ)۔

"مواطن" "موطن" کی جمع ہے۔ اس کا معنی ہے ایسی جگہ جسے انسان دائمی طور پر یا وقتی طور پر اقامت کے لیے منتخب کرے لیکن اس کے معانی میں سے ایک جنگ کا میدان بھی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جنگی فوجی تھوڑی یا زیادہ مدت کے لیے وہاں قیام کرتے ہیں۔

مزید فرمایا گیا ہے: اور حنین کے دن تمہاری مدد کی جب اپنی زیادہ جمعیت کی وجہ سے تم اترانے لگے تھے (ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم)۔

اس جنگ میں لشکرِ اسلام کی تعداد بارہ ہزار تھی۔ بعض نے دس یا آٹھ ہزار لکھی ہے لیکن مشہور اور صحیح روایات بارہ ہزار کی تائید کرتی ہیں اور اس وقت تک کسی اسلامی جنگ میں اتنی کثیر تعداد نے شرکت نہیں کی تھی چنانچہ بعض مسلمانوں نے غرور کے انداز میں کہا: "لن نغلب الیوم" یعنی اتنی فوج کے ہوتے ہوئے ہم ہرگز شکست نہیں کھائیں گے۔ لیکن جیسا کہ انشاء اللہ ہم جنگِ حنین کی تفصیل میں بتائیں گے کہ لشکر کی یہ کثیر تعداد جس میں ایک گروہ نئے مسلمانوں کا تھا اور جن کی ابھی تربیت نہیں ہوئی تھی لشکر کے فرار اور ابتدائی شکست کا سبب بنا مگر آخر کار انہیں لطف خداوندی کے سبب نجات ملی اس ابتدائی شکست کے بارے میں قرآن مزید کہتا ہے: زمین اپنی پوری وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی (وضاقت علیکم الارض بما رحبت) پھر تم دشمن کو پشت دکھا کر بھاگ کھڑے ہوئے (ثم ولیتم مدبرین)۔

ایسے موقع پر جب کہ مسلمان فوج سرزمین حنین پر منتشر ہو چکی تھی اور چند ایک افراد کے سوا پیغمبر اکرمؐ کے پاس کوئی باقی نہیں رہا تھا اور پیغمبر اسلامؐ ان کے بھاگ جانے کی وجہ سے سخت ناراحت تھے "خدا نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنی طرف سے سکون و اطمینان نازل کیا" (ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ و علی المؤمنین)۔ اور اسی طرح تمہاری تقویت اور مدد کے لیے ایسے لشکر بھیجے جنہیں تم نہیں دیکھتے تھے (وانزل جنودا لم تروھا)۔

جیسا کہ ہم جنگ بدر سے مربوط آیات کے ذیل میں کہہ چکے ہیں کہ اس غیر مرئی خدائی لشکر کا نزول صرف مسلمانوں کی تقویت روح اور ثبات قدم کے لیے تھا ورنہ فرشتوں اور غیبی طاقتوں نے کوئی جنگ نہیں کی تھی[1]

آخر میں جنگ حنین کا اصلی نتیجہ بیان کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: خدا نے بے ایمان اور بت پرست لوگوں کو سزا دی (کچھ لوگ مارے گئے کچھ گرفتار ہوگئے اور کچھ بھاگ کر مسلمانوں کی دسترس سے نکل گئے) (وعذب الذین کفروا)۔ اور بے ایمان لوگوں کی یہی سزا ہے (وذٰلک جزآء الکافرین)۔

اس کے باوجود کافر قیدیوں اور بھگوڑوں کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا گیا کہ اگر وہ مائل ہوں تو خدا کی طرف پلٹ آئیں اور دین حق قبول کر لیں لہٰذا آخری زیر بحث آیت میں ارشاد ہوتا ہے: پھر اس واقعہ کے بعد خدا جس کے لیے چاہے (اور جسے واقعی توبہ کے لیے تیار دیکھے اور اہل پائے) اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے (ثم یتوب اللہ من بعد ذٰلک علی من یشاء)۔

لفظ "یتوب" جو فعل مضارع ہے استمرار پر دلالت کرتا ہے اس کا مفہوم یہ ہے توبہ اور بازگشت کے دروازے اسی طرح ان کے سامنے کھلے ہیں کیونکہ "خدا بخشنے والا اور مہربان ہے" وہ کبھی توبہ کے دروازے کسی پر بند نہیں کرتا اور اپنی وسیع رحمت سے کسی کو ناامید نہیں کرتا (واللہ غفور رحیم)۔

چند اہم نکات

۱۔ جنگ حنین ـــــ ایک عبرت انگیز معرکہ: حنین شہر طائف کے قریب ایک علاقے کا نام ہے۔ یہ جنگ چونکہ اس زمین پر لڑی گئی لہٰذا غزوۂ حنین کے نام سے مشہور ہوگئی۔ قرآن میں اسے "یوم حنین" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس جنگ کو غزوہ اوطاس اور غزوۂ ہوازن بھی کہتے ہیں (اوطاس اسی علاقے کی زمین کا نام ہے اور ہوازن ایک قبیلے کا نام ہے جو اس جنگ میں مسلمانوں کے خلاف برسر پیکار تھا)۔

کامل میں ابن اثیر نے لکھا ہے کہ اس جنگ کی ابتدا یوں ہوئی کہ جب ہوازن جو بہت بڑا قبیلہ تھا اسے فتح مکہ کی خبر ہوئی تو اس کے سردار مالک بن عوف نے افراد قبیلہ کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ ممکن ہے فتح مکہ کے بعد محمدؐ ان سے جنگ کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ وہ کہنے لگے کہ مصلحت اس میں ہے کہ اس سے قبل کہ وہ ہم سے جنگ کرے ہمیں قدم آگے بڑھانا چاہیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ اطلاع پہنچی تو آپؐ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ سرزمین ہوازن کی طرف چلنے کو

---

[1] مزید وضاحت کے لیے اسی جلد میں سورہ انفال کی آیہ ۹ تا ۱۲ کے ذیل میں دیکھئے۔

تیار ہو جائیں ۔[1]

اس جنگ کے واقع اور کلیات میں مؤرخین کے درمیان تقریباً اختلاف نہیں ہے لیکن اس کی تفصیلات کے بارے میں طرح طرح کی روایات نظر آتی ہیں جو ایک دوسرے سے پوری طرح مطابقت نہیں رکھتیں ۔ جو کچھ ہم ذیل میں اختصار سے طرح کر رہے ہیں یہ اس روایت کے مطابق ہے جو طبری مرحوم نے مجمع البیان میں ذکر کی ہے ۔

۸ھ ہجری رمضان المبارک کے آخری دن تھے یا شوال کا مہینہ تھا کہ قبیلہ ہوازن کے افراد مالک بن عوف کے پاس جمع ہوئے اور اپنا مال، اولاد اور عورتیں بھی اپنے ساتھ لے آئے تاکہ مسلمانوں سے جنگ کرتے وقت کسی کے دماغ میں بھاگنے کا خیال نہ آئے ۔ اس طرح سے وہ سرزمین اوطاس میں وارد ہوئے ۔

پیغمبر اسلام نے لشکر کا بڑا علم باندھ کر علیؑ کے ہاتھ میں دیا اور وہ تمام افراد جو فتح مکہ کے موقع پر اسلامی فوج کے کسی دستے کے کمانڈر تھے آنحضرتؐ کے حکم سے اسی پرچم کے نیچے حنین کے میدان کی طرف روانہ ہوئے

رسول اللہؐ کو اطلاع ملی کہ صفوان بن امیہ کے پاس ایک بڑی مقدار میں زرہیں ہیں ۔ آپؐ نے کسی کو اس کے پاس بھیجا اور اس سے سو زرہیں عاریتاً طلب کیں ۔ صفوان نے پوچھا، واقعاً عاریتاً ہیں یا غصب کے طور پر ۔

رسول اللہؐ نے فرمایا، یہ عاریتاً ہیں اور ہم ان کے ضامن ہیں کہ صحیح و سالم واپس کریں گے ۔

صفوان نے زرہیں عاریتاً پیغمبر اکرمؐ کو دے دیں اور خود بھی آنحضرتؐ کے ساتھ چلا ۔

فوج میں دو ہزار ایسے افراد تھے جنہوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا ۔ ان کے علاوہ دس ہزار وہ مجاہدین اسلام تھے جو پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ فتح مکہ کے لیے آئے تھے ۔ یہ تعداد مجموعی بارہ ہزار بنتی ہے ۔ یہ سب میدانِ جنگ کی طرف چل پڑے ۔

مالک بن عوف ایک مرد جری اور ہمت و حوصلے والا انسان تھا ۔ اس نے اپنے قبیلے کو حکم دیا کہ اپنی تلواروں کے نیام توڑ ڈالیں اور پہاڑ کی غاروں میں، دروں کے اطراف میں اور درختوں کے درمیان لشکرِ اسلام کے راستے میں کمین گاہیں بنائیں اور جب اوّل صبح کی تاریکی میں مسلمان وہاں پہنچیں تو اچانک اور ایک ہی بار ان پر حملہ کر دیں اور انہیں فنا کر دیں ۔

اس نے مزید کہا، محمدؐ کا ابھی تک جنگجو لوگوں سے سامنا نہیں ہوا کہ وہ شکست کا مزہ چکھتا ۔

رسول اللہؐ اپنے اصحاب کے ہمراہ نماز صبح پڑھ چکے تو آپؐ نے حکم دیا کہ سرزمین حنین کی طرف چل پڑیں ۔ اس موقع پر اچانک لشکرِ ہوازن نے ہر طرف سے مسلمانوں پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی ۔ وہ دستہ جو مقدمہ لشکر میں تھا (اور جس میں مکہ کے نئے نئے مسلمان بھی تھے) بھاگ کھڑا ہوا ۔ اس کے سبب باقی ماندہ لشکر بھی پریشان ہو کر بھاگ کھڑا ہوا ۔

خدا تعالیٰ نے اس موقع پر دشمن کے ساتھ انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دیا اور وقتی طور پر ان کی نصرت سے ہاتھ اُٹھا لیا کیونکہ مسلمان اپنی کثرتِ تعداد پر مغرور تھے لہٰذا ان میں شکست کے آثار آشکار ہوئے ۔ لیکن حضرت علیؑ جو لشکرِ اسلام کے

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۲۶۱ ۔

علمبردار تھے وہ مٹھی بھر افراد سمیت دشمن کے مقابلے میں ڈٹے رہے اور اسی طرح جنگ جاری رکھے رہے۔

اس وقت پیغمبر اکرمؐ قلب لشکر میں تھے۔ رسول اللہؐ کے چچا عباس بنی ہاشم کے چند افراد کے ساتھ آپ کے گرد حلقہ باندھے ہوئے تھے۔ یہ کل افراد دس سے زیادہ نہ تھے دسویں اُم ایمن کے فرزند ایمن تھے۔ مقدمہ لشکر کے سپاہی فرار کے موقع پر رسول اللہؐ کے پاس سے گزرے تو آنحضرتؐ نے عباس کو جن کی آواز بلند اور زوردار تھی کو حکم دیا کہ اس ٹیلے پر جو قریب ہے چڑھ جائیں اور مسلمانوں کو پکاریں:

یا معشر المهاجرين والانصار! يا اصحاب سورة البقرة! يا اهل بيعت الشجرة! الیٰ این تفرون هٰذا رسول الله۔

اے مہاجرین وانصار!

اے سورۂ بقرہ کے ساتھیو!

اے درخت کے نیچے بیعت کرنے والو!

کہاں بھاگے جا رہے ہو؟ رسول اللہ تو یہاں ہیں۔

مسلمانوں نے جب عباس کی آواز سنی تو پلٹ آئے اور کہنے لگے: لبیك! لبیك!

خصوصاً لوٹ آنے میں انصار نے پیش قدمی اور فوج دشمن پر ہر طرف سے سخت حملہ کیا اور نصرتِ الٰہی سے پیش قدمی جاری رکھی یہاں تک کہ قبیلہ ہوازن دہشت زدہ ہو کر ہر طرف بکھر گیا۔ مسلمان مسلسل ان کا تعاقب کر رہے تھے۔ لشکرِ دشمن میں سے تقریباً ایک سو افراد مارے گئے۔ ان کے اموال غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھ لگے اور کچھ ان میں سے قیدی بنا لیے گئے[1]

لکھا ہے کہ اس تاریخی واقعہ کے آخر میں قبیلہ ہوازن کے نمائندے رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا۔ پیغمبر اکرمؐ نے ان سے بہت محبت والفت فرمائی۔ یہاں تک کہ ان کے سربراہ مالک بن عوف نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ آپؐ نے اس کا مال اور قیدی اسے واپس کر دیئے اور اس کے قبیلے کے مسلمانوں کی سرداری بھی اس کے سپرد کر دی۔

درحقیقت ابتداء میں مسلمانوں کی شکست کا اہم عامل غرور وتکبر جو کثرت فوج کی وجہ ان میں پیدا ہو گیا تھا، اس کے علاوہ دو ہزار نئے مسلمانوں کا وجود تھا جن میں سے بعض فطری طور پر منافق تھے، کچھ ان میں مالِ غنیمت کے حصول کے لیے شامل ہو گئے تھے اور بعض بغیر کسی مقصد کے ان میں شامل ہو گئے تھے۔

۲۔ بھاگنے والے کون تھے؟ اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ میدانِ حنین میں سے اکثریت ابتداء میں بھاگ گئی تھی۔ جو باقی رہ گئے تھے ان کی تعداد ایک روایت کے مطابق دس تھی اور بعض نے تو ان کی تعداد چار بیان کی ہے۔

---

[1] مجمع البیان جلد ۵ صفحہ ۱۸ تا ۱۹۔

بعض نے زیادہ سے زیادہ سو افراد لکھے ہیں۔

بعض مشہور روایات کے مطابق چونکہ پہلے خلفاء بھی بھاگ جانے والوں میں سے تھے لہٰذا بعض اہل سنت مفسرین نے کوشش کی ہے کہ اس فرار کو ایک فطری چیز کے طور پر پیش کیا جائے۔ المنار کے مؤلف لکھتے ہیں:

جب دشمن کی طرف سے مسلمانوں پر تیروں کی سخت بوچھاڑ کی تو جو لوگ مکہ سے مسلمانوں کے ساتھ مل گئے تھے اور جن میں منافقین اور ضعیف الایمان بھی تھے اور جو مالِ غنیمت کے لیے آگئے تھے وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور انہوں نے میدان میں پشت دکھائی تو باقی لشکر بھی فطری طور پر مضطرب اور پریشان ہوگیا وہ بھی معمول کے مطابق نہ کہ خوف و ہراس سے، بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ ایک فطری بات ہے کہ اگر ایک گروہ فرار ہو جائے تو باقی بھی بے سوچے سمجھے متزلزل ہو جاتے ہیں لہٰذا ان کا فرار ہونا پیغمبر کی مدد ترک کرنے اور انہیں دشمن کے ہاتھ میں چھوڑ جانے کے طور پر نہیں تھا کہ وہ خدا کے غضب کے مستحق ہوں [1]

ہم اس بات کی تشریح نہیں کرتے اور اس کا فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑتے ہیں۔

اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ صحیح بخاری جو اہلِ سنت کی معتبر ترین کتب میں سے ہے میں اس میدان میں مسلمانوں کی شکست اور فرار سے متعلق گفتگو میں منقول ہے:

فاذا عمر بن الخطاب فی الناس، وقلت ما شأن الناس، قال امر الله، ثم تراجع الناس الی رسول الله ....

اچانک عمر بن خطاب لوگوں کے درمیان تھے میں نے کہا کہ لوگوں نے کیا کیا ہے تو انہوں نے کہا اللہ کی مرضی ایسی تھی۔ پھر لوگ پیغمبر کی طرف پلٹ آئے [2]

لیکن اگر ہم اپنے پہلے سے کئے گئے فیصلوں کو چھوڑ دیں اور قرآن کی طرف توجہ دیں تو ہم دیکھیں گے کہ قرآن بھاگنے والوں میں کسی گروہ بندی اور تفریق کا قائل نہیں بلکہ سب کی مساوی مذمت کر رہا ہے کہ جو بھاگ گئے تھے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ ان دو جملوں میں کیا فرق ہے جن میں سے ایک یہ مندرجہ بالا آیات میں ہے:

ثم ولیتم مدبرین

پھر تم پشت پھیر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اور دوسرا جملہ کہ جو سورہ انفال آیہ ۱۶ میں گزرا ہے جہاں فرمایا گیا ہے:

ومن یولھم یومئذ دبرہ الا متحرفا لقتال او متحیزا الی فئة فقد باء بغضب من الله

جو شخص دشمن سے پشت پھیرے وہ غضب پروردگار میں گرفتار ہوگا مگر وہ جو دشمن پر حملہ کرنے کی غرض سے

---

[1] ، [2] تفسیر المنار جلد ۱۰، صفحہ ۲۶۲، ۲۶۳، صفحہ ۲۶۵۔

یا مجاہدین کے گروہ کے ساتھ آملنے کے لیے اپنی جگہ بدل لے۔

لہٰذا اگر ان دو آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر دیکھیں تو ثابت ہو گا کہ اس دن چند ایک مسلمانوں کے سوا باقی تمام ایک عظیم گناہ کے مرتکب ہوئے تھے زیادہ سے زیادہ یہ کہ بعد میں انھوں نے توبہ کر لی اور پلٹ آئے۔

۳۔ ایمان و اطمینان: "سکینۃ" دراصل "سکون" کے مادہ سے ہے۔ یہ ایک طرح کے اطمینان و سکون کی حالت کے معنی میں ہے کہ جو انسان سے ہر طرح کا شک و شبہ اور خوف و وحشت دور کر دے اور اسے سخت اور دشوار حوادث کے مقابلے میں ثابت قدم رکھے۔

"سکینۃ" کا ایمان کے ساتھ قریبی تعلق ہے یعنی یہ ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ صاحبانِ ایمان جب خدا کی بے پایاں قدرت کو یاد کرتے ہیں اور اس کے لطف و رحمت پر نظر کرتے ہیں تو امید کی ایک لہر ان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ جو "سکینۃ" کو بعض روایات میں "ایمان" کہا گیا ہے[1] اور بعض دیگر روایات میں "انسانی شکل و صورت میں نسیم بہشت" مراد لیا گیا ہے تو ان سب معانی کی بازگشت اسی معنی کی طرف ہے۔

قرآن مجید کی سورہ فتح آیہ ۴ میں ہے:

هو الذی انزل السکینة فی قلوب المؤمنین لیزدادوا ایمانا مع ایمانهم

وہ ذات وہ ہے جس نے مومنین کے دلوں میں سکینۃ کو نازل کیا تاکہ ان کے ایمان میں ایمان کا اضافہ ہو۔

بہرحال یہ غیر معمولی نفسیاتی کیفیت ایک خدائی اور آسمانی نعمت ہے جس کے باعث انسان مشکل ترین حوادث بھی برداشت کر لیتا ہے اور اطمینان و ثبات قدم کی ایک دنیا اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔

یہ امر جاذب توجہ ہے کہ قرآن محل بحث آیات میں یہ نہیں کہتا کہ ثم انزل اللّٰہ سکینتہ علی رسولہ وعلیکم (پھر خدا نے اپنے رسول اور تم پر سکینۃ نازل کی) حالانکہ اس سے پہلے کے تمام جملوں میں "کم" کا لفظ خطاب کے لیے آیا ہے جبکہ یہاں "علی المؤمنین" کہا گیا ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ منافقین اور وہ جو میدان جہاد میں طالب دنیا تھے اس سکینہ اور اطمینان میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا اور یہ نعمت صرف صاحبانِ ایمان کو نصیب ہوئی۔

روایات میں ہے کہ یہ نسیم جنت انبیاء اور خدا کے رسولوں کے ساتھ ہوا کرتی تھی[2] یہی وجہ ہے کہ ایسے حوادث کے موقع پر جن میں کسی شخص کو خود پر کنٹرول نہیں رہتا ان کی روح مطمئن ہوتی ہے اور ان کا عزم راسخ، آہنی اور غیر متزلزل ہوتا ہے۔

میدان حنین میں پیغمبر اکرمؐ پر سکینۃ کا نزول جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس اضطراب کو رفع کرنے کے لیے تھا جو آپؐ کو ان لوگوں کے بھاگ جانے کی وجہ سے تھا ورنہ آنحضرتؐ تو اس معرکے میں ایک مضبوط پہاڑ کی طرح ڈٹے ہوئے تھے اور اس طرح حضرت علیؑ اور مسلمانوں کا ایک چھوٹا سا گروہ بھی ثابت قدم تھا۔

۴۔ "مواطن کثیرۃ" کا مفہوم: مندرجہ بالا آیت میں ہے کہ "مواطن کثیرہ" (بہت سے میدانوں) میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کی نصرت کی۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۱۱۲۔ [2] تفسیر نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۰۱۔ [3] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۱۱۲۔

وہ جنگیں کہ جن میں رسول اللہؐ خود موجود تھے اور شریک جنگ ہوئے اور وہ جنگیں جن میں آپ شامل تو تھے لیکن خود آپ نے جنگ نہیں کی اور اسی طرح وہ جنگ جس میں لشکرِ اسلام دشمن کے آمنے سامنے ہوا مگر آپ اس میں موجود نہیں تھے ان کی تعداد کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے لیکن بعض روایات جو طرق اہلِ بیتؑ سے ہم تک پہنچی ہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کل تعداد اسی ۸۰ ہے۔

کافی میں منقول ہے کہ ایک عباسی خلیفہ کے بدن میں زہر سرایت کر گیا تھا۔ اس نے نذر مانی کہ اگر وہ اس سے بچ گیا تو کثیر مال فقرا ء کو دے گا۔ جب وہ صحت یاب ہو گیا تو وہ فقہاء جو اس کے گرد و پیش تھے انہوں نے مال کے مبلغ میں اختلاف کیا لیکن کسی کے پاس کوئی واضح مدرک اور دلیل نہ تھی۔ آخر کار انہوں نے نویں امام حضرت محمد بن علی التقی علیہ السلام سے سوال کیا۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ کثیر سے مراد اسی ۸۰ ہے۔ جب اس کی علت پوچھی گئی تو آپ نے زیر نظر آیت کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ ہم نے اسلام و کفر کی جنگوں کی تعداد شمار کی ہے کہ جن میں مسلمان کامیاب ہوئے ہیں تو ان کی تعداد اسی ۸۰ بنی ہے۔[1]

۵۔ ایک سبق: ایک نکتہ جس کی طرف آج کے مسلمانوں کو ضرور توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ حنین جیسے حوادث سے سبق حاصل کریں اور جان لیں کہ کثرتِ تعداد اور انبوہِ جمعیت کبھی بھی ان کے غرور اور فریب کا سبب نہ بنے کیونکہ صرف زیادہ جمعیت سے کام نہیں بنتا۔ اہم مسئلہ تو تربیت یافتہ مومنین اور عزم راسخ رکھنے والے افراد کا ہے چاہے ان کی تعداد مختصر ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ ایک چھوٹے سے گروہ نے جنگ حنین میں سرنوشت بدل کے رکھ دی جب کہ غیر آزمودہ، غیر تربیت یافتہ کثیر تعداد شکست و ہزیمت کا سبب بن چکی تھی۔

اہم بات یہ ہے کہ افراد میں ایمان، استقامت اور ایثار کی روح کو پروان چڑھنا چاہیے تاکہ ان کے دل خدائی سکینہ کے مرکز قرار پائیں اور وہ زندگی کے سخت ترین طوفانوں میں بھی پہاڑ کی طرح جمے رہیں اور مطمئن اور پر سکون ہوں۔

۲۸۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

ترجمہ

۲۸۔ اے ایمان والو! مشرک ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد وہ مسجد الحرام کے قریب نہیں جا سکتے اور اگر فقر و فاقہ سے ڈرتے ہو تو خدا اپنے فضل سے جب چاہے گا تمہیں بے نیاز کر دے گا، خدا دانا اور

---

[1] تفسیر نور الثقلین، جلد ۲ صفحہ ۱۹۰۔

حکیم ہے۔

تفسیر

مشرکین کو مسجد الحرام میں داخلے کا حق نہیں

ہم کہہ چکے ہیں کہ حضرت علیؑ نے سورہ مراسم حج میں مکہ کے لوگوں تک جو چار احکام پہنچائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آئندہ سال کوئی مشرک مسجد الحرام میں داخل ہونے اور خانہ کعبہ کے گرد طواف کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ مندرجہ بالا آیت اس امر اور اس کے فلسفے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: اے ایمان والو! مشرکین ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد انہیں مسجد الحرام کے قریب نہیں آنا چاہیے (یاایھا الذین اٰمنوا انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھٰذا)۔

کیا یہ آیت مشرکین کے نجس ہونے پر فقہی مفہوم کے لحاظ سے دلیل ہے یا نہیں، اس سلسلے میں فقہاء اور مفسرین میں اختلاف ہے آیت کے معنی کی تحقیق کے لیے ضروری ہے کہ پہلے لفظ "نجس" (بروزن "ہوس") پر بحث کی جائے۔ یہ لفظ مصدری معنی رکھتا ہے اور تاکید و مبالغہ کے طور پر صفت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

راغب نے مفردات میں اس لفظ کے معنی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ "نجاست" اور "نجس" ہر قسم کی ناپاکی کے معنی میں ہے اور وہ دو طرح کی ہوتی ہے ایک حسی اور دوسری باطنی۔

طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز کہ جس سے انسان کی طبیعت متنفر ہو اسے "نجس" کہا جاتا ہے۔

اس لیے یہ لفظ بہت سے ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں اس کا ظاہری نجاست اور آلودگی کا مفہوم نہیں ہوتا۔ مثلاً ایسی تکلیف اور درد کہ جس کا علاج دیر میں ہو عرب اسے "نجس" کہتے ہیں۔ پست اور شریر اشخاص کے لیے یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ بڑھاپے اور بدن کی کہنگی و فرسودگی کو بھی "نجس" کہتے ہیں۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ مشرکین کو نجس صرف اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کا جسم پلید ہے جیسے خون، پیشاب اور شراب نجس ہوتے ہیں یا یہ کہ بت پرستی کا عقیدہ رکھنے کی وجہ سے ان میں ایک قسم کی باطنی پلیدگی ہے۔ اس طرح سے کفار کی نجاست ثابت کرنے کے لیے اس آیت سے استدلال نہیں کیا جاسکتا اور اس کے لیے ہمیں دوسری ادلّہ تلاش کرنا پڑیں گی۔

اس کے بعد ان کوتاہ فکر افراد کو جواب دیا گیا ہے جو یہ اظہار کرتے تھے کہ اگر مشرکین کا مسجد الحرام میں آنا جانا بند ہو گیا تو ہمارا کاروبار اور تجارت بند ہو جائے گی اور ہم فقیر ہو کر رہ جائیں گے۔ ارشاد ہوتا ہے: فقر و فاقہ سے ڈرتے ہو تو اگر خدا نے چاہا تو عنقریب تمہیں اپنے فضل و کرم کے ذریعے بے نیاز کر دے گا (وان خفتم عیلۃ فسوف یغنیکم اللہ من فضلہ ان شاء)۔

اور ایسا ہی ہوا کہ اس نے مسلمانوں کو بہترین طور پہ بے نیاز کر دیا اور زمانہ پیغمبرؐ ہی میں اسلام کے پھیلاؤ اور وسعت سے خانۂ خدا کے زائرین کا ایک سیلاب مکہ کی طرف اُمڈ آیا اور آج تک اسی طرح جاری و ساری ہے۔ مکہ جو جغرافیائی لحاظ سے نامناسب ترین حالات سے دوچار ہے، جو چند خشک اور سنگلاخ بے آب و گیاہ پہاڑوں کے درمیان موجود ہے، اس کے باوجود ایک بہت ہی آباد شہر ہے اور تجارت کا اہم مرکز ہے۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے، خدا علیم و حکیم ہے (ان اللہ علیم حکیم) اور وہ جو بھی حکم دیتا ہے حکمت کے مطابق ہوتا ہے اور وہ نتائج سے مکمل طور پر آگاہ اور باخبر ہے۔

۲۹۔ قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُونَ ۝ ع ۱۰

ترجمہ

۲۹۔ اہلِ کتاب میں سے وہ لوگ جو نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روزِ جزا پر اور نہ اسے حرام سمجھتے ہیں جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اور نہ دینِ حق قبول کرتے ہیں ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے خضوع و تسلیم کے ساتھ جزیہ دینے لگیں۔

تفسیر

اہلِ کتاب کے بارے میں ہماری ذمہ داری

گذشتہ آیات میں بت پرستوں سے متعلق مسلمانوں کی ذمہ داری بیان کی گئی ہے۔ زیرِ بحث آیت اور آئندہ آیات میں اہلِ کتاب کے بارے میں مسلمانوں کی ذمہ داری کو واضح کیا گیا ہے۔ ان آیات میں درحقیقت اسلام کے ایسے احکام ہیں جو مسلمانوں اور مشرکین کے بارے میں اسلامی احکام کا حدِ وسط ہیں کیونکہ اہلِ کتاب ایک آسمانی دین کی پیروی کی وجہ سے مسلمانوں سے کچھ مشابہت رکھتے ہیں لیکن ایک پہلو سے مشرکین کے ساتھ بھی شباہت رکھتے ہیں اسی بنا پر اسلام انہیں

قتل کرنے کی اجازت نہیں دیتا حالانکہ بت پرست مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے ان کے لیے یہ اجازت دیتا تھا کیونکہ پروگرام یہ ہے کہ روئے زمین سے بت پرستی کی بیخ کنی کی جائے۔ لیکن اہل کتاب کو اس صورت میں مسلمانوں کے قریب آنے کی اجازت دیتا ہے کہ وہ اس بات کے لیے تیار ہوں کہ وہ پر امن مذہبی اقلیت کے طور پر مسلمانوں کے ساتھ مصالحت آمیز زندگی بسر کریں، اسلام کا احترام کریں، مسلمانوں کے خلاف تحریکیں نہ چلائیں اور مخالفِ اسلام پراپیگنڈا نہ کریں۔ پر امن بقائے باہمی کا اصول تسلیم کرنے کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ حکومت اسلامی کو جزیہ کی ادائیگی کریں جو ان میں سے ہر شخص پر ایک طرح کا ٹیکس ہے اور یہ سالانہ ایک مختصر سی رقم بنتی ہے۔ اس کی حدود و شرائط انشاء اللہ آئندہ مباحث میں بیان کی جائیں گی۔ ورنہ دوسری صورت میں اسلام ان سے جنگ کی اجازت دیتا ہے۔

اس شدت عمل کی دلیل زیر بحث آیت کے تین جملوں میں واضح کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جو لوگ خدا اور جزا پر ایمان نہیں رکھتے ان سے جنگ کرو (قاتلوا الذین لا یؤمنون باللّٰہ ولا بالیوم الاٰخر)۔

مگر سوال یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ جیسے اہل کتاب کس طرح خدا اور قیامت پر ایمان نہیں رکھتے حالانکہ ظاہراً ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خدا کو بھی مانتے ہیں اور قیامت کو بھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ایمان خرافات اور بے بنیاد عقائد سے مملو ہے۔

ان کے مبداء اور حقیقتِ توحید کے بارے میں ایمان کے سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ، جیسا کہ بعد کی آیات میں آئے گا حضرت عزیرؑ کو خدا کا بیٹا جانتے تھے اور عیسائی عموماً حضرت مسیحؑ کی الوہیت اور تثلیث پر ایمان رکھتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جیسا کہ آئندہ آیات میں بھی اشارہ کیا گیا ہے وہ "شرک فی العبادۃ" میں گرفتار تھے اور عملی طور پر اپنے مذہبی علماء اور پیشواؤں کی پرستش کرتے تھے۔ گناہوں کی بخشش جو خدا کے ساتھ مخصوص ہے وہ ان سے چاہتے تھے اور خدائی احکام میں تحریف کرنے کے بعد تحریف شدہ احکام کو باقاعدہ مانتے تھے۔

باقی رہا معاد و قیامت کے بارے میں ان کا ایمان تو وہ بھی تحریف شدہ ایمان تھا کیونکہ معاد کو وہ معادِ روحانی میں منحصر سمجھتے تھے جیسا کہ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا مبداء اور معاد دونوں پر ان کا ایمان مخدوش ہے۔

اس کے بعد ان کی دوسری صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ محرماتِ خداوندی کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور جسے خدا اور اس کا پیغمبر حرام کر چکے تھے اسے حرام شمار نہیں کرتے تھے (ولا یحرمون ما حرم اللّٰہ ورسولہ)۔

ہو سکتا ہے کہ "رسولہ" (اس کا رسول) سے مراد حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ ہوں کیونکہ وہ لوگ اپنے دین کے محرمات کے بھی عملی طور پر وفادار نہیں ہیں۔ بہت سے ایسے اعمال جو حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ کے دین میں حرام قرار دیئے گئے ہیں ان کا ارتکاب کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کا ارتکاب کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات انہیں حلال قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "رسولہ" سے مراد پیغمبر اسلامؐ ہوں یعنی یہ جو ان کے خلاف جہاد کا حکم دیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے پیغمبر اسلامؐ کے ذریعے حرام کیا ہے اس کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے اور ہر قسم کے گناہوں کے مرتکب

ہوتے ہیں

یہ احتمال زیادہ قرینِ نظر ہے اور اس کی شاہد اسی سورت کی آیت ۳۳ ہے جس کی تفسیر عنقریب بیان کی جائے گی، جس میں فرمایا گیا ہے:

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق

وہ خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو دینِ حق کی ہدایت کے لیے بھیجا۔

علاوہ ازیں قرآن مجید میں جہاں لفظ رسولہ بطورِ مطلق بولا جائے وہاں اس سے مراد پیغمبر اسلامؐ ہوتے ہیں۔ اس سے قطع نظر اگر مراد خود انہی کا پیغمبر ہوتا تو پھر مفرد کی صورت میں نہ کہا بلکہ تثنیہ یا جمع کی صورت میں کہتا کیونکہ ان کا اپنا رسول تھا یا رسل تھے جیسا کہ سورہ یونس کی آیہ ۱۳ میں آیا ہے:

وجآءتھم رسلھم بالبینٰت

یعنی — ان کے رسل اُن کے لیے واضح دلائل لائے تھے۔

ایسی تعبیر قرآن کی دیگر آیات میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

ممکن ہے کہا جائے کہ اس صورت میں یہ آیت توضیح واضحات میں سے ہو گی کیونکہ واضح ہے کہ غیر مسلم دینِ اسلام کے تمام محرمات کو قبول نہیں کرتے لیکن توجہ کرنا چاہیے کہ ان صفات کو بیان کرنے کا مقصد ان کے خلاف جہاد کے جائز ہونے کی علت بیان کرنا ہے۔ یعنی ان سے جہاد اس لیے جائز ہے کہ وہ محرماتِ اسلامی کو قبول نہیں کرتے اور بہت سے گناہوں میں آلودہ ہیں لہٰذا اگر وہ جنگ اور مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور ایک پُر امن اقلیت بن کر نہ رہیں تو پھر ان سے جنگ کی جا سکتی ہے۔

آخر میں ان کی تیسری صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے: وہ پورے طور پر دینِ حق قبول نہیں کرتے (ولا یدینون دین الحق)۔ اس جملے کے بارے میں بھی گذشتہ دونوں احتمالات ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ "دینِ حق" سے مراد "دینِ اسلام" ہی ہے کہ جس کی طرف چند آیات کے بعد اشارہ کیا گیا ہے۔

محرماتِ اسلامی پر اعتقاد نہ رکھنے کی بات کر کے اس بات کا بیان خاص کے بعد عام بات بیان کرنے کی طرح ہے یعنی پہلے بہت سے محرمات میں ان کے آلودہ ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ یہ آلودگی خصوصیت سے چبھنے والی ہے۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے کہ دراصل یہ لوگ دینِ حق کے سامنے سرنگوں ہی نہیں ہیں یعنی ان کے ادیان راہِ حقیقی سے منحرف ہو چکے ہیں۔ وہ بہت سے حقائق فراموش کر چکے ہیں اور ان کی بجائے اپنے دین میں بہت سے خرافات شامل کر چکے ہیں۔ لہٰذا یا تو وہ ارتقائی اور کامل تر انقلابِ اسلام کو قبول کر لیں اور اپنی مذہبی فکر کی نئی دنیا بنا لیں اور یا کم از کم ایک پُر امن اقلیت کے طور پر مسلمانوں کے ساتھ رہیں اور صلح آمیز شرائط زندگی قبول کریں۔

یہ تین اوصاف جو درحقیقت ان سے جہاد کے جواز بیان کرنے کے لیے ہیں، ان کے بعد فرمایا گیا ہے: یہ حکم ان کے بارے میں ہے جو اہلِ کتاب ہیں (من الذین اوتوا الکتٰب)۔

اصطلاح کے مطابق لفظ "من" یہاں بیانیہ ہے نہ کہ تبعیضیہ۔ دوسرے لفظوں میں قرآن کہتا ہے کہ (افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ) تمام گذشتہ آسمانی کتب کے پیروکار ان مذہبی انحرافات میں گرفتار ہیں اور یہ حکم ان سب کے بارے میں ہے۔
اس کے بعد ان کے اور بت پرستوں کے درمیان فرق ایک ہی جملے میں بیان کر دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: جب تک وہ جزیہ ادا نہ کرنے لگ جائیں یہ جنگ جاری رہے گی (حتّٰی یعطوا الجزیۃ عن ید و ھم صٰغرون)۔

"جزیۃ" "جزاء" کے مادہ سے ہے اس سے مراد وہ مال ہے جو اُن غیر مسلموں سے لیا جائے جو حکومت اسلامی کی پناہ میں رہیں لہٰذا اس کا یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ یہ مال اپنی جان و مال کی حفاظت کے بدلے جزاء کے طور پر حکومت اسلامی کو دیتے ہیں۔ اس لفظ کا یہ مفہوم راغب نے مفردات میں بیان کیا ہے۔

"صاغر" "صغر" (بروزن "پسر") کے مادہ سے ہے اور یہ ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اپنے چھوٹے ہونے پر راضی ہو اور مندرجہ بالا آیت میں اس سے مراد یہ ہے کہ جزیہ ادا کرنا دین اسلام اور قرآن کے سامنے اظہارِ خضوع کے طور پر ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ پُرامن بقائے باہمی کی علامت اور حاکم اکثریت کے سامنے ایک صلح مند محترم اقلیت کی حیثیت کی نشانی کے طور پر ہو۔

یہ جو بعض مفسرین نے اس کی تفسیر اہل کتاب کی تحقیر و توہین کے طور پر کی ہے وہ نہ تو لفظ کے لغوی مفہوم سے ظاہر ہوتی ہے اور نہ ہی تعلیماتِ اسلامی کی روح سے یہ بات مطابقت رکھتی ہے اور نہ ہی مذہبی اقلیتوں سے سلوک کے بارے میں دیگر احکام جو ہم تک پہنچے ہیں ان سے مناسبت رکھتی ہے۔

ایک اور قابلِ توجہ نکتہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں اگرچہ شرائط ذمہ میں سے صرف جزیہ کو سامنے رکھا گیا ہے لیکن "ھم صٰغرون" کی تعبیر باقی شرائط کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہے کیونکہ اس سے ایسی شرائط معلوم ہوتی ہیں مثلاً وہ اسلامی معاشرے میں خلافِ اسلام تبلیغات اور پراپیگنڈا نہیں کریں گے، مسلمانوں کے دشمنوں کا ساتھ نہیں دیں گے اور مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی نہیں کریں گے کیونکہ ایسے کام خضوع، تسلیم اور ہمکاری کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتے۔

جزیہ کیا چیز ہے؟

جزیہ ایک طرح کا اسلامی ٹیکس ہے جو افراد سے متعلق ہوتا ہے نہ کہ اموال اور زمینوں سے دوسرے لفظوں میں جزیہ فی کس سالانہ ٹیکس ہے۔

بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ اس لفظ کی اصل غیر عربی ہے اور قدیم فارسی لفظ "گزیت" سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ایسا ٹیکس جو فوج کی تقویت کے لیے لیا جائے لیکن بہت سے علماء کا نظریہ ہے کہ یہ خالص عربی لفظ ہے اور جیسا کہ ہم پہلے نقل کر چکے ہیں "جزاء" کے مادہ سے اس مناسبت سے لیا گیا ہے کہ مذکورہ مالیہ اس تحفظ اور امنیت کی جزاء اور بدل ہے جو اسلامی حکومت مذہبی اقلیتوں کو فراہم کرتی ہے۔

جزیہ اسلام سے پہلے بھی تھا۔ بعض کا نظریہ ہے کہ سب سے پہلے ساسانی بادشاہ نوشیرواں نے جزیہ وصول کیا لیکن اگر

اس بات کو درست نہ بھی سمجھا جائے تب بھی کم از کم یہ بات مسلم ہے کہ نوشیرواں وہ شخص تھا جس نے اپنی قوم سے جزیہ لیا تھا اور وہ ہر اس شخص سے جو حکومت کا کارندہ نہیں تھا اور اس کی عمر بیس سے پچاس سال تک تھی ۱۲، ۸، ۶ یا ۴ درہم کے فرق سے فی نفر ٹیکس وصول کیا کرتا تھا۔

ان مالیات کا فلسفہ یہ لکھا گیا ہے کہ کسی ملک کے وجود، آزادی اور امن کی حفاظت اس ملک کے ہر فرد کی ذمہ داری ہے لہٰذا جب ایک گروہ اس فریضے کی انجام دہی کے لیے قیام کرے اور دوسرا گروہ کسب و کار میں مشغول ہونے کی وجہ سے مجاہدین کی صف میں شامل نہیں ہو سکتا تو پھر کسب و کار میں مشغول گروہ کا فریضہ ہے کہ وہ فوج اور محافظانِ امن و امان کے اخراجات فی کس سالانہ ٹیکس کی صورت میں ادا کرے۔ ہمارے پاس ایسے قرائن موجود ہیں جو قبل از اسلام اور بعد از ظہورِ اسلام کے ادوار میں جزیہ کے بارے میں اس فلسفہ کی تاکید کرتے ہیں۔

نوشیروان کے زمانہ میں جزیہ دینے والوں میں (بیس سے پچاس سال تک کا) سن و سال کا مذکورہ معیار ہماری اس بات کا شاہد ہے کیونکہ اس عمر کے افراد در حقیقت عمر کے اس گروپ سے مربوط تھے جو ہتھیار اٹھانے اور امن و امان اور ملک کے استقلال کی حفاظت میں شریک ہونے کی طاقت رکھتا تھا لیکن کاروبار میں مشغول ہونے کی وجہ سے وہ لوگ اس کی بجائے جزیہ دیتے تھے۔

دوسرا گروہ یہ ہے کہ اسلام میں جزیہ مسلمانوں پر نہیں ہے کیونکہ سب پر جہاد واجب ہے اور ضرورت کے وقت سب کو میدانِ جنگ میں دشمن کے مقابلے میں جانا پڑے گا لیکن مذہبی اقلیتوں کے لیے چونکہ جہاد میں شرکت کرنا معاف ہے لہٰذا اس کے بجائے انہیں جزیہ دینا چاہیے تاکہ اس طرح وہ اسلامی ملک کی سالمیت کی حفاظت میں شریک ہوں جس میں وہ آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں نیز مذہبی اقلیتوں کے بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور نابیناؤں کو جزیہ معاف ہے۔ یہ بھی اسی امر کی ایک اور دلیل ہے۔

سطورِ بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ جزیہ صرف ایک قسم کی مالی امداد ہے جو اہلِ کتاب اس ذمہ داری کے بدلے میں دیتے ہیں جو مسلمان ان کی جان و مال کی حفاظت کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا جو لوگ جزیہ کو ایک قسم کا "حقِ تحقیر" شمار کرتے ہیں وہ اس کی روح اور فلسفے کی طرف توجہ نہیں رکھتے۔ ان لوگوں نے اس حقیقت کی طرف توجہ نہیں کی کہ اہلِ کتاب جب اہلِ ذمہ کی شکل میں ہوں تو حکومتِ اسلامی کی ذمہ داری ہے کہ انہیں ہر قسم کے تعرض اور آزار سے محفوظ رکھے۔ نیز اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ وہ جزیہ ادا کرنے کے بدلے میں آرام اور چین کی زندگی گذارتے ہیں اس کے علاوہ ان پر میدانِ جنگ میں شرکت اور دفاعی و حفاظتی ذمہ داریاں نہیں ہوتیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ حکومت اسلامی کے بارے میں مسلمانوں کی نسبت ان کی ذمہ داری کس قدر کم ہے۔ یعنی وہ سال بھر میں معمولی سی رقم ادا کر کے اسلامی حکومت کی تمام خوبیوں سے استفادہ کرتے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ اس سلسلے میں برابر کے شریک ہوتے ہیں جب کہ حوادث و خطرات کا سامنا نہیں نہیں کرنا پڑتا۔

اس فلسفے کی تائید کرنے والے واضح دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ ان عہد ناموں میں جو اسلامی حکومت کے دوران مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے مابین ہوتے تھے اس امر کی تصریح موجود ہے کہ اہلِ کتاب کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ جزیہ ادا کریں

اور اس کے بدلے میں مسلمانوں کا فرض ہوگا کہ وہ ان کی حفاظت کریں یہاں تک کہ اگر کوئی بیرونی دشمن ان کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور انہیں آزار پہنچانے کے درپے ہو تو اسلامی حکومت اہل کتاب کا دفاع کرے گی۔

ایسے عہدنامے بہت سے موجود ہیں۔ ان میں ایک کو ہم بطورِ نمونہ ذیل میں بیان کرتے ہیں۔ یہ عہدنامہ خالد بن ولید نے اطرافِ فرات کے عیسائیوں سے کیا تھا۔ عہدنامے کا متن یہ ہے۔

هٰذا کتاب من خالد بن ولید لصلوبا ابن نسطونا و قومه انی عاهدتکم علی الجزیة والمنعة، فلك الذمة والمنعة، ومامنعناکم فلنا الجزیة والا فلا. کتب سنة اثنتی عشرة فی صفر[1]

یہ خط ہے خالد بن ولید کی طرف سے صلوبا (عیسائیوں کے سردار) اور اس کی قوم کے لیے۔
میں تم سے معاہدہ کرتا ہوں جزیہ اور دفاع پر کہ جس کے مقابلے میں تم ہماری حمایت میں آجاؤ گے اور جب تک ہم تمہاری حمایت کرتے رہیں گے ہم جزیہ لینے کا حق رکھتے ہیں۔
یہ عہدنامہ ۱۲ھ ماہ صفر میں لکھا گیا۔

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ تاریخ میں ہے کہ جب ان کی حفاظت میں کوتاہی ہو جاتی تو انہیں جزیہ واپس کر دیا جاتا یا اصلاً لیا ہی نہ جاتا

اس نکتے کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ جزیہ کی مقدار معین نہیں تھی اور اس کی مقدار کا تعین جزیہ دینے والوں کی طاقت کو دیکھ کر کیا جاتا تھا اور یہ مقدار کبھی کبھی تو ایک دینار سالانہ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ بعض اوقات عہد ناموں میں یہ شرط ہوتی تھی کہ جزیہ دینے والوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق جزیہ دیں جو کچھ کہا جا چکا ہے اس تمام سے طرح طرح کے اعتراضات اور زہر افشانیاں جو اس اسلامی حکم کے سلسلے میں کی گئی ہیں ختم ہو جائیں گی اور اس سے ثابت ہو جائے گا کہ یہ ایک عادلانہ اور منطقی حکم ہے۔

۳۰۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ○

۳۱۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ

---

[1] تفسیر المنار جلد ۱۰ صفحہ ۲۹۱۔

الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا ۖ
لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ۝
۳۲۔ يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا
أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝
۳۳۔ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ
عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝

النّصف

ترجمہ

۳۰۔ یہودیوں نے کہا کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ بات جو وہ اپنی زبان سے کہتے ہیں ایسی ہے جو گذشتہ کافروں کی بات کے مشابہ ہے۔ ان پر خدا کی لعنت ہو، وہ کس طرح سے جھوٹ بولتے ہیں۔

۳۱۔ وہ خدا کے مقابلے میں علماء اور راہبوں (تارکین دنیا) کو ہی معبود قرار دیتے ہیں اور اسی طرح مریم کے بیٹے مسیح کو حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ ایک ہی معبود جس کے سوا کوئی معبود نہیں، کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں، وہ اس سے پاک و منزہ ہے کہ جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔

۳۲۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنی پھونکوں سے نور خدا کو بجھا دیں لیکن خدا اس کے علاوہ کچھ نہیں چاہتا کہ وہ اپنے نور کو کامل کرے اگرچہ کافر اسے ناپسند کرتے ہیں۔

۳۳۔ وہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام ادیان پر غلبہ دے اگرچہ مشرک ناپسند کرتے ہیں۔

تفسیر

اہلِ کتاب کی بت پرستی

گذشتہ آیات میں مشرکین کے سلسلے میں بحث تھی۔ یہ بتایا گیا تھا کہ ان کا معاہدہ منسوخ ہو چکا ہے اور کہا گیا تھا کہ ضروری ہے کہ مذہب بت پرستی کی بساط الٹ دی جائے۔ پھر اہلِ کتاب کی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ وہ چند شرائط کے تحت مسلمانوں کے ساتھ مصالحت آمیز زندگی بسر کر سکتے ہیں اور اگر یہ صورت نہ ہو تو پھر ان کے ساتھ جنگ کا حکم دیا گیا تھا۔

زیرِ بحث آیات میں اہلِ کتاب خصوصاً یہود و نصاریٰ کی مشرکین اور بت پرستوں سے جو شباہت پائی جاتی ہے اسے بیان کیا گیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ اگر اہلِ کتاب کے بارے میں بھی کسی حد تک سخت گیری عمل میں لائی گئی ہے تو وہ بھی توحید سے ان کے انحراف، ایک طرح سے "عقیدہ میں شرک" اور ایک لحاظ سے "عبادت میں شرک" کی وجہ سے ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے یہودیوں نے کہا کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے (و قالت الیهود عزیر ابن الله) اور عیسائیوں نے بھی کہا کہ مسیح خدا کا بیٹا ہے (و قالت النصاری المسیح ابن الله)۔

یہ ایسی بات ہے جو وہ صرف زبان سے کہتے ہیں جب کہ اس میں کوئی حقیقت نہیں (ذلک قولهم بافواههم)۔ ان کی یہ گفتگو گذشتہ مشرکین کی گفتار سے شباہت رکھتی ہے (یضاهئون قول الذین کفروا من قبل)۔ خدا انہیں قتل کرے، اپنی لعنت میں گرفتار کرے اور اپنی رحمت سے دور کر دے، وہ کس طرح کا جھوٹ بولتے ہیں اور حقائق میں تحریف کرتے ہیں (قاتلهم الله انّیٰ یؤفکون)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ عزیر کون ہیں؟ عربی زبان میں "عزیر" انہی کو کہا جاتا ہے جو یہودیوں کی لغت میں "عزرا" کہلاتے ہیں۔ عرب چونکہ جب غیر زبان کا کوئی نام اپناتے ہیں تو عام طور پر اس میں تبدیلی کر دیتے ہیں خصوصاً اظہارِ محبت کے لیے اسے صیغۂ تصغیر میں بدل لیتے ہیں۔ "عزرا" کو بھی "عزیر" میں تبدیل کیا گیا ہے جیسا کہ "عیسیٰ" کے اصل نام کو جو دراصل "یسوع" تھا اور "یحییٰ" کو جو کہ "یوحنا" تھا بدل دیا[1]

بہر حال عزیر یا عزرا یہودیوں کی تاریخ میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں یہاں تک کہ ان میں سے بعض ملت و قوم

---

[1] جیسا کہ عربی مباحث میں آیا ہے تصغیر سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کی چھوٹی نوع کو بیان کرنے کے لیے اس کے اصل صیغے سے ایک خاص صیغہ بنایا جاتا ہے مثلاً "رجل" (مرد) کی تصغیر "رجیل" (چھوٹا مرد) ہے البتہ بعض اوقات اس لفظ کا استعمال چھوٹے ہونے کے لحاظ سے نہیں ہوتا بلکہ اس شخص یا چیز سے اظہارِ محبت کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ انسان اپنے بیٹے سے اظہارِ محبت کرتا ہے۔

کی بنیاد اور اس جمعیت کی تاریخ کی درخشندگی کی نسبت ان کی طرف دیتے ہیں۔ درحقیقت حضرت عزیر نے اس دین کی بڑی خدمت کی ہے کیونکہ بخت النصر کے واقعہ میں جو بابل کا بادشاہ تھا یہودیوں کی کیفیت اس کے ہاتھوں درہم برہم ہوگئی۔ ان کے شہر بخت النصر کی فوج کے ہاتھ آگئے۔ ان کا عبادت خانہ ویران ہوگیا اور ان کی کتاب تورات جلا دی گئی۔

ان کے مرد قتل کردیئے گئے اور ان کی عورتیں اور بچے قید کرکے بابل کی طرف منتقل کردیئے گئے اور وہ تقریباً ایک سو سال وہیں رہے۔

پھر جب ایران کے بادشاہ کورش نے بابل فتح کیا تو عزرا جو اس وقت کے یہودیوں کے ایک سردار اور بزرگ تھے اس کے پاس آئے اور اسے ان کے بارے میں سفارش کی۔ کورش نے ان سے موافقت کی کہ یہودی اپنے شہروں کی طرف پلٹ جائیں اور نئے سرے سے تورات لکھی جائے۔ اسی لیے یہودی انہیں ایک نجات دہندہ اور اپنے دین کا زندہ کرنے والا سمجھتے ہیں۔ اسی بنا پر ان کا حد سے زیادہ احترام کرتے ہیں۔[1]

اسی امر کے سبب یہودیوں کے ایک گروہ نے انہیں "ابن اللہ" (اللہ کا بیٹا) کا لقب دیا۔ اگرچہ بعض روایات سے مثلاً احتجاج طبرسی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ لقب حضرت عزیر کے احترام کے طور پر استعمال کرتے تھے لیکن اسی روایت میں ہے کہ جب پیغمبر اسلامؐ نے ان سے پوچھا کہ اگر تم حضرت عزیر کا ان عظیم خدمات کی وجہ سے احترام کرتے ہو اور اس بنا پر انہیں اس نام سے پکارتے ہو تو پھر یہ لقب حضرت موسیٰ کو کیوں نہیں دیتے جب کہ انہوں نے حضرت عزیر کی نسبت تمہاری بہت زیادہ خدمت کی ہے تو وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے اور نہ ہی اس کا کوئی جواب تھا۔[2]

بہر حال اس نام نے بعض لوگوں کے اذہان میں احترام سے بالاتر صورت ہو گئی اور جیسا کہ عوام کی روش ہے کہ اس سے اپنی فطرت کے مطابق حقیقی مفہوم لیتے تھے اور انہیں واقعاً خدا کا بیٹا خیال کرتے تھے کیونکہ ایک تو حضرت عزیر نے انہیں دربدر کی زندگی سے نجات دی تھی اور دوسرا تورات لکھ کر ان کے دین کو ایک نئی زندگی بخشی تھی۔ البتہ ان سب کا یہ عقیدہ نہ تھا لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک گروہ خصوصیت سے جو پیغمبر اسلامؐ کے زمانے میں تھا کی یہی طرز فکر تھی یہی وجہ ہے کہ کسی تاریخ میں یہ نہیں ہے کہ انہوں نے زیر بحث آیت سن کر اس سے انکار کیا ہو یا انہوں نے کوئی آواز بلند کی ہو اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً وہ کوئی ردِ عمل ظاہر کرتے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے کہ آج یہودیوں میں ایسا عقیدہ موجود نہیں ہے اور کوئی شخص حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا نہیں سمجھتا تو پھر قرآن نے کیوں اس کی نسبت ان کی طرف دی ہے؟

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ تمام یہودی ایسا عقیدہ رکھتے ہوں البتہ یہ مسلم ہے کہ آیات قرآن کے نزول کے وقت یہودیوں میں ایسے عقائد رکھنے والے موجود تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ کبھی کسی نے مذکورہ نسبت کا انکار نہیں

---

[1] المیزان جلد ۹ صفحہ ۲۵۳ اور المنار جلد ۱۰ صفحہ ۳۲۲۔

[2] نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۰۵۔

کیا صرف روایات کے مطابق اس کی توجیہ کی جاتی تھی اور حضرت عزیر کو ابن اللہ کہنے کو ایک طرح کا احترام قرار دیتے تھے۔ اسی لیے جب پیغمبر اسلام نے یہ اعتراض کیا کہ پھر ایسا ہی احترام حضرت موسیٰ کے بارے میں کیوں نہیں کرتے ہو تو وہ جواب سے عاجز رہ گئے تھے۔

بہرکیف جب کسی عقیدے کی نسبت کسی قوم کی طرف دی جائے تو ضروری نہیں کہ اس کے تمام افراد اس سے متفق ہوں بلکہ اگر ایک قابلِ توجہ تعداد ایسا عقیدہ رکھتی ہو تو کافی ہے۔

۲۔ مسیحؑ خدا کے بیٹے نہ تھے: عیسائیوں کے بارے میں کوئی شک نہیں کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا حقیقی بیٹا سمجھتے تھے اور اس نام کا صرف احترام کے طور پر نہیں بلکہ حقیقی معنی میں ان پر اطلاق کرتے ہیں اور صراحت سے اپنی کتابوں میں کہتے ہیں کہ مسیح کے علاوہ اس نام کا حقیقی معنی میں کسی اور پر اطلاق جائز نہیں اور جیسا کہ ہم (جلد ۲ ص ۲۵۳ تا ۲۶۱ اُردو ترجمہ میں) کہہ چکے ہیں کہ حضرت مسیح نے کبھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا۔ وہ تو اپنا تعارف صرف خدا کا بندہ اور اس کا پیغمبر ہونے کی حیثیت سے کرواتے تھے اور اصولاً اس کی کوئی وجہ نہیں کہ باپ بیٹے کا رابطہ جو کہ عالم مادہ اور عالم ممکنات کے ساتھ مربوط ہے وہ خدا اور کسی شخص کے درمیان موجود ہو۔

۳۔ یہ خرافات دوسروں سے اخذ کیے گئے: مندرجہ بالا آیت میں قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ ان کجرویوں میں گذشتہ بت پرستوں کی طرح ہیں اور ان سے شباہت رکھتے ہیں۔

وہ بعض خداؤں کو باپ خدا اور بعض کو بیٹا خدا یہاں تک کہ بعض کو ماں خدا اور بیوی خدا جانتے تھے۔ ہندوستان چین اور قدیم مصر کے بت پرستوں کے اصولِ عقائد میں ایسے ہی افکار دکھائی دیتے ہیں۔ یہی افکار بعد ازاں یہودیوں اور عیسائیوں میں داخل ہو گئے۔ تو گویا انہوں نے ان میں بت پرستوں ہی کی تقلید کی ہے۔

دورِ حاضر میں بعض محققین اس فکر میں ہیں کہ عہدین (تورات، انجیل اور ان سے متعلق کتب) کے مندرجات کا بدھ مذہب اور برہمنوں سے موازنہ کیا جائے اور ان کتب کے مضامین کی جڑیں اُن کے عقائد میں تلاش کی جائیں۔ اور یہ بات دیکھی جاسکتی ہے کہ انجیل اور تورات کے بہت سے معارف بدھ مذہب اور برہمنوں کے خرافات پر منطبق ہوتے ہیں یہاں تک کہ بہت سے واقعات و حکایات جو انجیل میں ہیں بعینہ وہی ہیں کہ جو ان دو مذاہب میں نظر آتے ہیں۔

محققین تو آج اس فکر میں پڑے ہیں قرآن نے تو چودہ سو سال پہلے مندرجہ بالا آیت میں تطبیقی اشارے سے اس حقیقت کو بیان کر دیا ہے۔

۴۔ "قاتلھم اللہ" کا مفہوم: "قاتلھم اللہ" اگرچہ اصل میں اس معنی میں ہے کہ خدا ان سے جنگ کرے یا خدا انہیں قتل کر دے لیکن جیسا کہ طبرسی نے مجمع البیان میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ یہ جملہ لعنت سے کنایہ ہے یعنی خدا انہیں اپنی رحمت سے دور رکھے۔

اگلی آیت میں (اعتقادی شرک کے مقابلے میں) ان کے عملی شرک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں "شرک در عبادت" کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہود و نصاریٰ نے پروردگار کے مقابلے میں اپنے علماء اور

راہبوں کو اپنا خدا قرار دیا (اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ) بغیر مسیح ابن مریم کو بھی مرتبۂ الوہیت پر فائز مانا (والمسیح بن مریم)۔

* احبار "حبر" کی جمع ہے اور "رھبان" "راھب" کی جمع ہے۔ "حبر" عالم و دانشمند کو کہتے ہیں اور راہب ایسے شخص کو کہتے ہیں جس نے ترک دنیا کے طور پر دیر یا گرجے میں سکونت اختیار کر رکھی ہو اور مشغول عبادت رہتا ہو۔

کیا یہود و نصاریٰ اپنے پیشواؤں کی عبادت کرتے تھے

اس میں شک نہیں کہ یہود و نصاریٰ اپنے علماء اور راہبوں کو سجدہ نہیں کرتے تھے اور نہ ان کے لیے نماز، روزہ یا دیگر عبادات انجام دیتے تھے لیکن چونکہ انہوں نے غیر مشروط طور پر اپنے آپ کو ان کی اطاعت میں دے رکھا تھا یہاں تک کہ حکم خدا کے خلاف بھی جو احکام وہ دیتے تھے انہیں واجب العمل سمجھتے تھے۔ اس اندھی اور غیر منطقی پیروی کو خدا نے عبادت سے تعبیر کیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک روایت میں یہ معنی بیان کیا گیا ہے۔ انہوں نے فرمایا:

اما واللہ ما صاموا لھم ولا صلوا ولکنھم احلوا لھم حراما وحرموا علیھم حلالا فاتبعوھم وعبدوھم من حیث لا یشعرون

خدا کی قسم! وہ (یہود و نصاریٰ) اپنے پیشواؤں کے لیے روزہ نماز نہیں بجا لائے لیکن ان کے پیشواؤں نے ان کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کیا اور انہوں نے اسے قبول کر لیا، ان کی پیروی کی اور توجہ کیے بغیر ان کی پرستش کی[1]

ایک اور حدیث میں ہے:

عدی بن حاتم کہتا ہے: میں رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ طلائی صلیب میری گردن میں تھی۔ آپ نے مجھ سے فرمایا:

اے عدی! یہ بت اپنی گردن سے اتار دو۔

میں نے ایسا ہی کیا۔ پھر میں آپ کے مزید قریب گیا تو میں نے سنا کہ آپ یہ آیت تلاوت کر رہے تھے:

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا ۔۔۔۔

جب آپ نے آیت تمام کی تو میں نے عرض کیا: ہم کبھی اپنے پیشواؤں کی پرستش نہیں کرتے۔ آپ

---

[1] مجمع البیان زیر نظر آیت کے ذیل میں اور نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۰۹۔

نے فرمایا:

کیا ایسا نہیں ہے کہ وہ حلال خدا کو حرام اور حرام خدا کو حلال کرتے ہیں اور تم اُن کی پیروی کرتے ہو؟
میں نے کہا: ہاں! ایسا ہی ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا:
یہی ان کی عبادت ہے[1]

اس امر کی دلیل واضح ہے کیونکہ قانون بنانا خدا کا کام ہے اور اس کے علاوہ کوئی حق نہیں رکھتا کہ کوئی چیز لوگوں کے لیے حلال یا حرام کرے اور اسے قانون قرار دے۔ جو کام لوگ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ وہ قوانین کو کشف کریں اور جہاں ضرورت ہو مصادیق پر ان کی تطبیق کریں۔

اس لیے اگر کوئی شخص قوانین الٰہی کے خلاف قانون بنائے اور کوئی اسے باقاعدہ مان لے اور بلا چون و چرا اسے قبول کرے تو گویا وہ غیر خدا کے لیے خدا کے مقام کا قائل ہوا ہے اور یہ ایک طرح کا شرک اور بت پرستی ہے اور دوسرے لفظوں میں غیر خدا کی عبادت ہے۔

قرائن سے نتیجہ نکلتا ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے پیشواؤں کے لیے اس قسم کے اختیارات کے قائل تھے کہ وہ بعض اوقات قوانین الٰہی میں جہاں مصلحت دیکھیں تبدیلی کر دیں اور اب بھی گناہ بخشنے کا طریقہ عیسائیوں میں رائج ہے۔ وہ پادری کے سامنے گناہ کا اعتراف کریں تو وہ کہتا ہے: میں نے بخش دیا[2]

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ عیسائی کی طرف سے حضرت عیسیٰ کی پرستش اور یہودیوں کی طرف سے اپنے پیشواؤں کی پرستش کی نوعیت میں فرق ہے۔ عیسائی حقیقتاً حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا سمجھتے تھے جب کہ یہودی اپنے پیشواؤں کی غیر مشروط اطاعت کی وجہ سے ان کی عبادت کرتے تھے لہٰذا مندرجہ بالا آیت نے بھی اس فرق کو ملحوظ رکھا ہے اور ان کا حساب ایک دوسرے سے الگ رکھا ہے آیت کہتی ہے:

اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ

پھر حضرت مسیح کا ذکر جدا کیا گیا ہے:

والمسیح ابن مریم

یہ صورت نشاندہی کرتی ہے کہ قرآنی تعبیرات میں ہر طرح کی باریکیوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

آخر میں اس معاملے کی تاکید کی گئی ہے کہ یہ سب انسان پرستیاں بدعت اور جعلی مسائل میں سے ہیں اور کبھی بھی ان کا حکم نہیں دیا گیا کہ اپنے لیے کئی ایک خدا بنا لو بلکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ صرف ایک تنہا خدا کی پرستش کرو (وما امروا الا لیعبدوا الٰھا واحدا) وہ معبود کہ جس کے علاوہ کوئی بھی پرستش کے لائق نہیں (لا الٰہ الا ھو) وہ معبود جو منزہ ہے اس سے جسے اس

---

[1] مجمع البیان مذکورہ آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر نمونہ جلد دوم میں اہل کتاب کی انسان پرستی کے بارے میں ہم نے کچھ وضاحتیں کی ہیں (دیکھئے صفحہ ۳۴۹، اردو ترجمہ)۔

کا شریک قرار دیتے ہیں (سبحانہ عما یشرکون)۔

ایک اصلاحی درس

قرآن مجید مندرجہ بالا آیت میں اپنے پیروکاروں کو ایک بہت ہی قیمتی درس دیتا ہے اور توحید کا ایک اعلیٰ ترین مفہوم اس سلسلے میں دلنشین کرواتا ہے اور کہتا ہے کہ کوئی مسلمان یہ حق نہیں رکھتا کہ کسی انسان کی بلا شرط اطاعت قبول کرے کیونکہ یہ کام اس کی پرستش کے مساوی ہے۔ تمام اطاعتیں اطاعت الٰہی میں محدود ہونا چاہئیں اور حکم انسانی کی پیروی اس وقت تک ہی جائز ہے جب تک وہ قوانین خداوندی کے مخالف نہ ہو چاہے حکم دینے والا انسان کیسا ہی کیوں نہ ہو اور کتنا ہی بلند مقام کیوں نہ رکھتا ہو۔

ایسا اس لیے ہے کہ بلا شرط اطاعت عبادت کے مساوی ہے اور بت پرستی اور عبودیت کی ایک شکل ہے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان اس اہم اسلامی حکم سے دور ہونے اور انسانی بت بنا لینے کی وجہ سے تفرقہ بازی، پراگندگی، استعمار اور استثمار کا شکار ہو گئے ہیں۔ جب تک یہ بت نہیں توڑے جائیں گے اور انہیں دور نہ کیا جائے گا اس وقت تک بے سرو سامانیاں اور پریشانیاں برطرف نہیں ہو سکتیں۔

اصولی طور پر ایسی بت پرستی زمانہ جاہلیت کی بت پرستی کہ جس میں پتھر اور لکڑی کے سامنے سجدہ کیا جاتا تھا سے زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ وہ بے روح بت اپنے پجاریوں کو کبھی استعمال نہیں کرتے تھے لیکن انسان جب بتوں کی جگہ لیتے ہیں تو وہ اپنی خود غرضی کی بناء پر اپنے پیروکاروں کو اپنی قید کی زنجیروں میں جکڑ لیتے ہیں اور انہیں ہر طرح کی پستی اور بدبختی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

زیر بحث آیات میں سے تیسری میں قرآن نے یہودیوں اور عیسائیوں یا تمام مخالفین اسلام یہاں تک کہ مشرکین کی بھی جان توڑ اور بے نتیجہ کوششوں کو ایک جاذب نظر تشبیہ کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ چاہتے ہیں کہ اپنی پھونکوں سے نورِ خدا کو خاموش کر دیں لیکن خدا کا ارادہ ہے کہ اس نورِ الٰہی کو اسی طرح وسیع اور کامل کرے یہاں تک کہ وہ تمام دنیا پر چھا جائے اور تمام لوگ اس کے سائے سے مستفید ہوں اگرچہ کافروں کو یہ ناپسند ہے (یریدون ان یطفئوا نور اللہ بافواھھم ویأبی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون)۔

چند اہم نکات

۱۔ نور سے تشبیہ: اس آیت میں دین خدا، قرآن مجید اور تعلیمات اسلامی کو نور اور روشنی سے تشبیہ دی گئی ہے اور ہم جانتے ہیں کہ نور زندگی، حرکت، نشوونما اور روئے زمین پر آبادی کا سرچشمہ ہے اور ہر قسم کے حسن و زیبائی کا منشاء ہے۔

اسلام بھی تحرک آفرین دین ہے جو انسانی معاشرے کو تکامل وارتقاء کی راہ میں آگے لے جاتا ہے اور ہر خیر و برکت کا منبع ہے دشمنوں کی کاوشوں کو بھی پھونکوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ انسان نور آفتاب کی طرح کی روشنی کو پھونکوں سے بجھانے کی کوشش کرے اور ان کی کوششوں کے حقیر اور ناچیز ہونے کی تصویر کشی کے لیے اس سے عمدہ اور رسا تر تعبیر نظر نہیں آتی۔ درحقیقت حضرت حق کے بے پایاں ارادے اور لامتناہی قدرت کے مقابلے میں عاجز و ناتواں مخلوق کی

کوششیں اس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔

۲۔ نور خدا کو بجھانے کی مساعی کا دو مرتبہ ذکر: نور خدا کو بجھانے کی کوششوں کا ذکر قرآن میں دو مواقع پر آیا ہے۔ ایک زیر بحث آیت میں اور دوسرا سورہ صف کی آیہ ۸ میں۔ دونوں مقامات پر یہ بات دشمنانِ اسلام کی مساعی پر تنقید کے طور پر ہے لیکن ان دونوں آیات میں تھوڑا سا فرق نظر آتا ہے۔ زیر بحث آیت میں ہے:

یریدون ان یطفئوا

جبکہ سورہ صف میں ہے:

یریدون لیطفئوا

تعبیر کا یہ فرق یقیناً کسی نکتے کی طرف اشارہ ہے۔ مفردات میں راغب ان دونوں تعبیرات کے فرق کی وضاحت کے سلسلے میں کہتا ہے کہ پہلی آیت میں بغیر مقدمہ و وسیلہ کے بجھانے کی طرف اشارہ ہے لیکن دوسری آیت میں مقدمات و اسباب کے ذریعے بجھانے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی وہ اسباب کے بغیر یا پورے وسائل کے ساتھ نورِ حق کو بجھانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۳۔ "یأبی" کا مفہوم: "یأبی" مادہ "اباء" سے ہے اس کا مطلب ہے سختی سے کسی چیز سے روکنا اور منع کرنا۔ یہ تعبیر دینِ اسلام کی تکمیل اور پیش رفت کے لیے پروردگار کے حتمی ارادے اور مشیت کا ثبوت دیتی ہے اور اس دین کے مستقبل کے بارے میں تمام مسلمانوں کو ایک ولولہ اور امید دلاتی ہے ـــــ اگر مسلمان واقعی اور حقیقی مسلمان ہوں۔

اسلام کی عالمگیر حکومت

آخرکار زیرِ بحث آخری آیت میں مسلمانوں کو اسلام کے عالمگیر ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ گذشتہ آیت کی بحث جس کا مقصد یہ ہے کہ دشمنانِ اسلام کی جان توڑ کوششیں بارآور نہیں ہوں گی۔ اس کی بھی تکمیل کرتے ہوئے صراحت سے فرمایا گیا ہے وہ ایسی ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے تمام ادیان پر کامیابی اور غلبہ دے اگرچہ مشرکین اسے پسند نہیں کرتے (ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون)۔

ہدایت سے مراد روشن دلائل اور واضح براہین ہیں جو دینِ اسلام میں موجود ہیں اور دینِ حق سے مراد یہی دین ہے جس کے اصول اور فروع حق ہیں۔ مختصر یہ کہ اس کی تاریخ، اس کے مدارک اور اس کا ماحصل سب حق ہے اور بلاشبہ وہ دین جس کے مضامین بھی حق ہیں اور جس کے دلائل، مدارک اور تاریخ سب روشن ہیں اسے آخرکار تمام ادیان پر غالب اور کامیاب ہونا چاہیے۔

رفتارِ زمانہ، علم کی پیش رفت اور روابط کی آسانی کے ساتھ ساتھ زہریلے پراپیگنڈا کا پردہ ہٹتا جائے گا اور حقائق کا چہرہ آشکار ہوتا چلا جائے گا۔ اور مخالفینِ حق اس کی راہ میں جو رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گی۔ یوں دینِ حق تمام جگہوں پر محیط ہو جائے گا چاہے حق کے دشمن نہ چاہیں اور چاہے اپنی مذموم حرکتوں سے باز نہ آئیں کیونکہ ان کی حرکتیں راہِ تاریخ کے خلاف ہیں اور سنتِ آفرینش کی ضد ہیں۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ ہدایت اور دینِ حق سے کیا مراد ہے؟ یہ جو مندرجہ بالا آیت میں قرآن کہتا ہے: ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق ـــــ یہ گویا تمام ادیانِ عالم پر اسلام کی کامیابی کی دلیل کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کا عنوان اور متن مبنی بر ہدایت ہے اور عقل ہر مقام پر اس کی گواہی دے گی۔ نیز جب اس کے اصول و فروع حق کے موافق اور حق کے خواہاں ہیں تو ایسا دین فطری طور پر تمام ادیان پر کامیابی حاصل کرے گا۔

ہندوستان کے ایک دانشور کے بارے میں مرقوم ہے کہ وہ ایک مدت تک مختلف عالمی ادیان کا مطالعہ کرتا رہا اور ان کے بارے میں اس نے تحقیق کی اور آخر کار بہت زیادہ مطالعہ کرنے کے بعد اس نے اسلام کو قبول کر لیا اور انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی جس کا عنوان تھا "میں مسلمان کیوں ہوا؟" اس میں اس نے تمام ادیان کے مقابلے میں اسلام کی خوبیاں واضح کی ہیں۔ اہم ترین امور جنہوں نے اس کی توجہ جذب کی ان میں سے ایک کے بارے میں وہ کہتا ہے:

اسلام وہ واحد دین ہے جس کی تاریخ ثابت و برقرار اور محفوظ ہے۔

وہ تعجب کرتا ہے کہ یورپ نے ایک ایسا دین کیونکر اپنا رکھا ہے کہ جس میں اس دین کے لانے والے کو ایک انسان کے مقام سے بالاتر لے جا کر اسے اپنا خدا قرار دے لیا ہے جب کہ اس کی کوئی مستند اور قابلِ قبول تاریخ نہیں ہے۔[1]

وہ لوگ جنہوں نے اپنے سابقہ دین کو ترک کر کے اسلام قبول کیا ہے اگر ان کے اظہارات اور خیالات کا مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اس دین کی انتہائی سادگی، اس کے مبنی بر دلیل احکام، اس کے اصول و فروع کے استحکام اور اس کے پیش کردہ انسانی قوانین سے متاثر ہوئے ہیں اور انہوں نے دیکھا ہے کہ اس کے قوانین و مسائل ہر قسم کی بے ہودگی سے پاک ہیں اور ان میں "حق" و "ہدایت" کا نور جلوہ گر ہے۔

۲۔ منطقی غلبہ یا طاقت کا غلبہ: اس سلسلے میں کہ اسلام کس طرح تمام ادیان پر غلبہ حاصل کرے گا اور کامیاب ہوگا اور یہ کامیابی کس صورت میں ہوگی مفسرین میں اختلاف ہے۔

بعض اسے صرف منطقی و استدلالی کامیابی سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسا ہو چکا ہے کیونکہ منطق و استدلال کی نظر سے موجودہ ادیان کا اسلام سے کوئی موازنہ اور مقابلہ نہیں ہے۔

لیکن لفظ "اظہار" جس کا مادہ "لیظھرہ علی الدین ....." میں بھی استعمال ہوا ہے، اگر اس کا قرآن کے دیگر مواقع پر مطالعہ کیا جائے اور جہاں جہاں یہ مادہ استعمال ہوا ہے اس کی تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مادہ زیادہ تر جسمانی غلبہ اور ظاہری قدرت کے لیے آتا ہے۔ جیسا کہ اصحاب کہف کے واقعہ میں ہے:

انھم ان یظھروا علیکم یرجموکم

---

[1] المنار، جلد ۱۰ صفحہ ۳۹۔

اگر وہ (دقیانوس اور اس کا لشکر) تم پر غلبہ حاصل کریں تو تمہیں سنگسار کریں گے۔

(کہف ــ ۲۰)

نیز مشرکین کے بارے میں ہے:

کیف وان یظھروا علیکم لا یرقبوا فیکم الا ولا ذمة

جب وہ تم پر غالب آجاتے ہیں تو رشتہ داری، قرابت اور عہد و پیمان کا لحاظ نہیں کرتے۔

(توبہ ــ ۸)

بدیہی امر ہے کہ ایسے مواقع پر غلبہ منطقی نہیں ہوتا بلکہ عملی اور عینی ہوتا ہے۔

بہرحال زیادہ صحیح یہ ہے کہ مذکورہ غلبہ اور کامیابی کو ہر قسم کا غلبہ سمجھا جائے کیونکہ یہ معنی مفہوم قرآن سے بھی زیادہ مطابقت رکھتا ہے کیونکہ وہاں مطلق طور پر غلبہ کا ذکر ہے یعنی ایک دن ایسا آئے گا جب اسلام منطق و استدلال کے لحاظ سے بھی اور ظاہری نفوذ اور حکومت کے حوالے سے بھی تمام ادیانِ عالم پر کامیابی حاصل کرے گا اور سب اس کے تحت شعاع اور زیرِ نگیں ہوں گے۔

۴۔ قرآن اور قیام مہدیؑ: مندرجہ بالا آیت جو بعینہ انہی الفاظ کے ساتھ سورہ صف میں بھی آئی ہے اور کچھ فرق کے ساتھ اس کا تکرار سورہ فتح میں بھی ہوا ہے ایک اہم واقعہ کی خبر دیتی ہے، جس کی اہمیت اس تکرار کا سبب بنی ہے اور جو اسلام کے عالمگیر ہونے کی خبر دیتی ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے زیر بحث آیت میں کامیابی کو ایک علاقے کی اور محدود کامیابی کے معنی میں لیا ہے کہ جو رسول اللہؐ کے زمانے میں یا آپؐ کے بعد مسلمانوں کو حاصل ہوئی تھی لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیت میں کسی قسم کی قید اور شرط نہیں ہے اور یہ ہر لحاظ سے مطلق ہے لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ اس کے معنی کو محدود قرار دیا جائے۔ آیت کا مفہوم اسلام کی تمام پہلوؤں سے تمام ادیانِ عالم پر کامیابی کی خبر دیتا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر کار اسلام تمام کرۂ زمین پر محیط ہو جائے گا اور تمام عالم پر کامیاب ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی تک ایسا نہیں ہو پایا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ خدا کا یہ حتمی وعدہ تدریجاً اور آہستہ آہستہ عملی شکل اختیار کر رہا ہے۔ دنیا میں اسلام کی تیز رفتار ترقی، یورپ کے مختلف ممالک میں اسے باقاعدہ تسلیم کر لیا جانا، امریکہ اور افریقہ میں اس کا نفوذ، بہت سے دانشوروں اور غیر دانشوروں کا قبولِ اسلام اور اس قسم کے دیگر عوامل نشاندہی کرتے ہیں کہ اسلام عالمی ہونے کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ البتہ مختلف روایات جو منابع اسلامی میں وارد ہوئی ہیں ان کے مطابق اس پروگرام کا تکامل اس وقت ہوگا جب حضرت مہدی علیہ السلام ظہور کریں گے اور اسلام کے عالمی پروگرام کو تحقق بخشیں گے اور عالمی طور پر اسے نافذ کریں گے۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں امام باقر علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر میں آپؑ کا یہ فرمان نقل کرتے ہیں:

ان ذٰلک یکون عند خروج المھدی فلا یبقیٰ احدا الا اقر بمحمد (ص)

اس آیت میں جو وعدہ کیا گیا ہے مہدی آلِ محمدؐ کے ظہور کے وقت صورت پذیر ہوگا۔ اس دن کوئی شخص روئے زمین میں نہیں ہوگا مگر یہ کہ وہ حضرت محمدؐ کی حقانیت کا اقرار کرے گا۔

نیز اسی تفسیر میں پیغمبر اسلامؐ سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

لایبقیٰ علیٰ ظھر الارض بیت مدر ولا وبر الا ادخله الله کلمة الاسلام

دنیا میں کوئی بھی گھر جو پتھر اور مٹی کا، چادر اور خیمے کا اور اُون اور بالوں سے بنا ہو باقی نہیں رہے گا مگر یہ کہ خدا نام اسلام اس میں داخل کردے گا۔

نیز صدوق کی کتاب اکمال الدین میں امام صادقؑ سے اس آیت کی تفسیر میں یوں منقول ہے:

والله مانزل تأویلها بعد ولا ینزل تأویلها حتی یخرج القائم فاذا خرج القائم لم یبق کافر بالله العظیم (نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۱۱)

خدا کی قسم اس آیت کے مضمون نے عملی صورت اختیار نہیں کی اور ایسا صرف اس زمانے میں ہوگا جب "قائم" خروج کریں گے اور جب وہ قیام کریں گے تو ساری دنیا میں کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہے گا جو خدا کا انکار کرے۔

اسی مضمون کی اور احادیث بھی پیشوایان اسلام سے نقل ہوئی ہیں اور بعض مفسرین نے بھی اس آیت کے ذیل میں یہی تفسیر ذکر کی ہے لیکن یہ امر تعجب خیز ہے کہ المنار کے مؤلف نے نہ صرف یہ کہ اس تفسیر کو قبول نہیں کیا بلکہ حضرت مہدیؑ کے بارے میں احادیث چونکہ زیر نظر آیت سے مناسبت رکھتی ہیں اس لیے اس نے ان پر بحث تو کی ہے لیکن شیعوں سے اپنے مخصوص تعصب کی بنا پر بزدلانہ حملوں کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور حضرت مہدیؑ سے مربوط احادیث کا سرے سے انکار کرتے ہوئے انہیں متضاد اور غیر قابلِ قبول قرار دے دیا ہے۔ اس کے گمان میں وجودِ مہدیؑ کا عقیدہ صرف شیعوں سے یا جو شیعوں کی طرف ہیں انہی سے مربوط ہے۔ ان سب باتوں سے قطع نظر اس نے وجودِ مہدی کے عقیدے کو پسماندگی اور تنزل کا ایک عامل قرار دے دیا ہے۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم مجبور ہیں کہ کچھ اختصار سے ظہورِ مہدیؑ سے مربوط روایات کا ذکر کریں۔ نیز اسلامی معاشرے کی ترقی اور ظلم و جور کے خلاف قیام میں اس عقیدے کے اثرات پر بحث کریں تاکہ یہ واضح ہوجائے کہ جب ایک دروازے سے تعصب داخل ہوتا ہے تو علم و دانش دوسرے دروازے سے بھاگ جاتے ہیں۔ اس بحث سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ مذکورہ مفسر اگرچہ اسلامی مسائل میں بہت معلومات رکھتا ہے لیکن تعصب کے اس کمزور پہلو کی وجہ سے اس نے واضح حقائق کو کس طرح الٹی نظر سے دیکھا ہے۔

ظہورِ مہدیؑ اور اسلامی روایات

اگرچہ سنی شیعہ [illegible] نے بہت سی کتب میں قیامِ مہدیؑ سے متعلق احادیث لکھی ہیں لیکن ہماری نظر میں کوئی چیز اس خط سے بڑھ کر گویا اور جچی تلی نہیں جو چند علماء حجاز نے ایک سائل کے جواب میں لکھا ہے لہٰذا ہم اس کا بعینہ ترجمہ قارئین محترم کی خدمت میں پیش کرتے ہیں لیکن پہلے ہم یہ بات یاد دلادیں کہ قیامِ مہدیؑ سے مربوط روایات ایسی ہیں کہ کسی اسلامی محقق نے چاہے وہ کسی گروہ اور مذہب کا پیروکار ہو ان کے تواتر کا انکار نہیں کیا۔ اب تک اس سلسلے میں بہت زیادہ کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور ان کے مؤلفین نے بالاتفاق عالمی مصلح یعنی حضرت مہدیؑ سے مربوط احادیث کی صحت کو قبول کیا ہے۔ صرف معدودے چند افراد مثلاً ابن خلدون اور احمد امین مصری نے ان اخبار و روایات کے پیغمبر اکرمؐ سے صدور کے بارے میں شک و تردید کی ہے۔ البتہ ہمارے پاس ایسے قرآن موجود ہیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کام پر ابھارنے والی چیز ان اخبار کا ضعف نہیں تھا بلکہ ان کا خیال تھا کہ حضرت مہدیؑ

سے مربوط روایات ایسے مسائل پر مشتمل ہیں جن پر آسانی سے یقین نہیں کیا جاسکتا یا اس بنا پر کہ وہ صحیح اور غیر صحیح روایات کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے تھے یا انہیں ان کی تفسیر نہیں مل سکی۔ بہر حال ضروری ہے کہ پہلے اس مسئلے میں اس جواب کو پیش کیا جائے جو "رابطہ عالم اسلامی" کی طرف سے سامنے آیا ہے۔ جب کہ "رابطہ عالم اسلامی" عالم اسلام کے انتہائی سخت گیر افراد — یعنی وہابیوں پر مشتمل ہے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ ظہور مہدیؑ کا معاملہ ایسا ہے جس پر سب مسلمانوں کا اتفاق ہے، ہمارے نظریے کے مطابق اس چھوٹے سے رسالے میں ضروری مدارک کو اس طرح سے جمع کر دیا گیا ہے کہ کسی شخص کو ان کے انکار کی جرأت نہیں ہے اور اگر سخت گیر وہابی حضرات نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے تو اس کی بھی وجہ اس کے یہ نا قابل انکار مدارک ہی ہیں۔

تقریباً ایک سال پہلے ابو محمد نامی ایک شخص نے کینیا سے "رابطہ عالم اسلامی" سے مہدی منتظرؑ کے بارے میں سوال کیا۔ رابطہ کے سربراہ محمد الصالح القزاز نے اس کے جواب میں ضمناً تصریح کی ہے کہ ابن تیمیہ جو مذہب وہابی کا بانی ہے نے بھی ظہور مہدیؑ سے مربوط احادیث کو قبول کیا ہے۔

مذکورہ رسالے کا متن حجاز کے دورِ حاضر کے پانچ مشہور علماء نے تیار کیا ہے۔ اس رسالے میں حضرت مہدیؑ کے نام کی وضاحت کی گئی ہے اور ان کے ظہور کا مقام مکہ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد لکھا گیا ہے:

دنیا میں فتنہ و فساد کے ظہور اور کفر و ظلم کے پھیل جانے پر خداوند عالم اس (مہدیؑ) کے ذریعے دنیا کو عدل و انصاف سے اس طرح معمور کر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے بھری ہو گی۔

وہ ان بارہ خلفاء راشدین میں سے آخری ہے جن کے متعلق پیغمبرؐ نے کتب صحاح میں خبر دی ہے۔

مہدی سے مربوط احادیث بہت سے صحابہ نے پیغمبرؐ سے نقل کی ہیں ان صحابہ میں سے عثمان ابن عفان، علی ابن ابی طالب، طلحہ ابن عبید اللہ، عبدالرحمٰن ابن عوف، قرۃ بن اساس مزنی، عبداللہ ابن حارث، ابوہریرہ، حذیفہ بن یمان، جابر ابن عبداللہ، ابوامامہ، جابر ابن ماجد، عبداللہ ابن عمر، انس ابن مالک، عمران ابن حصین اور ام سلمہ شامل ہیں۔

یہ افراد ان صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے روایات مہدی کو نقل کیا ہے اور ان کے علاوہ بھی بہت افراد موجود ہیں۔

خود صحابہ سے بھی بہت سی باتیں منقول ہیں کہ جن میں ظہور مہدیؑ سے متعلق گفتگو کی گئی ہے کہ جنہیں احادیث پیغمبرؐ کے ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ یہ مسئلہ ایسے مسائل میں سے نہیں ہے کہ جس کے بارے میں اجتہاد کے ذریعے کچھ کہا جاسکے (لہٰذا ظاہر ہے کہ یہ باتیں بھی انہوں نے پیغمبرؐ سے سن کر کی ہیں)۔

مزید لکھا ہے:

مذکورہ بالا احادیث جو پیغمبرؐ سے نقل ہوئی ہیں اور صحابہ کی گواہی جو یہاں حدیث کا حکم رکھتی ہے بہت سی مشہور اسلامی

۱؎ تفسیر کی یہ جلد ۱۴۰۰ ہجری میں شائع ہوئی۔

کتب اور احادیث کی بنیادی کتب میں آئی ہیں چاہے وہ سنن و معاجم ہوں یا مسانید۔ ان میں سے سنن ابوداؤد، سنن ترمذی، ابن عمرو الدانی، مسند احمد، ابن یعلیٰ و بزاز، صحیح حاکم، معاجم طبرانی کبیر و متوسط، رویانی و دارقطنی اور ابونعیم نے اخبار المہدی میں، خطیب نے تاریخ بغداد میں اور ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں اور ان کے علاوہ دیگر علماء کی کتب میں یہ روایات موجود ہیں۔

اس کے بعد مزید لکھا ہے:

بعض علماء اسلام نے اس سلسلے میں مخصوص کتب تالیف کی ہیں جن میں ابونعیم کی "اخبار المہدی"، ابن حجر ہیثمی کی "القول المختصر فی علامات المہدی المنتظر" شوکانی کی "التوضیح فی تواتر ما جاء فی المنتظر والدجال والمسیح"، ادریس عراقی مغربی کی "المہدی" اور ابوالعباس ابن عبدالمؤمن المغربی کی "الوہم المکنون فی الرد علی ابن خلدون" شامل ہیں۔

اور آخری شخص جس نے اس سلسلے میں مفصل بحث کی ہے وہ اسلامی یونیورسٹی مدینہ کا سربراہ ہے جس نے مذکورہ یونیورسٹی کے مجلے کے چند شماروں میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔

مزید لکھا ہے:

قدیم اور جدید بزرگان اور علماء اسلام کی ایک جماعت نے بھی اپنی تحریروں میں تصریح کی ہے کہ مہدی کے سلسلے میں احادیث حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں (اور وہ کسی طرح سے قابل انکار نہیں ہیں) ان میں سے سخاوی نے کتاب "فتح المغیث" میں محمد ابن احمد سفاوینی نے "شرح العقیدہ" میں، ابوالحسن الابری نے "مناقب شافعی" میں، ابن تیمیہ نے "کتاب فتاویٰ" میں، سیوطی نے "الحاوی" میں، ادریس عراقی نے مہدی کے بارے میں اپنی تالیف میں، شوکانی نے "التوضیح فی تواتر ما جاء فی المنتظر" میں، محمد جعفر کتانی نے "نظم المتناثرہ" میں اور ابوالعباس ابن عبدالمؤمن نے "الوہم المکنون..." میں تصریح کی ہے۔

اس بحث کے آخر میں لکھا گیا ہے:

صرف ابن خلدون ہے جس نے چاہا ہے کہ مہدیؑ سے مربوط احادیث پر ایک بے بنیاد اور جعلی حدیث کے سہارے اعتراض کرے اور وہ جعلی حدیث ہے: لا مہدی الا عیسیٰ (مہدی عیسیٰ کے علاوہ کوئی نہیں) لیکن بزرگ آئمہ اور علماء اسلام نے اس کے قول کو رد کیا ہے۔ خصوصاً ابن عبدالمؤمن نے تو اس کے نظریے کے خلاف ایک خصوصی کتاب لکھی ہے کہ جو تیس سال پہلے مشرق و مغرب میں پھیل چکی ہے۔

حفاظ احادیث اور بزرگ علماء حدیث نے بھی تصریح کی ہے کہ مہدیؑ کے بارے میں روایات "صحیح" اور "حسن" احادیث پر مشتمل ہیں اور ان کا مجموعہ متواتر ہے اس لیے ظہور مہدی کا اعتقاد رکھنا (ہر مسلمان پر) واجب ہے اور یہ اہل سنت والجماعت کے عقائد کا جزو شمار ہوتا ہے اور سوائے نادان، جاہل یا بدعتی افراد کے اس کا کوئی انکار نہیں کرتا۔

محمد منتصر کتانی

مدیر ادارہ مجمع فقہی اسلامی

انتظارِ ظہورِ مہدیؑ کے تربیت کنندہ اثرات

گذشتہ بحث میں ہم جان چکے ہیں کہ یہ عقیدہ اسلامی تعلیمات میں کوئی وارداتی پہلو نہیں رکھتا بلکہ ان بہت زیادہ قطعی و یقینی امور میں سے ہے جو بانی اسلام سے بالذات لیے گئے ہیں اور سب اسلامی مکاتب و مذاہب اس سلسلے میں متفق ہیں اور اس کے بارے میں احادیث متواتر ہیں۔

اب ہم موجودہ اسلامی معاشروں کی کیفیت میں اس انتظار کے اثرات کی طرف آتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ کیا اس قسم کے ظہور پر ایمان انسان کو خواب و خیال کی دنیا میں لے جاتا ہے کہ جس سے وہ اپنی موجودہ حیثیت سے غافل ہو جاتا ہے اور ہر قسم کے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے یا یہ کہ واقعاً یہ عقیدہ ایک قسم کے قیام اور فرد اور معاشرے کی تربیت کی دعوت ہے۔

کیا یہ عقیدہ تحرک کا باعث ہے یا جمود کا؟

اور کیا یہ عقیدہ مسئولیت اور ذمہ داری کا احساس ابھارتا ہے یا ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے سے فرار کا باعث بنتا ہے؟

خلاصہ یہ کہ ـــــ کیا یہ نشکری صلاحیتوں کو شل کر دینے والی چیز ہے یا بیدار کرنے والی؟

ان سوالات کی وضاحت و تحقیق سے پہلے ایک نکتے کی طرف پوری توجہ ضروری ہے ـــــ اور وہ یہ کہ بہت زیادہ اصلاح کنندہ قانون اور اعلیٰ ترین مفاہیم جب جاہل، نالائق اور غلط فائدہ اٹھانے والے افراد کے ہاتھ چڑھ جائیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ انہیں اس طرح مسخ کر دیں کہ وہ اصلی مقصد کے بالکل خلاف نتیجہ پیدا کریں اور وہ ان کے ہدف سے الٹ راہ پر چل نکلیں۔ ایسے امور کی بہت سی مثالیں اور نمونے موجود ہیں اور مسئلہ انتظار کے ساتھ بھی جیسا کہ ہم دیکھیں گے یہی سلوک ہوا ہے۔

بہرحال ہر قسم کے اشتباہ سے بچنے کے لیے ہم بقول "بایدآب را از سرچشمہ گرفت" (یعنی پانی خود سرچشمہ سے حاصل کرنا چاہیے) اس موضوع کو بھی سرچشمہ سے حاصل کرتے ہیں تاکہ راستے کی نہروں اور کھائیوں کی آلودگیوں سے بچایا جا سکے۔ یعنی ہم "انتظار" کی بحث میں براہِ راست اسلام کے اصلی متون کو تلاش کریں گے اور ان مختلف روایات پر بحث کریں گے جو مختلف لب و لہجہ میں مسئلہ انتظار کی تاکید کرتی ہیں تاکہ اصلی مقصد اور ہدف تک پہنچ سکیں۔

اب نہایت غور سے ان چند روایات کی طرف توجہ کیجئے:

۱۔ کسی نے امام صادق علیہ السلام سے پوچھا:

آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں جو ہادیانِ برحق کی ولایت رکھتا ہے اور حکومتِ حق کے ظہور کے انتظار میں رہتا ہے اور اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

هو بمنزلة من كان مع القائم في فسطاطه۔

ثم سكت هنيئة۔ ثم قال

هو كمن كان مع رسول الله۔

وہ اس شخص کی طرح ہے جو اس رہبرِ انقلاب کے خیمے میں (اس کی فوج کے سپاہیوں میں) ہو۔

پھر آپ نے کچھ توقف کیا ــــ پھر فرمایا:

اسی شخص کی طرح جو پیغمبرِ اسلام کے ساتھ (ان کے معرکوں میں) شریک ہو[1]

بعینہ یہی مضمون بہت سی روایات میں مختلف تعبیرات کے ساتھ منقول ہے۔

۲۔ بعض روایات میں یہ عبارت آئی ہے:

بمنزلة الضارب بسيفه في سبيل الله

یعنی ــــ وہ اس شخص کی طرح ہے جو راہِ خدا میں شمشیر زن ہو۔

۳۔ بعض روایات میں عبارت یوں ہے:

كمن قارع مع رسول الله بسيفه

یعنی ــــ وہ اس شخص کی طرح ہے جو رسول اللہ کے ساتھ ہو کر دشمن کے دفاع پر تلوار مارے۔

۴۔ بعض دیگر روایات میں ہے:

بمنزلة من كان قاعدا تحت لواء القائم

یعنی ــــ وہ اس شخص کی طرح ہے جو قائم (مہدی) کے پرچم تلے ہو۔

۵۔ بعض دوسری روایات میں ہے:

بمنزلة المجاهد بين يدي رسول الله (ص)

یعنی ــــ وہ اس شخص کی طرح ہے جو رسول اللہ کی موجودگی میں جہاد کرے۔

۶۔ بعض روایات میں ہے:

بمنزلة من استشهد مع رسول الله (ص)

یعنی ــــ وہ اس شخص کی طرح ہے جو پیغمبر کی معیت میں شہید ہو۔

ان چھ روایات میں ظہورِ مہدیؑ کے انتظار کے بارے میں سات تشبیہیں آئی ہیں۔ ان سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایک طرف ان کا ربط اور مشابہت مسئلہ انتظار سے ہے اور دوسری طرف اس انتظار کا تعلق دشمن کے ساتھ جہاد اور مقابلے کی آخری صورت سے ہے (غور کیجیے گا)۔

۷۔ کئی ایک روایات میں ایسی حکومت کے انتظار کو بلند ترین عبادات میں سے شمار کیا گیا ہے۔ یہ مضمون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی بعض احادیث میں اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے بعض فرمودات میں نقل ہوا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا:

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۳ صفحہ ۱۳۶ (چاپ قدیم) بحوالہ محاسن برقی۔

افضل اعمال امتی انتظار الفرج من الله عزّ و جل

میری اُمت کے افضل ترین اعمال میں سے ظہور کا انتظار کرنا ہے [1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے:

افضل العبادة انتظار الفرج

زیادہ فضیلت والی عبادت ظہور کا انتظار کرنا ہے [2]

یہ حدیث یہاں عمومی مفہوم رکھتی ہے "انتظار فرج" کو یہاں چاہے وسیع معنی میں لیں یا عظیم عالمی مصلح کے ظہور کا انتظار سمجھیں۔ دونوں صورتوں میں زیر بحث موضوع کے حوالے سے انتظار کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

یہ تمام تعبیریں اس بات کی ترجمانی کرتی ہیں کہ ایسے انقلاب کا انتظار ہمیشہ وسیع اور ہمہ گیر جہاد سے منسلک ہوتا ہے۔ اس بات کو نظر میں رکھنا چاہیے تاکہ انتظار کا مفہوم سمجھ کر ہم ان سب تعبیروں سے ایک نتیجہ اخذ کر سکیں۔

انتظار کا مفہوم

لفظ "انتظار" ایسے شخص کی کیفیت پر بولا جاتا ہے جو موجودہ حالت سے پریشان ہو اور اس سے بہتر کیفیت کے ایجاد کرنے میں لگا ہو۔ مثلاً وہ بیمار جو صحت کے انتظار میں ہو یا وہ باپ جو سفر پر گئے ہوئے بیٹے کے انتظار میں ہو۔ بیمار بیماری پر پریشان اور دکھی ہوتا ہے اور باپ بیٹے کے فراق میں پریشان ہوتا ہے۔ دونوں بہتر حالت کی کوشش میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح وہ تاجر جو کاروبار کی بدحالی پر پریشان ہو اور اقتصادی بحران کے خاتمے کے انتظار میں ہو۔ ایسے تاجر کی دو حالتیں ہوتی ہیں ایک موجودہ حالت پر پریشانی اور ناپسندیدگی اور دوسرا بہتر حالت کے لیے کوشش۔

اس بنا پر حضرت مہدیؑ کی عادلانہ حکومت اور عالمی مصلح کے قیام کا انتظار بھی دو عناصر کا مرکب ہے۔ ایک "نفی" کا عنصر اور دوسرا "اثبات" کا عنصر۔ منفی عنصر موجودہ حالت کی ناپسندیدگی ہے اور مثبت عنصر بہتر اور اچھی حالت کی آرزو ہے۔

اب اگر یہ دونوں پہلو روح انسانی میں اتر جائیں تو دو قسم کے وسیع اعمال کا سرچشمہ بن جائیں گے۔ ان دو قسم کے اعمال میں ایک طرف تو ظلم و فساد کے عوامل سے ہر طرح کا تعلق ترک کرنا ہے یہاں تک کہ ان سے مقابلہ اور جنگ کرنا ہے اور دوسری طرف خود سازی، اپنی مدد آپ اور عوام کی واحد عالمی حکومت کی تشکیل کے لیے جسمانی اور روحانی طور پر تیاری کرنا ہے۔ اور اگر ہم اچھی طرح غور کریں تو دیکھیں گے کہ اس کے دونوں حصے اصلاح کن، تربیت کنندہ اور تحرک، آگاہی اور بیداری کے حامل ہیں۔

"انتظار" کے حقیقی اور اصلی مفہوم کی طرف توجہ کریں تو مندرجہ بالا متعدد روایات میں جو انتظار کی جزا اور نتیجہ بتایا گیا ہے وہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے اور سمجھ آتا ہے کہ کس طرح حقیقی انتظار کرنے والے کبھی ان لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جو حضرت مہدیؑ

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۳ ص ۱۳۶ بحوالہ کافی۔

[2] بحار الانوار جلد ۱۳ ص ۱۳۶ بحوالہ کافی۔

کے کیمپ میں یا ان کے پرچم کے نیچے ہیں یا اس شخص کی طرح قرار پاتے ہیں جو راہِ خدا میں تلوار چلائے یا جو اپنے خون میں غلطاں ہو اور یا جو شہید ہو جائے۔ کیا یہ حق و عدالت کی راہ کے مختلف مراحل اور مجاہدہ کے مختلف درجات کی طرف اشارہ نہیں ہے کہ جو مختلف لوگوں کو ان کی تیاری اور انتظار کے درجے کی مناسبت سے حاصل ہوتے ہیں۔ یعنی جس طرح راہ خدا کے مجاہدین کی فداکاری اور اس کے نتیجہ و اثر کے مختلف درجے ہوتے ہیں اسی طرح انتظار، خودسازی اور آمادگی کے بھی بالکل مختلف درجے ہوتے ہیں۔ مقدمات اور نتائج کے لحاظ سے ان کی ایک دوسرے سے مشابہت ہوتی ہے۔ دونوں جہاد ہیں۔ دونوں کے لیے تیاری اور خودسازی کی ضرورت ہے۔ جو شخص ایسی حکومت کے قائد کے کیمپ میں ہو یعنی ایک عالمی حکومت کے فوجی مرکز میں ہو وہ ایک غافل اور جاہل شخص نہیں ہو سکتا اور نہ وہ لااُبالی پن کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ ایسے مرکز میں ہر کوئی نہیں آسکتا۔ یہ جگہ تو ان افراد کے لیے ہے جو حقیقتاً اس حیثیت، مقام اور اہمیت کی لیاقت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔

اسی طرح جس شخص کے ہاتھ میں ہتھیار ہو اور وہ اس قائدِ انقلاب کے سامنے اس کی صلح و آشتی اور عادلانہ حکومت کے مخالفین سے جنگ کرے تو اس میں روحانی اور فکری جنگی لحاظ سے پوری آمادگی اور تیاری ہونا چاہیے۔

ظہورِ مہدیؑ کے انتظار کے حقیقی اثرات سے مزید آگاہی کے لیے حسبِ ذیل وضاحت کی طرف توجہ کریں:

انتظار ـــــ یعنی بھرپور تیاری

میں اگر ظالم اور ستمگر ہوں تو کیسے ممکن ہے کہ اس شخص کا انتظار کروں کہ جس کی تلوار ستمگروں کے خون سے سیراب ہوگی۔

میں اگر گنہگار اور ناپاک ہوں تو میں کیونکر ایسے انقلاب کا منتظر ہوں گا جس کا پہلا شعلہ ناپاک لوگوں کے دامن کو لپکے گا۔

وہ لشکر جو ایک عظیم جہاد کے انتظار میں ہے وہ اپنے سپاہیوں کی جنگی تربیت کو آخری حد تک پہنچائے گا اور ان میں انقلاب کی روح پھونک دے گا اور کمزوری کے ہر نقطے کی اصلاح کرے گا۔

کیونکہ ـــــ

انتظار کی کیفیت ہمیشہ اس ہدف اور مقصد کے مطابق ہوتی ہے جس کے ہم انتظار میں ہوتے ہیں۔

ایک عام مسافر کے سفر سے آنے کا انتظار۔

ایک بہت ہی عزیز دوست کے لوٹ آنے کا انتظار۔

درخت سے پھلوں کے اتارنے کے موسم کا انتظار۔

فصل کی کٹائی کے سمے کا انتظار۔

ان میں سے ہر انتظار میں ایک طرح کی آمادگی اور تیاری شامل ہوتی ہے۔

مہمان کے لیے گھر کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ اس کی پذیرائی اور خدمت کے ذرائع مہیا کرنا پڑتے ہیں۔

پھل اتارنے اور فصل کاٹنے کے لیے مزدوری ساز و سامان، درانتی اور متعلقہ مشین وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے جو فراہم کرنا پڑتی ہے۔

اب غور کریں کہ ـــــ وہ جو ایک عظیم عالمی مصلح کے قیام کا انتظار کر رہے ہیں ـــــ وہ درحقیقت صورتِ حال کو یکسر پلٹ دینے والے انقلاب اور ایک تحول کا انتظار کر رہے ہیں کہ جو پوری انسانی تاریخ میں سب سے بڑا اور سب سے بنیادی انسانی انقلاب ہوگا۔

وہ انقلاب کہ جو گزشتہ انقلابوں کے برعکس علاقائی نہیں ہوگا بلکہ ہمہ گیر اور سب کے لیے ہوگا اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہوگا۔

وہ انقلاب سیاسی، ثقافتی، اقتصادی اور اخلاقی ہر حوالے سے انقلاب ہوگا۔

پہلا فلسفہ ـــــ انسان سازی

اس قسم کا تحول ہر چیز سے پہلے آمادہ اور تیار عناصر کا محتاج اور انسانی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ اسے ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو پوری دنیا میں وسیع اصلاحات کا بھاری بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا سکیں۔

پہلی منزل میں ـــــ اس عظیم پروگرام کو عملی شکل دینے میں تعاون کرنے کی فکر اور آگاہی کی سطح بلند کرنے کی ضرورت ہے اور روحانی و فکری آمادگی کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔

تنگ نظری، کوتاہ بینی، کج فکری، حسد، بچگانہ اور غیر عاقلانہ اختلافات اور ہر قسم کا نفاق و انتشار حقیقی انتظار کرنے والوں کے شایانِ شان نہیں۔

اہم نکتہ یہ ہے کہ حقیقی انتظار کرنے والا اس قسم کے اہم پروگرام کا فقط تماشائی ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اسے چاہیے کہ وہ ابھی سے حتمی طور پر انقلابیوں کی صف میں شامل ہو جائے۔ اس انقلاب کے نتائج پر ایمان اسے ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ وہ مخالفین کی صف میں کھڑا ہو۔ دوسری طرف موافقین کی صف میں کھڑا ہونے کے لیے بھی پاک اعمال، پاکیزہ روح، کافی دلیری اور آگاہی کی ضرورت ہے۔

میں اگر فاسد، خراب اور نادرست ہوں تو ایسے نظام کے ایام کو کیسے یاد کر سکتا ہوں جس میں فاسد، خراب اور نادرست افراد کی کوئی حیثیت نہ ہوگی بلکہ وہ تو اس میں ٹھکرا دیئے جائیں گے اور قابلِ نفرت ہوں گے۔

کیا یہ انتظار فکر و روح اور جسم و جاں کی پاکیزگی کے لیے کافی نہیں۔

وہ لشکر جو آزادی بخش جہاد کے انتظار میں وقت گزار رہا ہے یقیناً مکمل طور پر آمادہ اور تیار ہوگا، وہ ہتھیار جو ایسے میدانِ جنگ کے لیے مناسب اور ضروری ہے اسے مہیا رکھے گا۔ ایسا لشکر ضرور مورچہ بند رہے گا۔ اپنے افراد کی تیاریوں میں اضافہ کرتا رہے گا اور اپنے فوجیوں کے دلوں کو مضبوط کرے گا اور ایسے جہاد اور مقابلے کے لیے اپنے ہر سپاہی کے دل میں عشق اور شوق زندہ رکھے گا۔ جو لشکر اس طرح سے تیار نہ ہو وہ کبھی منتظر نہیں رہ سکتا اور اگر تیار ہونے کا دعوٰی کرے تو جھوٹ ہے۔

ایک عالمی مصلح اور مربی کا انتظار تمام جہانوں کی مکمل فکری، اخلاقی، مادی اور روحانی اصلاح کی آمادگی کا مفہوم رکھتا ہے۔ اب آپ سوچیں کہ ایسی آمادگی اور انتظار کس قدر انسان ساز اور تربیت کنندہ ہے۔

تمام روئے زمین کی اصلاح اور تمام مظالم اور خرابیوں کا خاتمہ کوئی مذاق نہیں اور نہ یہ کوئی آسان کام ہے۔ ایسے عظیم مقصد کی تیاری اس کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہیے۔ یعنی تیاری بھی اس پروگرام کی گہرائی اور گیرائی کے مطابق ہونا چاہیے۔ ایسے انقلاب

کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے عظیم مصمم ارادوں والے، بہت قوی اور شکست ناپذیر، انتہائی پاک باز، بلند نظر، پوری طرح تیار اور گہری نگاہ رکھنے والے لوگوں کی ضرورت ہے۔

ایسے مقصد کے لیے خود سازی اور اپنی عمیق ترین تربیت کی ضرورت ہے۔ ایسے ہدف کے لیے بہت سے اخلاقی، فکری اور اجتماعی منصوبوں پر عمل درآمد ناگزیر ہے۔

یہ ہے حقیقی انتظار کا مفہوم ـــــــ تو کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ ایسا انتظار انسان ساز اور اصلاح کنندہ نہیں ہے؟

دوسرا فلسفہ ـــــ اجتماعی کاوشیں

سچے انتظار کرنے والوں کی ساتھ ساتھ یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وہ فقط اپنی اصلاح نہ کریں بلکہ ایک دوسرے کے حالات پر بھی نظر رکھیں اور اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ دوسروں کی اصلاح کی بھی کوشش کریں کیونکہ جس عظیم اور بھاری پروگرام کی تکمیل کے وہ منتظر ہیں انفرادی نہیں بلکہ ایسا پروگرام ہے جس میں تمام عناصر انقلاب کو شرکت کرنا ہوگی لہٰذا کام گروہی اور اجتماعی صورت میں ہونا چاہیے۔ مساعی اور کاوشیں ہم آہنگ ہونا چاہئیں۔ اس ہم آہنگی کی گہرائی اور وسعت اس عالمی انقلاب کے پروگرام کی عظمت کے مطابق ہونا چاہیے ـــــ کہ جس کا وہ انتظار کر رہے ہیں۔

ایک اجتماعی اور وسیع جنگ کے میدان میں کوئی شخص دوسروں کے حال سے غافل نہیں رہ سکتا بلکہ اس کی ذمہ داری ہے کہ کمزوری کا کوئی نقطہ اسے جہاں نظر آئے اس کی اصلاح کرے اور جو بھی نقصان زدہ جگہ ہو اس کی مرمت کرے اور کمزور حصے کو تقویت پہنچائے کیونکہ میدانِ جنگ میں موجود تمام مجاہدین کی فعال اور ہم آہنگ شرکت کے بغیر ایسے پروگرام کو عملی شکل دینا ممکن نہیں ہے۔

لہٰذا حقیقی انتظار کرنے والے نہ صرف اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ دوسروں کی بھی اصلاح کریں۔

یہ ہے ـــــ ایک عالمی مصلح کے قیام کے انتظار کا ایک اور تعمیری اور تربیتی اثر اور یہ ہے فلسفہ ان تمام فضیلتوں کا جو ایک سچے انتظار کرنے والے کے لیے شمار کی گئی ہیں۔

تیسرا فلسفہ ـــــ خراب ماحول کا مقابلہ

حضرت مہدیؑ کے انتظار کا ایک اور اثر ماحول کے مفاسد میں گھل مل جانا اور برائیوں کے سامنے ہتھیار نہ ڈالنا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جب کوئی برائی عام ہو جاتی ہے اور سب کو گھیر لیتی ہے۔ اکثریت یا جماعت کا ایک بڑا حصہ اس کی طرف چلا جاتا ہے تو بعض اوقات نیک لوگ ایک سخت قسم کی نفسیاتی تنگی میں پھنس جاتے ہیں ـــــ اس گھٹن میں وہ اصلاح سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے اور اب اصلاح کی کوئی امید باقی نہیں رہی اب اپنے آپ کو پاک رکھنے کی کوشش اور جدوجہد فضول ہے۔ ممکن ہے ایسی ناامیدی اور مایوسی آہستہ آہستہ انہیں برائی اور ماحول کی

ہر شئی کی طرف کھینچے جائے اور وہ اپنے آپ کو ایک صالح اقلیت کے طور پر فاسد اکثریت کے مقابلے میں محفوظ رکھ سکیں اور دوسروں کے رنگ میں نہ رنگے جانے کو رسوائی کا سبب سمجھیں۔

تنہا یہ چیز ان میں اُمید کی روح پھونک سکتی ہے، انہیں مقابلے اور کھڑے رہنے کی دعوت دے سکتی ہے اور انہیں فاسد ماحول میں گھل مل جانے سے روک سکتی ہے ۔۔۔ وہ ہے مکمل اصلاح کی اُمید۔ صرف یہی صورت ہے کہ جس میں وہ اپنی پاکیزگی کی حفاظت کر سکتے ہیں اور دوسروں کی اصلاح کی جدوجہد کو جاری رکھ سکتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی قوانین میں بخشش سے مایوسی کو بہت بڑا گناہ شمار کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ نا سمجھ اور بے خبر افراد تعجب کریں کہ رحمتِ خدا سے مایوسی کو اس قدر اہمیت کیوں دی گئی ہے، یہاں تک کہ بہت سے گناہوں سے اسے بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے ۔۔۔ تو اس کا فلسفہ درحقیقت یہی ہے کہ رحمت سے مایوس گنہگار کو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ تلافی کی فکر کرے یا کم از کم گناہ کو جاری رکھنے سے دستبردار ہو جائے اور اس کی منطق یہ ہے کہ اب جب کہ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے تو چاہے ایک قد کے برابر چاہے سو قد کے برابر ہو۔ وہ سوچتا ہے کہ میں دنیا میں رسوا ہو چکا ہوں، اب دنیا کا غم فضول ہے۔ سیاہی سے بڑھ کر کوئی رنگ نہیں۔ آخر جہنم ہے۔ میں تو ابھی سے اسے اپنے لیے خرید چکا ہوں، اب دوسری کسی چیز سے کیا ڈروں۔ اسی طرح کی دیگر باتیں اُسے گناہ کے راستے پر باقی رکھتی ہیں۔

مگر ۔۔۔ جب اس کے لیے امید کا دروازہ کھلا ہو، عفوِ الٰہی کی اُمید ہو اور موجود کیفیت کے بدل جانے کی توقع ہو ۔۔۔ تو اس کی زندگی میں ایک طرح کا میدان پیدا ہو گا جو اُسے راہِ گناہ سے لوٹ آنے اور پاکیزگی و اصلاح کی طرف واپسی کی دعوت دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ فاسد افراد کی اصلاح کے لیے امید کو ہمیشہ ایک مؤثر تربیتی عامل سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح وہ نیک افراد جو خراب ماحول میں گرفتار ہیں، اُمید کے بغیر اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

خلاصہ یہ کہ دنیا جس قدر فاسد اور خراب ہو گی مصلح کے ظہور کے انتظار میں اُمید بڑھے گی جو معتقدین پر زیادہ روحانی اثر ڈالے گی۔ برائی اور خرابی کی طاقتور موجوں کے مقابلے میں یہ ایمان کی حفاظت کرے گی اور وہ نہ صرف ماحول کے دامنِ فساد کی وسعت سے مایوس نہیں ہوں گے بلکہ

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
آتشِ عشق تیز تر گردد

یعنی ۔۔۔ وعدۂ وصل کا لمحہ جوں جوں نزدیک آیا، آتشِ عشق تیز تر ہو گئی۔

اس کے مطابق مقصد انہیں قریب تر نظر آئے گا اور برائی سے جنگ کرنے میں ان کی کوشش یا اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں اضافہ ہو گا اور مزید شوق و ولولہ پیدا ہو گا۔

گذشتہ مباحث سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انتظار جمود کا باعث صرف اس صورت میں بنتا ہے جب اس کے مفہوم کو مسخ کیا جائے یا اس میں تحریف کر دی جائے جیسا کہ مخالفین کے ایک گروہ نے اس میں تحریف کر دی ہے اور موافقین کے ایک گروہ نے اسے مسخ کر دیا ہے لیکن اگر اس کے حقیقی مفہوم میں افراد اور معاشرہ اس پر عمل کریں تو انتظار تربیت، خودسازی، تحرک اور امید کا ایک

اہم عامل اور داعی ثابت ہوگا۔

قیام مہدیؑ کے بارے میں واضح مدارک میں سے ایک یہ آیت ہے:

وعد الله الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنهم فی الارض

ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ روئے زمین کی حکومت ان کے قبضے میں دے۔

اس آیت کے ذیل میں اسلام کے عظیم ہادیوں سے منقول ہے کہ:

هو القائم واصحابه

(یعنی یہ جن سے خدا نے وعدہ کیا ہے) وہ قائم (حضرت مہدیؑ) اور آپ کے اصحاب ہیں[1]

ایک اور حدیث میں ہے:

نزلت فی المهدیؑ

یعنی ـــ یہ آیت حضرت مہدیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

اس آیت میں حضرت مہدیؑ اور ان کے یار و انصار کا تعارف اس عنوان سے کروایا گیا ہے:

الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت

یعنی ـــ وہ جو تم میں سے ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے۔

لہٰذا اس عالمی انقلاب کا قائم ہونا اور عالم وجود میں آنا ایک مستحکم ایمان کے بغیر جو ہر قسم کے ضعف، کمزوری اور ناتوانی کو دور کر دے کے بغیر ممکن نہیں۔ نیز نیک اعمال جو اصلاح عالم کا راستہ کھول دیں کے بغیر بھی ممکن نہیں۔ اور وہ لوگ جو ایسے پروگرام کے انتظار میں ہیں انہیں اپنی آگاہی، علم اور ایمان کی سطح بھی بلند کرنا ہوگی اور اپنے اعمال کی اصلاح کی کوشش بھی کرنا ہوگی۔ صرف وہی لوگ ایسی حکومت میں ہم قدم اور ہم کام ہونے کی خوشخبری کے مستحق ہیں نہ کہ وہ لوگ جو ظلم و ستم کا ساتھ دیں اور نہ ہی وہ جو ایمان اور عمل صالح سے بیگانہ ہوں اور نہ ڈرپوک اور بزدل لوگ جو ایمان کی کمزوری کی وجہ سے ہر چیز سے یہاں تک کہ اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں اور نہ ہی سست، بے حال اور بے کار لوگ جو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور اپنے معاشرے کے مفاسد اور خرابیوں پر سکوت اختیار کیے ہوئے ہیں اور ان سے مقابلے کی کچھ بھی کوشش نہیں کرتے۔

یہ ہے قیام مہدیؑ کے انتظار کا معاشرے میں تعمیری اور اصلاحی اثر۔

۳۴۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ

---

[1] بحار الانوار طبع قدیم جلد ۱۳ ص۱۴

لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ
اللَّهِ ۗ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي
سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝
۳۵۔ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ
وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ
فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ۝

ترجمہ

۳۴۔ اے ایمان والو! (اہلِ کتاب کے) بہت سے علما اور راہب لوگوں کا مال باطل طور پر کھاتے ہیں اور (انہیں) خدا کی راہ سے روکتے ہیں اور وہ جو سونا چاندی کا خزانہ جمع کر کے (اور چھپا کر) رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔

۳۵۔ اس روز کہ جب انہیں آتشِ جہنم میں گرم کیا جائے گا اور جلایا جائے گا پس ان کے چہروں، پہلوؤں اور پشتوں کو داغا جائے گا (اور انہیں کہا جائے گا کہ) یہ وہی چیز ہے کہ جسے تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا پس چکھو اس چیز کو جسے اپنے لیے تم نے ذخیرہ کیا تھا۔

تفسیر

کنز اور ذخیرہ اندوزی منع ہے

گذشتہ کلمات میں یہود و نصاریٰ کے مشرکانہ اعمال کے متعلق گفتگو تھی کہ جو اپنے علماء کے لیے ایک طرح کی الوہیت کے قائل تھے۔ زیرِ بحث آیت کہتی ہے کہ وہ نہ صرف مقامِ الوہیت نہیں رکھتے بلکہ مخلوق کی رہبری کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔ اس کا شاہد ان کی طرح طرح کی غلط کاریاں ہیں۔

یہاں روئے سخن مسلمانوں کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اہلِ کتاب کے علماء اور راہب

لوگوں کے مال باطل طور پر کھاتے ہیں اور مخلوق کو خالق کی راہ سے روکتے ہیں (یا ایھا الذین اٰمنوا ان کثیرا من الاحبار و الرھبان لیأکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللّٰہ)۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ جس طرح قرآن کی سیرت ہے یہاں حکم یہودیوں کے تمام علماء اور راہبوں پر جاری نہیں کیا بلکہ "کثیرا" کی تعبیر در حقیقت صالح اور نیک اقلیت کے استثناء کے لیے ہے اور ایسا ہی دیگر آیات قرآن میں بھی نظر آتا ہے کہ جس کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ وہ کس طرح لوگوں کا مال فضول بغیر کسی جواز کے اور قرآنی تعبیر کے مطابق باطل طریقے سے کھاتے تھے تو اس سلسلے میں کم و بیش دوسری آیات میں اشارہ ہوا ہے اور کچھ باتیں تواریخ میں بھی آئی ہیں۔

ایک بات تو یہ تھی کہ وہ حضرت مسیحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی تعلیمات کے حقائق چھپاتے تھے تاکہ لوگ نئے دین (اسلام) کے گرویدہ نہ ہوں تاکہ ان کے مفادات خطرے میں نہ پڑیں اور ان کے تحفے اور ہدیے منقطع نہ ہوں جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیات ۴۱، ۷۹ اور ۱۷۴ میں اس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

دوسری بات یہ تھی کہ لوگوں سے رشوت لے کر حق کو باطل اور باطل کو حق قرار دے دیتے تھے۔ طاقتوروں اور زورداروں کے فائدے میں باطل فیصلے صادر کرتے تھے جیسا کہ سورہ مائدہ کی آیہ ۴۱ میں اس طرف اشارہ ہوا ہے۔

ان کی غیر شرعی آمدنی کا ایک اور طریقہ بھی تھا اور وہ یہ کہ وہ "بہشت فروشی" اور "گناہ بخشی" کے نام پر لوگوں سے بہت سی رقم وصول کرتے تھے اور بہشت اور بخشش جو صرف خدا کے اختیار میں ہے کا کاروبار کرتے تھے۔ اس معاملے پر تاریخ مسیحیت میں بہت شور مچا ہے اور جنگ و جدال ہوئے ہیں۔

باقی رہا ان کا راہ خدا سے لوگوں کو روکنے کا معاملہ تو وہ واضح ہے کیونکہ وہ آیات الٰہی میں تحریف کرتے تھے یا اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے انہیں چھپاتے تھے بلکہ جس کسی کو بھی اپنے مقام اور مفاد کا مخالف پاتے اس پر تہمتیں لگاتے اور "مذہبی تفتیش کی عدالت" قائم کرتے اور بدترین طریقے سے باز پرس کرتے، ان کے خلاف فیصلہ دیتے اور انہیں سزا دیتے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر انہوں نے یہ اقدام نہ کیے ہوتے اور اپنے پیروکاروں کو اپنی لالچ اور ہوا و ہوس پر قربان نہ کرتے تو آج بہت سے گروہ دین حق یعنی اسلام کو دل و جان سے قبول کر چکے ہوتے۔ لہٰذا یہ بات کھلے بندوں کہی جا سکتی ہے کہ لاکھوں انسان جو کفر کی تاریکی میں باقی رہ گئے ہیں ان کا گناہ انہی کی گردن پر ہے۔

اس وقت بھی کلیسا اور یہودیوں کے مراکز اسلام کے بارے میں عام لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کرتے اور آج بھی کیسی عجیب و غریب اور وحشتناک تہمتیں پیغمبر اسلامؐ پر لگانا روا سمجھتے ہیں۔

یہ کام اتنا وسیع اور عام ہے کہ مسیحیوں کے بعض روشن فکر علماء نے صراحت سے اس کا اعتراف کیا ہے کہ گرجے کی اسلام کے خلاف بزدلانہ حملوں کی یہ سنت بھی اس بات کا باعث ہے کہ اہل مغرب ایسے پاک و پاکیزہ دین سے بے خبر ہیں۔

اس کے بعد قرآن یہود و نصاریٰ کے پیشواؤں کی دنیا پرستی کی بحث کی مناسبت سے ذخیرہ اندوزوں کے بارے میں ایک عمومی قانون بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے چھپا رکھتے ہیں اور انہیں راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے

انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو (والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونہا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم).

"یکنزون" کا مادہ ہے "کنز" (بروزن اور بر معنی "گنج") یعنی خزانے کو "کنز" کہتے ہیں جو دراصل جمع کرنے اور کسی چیز کے اجزا اکٹھا کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسی لیے جس اونٹ پر زیادہ گوشت ہو اسے "کناز اللحم" کہتے ہیں۔ بعد ازاں یہ لفظ جمع کرنے، حفاظت کرنے اور قیمتی اموال و اشیاء کو چھپا کر رکھنے کے معنی میں بولا جانے لگا۔ لہٰذا اس کے مفہوم میں جمع کرنا، حفاظت اور کبھی چھپا کر رکھنا بھی پنہاں ہوتا ہے۔

"ذھب" کا معنی ہے "سونا" اور "فضۃ" کا معنی ہے "چاندی"۔

جیسا کہ طبرسی نے مجمع البیان میں نقل کیا ہے، بعض علماء لغت نے ان دو الفاظ کے بارے میں جاذب نظر تعبیر کی ہے اور کہا ہے کہ یہ جو سونے کو "ذھب" کہا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بہت جلد ہاتھوں سے نکل جاتا ہے اور اس کے لیے بقا نہیں ہے (یاد رہے کہ لغت میں "ذہاب" کا مادہ جانے کے معنی میں ہے) اور یہ جو چاندی کو "فضۃ" کہا گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جلد ہی پراگندہ اور متفرق ہو جاتی ہے (کیونکہ "انفضاض" لغت میں پراگندگی کے معنی میں ہے)۔ ایسی دولت و ثروت کی کیفیت کو سمجھنے کے لیے ایسا نام ہی کافی ہے۔

جس دن سے انسانی معاشرے وجود میں آئے ہیں مختلف اجناس مبادلہ کے طور پر لینے کا طریقہ انسانوں میں رائج تھا۔ ہر شخص اپنی کھیتی باڑی اور نقدی وغیرہ میں سے ضرورت سے زیادہ اموال کو بیچتا تھا لیکن شروع شروع میں ہمیشہ جنس کا جنس سے تبادلہ ہوتا تھا کیونکہ پیسہ روپیہ ابھی ایجاد نہیں ہوا تھا۔ جنس کا جنس سے مبادلہ میں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا کیونکہ بہت سے لوگ ایسے ہوتے تھے جو اپنی ضرورت سے زیادہ مال بیچنا چاہتے تھے لیکن انہیں اس وقت کسی چیز کی ضرورت نہ ہوتی تھی جسے وہ خرید لیتے مگر وہ چاہتے کہ اسے کسی چیز میں تبدیل کریں تاکہ جب چاہیں اس سے اپنی ضرورت کی اجناس فراہم کر سکیں یہاں سے "کرنسی" کے ایجاد کا مسئلہ پیدا ہوا۔

چاندی اور اس سے زیادہ اہم سونے کی پیدائش نے اس فکر کو جنم دیا۔ یوں ان دو دھاتوں نے کم قیمت اور زیادہ قیمت کی کرنسی کی شکل اختیار کر لی اور ان کے ذریعے سے تجارت اور معاملات کا کام تیزی سے سرانجام پانے لگا۔

اس بناء پر کرنسی کا اصلی فلسفہ وہی کامل تر اور تیز تر اقتصادی مبادلات کے پہیوں کی گردش ہے اور جو لوگ نقدی کو خزانے کی صورت میں چھپا لیتے ہیں وہ نہ صرف اقتصادی ٹھہراؤ اور معاشرے کے منافع کے نقصان کا سبب بنتے ہیں بلکہ ان کا عمل کرنسی کی ایجاد کے فلسفہ کے بالکل برخلاف ہے۔

مندرجہ بالا آیت نے صراحت سے ذخیرہ اندوزی کو حرام قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ اپنے اموال راہ خدا میں اور بندگان خدا کے مفاد کی راہ میں لگائیں اور انہیں جمع کر کے رکھنے، ذخیرہ کرنے اور گردش سے الگ کرنے سے پرہیز کریں اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو انہیں دردناک عذاب کا منتظر رہنا چاہیے۔ یہ دردناک عذاب صرف قیامت کے دن کی سخت سزا نہیں ہے بلکہ اس دنیا کی وحشت سزائیں بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں جو اقتصادی توازن برقرار نہ رہنے کی وجہ سے اور طبقاتی اختلاف

پیدا ہونے کے باعث پیش آتی ہیں۔

گذشتہ زمانے کے لوگ اگر اس اسلامی حکم کی اہمیت سے اچھی طرح آشنا نہیں تھے تو آج ہم پوری طرح اس کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں کیونکہ وہ خرابیاں جو انسان کو دامن گیر ہوئی ہیں خود پرست اور بے خبر لوگوں کی ثروت اندوزی اور ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مصائب و آلام جنگیں اور خون ریزیاں جو ظاہر ہو رہی ہیں کسی سے ان کی وجہ مخفی نہیں ہے۔

"کنز" کتنی دولت کو کہتے ہیں؟

مفسرین کے درمیان زیر بحث آیت کے بارے میں اختلاف ہے کہ کیا ضروریاتِ زندگی سے زیادہ ہر قسم کی ثروت اندوزی "کنز" شمار ہوتی ہے اور اس آیت کے مطابق حرام ہے یا یہ کہ یہ حکم آغازِ اسلام اور حکمِ زکوٰۃ کے نزول سے پہلے کے زمانے سے مربوط ہے اور پھر زکوٰۃ کا حکم نازل ہونے سے ختم ہو گیا ہے؟

یا یہ کہ جو کچھ واجب ہے وہ زکوٰۃ کی ادائیگی ہے نہ کہ اس کے علاوہ کچھ اور۔ اس بناء پر جب انسان کوئی مال جمع کرے اور ہر سال باقاعدگی سے اس کے اسلامی مالیات یعنی زکوٰۃ ادا کرے تو وہ زیر نظر آیت کی زد میں نہیں آتا۔

بہت سی روایات میں جو شیعہ اور سنی کتب میں آئی ہیں ان میں تیسری تفسیر ہی نظر آتی ہے، مثلاً ایک حدیث میں پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپؐ نے فرمایا:

ای مال ادیت زکوتہ فلیس بکنز

یعنی — جس مال کی تو زکوٰۃ ادا کرے وہ کنز نہیں ہے [1]

نیز روایت ہے کہ جب مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر معاملہ سخت ہو گیا اور انہوں نے کہا کہ ہم میں سے کوئی شخص بھی اپنی اولاد کے لیے کوئی چیز بچا کے نہیں رکھ سکتا اور ان کے مستقبل کے لیے کچھ نہیں بنا سکتا۔ آخر کار انہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا:

ان الله لم یفرض الزکوة الا لیطیب بھا ما بقی من اموالکم و انما فرض المواریث من اموال تبقی بعدکم

خدا نے زکوٰۃ کو واجب نہیں کیا مگر اس لیے کہ تمہارے باقی اموال تمہارے لیے پاک ہو جائیں لہٰذا میراث کا قانون ان اموال کے لیے قرار دیا ہے جو تمہارے بعد رہ جائیں گے [2]

یعنی مال جمع کرنا اگر بالکل ممنوع ہوتا تو پھر قانونِ میراث کا موضوع ہی باقی نہیں رہتا تھا۔

کتاب امالی شیخ میں بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہی مضمون نقل ہوا ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

جو شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے تو اس کا باقی مال کنز نہیں ہے [3]

---

[1] و [3] المنار جلد ۱۰ صفحہ ۴۰۴۔

[2] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۱۳۔

منابع اسلامی میں کچھ اور روایات بھی دکھائی دیتی ہیں ظاہراً اور پہلی نظر میں جن کا مضمون مندرجہ تفسیر سے مطابقت نہیں رکھتا۔
ان میں سے ایک حدیث وہ ہے جو مجمع البیان میں حضرت علی علیہ السلام سے نقل ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

ما زاد علیٰ اربعۃ آلاف فھو کنز ادی زکوتہ او لم یودھا وما دونہا فہی نفقۃ فبشرھم بعذاب الیم۔

جو کچھ چار ہزار (درہم) سے (کہ ظاہراً جس سے مراد سال بھر کا خرچ ہے) زیادہ ہو وہ کنز ہے، چاہے اس کی زکوٰۃ ادا کر دی ہو یا نہ کی ہو اور جو کچھ اس سے کم ہو وہ نان نفقہ اور ضروریات زندگی میں شمار ہوگا۔ ان ثروت اندوزوں کو دردناک عذاب کی بشارت دو۔[1]

کافی میں معاذ بن کثیر سے منقول ہے، وہ کہتا ہے کہ میں نے امام صادقؑ سے سنا کہ وہ کہتے تھے۔

ہمارے شیعہ اس وقت تو آزاد ہیں کہ جو کچھ ان کے پاس ہے اسے راہِ خدا میں خرچ کریں (اور باقی ان کے لیے حلال ہے) لیکن جب ہمارے قائم قیام کریں گے تو تمام خزانوں اور جمع شدہ ثروتوں کو حرام قرار دیں گے تاکہ وہ سب مال ان کے پاس لے آئیں اور انہیں وہ دشمنوں کے مقابلے میں کام لائیں اور یہی مفہوم ہے اس کلام خدا کا جو وہ اپنی کتاب میں فرماتا ہے: والذین یکنزون الذھب والفضۃ.......[2]

جناب ابوذرؓ کے حالات زندگی میں بھی بار بار اور بہت سی کتب میں یہ بات منقول ہے کہ وہ یہ آیت شام میں معاویہ کے سامنے صبح و شام پڑھتے تھے بلند آواز میں پکارتے تھے:

بشر اھل الکنوز بکی فی الجباہ وکی بالجنوب وکی بالظھور ابداً حتیٰ یتردد الحر فی اجوافھم۔

خزانہ رکھنے والوں کو بشارت دے دو کہ اس مال سے ان کی پیشانیاں، ان کے پہلو اور ان کی پشتیں داغی جائیں گی یہاں تک کہ گرمی کی سوزش ان کے وجود کے اندر تک جا پہنچے گی۔[3]

نیز حضرت عثمان کے سامنے ابوذر کا اس آیت سے استدلال نشاندہی کرتا ہے کہ ان کا نظریہ تھا کہ یہ آیت مانعین زکوٰۃ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کے بارے میں بھی ہے۔

مندرجہ بالا تمام احادیث کو سامنے رکھا جائے اور آیت کو بھی ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عام حالات میں یعنی ایسے مواقع پر جب معاشرہ ناگوار اور خطرناک حالات سے دوچار نہ ہو اور لوگ معمول کی زندگی سے بہرہ ور ہوں تو صرف زکوٰۃ کی ادائیگی کافی ہے اور باقی مال "کنز" شمار نہیں ہوگا (البتہ توجہ رہے کہ اصولی طور پر دولت کمانے میں اگر اسلامی قوانین کو

---

[1] مجمع البیان آیۂ مذکورہ کے ذیل میں اور نور الثقلین جلد ۲ صہ ۲۱۳۔
[2] نور الثقلین جلد ۲ صہ ۲۱۳۔
[3] نور الثقلین جلد ۲ صہ ۲۱۳، برہان جلد ۱ صہ ۱۲۲۔

ملحوظ رکھا جائے تو اس صورت میں حد سے زیادہ مال و منال جمع نہیں ہو پاتا کیونکہ اسلام نے اس قدر قیود و شرائط عائد کی ہیں کہ ایسے مال کا حصول عام طور پر ممکن ہی نہیں ہے) لیکن اگر حالات معمول کے مطابق نہ ہوں اور ایسے مواقع ہوں جب اسلامی معاشرے کے مفاد میں یہ واجب اور ضروری ہو تو حکومت اسلامی مال کی جمع آوری پر حد بندی کر سکتی ہے اور اسے محدود کر سکتی ہے (جیسا کہ ہم حضرت علیؑ کی روایت میں پڑھ چکے ہیں) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسلامی حکومت عالم اسلام کی بقاء کے پیش نظر تمام جمع شدہ اموال اور ذخائر پیش کرنے کا مطالبہ کر دے جیسا کہ امام صادق علیہ السلام کی روایت میں قیام قائمؑ کے زمانے کے بارے میں آیا ہے ۔ اس روایت کی علت کی طرف توجہ کرتے ہوئے وہ باقی زمانوں پر بھی محیط ہو گی کیونکہ امامؑ فرماتے ہیں :

فیستعین بہ علی عدوہ

وہ اس سے اپنے دشمن کے خلاف مدد لیں گے ۔

لیکن ہم اس بات کو دہراتے ہیں کہ ایسا صرف اسلامی حکومت کے اختیار میں ہے اور وہی ضروری مواقع پر ایسے اقدامات کر سکتی ہے (غور کیجئے گا) ۔

باقی رہا ابوذرؓ کا واقعہ تو ہو سکتا ہے وہ بھی اسی صورتِ حال کے پیش نظر ہو کیونکہ اُس وقت کے اسلامی معاشرے میں اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ دولت اور سرمایہ مرتکز اور جمع نہ ہو ۔ اُس وقت ایسا کرنا اسلامی معاشرے کے تحفظ ، بقاء اور سالمیت کے خلاف تھا ۔

یا ہو سکتا ہے کہ ابوذر بیت المال کے اموال کے بارے میں کہتے ہوں جو عثمان اور معاویہ کے ہاتھ میں تھے ۔ ہم جانتے ہیں کہ ایسے اموال مستحق اور حاجت مند افراد کے ہوتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے بھی جمع نہیں رکھے جا سکتے بلکہ یہ مستحقین تک پہنچنے چاہئیں اور اس معاملے کا زکوٰۃ کے مسئلے سے کوئی ربط نہیں ہے ۔

خصوصاً ان حالات میں جب کہ تمام اسلامی تواریخ جن میں شیعہ سنی سب تاریخیں شامل ہیں گواہی دیتی ہیں کہ حضرت عثمان نے بیت المال میں سے بہت سی دولت اپنے رشتہ داروں میں بانٹ دی تھی اور معاویہ نے بیت المال ہی سے ایک ایسا محل تعمیر کیا تھا جس نے ساسانیوں کے محلات کے افسانوں کو زندہ کر دیا تھا ۔ ایسے میں ابوذرؓ کو حق پہنچتا تھا کہ انہیں فرمانِ الٰہی یاد دلاتے ۔

ابوذرؓ اور اشتراکیت

ہم جانتے ہیں کہ تیسرے خلیفہ پر جو اعتراضات کیے گئے ہیں ان میں سے ایک ابوذرؓ کی ظالمانہ جلا وطنی ہے ۔ انہیں بُری آب و ہوا کے مقام ربذہ کی طرف جلا وطن کیا گیا تھا ۔ جس کے نتیجے میں آخر کار یہ عظیم صحابی اور راہِ اسلام کے فداکار مجاہد اس دنیا سے چل بسے ۔ ابوذرؓ ۔۔۔ وہ شخص کہ جس کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا :

آسمان نے کسی ایسے شخص پر سایہ نہیں کیا نہ زمین نے اسے اٹھایا جو ابوذر سے بڑھ کر سچا ہو ۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عثمان سے ابوذرؓ کا اختلاف مال کی تمنا اور کسی مقام و منصب کی آرزو کی بنیاد پر نہ تھا کیونکہ ابوذرؓ ایک

پارسا اور آزاد انسان تھے۔ ان کے اختلاف کا سرچشمہ صرف تیسرے خلیفہ کی بیت المال کے بارے میں فضول خرچی، اپنی قوم اور قبیلے پر ان کی بے پناہ نوازشات اور اپنے حامیوں پر ان کی بے شمار بخشش تھی۔

ابوذرؓ مالی مسائل کے بارے میں خصوصاً جب ان کا تعلق بیت المال سے ہوتا بہت ہی سخت گیر تھے اور چاہتے تھے کہ تمام مسلمان اس سلسلے میں پیغمبر اسلامؐ کی روش اپنائیں مگر ہم جانتے ہیں کہ خلیفہ سوم کے دور میں صورتِ حال مختلف تھی۔

بہر حال اس عظیم صحابی کی صریح اور قطعی باتیں خلیفہ سوم کو سخت ناگوار گزریں۔ انہوں نے پہلے تو انہیں شام کی طرف بھیج دیا مگر ابوذرؓ وہاں زیادہ صراحت اور زیادہ قاطعیت سے معاویہ کے کرتوتوں کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ ابن عباس کہتے ہیں :

> معاویہ نے عثمان کو لکھا، اگر آپ کو شام کی ضرورت ہے تو ابوذرؓ کو واپس بلالیں کیونکہ اگر وہ یہاں رہ گئے تو یہ علاقہ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

عثمان نے خط لکھا اور ابوذرؓ کے حاضر ہونے کا حکم صادر کیا اور بعض تواریخ کے مطابق معاویہ کو حکم دیا کہ ابوذرؓ کو مدینہ بھیجنے کے لیے ایسے افراد مقرر کیے جائیں جو رات دن انہیں مدینہ کی راہ پر چلاتے رہیں اور انہیں لمحہ بھر آرام نہ کرنے دیں۔

یہاں تک کہ ابوذر جب مدینہ میں پہنچے تو بیمار ہو گئے اور چونکہ ان کا مدینہ میں رہنا بھی کاروبارِ خلافت کے لیے گوارا نہ تھا لہٰذا انہیں ربذہ کی طرف بھیج دیا گیا اور وہیں ان کی وفات ہو گئی۔

جو لوگ اس سلسلے میں خلیفہ سوم کا دفاع کرنا چاہتے ہیں وہ بعض اوقات ابوذرؓ پر تہمت لگاتے ہیں کہ وہ اشتراکی نظریہ رکھتے تھے اور تمام مال کو اللہ کا مال سمجھتے تھے اور شخصی ملکیت کا انکار کرتے تھے۔

یہ اتہام نہایت عجیب ہے۔ کیا باوجودیکہ قرآن صراحت سے خاص شرائط کے ساتھ تمام شخصی ملکیتوں کو محترم سمجھتا ہے اور باوجودیکہ ابوذر رسول اللہؐ کے نزدیک ترین افراد میں سے تھے اور انہوں نے قرآن کے دامن میں پرورش پائی تھی اور آسمان کے نیچے ان سے زیادہ سچا کوئی پیدا نہیں ہوا تھا، پھر ان کی طرف ایسی نسبت کس طرح دی جا سکتی ہے۔

دور دراز کے بادیہ نشین تو اس اسلامی حکم کو جانتے تھے اور انہوں نے تجارت اور میراث وغیرہ سے مربوط آیات سن رکھی تھیں تو پھر کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے نزدیک ترین شاگرد اس حکم سے بے خبر ہوں۔

کیا اس کے علاوہ کوئی اور بات ہے کہ ہٹ دھرم متعصبین نے خلیفہ سوم کی برات کے لیے ان پر اس قسم کی تہمت لگائی ہے اور اس سے بھی بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ معاویہ کے طرزِ عمل کے دفاع میں یہ اتہام باندھا ہے۔ اب بھی کچھ لوگ آنکھ کان بند کر کے اس بات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

جی ہاں ! ابوذر آیاتِ قرآنی سے راہنمائی لے کر خصوصاً "آیۂ کنز" سے ہدایت حاصل کرتے ہوئے یہ نظریہ رکھتے تھے اور صراحت کے ساتھ اس نظریے کا اظہار کرتے تھے کہ اسلامی بیت المال بعض لوگوں کی خصوصی ملکیت نہیں بننا چاہیے۔ ان کا نظریہ تھا کہ وہ اموال جن میں محروموں اور حاجت مندوں کا حق ہے اور جنہیں تقویتِ اسلام کے لیے اور مفادِ مسلمین کے لیے صرف ہونا چاہیے وہ کسی کو اپنے تئیں حاتم طائی ثابت کرنے کے لیے یا تعمیر محلات میں قیصر و کسریٰ کے محلات کے افسانوں کو زندہ کرنے کے لیے

استعمال نہیں ہونا چاہئیں۔

علاوہ ازیں ابوذرؓ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ جس دور میں مسلمان انتہائی تنگدستی میں مبتلا ہیں ثروت مندوں کو بھی سادہ ترین زندگی پر قناعت کرنا چاہیے اور اپنے مال میں سے انہیں کچھ راہ خدا میں خرچ کرنا چاہیے۔ اگر ابوذرؓ کا کوئی گناہ تھا تو یہی تھا۔ لیکن کرامے کے مؤرخین، بنی امیہ اور چاپلوس اور دین فروش راویوں نے اس مرد مجاہد کا چہرہ بگاڑنے اور مسخ کرنے کے لیے ایسی ناروا تہمتیں ان پر لگائی ہیں۔

ابوذرؓ کا دوسرا گناہ یہ تھا کہ وہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ خاص عشق اور لگاؤ رکھتے تھے۔ یہ گناہ اکیلا ہی اس بات کے لیے کافی تھا کہ بنی امیہ کے جھوٹے پراپیگنڈا کرنے والے اپنی شیطانی طاقت ابوذرؓ کی حیثیت کو داغدار کرنے کے لیے صرف کریں لیکن ان کا دامن اس طرح سے پاک تھا اور ان کی سچائی اور اسلامی مسائل سے آگاہی اس قدر واضح اور روشن تھی کہ جس نے ان سب جھوٹوں کو ذلیل و رسوا کر دیا۔

ان میں سے ایک عجیب افتراء جو خلیفہ سوم کو بری کرنے کے لیے ابوذرؓ پر باندھا گیا ہے طبقات ابن سعد میں منقول ہے وہ یہ کہ:

> جب ابوذرؓ ربذہ میں تھے اہل کوفہ کا گروہ آپ کے پاس آیا۔ اس نے کہا: اس شخص (یعنی — عثمان) نے آپ کے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے۔ کیا آپ تیار ہیں کہ پرچم بلند کریں اور ہم اس پرچم تلے اس کے خلاف جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔
>
> ابوذرؓ نے کہا: نہیں، اگر عثمان مجھے مشرق سے مغرب کی طرف بھیج دے، تب بھی میں اس کا تابع فرمان رہوں گا[1]

ان جعل سازوں نے اس طرف توجہ نہ کی کہ اگر وہ خلیفہ کے اتنے ہی تابع فرمان تھے تو پھر ان کی اتنی مزاحمت کیوں کرتے کہ ان کا مدینہ میں رہنا خلیفہ پر گراں ہو جاتا کہ جسے وہ کسی طرح برداشت نہ کر پاتے۔

اس سے زیادہ تعجب انگیز وہ بات ہے جس کی طرف المنار کے مؤلف نے زیر بحث آیت کے ذیل میں ابوذرؓ کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے۔ وہ یہ کہ ابوذرؓ کا واقعہ نشاندہی کرتا ہے کہ صحابہ کے زمانے میں (خصوصاً حضرت عثمان کے دور میں) اظہار رائے کی کس قدر آزادی تھی، علماء کا کتنا احترام ہوتا تھا اور خلفاء ان سے کتنی محبت کرتے تھے یہاں تک کہ معاویہ کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ ابوذرؓ سے کچھ کہے بلکہ اپنے لیے حاکم بالا یعنی خلیفہ کو لکھا اور ان سے حکم لیا۔

واقعاً تعصب کیا کچھ نہیں کرتا۔ کیا ربذہ کی گرم، خشک اور جلا دینے والی سرزمین جو موت اور آگ کی سرزمین تھی — کی طرف جلاوطن کرنا علماء کے لیے آزادی فکر اور احترام محبت کا نمونہ تھا؟ کیا اس عظیم صحابی کو موت کی وادی میں دھکیل دینا حریت عقیدہ کی دلیل ہے؟ اگر معاویہ عوام کے افکار کے سیلاب کے خوف سے اکیلا ابوذرؓ کے بارے میں کوئی منصوبہ نہ بنا سکا تو یہ اس کی طرف سے ان کے احترام کی علامت ہے؟

---

[1] تفسیر المنار جلد ۱۰ صفحہ ۲۰

اس واقعہ کے عجائبات میں سے ایک یہ ہے کہ خلیفہ کا دفاع کرنے والے کہتے ہیں کہ ابوذر کی جلاوطنی "مفسدہ کو دور کرنے کے لیے مصلحت کے مقدم ہونے" کے قانون کے مطابق ہے کیونکہ اگرچہ ابوذر کے مدینہ میں رہنے کے بڑی مصلحتیں اور فائدے تھے اور لوگ ان کے علم و دانش سے بہت فائدہ اٹھا سکتے تھے مگر عثمان کا نظریہ یہ تھا کہ ان کا غیر لچکدار طرز فکر اور اموال کے بارے میں ان کا سخت رویہ مفاسد اور خرابیوں کا سرچشمہ ہے لہٰذا ان کے وجود کے فائدوں سے چشم پوشی کرتے ہوئے انہیں مدینہ سے باہر بھیج دیا اور چونکہ ابوذرؓ اور عثمان دونوں مجتہد تھے لہٰذا یہاں کسی کے عمل پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔[1]

واقعاً ہمیں معلوم نہیں کہ ابوذرؓ کے مدینہ میں رہنے سے کیا خرابی پیدا ہوتی تھی؟ کیا لوگوں کو سنتِ پیغمبرؐ کی طرف پلٹانا خرابی کا باعث تھا؟

حضرت ابوذرؓ نے آخر پہلے اور دوسرے خلیفہ کی مالی منصوبہ بندی جو عثمان کے طرز عمل سے مختلف تھی پر اعتراض کیوں نہیں کیا۔
تو کیا لوگوں کو صدرِ اسلام کے مالی لائحہ عمل کی طرف پلٹانا فساد کا باعث تھا؟
کیا ابوذرؓ کو جلاوطن کرنا اور ان کی حق گو زبان کو منقطع کرنا اصلاح کا سرچشمہ تھا؟
کیا حضرت عثمان کے طرز عمل سے خصوصاً مالی امور میں ان کے طریقِ کار سے اتنا عظیم دھماکہ نہیں ہوا جس کی بھینٹ وہ خود بھی چڑھ گئے؟
کیا یہ مفسدہ تھا اور اسے ترک کرنا مصلحت تھا؟
لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ جب تعصب ایک دروازے سے داخل ہوتا ہے عقل دوسرے دروازے سے رخصت ہو جاتی ہے۔
بہرحال اس عظیم صحابی کا طرز عمل کسی منصف مزاج محقق پر پوشیدہ نہیں ہے اور کوئی ایسا منطقی راستہ نہیں کہ خلیفہ سوم کی اس آزار اور تکلیف کے بارے میں برائت ہو سکے جو ان سے حضرت ابوذرؓ کو پہنچی۔

ارتکازِ دولت کی سزا

بعد والی آیت میں ایسے افراد کے لیے دوسرے جہان کی ایک سزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ سکے جہنم کی جلا دینے والی آگ میں پگھلائے جائیں گے اور پھر ان سے ان کی پیشانی، پہلو اور پشت کو داغا جائے گا (یوم یحمٰی علیھا فی نار جھنم فتکوٰی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم)۔ اسی حالت میں عذاب کے فرشتے ان سے کہیں گے کہ وہی چیز ہے جسے تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا تھا اور خزانے کی صورت میں رکھا تھا اور راہِ خدا میں محروم لوگوں پر خرچ نہیں کیا تھا (ھٰذا ما کنزتم لانفسکم)۔ اب چکھو اسے جسے تم نے اپنے لیے ذخیرہ کیا تھا اور اس کے بُرے انجام کو پاؤ (فذوقوا ما کنتم تکنزون)۔
یہ آیت اس حقیقت کی دوبارہ تاکید کرتی ہے کہ انسانوں کے اعمال فنا نہیں ہوتے اور اسی طرح باقی رہتے ہیں اور وہی

---

[1] المنار جلد ۱۰ ص ۴۰۴۔

دوسرے جہان میں انسان کے سامنے مجسم ہوں گے اور اس کے سرور و مسرت یا رنج و تکلیف کا سبب بنیں گے۔

اس بارے میں کہ مندرجہ بالا آیت میں تمام اعضائے بدن میں سے صرف پیشانی، پشت اور پہلو کا ذکر کیوں کیا گیا ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن جناب ابوذرؓ سے منقول ہے، وہ کہتے تھے:

یہ اس بنا پر ہے کہ جلا دینے والی حرارت اس فضا میں اور ان کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے

(حتی یتردد الحر فی اجوافھم)[1]

نیز یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس بنا پر ہے کہ محرومین کے مقابلے میں وہ ان تین اعضاء سے کام لیتے تھے وہ کبھی ان سے منہ پھیرتے، کبھی بے اعتنائی کے طور پر ان کے سامنے آنے سے کتراتے اور کبھی ان کی طرف پشت پھیر لیتے لہٰذا ان کے بدن کے یہ تین حصے اس سیم و زر سے داغے جائیں گے جو انہوں نے جمع کر رکھا تھا۔

اس بحث کے آخر میں مناسب ہے کہ ایک ادبی نکتے کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے، جو آیت میں موجود ہے اور وہ یہ کہ آیت میں ہے: یوم یحمیٰ علیھا ــــــ یعنی اس دن آگ سکوں کے اوپر ڈالی جائے گی تاکہ وہ گرم اور جلانے کے قابل ہو جائیں حالانکہ عام طور پر اس قسم کے مواقع پر لفظ "علی" استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ مثال کے طور پر کہا جاتا ہے "یحمی الحدید" ــــ یعنی لوہے کو گرم کرتے ہیں۔ عبارت کی تبدیلی شاید سکوں کے بہت زیادہ جلانے کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اگر سکوں کو آگ میں ڈال دیا جائے تو وہ اس قدر سرخ اور گرم نہیں ہوتے جتنا کہ وہ آگ کے نیچے گرم ہوتے ہیں۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ سکوں کو آگ میں ڈالیں گے بلکہ کہتا ہے انہیں آگ کے نیچے رکھیں گے تاکہ وہ اچھی طرح گرم جائیں اور پھر جلا سکیں اور یہ ایسے سنگدل سرمایہ داروں کو سزا دینے کے لیے نہایت سخت تعبیر ہے۔

۳۶۔ اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِیْ كِتٰبِ اللّٰهِ
یَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ مِنْهَاۤ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ؕ ذٰلِكَ
الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ۙ۬ فَلَا تَظْلِمُوْا فِیْهِنَّ اَنْفُسَكُمْ وَ قَاتِلُوا الْمُشْرِكِیْنَ
كَآفَّةً كَمَا یُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ
الْمُتَّقِیْنَ۝
۳۷۔ اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْكُفْرِ یُضَلُّ بِهِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۱۴۔

يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

ترجمہ

۳۶۔ مہینوں کی تعداد خدا کے نزدیک خدا کی (آفرینش کی) کتاب میں جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، بارہ ہے کہ جن میں سے چار مہینے ماہ حرام ہیں (اور ان میں جنگ کرنا ممنوع ہے)۔ یہ (اللہ کا) ثابت وقائم آئین ہے لہٰذا ان مہینوں میں اپنے اوپر ظلم نہ کرو (اور ہر قسم کی خوں ریزی سے پرہیز کرو) اور مشرکین کے ساتھ (جنگ کے وقت) سب مل کر جنگ کرو جیسا کہ وہ سب مل کر تم سے جنگ کرتے ہیں اور جان لو کہ خدا پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

۳۷۔ نسئی (حرام مہینوں میں تقدم وتاخر) (مشرکین) کے کفر میں زیادتی ہے کہ جس کی وجہ سے کافر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ ایک سال اسے حلال اور دوسرے سال اسے حرام کر دیتے ہیں تاکہ ان مہینوں کی تعداد کے مطابق ہو جائے کہ جنہیں خدا نے حرام کیا ہے (اور ان کے خیال میں چار کا عدد پورا ہو جائے) اور اس طرح سے خدا کے حرام کردہ کو حلال شمار کریں۔ ان کے برے اعمال ان کی نظر میں زیبا ہو گئے ہیں اور خدا کافروں کی جماعت کو ہدایت نہیں کرتا۔

تفسیر

لازمی جنگ بندی

اس سورت میں چونکہ مشرکین سے جنگ کے بارے میں تفصیلی مباحث آئی ہیں لہٰذا زیر نظر دو آیات میں بحث کے دوران جنگ اور اسلامی جہاد کے ایک اور قانون کی طرف کیا گیا ہے اور وہ حرام مہینوں کے احترام کا قانون۔

پہلے فرمایا گیا ہے: خدا کے ہاں کتاب خلقت میں اس دن سے جب اس نے آسمان اور زمین پیدا کیے مہینوں کی تعداد بارہ ہے

(ان عدة الشهور عند الله اثنا عشر شهرًا فی کتاب الله یوم خلق السمٰوٰت والارض)۔

" کتاب الله " کی تعبیر ہو سکتا ہے قرآن مجید یا دیگر آسمانی کتب کی طرف اشارہ ہو لیکن " یوم خلق السمٰوٰت والارض " کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیادہ موزوں یہی لگتا ہے کہ کتاب آفرینش اور کتاب جہان ہستی کی طرف اشارہ ہو۔ بہرحال جس دن سے نظام شمسی نے موجودہ شکل اختیار کی ہے سال اور مہینے موجود ہیں۔ سال عبارت ہے سورج کے گرد زمین کے ایک مکمل دورے سے اور مہینہ عبارت ہے کہ ماہتاب کے زمین کے گرد ایک مکمل دورے سے اور ہر سال کہ آفتاب کے ایسے ۱۲ دورے ہوتے ہیں۔

یہ در حقیقت ایک حقیقی طبعی اور ناقابلِ تغیر تقویم ہے کہ جو تمام انسانوں کی زندگی کو ایک طبیعی نظام بخشتی ہے اور ان کے تاریخی حسابات کو بڑے اچھے طریقے سے منظم کرتی ہے اور یہ نوعِ انسانی کے لیے خدا کی ایک عظیم نعمت شمار ہوتی ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۸۹ کے ذیل میں تفصیل سے بحث ہو چکی ہے، آیت یوں ہے:

یسئلونك عن الاهلة قل هی مواقیت للناس والحج

اس کے بعد مزید ارشاد ہوتا ہے: " ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرام ہیں " کہ جن میں ہر قسم کی جنگ و جدال حرام ہے (منها اربعة حرم)۔

بعض مفسرین کے مطابق ان چار مہینوں میں جنگ کی حرمت حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کے دور سے ہے اور یہ حرمت زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں بھی پوری قوت سے ایک سنت کے طور پر موجود تھی اگرچہ اپنے میلانات اور ہوا و ہوس کے مطابق کبھی کبھی وہ ان مہینوں کو آگے پیچھے کر دیتے تھے لیکن اسلام میں یہ ماہ غیر متغیر ہیں۔ ان میں تین مہینے یکے بعد دیگرے ہیں اور وہ ہیں ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم۔ ایک ماہ الگ اور وہ رجب ہے۔ عربوں کی اصطلاح میں تین ماہ " سرد " (یکے بعد دیگرے) اور ایک ماہ " فرد " (اکیلا) ہے۔

اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ ان مہینوں میں جنگ کی حرمت اس صورت میں ہے جب جنگ دشمن کی طرف سے ٹھونسی ہوئی نہ ہو ورنہ اس میں شک نہیں کہ دوسری صورت میں مسلمانوں کو اٹھ کھڑا ہونا چاہیے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہ بیٹھنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں ماہِ حرام کی حرمت مسلمانوں کی طرف سے زائل نہیں کی گئی بلکہ اسے دشمن کی طرف سے توڑا گیا ہے (جیسا کہ اس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۹۴ میں گزر چکی ہے)۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: یہ دین و آئین ثابت، قائم و دائم اور ناقابلِ تغیر ہے نہ کہ غلط رسم جو عربوں میں تھی وہ پائیدار ہے کہ وہ اپنی خواہش اور ہوا و ہوس سے اسے آگے پیچھے کر دیتے تھے (ذلك الدین القیم)۔

چند ایک روایات[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ چار ماہ جنگ کی یہ حرمت دینِ ابراہیمی کے علاوہ یہود و نصاریٰ اور باقی آسمانی ادیان میں بھی تھی اور " ذلك الدین القیم " ہو سکتا ہے اس نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو یعنی پہلے سے ایک قانون مستقل اور ثابت طور پر موجود تھا۔

اس کے بعد کہا گیا ہے: ان چار مہینوں میں اپنے اوپر ظلم روا نہ رکھو اور ان کا احترام زائل نہ کرو اور اپنے تئیں دنیا کی سزاؤں اور آخرت کے عذابوں میں مبتلا نہ کرو (فلا تظلموا فیهن انفسکم)۔

---

[1] تفسیر ابوالفتوح جلد دوم صفحہ ۱۲۲۔

لیکن ادھر چونکہ ممکن ہے کہ ان چار مہینوں میں حرمتِ جہاد دشمن کے لیے فائدہ اٹھانے کا سبب بنے اور اسے مسلمانوں پر حملہ کرنے پر ابھارے لہٰذا اگلے جملے میں مزید فرمایا گیا ہے مشرکین کے ساتھ سب مل کر جنگ کرو جیسا کہ وہ سب اکٹھے ہو کر تم سے جنگ کرتے ہیں (وقاتلوا المشرکین کآفۃ کما یقاتلونکم کآفۃ)۔ یعنی باوجودیکہ وہ مشرک ہیں اور شرک و بت پرستی اختلاف و انتشار کا سرچشمہ ہے لیکن وہ ایک ہی صف میں تم سے جنگ کرتے ہیں اور تم موحد و یکتا پرست ہو اور توحید دین اتحاد و یک جہتی ہے لہٰذا تم زیادہ حق رکھتے ہو کہ دشمن کے مقابلے میں وحدتِ کلمہ کی حفاظت کرو اور ایک ہی آہنی دیوار کی طرح دشمن کے مقابلے میں کھڑے ہو جاؤ۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے: اور جان لو کہ اگر پرہیزگار بنو گے اور تعلیمات اسلامی کے اصولوں پر پوری طرح سے عمل پیرا ہو گے تو خدا تمہاری کامیابی کی ضمانت دیتا ہے کیونکہ خدا پرہیزگاروں کے ساتھ ہے (واعلموا ان اللہ مع المتقین)۔

زیرِ نظر دوسری آیت میں زمانۂ جاہلیت کی ایک غلط سنت یعنی مسئلہ نسیئ (حرام مہینوں کو آگے پیچھے کر دینا) کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: حرام مہینوں کو ادل بدل کر دینا ایسا کفر ہے جو ان کے کفر میں زیادتی کا سبب ہے (انما النسیئ زیادۃ فی الکفر) اس عمل کے ذریعے بے ایمان لوگ مزید گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں (یضل بہ الذین کفروا) وہ ایک سال ایک ماہ کو حلال شمار کر لیتے ہیں اور دوسرے سال اسی ماہ کو حرام قرار دے لیتے ہیں تاکہ اپنے گمان میں اسے خدا کے معین کردہ حرام مہینوں کی تعداد پر منطبق کریں یعنی جب ایک حرام مہینے کو ختم کر دیتے ہیں تو اس کی جگہ دوسرا مہینہ مقرر کر لیتے ہیں تاکہ چار ماہ کی تعداد مکمل ہو جائے (یحلونہ عاما و یحرمونہ عاما لیواطئوا عدۃ ما حرم اللہ)۔ حالانکہ اس برے اور منکر خیز عمل سے حرام مہینوں کی حرمت کا فلسفہ بالکل ختم ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ اس طرح حکم خدا کو اپنی خواہشات کا بازیچہ بنا دیتے ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے اس کام پر بڑے خوش اور راضی ہیں کیونکہ ان کے برے اعمال ان کی نگاہ میں بڑے زیبا ہو چکے ہیں (زین لہم سوء اعمالہم)۔

جیسا کہ آگے آئے گا وہ شیطانی وسوسوں سے حرام مہینوں کو ادل بدل کر دیتے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اس کام کو تدبیرِ زندگی اور معیشت کے لیے مفید خیال کرتے یا جنگ اور جنگ کی تیاری کے لیے اچھا سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ طویل جنگ بندی نے جنگی مہارت کم ہو جاتی ہے لہٰذا آتش جنگ بھڑکائی جائے۔

خدا بھی ان لوگوں کو جو ہدایت کی اہلیت نہیں رکھتے ان کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے اور ان کی ہدایت سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے کیونکہ خدا کافر گروہ کو ہدایت نہیں کرتا (واللہ لا یھدی القوم الکافرین)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ حرام مہینوں کا فلسفہ: ان چار مہینوں میں جنگ کو حرام قرار دینا طویل المدت جنگوں کے خاتمے کا طریقہ اور صلح و آشتی کی دعوت دینے کا ذریعہ ہے کیونکہ اگر جنگجو افراد سال میں چار مہینے ہتھیار زمین پر رکھ دیں اور تلواروں کی جھنکار اور بموں کے دھماکوں کی آواز خاموش ہو جائے اور غور و فکر کا موقع مل جائے تو جنگ ختم ہو جانے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔

کسی کام کو جاری و ساری رکھنا، اسے چھوڑ کر نئے سرے سے شروع کرنے سے ہمیشہ مختلف ہوتا ہے نیز پہلے کی نسبت کئی

در پے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ ویت نام کی بیس سالہ جنگوں کی وہ کیفیت بھلائی نہیں جاسکتی جب نئے عیسوی سال کی آمد کے موقع پر صرف چوبیس گھنٹے کی جنگ بندی کے لیے کس قدر زحمت اٹھانا پڑتی تھی لیکن اسلام اپنے پیروکاروں کے لیے ہر سال چار ماہ کی جنگ بندی کا اعلان کیے ہوئے ہے اور یہ خود اسلام کی امن پسندی کی ایک نشانی ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اگر دشمن اس اسلامی قانون سے غلط فائدہ اٹھانا چاہے اور حرام مہینوں کی حرمت کو پائمال کر دے تو پھر مسلمانوں کو اس کا ویسا ہی جواب دینے کی اجازت دی گئی ہے۔

۲۔ زمانہ جاہلیت میں "نسئ" کا مفہوم اور فلسفہ: "نسئ" (بروزن کثیر) "نساء" کے مادہ سے تاخیر میں ڈالنے کے معنی میں ہے (اور خود یہ لفظ اسم مصدر یا مصدر ہو سکتا ہے)۔ وہ لین دین کہ جس میں قیمت کی ادائیگی میں تاخیر کی جائے اسے "نسیہ" کہتے ہیں۔

زمانہ جاہلیت میں عرب کبھی کبھی کسی ماہ حرام کو مؤخر کر دیتے تھے یعنی مثلاً محرم کی بجائے صفر کا انتخاب کر لیتے تھے۔ اس کا طریقہ اس طرح تھا کہ بنی کنانہ کا کوئی ایک سردار مراسم حج میں منیٰ کے مقام پر نسبتاً ایک بڑے اجتماع میں لوگوں کے تقاضے کے بعد کہتا،

میں ماہ محرم کو اس سال مؤخر کرتا ہوں اور اس کے لیے ماہ صفر کا انتخاب کرتا ہوں۔

ابن عباس سے منقول ہے کہ پہلا شخص جس نے اس طریقے کا آغاز کیا عمرو بن لحی تھا اور بعض کہتے ہیں اس کام کا آغاز کرنے والا قلمس تھا جس کا تعلق بنی کنانہ سے تھا۔

بعض کے خیال میں ان کی نگاہ میں اس کام کا فلسفہ یہ تھا کہ بعض اوقات مسلسل تین ماہ کی پابندی (یعنی ذی القعدہ، ذی الحجہ اور محرم) انہیں مشکل لگتی تھی اور وہ اسے اپنے خیال میں جذبۂ جنگ کی کمزوری کا باعث سمجھتے اور خیال کرتے کہ یہ سپاہیوں کی کارکردگی رک جانے کا سبب ہے کیونکہ زمانہ جاہلیت میں لوگ غارتگری، خونریزی اور جنگ سے ایک عجیب سا لگاؤ رکھتے تھے اور اصولی طور پر جنگ و جدال ان کی زندگی کا ایک حصہ تھا اور ان کے پے درپے تین ماہ کی جنگ بندی ایک طاقت فرسا امر تھا لہٰذا وہ کوشش کرتے تھے کہ کم از کم ماہ محرم کو ان تین مہینوں سے جدا کریں۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ کبھی ماہِ ذی الحجہ گرمیوں میں آجاتا تھا اور اس سے حج کا معاملہ ان کے لیے مشکل ہو جاتا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ حج اور اس کے مراسم زمانہ جاہلیت کے عربوں کے لیے عبادت میں منحصر نہ تھے بلکہ یہ عظیم مراسم حضرت ابراہیم کے زمانے سے بطور یادگار چلے آرہے تھے۔ یہ ایک عظیم کانفرنس شمار ہوتی تھی جو ان کی تجارت اور کاروبار کی رونق کا سبب بھی تھی۔ انہیں اس عظیم اجتماع سے بہت سے فوائد نصیب ہوتے تھے لہٰذا وہ ماہ ذی الحجہ کو اس کی جگہ سے اپنی خواہش اور رغبت کے مطابق تبدیل کر دیتے تھے اور اس کی جگہ مناسب موسم میں کوئی دوسرا مہینہ مقرر کر دیتے تھے اور ہو سکتا ہے کہ دونوں وجوہ صحیح ہوں۔ بہر حال یہ عمل سبب بنتا کہ آتش جنگ اسی طرح بھڑکتی رہتی اور حرام مہینوں کا مقصد پامال ہو جاتا۔ یوں مراسم حج ان کے اور اس کے اثر میں کھلونا اور ان کے مادی مفادات کا ذریعہ بن گئے۔

قرآن اس کام کو کفر کی زیادتی شمار کرتا ہے کیونکہ ان کے اعتقادی شرک اور کفر کے علاوہ اس حکم کو ٹھکرا کر وہ عملی کفر کا بھی ارتکاب کرتے تھے خصوصاً جب کہ اس کام کی وجہ سے وہ حرام عمل بجا لاتے تھے۔ ایک یہ کہ حرام خدا کو انھوں نے حلال کیا تھا

تھا اور دوسرا یہ کہ حلالِ خدا کو انھوں نے حرام کر رکھا تھا۔

۳۔ دشمن کے مقابلے میں وحدتِ کلمہ: مندرجہ بالا آیات میں قرآن حکم دیتا ہے کہ دشمن سے جنگ کرنے کے موقع پر مسلمان متحد ہو کر ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر ان سے جنگ کریں۔ اس حکم سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سیاسی، ثقافتی، اقتصادی اور فوجی میدان میں بھی اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں تیار کریں اور وہ صرف ایسی وحدت سے جس کا سرچشمہ توحیدِ اسلامی کی روح ہے، دشمن پر کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

یہ وہی حکم ہے جو مدت ہوئی طاقِ نسیاں ہو چکا ہے اور یہی بات مسلمانوں کے انحطاط اور پسماندگی کی علت ہے۔

۴۔ بُرے کام کیونکر زیبا معلوم ہوتے ہیں: جب تک انسان بُرے راستے پر گامزن نہ ہو اس کا وجدان اچھی طرح سے اچھائی اور برائی کی تمیز کر سکتا ہے لیکن جب وہ جان بوجھ کر جادۂ گناہ پر چل نکلے اور غلط کاری کی راہ پر قدم رکھ دے تو وجدان کی روشنی مدہم پڑ جاتی ہے اور بات رفتہ رفتہ یہاں تک جا پہنچی ہے کہ گناہ کی قباحت اس کے لیے آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے اور اگر وہ ایسے کام جاری رکھے تو آہستہ آہستہ بُرے کام اس کی نظر میں اچھے اور اچھے کام بُرے گنے جاتے ہیں اور اسی بات کی طرف زیرِ نظر آیات میں اور متعدد دیگر آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔

بعض اوقات بُرے اعمال کی تزئین کی نسبت شیطان کی طرف دی جاتی ہے۔ مثلاً سورہ نحل کی آیہ ۶۳ میں ہے:

فزین لھم الشیطان اعمالھم

اور کبھی فعل مجہول کی صورت میں ذکر ہوتی ہے۔ جیسا کہ زیرِ نظر آیت میں ہے۔ اس کا فاعل ہو سکتا ہے شیطانی وسوسے ہوں یا پھر سرکش نفس ہو۔

کبھی یہ نسبت "شرکاء" (یعنی۔ بتوں) کی طرف دی گئی ہے۔ اس کی مثال سورہ انعام کی آیہ ۱۳۷ ہے یہاں تک کہ کبھی خدا کی طرف . . . دی گئی ہے۔ مثلاً سورہ نمل کی آیہ ۴ میں ہے:

ان الذین لا یؤمنون بالاٰخرۃ زینا لھم اعمالھم

وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم نے ان کے بُرے اعمال کو ان کی نظر میں مزین کر دیا۔

ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کے امور کی خدا کی طرف نسبت اس بنا پر ہے کہ یہ چیزیں ان کے عمل کی خاصیت شمار ہوتی ہیں اور تمام چیزوں کے خواص اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ نیز ہم کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کی نسبتیں انسان کے اختیار اور ارادے کی آزادی سے منافات نہیں رکھتیں۔

۳۸۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِیْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ؕ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا

مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ
اِلَّا قَلِيْلٌ ○

۳۹۔ اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا
غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيْرٌ ○

ترجمہ

۳۸۔ اے ایمان والو! جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ راہِ خدا میں جہاد کے لیے نکل پڑو تو کیوں زمین پر اپنا بوجھ ڈال دیتے ہو (اور سستی کرتے ہو)۔ کیا تم آخرت کے بدلے دنیاوی زندگی پر راضی ہو گئے ہو حالانکہ حیاتِ دنیا کی متاع آخرت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں مگر بہت ہی کم۔

۳۹۔ اگر (میدان جہاد کی طرف) حرکت نہ کرو تو تمہیں دردناک عذاب دے گا اور کسی دوسرے گروہ کو تمہاری جگہ مقرر کر دے گا اور تم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکو گے اور خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

شانِ نزول

ابن عباس اور دوسرے صحابہ سے منقول ہے کہ مندرجہ بالا آیات جنگ تبوک کے بارے میں اس وقت نازل ہوئیں جب پیغمبر اکرمؐ طائف سے مدینہ کی طرف لوٹے اور لوگوں کو رومیوں سے جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔

اسلامی روایات میں آیا ہے کہ رسول اللہؐ عام طور پر جنگ کی بنیادی باتیں اور تفصیلات مسلمانوں کے سامنے واضح نہیں کیا کرتے تھے تاکہ اسلام کے فوجی راز دشمنوں کے ہاتھ نہ لگ جائیں لیکن تبوک کے معاملے کی صورت مختلف تھی لہٰذا پہلے سے آپ نے انہیں بتا یا کہ ہم رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے جا رہے ہیں کیونکہ مشرقی روم کی سلطنت سے جنگ مشرکین مکہ یا یہودِ خیبر سے جنگ کی طرح کوئی آسان کام نہ تھا لہٰذا ضرورت تھی کہ مسلمان اس عظیم مشکل کے لیے پوری طرح اپنے آپ کو تیار کریں۔

علاوہ ازیں مدینہ اور سرحدِ روم کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ تھا مزید برآں گرمی کا موسم تھا اور غلوں اور پھلوں کی فصل کی کٹائی کے دن بھی تھے۔

یہ تمام امور یکجا ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے میدانِ جنگ کی طرف جانا بہت زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ یہاں

تک کہ بعض لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہنے میں متردد تھے اور گومگو کی کیفیت میں تھے۔

ان حالات میں مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور قاطع انداز میں سختی کے ساتھ مسلمانوں کو تنبیہ کی، اس کیفیت کے خطرے سے انہیں خبردار کیا اور انہیں اس عظیم معرکے کے لیے تیار کیا[1]

تفسیر

دوبارہ میدانِ جنگ کی طرف روانگی

جیسا کہ ہم شانِ نزول میں کہہ چکے ہیں مندرجہ بالا آیات جنگ تبوک کے بارے میں ہیں۔

تبوک مدینہ اور شام کے درمیان ایک علاقہ ہے جو آجکل سعودی عرب کی سرحد شمار ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مشرقی روم کے سرحد کے قریب تھا۔ وہ حکومت اس وقت شامات پر قابض تھی[2]

یہ واقعہ ۹ ہجری یعنی فتح مکہ سے تقریباً ایک سال بعد رونما ہوا۔ مقابلہ چونکہ اس وقت کی ایک عالمی سوپر طاقت سے تھا لہٰذا عرب کے کسی چھوٹے بڑے گروہ سے لہٰذا بعض مسلمان اس جنگ میں شرکت سے خوف زدہ تھے۔ اس صورتِ حال میں منافقین کے زہریلے پراپیگنڈا اور وسوسوں کے لیے ماحول بالکل سازگار تھا اور وہ بھی مومنین کے دلوں اور جذبات کو کمزور کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کر رہے تھے۔

پھل اتارنے اور فصل کاٹنے کا موسم تھا۔ جن لوگوں کی زندگی تھوڑی سی کھیتی باڑی اور کچھ جانور پالنے پر بسر ہوتی تھی یہ ان کی قسمت کے اہم دن شمار ہوتے تھے کیونکہ ان کی سال بھر کی گزر بسر انہی چیزوں سے وابستہ تھی۔

جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں مسافت کی دوری اور موسم کی گرمی بھی روکنے والے عوامل کی مزید مدد کرتی تھی۔ اس موقع پر آسمانی وحی لوگوں کی مدد کے لیے آپہنچی اور قرآنی آیات یکے بعد دیگرے نازل ہوئیں اور ان منفی عوامل کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

زیرِ بحث پہلی آیت میں قرآن جس قدر ہوسکتی ہے اتنی سختی اور شدت سے جہاد کی دعوت دیتا ہے۔ کبھی تشویق کی زبان سے کبھی سرزنش کے لہجے میں اور کبھی دھمکی کی زبان میں ان سے بات کرتا ہے اور انہیں آمادہ کرنے کے لیے ہر راستہ اختیار کرتا ہے۔

پہلے کہتا ہے اے ایمان والو! جب تم سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی راہ میں، میدانِ جہاد کی طرف حرکت کرو تو تم سستی کا مظاہرہ کرتے ہو اور بوجھل پن دکھاتے ہو (یاایھا الذین اٰمنوا مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم الی الارض)۔

---

[1] بہت سے مفسرین مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں، فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں اور آلوسی نے روح المعانی میں اس شانِ نزول کو اجمالی طور پر بیان کیا ہے۔

[2] تبوک کا فاصلہ مدینہ سے ۶۱۰ کلو میٹر اور شام سے ۶۹۲ کلو میٹر بیان کیا جاتا ہے۔

"اثاقلتم" "ثقل" کے مادہ سے بوجھ کے معنی میں ہے۔ "اثاقلتم الی الارض" وطن میں رہ جانے کی خواہش اور میدان جہاد کی طرف حرکت نہ کرنے کے لیے کنایہ ہے یا پھر مادی اور زرق برق دنیا سے چمٹے رہنے کے لیے کنایہ ہے۔ دونوں صورتوں میں بہرحال مسلمانوں کے ایک گروہ کی یہ حالت تھی۔ سب ایسے نہ تھے۔ سچے مسلمانوں اور راہ خدا میں جہاد کے عاشقوں کی یہ حالت نہ تھی۔

اس کے بعد ملامت آمیز لہجے میں قرآن کہتا ہے: کیا آخرت کی وسیع اور دائمی زندگی کی بجائے اس دنیاوی پست اور ناپائیدار زندگی پر راضی ہو گئے ہو (ارضیتم بالحیوة الدنیا من الاخرة) حالانکہ دنیاوی زندگی کے فوائد اور مال و متاع آخرت کی زندگی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے اور بہت ہی کم ہیں (فما متاع الحیٰوة الدنیا فی الاٰخرة الا قلیل)۔

یک عقلمند انسان ایسے گھاٹے کے سودے پر کیسے تیار ہو سکتا ہے اور کیونکر وہ ایک نہایت گراں بہا متاع اور سرمایہ چھوڑ کر ایک ناچیز اور بے وقعت متاع کی طرف جا سکتا ہے۔

اس کے بعد ملامت کی بجائے ایک حقیقی تہدید کا انداز اختیار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: اگر تم میدانِ جنگ کی طرف حرکت نہیں کرو گے تو خدا دردناک عذاب کے ذریعے تمہیں سزا دے گا (الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما)۔

اور اگر تم گمان کرتے ہو کہ تمہارے کنارہ کش ہونے اور میدانِ جہاد سے پشت پھیرنے سے اسلام کی پیش رفت رک جائے گی اور آئینہ الٰہی کی چمک ماند پڑ جائے گی تو تم سخت اشتباہ میں ہو کیونکہ خدا تمہاری بجائے ایسے صاحبان ایمان کو لے آئے گا جو عزم صمیم رکھتے ہوں گے اور فرمان خدا کے مطیع ہوں گے (ویستبدل قوما غیرکم)۔ وہ لوگ کہ جو ہر لحاظ سے تم سے مختلف ہیں۔ نہ صرف ان کی شخصیت بلکہ ان کا ایمان، ارادہ، دلیری اور فرماں برداری بھی تم سے مختلف ہے لہٰذا "اس طرح تم خدا اور اس کے پاکیزہ دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے" (ولا تضروہ شیئا)۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک خیالی گفتگو یا دور دراز کی آرزو کیونکہ "وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے" اور جب وہ اپنے پاک آئین کی کامیابی کا ارادہ کرے گا تو اس میں کلام نہیں کہ اسے عمل جامہ پہنا دے گا (واللہ علی کل شیء قدیر)۔

چند اہم نکات

۱۔ جہاد پر سات تاکیدیں: مندرجہ بالا آیات میں سات طریقوں سے مسئلہ جہاد پر تاکید کی گئی ہے۔

۱۔ اہل ایمان کو اس کے لیے خطاب کیا گیا ہے۔

۲۔ میدانِ جہاد کی طرف حرکت کا حکم دیا گیا ہے۔

۳۔ "فی سبیل اللہ" کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔

۴۔ آخرت کے بدلے دنیا کا ذکر استفہام انکاری کی صورت میں کیا گیا ہے۔

۵۔ جہاد سے کنارہ کشی پر "عذاب الیم" کی دھمکی دی گئی ہے۔

۶۔ یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ تمہیں منظر سے ہٹا کر تمہاری ... لے آیا جائے گا۔

۱۔ خدا کی لامتناہی قدرت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ تمہاری سستیاں امور الٰہی کی پیش رفت میں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتیں بلکہ جو نقصان بھی ہو گا وہ تمہی کو دامن گیر ہو گا۔

۲۔ دنیا کی دل بستگی جہاد کے لیے سدراہ ہے: مندرجہ بالا آیات سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی زندگی سے دل بستگی مجاہدین کو امر جہاد میں سست کر دیتی ہے۔ سچے مجاہدین کو پاکباز، زہد پیشہ اور زرق و برق دنیا سے بے پرواہ ہونا چاہیے امام علی بن الحسین علیہ السلام اسلامی حکومت کی سرحدوں کے محافظین کے لیے کی گئی دعا میں کہتے ہیں۔

وانسھم عند لقائھم العدو ذکر دنیا ھم الخداعۃ وامح عن قلوبھم خطرات المال الفتون

بارالہا! جب وہ دشمن کے مقابل ہوں اس پر فریب دنیا کے ذکر و فکر کو ان سے دور رکھ اور فتنہ انگیز و دلکش اموال کی اہمیت ان کے منو دل سے محو کر دے (تاکہ تیرے عشق سے لبریز دل کے ساتھ تیرے لیے جنگ کریں۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم دنیا و آخرت کی کیفیت کو اچھی طرح پہچانتے ہوں تو ہم جان لیں گے آخرت کے مقابلے میں دنیا اس قدر محدود اور حقیر ہے کہ ان کا آپس میں کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں پیغمبر خدا سے ایک حدیث منقول ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے:

واللہ ما الدنیا فی الاٰخرۃ الا لما یجعل احدکم اصبعہ فی الیم ثم یرفعھا فلینظر بم ترجع

بخدا آخرت کے مقابلے میں دنیا اس طرح ہے کہ تم میں سے ایک شخص اپنی انگلی دریا میں ڈبوئے اور پھر اسے نکال لے اور دیکھے کہ دریا کا کتنا پانی اس کے ساتھ لگا ہوا ہے۔

۳۔ آیت میں کس گروہ کی طرف اشارہ ہے؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ آیت میں جس گروہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ایرانی ہیں بعض یہاں یمن کے لوگ مراد لیتے ہیں کہ جن میں سے ہر ایک گروہ نے اسلام کی پیش رفت میں اپنی بے انتہا جرأت و استقامت سے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ بعض ان لوگوں کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں جنہوں نے ان آیات کے نزول کے بعد اسلام قبول کیا اور دل و جان سے اس کی راہ میں فدا کاری کی۔

۴۰۔ اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَ

اَیَّدَهٗ بِجُنُوۡدٍ لَّمۡ تَرَوۡهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوا السُّفۡلٰى‌ؕ وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الۡعُلۡيَا‌ؕ وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۝

ترجمہ

۴۰۔ اگر اس کی مدد نہیں کرو گے تو خدا اس کی مدد کرے گا (جیسا کہ اس نے مشکل ترین لمحات میں اسے تنہا نہیں چھوڑا)۔ اس وقت جب کفار نے انہیں (مکہ سے) نکال دیا جب کہ وہ دو میں سے دوسرے تھے (ان کے ساتھ صرف ایک شخص اور تھا) جب وہ دونوں غار میں تھے تو وہ ہمسفر سے کہہ رہے تھے غم نہ کھاؤ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ تو اس موقع پر خدا نے اپنا سکینہ (اور اطمینان) ان پر بھیجا اور ان کی ایسے لشکر سے تقویت کی جنہیں تم نہیں دیکھتے تھے اور کافروں کی گفتار (اور ہدف) کو پست قرار دیا (اور انہیں شکست سے دوچار کیا) اور خدا کی بات (اور اس کا دین) بلند (اور کامیاب) ہوا اور خدا عزیز و حکیم ہے۔

تفسیر

حساس ترین لمحات میں خدا نے اپنے پیغمبر کو تنہا نہیں چھوڑا

جیسا کہ وضاحت کی جا چکی ہے گزشتہ آیات میں جہاد کے مسئلے پر متعدد حوالوں سے تاکید کی گئی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ــــ یہ گمان نہ کرو کہ اگر تم جہاد اور پیغمبر کی مدد سے کنارہ کش ہو گئے تو اس کا پروگرام اور اسلام زمین بوس ہو جائے گا ــــ زیر بحث آیت اسی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتی ہے، اگر اس کی مدد نہ کرو گے تو وہ خدا جس نے سخت ترین حالات اور پیچیدہ ترین مواقع پر معجزانہ طور پر اس کی مدد کی ہے قدرت رکھتا ہے کہ پھر اس کی مدد کرے (الا تنصروہ فقد نصرہ اللہ[1])۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرکین مکہ پیغمبر اکرمؐ کو قتل کرنے کی ایک خطرناک سازش تیار کر چکے تھے۔ جب کہ سورہ انفال کی آیہ ۳۰

---

[1] ادبی نقطہ نظر سے اس جملے میں کچھ محذوف ہے اور اصل میں یوں اس طرح تھا: "الا تنصروہ ینصرہ اللہ" کیونکہ فعل ماضی جس کا مفہوم گزشتہ زمانے میں واقع ہو چکا ہو، جزائے شرط نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ فعل ماضی ایسا ہو جو مضارع کا معنی دیتا ہو۔

کے ذیل میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے تفصیلی غور و خوض اور منصوبہ بندی کے بعد انہوں نے آخری فیصلہ کیا تھا کہ عرب کے مختلف قبائل کے بہت سے شمشیر زن رات کے وقت رسول اللہؐ کے گھر کا محاصرہ کریں اور صبح سب مل کر آنحضرتؐ پر حملہ کریں اور بستر پر ہی تلواروں سے ان کے جسم مبارک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔

پیغمبر اکرمؐ جو حکم خدا سے اس سازش سے آگاہ ہو چکے تھے مکہ سے باہر جانے اور مدینہ کی طرف ہجرت کے لیے تیار ہوئے لیکن ابتدا میں کفار کی دسترس سے محفوظ رہنے کے لیے غار ثور میں پناہ گزیں ہوئے جو مکہ کے جنوب میں مدینہ کے راستے کی مخالف سمت میں تھی۔ اس سفر میں ابوبکر بھی آنحضرتؐ کے ساتھ تھے۔

دشمنوں نے رسول اللہؐ کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن مایوس ہو کر پلٹ گئے۔ رسول اللہؐ تین راتیں اور دن غار میں ٹھہرے رہے۔ جب دشمن کے پلٹ جانے کا اطمینان ہو گیا تو رات کے وقت عام راستے سے ہٹ کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ چند دنوں میں آپ صحیح و سالم مدینہ پہنچ گئے اور اس طرح تاریخ اسلام میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

مندرجہ بالا آیت اس تاریخی سفر کے ایک حساس ترین موقع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: خدا نے اپنے پیغمبر کی اس وقت مدد کی جب کافروں نے انہیں نکال باہر کیا (اذ اخرجه الذین کفروا)۔

البتہ کفار کا ارادہ انہیں نکال باہر کرنے کا نہیں تھا بلکہ وہ آپ کو قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکے تھے لیکن ان کے کام کے نتیجے میں چونکہ پیغمبر خداؐ کو مکہ سے باہر نکل جانا پڑا لہٰذا یہ نسبت ان کی طرف دی گئی ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: یہ اس حالت میں تھا کہ آپ دو میں سے دوسرے تھے (ثانی اثنین)۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کے ساتھ صرف ایک ہی شخص تھا اور یہ چیز اس پر خطر سفر میں آپؐ کی انتہائی تنہائی کی نشاندہی کرتی ہے۔ ابوبکر آپ کے ہمسفر تھے "جس وقت ان دونوں نے غار (یعنی غار ثور) میں پناہ لی (اذ هما فی الغار)۔ اس موقع پر پیغمبر کے ساتھی اور ہمسفر کو خوف اور وحشت نے گھیر رکھا تھا اور پیغمبرؐ نے اسے تسلی دی اور کہا غم نہ کھا خدا ہمارے ساتھ (اذ یقول لصاحبه لا تحزن ان الله معنا)۔ اس وقت اللہ نے سکون و اطمینان کی روح آپ پر نازل کی جو حساس اور پر خطر لمحات میں اپنے پیغمبر پر نازل کیا کرتا تھا (فانزل الله سکینته علیه) اور آپ کی ایسے لشکروں سے مدد کی جنہیں تم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ (وایده بجنود لم تروها)۔

یہ غیبی لشکر ہو سکتا ہے کہ ان فرشتوں کی طرف اشارہ ہو جو خوف و خطر سے بھرپور اس سفر میں پیغمبر کے محافظ ہوں یا ان کی طرف جو بدر حنین وغیرہ کے میدانوں میں آپ کی مدد کے لیے آئے تھے۔

آخر میں خدا تعالیٰ نے کفار کے طرز عمل، ہدف اور مکتب کو پست قرار دیا ہے اور الٰہی منصوبہ بندی اور کلام کو بلند قرار دیا ہے (وجعل کلمة الذین کفروا السفلی و کلمة الله هی العلیا) اور ساتھ اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کی سازش ناکام ہو کر رہ گئی، ان کے بے ہودہ مذہب کی بساط الٹ گئی، خدا کا نور ہر جگہ آشکار ہوا اور چمکنے لگا اور پیغمبر اسلام کو تمام جہات میں کامیابی نصیب ہوئی۔ ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ خدا قادر بھی ہے اور حکیم و دانا بھی، وہ اپنی حکمت کے ذریعے اپنے پیغمبر کو کامیابی کی راہوں کی نشاندہی کرتا ہے اور اپنی قدرت سے ان کی مدد کرتا ہے (والله عزیز حکیم)۔

داستان یارِ غار

اس سفر میں حضرت ابوبکر کے پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ ہونے کے بارے میں جو سربستہ اشارات مندرجہ بالا آیت میں کیے گئے ہیں اس پر شیعہ اور سنی مفسرین میں بہت سی مباحث پیدا ہو گئی ہیں۔

اس سلسلے میں بعض نے افراط کی راہ اختیار کی ہے اور بعض نے تفریط کا راستا اپنایا ہے۔

فخر الدین رازی نے اپنے مخصوص تعصب کی بنا پر اپنی تفسیر میں کوشش کی ہے کہ مندرجہ بالا آیت سے حضرت ابوبکر کی بارہ فضیلتیں ثابت کرے۔ اس میں فضائل کی تعداد زیادہ ثابت کرنے کے لیے اس نے زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں اس تفسیر کی صورت یہ ہو گئی ہے کہ تفصیل بیان کرنا شاید ضیاع وقت کا مصداق ہو۔

جب کہ بعض دوسرے لوگ اصرار کرتے ہیں کہ اس آیت سے حضرت ابوبکر کی متعدد مذمتیں معلوم ہوتی ہیں۔

پہلے یہ دیکھنا ہے کہ کیا لفظ "صاحب" فضیلت کی دلیل ہے؟ ظاہراً ایسا نہیں ہے کیونکہ لغت کے لحاظ سے صاحب کے مطلقاً معنیٰ "ہم نشین" اور "ہم سفر" کے ہیں چاہے ہم نشین و ہم سفر اچھا ہو یا بُرا۔ نیز سورہ کہف کی آیہ ۳۷ میں ان دو افراد کا واقعہ آیا ہے کہ جن میں سے ایک صاحبِ ایمان اور خدا پرست تھا اور دوسرا بے ایمان اور مشرک تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:

قال لہ صاحبہ وھو یحاورہ اکفرت بالذی خلقک من تراب

اس کے ساتھی نے اس سے کہا کیا تو اس خدا کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا ہے؟

بعض یہ بھی اصرار کرتے ہیں کہ "علیہ" کی ضمیر جو "فانزل اللہ سکینتہ علیہ" کے جملہ میں آئی ہے حضرت ابوبکر کی طرف لوٹتی ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ کو سکینہ اور اطمینان کی ضرورت نہیں تھی اس لیے اس کا نزول ان کے ہمسفر (ابوبکر) کے لیے تھا جبکہ بعد والے جملے میں ہے: "وایدہ بجنود لم تروھا" (اس کی غیر مرئی لشکر سے مدد کی)۔ اس کی طرف توجہ کی جائے اور دونوں میں مرجع ضمیر کے ایک ہونے کی طرف توجہ کی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ "علیہ" کی ضمیر بھی رسول اللہ کی طرف لوٹتی ہے۔ نیز یہ اشتباہ ہے کہ ہم تصور کریں کہ سکینہ کا تعلق حزن و ملال کے مواقع سے ہے کیونکہ قرآن میں بارہا آیا ہے کہ "سکینہ" ذاتِ پیغمبر پر نازل ہوئی جب آپ سخت اور مشکل حالات سے دوچار ہوئے۔ ان میں سے ایک واقعہ حنین ہے جس کے بارے میں اسی سورہ کی آیہ ۲۶ میں ہم پڑھ چکے ہیں:

ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المؤمنین

یعنی — پھر اللہ نے اپنی سکینہ اپنے رسول اور مومنین پر نازل کی۔

نیز سورہ فتح کی آیہ ۲۶ میں ہے:

فانزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المؤمنین

جب کہ ان دونوں آیات سے متعلق حزن و ملال اور غم و اندوہ کے متعلق کسی قسم کی کوئی گفتگو نہیں ہوئی بلکہ حالات کی پیچیدگی کی بات ہوئی ہے۔

بہر حال آیات قرآنی نشاندہی کر رہی ہیں کہ نزول سکینہ سخت مشکلات کے وقت ہوتی تھی اور اس میں شک نہیں کہ غار ثور میں رسول اللہ سخت لمحات میں وقت گزار رہے تھے۔

زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ "بجنود لم تروھا" (اس نے اس کی ایسے لشکر سے مدد کی جسے تم نہیں دیکھ سکتے تھے) یہ جملا ابو بکر کے بارے میں ہے جب کہ اس آیت کی ساری بحث جو کہ خدا کی مدد و نصرت کے محور پر گھومتی ہے سب پیغمبر کے بارے میں ہے اور قرآن چاہتا ہے کہ واضح کرے کہ پیغمبر اکیلے نہیں ہیں اگر اس کی مدد نہ کرو گے تو خدا اس مدد کرے گا۔ لہٰذا جس شخص کے گرد تمام بحث گھومتی ہے اسے چھوڑ کر ایسے شخص کی تلاش کیوں کی جائے کہ جس کا ذکر اتباع اور پیروی کے حوالے سے آیا ہے۔ یہ صورت حال نشاندہی کرتی ہے تعصبات یہاں تک حائل ہو گئے ہیں کہ بعض لوگوں کی توجہ آیت کے معنی کی طرف بھی نہیں گئی۔

۴۱۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝
۴۲۔ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ
بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا
لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ
لَكٰذِبُوْنَ ۝

ترجمہ

۴۱۔ (سب کے سب میدانِ جہاد کی طرف) چل پڑو چاہے سبک بار ہو یا سنگین بار اور اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کرو اور اگر تم جانو تو یہ تمہارے نفع میں ہے۔

۴۲۔ (اور ان میں سے ایک گروہ ایسا ہے کہ) اگر غنائم نزدیک (اور دسترس میں) ہوں اور سفر آسان ہو (تو دنیاوی طمع میں) تیری پیروی کرتے ہیں لیکن (اب جب کہ میدان تبوک کے لیے راستہ ان کے طویل (اور مشقت والا) ہے (تو روگردانی کرتے ہیں) اور عنقریب قسم کھائیں گے کہ اگر ہم میں طاقت

ہوتی تو ہم تمہارے ساتھ چل پڑتے (لیکن ان اعمال اور ایسے صریح جھوٹوں سے) اپنے آپ کو ہلاک کرتے ہیں اور خدا جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

تفسیر

تن پرور لالچی

ہم کہہ چکے ہیں کہ جنگ تبوک ایک استثنائی کیفیت رکھتی تھی اور اس کے لیے ایسے امور ضروری تھے جو بہت مشکل اور پیچیدہ تھے۔ اسی بناء پر چند ضعیف الایمان یا منافق افراد اس میدان میں شرکت کرنے سے لیت و لعل کرتے تھے۔ گذشتہ آیات میں خدا تعالیٰ نے ایک گروہ کو سرزنش کی ہے کہ جب جہاد کا فرمان صادر ہوتا ہے تو بوجھل کیوں ہو جاتے ہو (اور سستی کیوں دکھاتے ہو)۔ نیز فرمایا ہے کہ جہاد کا حکم تمہارے فائدے میں ہے ورنہ خدا ایسا کر سکتا ہے کہ بے ارادہ اور تن پرور افراد کی بجائے شجاع، بہادر، صاحبِ ایمان اور عزمِ راسخ والے افراد لے آئے بلکہ یہاں تک کہ ان کے بغیر بھی وہ قدرت رکھتا ہے کہ اپنے پیغمبر کی حفاظت کرے جیسا کہ غارِ ثور اور لیلۃ المبیت والے واقعہ میں حفاظت کی ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ کڑی کے جالے کے چند تار جو غار کے دھانے پر تنے ہوئے تھے اس بات کا سبب بن گئے کہ ہٹ دھرم اور سرکش دشمن کی فکر ہی بدل جائے اور وہ غار کے دھانے سے ہی پلٹ آئے اور رسول اللہ صحیح و سالم رہے جب خدا عنکبوت کے چند تاروں کے ذریعے نوعِ بشر کی تاریخ کا دھارا بدل سکتا ہے تو اسے اِن کی اور اُس کی مدد کی کیا ضرورت ہے کہ وہ ناز نخرے دکھاتے رہیں۔ درحقیقت یہ تمام احکام خود ان کی ترقی اور تکامل کے لیے ہیں نہ کہ خدا کو ان کی حاجت ہے۔

اس گفتگو کے بعد قرآن دوبارہ مومنین کو جہاد کی طرف ہر پہلو سے دعوت دے رہا ہے اور سستی دکھانے والوں کو سرزنش کر رہا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: تم سب کے سب میدان جہاد کی طرف چل پڑو چاہے سبک بار ہو چاہے بوجھل (انفروا خفافاً و ثقالاً)۔

"خفاف" جمع ہے "خفیف" کی اور "ثقال" جمع ہے "ثقیل" کی اور یہ دونوں لفظ ایک جامع مفہوم رکھتے ہیں جس میں انسان کے تمام ترکیفیات اور حالات شامل ہیں۔ چاہے انسان جوان ہو یا بوڑھا، مجرد ہو یا شادی شدہ، اس کے افرادِ خانہ کم ہوں یا زیادہ، غنی ہو یا فقیر، ابتلا میں ہو یا مصیبت میں، اس کی زراعت، باغ اور تجارت ہو یا نہ ہو، ہر صورت اور ہر حالت میں اور ہر مقام اور ہر حیثیت میں اس پر لازم ہے کہ جب فرمانِ جہاد صادر ہو بس اسی آزادی بخش دعوت پر لبیک کہے، دوسرے ہر کام سے آنکھیں بند کر لے اور تلوار بکف میدانِ جنگ کی طرف چل کھڑا ہو۔

یہ جو بعض مفسرین نے ان دو الفاظ کو مندرجہ بالا معانی میں سے فقط ایک میں محدود قرار دیا ہے اس کے لیے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ دراصل ان میں سے ہر لفظ اس وسیع مفہوم کا مصداق ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: راہِ خدا میں مالوں اور جانوں سے جہاد کرو (وجاھدوا باموالکم و انفسکم) یعنی

ہر پہلو سے جہاد کرو کیونکہ ایسے طاقتور دشمن کے مقابلے میں جو اس دور کی سپر طاقت سمجھا جاتا تھا، اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں تھی لیکن اس بناء پر کہ پھر بھی کسی کو اشتباہ نہ ہو کہ یہ قربانی اور فداکاری خدا کے لیے فائدہ مند ہے، فرمایا گیا ہے: یہ تمہارے فائدے میں ہے، اگر تم جانو (ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون)۔ یعنی اگر تم جان لو کہ جہاد سربلندی اور عزت کی کلید ہے اور ذلت اور کمزوری کے خاتمے کا ذریعہ ہے، اگر تم جان لو کہ کوئی قوم جہاد کے بغیر دنیا میں حقیقی آزادی اور عدالت تک نہیں پہنچ سکتی اور اگر تم جان لو کہ رضائے خدا، دائمی سعادت اور طرح طرح کی نعماتِ الٰہی تک پہنچنے کی راہ اسی مقدس نہضت اور ہمہ پہلو فداکاری میں ہے۔ اس کے بعد بحث کا رُخ سست، کاہل اور کمزور ایمان والے افراد کی طرف موڑا گیا ہے۔ یہ لوگ اس عظیم معرکے میں شرکت سے بچنے کے لیے طرح طرح کے بہانے بناتے تھے۔ اس سلسلے میں رسول اللہؐ سے فرمایا گیا ہے: اگر مالِ غنیمت دسترس میں ہوتا اور سفر نزدیک کا ہوتا تو متاعِ دنیا تک پہنچنے کے لیے یہ بہت ہی جلد تیری دعوت پر لبیک کہتے اور اس کے پیچھے ہوئے دسترخوان پر بیٹھنے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے (لو کان عرضا قریبا و سفرا قاصدا لا تبعوک)۔[۱]

لیکن اب جب کہ سفر دور کا ہے سستی دکھاتے ہیں اور بہانے بناتے ہیں (و لکن بعدت علیهم الشقة)۔[۲]

تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ صرف بہانے نہیں بناتے بلکہ "جلدی سے تمہارے پاس آجاتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں کہ اگر ہم میں طاقت ہوتی تو آپ کے ساتھ ہم بھی نکلتے" (و سیحلفون بالله لو استطعنا لخرجنا معکم)۔ اور اگر آپ دیکھتے ہیں کہ ہم اس معرکے میں آپ کے ساتھ شرکت نہیں کر رہے تو اس کی وجہ ہماری معذوری اور عدم قدرت ہے، ہم مختلف مسائل میں گرفتار ہیں "ان اعمال اور ان دروغ گوئیوں کی وجہ سے درحقیقت وہ اپنے آپ کو ہلاک کر دیتے ہیں" (یهلکون انفسهم) لیکن خدا جانتا ہے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں" (و الله یعلم انهم لکذبون)۔

وہ مکمل طور پر طاقت رکھتے ہیں لیکن چونکہ کام اتنا آسان نہیں ہے بلکہ کٹھن اور مشکل ہے لہٰذا وہ جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے ہیں۔

یہ امر جنگ تبوک اور زمانۂ رسولؐ سے مخصوص نہیں بلکہ ہر معاشرے میں بیکار، سست اور کاہل یا منافقین، لالچی اور ابن الوقت لوگوں کا ایک گروہ ہوتا ہے جو ہمیشہ منتظر رہتا ہے کہ کامیابی اور فتح کے لمحات آپہنچیں تو اس وقت پہلی صف میں آکھڑے ہوں گے اور شور مچانے لگیں گے، گریبان چاک کریں گے، اپنے آپ کو مبارز اور مجاہد اول قرار دیں گے اور اپنا تعارف دلسوز ترین افراد میں سے کروائیں گے تاکہ بغیر زحمت کے دوسروں کی کامیابی کے ثمرات سے بہرہ ور ہوں لیکن یہی مبارز، مجاہد، سینہ چاک اور دل سوز مشکل حوادث کے موقع پر کسی نہ کسی طرف بھاگ کھڑے ہوں گے اور اپنے فرار کے لیے عذر بہانے تراشیں گے۔ کوئی خود بیمار ہو گیا ہوگا، کسی کا بیٹا بستر بیماری پر پڑا ہوگا، کسی کی بیوی وضع حمل میں مبتلا ہوگی، کچھ کی آنکھیں کمزور ہونے کی بات

۱۔ "عرض" اس عارضی چیز کو کہتے ہیں جو جلدی زائل ہو جاتی ہے اور جسے دوام حاصل نہیں ہوتا۔ عام طور پر دنیا کی مادی نعمتوں کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے اور "قاصد" سہل و آسان کے معنی میں ہے کیونکہ اصل میں یہ لفظ "قصد" کے مادہ سے ہے اور عموماً لوگ اپنے قصد کو آسان مسائل میں سے سمجھتے ہیں۔

۲۔ "شقة" ایسی سنگلاخ زمینوں یا دور دراز راہوں کو کہتے ہیں کہ جنہیں عبور کرنے کے لیے بڑی مشقت اور زحمت درکار ہوتی ہے۔

کرے گا اور کوئی مقدمات کی تیاری میں لگا ہوگا ـــــ اسی طرح کے بیسیوں بہانے ہوں گے۔ لیکن بیدار اور روشن دل رہبر پر لازم ہے کہ ایسے لوگوں کی شناخت شروع میں کروا دیں اور اگر یہ لوگ قابلِ اصلاح نہ ہوں تو انہیں اپنی صفوں سے نکال باہر کریں۔

۴۳۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ○

۴۴۔ لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ○

۴۵۔ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ○

ترجمہ

۴۳۔ خدا نے تمہیں بخش دیا کہ تم نے انہیں اجازت کیوں دی، اس سے پہلے کہ جو راست گو ہیں تیرے لیے واضح ہوں اور تم جھوٹوں کو پہچان لو۔

۴۴۔ وہ جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں تم سے کبھی بھی (راہِ خدا میں) اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے سے رخصت نہیں چاہیں گے اور خدا پرہیزگاروں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے۔

۴۵۔ صرف وہ لوگ تم سے رخصت چاہیں گے جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک و تردد میں ہیں لہٰذا وہ اپنے تردد میں سرگرداں ہیں۔

تفسیر

کوشش کرو کہ منافقین کو پہچان لو

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کا ایک گروہ پیغمبرؐ کے پاس آیا اور طرح طرح کے عذر بہانے کرنے لگا۔ یہاں تک کہ قسم کھا کر انہوں نے اجازت چاہی کہ انہیں میدانِ تبوک میں شرکت سے معذور سمجھیں اور پیغمبر اکرمؐ نے اس گروہ کو اجازت دے دی۔

زیر بحث پہلی آیت میں خداوند عالم اپنے پیغمبرؐ کو تنبیہ کے انداز میں کہتا ہے: خدا نے تمہیں بخش دیا کہ تم نے انہیں جہاد میں شرکت سے رخصت کیوں دی (عفا اللہ عنک لم اذنت لھم)۔ کیوں ایسا نہ ہونے دیا کہ راست گو لوگ جھوٹوں سے ممتاز ہو جائیں اور تم ان کی کیفیت جان لیتے (حتی یتبین لک الذین صدقوا و تعلم الکذبین)۔

اس بارے میں کہ مذکورہ تنبیہ جس کے ساتھ عفوالٰہی کا ذکر ہے کس بات کی دلیل ہے کیا یہ کوئی غلط کام تھا یا صرف "ترکِ اولیٰ" تھا یا کچھ بھی نہ تھا اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض نے تو ایسی تیزی دکھائی ہے کہ رسول اللہؐ کے مقامِ مقدس تک میں جسارت اور بے ادبی کی ہے اور یہاں تک کہ اس آیت کو آپ سے صدورِ گناہ کے امکان کی دلیل قرار دیا ہے۔ ان لوگوں نے کم از کم اتنا ادب بھی ملحوظ نہیں رکھا جو خود خدائے عظیم نے اپنے پیغمبرؐ کے بارے میں کیا ہے کہ پہلے "عفو" کی بات کی گئی ہے پھر تنبیہ کی گئی ہے۔ اس طرح سے یہ لوگ عجیب گمراہی میں جا پڑے ہیں۔

انصاف یہ ہے کہ اس آیت میں پیغمبر اکرمؐ سے گناہ کے صدور کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ظاہر آیت میں بھی ایسی کوئی دلیل نہیں کیونکہ تمام قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ چاہے انہیں اجازت دیتے یا نہ دیتے منافقین کا وہ گروہ جنگِ تبوک میں شرکت نہ کرتا اور بالفرض شرکت کرتا بھی تو مسلمانوں کے کسی کام نہ آتا بلکہ ان کی مشکلات میں اضافہ ہی کرتا جیسا کہ بعد کی ایک آیت میں ہے:

لو خرجوا فیکم ما زادوکم الا خبالا

اگر وہ تمہارے ساتھ چل پڑتے تو شر، فساد، چغلخوری، سخن چینی اور نفاق پیدا کرنے کے سوا کچھ نہ کرتے۔

(توبہ۔ ۴۷)

اس لیے اگر پیغمبر اکرمؐ نے انہیں اجازت دے دی تو مسلمانوں کا کوئی مفاد ضائع نہیں ہوا۔ صرف جو بات اس میں موجود تھی وہ یہ تھی کہ اگر آپ انہیں اجازت نہ دیتے تو ان کی قلعی ذرا پہلے کھل جاتی اور لوگ پہلے ہی ان کی کیفیت سے آشنا ہو جاتے لیکن اس کام سے کوئی ارتکابِ گناہ نہیں ہوا۔ شاید اسے فقط "ترکِ اولیٰ" کہا جا سکے، اس معنی میں کہ ان حالات میں اور منافقین کے قسم کھانے اور اصرار کرنے کی صورت میں پیغمبر اکرمؐ کی طرف سے انہیں اجازت دینا اگرچہ کوئی بُرا کام نہ تھا مگر اذن نہ دینا

اس سے بہتر تھا تاکہ یہ لوگ جلدی پہچانے جائیں۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ تنبیہ اور مذکورہ خطاب کنایہ کے طور پر ہو۔ یہاں تک کہ اس میں ترکِ اولیٰ بھی نہیں ہے بلکہ یہاں مراد یہ ہے کہ منافقین میں روحِ منافقت کو ایک لطیف پیرائے میں کنایہ کی صورت میں بیان کیا جائے۔

اس امر کو ایک مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ فرض کیجیے ایک ظالم چاہتا ہے کہ آپ کے بیٹے کے منہ پر طمانچہ رسید کرے۔ آپ کا ایک دوست اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے تو آپ کو نہ صرف اس کام پر دکھ نہیں ہوگا بلکہ آپ خوش بھی ہوں گے لیکن آپ ظالم کے باطن کی بدی ثابت کرنے کے لیے آپ غصے کے انداز میں اپنے دوست سے کہیں گے کہ تم نے اسے چھوڑا کیوں نہیں کہ وہ طمانچہ مارتا تاکہ تمام لوگ اس سنگدل منافق کو پہچان لیتے۔ آپ کا مقصد اس بیان سے صرف اس کی سنگدلی اور نفاق کا اثبات ہے جبکہ ظاہرًا یہ دفاع کرنے والے دوست کی سرزنش ہے۔

اور بات جو آیت کی تفسیر میں باقی رہ جاتی ہے یہ ہے کہ کیا رسول اللہؐ منافقین کو نہیں پہچانتے تھے کہ خدا تعالیٰ کہہ رہا ہے: چاہیے یہ تھا کہ تم انہیں اجازت نہ دیتے تاکہ ان کی کیفیت تمہارے لیے واضح ہو جاتی۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ پہلے تو پیغمبر اکرمؐ معمول کے علم کے طریقے سے اس گروہ کی کیفیت سے آشنا نہیں تھے اور علمِ غیب موضوعات کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ معمول کے مدارک سے ان کی کیفیت واضح ہونا چاہیے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ پیغمبرؐ جان لیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ مقصد یہ ہو کہ تمام مسلمان آگاہ ہو جائیں اگرچہ روئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے۔

اس کے بعد مومنین اور منافقین کی نشانیوں کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا: وہ جو خدا اور روزِ آخرت پر یقین رکھتے ہیں وہ اپنے مالوں اور اپنی جان سے راہِ خدا میں جہاد کرنے سے تم سے کبھی رخصت نہیں چاہیں گے (لا یستأذنك الذین یؤمنون باللہ والیوم الاٰخر ان یجاھدوا باموالھم وانفسھم) بلکہ جب فرمانِ جہاد صادر ہوگا بغیر پست و لعل اور سستی کے اس کی طرف بھاگیں گے اور یہی خدا پر ایمان، اس کی طرف سے عائد ذمہ داریوں پر ایمان اور آخرت کی عدالت پر ایمان انہیں اس راہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ یہ ایمان عذر تراشی اور بہانہ جوئی کی راہ ان کے سامنے بند کر دیتا ہے۔ خدا پرہیزگاروں کو اچھی طرح سے پہچانتا ہے اور ان کی نیتوں اور اعمال سے مکمل طور پر آگاہ ہے (واللہ علیم بالمتقین)۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: میدانِ جہاد میں شرکت نہ کرنے کی اجازت تم سے وہی لوگ طلب کرتے ہیں جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان نہیں رکھتے (انما یستأذنك الذین لا یؤمنون باللہ والیوم الاٰخر)۔ ان کے عدمِ ایمان ہی پر زور دیتے ہوئے مزید کہا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جن کے دل مضطرب اور شک و تردد میں گرفتار ہیں (وارتابت قلوبھم)۔

لہٰذا وہ اس شک و تردد کی بنا پر کبھی قدم آگے بڑھاتے ہیں اور کبھی پلٹ آتے ہیں اور ہمیشہ تحیر و سرگردانی میں رہتے ہیں اور اسی وجہ سے بہانے تراشنے اور پیغمبرؐ سے اجازت حاصل کرنے کے منتظر رہتے ہیں (فھم فی ریبھم یترددون)۔

مندرجہ بالا صفات اگرچہ فعل مضارع کی صورت میں ذکر ہوئی ہیں لیکن ان کا مقصد منافقین اور مومنین کی صفات و حالات بیان کرنا ہے اور اس میں ماضی، حال اور مستقبل کا کوئی فرق نہیں۔

بہرحال مومنین اپنے ایمان کے زیرِ سایہ عزمِ صمیم اور غیر متزلزل ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے راستے کو روشنی میں دیکھا ہے۔ ان کا مقصد واضح اور ہدف مشخص ہے۔ اسی بناء پر وہ عزم راسخ کے ساتھ بلا تردد سیدھے قدموں سے آگے کی طرف جاتے ہیں اور منافقین کا ہدف چونکہ تاریک اور غیر مشخص ہے وہ حیرت و سرگردانی میں گرفتار ہیں اور وہ ہمیشہ ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے سے فرار کے لیے بہانے تراشتے رہتے ہیں۔

یہ دونوں نشانیاں صدرِ اسلام اور میدانِ تبوک کے مومنین اور منافقین سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ آج بھی سچے مومنین کو جھوٹے دعویداروں کی انہی دو صفات کو دیکھ کر پہچانا جا سکتا ہے۔ مومن شجاع اور مصمم ارادے والا ہوتا ہے اور منافق بزدل، ڈرپوک متحیر اور بہانہ تراش ہوتا ہے۔

۴۶۔ وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ○

۴۷۔ لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَاوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ○

۴۸۔ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ○

ترجمہ

۴۶۔ اگر وہ (سچ کہتے تھے اور) چاہتے تھے (کہ میدان جہاد کی طرف) نکلیں تو اس کے لیے وسیلہ فراہم کرتے لیکن خدا ان کے نکل پڑنے کو ناپسند کرتا تھا لہٰذا اپنی توفیق ان سے سلب کر لی اور انہیں (اس کام سے) روک لیا اور ان سے کہا گیا کہ قاعدین (جو بچوں، بوڑھوں اور بیماروں پر مشتمل ہیں) کے ساتھ بیٹھ رہو۔

۴۷۔ اگر تمہارے ساتھ (میدان جہاد کی طرف) نکل پڑتے تو اضطراب اور شک و تردد کے سوا تمہارے

لیے کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے اور بہت جلدی تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کرتے (اور تفرقہ و نفاق پیدا کرتے) اور تمہارے درمیان (سست اور کمزور) افراد ہیں جو ان کی بات کو زیادہ قبول کرنے والے ہیں اور خدا ظالموں سے باخبر ہے۔

۴۸۔ انہوں نے اس سے قبل بھی فتنہ انگیزی کے لیے اقدام کیا ہے اور تمہارے لیے کئی ایک کام دگرگوں کیے ہیں (اور انہیں خراب کیا ہے) یہاں تک کہ حق آپہنچا اور خدا کا فرمان آشکار ہوا (اور تم کامیاب ہوگئے) جب کہ وہ اسے ناپسند کرتے تھے۔

تفسیر

ان کا نہ ہونا ہونے سے بہتر تھا

گذشتہ آیات میں فرمایا گیا تھا:

واللہ یعلم انہم لکذبون

اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

زیر نظر آیات میں اسی بحث کو جاری رکھتے ہوئے ان کے جھوٹ اور افترا کی ایک اور نشانی بیان کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے، یہ اگر سچ کہتے ہیں اور جہاد میں شرکت کے لیے تیار ہیں اور صرف تمہارے اذن کے منتظر ہیں تو انہیں چاہیے کہ جہاد کے تمام وسائل ہتھیار، سواری اور جو کچھ ان کی طاقت میں ہے اسے فراہم کریں، جب کہ ان میں تو ایسی کوئی آمادگی نظر نہیں آتی (ولو ارادوا الخروج لاعدوا لہ عدۃ) یہ تاریک دل اور بے ایمان افراد ہیں کہ خدا جن کو جہاد کے پرافتخار میدان میں ناپسند کرتا ہے لہٰذا اس نے اپنی توفیق ان سے سلب کی ہے اور انہیں باہر نکلنے سے باز رکھا ہے (ولکن کرہ اللہ انبعاثہم فثبطہم)[1]۔

اس بارے میں کہ یہ گفتگو کس کی طرف سے ہے خدا کی طرف سے ہے یا پیغمبرؐ کی طرف سے یا یہ خود ان کے اپنے نفس اور باطن کی آواز ہے، مفسرین میں اختلاف ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ ایک تکوینی حکم ہے جو ان کے تاریک اور گندے باطن سے اٹھا ہے اور ان کے فاسد عقیدے اور برے اعمال کا تقاضا ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ مقتضائے حال کو امر یا نہی کی صورت میں لایا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت سے اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر عمل اور نیت کا ایک تقاضا ہے جو خواہ مخواہ انسان کو دامن گیر ہوتا ہے اور تمام لوگ اس کی اہلیت نہیں رکھتے کہ وہ بڑے کاموں اور راہِ خدا میں قدم اٹھائیں۔ یہ توفیق خدا ایسے لوگوں کو نصیب کرتا ہے جن میں

---

[1] "ثبطہم" "تثبیط" کے مادہ سے ہے اور یہ انجام کار سے روکنے کے معنی میں ہے۔

یت کی پاکیزگی، آمادگی اور خلوص ہوتا ہے۔

بعد والی آیت میں قرآن اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ایسے لوگوں کا میدان جہاد میں شریک نہ ہونا نہ صرف مقام افسوس نہیں بلکہ شاید خوشی کا مقام ہے کیونکہ وہ نہ فقط یہ کہ کوئی مشکل دور نہیں کرتے بلکہ اس نفاق، بے ایمانی اور اخلاقی انحراف کی روح کی وجہ سے نئی مشکلات کا باعث ہوتے۔

دراصل یہاں مسلمانوں کو ایک عظیم درس دیا گیا ہے کہ کبھی بھی بڑے لشکر اور زیادہ تعداد کی فکر میں نہ رہیں بلکہ اس فکر میں رہیں کہ مخلص اور باایمان افراد کا انتخاب کیا جائے چاہے ان کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کے لیے کل بھی یہی درس تھا، آج بھی یہی درس ہے اور آئندہ کے لیے بھی یہی درس ہوگا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اگر وہ تمہارے ساتھ (تبوک کے) میدان جہاد کی طرف روانہ ہوتے تو ان کا پہلا منحوس اثر یہ ہوتا کہ وہ اضطراب اور شک و تردد کے علاوہ تم میں کسی چیز کا اضافہ نہ کرتے (لو خرجوا فیکم ما زادوکم الا خبالاً)۔

"خبال" کا معنی ہے "اضطراب اور تردد" اور "خبل" (بروزن "اجل") جنون کے معنی میں ہے اور "خبل" بروزن طبل اعضاء کے فاسد ہونے کے معنی میں ہے۔ اس بنا پر اس فاسد باطن جو شک و تردد اور نفاق و بزدلی کی آماجگاہ ہے کے ساتھ اگر وہ میدان میں آجاتے تو سپاہِ اسلام میں شکوک و شبہات پیدا کرنے اور فساد پھیلانے کے سوا اور کچھ نہ کرتے۔ علاوہ ازیں وہ بڑی سرعت سے یہ کوشش کرتے ہیں کہ افرادِ لشکر میں نفوذ حاصل کریں، نفاق و تفرقہ پیدا کریں اور اتحاد کے رشتوں کو کاٹ دیں (ولا اوضعوا خلالکم یبغونکم الفتنۃ)۔[1]

اس کے بعد مسلمانوں کو خطرے سے متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ متوجہ رہیں کہ کمزور ایمان والے افراد تمہارے درمیان موجود ہیں جو ان منافقوں کی باتوں سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں (وفیکم سماعون لھم) "سماع" اس شخص کو کہتے ہیں جس میں پذیرائی اور شنوائی کی حالت زیادہ ہو اور جو تحقیق اور غور و غرض کے بغیر ہر بات کا اعتبار کر لے لہٰذا قوی ایمان مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کمزور گروہ پر نظر رکھیں کہ کہیں وہ گرگ صفت منافقین کا لقمہ نہ بن جائیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "سماع" جاسوس کے معنی میں ہو یعنی تمہارے درمیان کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو منافقین کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: "خدا ستمگروں کو پہچانتا ہے" وہ جو علی الاعلان اور وہ جو چھپ کر اپنے اوپر یا معاشرہ پر ظلم کرتے ہیں، اس کی دیدگاہ و علم سے مخفی نہیں ہیں (واللہ علیم بالظالمین)۔

اگلی آیت میں پیغمبر اکرم کو متنبہ کیا گیا ہے کہ یہ پہلا موقع نہیں کہ یہ منافقین سم پاشی اور تخریب کاری میں مشغول ہیں، یہ پہلے بھی ایسی کارروائیوں کا ارتکاب کرتے رہے ہیں اور اب بھی اپنے مقصد کے لیے ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں (لقد ابتغوا الفتنۃ من قبل)۔

---

[1] "اوضعوا" "ایضاع" کے مادہ سے حرکت میں تیزی کے معنی میں ہے اور یہاں سپاہ اسلام میں نفوذ میں تیزی کے مفہوم میں ہے۔ نیز "فتنہ" یہاں اختلاف اور تفرقہ کے معنی میں ہے۔

یہ جنگ اُحد کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ جس میں عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھ راستے ہی سے پلٹ آئے تھے اور رسول اللہؐ کی مدد سے انہوں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا یا دیگر مواقع کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں انہوں نے رسول اللہؐ کی ذات یا مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں کہ جن کا ذکر تاریخ اسلام میں موجود ہے۔

انہوں نے تمہارے بہت سے کام خراب کیے اور سازشیں کیں تا کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈال دیں اور انہیں جہاد سے باز رکھیں اور تمہارے اردگرد کوئی باقی نہ رہے (وقلبوا لك الامور)۔ لیکن ان کی کسی سازش اور کوشش کا کوئی اثر دیکھا اور ان کی سب سازشیں نقش برآب ہوگئیں اور ان کا وار خالی گیا "آخر کار فتح حاصل ہوئی اور حق واضح ہو گیا" (حتیٰ جآء الحق وظهر امر الله)۔ "جب کہ وہ تمہاری پیش رفت اور کامیابی کو ناپسند کرتے تھے" (وهم كارهون) لیکن پروردگار کے ارادہ اور مشیت کے مقابلے میں بندوں کی خواہش اور ارادہ کچھ بھی اثر نہیں رکھ سکتا۔ خدا چاہتا تھا کہ تمہیں کامیاب کرے اور تیرے دین کو ساری دنیا تک پہنچائے اور جتنی بھی رکاوٹیں ہوں انہیں راستے سے ہٹا دے۔ آخر اس نے یہ کام کر دکھایا۔

اہم بات یہ ہے کہ ہم جانیں کہ جو کچھ مندرجہ بالا آیات میں بیان کیا گیا ہے دوسرے قرآنی مطالب کی طرح پیغمبر اکرمؐ کے زمانے سے منصوص نہیں ہے۔ ہر معاشرے میں ہمیشہ منافقین کا ایک گروہ موجود ہوتا ہے جو کوشش کرتا ہے کہ حساس اور تاریخ ساز لمحات میں زہریلی باتوں کے ذریعے لوگوں کے افکار خراب کر دے، وحدت کی روح کا خاتمہ کر دے اور ان کے نظریات میں شکوک و شبہات پیدا کر دے لیکن اگر معاشرہ بیدار ہو تو مسلم ہے کہ نصرتِ الٰہی سے ان کی تمام سازشیں اور منصوبہ بندیاں بے اثر ہو جائیں گی اور ان کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے کیونکہ اس نے اپنے دوستوں سے کامیابی کا وعدہ کر رکھا ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ مسلمان مخلصانہ جہاد کریں اور ہوشیاری کے ساتھ ان کے داخلی دشمنوں پر نظر رکھیں۔

۴۹۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ○

ترجمہ

۴۹۔ ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ ہمیں اجازت دو (تا کہ ہم جہاد میں شرکت نہ کریں) اور ہمیں گناہ میں گرفتار نہ کرو آگاہ رہو کہ وہ (ابھی سے) گناہ میں گر چکے ہیں اور جہنم کفار پر محیط ہے۔

شانِ نزول

کچھ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ جب پیغمبر اسلامؐ مسلمانوں کو جنگ تبوک کے لیے تیار کر رہے تھے اور اس کے لیے جانے کی

دعوت دے رہے تھے بنی سلمہ قبیلے کا ایک سردار جد بن قیس آپؐ کی خدمت میں آیا۔ یہ منافقین میں سے تھا۔ اس نے عرض کی: اگر آپ اجازت دیں تو میں اس میدانِ جنگ میں حاضر نہ ہوں کیونکہ مجھے عورتوں سے بہت پیار ہے خصوصاً اگر میری نظر رومی لڑکیوں پر جا پڑی تو ہو سکتا ہے میں دل ہار بیٹھوں اور ان پر عاشق ہو جاؤں اور میدان سے ہاتھ کھینچ لوں۔

اس پر پیغمبر اکرمؐ نے اسے اجازت دے دی۔ اس موقع پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں اس شخص کے کردار کی مذمت کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ نے بنی سلمہ کے ایک گروہ کی طرف رُخ کر کے فرمایا: تمہارا سردار اور بڑا کون ہے؟

انہوں نے کہا: جد بن قیس، لیکن وہ بخیل اور ڈرپوک شخص ہے۔

آپؐ نے فرمایا: بخل سے بڑھ کر کونسا درد ہے، پھر فرمایا: تمہارا سردار وہ سفید رو جوان بشر بن براء ہے (جو کہ بہت سخی اور کشادہ رو انسان ہے)۔

تفسیر

بہانہ تراش منافقین

مندرجہ بالا شانِ نزول نشاندہی کرتی ہے کہ انسان جب چاہے ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں سے اُتار پھینکے تو اپنے لیے کسی نہ کسی طرح کوئی بہانہ بنا ہی لیتا ہے، جیسے جد بن قیس منافق نے میدانِ جہاد میں شرکت نہ کرنے کا کیا عذر گھڑا تھا اور وہ یہ کہ ہو سکتا ہے کہ خوبصورت رومی لڑکیاں اس کا دل لوٹ لیں اور وہ جنگ نہ کر سکے اور وہ "اشکالِ شرعی" میں گرفتار ہو جائے۔

جد بن قیس جیسا ہی ایک جابر حکمران کے کارندے کا موقف ہے جو کہتا تھا کہ اگر ہم لوگوں پر سختی اور تشدد نہ کریں تو ہم جو تنخواہ لیتے ہیں وہ "شرعاً" ہمارے لیے اشکال رکھے گی یعنی اس اشکال سے بچنے کے لیے ہمیں مخلوقِ خدا پر ظلم و ستم کرنا چاہیے۔

بہرحال قرآن یہاں روئے سخن پیغمبر اسلامؐ کی طرف کیے ہوئے اس قسم کے رُسوا اور ذلیل بہانہ جو لوگوں کے جواب میں کہتا ہے: ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم میدانِ جہاد میں حاضر نہ ہوں اور ہمیں (خوبرو رومی لڑکیوں کا فریفتہ کر کے) گرفتارِ گناہ نہ کیجیے (ومنهم من يقول ائذن لی و لا تفتنی)۔

آیت کی تفسیر اور شانِ نزول میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جد بن قیس چاہتا تھا کہ یہ بہانہ کر کے کہ میرے بیوی، بچے اور اموال کا کوئی اور سرپرست نہیں، جہاد سے بچنا چاہتا تھا۔ بہرحال قرآن ایسے لوگوں کے جواب میں کہتا ہے: آگاہ رہو کہ وہ ابھی سے فتنہ گناہ اور حکمِ خدا کی مخالفت میں گر چکے ہیں اور جہنم نے کافروں کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے (الا فی الفتنة سقطوا و ان جهنم لمحيطة بالكفرين)۔ یعنی وہ بے ہودہ معذرتوں کی وجہ سے اور یہ بھی کہ ہو سکتا ہے کہ بجائے اس کے کہ بعد میں آلودہ گناہ ہوں، ابھی سے گناہ میں گھرے ہوئے ہیں اور جہنم ان پر محیط ہے۔ وہ جہاد کی طرف روانگی کے بارے میں خدا اور رسول کے صریح حکم کو پاؤں تلے روند رہے ہیں کہ شاید کہیں شرعی شبہ میں گرفتار نہ ہو جائیں۔

چند اہم نکات

۱۔ منافقوں کی ایک پہچان : ہر معاشرے میں منافقین کی پہچان کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کے طرزِ استدلال اور عذر بہانوں پر غور و فکر کیا جائے کہ جو وہ اپنی لازمی ذمہ داریوں کی انجام دہی کو ترک کرنے کے لیے پیش کرتے ہیں۔ ان عذر بہانوں کی کیفیت ان کے باطن کو اچھی طرح واضح کر دیتی ہے۔ وہ زیادہ تر جزوی، ناچیز، حقیر اور کبھی مضحکہ خیز امور کا سہارا لیتے ہیں تاکہ وہ اہم اور کلی امور کو نظر انداز کر دیں اور بزعم خود اہلِ ایمان کو غافل کرنے کے لیے ان کی سطحی فکر کا سہارا لیتے ہیں۔ شرعی مسائل اور خدا اور رسول کے حکم کو بیچ میں کھینچ لاتے ہیں حالانکہ وہ گناہ میں غوطہ زن ہیں شمشیر بکف پیغمبر اکرمؐ اور ان کے دین کے خلاف دوڑ پڑتے ہیں۔

۲۔ "وان جھنم لمحیطۃ بالکٰفرین" کا مفہوم : اس جملے کی تفسیر کے بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔

بعض کہتے ہیں کہ جہنم کے اسباب و عوامل یعنی گناہوں نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ یہ آئندہ کے حتمی اور یقینی حوادث کے ذکر کی طرح ہے جنہیں ماضی یا حال کی صورت میں بیان کیا جاتا ہے یعنی قطعی اور یقینی طور پر جہنم انہیں اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ اس جملے کی تفسیر اس کے حقیقی معنی کے ساتھ کی جائے اور ہم کہیں کہ اسی وقت جہنم موجود ہے۔ اس جہان کے باطن میں جہنم موجود ہے اور وہ جہنم میں گھرے ہوئے ہیں اگرچہ ابھی تک اسے تاثیر کا فرمان صادر نہیں ہوا جیسا کہ بہشت بھی اس وقت موجود ہے اور اس جہان کے باطن اور اس کے اندر سب پر محیط ہے۔ بہشتی چونکہ بہشت سے مناسبت رکھتے ہیں اس لیے اس سے مربوط ہوتے ہیں اور دوزخی چونکہ دوزخ سے مناسبت رکھتے ہیں اس لیے ان کا دوزخ سے ربط ہوگا۔[1]

۵۰۔ اِنۡ تُصِبۡكَ حَسَنَةٌ تَسُؤۡهُمۡ‌ۚ وَاِنۡ تُصِبۡكَ مُصِيۡبَةٌ يَّقُوۡلُوۡا قَدۡ اَخَذۡنَاۤ اَمۡرَنَا مِنۡ قَبۡلُ وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمۡ فَرِحُوۡنَ ○

۵۱۔ قُلْ لَّنۡ يُّصِيۡبَـنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَـنَا‌ ۚ هُوَ مَوۡلٰٮنَا‌ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ○

۵۲۔ قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوۡنَ بِنَاۤ اِلَّاۤ اِحۡدَى الۡحُسۡنَيَيۡنِ‌ؕ وَنَحۡنُ

---

[1] اس بحث کی ایک بسوط تشریح ہے۔ اس کا مطالعہ آپ کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کے باب "بہشت و دوزخ" میں کر سکتے ہیں۔

نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖۤ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ۖ فَتَرَبَّصُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۰۔ اگر تجھے کوئی اچھائی پہنچے تو وہ انہیں بری لگتی ہے اور اگر تجھے کوئی مصیبت پہنچے تو کہتے ہیں ہم نے پہلے سے مصمم ارادہ کر رکھا ہے اور وہ خوش و خرم پلٹ جاتے ہیں۔

۵۱۔ کہہ دو، کوئی حادثہ ہمارا رخ نہیں کرتا مگر جو کچھ خدا نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے وہ ہمارا مولیٰ اور سرپرست ہے اور مومنین صرف خدا پر توکل کرتے ہیں۔

۵۲۔ کہہ دو: کیا ہمارے بارے میں دو نیکیوں میں سے کسی ایک کے علاوہ تمہیں کوئی توقع ہے (یا تو ہم تم پر کامیاب ہو جائیں گے یا جام شہادت نوش کریں گے) لیکن ہم توقع رکھتے ہیں کہ خدا کی طرف سے تمہیں (اس جہان میں) یا ہمارے ہاتھ سے (اس جہان میں) عذاب پہنچے گا۔ اب جب کہ معاملہ ایسا ہے تو تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔

تفسیر

زیر نظر آیات میں منافقین کی ایک صفت اور نشانی کی طرف اشارہ ہوا ہے اور وہ بحث جو گذشتہ اور آئندہ آیات میں منافقین کی نشانیوں کے سلسلہ میں آئی ہے یہ اسی کے ضمن میں ہے۔

پہلے کہا گیا ہے، اگر تجھے کوئی اچھائی پہنچے تو وہ ناراحت ہو جاتے ہیں اور انہیں برا لگتا ہے (ان تصبك حسنة تسؤهم) یہ ناراحتی اور دکھ ان کی باطنی عداوت اور ایمان کے فقدان کی دلیل ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص تھوڑا سا ایمان بھی رکھتا ہو اور وہ پیغمبر خدا یا کسی عام صاحب ایمان شخص کی کامیابی پر رنجیدہ ہو۔

"لیکن اگر اس کے مقابلے میں تجھے کوئی مصیبت پہنچے اور تم کسی مشکل میں مبتلا ہو جاؤ تو خوش ہو کر کہتے ہیں کہ ہم تو پہلے سے ایسے حالات کی پیش بینی کر رہے تھے اور ہم نے تو مصمم ارادہ کر رکھا تھا" اور خود کو ہلاکت کے اس گڑھے سے بچا چکے تھے (وان تصبك مصيبة يقولوا قد اخذنا امرنا من قبل) "اور جب وہ اپنے گھروں کو پلٹ جاتے ہیں تو تمہاری شکست، مصیبت یا پریشانی پر خوش ہوتے ہیں (ويتولوا وهم فرحون)۔

بزدل کے اندھے منافقین ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی عقل کے بارے میں لاف زنی کرتے ہیں کہ یہ ہماری دانشمندی تھی کہ ہم نے فلاں میدان میں شرکت نہ کی اور وہ مشکلات جو دوسروں کو عقل نہ ہونے کی وجہ سے دامن گیر ہوئیں، ہم ان میں مبتلا نہیں ہوئے۔ ایسی باتیں کرتے ہیں کہ جامے میں پھولے نہیں سماتے۔ لیکن اے پیغمبر! تم انہیں دو طرح سے جواب دو، ایسا جواب جو دندان شکن اور منطقی ہے۔

پہلے ان سے کہو کہ ہمیں کوئی حادثہ پیش نہیں آتا مگر وہ کہ جو خدا نے ہمارے لیے مقرر کیا ہے، وہ خدا جو ہمارا مولا، سرپرست حکیم اور مہربان ہے اور جو ہماری بھلائی کے سوا ہمارے لیے کچھ مقدر نہیں کرتا (قل لن یصیبنا الا ما کتب الله لنا هو مولانا)۔ جی ہاں! اہلِ ایمان فقط خدا پر توکل کرتے ہیں (وعلی الله فلیتوکل المؤمنون)۔ اہلِ ایمان صرف اس کے عاشق ہیں۔ اسی سے نصرت طلب کرتے ہیں، اپنی پیشانی اسی کی چوکھٹ پر رکھتے ہیں اور ان کی پناہ گاہ اس کے علاوہ کوئی نہیں۔

یہ بہت بڑا اشتباہ ہے کہ جس میں منافقین گرفتار ہیں۔ وہ خیال کرتے ہیں وہ اپنی معمولی سی عقل اور ناتواں فکر سے تمام مشکلات اور حوادث کی پیش بینی کر لیتے ہیں اور خدا کے لطف و رحمت سے بے نیاز ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ ان کی تمام ہستی حوادث کے کسی عظیم طوفان کے سامنے ایک تنکے کی مانند ہے یا کسی بیابان میں گرمیوں کی کسی جلا دینے والی دوپہر میں پانی کے ایک قطرے کی طرح ہے، اگر لطف الٰہی شاملِ حال نہ ہو تو کمزور سا انسان کچھ نہیں کر سکتا۔

"دوسرے اے پیغمبر! تم انہیں جواب دو کہ تم ہمارے بارے میں کیا توقع رکھتے ہو سوائے اس کے کہ دو میں سے ایک سعادت ہمیں نصیب ہو جائے" یا ہم دشمنوں کو تہس نہس کر دیں گے اور میدانِ جنگ سے کامیابی کے ساتھ پلٹ آئیں گے اور یا مارے جائیں گے اور عزت و افتخار سے جام شہادت نوش کریں گے۔ ان دو صورتوں میں سے جو بھی پیش آئے ہمارے لیے افتخار ہے اور ہماری آنکھوں کی روشنی ہے (قل هل تربصون بنا الا احدی الحسنیین)۔ "لیکن اس کے برعکس ہم تمہارے بارے میں دو میں سے ایک سیاہ دن اور بدبختی کی توقع رکھتے ہیں یا تو اس جہان میں تم عذابِ الٰہی میں مبتلا ہو گے اور یا ہمارے ہاتھوں تم ذلیل و نابود ہو گے" (ونحن نتربص بکم ان یصیبکم الله بعذاب من عنده او بایدینا)۔

"جب معاملہ اس طرح ہے تو تم بھی منتظر رہو اور ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتے ہیں" تم ہماری خوش بختی اور سعادت کا انتظار کرو اور ہم تمہاری بدبختی کے انتظار میں ہیں (فتربصوا انا معکم متربصون)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ **تقدیر اور ہماری کاوشیں:** اس میں شک نہیں کہ ہماری سرنوشت جس قدر ہمارے کام، کوشش اور جستجو سے مربوط ہے وہ تو خود ہمارے ہاتھ میں ہے۔ قرآنی آیات بھی صراحت سے یہ بات بیان کر رہی ہیں، مثلاً

وان لیس للانسان الا ما سعی

انسان کے حصے میں اس کی کوشش اور سعی کے سوا کچھ نہیں۔ (نجم۔ ۳۹)

اسی طرح یہ بھی ہے:

کل نفس بما کسبت رھینۃ

ہر شخص اپنے اعمال کا گروی ہے۔ (مدثر - ۳۸)

اسی طرح دیگر آیات بھی ہیں (اگرچہ سعی و کوشش کی تاثیر بھی سنن الٰہی کے مطابق اور اس کے فرمان کے تحت ہی ہے)۔ لیکن ہماری کدو کاوش سے ماوراء اور ہماری قدرت سے جو کچھ متجاوز ہے اس میں صرف دستِ قدرت کارفرما ہے اور جو کچھ قانونِ علیت کے تقاضے کے مطابق مقدر ہوا ہے وہ انجام پذیر ہو کے رہے گا اور یہ سب کچھ پروردگار کی مشیت، علم اور حکمت کے مطابق انجام پاتا ہے۔

البتہ صاحب ایمان اور خدا پرست افراد کہ جو اس کے علم و حکمت اور لطف و رحمت پر ایمان رکھتے ہیں ان تمام مقدرات کو "نظامِ احسن" اور بندوں کی مصلحت کے مطابق سمجھتے ہیں۔ ہر شخص اپنی حاصل کردہ اہلیت اور صلاحیتوں کے مطابق مقدر رکھتا ہے۔

ایک منافق، ڈرپوک، سست مزاج اور منتشر جمعیت کو فنا ہی ہونا ہے اور یہ اس کی حتمی سرنوشت ہے لیکن ایک صاحب ایمان، آگاہ، متحد اور عزم صمیم رکھنے والی جمعیت کی سرنوشت کامیابی کے سوا کچھ نہیں۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مندرجہ بالا آیات نہ ارادہ اختیار کی آزادی کے منافی ہیں اور نہ ہی انسانوں کی جبری سرنوشت اور ان کی کاوشوں کے بے اثر ہونے پر دلیل ہیں۔

۲۔ مومنین کی لغت میں "شکست" کا لفظ نہیں: زیر بحث آخری آیت میں ایک عجیب پختہ اور محکم منطق بیان کی گئی ہے۔ اسی منطق میں مسلمانوں کی تمام کامیابیوں کا حقیقی راز پنہاں ہے اور اگر پیغمبر اسلامؐ اس کے علاوہ کوئی تعلیم اور حکم نہ بھی رکھتے ہوتے تو یہی ان کے پیروکاروں کی کامیابی کی ضمانت کے لیے کافی تھا۔ آپؐ نے شکست اور ناکامی کا مفہوم ان کے مغز و روح سے مٹا دیا تھا اور ان پر ثابت کیا تھا کہ تم ہر حالت میں کامیاب ہو۔ تم مارے جاؤ تو کامیاب ہو اور دشمن کو قتل کر دو تب بھی کامیاب ہو۔ تمہارے سامنے دو راستے ہیں کہ جس راستے پر بھی جاؤ منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ کجی، الجھنیں اور گرنے کی جگہ تمہارے راستے میں نہیں۔ تمہارا ایک راستہ شہادت کی طرف جاتا ہے کہ جو ایک صاحبِ ایمان انسان کا اوجِ افتخار آخری معراج اور بالاترین نعمت ہے اس سے بڑھ کر افتخار اور نعمت کا انسان کے لیے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جو خدا کے ساتھ جان کا سودا کرے اور اس کے بدلے ایک ایسی جاودانی حیات حاصل کرے جو جوارِ الٰہی میں ناقابلِ توصیف نعمات سے مالا مال ہو۔

دوسرا راستہ دشمن پر کامیابی ہے، اس کی شیطانی طاقت کو درہم برہم کرنا ہے اور انسانی ماحول کو ظالموں، ستم گروں اور بدکاروں کے شر سے پاک و صاف کرنا ہے اور یہ بھی ایک عظیم فیض اور مسلم افتخار ہے۔

وہ سپاہی جو اس جذبے سے میدانِ جنگ میں آتا ہے کبھی فرار اور دشمن کو پشت دکھانے کی نہیں سوچتا ایسا سپاہی کسی شخص اور کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ خوف و وحشت، اضطراب اور شک و تردد اس کے وجود میں راہ نہیں پاتا۔ جو لشکر ایسے

سپاہیوں پر مشتمل ہوتا ہے وہ ناقابلِ شکست ہوتا ہے۔ ایسا جذبہ صرف تعلیمات اسلامی سے پیدا کیا جاسکتا ہے اور آج بھی اگر صحیح تعلیم و تربیت سے یہ منطق دوبارہ مسلمانوں میں اتار دی جائے تو تمام پسماندگیوں اور شکستوں کی تلافی ہوسکتی ہے۔

وہ لوگ جو پہلے مسلمانوں کی پیش رفت اور آج کے مسلمانوں کی پسماندگی کے علل و اسباب کا مطالعہ اور تحقیق کرتے ہیں اور اسے ایک عجیب معمہ سمجھتے ہیں انہیں چاہیے کہ وہ آئیں اور مندرجہ بالا آیت پر تھوڑی سی غور و فکر کریں۔ انہیں اس آیت میں واضح جواب مل جائے گا۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں جب منافقین کی دو شکستوں کے متعلق گفتگو کی گئی ہے تو اس کی الگ الگ تفصیل بیان کی گئی ہے لیکن جب مومنین کی دو کامیابیوں کا ذکر کیا گیا ہے انہیں سربستہ چھوڑ کر گفتگو آگے بڑھا دی گئی ہے گویا یہ دو کامیابیاں ایسی روشن، واضح اور آشکار ہیں کہ جن کی تشریح کی بالکل ضرورت نہیں اور یہ بلاغت کا ایک خوبصورت اور لطیف نکتہ ہے جو مندرجہ بالا آیت میں استعمال کیا گیا ہے۔

۳۔ منافقین کی دائمی صفات: ہم دوبارہ اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ ان آیات کو تاریخی حوالے سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ ہمیں جاننا چاہیے یہ ہمارے لیے گذشتہ اور آئندہ ہر دور کے لیے ایک درس ہے۔

عموماً کوئی بھی معاشرہ چھوٹے یا بڑے منافقین کے ایک گروہ سے خالی نہیں ہوتا اور ان کی صفات اور تقریباً ایک جیسی ہوتی ہیں اور وہ ایک ہی طرز کے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نادان اور بے وقوف ہوتے ہیں اور اس کے باوجود خود پرست اور متکبر ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو بڑا عقلمند اور سمجھدار سمجھتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ لوگوں کے راحت و آرام میں رنج ہوتا ہے اور وہ ان کی پریشانیوں پر خوشحال اور خندہ زن ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ فضول خیالات اور شک و تردد میں کھوئے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک قدم آگے بڑھاتے اور ایک پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں سچے مومنین ہیں جو لوگوں کی خوشی میں خوش ہوتے ہیں اور ان کے غم میں شریک ہوتے ہیں وہ کبھی اپنے علم اور فہم و فراست پر ناز نہیں کرتے اور کبھی اپنے آپ کو لطفِ الٰہی سے بے نیاز نہیں سمجھتے۔ وہ عشقِ خدا سے لبریز دل رکھتے ہیں اور اس راہ میں کسی حادثے اور مشکل سے نہیں ڈرتے۔

۵۳۔ قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ۭ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ○

۵۴۔ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ○

۵۵۔ فَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُهُمۡ‌ؕ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا وَتَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ ○

ترجمہ

۵۳۔ کہہ دو کہ تم چاہے میلان اور رغبت سے خرچ کرو چاہے جبر و اکراہ سے، تم سے ہرگز قابل قبول نہیں کیونکہ تم فاسق ہو۔

۵۴۔ ان کے انفاق کے قبول ہونے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنی مگر یہ کہ وہ خدا اور اس کے پیغمبر کے منکر تھے نماز نہیں بجالاتے تھے مگر کسالت اور سستی کے ساتھ اور انفاق نہیں کرتے مگر کراہت کے ساتھ۔

۵۵۔ اور ان کے مال و اولاد (کی کثرت) تجھے تعجب میں نہ ڈالے۔ خدا چاہتا ہے کہ انہیں اس کے ذریعے دنیا کی زندگی میں عذاب کرے اور وہ حالت کفر میں مرجائیں۔

تفسیر

یہ آیات منافقین کی کچھ اور نشانیوں اور ان کے کام کے انجام کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور انہیں واضح کرتی ہیں کہ کس طرح سے ان کے اعمال بے روح اور بے اثر ہیں اور ان سے انہیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ نیز نیک اعمال میں سے چونکہ راہ خدا میں خرچ کرنا یعنی زکوٰۃ کی ادائیگی (اپنے وسیع معنی کے لحاظ سے) اور نماز کا قیام (خالق و مخلوق کے درمیان رشتے کی حیثیت سے) خاص مقام رکھتے ہیں لہٰذا خصوصیت کے ساتھ ان دو حصوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اے پیغمبر! انہیں کہہ دو، چاہے ارادہ و اختیار سے راہ خدا میں خرچ کرو اور چاہے کراہت و مجبوری اور شخصی و اجتماعی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے تم منافقین سے کسی حالت میں کچھ قبول نہیں کیا جائے گا (قل انفقوا طوعاً او کرهاً لن يتقبل منكم[1])۔

---

[1] "انفقوا" اگرچہ صیغہ امر کی شکل میں ہے لیکن مفہوم شرط رکھتا ہے یعنی اگر تم خرچ کرو چاہے اختیار سے یا مجبوری سے، تم سے قابل قبول نہیں ہوگا۔

اس کے بعد اس کی دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیونکہ تم فاسق گروہ ہو (انکم کنتم قوما فٰسقین)۔ تمہاری نیتیں غلط، تمہارے اعمال ناپاک اور تمہارے دل تاریک ہیں اور خدا صرف اس عمل کو قبول کرتا ہے جو پاک و پاکیزہ ہو اور جسے ایک پاکیزہ شخص تقویٰ و پرہیزگاری کے ساتھ انجام دے۔

واضح ہے کہ "فسق" یہاں کوئی عام اور معمولی گناہ نہیں ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ انسان کسی گناہ کا مرتکب ہو لیکن اس کے باوجود ایک نیک عمل بھی انجام دے دے بلکہ یہاں مراد اس سے کفر و نفاق ہے یا ان کے انفاق کا ریاکاری سے آلودہ ہونا ہے۔

اس میں بھی کوئی مانع نہیں کہ مندرجہ بالا جملے میں "فسق" اپنے وسیع مفہوم کے لحاظ سے دونوں معانی میں ہو جیسا کہ بعد والی آیت بھی اس حصے کی وضاحت کرے گی۔

اگلی آیت میں ان کے خرچ کیے ہوئے مال کے قابلِ قبول نہ ہونے کی دوبارہ وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کے انفاق اور مخارج کے قبول ہونے میں اس کے سوا کوئی امر مانع نہیں کہ وہ خدا اور اس کے پیغمبر کے منکر اور کافر ہیں" اور ہر وہ کام جس میں خدا پر ایمان اور توحید پر یقین شامل نہ ہو بارگاہِ خداوندی میں قابلِ قبول نہیں ہے (وما منعھم ان تقبل منھم نفقاتھم الا انھم کفروا باللہ وبرسولہ)۔

قرآن نے بارہا اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اعمالِ صالح کے قبول ہونے کی شرط ایمان ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی عمل ایمان کی بنا پر سرزد ہوا اور ایک مدت کے بعد عمل کرنے والا شخص کفر کی راہ اختیار کرلے تو اس کا عمل حبط، نابود اور بے اثر ہو جائے گا (اس سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۱ میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں) (دیکھیے ص... اردو ترجمہ)۔

ان کے انفاق اور مالی اخراجات قبول نہ ہونے کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کی عبادات کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ نماز بجا نہیں لاتے مگر کسالت و ناراحتی کے ساتھ اور بوجھ سمجھتے ہوئے (ولا یأتون الصّلوٰة الا وھم کسالیٰ)۔ جیسے کہ وہ خرچ بھی بس کراہت و مجبوری کے عالم میں کرتے ہیں (ولا ینفقون الا وھم کٰرھون)۔

درحقیقت دو وجوہ کی بنیاد پر ان کے خرچ شدہ اموال قابلِ قبول نہیں ہوتے۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ حالت کفر اور عدم ایمان میں سرزد ہوتے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ کراہت اور مجبوری کے عالم میں خرچ کیے گئے ہیں۔ اسی طرح ان کی نماز بھی دو وجوہ سے قبول نہیں ہوتی ایک کفر کی وجہ سے اور دوسرا کسالت اور ناپسندیدگی کی حالت میں ادائیگی کے سبب۔

مندرجہ بالا جملوں میں منافقین کی کیفیت ان کے بے ثمر اعمال کے لحاظ سے بیان کی گئی ہے اس کے باوجود ان میں ان کی ایک اور نشانی بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ حقیقی مومنین کو عبادت میں ان کی خوشی اور نشاط کے سبب اور نیک اعمال سے ان کی رغبت اور خلوص کی بنا پر اچھی طرح پہچانا جا سکتا ہے جیسا کہ منافقین کو ان کے اعمال کی انجام دہی کے رنگ ڈھنگ سے پہچانا جا سکتا ہے کیونکہ عام طور پر وہ سرد مہری، بے رغبتی، ناراحتی اور کراہت سے کارِ خیر انجام دینے کے لیے قدم اٹھاتے ہیں گویا کوئی شخص جبراً ان کا ہاتھ پکڑے انہیں کارِ خیر کی طرف لیے جا رہا ہو۔

واضح ہے کہ پہلے گروہ کے اعمال چونکہ عشقِ الٰہی کی بنا پر سرزد ہوتے ہیں اور ان میں دلسوزی ہوتی ہے لہٰذا ان اعمال کے آداب و قواعد کا خیال رکھا جاتا ہے لیکن دوسرے گروہ کے اعمال میں چونکہ کراہت، ناپسندیدگی اور بے رغبتی ہوتی ہے لہٰذا وہ

ناقص، ٹوٹے پھوٹے اور بے روح ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کے اسباب دل کا اختلاف ان کی مختلف شکلیں صورتیں اختیار کرنے کا سبب بنتا ہے۔

آخری آیت میں روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے؛ ان کے مال واولاد کی کثرت تجھے تعجب میں نہ ڈال دے اور تم یہ نہ سوچنے لگ جاؤ کہ اس کے باوجود کہ وہ منافق ہیں انہیں یہ سب نعمات الٰہی کیونکر میسر ہیں (فلا تعجبك اموالهم ولا اولادهم) کیونکہ یہ چیزیں ظاہراً تو ان کے لیے نعمات ہیں لیکن حقیقت میں "خدا چاہتا ہے کہ اس طرح انہیں دنیاوی زندگی میں معذب کرے اور ان چیزوں سے بے انتہا دلبستگی کی وجہ سے وہ کفر اور بے ایمانی کی حالت میں مرجائیں (انما یرید الله لیعذبهم بها فی الحیٰوة الدنیا وتزهق انفسهم وهم کٰفرون)۔

درحقیقت وہ ان اموال واولاد (اقتصادی اور افرادی قوت) کے ذریعے دو راستوں سے معذب ہوں گے۔ پہلا تو یہ کہ عام طور پر ایسے افراد کی اولاد غیر صالح ہوتی ہے اور مال بے برکت ہوتا ہے جو کہ دنیاوی زندگی میں ان کے لیے رنج والم کا باعث بنتے ہیں۔ کیا یہ بات باعث رنج والم نہیں کہ شب وروز ایسی اولاد کے لیے کوشش کی جائے جو ننگ وعار اور پریشانی کا باعث ہے اور ایسے مال کی حفاظت میں جان جوکھوں میں ڈالی جائے جو گناہ کے راستے سے کمایا ہے۔ دوسری طرف یہ لوگ چونکہ ان اموال اور اولاد سے رگ و ریشہ رکھتے ہیں اور آخرت کی پُرنعمت اور وسیع دنیا اور موت کے بعد کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے لہٰذا اس سب مال ومنال سے آنکھیں بند کرلینا ان کے لیے مشکل ہے یہاں تک کہ انہی چیزوں پر ایمان رکھ کر کفر کے ساتھ دنیا سے چلے جاتے ہیں اور سخت ترین حالت میں جان دیتے ہیں۔

مال واولاد اگر پاک اور صالح ہوں تو نعمت ہیں اور رفاہ وآسائش کا سبب ہیں اور اگر ناپاک اور غیر صالح ہوں تو رنج و تکلیف اور عذاب الیم ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ کیا منافقین خوشی سے خرچ کرتے ہیں: بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ پہلی آیت کے شروع میں یہ کیسے کہہ دیا گیا ہے کہ چاہے اختیار سے خرچ کرو چاہے مجبوری سے، تم سے قبول نہیں ہوگا جب کہ دوسری آیت کے آخر میں تصریح کی گئی ہے کہ وہ صرف کراہت اور مجبوری کے عالم ہی میں خرچ کرتے ہیں۔ کیا یہ دونوں آیتیں ایک دوسرے کے منافی ہیں؟

ایک مطلب کی طرف متوجہ ہوا جائے تو اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ پہلی آیت کی ابتداء درحقیقت ایک "قضیہ شرطیہ" کی صورت میں ہے یعنی اگر اطاعت یا اکراہ کی صورت میں خرچ کرو، جس صورت میں بھی ہو قابل قبول نہیں ہوگا اور ہم جانتے ہیں کہ قضیہ شرطیہ وجود شرط کی دلیل نہیں ہے یعنی فرض کریں کہ وہ میل ورغبت اور اختیار وارادہ سے بھی خرچ کریں تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں چونکہ وہ ایمان نہیں رکھتے۔

لیکن دوسری آیت میں ایک "قضیہ خارجیہ" کو بیان کیا جارہا ہے اور وہ یہ کہ یہ لوگ ہمیشہ اکراہ اور ناپسندیدگی ہی سے خرچ کرتے ہیں (غور کیجئے گا)۔

۲۔ صرف نماز روزہ کافی نہیں، دوسرا درس جو مندرجہ بالا آیات سے حاصل کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ صرف لوگوں کی نماز روزہ اور زکوٰۃ پر فریفتہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ منافقین نماز بھی پڑھتے ہیں اور بظاہر راہ خدا میں خرچ بھی کرتے ہیں بلکہ منافقوں کی نمازوں اور عبادتوں کو سچے مومنین کے پاک اور مسلمانہ اعمال سے الگ پہچاننا چاہیے اور اتفاق کی بات ہے کہ غور کرنے اور تحقیق و جستجو سے ظاہر عمل سے بھی عموماً پہچان ہو جاتی ہے۔

حدیث میں ہے:

لا تنظروا الی طول رکوع الرجل و سجوده فان ذٰلك شیء اعتاده ولو ترکه استوحش، ولکن انظروا الی صدق حدیثه و اداء امانته۔

کسی کے لمبے لمبے رکوع اور سجدوں کو نہ دیکھو کیونکہ ہو سکتا ہے یہ عادی عبادت ہو جسے چھوڑنے سے اسے پریشانی ہوتی ہو بلکہ اس کی راست گوئی اور امانت کی ادائیگی پر نظر رکھو کیونکہ سچائی، راستی اور امانت کا سرچشمہ ایمان ہے جب کہ عادی رکوع و سجود کفر و نفاق کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔

۵۶۔ وَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَفْرَقُونَ ○

۵۷۔ لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ○

ترجمہ

۵۶۔ وہ خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں اور وہ لوگ ہیں جو ڈرتے ہیں (اور وحشت زدہ ہیں لہٰذا جھوٹ بولتے ہیں)۔

۵۷۔ اگر انہیں کوئی پناہ گاہ یا غاریں یا کوئی زیر زمین راستہ مل جائے تو وہ اس کی طرف چل پڑیں حالانکہ وہ تیزی میں بھاگ کھڑے ہوں گے۔

تفسیر

منافقین کی ایک اور نشانی

مندرجہ بالا آیات میں منافقین کے احوال اور حالات کے بارے میں ایک اور نشانی بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں (ویحلفون باللہ انھم لمنکم) "حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں اور نہ ہی کسی چیز میں تمہارے موافق ہیں بلکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو بے حد ڈرپوک ہیں" اور شدتِ خوف ہی کے باعث اپنے کفر کو چھپاتے ہیں اور ایمان کا اظہار کرتے ہیں کہ کہیں گرفتار بلا نہ ہو جائیں (وما ھم منکم ولکنھم قوم یفرقون)۔

"یفرقون" "مادہ" فرق" (بروزن "شفق") سے ہے اور اس کا معنی ہے شدتِ خوف و ہراس۔ راغب نے "مفردات" میں کہا ہے کہ یہ مادہ اصل میں تفرق، جدائی اور پراگندگی کے معنی میں ہے۔ گویا اس طرح ڈرتے ہیں کہ چاہتے ہیں کہ ان کا دل متفرق اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

درحقیقت باطن میں چونکہ ان کا کوئی سہارا نہیں لہٰذا ہمیشہ کے لیے خوف و ہراس اور شدید وحشت میں گرفتار ہیں اور اسی خوف و وحشت کی وجہ سے جو کچھ ان کے باطن میں ہے اس کا کبھی اظہار نہیں کر پاتے اور چونکہ خدا سے نہیں ڈرتے اس لیے ہر چیز سے ڈرتے ہیں اور ہمیشہ وحشت زدہ رہتے ہیں جب کہ سچے اور حقیقی مومن ایمان کے سائے میں سکون و اطمینان اور ایک خاص شجاعت و جرأت سے رہتے ہیں۔

بعد والی آیت میں مومنین سے ان کے شدید بغض، عداوت اور نفرت کو مختصر سی عبارت میں لیکن رسا اور واضح انداز میں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: وہ ایسے ہیں کہ اگر کوئی پناہ گاہ (مثلاً مستحکم قلعہ) انہیں مل جائے یا پہاڑوں کی غاروں تک جا سکتے ہوں یا انہیں زیرِ زمین کوئی راستہ مل جائے تو جتنا جلدی ہو سکے اس کی طرف کھسکے ہوں" تاکہ وہ تم سے دور ہو کر اپنے کینہ اور عداوت کو ظاہر کر سکیں (لو یجدون ملجأ او مغارات او مدخلا لولوا الیہ وھم یجمحون)۔

"ملجأ" کا معنی ہے "پناہ گاہ" مثلاً کوئی مستحکم قلعہ یا اس قسم کی کوئی جگہ۔

"مغارات" جمع ہے مغارہ کی جس کا معنی ہے "غار"۔

"مدخل" کا معنی ہے پوشیدہ اور چھپے ہوئے راستے۔ مثلاً وہ نقب جو زیرِ زمین لگاتے ہیں اور اس سے کسی جگہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔

"یجمحون" "جماح" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے تیزی اور شدت کے ساتھ چلنا کہ جسے کوئی چیز روک نہ سکے مثلاً سرکش اور منہ زور گھوڑے کا دوڑنا کہ جسے روکا نہ جا سکتا ہو۔ اسی لیے ایسے گھوڑے کو "جموح" کہتے ہیں۔

بہر حال یہ ایک واضح ترین اور نہایت عمدہ تعبیر ہے جو قرآن منافقین کے خوف و وحشت کے بارے میں یا ان کے بغض و نفرت کے سلسلے میں بیان کرتا ہے کہ اگر انہیں پہاڑوں یا زمین پر کوئی راہ فرار مل جائے تو خوف یا دشمنی کی وجہ سے تم سے

دور ہو جائیں لیکن چونکہ ان کی قوم وقبیلہ اور مال وثروت تمہارے علاقے میں ہے لہٰذا مجبور ہیں کہ خونِ جگر پی کر تم میں رہ جائیں۔

۵۸۔ وَمِنْهُمْ مَنْ يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُوا مِنْهَا
رَضُوا وَإِنْ لَمْ يُعْطَوْا مِنْهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ ○
۵۹۔ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُوا مَا آتَاهُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ
سَيُؤْتِينَا اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللَّهِ رَاغِبُونَ ○

ترجمہ

۵۸۔ ان میں ایسے لوگ ہیں جو غنائم (کی تقسیم) کے بارے میں تم پر اعتراض کرتے ہیں اگر ان میں سے انہیں دے دیں تو راضی ہو جاتے ہیں اور اگر نہ دیں تو ناراض ہو جاتے ہیں (چاہے ان کا حق ہو یا نہ ہو)۔

۵۹۔ لیکن اگر وہ اس پر راضی ہوں کہ جو خدا اور اس کا رسول انہیں دیتا ہے اور کہیں کہ خدا ہمارے لیے کافی ہے اور عنقریب خدا اور اس کا رسول اپنے فضل میں سے ہمیں بخشے گا اور ہم صرف اس کی رضا چاہتے ہیں (اگر ایسا کریں تو ان کے فائدے میں ہے)۔

شانِ نزول

تفسیر در منثور میں صحیح بخاری، نسائی اور بعض دیگر محدثین سے نقل کیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کچھ (غنائم یا ان جیسے) اموال کی تقسیم میں مشغول تھے کہ قبیلہ بنی تمیم میں سے ایک شخص "ذوالخویصرہ" آپہنچا اور بلند آواز سے پکار کر کہنے لگا: یا رسول اللہؐ عدل و انصاف سے کام لیں۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: وائے ہو تجھ پر، اگر میں عدالت نہ کروں تو پھر کون عدالت کرے گا۔

عمر نے چیخ کر کہا: یا رسول اللہؐ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: اسے اس کی حالت پر چھوڑ دو۔ اس کے ایسے ساتھی ہیں کہ تم اپنی نماز روزہ ان کے مقابلے میں ناچیز سمجھو گے لیکن اس کے باوجود وہ دین سے اس طرح نکل جائیں گے کہ جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا۔

اس موقع پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور اس قسم کے افراد کو نصیحت کی گئی۔

تفسیر

بے منطق خود غرض افراد

مندرجہ بالا پہلی آیت میں منافقین کی ایک اور حالت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ ہرگز اپنے حق پر راضی نہیں ہوتے اور ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ بیت المال سے اور عمومی منافع سے جتنا ہو سکے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں، چاہے مستحق ہوں یا نہ ہوں۔ ان کی دوستی اور دشمنی اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔ جو شخص ان کی جیب بھر دے اس پر راضی ہیں اور جو شخص عدالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں دوسرے کا حق نہ دے تو اس سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ حق و عدالت کا ان کی لغت میں کوئی مفہوم نہیں ہے اور اگر کوئی مفہوم ہے تو ان کی نظر میں عادل وہ شخص ہے جو انہیں زیادہ سے زیادہ دے اور ظالم ان کی نظر میں وہ شخص ہے جو دوسروں کا حق ان سے لے لے۔ دوسرے لفظوں میں ان میں ہر طرح کے اجتماعی شعور کا فقدان ہے اور وہ صرف انفرادی حوالے سے سوچتے ہیں اور صرف اپنے ہی مفادات پیش نظر رکھتے ہیں اور وہ تمام چیزوں کو صرف اسی زاویے سے دیکھتے ہیں۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے: "ان میں سے بعض صدقات کی تقسیم کے معاملے میں تم پر عیب لگاتے اور اعتراض کرتے ہیں" اور کہتے ہیں کہ آپ نے عدالت کو ملحوظ نظر نہیں رکھا (و منهم من يلمزك في الصدقات) لیکن حقیقت میں اس طرح ہے کہ وہ اپنے مفادات پر نظر رکھتے ہیں، "اگر انہیں کچھ حصہ دیا جائے تو راضی اور خوش ہیں" اور تمہیں عدالت کرنے والا سمجھتے ہیں چاہے وہ استحقاق نہ رکھتے ہوں (فان اعطوا منها رضوا) "لیکن اگر کوئی چیز انہیں نہ دی جائے تو سیخ پا اور ناراض ہو جاتے ہیں" اور تم پر بے عدالتی کی تہمت لگاتے ہیں (و ان لم يعطوا منها اذا هم يسخطون) لیکن اگر وہ اپنے حق پر راضی ہو جائیں اور جو کچھ خدا اور اس کا پیغمبر انہیں دیتا ہے اس پر راضی رہیں اور کہیں کہ یہی ہمارے لیے کافی ہے اگر مزید ضرورت پڑی تو خدا اور پیغمبر اپنے فضل و کرم سے عنقریب ہمیں بخشش کریں گے، ہم صرف اسی کی رضا چاہتے ہیں اور اس سے خواہش کرتے ہیں کہ ہمیں لوگوں کے مال سے بے نیاز کر دے اگر وہ ایسا کریں تو ان کے فائدے میں ہے (ولو انهم رضوا ما آتاهم الله و رسوله وقالوا حسبنا الله سيؤتينا الله من فضله و رسوله انا الى الله راغبون)۔

آج کے مسلمان معاشروں میں ایسے لوگ

کیا آج کل اسلامی معاشروں میں اس قسم کے لوگ نہیں پائے جاتے بلکہ جو لوگ اپنے جائز حق پر قانع ہیں، اور جو انہیں ان کے حق کے مطابق دے یہ سب لوگ اسے عدالت پیشہ سمجھتے ہیں، یہی غلط معاملات کا موجب بنتی ہے۔ انتہائی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اب بھی بہت سے ایسے افراد ہیں جو حق اور عدالت کا معیار صرف اپنے ذاتی مفادات کو سمجھتے ہیں اور اپنے حقوق پر قناعت نہیں کرتے۔ اگر کوئی سب کو خصوصاً محروم لوگوں کو ان کا جائز حق دینا چاہے تو ایسے افراد شور مچانا شروع کر دیتے ہیں لہٰذا ضروری نہیں کہ منافقین کی پہچان کے لیے صفحات تاریخ ہی کی ورق گردانی کی جائے، ایک نگاہ اپنے گرد و پیش پر ڈال لیں بلکہ ہم اپنے اوپر ہی نظر ڈال لیں تو اپنی اور دوسروں کی کیفیت

معلوم ہو جائے گی۔

پروردگارا! روحِ ایمان ہم میں زندہ کر دے۔ شیطانی لشکر اور نفاق ہم میں سے دور کر دے اور ہمیں توفیق عطا فرما کہ اپنے آپ کو اس طرح آراستہ کریں کہ صرف اپنے حق پر قناعت کریں نہ کہ دوسروں پر ظلم کریں اور دوسروں کے حقوق غصب کرنے کو عدالت سمجھیں۔ ہمیشہ عدالت کے خواہاں رہیں اور عدالت کا اجرا کریں۔

جلد ہفتم ــــــ تفسیر نمونہ
کا ترجمہ اختتام کو پہنچا

اختتام ترجمہ ــــــ
پونے دس بجے شب ــــــ
۱۹ محرم الحرام ۱۴۰۴ھ
۲۶ اکتوبر ۱۹۸۳ء
سیٹھ نوازش علی کے مکان ۸۱/۱ ای
ماڈل ٹاؤن لاہور ــــ میں

صفدر حسین نجفی

۶۰۔ إِنَّمَا الصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَٰكِينِ وَالْعَٰمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَٰرِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○

ترجمہ

۶۰۔ زکوٰۃ فقیروں، مسکینوں اور ان لوگوں کے لیے جو اس کے جمع کرنے میں ہاتھ بٹاتے ہیں اور ان افراد کے واسطے ہے جن کی تالیف قلوب کیلیے اقدام کیا جائیے۔ غلاموں کی (آزادی) کے لیے اور بے مال قرضداروں کیلیے اور ضداد کے قوانین کی تقویت) کی راہ میں اور راستے میں رہ جانے والے مسافروں کیلئے ہے اور یہ ایک (اہم) خدائی فریضہ ہے اور خدا دانا اور حکیم ہے۔

تفسیر

مصارف زکوٰۃ اور اس کی تفصیلات

اس سلسلے میں تاریخ اسلام میں دو دور نمایاں دکھائی دیتے ہیں ایک مکّہ کے قیام کا زمانہ جس میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مسلمانوں کی توجہ افراد کی تعلیم و تربیت اور تبلیغ پر لگی ہوئی تھی۔
دوسرا دور مدینہ منورہ کا ہے۔ جس میں رسول اللہؐ نے حکومتِ اسلامی کی تشکیل اور تعلیماتِ اسلامی کو اس صالح حکومت کے ذریعے عملی صورت دینے اور جاری کرنے کا بیڑا اٹھایا۔
اس میں شک نہیں کہ حکومت کی تشکیل کے وقت ایک ابتدائی اور نہایت ضروری مسئلہ بیت المال کی تشکیل ہے تاکہ اس کے ذریعے حکومت کی اقتصادی ضروریات پوری ہوتی رہیں اور یہ وہ بنیادی ضروریات ہیں جن کا ہر ایک حکومت کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔
اس لیے سب سے پہلے کاموں میں سے ایک کام جو حضرت رسولِ اکرمؐ نے مدینہ منورہ میں کیا، بیت المال کا قیام تھا جس کا ایک سرچشمہ زکوٰۃ تھی اور قولِ مشہور کے مطابق یہ حکم رسول اللہؐ کی ہجرت کے دوسرے سال ہی نافذ ہوا۔
البتہ جیسا کہ ہم انشاء اللہ اس کے بعد اشارہ کریں گے کہ زکوٰۃ کا حکم پہلے پہل مکہ مکرمہ میں بھی نازل ہوا تھا۔ لیکن اس میں زکوٰۃ کی رقم کا بیت المال میں جمع کرنا واجب نہ تھا۔ بلکہ لوگ اسے خود ادا کرتے تھے۔ لیکن مدینہ منورہ میں اسے جمع کرنے اور مرکزیت دینے کا حکم خداوند تعالیٰ کی طرف سے سورۂ توبہ کی آیت ۱۰۳ میں نازل ہوا۔

زیر بحث آیت جس کے بارے میں تسلیم شدہ ہے کہ وہ زکوٰۃ حاصل کرنے کو واجب قرار دینے والی آیت کے بعد اتری ہے (اگرچہ قرآن میں اس کا ذکر پہلے کیا گیا ہے) زکوٰۃ کے مختلف مصارف بیان کرتی ہے

قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت کے شروع میں لفظ " انما " ہے جو حصر پر دلالت کرتا ہے اور اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بعض خود غرض اور جاہل یہ امید رکھتے تھے کہ وہ استحقاق کے بغیر زکوٰۃ میں سے کچھ حصّہ وصول کرلیں مگر لفظ " انما " نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ پہلے کی دو آیتوں سے یہی معنی نکلتے ہیں کہ بعض لوگ رسول اللہؐ پر اعتراض کرتے تھے کہ آپ زکوٰۃ کا کچھ حصّہ ہمارے اختیار میں کیوں نہیں دیتے؟ یہاں تک کہ وہ محرومی کی صورت میں آگ بگولہ ہو جاتے لیکن اس کے ملنے پر خوشی کا اظہار کرتے۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت واضح طور پر زکوٰۃ کے واقعی اور حقیقی مصارف بیان کرکے تمام بے جا توقعات کو ختم کررہی ہے اور ان مصارف کی آٹھ قسمیں مقرر کرتی ہے:۔

۱۔ فقراء :۔ سب سے پہلے واضح کرتی ہے "صدقات (زکوٰۃ) فقیروں کے لیے ہیں" (انما الصدقات للفقرآء)

۲۔ مساکین (والمساکین)

۳۔ "عاملین" زکوٰۃ جمع کرنے والے (والعاملین علیہا)

یہ جماعت اس عملے اور کارکنوں کی ہے جو زکوٰۃ جمع کرتے اور اسلامی بیت المال کا انتظام و انصرام کرتے ہیں۔ جو کچھ ان کو دیا جاتا ہے وہ در حقیقت ان کی مزدوری ہے۔

۴۔ "مؤلفۃ قلوبہم" یعنی وہ لوگ جن میں اسلام کی ترقی کے لیے کوئی مضبوط روحانی جذبہ نہیں ہے لیکن مالی تشویق کے ذریعے ان کی تالیفِ قلوب ہو سکتی ہے ان کی حمایت حاصل کی جا سکتی ہے۔ "والمؤلفۃ قلوبھم" کی مزید توضیح بعد میں آئے گی۔

۵۔ غلاموں کو آزاد کروانے کے لیے (وفی الرقاب)

یعنی زکوٰۃ کا ایک حصّہ غلامی کے خلاف جہاد کرنے اور اس خلاف انسانیت کام کو ختم کرنے کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ نیز جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ غلاموں کے بارے میں اسلام کا پروگرام ان کی تدریجی آزادی ہے، جس کا آخری نتیجہ تمام غلاموں کو آزادی دلانا ہے۔ بغیر اس کے کہ معاشرے کی طرف سے کوئی ناپسندیدہ ردِعمل کیا جائے یہ بھی اسی پروگرام کا ایک حصّہ ہے کہ زکوٰۃ کا ایک حصّہ اس مقصد کے لیے مختص کیا جاتا ہے۔

۶۔ ایسے قرض داروں کے قرض کی ادائیگی جو کسی جرم و خطا کے بغیر قرض کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور اسے ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتے (والغارمین)

۷۔ خدا کے راستے میں (وفی سبیل اللہ)

جیسا کہ ہم مذکورہ آیت کے آخر میں اشارہ کریں گے کہ اس سے مراد وہ تمام راستے ہیں جن سے دینِ الٰہی کو وسعت ملتی ہو اور تقویت ملتی ہو، مثلاً جہاد اور تبلیغ وغیرہ۔

۸۔ وہ جو سفر میں محتاج ہو جائیں (وابن السبیل)

یعنی ایسے مسافر جو کسی وجہ سے راستے میں رہ جائیں اور منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے حسبِ ضرورت زادِ راہ اور سواری نہ رکھتے ہوں۔ اگرچہ وہ فقیر اور نادار نہ ہوں۔ مگروہ چوری، بیماری یا مال گم ہونے یا کسی اور سبب سے اس حالت میں مبتلا ہوں اس قسم کے افراد کو زکوٰۃ سے اس قدر رقم دی جاتی کہ وہ اطمینان سے منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔

آیت کے آخر میں تاکید کے عنوان سے گزشتہ مصارف کے بارے میں فرمایا گیا ہے یہ اللہ کی طرف سے فرض ہے (فریضۃ من اللّٰہ)۔ اس میں شک نہیں کہ یہ فریضہ انتہائی جچا تلا ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کی بہتری کے ساتھ جامع ہے کیونکہ خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے (واللّٰہ علیم حکیم)۔

چند اہم نکات

۱۔ "فقیر" اور "مسکین" میں فرق :۔ مفسرین میں اس امر کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ فقیر اور مسکین کا ایک ہی مفہوم ہے۔ اس لیے تاکید کے طور پر مذکورہ بالا آیت میں دو الفاظ آئے ہیں۔ اس بنا پر مصارف زکوٰۃ سات ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ دونوں الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔

اکثر مفسرین و فقہاء نے دوسرے احتمال کو مانا ہے اور اس نظریہ کے طرفداروں نے بھی ان دونوں لفظوں کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے لیکن جو زیادہ قرین نظر معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ فقیر وہ شخص ہے جو زندگی کو تنگی ترشی سے گذارتا ہو باوجود اس کے کہ کوئی کام کاج بھی کرتا ہو اور کبھی کسی سے سوال نہ کرتا ہو لیکن مسکین وہ شخص ہے جو زیادہ ضرورت مند ہو اور کوئی کام بھی نہ کرسکتا ہو اس لیے ہر ایک سے سوال کرتا ہو۔ شاید یہ بات "مسکین" کے بنیادی معنی سے لی گئی ہے یہ لفظ "سکون" کے مادے سے ہے۔ یعنی اس قسم کا فرد شدید ناداری کی وجہ سے زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان دونوں لفظوں کے استعمال کو قرآن مجید میں دیکھنے سے اسی معنی کی تائید ہوتی ہے چنانچہ ہم سورۂ بلد کی آیت ۱۶ میں پڑھتے ہیں :۔

اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ

یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلائے۔

سورۂ نساء کی آیت ۸ میں ہے :۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ

جس وقت رشتہ دار، یتیم اور مسکین میراث کی تقسیم کے وقت موجود ہوں تو اس میں سے کچھ انہیں دے دو۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ مساکین سے مراد وہ سوالی ہیں جو کبھی کبھی ایسے مواقع پر آ نکلتے ہیں۔

سورۂ قلم کی آیت ۲۴ میں ہے :۔

اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ

آج کوئی مسکین تمہاری کھیتی باڑی کے احاطہ میں داخل نہ ہونے پائے۔

جو سوال کرنے والوں کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح "اطعام مسکین" یا "طعام مسکین" کی تعبیر قرآن مجید کی بہت سی

آیات میں ہے جو نشاندہی کرتی ہے کہ مساکین وہ بھوکے لوگ ہیں جو کھانے کے ایک دو دانوں کے محتاج ہیں۔
جبکہ فقیر کا لفظ جن جن آیات قرآنی میں آیا ہے ان سے بخوبی یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ ان آبرومند لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو نادار تو ہیں مگر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے۔
مثلاً سورہ بقرہ کی آیت ۲۷۳ میں ہے:

للفقرآء الذین احصروا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضربًا فی الارض یحسبھم الجاھل اغنیآء من التعفف

ایسے فقیروں پر خرچ کرنا چاہیے جو خدا کے راستے میں گرفتار ہوتے ہیں اور اپنی ظاہری حالت ایسی اچھی رکھتے ہیں کہ جاہل ان کی عزتِ نفس کو دیکھ کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ مالدار اور خوشحال ہیں۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اس روایت میں جو محمد بن مسلم نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام یا حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے نقل کی ہے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حضرتؑ سے "فقیر" اور "مسکین" کے بارے میں سوال کیا گیا، تو آپ نے فرمایا:

الفقیر الذی لا یسئل والمسکین الذی ھو اجھد منہ الذی یسئل۔

فقیر وہ ہے جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا ہے اور مسکین کی حالت اس سے زیادہ سخت ہوتی ہے وہ ایسا شخص ہے جو لوگوں سے سوال کرتا ہے اور مانگتا ہے۔[1]

یہی مضمون ایک دوسری حدیث میں ابوبصیر کے ذریعے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے اور یہ دو احادیث مفہوم مذکورہ کی تصریح کرتی ہیں۔
البتہ کچھ قرائن اس کے خلاف بھی گواہی دیتے ہیں لیکن اگر تمام قرائن پیشِ نظر رکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ حق وہی ہے جو اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔

۲۔ کیا زکوٰۃ آٹھ حصوں میں برابر تقسیم کی جائے گی؟ بعض مفسرین اور فقہاء کا یہ نظریہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مال آٹھ حصوں میں مساوی مساوی تقسیم کیا جائے اور ہر ایک حصہ اپنے ہی مصرف میں خرچ کیا جائے مگر یہ کہ مالِ زکوٰۃ کی مقدار اتنی کم ہو کہ وہ آٹھ حصوں میں نہ بانٹا جا سکے۔ لیکن فقہاء کی بہت بڑی اکثریت اس نظریہ کی حامی ہے کہ مندرجہ بالا آٹھ اصناف ایسی ہیں کہ جن میں زکوٰۃ کو صرف کیا جا سکتا ہے لیکن ان میں تقسیم کرنا واجب نہیں ہے۔
حضرت رسولِ اکرمؐ، ائمہ اطہارؑ اور ان کے اصحاب کی سیرتِ قطعی بھی اسی معنی کی تائید کرتی ہے علاوہ ازیں چونکہ زکوٰۃ اسلامی مالیات میں سے ایک مالیہ ہے اور اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ اسے رعایا سے وصول کرے اور اس کے نفاذ کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس سے اسلامی معاشرے کی گوناگوں ضروریات پوری ہوں اس لیے فطرتاً اس کے مصرف کی کیفیت آٹھوں مصارف میں سے ایک طرف اجتماعی ضروریات سے وابستہ ہے اور دوسری طرف اسلامی حکومت کی فکر و نظر سے۔

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۶ ص ۱۴۴ ابواب مستحقین زکوٰۃ باب ۱ حدیث ۲

۳۔ زکوٰۃ کس وقت واجب ہوئی تھی؟ قرآن کی مختلف آیات مثلاً اعراف ۱۵۶، نمل ۳، لقمان ۴ اور سورۂ حم السجدہ آیت ۷ سے جو سب کی سب مکی ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وجوب زکوٰۃ کا حکم مکہ مکرمہ میں نازل ہوا اور مسلمان اس اسلامی فرض کی بجا آوری کے پابند تھے لیکن جب رسول اللہؐ مدینہ منورہ میں تشریف لائے اور اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی تو فطری طور پر بیت المال کے قیام کی ضرورت پڑی چنانچہ خداوند عالم کی طرف سے آپ کو حکم ملا کہ آپ مسلمانوں سے خود زکوٰۃ وصول کریں (نہ یہ کہ وہ خود اپنی رائے اور مرضی سے اسے صرف کریں) آیۂ شریفہ:۔

خذ من اموالهم صدقة ....

ان کے مال سے زکوٰۃ لو ــــــــــــــــ (توبہ ۱۰۳)

اسی موقع پر نازل ہوئی۔

اور مشہور یہ ہے کہ یہ حکم ہجرت کے دوسرے سال میں آیا تھا اس کے بعد زکوٰۃ کے مصارف جزئیاتی تفصیل کے ساتھ اس آیت میں نازل ہوئے جس پر ہم بحث کر رہے ہیں۔ یعنی سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ زکوٰۃ لینے کا حکم آیت ۱۰۳ میں آیا ہے اور اس کے مصارف کا تذکرہ ہجرت کے نویں سال آیت ۶۰ میں ہوا ہے۔

کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آیاتِ قرآن کی جمع و ترتیب، تاریخ نزولِ قرآن کے مطابق نہیں ہے بلکہ حکم رسولؐ سے ہر ایک آیت مناسب مقام پر رکھی گئی ہے۔

۴۔ "مؤلفة قلوبهم" سے مراد کون لوگ ہیں؟ جو کچھ "مؤلفة قلوبهم" کی تعبیر سے سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ مصارفِ زکوٰۃ میں سے کچھ رو پیہ ان اشخاص پر خرچ کیا جاتا ہے جن کی تالیفِ قلب مقصود ہوتی ہے لیکن کیا ان سے مراد وہ کافر اور غیر مسلم افراد ہیں جن کو جہاد میں مدد پر آمادہ کرنے کے لیے زکوٰۃ دی جاتی ہے یا اس میں ضعیف الایمان مسلمان بھی شامل ہیں؟

جس طرح ہم فقہی مباحث میں کہہ چکے ہیں کہ یہ آیت اور اسی طرح چند ایک روایات جو اس سلسلے میں ہیں ایک وسیع مفہوم رکھتی ہیں۔ اور یہ ان تمام لوگوں کے بارے میں ہیں جن کو مال دینے سے اسلام اور اہلِ اسلام کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور اس کے صرف کافروں کیلئے ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۵۔ اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت اور اثر:۔ اس امر کے پیشِ نظر کہ اسلام صرف ایک اخلاقی یا فلسفی اور اعتقادی مکتبِ فکر کی صورت میں ظاہر نہیں ہوا۔ بلکہ وہ ایک ایسے جامع دستور و آئین کے طور پر ظہور میں آیا ہے جس میں تمام مادی اور روحانی ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے۔

نیز جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام نے پیغمبرؐ کے عہد سے ہی حکومت کی بنیاد رکھی اسی طرح اسلام محروم لوگوں کی حمایت اور طبقاتی فاصلوں سے جنگ آزمائی پر خاص توجہ دیتا ہے تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ بیت المال اور زکوٰۃ کی کس قدر اہمیت ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ بیت المال کی آمدنی کا ایک سرچشمہ ہے اور یہ اس سلسلے میں اہم ترین کردار ادا کرنے والے امور میں سے ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر معاشرے میں ایسے بیکار، بیمار، یتیم، لاوارث اور محتاج و معذور افراد ہوتے ہیں جن کی امداد کرنا از بس ضروری ہے۔

نیز دشمن کے حملے کے وقت سرفروش مجاہدین کی ضرورت ہے جن کے اخراجات حکومت برداشت کرتی ہے اسی طرح اسلامی حکومت کے ملازمین

عدلیہ، نشرواشاعت کے وسیلوں اور دینی مراکز میں سے بھی ہر ایک کے لیے سرمایے کی ضرورت پڑتی ہے جو منظم اور اطمینان بخش مالی وسائل کے بغیر نہیں چل سکتے۔

اسی بنا پر اسلام میں زکوٰۃ جو مالی وسائل کی ایک قسم ہے اور جو آمدنی، تولید مال اور منجمد دولت پر لاگو مالیات میں شمار ہوتی ہے، ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں تک کہ یہ اہم ترین عبادت کے ہم پلہ قرار پائی ہے اور بہت سے مواقع پر اس کا ذکر نماز کے ساتھ ہوا ہے۔ حدیہ ہے کہ زکوٰۃ کو قبولیتِ نماز کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ روایاتِ اسلامی میں ہے کہ اگر اسلامی حکومت کسی شخص یا چند افراد سے زکوٰۃ کا مطالبہ کرے اور وہ حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیں تو وہ مرتد شمار ہوں گے اور اگر ان پر پند و نصائح کا کوئی اثر نہ ہو تو ان کے خلاف فوجی کارروائی کرنا بھی جائز ہے۔

چنانچہ ایک روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من منع قیراطاً من الزکوٰۃ فلیس ھو بمؤمن، ولا مسلم، ولا کرامۃ

جو شخص مالِ زکوٰۃ میں سے ایک قیراط (جو کہ چار رتی دانوں کے برابر وزن ہے) نہ دے تو وہ مومن ہے اور نہ مسلمان اور نہ اس کی کوئی قدر و قیمت ہے[1]

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ کی حدود اور اس کی مقدار ایسی حکمت کے ساتھ مقرر کی گئی ہے کہ اگر تمام مسلمان مالِ زکوٰۃ کی صحیح اور مکمل ادائیگی کریں تو اسلامی حکومت میں کوئی شخص فقیر اور نادار نہیں رہے گا۔

چنانچہ ایک حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ولو ان الناس ادوا زکوٰۃ اموالھم ما بقی مسلم فقیراً محتاجاً ...... وان الناس ما افتقروا، ولا احتاجوا ولا جاعوا ولا عروا، الا بذنوب الاغنیاء

اگر تمام لوگ اپنے اپنے مال کی زکوٰۃ دیں تو کوئی مسلمان فقیر و محتاج نہ رہے گا...... اور لوگ مالداروں کے گناہوں کی وجہ سے ہی فقیر، محتاج اور بھوکے ننگے ہوتے ہیں[2]

نیز روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی اصل ملکیت کی حفاظت اور اس کی بنیادوں کی مضبوطی کا سبب ہے۔
اسی طرح اگر لوگ اس اہم بنیادی اسلامی فریضہ کو بھلا دیں تو مختلف گروہوں کے درمیان اس قدر دُوری ہو جائے گی کہ اہلِ ثروت کا مال خطرے میں پڑ جائے گا۔

حضرت امام موسیٰ بن جعفرؑ فرماتے ہیں:

حصنوا اموالکم بالزکوٰۃ

اپنے اموال کو زکوٰۃ دے کر محفوظ کر لو[3]

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۶ ص ۲۰ باب ۴ حدیث ۹

[2] وسائل الشیعہ ج ۶ ص ۴ (باب ۱ حدیث ۶ ابواب زکوٰۃ)

[3] وسائل ج ۶ ص ۶ (باب ۱ حدیث ۱۱ ابواب زکوٰۃ)

یہی مضمون حضرت پیغمبر اکرمؐ اور امیرالمومنین علیہ السلام سے بھی دوسری احادیث میں منقول ہے۔ مزید معلومات کے لیے وسائل الشیعہ کی چھٹی جلد کے ابواب ایک، تین، چار اور پانچ کی طرف رجوع فرمائیے۔

۶۔ "لام" اور "فی" کا فرق:۔ آخری نکتہ جس کی طرف توجہ ضروری ہے کہ اس آیت میں چار گروہوں کے ساتھ لفظ "لام" لگایا گیا ہے (انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبھم) یہ عام طور پر ملکیت کی نشانی ہے۔

دوسرے چار گروہوں کے لیے لفظ "فی" آیا ہے (وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن السبیل)۔ یہ "فی" زیادہ مصرف کے بیان کے لیے ہے[1] مفسرین میں اس اختلافِ تعبیر کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ بعض کا نظریہ ہے کہ پہلے چار گروہ زکوٰۃ کے مالک ہیں اور دوسرے چار گروہ مالک نہیں صرف جائز ہے کہ زکوٰۃ ان پر صرف کی جائے۔

بعض کا نظریہ یہ ہے کہ تعبیر کا یہ اختلاف ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دوسرے چار گروہ زکوٰۃ کے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ لفظ "فی" ظرفیت کے بیان کے لیے ہے۔ یعنی یہ چار گروہ زکوٰۃ کے ظرف ہیں اور زکوٰۃ ان کی مظروف ہے جبکہ پہلے گروہ ایسے نہیں ہیں لیکن ہم نے یہاں ایک اور احتمال کو انتخاب کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ چھ گروہ فقراء، مساکین، عاملین، مؤلفۃ قلوبھم، غارمین اور ابن سبیل جن کا ذکر فی کے بغیر ہے۔ برابر ہیں اور ایک دوسرے پر عطف ہیں اور دوسرے دو گروہ جو کہ "فی الرقاب" اور "فی سبیل اللہ" ہیں اور جو لفظ "فی" کے ساتھ ہیں وہ ایک مخصوص شکل رکھتے ہیں۔ شاید یہ تعبیر کا فرق اس لحاظ سے ہو کہ چھ گروہ تو مالکِ زکوٰۃ ہو سکتے ہیں اور خود انہیں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے (یہاں تک کہ ایسے مقروض لوگ جو اپنا قرض ادا نہ کرسکیں البتہ اس صورت میں جبکہ یہ اطمینان ہو کہ وہ اسے اپنے قرض کی ادائیگی میں خرچ کریں گے) لیکن باقی دونوں زکوٰۃ کے مالک نہیں ہوں گے اور نہ خود انہیں دی جائے گی بلکہ ان کے لیے خرچ کی جائے گی۔ مثلاً غلاموں کو مالِ زکوٰۃ سے خرید کر آزاد کیا جائے گا۔ واضح ہے کہ اس طرح وہ زکوٰۃ کے مالک نہیں ہوں گے۔ اسی طرح وہ مواقع کہ جو "فی سبیل اللہ" کے مفہوم میں آتے ہیں۔ مثلاً جہاد کا ساز و سامان اور اسلحہ مہیا کرنا یا مسجد بنانا اور دینی مراکز قائم کرنا اس قسم کے امور میں کوئی بھی زکوٰۃ کا مالک نہیں ہے بلکہ وہ اس کے مصرف ہیں۔ طرفیکہ تعبیر کا یہ فرق اس بات کو بخوبی واضح کرتا ہے کہ قرآنی تعبیرات کس قدر نپی تلی ہیں۔

۶۱۔ وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۚ قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ ۚ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○

---

[1] خیال رہے کہ دو مقامات پر "فی" صراحت کے ساتھ ہے اور دو جگہ مجرور "فی" پر عطف ہے۔ جیسے "لام" کا ایک جگہ پر ذکر ہے اور باقی اسی پر عطف ہے۔

ترجمہ

۶۱۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو پیغمبر کو تکلیف پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ خوش باور اور ہمہ تن گوش ہیں۔ کہہ دو کہ اس کا خوش فہم ہونا تمھارے فائدے میں ہے (لیکن جان لو) وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور (صرف) مومنین کی تصدیق کرتا ہے اور تم میں سے ان لوگوں کے لیے رحمت ہے جو ایمان لائے ہیں۔ جو لوگ اللہ کے رسول کو اذیت پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

شانِ نزول

یہ خوبی ہے عیب نہیں

آیت مذکورہ کی کئی ایک شانِ نزول بیان کی گئی ہیں جو ایک دوسرے سے طبق مختلف ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ آیت منافقین کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے یہ لوگ ایک دوسرے کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت رسولِ اکرمؐ کے متعلق نازیبا اور ناپسندیدہ باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا: "ایسا نہ کرو کیونکہ ہمیں یہ خوف ہے کہ کہیں یہ باتیں محمدؐ کے کان تک نہ پہنچ جائیں اور کہیں وہ ہمیں بُرا بھلا نہ کہے (اور لوگوں کو ہمارے خلاف نہ ابھارے) ان میں سے ایک نے جس کا نام "جلاس" تھا کہا کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے ہم جو چاہیں گے کہیں گے اور اگر اس کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تو ہم ان کے پاس جائیں گے اور انکار کر دیں گے اور وہ ہماری بات قبول کریں گے کیونکہ محمد خوش باور اور قول کو تسلیم کرنے والا ہے اور جو شخص جو بات بھی کہے اسے قبول کر لیتا ہے۔ اس وقت آیتِ بالا نازل ہوئی اور اس کے ذریعے انھیں جواب دیا گیا۔

تفسیر

اس آیت میں جیسا کہ اس کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے ایک یا کئی افراد کے بارے میں گفتگو ہے جو پیغمبرِ اکرمؐ کو اپنی باتوں سے تکلیف پہنچاتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ خوش باور اور قول کا اعتبار کرنے والا ہے (وَمِنۡهُمُ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ النَّبِىَّ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ اُذُنٌ)۔

"اُذُن" اصل میں کان کے معنی میں ہے ــــــــــ ان لوگوں کو جو دوسروں کی باتیں بڑی توجہ سے سنتے ہیں اور اصطلاحاً (فارسی میں) انھیں "گوشی" کہتے ہیں ان کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے[1]۔ وہ لوگ حقیقت میں رسولِ اکرمؐ کی ایک خوبی کو جو کہ ایک رہبر میں ہونا نہایت ضروری ہے، ایک برائی کے لباس میں پیش کرتے تھے اور وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ایک محبوب رہبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ انتہائی لطف و محبت کا مظاہرہ کرے اور جہاں تک ممکن ہو لوگوں کے عذر اور معذرت کو قبول کرے اور ان کے

---

[1] اردو میں اسے "ہمہ تن گوش" بھی کہا جاتا ہے۔ (مترجم)

عیب چھپائے۔

مگر وہاں نہیں جہاں اس کا بُرا اثر پڑے۔ اسی لیے قرآن اس کے فوراً بعد فرماتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ اگر پیغمبر تمہاری باتوں کی طرف کان دھرتا ہے اور تمہارے عذر قبول کرتا ہے اور تمہارے گمان میں ہمہ تن گوش اور جلدی اعتماد کرنے والا ہے، تو یہ بات تو تمہارے فائدے میں ہے (قل اذن خیر لکم) کیونکہ اس طرح وہ تمہاری عزت و آبرو کی حفاظت کرتا ہے اور تمہارے وقار کو ٹھیس نہیں لگاتا اور تمہارے خیالات و جذبات کو مجروح نہیں کرتا اور اس طریقے سے تمہاری محبت، اتحاد اور وحدت کے لیے کوشاں ہے۔

کیونکہ اگر وہ فوراً پردہ اٹھا دیتا اور جھوٹوں کو ذلیل و رسوا کرتا تو تمہارے لیے بڑی کٹھن صورت حال ہوتی۔ علاوہ ازیں اگر ایک جماعت کی عزت و آبرو ختم ہو جاتی تو پھر اس کے لیے توبہ اور بازگشت کا راستہ بھی بند ہو جاتا۔ اور وہ گنہگار لوگ جو ہدایت کے قابل تھے بدکاروں کی صف میں جا کھڑے ہوتے اور پیغمبرؐ کے پاس سے دور ہو جاتے۔

ایک ہمدرد اور مہربان قائد کو جبکہ وہ پختہ کار اور دانا بھی ہے، ان سب باتوں کو سمجھنا چاہیے لیکن ایسی بہت سی چیزوں کو زبان پر نہیں لانا چاہیے تاکہ وہ افراد جو تربیت کی اہمیت رکھتے ہیں ان کی تربیت ہو جائے اور اس کے مکتب سے نہ بھاگیں اور لوگوں کے اسرار بھی ظاہر نہ ہوں۔ اس کا آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ خدا عیب جوئی کرنے والوں کے جواب میں کہتا ہے:

"ایسا نہیں ہے کہ وہ سب کی باتوں کو قابل اعتنا سمجھتا ہے بلکہ وہ ایسی باتوں پر کان دھرتا ہے جو تمہارے فائدے میں ہوں یعنی خدا کی وحی کو سنتا ہے، مفید تجویز پر کان دھرتا ہے اور لوگوں کی عذر خواہی ایسے مواقع پر قبول کرتا ہے جبکہ وہ ان کے اور معاشرے کے مفاد میں ہو"۔[1]

اس کے بعد اس وجہ سے کہ عیب جوئی کرنے والے کہیں اس بات سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں اور اسے سند قرار نہ دے لیں یہ اضافہ فرماتا ہے: وہ خدا اور اس کے احکامات پر ایمان رکھتا ہے اور سچے مومنوں کی باتوں پر کان دھرتا ہے، انھیں قبول کرتا اور ان پر اقدام کرتا ہے (یؤمن باللہ و یؤمن للمؤمنین)۔

یعنی حقیقت میں پیغمبر دو قسم کے پروگرام رکھتے ہیں ایک ظاہری محافظت اور پردہ دری سے اجتناب اور دوسرا عمل کا مرحلہ۔ پہلے مرحلے میں آپؐ سب کی باتوں کو سنتے ہیں اور بظاہر انکار نہیں کرتے۔ لیکن عمل کے مقام میں ان کی توجہ صرف احکامات خدا اور سچے مومنین کی تجاویز اور باتوں کی طرف ہوتی ہے اور حقیقت پسند قائد کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ معاشرے کے مفادات کا تحفظ اس طریقے کے بغیر ممکن نہیں اس لیے خداوند عالم بلافاصلہ فرماتا ہے: وہ تم میں سے مومنین کے لیے رحمت ہے (ورحمۃ للذین اٰمنوا منکم)۔

اس مقام پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ہم چند آیات میں پڑھتے ہیں کہ پیغمبرؐ رحمۃ للعالمین ہیں (سورہ انبیاء ۱۰۷) لیکن مذکورہ آیت کہتی ہے کہ آپ صرف مومنین کے لیے رحمت ہیں۔ کیا وہ عمومیت اس تخصیص کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے؟ مگر ایک نکتہ کی طرف توجہ دینے سے اس سوال کا

---

[1] در حقیقت تفسیر اول کی بنا پر "اُذن خیر" جو کہ مثال (مضاف الیہ) ہے صفت موصوف کی طرف اضافت کی قسم سے ہے اور دوسری تفسیر کی بنا پر وصف کی طرف اضافت کے قبیل سے ہے۔ پہلے احتمال کی بنا پر عبارت کے معنی اس طرح ہوں گے "وہ تمہارے لیے بات کو قبول کرنے والا اور اچھا سنن پذیر ہے" اور دوسرے احتمال کی بنا پر اس کا مفہوم یہ ہے:
"وہ اچھی اچھی باتوں کو تمہارے فائدے اور نفع کے لیے سنتا ہے"۔

جواب واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ رحمت کے کئی درجات اور مراتب ہیں۔ جن میں ایک مرتبہ قابلیت اور استعداد ہے اور دوسرا مرتبہ فعلیت ہے۔ مثلاً بارش اللہ کی رحمت ہے یعنی یہ قابلیت اور اہلیت اسکے سب قطروں میں پائی جاتی ہے کہ وہ خیر و برکت، نشوونما اور حیات کا سبب بنیں۔ لیکن یہ تسلیم شدہ ہے کہ اس رحمت کے آثار کا ظہور صرف اچھی زمینوں پر ہوتا ہے جو اس کے قابل ہوں اس وجہ سے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بارش کے سب قطرے "رحمت" ہیں اور اسی طرح یہ کہنا بھی درست ہے کہ بارش کے یہ قطرے اہل اور قابل زمینوں کیلئے باعث رحمت ہیں۔ پہلا جملہ اہلیت اور قابلیت کی طرف اور دوسرا جملہ وجود اور فعلیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح حضرت پیغمبر اکرمؐ قابلیت اور استعداد کی رُو سے تمام جہانوں کے لیے رحمت ہیں لیکن آپ عملی طور پر مومنین کے لیے مخصوص ہیں۔

اب یہاں پر ایک چیز باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ رسول اللہؐ کو اپنی باتوں سے اذیت و تکلیف پہنچاتے ہیں اور ان کی عیب جوئی کرتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ وہ سزا سے بچ جائیں گے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ ان کے بارے میں ایک ذمہ داری رکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ بزرگانہ اور فراخدلانہ برتاؤ کریں اور انھیں رسوا نہ کریں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے اعمال کی سزا نہ پائیں گے۔ لہٰذا آیت کے آخر میں قرآن فرماتا ہے: وہ لوگ جو رسولِ خدا کو اذیت و تکلیف پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے (والذین یؤذون رسول اللہ لہم عذاب الیم)۔

۶۲۔ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ
اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝
۶۳۔ اَلَمْ يَعْلَمُوْۤا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ
جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ۝

ترجمہ

۶۲۔ وہ تمھارے سامنے خدا کی قسم کھاتے ہیں تاکہ تمھیں خوش رکھیں حالانکہ زیادہ مناسب بات یہ ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کو راضی کریں اگر (وہ سچ کہتے ہیں اور) ایمان رکھتے ہیں۔

۶۳۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ جو شخص خدا اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی کرے، اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا یہ ایک بڑی رسوائی ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ زیرِ نظر دونوں آیتیں گزشتہ آیت کی تکمیل کرتی ہیں اور یہ طبعاً اور فطرتاً اسی سلسلے میں نازل

ہوئی ہیں۔ لیکن مفسرین کی ایک اور جماعت نے ان دونوں آیات کے بارے میں ایک اور شانِ نزول نقل کی ہے اور وہ یہ کہ جب جنگِ تبوک کی مخالفت کرنے والوں اور پیچھے رہ جانے والوں کی مذمت میں آیات نازل ہوئیں تو منافقوں میں سے ایک نے کہا: خدا کی قسم! یہ لوگ ہمارے بزرگ اور اشراف ہیں اور جو کچھ محمدان کے بارے میں کہتا ہے پیغمبر ہے تو پھر یہ چوپایوں سے بھی گئے گذرے ہیں۔

ایک مسلمان نے یہ بات سن کر کہا: خدا کی قسم! جو کچھ آنحضرتؐ کہتے ہیں وہ حق ہے اور تو چوپائے سے بھی بدتر ہے۔

جب یہ بات رسولِ اکرمؐ کے پاس پہنچی تو آپؐ نے کسی کو اس منافق کو بلانے کے لیے بھیجا اور اس سے پوچھا کہ تو نے یہ بات کیوں کہی ہے؟

تو اس نے قسم کھا کر کہا: میں نے یہ بات نہیں کہی۔

وہ مردِ مومن جو اس کے خلاف تھا اسی نے یہ بات جا کر حضورؐ سے کہی تھی اس نے دعا کی: خداوندا! تو خود سچے کی تصدیق اور جھوٹے کی تکذیب فرما۔

اس وقت آیاتِ مندرجہ بالا نازل ہوئیں اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔

تفسیر

منافقین کی ایک نشانی

منافقین کی ایک اور عملی نشانی اور عملِ بد یہ ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کر رہا ہے کہ وہ اپنی بدکرداری کو چھپانے کے لیے اپنی بہت سی کرتوتوں کا انکار کر دیتے ہیں اور چاہتے تھے کہ جھوٹ موٹ قسموں کے ذریعے لوگوں کو دھوکا دیتے رہیں اور انھیں اپنے آپ سے راضی رکھیں۔

مندرجہ بالا آیتوں میں ایک طرف قرآن اس بُرے عمل سے پردہ اٹھا کر ان کو ذلیل کرتا ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو بتا دیتا ہے کہ وہ ان کی جھوٹی قسموں میں نہ آئیں۔ پہلے کہتا ہے: وہ تمھارے سامنے خدا کی قسم کھاتے ہیں تاکہ تمھیں خوش رکھیں (یحلفون باللہ لکم لیرضوکم)۔

ظاہر ہے کہ ان قسموں سے ان کا مقصد حقیقت بیان کرنا نہیں ہے بلکہ وہ چاہتے ہیں کہ مکر و فریب سے حقیقت کا چہرہ تمھاری نظروں میں مسخ کر دیں اور اپنا مقصد حاصل کر لیں۔ اگر ان کا نصب العین اور مقصد یہ ہوتا کہ واقعاً سچے مومنین کو اپنے سے راضی کریں تو اس سے زیادہ ضروری یہ تھا کہ وہ خدا اور اس کے پیغمبر کو راضی کر لیں۔ حالانکہ انھوں نے اپنے کردار اور عمل سے خدا و رسول کو سخت ناراض کیا ہے۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے: اگر وہ سچ کہتے ہیں اور ایماندار ہیں تو مناسب یہ ہے کہ وہ خدا اور پیغمبر کو راضی کریں (واللہ و رسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مؤمنین)۔

قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس جملے میں چونکہ خدا اور اس کے رسول کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے تو قاعدے کے لحاظ سے ضمیر کو تثنیہ ہونا چاہیے لیکن اس کے باوجود ضمیر "واحد" استعمال ہوئی ہے (مراد یرضوہ کی ضمیر ہے) حقیقت میں اس تعبیر کا اشارہ اس طرف ہے کہ پیغمبر کی رضا اور خدا کی رضا جُدا جُدا نہیں ہے اور رسول اسی چیز کو پسند کرتے ہیں جسے خداوندِ عالم پسند کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ "توحیدِ افعالی" کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ

رسول اللہ خدا کے مقابلے میں اپنی طرف سے استقلال نہیں رکھتے۔ ان کی خوشی اور ناراضی سب خدا کے لیے ہے۔ ان کا سب کچھ اس کیلئے اور اس کی راہ میں ہے۔

چند ایک روایات میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں ایک شخص نے اثنائے گفتگو میں یوں کہا:

من اطاع اللّٰہ و رسولہ فقد فاز ومن عصاھما فقد غوی۔

جس نے خدا اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کی وہ کامیاب ہوا اور جس نے ان دونوں کی مخالفت کی وہ گمراہ ہوا

جب پیغمبرؐ نے یہ بات سنی کہ اس نے خدا اور پیغمبر کو ایک درجے میں رکھا ہے اور تثنیہ کی ضمیر استعمال کی ہے تو آپؐ پریشان ہوئے اور فرمایا:

بئس الخطیب انت ھلا قلت من عصی اللّٰہ و رسولہ

تم بُرے خطیب ہو تم نے اس طرح کیوں نہیں کہا کہ جو شخص خدا اور اس کے پیغمبر کی نافرمانی کرے .... (بلکہ تم نے تثنیہ کی ضمیر استعمال کی ہے اور کہا ہے کہ جو ان دونوں کا حکم نہ مانے) [1]

اس کے بعد کی آیت میں قرآن ایسے منافقوں کو سخت دھمکی دیتا ہے اور کہتا ہے: "کیا وہ نہیں جانتے کہ جو خدا اور اس کے رسول کی مخالفت اور دشمنی کرے اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا (الم یعلموا انہ من یحادد اللّٰہ و رسولہ فان لہ نار جھنم خالدا فیھا) اس کے بعد تاکید کے طور پر فرماتا ہے یہ بڑی ذلت و رسوائی ہے (ذالک الخزی العظیم)۔

"یحادد" "محادۃ" کے مادہ سے ہے اور "حد" کی اصل سے ہے جو کنارہ، طرف اور کسی چیز کی انتہا کے معنی میں آتا ہے۔ چونکہ مخالف اور دشمن افراد ایک دوسرے کے مدمقابل ہوتے ہیں اس لیے "محادہ" کا مادہ عداوت اور دشمنی کا مفہوم بھی رکھتا ہے جیسا کہ ہم روزمرہ کی گفتگو میں لفظ "طرفیت" مخالفت اور دشمنی کے معنی میں بولتے ہیں۔

۶۴۔ يَحۡذَرُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ اَنۡ تُنَزَّلَ عَلَيۡهِمۡ سُوۡرَةٌ تُنَبِّئُهُمۡ بِمَا فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ‌ؕ قُلِ اسۡتَهۡزِءُوۡا‌ۚ اِنَّ اللّٰهَ مُخۡرِجٌ مَّا تَحۡذَرُوۡنَ‏ ۝

۶۵۔ وَلَـئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ لَيَـقُوۡلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوۡضُ وَنَلۡعَبُ‌ؕ قُلۡ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوۡلِهٖ كُنۡتُمۡ تَسۡتَهۡزِءُوۡنَ‏ ۝

۶۶۔ لَا تَعۡتَذِرُوۡا قَدۡ كَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ‌ؕ اِنۡ نَّعۡفُ عَنۡ طَآئِفَةٍ

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، آیہ مذکورہ کے ذیل میں

مِّنۡكُمۡ نُعَذِّبۡ طَآىِٕفَةًۢ بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ۝

ترجمہ

۶۴۔ منافقین اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کہیں کوئی آیت ان کے خلاف نازل ہو جائے جو ان کے دلوں کے بھیدوں کی انھیں خبر دے دے۔ کہہ دیجیے کہ استہزاء اور مذاق کر لو۔ جس کا تمھیں ڈر ہے خدا اسے ظاہر کرے گا۔

۶۵۔ اگر تم ان سے پوچھو (کہ تم یہ بُرے کام کیوں کرتے ہو) تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مذاق کرتے ہیں تو کہہ دو کہ کیا تم خدا، اس کی آیات اور اس کے پیغمبر کا مذاق اڑاتے ہو؟

۶۶۔ (کہہ دو) معذرت نہ کرو (کیونکہ وہ فضول ہے اس لیے کہ) تم ایمان لانے کے بعد کافر ہو گئے ہو۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو (توبہ کرنے کی وجہ سے) معاف کر دیں تو دوسرے گروہ کو عذاب میں مبتلا کریں گے کیونکہ وہ مجرم تھے۔

شانِ نزول

مذکورہ بالا آیتوں کی مختلف شانِ نزول نقل ہوئی ہیں ان سب کا تعلق جنگِ تبوک کے بعد منافقوں کی حرکتوں اور شرارتوں سے ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ منافقوں کی ایک جماعت نے خفیہ میٹنگ میں حضرت رسولِ اکرمؐ کے قتل کی سازش کی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جنگِ تبوک سے واپسی پر راستے کی ایک گھاٹی میں چپکے سے صورت بدل کر گھات میں رہیں گے اور جب رسول اللہ اپنی اونٹنی پر گذریں گے تو اونٹنی کو بدکائیں گے اور رسول اللہ کو قتل کر دیں گے۔ خدا نے اپنے پیغمبر کو اس سازش کی اطلاع کر دی۔

آپ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کا ایک گروہ نگرانی کرے اور ان لوگوں کو تتر بتر کر دے جب حضرت رسولِ اکرمؐ اس گھاٹی پر پہنچے تو آپ کی اونٹنی کی مہار حضرت عمار کے ہاتھ میں تھی اور حذیفہ اسے پیچھے سے ہانک رہے تھے۔ رسول اللہؐ نے حذیفہ سے فرمایا کہ ان کی سواریوں کے منہ پر (چابک) مارو اور انھیں بھگا دو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ جب آپ گھاٹی سے صحیح سلامت نکل آئے تو حضورؐ نے حذیفہ سے فرمایا تو نے انھیں پہچانا نہیں؟ تو اس نے عرض کیا "نہیں میں نے تو ان میں سے کسی کو نہیں پہچانا۔ اس کے بعد حضرت پیغمبرؐ نے ان سب کے نام گنوائے۔ حذیفہ نے عرض کیا کہ جب صورتحال یہ ہے تو آپ ایک گروہ کو کیوں یہ حکم نہیں دیتے کہ وہ جاکر انھیں قتل کر دے۔ آپؐ نے فرمایا: میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ عرب کہیں کہ محمدؐ اپنے ساتھیوں پر کامیاب ہو گیا تو انھیں قتل کرنا شروع کر دیا۔

یہ شانِ نزول حضرت امام محمد باقرؑ سے نقل ہوئی ہے اور حدیث و تفسیر کی بہت سی کتابوں میں آئی ہے۔

ایک دوسری شانِ نزول یہ لکھی ہے کہ جب منافقوں نے جنگِ تبوک میں دشمن کے مقابلے میں حضرتؐ کی جگہ دیکھی تو مذاق کے طور پر کہنے لگے کہ یہ شخص گمان کرتا ہے کہ شام کے محل اور شامیوں کے مضبوط قلعے فتح کرے گا، یہ تو قطعی طور پر محال ہے۔

خداوندِ عالم نے اپنے پیغمبرؐ کو اس واقعہ کی خبر دی تو آپؐ نے حکم دیا کہ اس گروہ کا رستہ بند کر دیا جائے اس کے بعد آپؐ نے انھیں بلایا اور لعنت ملامت کی اور فرمایا کہ تم نے لوگوں سے یہ باتیں کی ہیں انھوں نے معافی مانگی کہ اس سے ہمارا کوئی خاص مقصد نہ تھا ہم تو مذاق کر رہے تھے

اور اس بات پر قسم کھائی ۔

تفسیر

منافقین کا خطرناک پروگرام

گزشتہ آیات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ منافق کس طرح قوت کے اسباب کو کمزوری کے ذرائع سمجھتے تھے اور مسلمانوں میں تفرقہ اور اختلاف ڈالنے کے لیے پروپیگنڈا کرتے تھے ۔ جن آیات پر بحث کی جارہی ہے ان میں ان کے منصوبوں اور طریق کار کے ایک اور حصے کی طرف اشارہ ہے ۔ پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا پیغمبر اکرمؐ کو منافقین کی سازشوں سے بچانے کے لیے بعض اوقات ان کے اسرار سے پردہ اٹھا دیتا تھا اور ان سے مسلمانوں کی جماعت کو آگاہ کر دیتا تھا تاکہ وہ چوکنے ہو جائیں اور ان کے دھوکے میں نہ آئیں اور وہ بھی اپنی حیثیت کی طرف متوجہ رہیں ، اور اپنے دست و پا سمیٹ کر رکھیں ۔ اس وجہ سے منافق اکثر اوقات خوف زدہ اور حیران و پریشان رہتے تھے ۔ چنانچہ قرآن ان کی اس حالت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے ،

"منافق ڈرتے ہیں کہ ان کے خلاف کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو اس سے انھیں (مسلمانوں کو) آگاہ کر دے (یحذر المنافقون ان تنزل علیہم سورۃ تنبئھم بما فی قلوبہم)"۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ پھر بھی انتہائی دشمنی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے پیغمبرؐ کے کاموں کا مذاق اڑانے سے باز نہیں آتے اور تمسخر اڑانے کا سلسلہ ترک نہیں کرتے لہٰذا خدا اس آیت کے آخر میں اپنے پیغمبر سے فرماتا ہے : ان سے کہہ دو کہ تم سے جتنا ہو سکے مذاق اڑاؤ ، لیکن جان لو کہ جس چیز کا تمھیں خوف ہے خدا اسے ظاہر کر دے گا اور تمھیں ذلیل و رسوا کر کے رہے گا (قل استھزءوا ان اللہ مخرج ما تحذرون) ۔ البتہ "استھزءوا" (ہنسی مذاق اڑاؤ) تہدید کی قبیل سے فعل امر ہے جیسے انسان اپنے دشمن سے کہتا ہے ۔ جس قدر دکھ تکلیف تو پہنچا سکتا ہے پہنچا لے ہم اس کا ایک ہی مرتبہ جواب دیں گے ۔ اس قسم کی باتیں دھمکی کے موقع پر کی جاتی ہیں ۔

ضمنی طور پر توجہ دیجیے تو اوپر والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق دل میں پیغمبرؐ کی دعوت کی سچائی کو اچھی طرح جانتے تھے اور خدا سے آنحضرتؐ کے ارتباط سے وہ خوب واقف تھے ۔ لیکن اس کے باوجود ہٹ دھرمی اور دشمنی کی وجہ سے ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے مخالفت کرتے تھے ۔ اسی وجہ سے قرآن کہتا ہے ، منافقوں کو اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں ان کے خلاف قرآنی آیات نازل ہوں اور ان کے دلوں میں چھپے ہوئے رازوں کو طشت ازبام کر دیں ۔

اس نکتہ کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ "تنزل علیہم" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس قسم کی آیتیں منافقین پر نازل ہوتی تھیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ ان کے بارے اور ان کے خلاف تھیں اگرچہ وہ حضرت رسول اکرمؐ پر نازل ہوتی تھیں ۔

خدا اس کے بعد میں آنے والی آیت میں منافقین کے ایک اور منصوبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : ۔

" اگر ان سے پوچھو کہ تم نے اس قسم کی غلط بات کیوں کی ہے اور اس قسم کی غلط حرکت کیوں کی ہے ؟ تو کہتے ہیں کہ ہم تو دل لگی اور ہنسی مذاق کرتے تھے اور اس سے ہماری کوئی غرض

دیتی (ولئن سألتھم لیقولن انما کنا نخوض و نلعب)[۱]

اصل میں یہ ایک اڈکھی راہ فرار تھی۔ سوچ سمجھ کر سازشیں کرتے تھے اور زہریلی باتیں اس ارادے سے کرتے کہ اگر ان کا راز ظاہر نہ ہوا اور ان کا منحوس مقصد پورا ہو گیا تو اپنی دلی مراد پا لیں گے اور اگر بھانڈا پھوٹ گیا تو اپنے اسرار کو ہنسی مذاق کے پردے میں چھپا لیں گے اور جھوٹ موٹ بہانہ بازیاں کر کے رسول اکرمؐ اور لوگوں کی طرف سے سزا اور ردعمل سے بچ جائیں گے۔

اس زمانے کے منافق بلکہ ہر زمانے کے منافقوں کے منصوبے ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں اس طریقے سے وہ بہت سے فائدے اٹھاتے ہیں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن مقاصد کے وہ سختی سے پابند ہوتے ہیں انہیں عام مذاق اور دل لگی کے لباس میں پیش کرتے ہیں اگر اپنا مقصد پا لیا تو کیا کہنے ورنہ مذاق اور خوش طبعی کے بہانے سزا کے چنگل سے بچ جاتے ہیں۔

لیکن قرآن انہیں یقینی سزا دینے کا اعلان کرتا ہے اور رسالت مآبؐ کو حکم دیتا ہے کہ ان سے کہہ دو کیا تم خدا، اس کی آیتوں اور اس کے رسول کا مذاق اڑاتے ہو اور اس سے استہزاء اور دل لگی کرتے ہو (قل اباللہ و ایاتہ و رسولہ کنتم تستھزءون)۔ یعنی کیا ہر ایک سے مذاق کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا، پیغمبر اور آیات قرآن کے ساتھ بھی؟ کیا پختہ ترین اسلامی اصول بھی ہنسی مذاق کے لائق ہیں؟ کیا حضرت رسول اکرمؐ کی دشمنی کو بھڑکانا اور بھگانا اور اس خطرناک گھاٹی میں پیغمبرؐ کا گرانا۔ ایسی چیزیں ہیں جن کو مذاق کے پردے میں چھپایا جا سکے؟

یا آیات خداوندی کا مذاق اڑانا اور پیغمبرؐ کی آئندہ کامیابیوں کی پیش گوئیوں پر پھبتیاں کسنا بھی مزاح سمجھا جا سکتا ہے۔ سب باتیں گواہی دیتی ہیں کہ وہ خطرناک ارادے رکھتے تھے جنہیں ان پردوں میں چھپانا چاہتے تھے۔

اس کے بعد خداوند عالم نے اپنے پیغمبرؐ کو حکم دیا ہے کہ منافقوں سے صراحت کے ساتھ کہہ دو کہ "ان فضول اور جھوٹے بہانوں سے باز آجاؤ" (لا تعتذروا)۔

"کیونکہ تم نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کر لی ہے (قد کفرتم بعد ایمانکم)۔"

اس بات سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ بالا گروہ شروع سے منافقوں کی صف میں نہ تھا بلکہ یہ لوگ کمزور ایمان رکھنے والوں کی صف میں تھے لیکن مندرجہ بالا واقعہ کے بعد انہوں نے کفر کا راستہ اختیار کر لیا۔

مندرجہ بالا جملے کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جماعت اس سے پہلے بھی منافقوں کی صف میں داخل تھی لیکن کیونکہ ان سے ظاہراً کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی اس لیے پیغمبرؐ اور مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ ان سے مومنوں کا سا سلوک کریں لیکن جب جنگ تبوک کے واقعہ کے بعد پردہ ہٹا اور ان کا کفر و نفاق ظاہر ہو گیا تو انہیں اس امر سے خبردار کیا گیا کہ تم آئندہ مومنین کی صف میں شمار نہ ہو گے۔ آخرکار آیت کو اس جملے پر ختم کیا گیا ہے: اگر ہم تم میں سے ایک جماعت کو بخش دیں تو دوسرے گروہ کو اس بنا پر کہ وہ مجرم ہے سزا دیں گے (ان نعف عن طائفۃ منکم نعذب طائفۃ بانھم کانوا مجرمین)۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ ہم ایک گروہ کو ان کے جرم و خطا کی پاداش میں سزا دیں گے یہ اس بات کی دلیل ہے

۱۔ "نخوض" (بروزن "حوض") جیسا کہ کتب لغت میں ہے، آہستہ آہستہ پانی میں داخل ہونے کے معنی میں ہے بعد ازاں اطلاق کنایۃً مختلف کاموں میں داخل ہونے کے معنی میں ہونے لگا لیکن قرآن میں زیادہ تر بے کار شروع کرنے اور بری باتوں کا سلسلہ شروع کرنے کے مفہوم میں آیا ہے۔

ایسے لوگ قابلِ معافی ہیں جنھوں نے گناہ اور جرم کی نشانیوں کو توبہ کے پانی سے دھو ڈالا ہے۔ آئندہ آیات مثلاً آیہ ۷۴ میں بھی اس بات کا قرینہ پایا جاتا ہے۔ اس آیت کے ضمن میں بہت سی روایتیں ہیں جو اس امر کی حکایت کرتی ہیں کہ ان منافقوں میں سے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہو چکا ہے بعض اپنے کیے پر پشیمان ہوئے اور انھوں نے توبہ کی۔ لیکن کچھ دوسرے منافق اپنے طریقے پر ڈٹے رہے۔ مزید وضاحت کے لیے تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۳۹ ملاحظہ فرمایے۔

۶۷۔ اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ
بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ
اَيْدِيَهُمْ ۭ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۭ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ
الْفٰسِقُوْنَ ۝

۶۸۔ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ۭ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ۙ

۶۹۔ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا
وَّاَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ
بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ
وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

۷۰۔ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ
وَّثَمُوْدَ ڏ وَقَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ۭ
اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

ترجمہ

۶۷۔ منافق مرد اور عورتیں سب ایک ہی گروہ سے ہیں وہ بُرے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو (سخاوت اور بخشش سے) باندھ لیتے ہیں انھوں نے خدا کو فراموش کر دیا ہے اور خدا نے ان کو بھلا دیا ہے (اس نے اپنی رحمت ان سے منقطع کرلی ہے) یقیناً منافق فاسق ہیں۔

۶۸۔ خدا نے منافق مردوں اور عورتوں اور کافروں کے لیے جہنم کی آگ کا وعدہ کیا ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ وہی ان کے لیے کافی ہے اور خدا نے انھیں اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے اور ان کے لیے ہمیشہ کا عذاب ہے۔

۶۹۔ (تم منافق لوگ) ان افراد کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے (اور انھوں نے نفاق کا راستہ اختیار کیا تھا) وہ تم سے زیادہ طاقت ور تھے اور مال اور اولاد کے لحاظ سے تم سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ انھوں نے (دنیا میں ہوا و ہوس اور گناہ کے ذریعے) اپنے حصے سے استفادہ کیا۔ تم نے بھی (اسی طرح) اپنے حصے سے استفادہ کیا ہے جیسا کہ انھوں نے استفادہ کیا تھا تم (کفر، نفاق اور مومنین کا مذاق اڑانے میں) مگن ہو جیسے وہ مگن تھے (لیکن آخر کار) ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں ملیامیٹ ہو گئے اور وہ خسارے میں ہیں۔

۷۰۔ کیا انھیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے تھے۔ قوم نوح، عاد، ثمود اور ابراہیم کی قوم اور اصحاب مدین (قوم شعیب) اور وہ شہر جو تہ و بالا ہوئے تھے (قوم لوط) کہ جن کے پیغمبر ان کی طرف روشن اور واضح دلیلوں کے ساتھ آئے تھے (لیکن انھوں نے پیغمبروں کی کوئی بات نہ مانی) خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔

تفسیر

مُنافقوں کی نشانیاں

ان آیتوں میں بھی اسی طرح منافقین کے چال چلن اور نشانیوں کے بارے میں بحث ہے۔

پہلی زیر بحث آیت میں خداوند عالم ایک امر کلی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ ہو سکتا ہے کہ نفاق کی روح مختلف شکلوں میں ظاہر ہو اور مختلف چہروں میں دکھائی دے ہو سکتا ہے شروع شروع میں متوجہ نہ کرے۔ خاص طور پر ہو سکتا ہے کہ روح نفاق کا اظہار ایک مرد کی نسبت ایک عورت میں مختلف طرح سے ہو۔ لیکن نفاق کے سروں کے تغیر و تبدل سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے بلکہ غور و فکر کرنے سے بخوبی یہ بات

روشن ہوجاتی ہے کہ وہ سارے صفات کے لحاظ سے ایک ہی سلسلے میں جو ان کی قدر مشترک سمجھی جاتی ہے، شریک ہیں۔ اس لیے قرآن کہتا ہے، منافق مرد اور منافق عورتیں ایک ہی قماش کے ہیں (المنافقون والمنافقات بعضھم من بعض)۔ اس کے بعد ان کی پانچ صفات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

پہلی اور دوسری صفت یہ ہے کہ وہ لوگوں کو برائیوں پر ابھارتے ہیں اور نیکیوں سے روکتے ہیں (یأمرون بالمنکر وینھون عن المعروف)۔ یعنی بالکل سچے مومنین کے طریقے کے اُلٹ جو ہمیشہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے طریقے سے معاشرے کی اصلاح اور اسے نجاست اور گناہ سے پاک کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ منافق ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر جگہ پر فساد پھیل جائے اور معروف اور نیکی معاشرے سے ختم ہوجائے تاکہ وہ اس قسم کے ماحول میں اپنے بُرے مقصد بہتر طریقے سے حاصل کرسکیں۔

تیسری صفت یہ ہے کہ وہ دینے والا ہاتھ نہیں رکھتے بلکہ اپنے ہاتھوں کو باندھے ہوئے ہیں وہ راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور نہ محروم اور بے کس لوگوں کی مدد کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے رشتہ دار اور دوست آشنا بھی ان کی مالی مدد سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے (ویقبضون ایدیھم)۔

واضح ہے چونکہ وہ آخرت پر اور انفاق کے نتیجے اور جزا پر ایمان نہیں رکھتے۔ اس لیے مال خرچ کرنے میں بہت ہی بخیل ہیں۔ اگرچہ وہ اپنے بُرے اغراض و مقاصد تک پہنچنے کے لیے بہت زیادہ مال خرچ کرتے ہیں یا ریاکاری اور دکھلاوے کے طور پر سخاوت اور بخشش کرتے ہیں لیکن وہ خدا کے نام پر خلوصِ دل سے کبھی کوئی نیک کام نہیں کرتے۔

چوتھی صفت یہ ہے کہ ان کے تمام کام، گفتار اور کردار بتاتے ہیں کہ وہ خدا کو بھول چکے ہیں۔ نیز ان کے طرزِ زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ "خدا نے بھی ان کو اپنی برکات، توفیقات اور نعمات سے فراموش کر دیا ہے" اور ان دونوں فراموشیوں کے آثار ان کی زندگی سے آشکار ہیں (نسوا اللہ فنسیھم)۔ واضح ہے کہ "نسیان" کی نسبت خدا کی طرف واقعی اور حقیقی بھلا دینے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ان کے ساتھ بھلا دینے والے شخص کا سا سلوک کرتا ہے۔ یعنی انھیں اپنی رحمت اور توفیق سے دُور رکھتا ہے۔

یہ معاملہ روزمرہ کی باتوں میں بھی پایا جاتا ہے مثلاً ہم کہتے ہیں کہ چونکہ تو اپنی ذمہ داری کو بھول چکا ہے لہٰذا ہم بھی مزدوری اور بدلے کے وقت تجھے بھول جائیں گے یعنی تجھے مزدوری اور بدلہ نہیں دیں گے یہی مفہوم روایات اہل بیتؑ میں بارہا بیان ہوا ہے[1]

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ خداوندِ عالم کی بھول کا موضوع ان کے نسیان پر فاء تفریع کے ساتھ عطف ہے۔ یعنی خدا کی پاک ذات اور اس کے حکم کو بھلا دینے کا یہ اثر ہے کہ خدا بھی انھیں اپنی رحمتوں اور نعمتوں سے محروم کر دیتا ہے اور یہ ان کے اپنے عمل کا نتیجہ ہے۔

پانچویں صفت یہ ہے کہ یہ منافق فاسق ہیں اور اطاعتِ خداوندی کے دائرے سے خارج ہیں (ان المنافقین ھم الفاسقون)۔

جو کچھ مندرجہ بالا آیت میں منافقین کی مشترک صفات کے بارے میں کہا جا چکا ہے وہ ہر زمانے میں دیکھا جاتا ہے ہمارے زمانے کے منافق اپنے خود ساختہ نئے اور جدید چہروں کے باوجود مذکورہ اصولوں کی رُو سے گذشتہ صدیوں کے منافقوں کی طرح ہیں وہ برائی اور فساد کیطرف ابھارتے ہیں اور اچھے کاموں سے روکتے ہیں بخیل اور کنجوس بھی ہیں اور اپنی زندگی کے تمام پہلوؤں میں خدا کو بھول چکے ہیں وہ قانون شکن اور فاسق بھی ہیں اور نرالی بات یہ ہے کہ ان تمام عیوبوں کے باوجود خدا پر ایمان اور دینی اصولوں اور اسلامی بنیادوں پر یقین محکم کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اسکا مع

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۲۳۹، ۲۴۰ ملاحظہ فرمائیے۔

آیت میں ان کی سخت اور دردناک سزا اس مختصر سے جملے میں بیان کی گئی ہے۔ خدا منافق مردوں، منافق عورتوں، تمام کافروں اور بے ایمان افراد کے لیے جہنم کی آگ کا وعدہ کرتا ہے (وعد الله المنافقین والمنافقات والکفار نار جهنم)۔

وہ جلانے والی آگ کہ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے (خالدین فیها)۔

اور یہی ایک سزا جو طرح طرح کے عذاب لیے ہوئے ہے ان کے لیے کافی ہے (هی حسبهم) دوسرے لفظوں میں انھیں کسی اور سزا کی ضرورت نہیں کیونکہ جہنم میں ہر قسم کا جسمانی اور روحانی عذاب موجود ہے۔

اور آیت کے آخر میں یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ "خدا نے انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے اور ہمیشہ کا عذاب ان کے نصیب میں ہے" (ولعنهم الله ولهم عذاب مقیم)۔

بلکہ یہ خدا سے دوری خود عظیم ترین عذاب اور دردناک ترین سزا شمار ہوتی ہے۔

تاریخ کا ذکر اور درسِ عبرت

اس آیت میں منافقین کی جماعت کو بیدار کرنے کے لیے ان کے چہرے کے سامنے تاریخ کا آئینہ رکھ دیا گیا ہے اور ان کی زندگی کا گذشتہ باغی منافقوں سے مقابلہ اور موازنہ کر کے مؤثر درسِ عبرت دیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ "تم گذشتہ منافقوں کی طرح ہو اور اسی بُرے راستے اور بد سرنوشت کے پیچھے پڑے ہوئے ہو (کالذین من قبلکم) انھی لوگوں کی طرح جو قوت وطاقت میں تم سے زیادہ اور مال و دولت کی رُو سے تم سے بہت آگے تھے (کانوا اشد منکم قوة واکثر اموالا واولادا)۔ دنیا میں وہ اپنے حصہ میں سے شہوات نفسانی، گندگی، گناہ، فتنہ و فساد اور تباہ کاریوں سے بہرہ ور ہوئے۔ تم بھی جو اس اُمت کے منافق ہو گزرے ہوئے منافقین کی طرح ہی حصہ دار ہو (فاستمتعوا بخلاقهم فاستمتعتم بخلاقکم کما استمتع الذین من قبلکم بخلاقهم)۔

"خلاق" لغت میں نصیب اور حصہ کے معنی میں ہے جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے یہ "خلق" سے لیا گیا ہے (یعنی اس جہت سے انسان اپنا نصیب اپنے خلق وخو کے مطابق اس دنیا میں حاصل کرتا ہے) اس کے بعد فرمایا گیا ہے: "تم کفر و نفاق میں اور مومنین کا مذاق اڑانے میں مگن ہو جیسا کہ ان امور میں وہ لوگ ڈوبے ہوئے تھے (وخضتم کالذی خاضوا)[1] آخر میں پیغمبر کے منافقوں اور دنیا کے سب منافقوں کو بیدار کرنے کے لیے گزرے ہوئے منافقین کا انجام دو جملوں میں بیان کیا گیا ہے۔

پہلا یہ کہ وہ ایسے لوگ ہیں جن کے دنیا و آخرت میں سب اعمال تباہ و برباد ہوئے ہیں اور برباد ہوں گے اور انھیں اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں ملے گا (اولئک حبطت اعمالهم فی الدنیا والآخرة)۔

---

[1] "کالذی خاضوا" در اصل "کالذی خاضوا فیه" ہے یا دوسرے لفظوں میں آج کل کے منافقین کے عمل کی تشبیہ گزرے ہوئے منافقین کے عمل سے ہے جیسے کہ گذشتہ جملے میں ان کے نعمات الٰہی سے راہِ شہوات وخواہشات میں فائدہ اٹھانے کو گزرے ہوئے منافقوں کے طرزِ عمل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس بنا پر ایک شخص کی دوسرے شخص سے تشبیہ نہیں ہے کہ ہم مجبور ہو کر "الذی" کو "الذین" (یعنی مفرد کی جمع) کے معنی میں لیں بلکہ عمل کو عمل سے تشبیہ دی گئی ہے۔

وہ شرارت پسند گروہ اصلی اور حقیقی نقصان اٹھانے والے ہیں (واولٰئک ھم الخاسرون)۔

ممکن ہے کہ وہ اپنے منافقانہ اعمال سے وقتی اور عارضی محدود فائدے حاصل کریں لیکن اگر ہم گہرے طور پر غور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ اس طریقے سے نہ دنیا میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور نہ آخرت میں انھیں کوئی فائدہ ہوگا۔ جیسا کہ اقوام گزشتہ کی تاریخ اس حقیقت کو واضح کر رہی ہے کہ کس طرح نفاق کی بدبختیاں ان سے وابستہ ہو کر رہ گئیں اور انہیں زوال اور پستی کی طرف لے گئیں اور ان کے بُرے انجام اور بری عاقبت نے عالم آخرت میں ان کی بدبختی ظاہر اور واضح کر دی۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ باوجود تمام وسائل اور مال اولاد کے ہوتے ہوئے کامیابی تک نہ پہنچ سکے اور ان کے سب اعمال بے بنیاد ہونے کی وجہ سے اور نفاق کے زیر اثر نابود ہو گئے تو پھر تم جو کہ قوت اور طاقت کے لحاظ سے کمتر ہو اس قسم کی بدقسمتی اور ناکامی میں اور بھی بری طرح سے پھنسو گے۔

اس کے بعد خداوند عالم پیغمبر اکرمؐ کی طرف بات کا رخ موڑتے ہوئے استفہام انکاری کے طور پر یوں فرماتا ہے:

"کیا منافقوں کا یہ گروہ گزشتہ استوں قوم نوح، عاد، ثمود اور قوم ابراہیم اور اصحاب مدین (قوم شعیب) اور قوم لوط کے ویران و برباد شہروں کے حال سے باخبر نہیں ہے" (الم یأتھم نبأ الذین من قبلھم قوم نوح وعاد وثمود و قوم ابراھیم واصحاب مدین والمؤتفکات)

یہ قومیں جن کا ایک عرصہ تک دنیا کے اہم حصوں پر اقتدار رہا۔ ان میں سے ہر ایک تباہ کاری، نافرمانی، سرکشی، بے انصافی، طرح طرح کے ظلم و ستم اور فساد کی وجہ سے کسی نہ کسی عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئی۔

قوم نوح طوفان کی تباہ کن موجوں سے اور قوم عاد (قوم ہود) تیز اور وحشتناک آندھیوں کے ذریعے، قوم ثمود (قوم صالح) ویران گر زلزلوں سے، قوم ابراہیم گوناگوں نعمتوں کی محرومی سے، اصحاب مدین (قوم شعیب) آگ برسانے والے بادل سے اور قوم لوط اپنے شہروں کے زیر و زبر ہونے سے تباہ و برباد ہوئی۔ صرف ان کے بے جان جسم اور بوسیدہ ہڈیاں مٹی کے نیچے یا پانی کی موجوں میں باقی رہ گئیں۔

یہ وہ دل دہلا دینے والے واقعات و حوادث ہیں جن کا مطالعہ اور آگاہی ہر اس انسان کو جو ذرا سا بھی احساس رکھتا ہے جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

اگرچہ خدا نے کبھی بھی انھیں اپنے لطف و کرم سے محروم نہیں رکھا اور ان کے نبیوں کو واضح دلیلوں کے ساتھ ان کی ہدایت کے لیے بھیجا (اتتھم رسلھم بالبینات) لیکن انھوں نے ان عالی رتبہ بزرگوں کے کسی موعظہ اور نصیحت پر کان نہ دھرے اور مخلوق خدا کی نصیحت و ہدایت کی راہ میں ان کی ناقابل برداشت تکلیفوں کو ذرہ برابر اہمیت نہ دی۔ اس بنا پر خدا نے کبھی ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود اپنے آپ پر ظلم و جور روا رکھا۔ (فما کان اللّٰہ لیظلمھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون)۔

۱؎ مؤتفکات "ائتفاک" کے مادہ سے انقلاب، تبدیلی اور زیر و زبر ہونے کے معنی میں ہے۔ قوم لوط کے شہروں کی طرف اشارہ ہے جو زلزلہ کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئے تھے۔

۷۱۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ
بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ
وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ
سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝
۷۲۔ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ
جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ
الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝

ترجمہ

۷۱۔ ایماندار مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے ولی (دوست اور مددگار) ہیں وہ اچھے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کاموں سے روکتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور خدا و رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ خدا عنقریب ان پر رحمت کریگا بے شک خدا توانا و حکیم ہے۔

۷۲۔ خدا نے مومن مردوں اور عورتوں سے ایسے جنت کے باغوں کا وعدہ کیا ہوا ہے جن کے (درختوں کے) نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ ان ہی میں رہیں گے اور عدن کی جنتوں میں (ان کے لیے) پاکیزہ مساکن ہیں اور خدا کی رضا (اور خوشنودی ان سب سے) برتر و بہتر ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

تفسیر

سچے مومنوں کی نشانیاں

گزشتہ آیتوں میں منافق مردوں اور عورتوں کی مشترکہ علامتیں بیان کی گئی تھیں۔ جن کا خلاصہ پانچ حصوں میں ہوتا ہے:

۱۔ بری چیزوں کا حکم دینا،

۲۔ اچھی چیزوں سے روکنا ـــــــ ،

۳۔ کنجوسی اور بخیلی ـــــــ ،

۴۔ خدا کو بھول جانا ـــــــ اور

۵۔ حکم خدا کی نافرمانی ـــــــ ۔

ان آیات میں مومن مردوں اور عورتوں کی نشانیاں بتائی گئی ہیں اور وہ بھی پانچ حصّوں ہی میں ہیں اور بالکل منافقوں کی صفات کے مقابلے میں ہیں آیت یہاں سے شروع ہوتی ہے :

" باایمان مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے دوست ولی یار اور مددگار ہیں (والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولیاء بعض)"۔

توجہ کے قابل یہ بات ہے کہ منافقین کے لیے لفظ " اولیاء " نہیں آیا بلکہ " بعضهم من بعض " ہے جو بظاہر غرض و نیات کی وحدت اور صفات و کردار کی یکسانیت کی دلیل دکھائی دیتا ہے یہ اس طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اگرچہ منافق ایک ہی صف میں ہیں اور ان کے مختلف گروہ ایک ہی قسم کے منصوبوں اور پروگراموں میں مصروف ہیں پھر بھی ان میں محبت، مودت اور ولایت کی روح موجود نہیں۔ جب انکی شخصی اغراض خطرے میں پڑ جاتی ہیں تو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بھی بے ایمانی کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ہم سورہ حشر کی آیت ۱۴ میں پڑھتے ہیں:

تحسبهم جمیعًا وقلوبهم شتّٰی

تم انھیں متفق اور متحد سمجھتے ہو، حالانکہ ان کے دل پراگندہ اور مختلف ہیں

خداوند عالم اس حقیقت کو بیان کرنے کے بعد مومنین کی صفات کی جزئیات کی تشریح کرتا ہے۔

۱۔ پہلے فرماتا ہے : وہ لوگوں کو نیکی کی طرف بلاتے ہیں (یأمرون بالمعروف)۔

۲۔ لوگوں کو بدی، برائی اور گناہ سے روکتے ہیں (وینهون عن المنکر)۔

۳۔ وہ منافقوں کے برخلاف جنھوں نے خدا کو بھلا رکھا تھا " نماز قائم کرتے ہیں " اور خدا کو یاد کرتے ہیں اور اس کی عبادت اور ذکر سے دل کو روشن اور عقل کو بیدار اور خبردار کیے ہوئے ہیں (ویقیمون الصلٰوة)۔

۴۔ وہ منافقوں کے برخلاف جو کنجوس اور بخیل لوگ تھے، اپنے مال کا ایک حصّہ راہِ خدا میں اور خلقِ خدا کی فلاح و بہبودی اور معاشرے کی تشکیل نو کے لیے خرچ کرتے ہیں (ویؤتون الزکٰوة)۔

۵۔ منافق، فاسق اور سرکش ہیں اور خداوند عالم کے حکم کی پیروی نہیں کرتے لیکن مومن خدا اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرتے ہیں (ویطیعون الله ورسوله)۔

اس آیت کے آخر میں خداوند عالم نتیجے اور بدلے کے طور پر مومنوں کے پہلے امتیاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : خدا عنقریب ان پر اپنی رحمت نازل کرے گا (اولٰئک سیرحمهم الله)۔

لفظ " رحمت " جس کا ایک مقام پر ذکر ہوا ہے ایک بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے جو دین و دنیا کی ہر قسم کی خیر و برکت اور نیکی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ لفظ اصل میں منافقین کی حالت کی ضد ہے یعنی خدا نے ان پر لعنت کی ہے لہٰذا انھیں اپنی رحمت سے دور

کر دیا ہے۔

بے شک مومنین سے خدا کا وعدہ رحمت یقینی اور اطمینان بخش ہے کیونکہ وہ قدرت رکھتا ہے اور دانا و حکیم بھی ہے لہٰذا وہ کسی سبب کے بغیر وعدہ کرتا ہے اور نہ ہی جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے پورا کرنے سے عاجز ہے (ان اللہ عزیز حکیم)۔

بعد والی آیت خدا کی اس وسیع رحمت کے ایک حصّہ کی جو ایماندار لوگوں کے لیے ہے، تشریح کرتی ہے۔ اس میں اس رحمت کے مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں کا تذکرہ ہے۔ شروع میں فرمایا گیا ہے، خدا ایمان دار مردوں اور عورتوں سے ایسے بہشت کے باغوں کا وعدہ کرتا ہے جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں (وعد اللہ المؤمنین والمؤمنات جنات تجری من تحتها الانهار) اس عظیم نعمت کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ زوال، فنا اور جدائی کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور وہ ہمیشہ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے (خالدین فیها)۔

ان پر اللہ کا دوسرا احسان یہ ہوگا کہ خدا انھیں بہشت عدن کے مرکز میں پاکیزہ مسکن اور شاندار مکان عطا فرمائے گا (ومساکن طیبة فی جنات عدن)۔

لغت میں "عدن" کے معنی کسی مکان اور جگہ میں ٹھہرنے اور زندگی گزارنے کے ہیں۔ اس لیے "معدن" کسی خاص مواد کی بقا کی جگہ کے معنی میں بولا جاتا ہے اس بناء پر "عدن" کا مفہوم و مطلب خلود (ہمیشگی) کے ساتھ مشابہت رکھتا ہے لیکن کیونکہ گزشتہ جملہ میں خلود کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے تو اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ "جنات عدن" پروردگار کی بہشت کا ایک خاص مقام ہے۔ جو دیگر سب بہشتوں سے ممتاز ہے۔

اسلامی حدیثوں اور مفسرین کی تفسیر میں یہ امتیاز مختلف شکلوں میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؐ کی ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

عدن دار اللہ التی لم ترها عین ولم یخطر علی قلب بشر، لا یسکنها غیر ثلاثة النبیین والصدیقین والشهداء

"عدن خدا کا وہ گھر ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ اس کا خیال کسی کے دل و دماغ میں آیا ہے اور اس میں صرف تین گروہ سکونت پذیر ہوں گے۔ انبیاء، صدیقین (وہ کہ جنھوں نے انبیاء کی تصدیق کی ہے اور ان کی حمایت کی ہے) اور شہداء"[1]

کتاب خصائل میں حضرت رسول اکرمؐ سے اس طرح مروی ہے:۔

من سره ان یحیا حیاتی ویموت مماتی ویسکن جنتی التی وعدنی اللہ ربی جنات عدن ...... فلیوال علی بن ابی طالب علیه السلام و ذریته علیهم السلام من بعده

"جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی مجھ جیسی اور موت بھی مجھ جیسی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ علی بن ابی طالبؑ اور ان کی اولاد سے محبت کرے"۔[2]

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں

[2] نور الثقلین ج ۲ ص ۲۴۱ بحوالہ کتاب خصال

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ جنات عدن بہشت بریں کے ایسے باغات ہیں جن میں رسالت مآبؐ اور ان کے خاص پیروکاروں کی ایک جماعت مقیم ہوگی۔

یہی مضمون ایک اور حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے بھی منقول ہے کہ جنات عدن پیغمبر اسلامؐ کے قیام کا مقام ہے۔

اس کے بعد خداوند عالم ان کی روحانی نعمتوں اور جزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے، خدا کی رضا اور خوشنودی جو ان سچے مومنوں کو نصیب ہوگی سب سے برتر اور عظیم ہے (ورضوان من اللہ اکبر)۔

کوئی شخص اس روحانی لذت اور خوشی کے احساس کی جسے ایک انسان خدا کی رضا کی طرف متوجہ ہونے سے پاتا ہے تعریف و توصیف نہیں کرسکتا۔ بعض مفسرین کے قول کے مطابق اس روحانی لذت کا ایک گوشہ سب بہشتوں اور ان کی گوناگوں نعمتوں اور بے پایاں آسائشوں سے برتر اور بالاتر ہے۔ البتہ ہم اس دنیا کے قفس میں اور اس کی محدود زندگی میں اس کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتے۔ چہ جائیکہ اس عظیم روحانی اور معنوی نعمت کو سمجھ سکیں۔

البتہ اس دنیا کے روحانی اور مادی فرق کی ایک دھندلی سی تصویر کھینچ سکتے ہیں مثلاً جو لذت مسلسل فراق وجدائی کے بعد ایک مخلص اور مہربان دوست کی ملاقات سے ملتی ہے یا ایک خاص روحانی خوشی جو لگاتار کئی ماہ و سال صرف کرنے کے بعد کسی پیچیدہ مسئلہ کے حل ہونے سے حاصل ہوتی ہے یا وہ نشاط افزاء جذبہ جو کسی خاص عبادت اور حضور قلب سے مناجات پڑھنے سے حاصل ہو۔ وہ کسی مادی غذا اور مادی لذتوں سے کوئی نسبت نہیں رکھتا۔

یہاں یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ وہ لوگ جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن مومنین اور نیک لوگوں کی جزا اور ثواب بیان کرتے وقت صرف مادی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے اور معنوی جذبات کا اس میں کوئی ذکر اور خبر نہیں ہے وہ اشتباہ اور غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ کیونکہ مندرجہ بالا جملے میں خدا کی رضا جو خصوصیت کے ساتھ لفظ "نکرہ" کے ساتھ بیان کی گئی ہے، خداوند عالم کی خوشنودی کے ایک خاص گوشے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ بہشت کی تمام مادی نعمتوں سے افضل و اعلیٰ ہے اور یہ چیز اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ وہ معنوی جزا کس قدر قیمتی اور اہم ہے۔

البتہ اس کی برتری کا سبب واضح اور روشن ہے کیونکہ حقیقت میں روح ایک گوہر کی مانند ہے اور جسم صدف کی طرح ہے۔ روح حاکم ہے اور جسم محکوم، روح کا ارتقاء اصلی اور بنیادی مقصد ہے جبکہ جسم کی تکمیل وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر روح کی تمام شایانِ جسم سے زیادہ وسیع ہیں اور روحانی لذتوں کا قیاس جسمانی لذتوں پر نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح روحانی مصیبتیں اور تکلیفیں جسمانی آلام و مصائب کے مقابلے میں بدرجہا دردناک ہیں۔

آیت کے آخر میں تمام مادی اور روحانی نعمتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے (ذٰلک ھو الفوز العظیم)۔

۷۳۔ یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ

وَمَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○

ترجمہ

۷۳۔ اے پیغمبر! کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کرو، ان پر سختی کرو، ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور ان کا انجام کیسا بُرا ہے۔

تفسیر

کافروں اور منافقوں سے جنگ

آخرکار اس آیت میں کافروں اور منافقوں کے مقابلے میں شدت کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے پیغمبر! کفار و منافقین کے ساتھ جہاد کرو (یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ) اور ان کے مقابلے میں سخت اور شدید طریقہ اختیار کرو" (وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ)۔
یہ تو ان کی دنیاوی سزا ہے اور آخرت میں ان کے رہنے کی جگہ دوزخ ہے۔ جو بدترین انجام اور بُرا ٹھکانا ہے (وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ)۔

البتہ کافروں کے مقابلے میں جہاد کا طور طریقہ تو بالکل واضح ہے اور وہ ہر پہلو سے جہاد ہے۔ خصوصاً مسلح جہاد۔ لیکن منافقوں سے جہاد کے طریقہ میں اختلاف ہے۔ کیونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ رسولِ اکرمؐ منافقوں سے مسلح جہاد نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ منافق وہ شخص ہے جو ظاہری طور پر مسلمانوں کی صف میں ہو اور بظاہر تمام آثارِ اسلام کا پابند ہو۔ اگرچہ باطنی طور پر اسلامی احکام کی خلاف ورزی کرتا ہو۔ چنانچہ ہم بہت سے لوگوں کو جانتے ہیں کہ وہ ایمانِ حقیقی نہیں رکھتے لیکن کیونکہ وہ اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اس لیے ہم ان سے غیر مسلموں کا سا برتاؤ نہیں کرسکتے۔ بنابریں جس طرح اسلامی روایات اور مفسرین کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے منافقوں سے جہاد کرنے سے مراد اور طرح کی جنگ ہے جو مسلح جنگ کے علاوہ ہے۔ مثلاً مذمت، سرزنش، تہدید اور انھیں رسوا کرنا۔ شاید "وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ" اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔

ہاں آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ جب تک منافقوں کی حقیقت اور ان کے خفیہ منصوبے منظرِ عام پر نہ آجائیں ان کے بارے میں مسلمانوں سے متعلق احکام پر عمل کیا جائے گا۔ لیکن جب ان کی حالت اچھی طرح معلوم ہوجائے تو پھر ان پر کفارِ حربی کا حکم لاگو ہوجائے گا اور اس صورت میں ان سے مسلح جنگ بھی کی جاسکتی ہے۔ لیکن جو بات اس احتمال کو کمزور کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں "منافق" کے لفظ کا اطلاق اس پر درست نہیں ہے۔ بلکہ اب وہ کفارِ حربی کی صف میں ہے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ منافق وہ ہے جس کا ظاہر اسلام ہو اور باطن کفر۔

۷۴۔ يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا ۚ وَلَقَدْ قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ
وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا ۚ وَمَا
نَقَمُوا إِلَّا أَنْ أَغْنَاهُمُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ مِنْ فَضْلِهِ ۚ فَإِنْ
يَتُوبُوا يَكُ خَيْرًا لَهُمْ ۖ وَإِنْ يَتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا
أَلِيمًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِنْ
وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝

ترجمہ

۷۴۔ منافق خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ (پیغمبر کے پس پشت) انھوں نے (تکلیف دہ) باتیں نہیں کیں۔ حالانکہ یقیناً انھوں نے کفر آمیز باتیں کی ہیں اور اسلام لانے کے بعد وہ کافر ہو گئے ہیں اور انھوں نے (ایک خطرناک کام کا) پکا ارادہ کیا تھا جسے وہ نہ کر سکے وہ صرف اس بات کا انتقام لے رہے ہیں کہ خدا اور اس کے رسول نے صرف اپنے فضل (اور کرم) سے بے نیاز کر دیا ہے (اس کے باوجود) اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے لیے بہتر ہے، اور اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو خدا انھیں دنیا و آخرت میں دردناک سزا دے گا اور وہ روئے زمین پر نہ کوئی ولی و حامی رکھتے ہیں اور نہ ہی یار و مددگار۔

شانِ نزول

اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں مختلف روایتیں نقل ہوئی ہیں جو سب کی سب یہ ظاہر کرتی ہیں کہ بعض منافقوں نے اسلام اور پیغمبرؐ کے بارے میں تکلیف دہ باتیں کی تھیں اور اپنے راز فاش ہونے کے بعد انھوں نے جھوٹی قسم کھائی تھی کہ ہم نے کچھ نہیں کہا۔ غرض انھوں نے اسلام کے خلاف جو سکیم بنائی تھی وہ ناکام ہو گئی۔ ان کی باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ منافقوں میں سے جلاس نامی ایک شخص نے جنگِ تبوک کے موقع پر نبی اکرمؐ کے بعض خطبے سن کر ان کا حق سے انکار کر دیا تھا اور آپؐ کو جھٹلایا تھا۔

مدینہ میں آنے کے بعد ایک شخص عامر بن قیس جس نے یہ باتیں سنی تھیں، پیغمبرؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جلاس کی باتیں بیان کیں۔ لیکن جب وہ خود آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا تو اس نے اس کے بارے میں صاف انکار کر دیا۔ اس پر حضرت رسالتمآبؐ نے دونوں کو حکم دیا کہ وہ مسجد میں منبر کے پاس کھڑے ہو کر قسم کھائیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہے۔ دونوں نے قسم کھائی۔ مگر عامر نے عرض کیا کہ اے خدا! اپنے پیغمبر پر

آیت نازل فرما: اور جو شخص سچا ہے اس کی سچائی کو ظاہر کر دے اس پر پیغمبر اور مومنین نے آمین کہی۔ جبرئیل نازل ہوئے اور مندرجہ بالا آیت پیغمبر کی خدمت میں لائے جس وقت "فان یتوبوا یک خیرا لھم" (اگر وہ توبہ کریں تو ان کے لیے بہتر ہے) کا جملہ آیا تو "جلاس" نے کہا: اے خدا کے رسولؐ! پروردگار نے مجھ سے توبہ چاہی ہے اور میں اپنے گناہ پر پچھتا رہا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔ حضورؐ نے اس کی توبہ قبول کر لی۔

نیز جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں مفسرین نے نقل کیا ہے کہ منافقوں کے ایک گروہ نے پکا ارادہ کیا ہوا تھا کہ جنگِ تبوک سے واپسی پر راستے میں ایک درّے سے گزرتے ہوئے پیغمبرؐ کی اونٹنی کو بدکائیں گے تا کہ پیغمبر اکرمؐ پہاڑ کے اوپر سے درّے میں گر جائیں۔ لیکن آنحضرتؐ وحی کے ذریعے اس واقعہ سے آگاہ ہو گئے اور ان کی سازش کو نقش بر آب کر کے رکھ دیا۔ ناقہ کی مہار عمار کے ہاتھ میں دی اور "حذیفہ" پیچھے سے ناقہ کو ہانک رہے تھے تاکہ سواری پورے طور قابو میں رہے۔ یہاں تک کہ آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ دوسرے راستے سے آئیں تاکہ منافق لوگوں کے ہجوم میں چھپ سکیں اور نہ اپنی سازش پر عمل کر سکیں۔ جس وقت آپ نے اس رات کی تاریکی میں کچھ لوگوں کی اپنے پیچھے سے درّے میں آنے کی آواز سنی تو آپؐ نے اپنے بعض ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ فوراً ان منافقوں کو پلٹا دیں وہ تقریباً بارہ یا پندرہ افراد تھے اور ان میں سے بعض نے اپنے منہ چھپا رکھے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ہم اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتے تو وہ چھپ گئے لیکن پیغمبرؐ نے انھیں پہچان لیا اور ایک ایک کر کے سب کے نام اپنے صحابہ کرام کو گنوائے [1]

لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے یہ آیت منافقوں کے دو کاموں کی طرف اشارہ کر رہی ہے ایک ان کی نامناسب گفتگو اور دوسرا ان کی ناکام سازش۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دونوں شانِ نزول ایک ساتھ صحیح ہیں۔

تفسیر

خطرناک سازش

اس آیت کا گزشتہ آیات کے ساتھ تعلق بڑا واضح ہے کیونکہ یہ سب آیتیں منافقوں کے بارے میں ہیں البتہ اس آیت میں ان کے ایک اور عمل سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے راز فاش ہو رہے ہیں تو واقعات کا انکار کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اپنی بات کو سچ ثابت کرنے کے لیے جھوٹی قسمیں بھی کھا لیتے ہیں۔

پہلے خدا فرماتا ہے: منافقین قسم کھاتے ہیں کہ انھوں نے اس قسم کی باتیں پیغمبرؐ کے بارے میں نہیں کہیں (یحلفون باللہ ما قالوا) حالانکہ انھوں نے یقینی طور پر کفر آمیز باتیں کی ہیں (ولقد قالوا کلمۃ الکفر) اس طرح انھوں نے اسلام قبول کرنے اور اس کا اظہار کرنے کے بعد کفر کا راستہ اختیار کیا (وکفروا بعد اسلامھم) البتہ وہ پہلے بھی مسلمان نہیں تھے کہ اب کافر ہو گئے ہیں بلکہ وہ صرف ظاہری طور پر ہی مسلمان تھے۔ جسے انھوں نے کفر کا اظہار کر کے توڑ ڈالا۔ اس ظاہری اور دکھلاوے کے اسلام کو بھی انھوں نے کفر کا اظہار کر کے درہم برہم کر دیا ہے اس سے بھی بڑھ کر وہ خطرناک ارادہ لیے ہوئے تھے جن تک نہیں پہنچ سکے (وھموا بما لم ینالوا)

---

[1] اقتباس از تفسیر مجمع البیان، تفسیر المنار، تفسیر روح المعانی اور دیگر تفاسیر۔

ہو سکتا ہے ان کا یہ ارادہ "لیلۃ العقبۃ" پیغمبرؐ کو شہید کرنے کا ہو جس کی تشریح شان نزول میں ہو چکی ہے یا ان کے تمام کاموں کی طرف اشارہ ہو جنہیں وہ اسلامی معاشرے کو تباہ و برباد کرنے اور فساد و نفاق پیدا کرنے اور پھوٹ ڈالنے کے لیے انجام دیتے تھے لیکن انہیں کبھی بھی کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ مختلف حوادث میں مسلمانوں کی تیاری اور بیداری کے سبب منافق اور ان کے منصوبے پہچانے جاتے تھے۔ مسلمان ہمیشہ ان کی تاک میں لگے رہتے تھے تاکہ ان سے کوئی بات سنیں اور اس کی پیش بندی اور ضروری کارروائی کے لیے حضورؐ کی خدمت میں عرض کردیں۔ یہ بیداری اور برمحل اقدامات اور ان کے ساتھ ساتھ نزول آیات اور خدا کی تصدیق منافقوں کی رسوائی اور ان کی سازشوں کی ناکامی کا سبب بنتی تھی۔

بعد والے جملہ میں اس لیے کہ منافقوں کے کرتوت اور نمک حرامی کا گھٹیا پن اور برائی پوری طرح واضح ہو جائے، مزید فرمایا گیا ہے:۔ اصل میں انھوں نے پیغمبرؐ سے کوئی غلط کام نہیں دیکھا تھا نہ اسلام نے انھیں کوئی نقصان پہنچایا تھا بلکہ اس کے برعکس وہ حکومت اسلامی کے سایے میں طرح طرح کی مادی اور روحانی نعمتوں سے بہرہ ور ہوئے تھے۔ اس بنا پر وہ اصل میں ان نعمتوں کا انتقام لے رہے تھے جو خدا اور اس کے پیغمبرؐ نے اپنے فضل و کرم سے انھیں استغنا کی حد تک دی تھیں (وما نقموا الا ان اغناھم اللہ و رسولہ من فضلہ)۔[1]

اس میں شک نہیں کہ خدا کے فضل اور رسول اکرمؐ کی انتہائی مہربانی سے انھیں بے نیاز کر دینا، پھر ان کی ضرورتوں اور حاجتوں کا پورا کرنا کوئی ایسی چیز نہ تھی جو منافقوں کو اس پر ابھارے کہ وہ اس اچھے برتاؤ کا انتقام لیں بلکہ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ حق شناسی اور شکرگزاری سے کام لیتے لیکن ان بے وفا اور کمینے لوگوں نے خدمت و نعمت کا جواب جرم اور زیادتی سے دیا یہ بڑی خوب صورت اور بہترین تعبیر ہے جو بہت سی باتوں اور تحریروں میں استعمال ہوتی ہے جیسے ایک شخص کی ہم نے سالہا سال تک خدمت کی ہو اور اس کے بعد وہ خیانت کرے تو اس موقع پر کہتے ہیں کہ ہمارا گناہ صرف یہ ہے کہ ہم نے تجھے پناہ دی، تیری حفاظت کی اور بہت زیادہ محبت کی۔

اس کے بعد جیسا کہ قرآن کی سیرت ہے، لوٹ آنے کا راستہ ان کے لیے کھلا رکھتے ہوئے کہتا ہے، اگر وہ توبہ کرلیں تو ان کے لیے بہتر ہے (فان یتوبوا یک خیرا لھم)۔

یہ اسلام کی حقیقت بینی، تربیت کے اہتمام اور ہر قسم کی سختی اور نامناسب سلوک کے خلاف جنگ کی نشانی ہے۔ یہاں تک کہ ان منافقوں کے لیے جنھوں نے رسول اللہ کو ختم کرنے کی کوشش کی اور کفرآمیز باتیں کیں اور تکلیف دہ توہین کی نہ صرف صلح اور توبہ کی راہ کھلی رکھی ہے بلکہ انھیں توبہ کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ اصل میں اسلام کا حقیقی چہرہ ہے لیکن وہ لوگ کتنے ظالم ہیں جو اسلام کے اس خوبصورت اور حقیقی چہرے کا تعارف دباؤ اور سختی کے دین کے ساتھ کراتے ہیں۔

---

[1] یہ امر قابل توجہ ہے کہ مندرجہ بالا جملہ میں اگرچہ خدا اور پیغمبر دونوں کے فضل کے متعلق کہ رہے، " من فضلہ " لیکن اس میں ضمیر واحد استعمال ہوئی ہے نہ کہ تثنیہ کی شکل میں۔ اس تعبیر کا سبب وہی ہے جس کی طرف ہم گذشتہ مواقعوں میں اشارہ کر چکے ہیں۔ اس قسم کی تعبیریں حقیقت توحید کو ثابت کرنے کے لیے ہیں اور یہ کہ تمام کام اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اگر حضرت رسول اکرمؐ کوئی کام کرتے ہیں تو وہ بھی اس کے حکم سے ہے اور ان کا کام اس کے ارادے اور مشیت سے الگ نہیں ہے۔

کیا آج کی دنیا میں کوئی ایسی مہربان اور نرم خو حکومت مل سکتی ہے جو اپنے خلاف سازش کرنے والوں کے ساتھ ایسی مہربانی اور محبت کرنے کو تیار ہے جیسا کہ ہم شانِ نزول میں پڑھ چکے ہیں کہ نفاق انگیز منصوبہ بنانے والوں میں سے ایک نے یہ بات سن کر توبہ کرلی اور پیغمبر نے اس کی توبہ قبول بھی کرلی۔

اس کے باوجود اس بنا پر کہ کہیں وہ لوگ اس نرمی کو کمزوری پر محمول نہ کریں انھیں تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آئے اور توبہ سے منہ پھیر لیا تو خدا انھیں دنیا اور آخرت میں دردناک سزا دے گا (وان یتولوا یعذبھم اللہ عذابا الیما فی الدنیا والاخرۃ)۔

اگر وہ یہ سوچتے ہیں کہ ہوسکتا ہے خدا کی سزا کے مقابلے میں کوئی ان کی مدد کرے گا تو وہ انتہائی غلطی پر ہیں کیونکہ وہ روئے زمین پر کسی کو اپنا ولی، سرپرست اور یار و مددگار نہ پائیں گے (وما لھم فی الارض من ولی ولا نصیر)۔

البتہ ان کی آخرت کی سزا اور عذاب تو واضح ہے باقی رہا ان کے لیے دنیاوی عذاب تو وہ رسوائی، خواری اور بدبختی وغیرہ ہے۔

۷۵۔ وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○

۷۶۔ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○

۷۷۔ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○

۷۸۔ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ○

ترجمہ

۷۵۔ ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے خدا سے وعدہ کیا ہے کہ اگر خدا ہمیں اپنے فضل و کرم سے رزق دے تو ہم یقیناً صدقہ دیں گے اور شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔

۷۶۔ لیکن جب اس نے اپنے فضل سے انھیں بخش دیا تو انھوں نے بخل کیا اور نافرمانی کی اور وہ روگرداں ہو گئے۔

۷۷۔ اس عمل نے ان کے دلوں میں نفاق (کی روح) کو اس دن تک کے لیے جب وہ خدا کے سامنے ہوں گے باقی رکھا۔ کیونکہ انھوں نے خدا سے کئے ہوئے وعدے سے انحراف کیا اور وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

۷۸۔ کیا وہ نہیں جانتے کہ خدا ان کے بھیدوں اور سرگوشیوں کو جانتا ہے خدا سب چھپی ہوئی باتوں سے آگاہ ہے۔

شانِ نزول

مفسرین میں مشہور ہے کہ یہ آیتیں ایک انصاری ثعلبہ بن حاطب کے بارے میں نازل ہوئیں۔ وہ ایک غریب آدمی تھا۔ روزانہ مسجد میں آیا کرتا تھا اس کا اصرار تھا کہ رسولِ اکرمؐ دعا فرمائیں کہ خدا اس کو مالا مال کر دے۔ حضورؐ نے اس سے فرمایا:

قليل تؤدى شكره خير من كثير لا تطيقه

مال کی تھوڑی مقدار جس کا تو شکر ادا کر سکے اس مال کی کثرت سے بہتر ہے جس کا تو شکرانہ ادا نہ کر سکے کیا یہ بہتر نہیں کہ تو خدا کے پیغمبرؐ کی پیروی کرے اور سادہ زندگی بسر کرے۔

لیکن ثعلبہ مطالبہ کرتا رہا اور آخر کار اس نے پیغمبر اکرمؐ سے عرض کیا کہ میں آپؐ کو اس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے آپؐ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر خدا نے مجھے دولت عطا فرمائی تو میں اس کے تمام حقوق ادا کروں گا۔ چنانچہ آپؐ نے اس کے لیے دعا فرمائی۔

ایک روایت کے مطابق زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ اس کا ایک چچا زاد بھائی جو بہت مال دار تھا، فوت ہو گیا اور اسے بہت سی دولت ملی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اس نے ایک بھیڑ خریدی جس سے اتنی نسل بڑھی کہ جس کی دیکھ بھال مدینہ میں نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے انھیں مدینہ کے آس پاس کی آبادیوں میں لے گیا اور مادی زندگی میں اس قدر مصروف اور مگن ہو گیا کہ نماز با جماعت تو کیا نماز جمعہ میں بھی نہ آتا تھا ایک مدت کے بعد رسولِ اکرمؐ نے زکوٰۃ وصول کرنے والے خادم کو اس کے پاس زکوٰۃ لینے کے لیے بھیجا لیکن اس کم ظرف کنجوس نے نہ صرف خدائی حق کی ادائیگی میں پس و پیش کیا بلکہ شرع مقدس پر بھی اعتراض کیا اور کہا کہ یہ حکم جزیہ کی طرح ہے یعنی ہم اس لیے مسلمان ہوئے تھے کہ جزیہ دینے سے بچ جائیں۔ اب زکوٰۃ دینے کی شکل میں ہم میں اور غیر مسلموں میں کون سا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ حالانکہ اس نے نہ جزیہ کا مطلب سمجھا تھا اور نہ زکوٰۃ کا اور اگر اس نے سمجھا تھا تو دنیا پرستی اسے حقیقت کے بیان اور اظہارِ حق کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ طرف جب حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی باتیں سنیں تو فرمایا:

يا ويح ثعلبة! يا ويح ثعلبة!

وائے ہو ثعلبہ پر ہلاکت ہو ثعلبہ پر۔

اس وقت مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں

ان آیتوں کے لیے اور بھی شانِ نزول منقول ہیں جو کم و بیش ثعلبہ کی داستان سے ملتی جلتی ہیں۔ مذکورہ شانِ نزول اور آیات

سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ شخص یا اشخاص پہلے منافقوں کی صف میں شامل نہ تھے لیکن اس قسم کے اعمال اور کردار کی وجہ سے ان کے ساتھ مل گئے۔

تفسیر

منافق کم ظرف ہوتے ہیں

دراصل یہ آیتیں منافقوں کی ایک بری صفت کی نشاندہی کرتی ہیں اور وہ یہ ہے کہ وہ بے بس، ناتواں اور فقر و پریشانی کے وقت تو اس طرح ایمان کا دم بھرتے ہیں کہ کوئی شخص یہ باور ہی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی دن منافقوں کی صف میں جا کھڑے ہوں گے۔ یہاں تک کہ وہ ان لوگوں کو جو وسیع ذرائع آمدنی اور وسائل رکھتے ہیں اس بات پر مذمت کرتے ہیں کہ وہ اپنی وسائل سے محروم لوگوں کو کیوں فائدہ نہیں پہنچاتے۔ لیکن جب وہ خود صاحب ثروت ہو جاتے ہیں تو اپنے ہاتھ سمیٹ لیتے ہیں اور دنیا پرستی میں ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ خدا کے ساتھ کے ہوئے سب وعدوں کو بھول جاتے ہیں یعنی ان کی شخصیت بالکل بدل جاتی ہے اور ان کی سوچ میں یکسر تغیر آجاتا ہے۔

اور یہی وہ کم ظرفی ہے جس کا نتیجہ دنیا پرستی، کنجوسی اور خود غرضی ہے۔ یوں روح نفاق ان کو اس طرح سے جکڑ لیتی ہے کہ ان کیلئے واپسی کا کوئی راستہ بھی نہیں چھوڑتی۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: بعض منافقین ایسے ہیں جنھوں نے خدا کے ساتھ عہد و پیمان باندھا کہ اگر وہ اپنے فضل و کرم سے ہمیں کچھ عطا فرمائے گا تو ہم یقیناً ضرورت مندوں کی مدد کریں گے۔ اور نیکوں میں سے ہو جائیں گے۔ (وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ)۔

لیکن یہ باتیں وہ اس زمانے میں کیا کرتے تھے جب ان کا ہاتھ خالی تھا مگر جس وقت خدا نے اپنے فضل و کرم سے انھیں مالا مال کر دیا تو انھوں نے بخل کیا اور نافرمان اور روگرداں ہو گئے (فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ) اس پیمان شکنی اور بخل کا یہ نتیجہ نکلا کہ روح نفاق دائمی طور پر مضبوطی کے ساتھ ان کے دل میں راسخ ہو گئی اور اب وہ تا قیامت اور اس وقت تک جب وہ خدا سے ملیں گے باقی رہے گی (فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ) اور یہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے جو وعدہ خداوند عالم سے کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی اس لیے کہ ہمیشہ جھوٹ بولتے تھے (بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ)۔

آخر میں ان کی مذمت و سرزنش کے طور پر کہا گیا ہے کیا وہ نہیں جانتے کہ خدا ان کے بھیدوں کو جانتا ہے اور ان کی سرگوشیوں کو سنتا ہے اور وہ خدا سب غائب اور چھپے ہوئے امور کو جانتا ہے (اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ)۔

چند اہم نکات

۱۔ "فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ" سے بخوبی روشن ہے کہ بہت سے گناہ اور برائیاں یہاں تک کہ کفر و نفاق ایک دوسرے کی علت اور معلول ہیں کیونکہ مندرجہ بالا جملہ صراحت کے ساتھ بتاتا ہے کہ ان کا بخل اور عہد شکنی اس بات کا سبب بنی کہ نفاق ان کے دلوں میں

طرح طرح کی سازشوں اور فتنوں کا بیج بوئے۔ یہی صورت دوسرے گناہوں اور غلط کاموں کی ہے۔ اس لیے بعض کتب میں ہے کہ کبھی کبھی بڑے گناہوں کی وجہ سے انسان دنیا سے بے ایمان ہو کر اٹھتا ہے۔

۲۔ "یوم یلقونہ" جس کی ضمیر "خدا" کی طرف لوٹتی ہے اس سے مراد قیامت کا دن ہے کیونکہ "لقاء اللہ" اور اسی قسم کی دوسری تعبیریں عام طور پر قرآن میں قیامت ہی کے بارے میں آئی ہیں یہ درست ہے کہ موت واقع ہونے کے ساتھ ہی عمل کا دفتر ختم ہو جاتا ہے اور اچھے برے کاموں کا نامۂ عمل بند ہو جاتا ہے لیکن ان کے آثار اسی طرح قیامت تک باقی رہیں گے۔

البتہ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ "یلقونہ" کی ضمیر بخل کی طرف لوٹتی ہے یعنی جب تک وہ اپنے بخل کا نتیجہ دیکھیں گے اور سزا پائیں گے۔

اسی طرح یہ احتمال بھی ہے کہ پروردگار کی ملاقات سے مراد موت کا لمحہ ہے مگر یہ سب احتمالات آیت کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہیں اور ظاہری مفہوم وہی ہے جو ہم لکھ چکے ہیں۔

اس چیز کے بارے میں کہ پروردگار عالم کی ملاقات سے کیا مراد ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۴۶ کے ضمن میں جلد اول (ص ۱۹۰ اردو ترجمہ) میں ہم نے بحث کی ہے اسے ملاحظہ کیجیے۔

۳۔ زیر نظر آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وعدہ توڑنا اور جھوٹ بولنا منافقوں کی صفات ہیں اور یہ منافق ہی ہیں جو خدا کے ساتھ اپنے وعدوں کو بڑی تاکید کے ساتھ باندھتے ہیں پھر انہیں پاؤں کے نیچے روند ڈالتے ہیں یہاں تک کہ اپنے پروردگار سے جھوٹ بولتے ہیں۔

ایک مشہور حدیث جو رسول اکرم سے منقول ہے بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے۔ حضور نے فرمایا:

للمنافق ثلاث علامات اذا حدث کذب و اذا وعد اخلف و اذا ائتمن خان

منافق کی تین علامتیں ہیں ۱۔ جب بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔ ۲۔ جب وعدہ کرتا ہے تو اسے پورا نہیں کرتا ۳۔ جب اس کے پاس امانت رکھیں تو اس میں خیانت کرتا ہے[۱]

یہ بات قابل توجہ ہے کہ مذکورہ بالا داستان (ثعلبہ کا واقعہ) میں تینوں نشانیاں پائی جاتی ہیں۔ اس نے جھوٹ بولا، وعدہ توڑا اور اس مال میں سے جو خدا نے اسے اپنی امانت کے طور پر دیا تھا خیانت بھی کی۔

مندرجہ بالا حدیث زیادہ تاکید کے ساتھ کتاب کافی میں حضرت امام جعفر صادق کے ذریعے حضرت رسول اکرم سے مروی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

ثلاث من کن فیہ کان منافقا وان صام وصلی و زعم انہ مسلم من اذا ائتمن خان و اذا حدث کذب و اذا وعد اخلف

جس شخص میں یہ تین چیزیں ہوں وہ منافق ہے چاہے وہ روزہ و نماز کا پابند ہو اور اپنے آپ کو مسلمان سمجھے ۱۔ امانت میں خیانت کرے۔ ۲۔ بات کرے تو جھوٹ بولے اور ۳۔ وعدہ کر کے پھر جائے[۲]

---

[۱] مجمع البیان۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[۲] سفینۃ البحار ج ۲ ص ۶۰۶۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کبھی کبھی ایسے گناہ بعض ایماندار لوگوں سے بھی ہوں مگر پھر وہ توبہ کرلیں۔ لیکن ان گناہوں کا تسلسل اور ہمیشگی روح نفاق اور منافقت کی نشانی ہے۔

۴۔ اس نکتہ کو ذہن نشین کرنا بھی ضروری ہے کہ جو کچھ ہم نے مندرجہ بالا آیتوں میں پڑھا ہے وہ صرف ایک گذرے ہوئے زمانہ سے متعلق تاریخی واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسی اخلاقی اور اجتماعی حقیقت کا بیان ہے جس کے بے شمار نمونے ہر زمانے اور ہر معاشرے میں کسی استثناء کے بغیر پائے جاتے ہیں۔

اگر ہم اپنے آس پاس نگاہ ڈالیں (یہاں تک کہ ہم اپنے آپ کو دیکھیں) تو "ثعلبہ بن حاطب" کے اعمال اور اس کی سوچ کے نمونے ہمیں مختلف چہروں میں ملیں گے۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو عام حالات یا غربت میں پکے اور مخلص مومنین کی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں تمام مذہبی پروگراموں میں شرکت کرتے ہیں، ہر اصلاحی پرچم کے نیچے ماتم کرتے ہیں اور حق و صداقت کی آواز بلند کرنے والے کا ساتھ دیتے ہیں نیک کام کرنے کی تڑپ رکھتے ہیں پھر فساد اور برائی کا مقابلہ کرنے کے لیے آواز بلند کرتے ہیں۔ لیکن جب دن بدلتے ہیں اور صاحب ثروت ہو جاتے ہیں، کوئی عہدہ یا مقام انہیں حاصل ہو جاتا ہے تو اچانک ان کا چہرہ بدل جاتا ہے خدا اور دین کے بارے میں ان کا شور اور عشق سوز ماند پڑ جاتا ہے اور اب وہ اصلاحی اور تربیتی پروگراموں میں نظر نہیں آتے۔ نہ حق کے لیے گریبان چاک کرتے ہیں اور نہ اب وہ باطل کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔

پہلے جب ان کی حیثیت نہ تھی اور نہ معاشرے میں انہیں کوئی مقام حاصل تھا تو خدا اور مخلوق خدا کے ساتھ طرح طرح کے وعدے کرتے تھے کہ اگر کسی دن ہمیں وسائل مل گئے اور ہم کسی مقام پر پہنچ گئے تو یہ کریں گے اور وہ کریں گے۔ یہاں تک کہ وہ صاحب ثروت و اقتدار پر اپنے فرائض انجام نہ دینے پر ہزاروں اعتراض کرتے تھے لیکن جس روز جب خود ان کی حالت بدلی تو سب عہد و پیمان بھول گئے اور سب اعتراضات اور نکتہ چینیاں برف کی طرح پانی ہو گئیں۔

بے شک یہ کم ظرفی منافقوں کی ایک واضح صفت ہے۔ نفاق، دورخی شخصیت اور دوغلے پن کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں۔ اس قسم کے لوگوں کی تاریخ حیات، شخصیت کی دورنگی اور دورخی کا بہترین نمونہ ہے۔ اصولی طور پر صاحب ظرف انسان میں دوغلا پن نہیں پایا جاتا۔ نیز اس میں شک نہیں کہ ایمان کی طرح نفاق کے بھی کئی مراحل ہیں۔ بعض لوگوں کی روح میں یہ بری عادت اس طرح راسخ ہو جاتی ہے کہ ان کے عمل میں خدا پر ایمان کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا اگرچہ وہ اپنے آپ کو مومنین کی صف میں شامل سمجھتے ہیں۔

جو شخص ہمیشہ جھوٹ بولتا ہے جبکہ ظاہرا وہ سچا ہے کیا وہ دو پہلو اور دو چہرے رکھنے والا منافق نہیں ہے۔ جو شخص ظاہری طور پر امین ہے اور اسی وجہ سے لوگ اس کا اعتبار کرتے ہیں اور اپنی امانتیں اس کے سپرد کرتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ان میں خیانت کرتا ہے کیا وہ دورخی شخصیت کا حامل نہیں ہے اسی طرح وہ لوگ جو عہد و پیمان باندھتے ہیں لیکن کبھی اس کی پاسداری نہیں کرتے۔ کیا ان کا یہ عمل منافقوں کا سا نہیں ہے؟

انسانی معاشروں کے لیے ایک عظیم ترین مصیبت اور پس ماندگی کا ایک عامل ایسے منافقوں کا وجود ہے اگر ہم آنکھیں بند نہ کرلیں اور اپنے آپ سے جھوٹ نہ بولیں تو ایسے بہت سے ثعلبہ صفت منافقین ہمیں اپنے گرد و پیش اور اسلامی معاشروں میں نظر آئیں گے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ان سب عیوب، تنگ دماغ اور اسلامی تعلیمات کی روح سے دوری کے باوجود ہم اپنی پس ماندگی کا گناہ اسلام کی گردن پر ڈالتے ہیں۔

۷۹۔ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ
وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ
سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

۸۰۔ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ
سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○

ترجمہ

۷۹۔ جو لوگ عبادت گذار مومنین کے صدقات کی عیب جوئی کرتے ہیں اور ان کا تمسخر اڑاتے ہیں جو (تھوڑی سی) مقدار سے زیادہ کی دسترس نہیں رکھتے خدا ان کا مذاق اڑاتا ہے (انھیں مذاق اڑانے والوں کی سزا دیتا ہے) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۸۰۔ ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو (یہاں تک کہ) اگر ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کرو تو خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا کیونکہ انھوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے اور خدا فاسقوں کے گروہ کو ہدایت نہیں کرے گا۔

شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول کے ضمن میں حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں روایات نقل ہوئی ہیں۔ ان تمام روایات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ارادہ کر رکھا تھا کہ دشمن کے مقابلے کے لیے (احتمالاً جنگ تبوک کے لیے) لشکرِ اسلام کو تیار کریں۔ اس لیے آپ کو لوگوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔ جب آپؐ نے اپنے نظریے کا اظہار کیا تو جو لوگ توانائی رکھتے تھے انھوں نے زکوٰۃ یا بلا عوض مدد کے طور پر لشکرِ اسلام کی قابلِ قدر خدمت کی۔

جو مسلمان مزدور پیشہ تھے ان کی آمدنی تھوڑی تھی۔ ان میں سے ابو عقیل انصاری یا سالم بن عمیر انصاری نے رات کے وقت کنوئیں سے پانی نکال کر اضافی طور پر مزدوری کی اور اس طرح دو من[1] کھجوریں جمع کیں۔ ان میں سے ایک من اپنے گھر والوں کے لیے رکھ دیں اور ایک من

---

[1] یہاں من سے مراد وزن کے لحاظ سے ہے ایرانی من ہمارے ہاں کی نسبت کم مقدار کا ہوتا ہے (مترجم)

پڑتی ہے دیگر صفات کی طرح اسی زمانہ کے منافقین سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ صفت ہر دور کے منافقین کی پست صفات میں سے ایک ہے وہ اپنی بدنیتی کے مخصوص مزاج کے ساتھ کوشش کرتے ہیں کہ ہر مثبت کو غلط انداز میں پیش کر کے بے اثر کر دیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر نیک شخص کی کسی نہ کسی طرح حوصلہ شکنی کریں اور اسے کار خیر کی انجام دہی میں سُست کر دیں۔ یہاں تک کہ وہ کم آمدنی والے افراد کی خدمات کی اہمیت کو کم کر کے پیش کرتے ہیں اور ان کی شخصیت کو مجروح کرنے اور ان کی توہین کرنے کے لیے ان کے کام کا تمسخر اڑاتے ہیں وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں تاکہ تمام مثبت کارکردگیاں ختم ہو جائیں اور وہ اپنے بُرے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔

آگاہ اور بیدار مغز مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر زمانے میں ان کی قبیح سازش کی طرف متوجہ رہیں۔ ان کے بالکل برعکس قدم اٹھائیں معاشرے کی خدمت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں اور ایسی خدمات جو ظاہراً چھوٹی ہوں لیکن خلوص دل سے انجام پائی ہوں ان کی زیادہ قدردانی کریں تاکہ ہر چھوٹا بڑا اپنے کام میں شوق و ذوق اور دلچسپی سے مگن رہے۔ نیز سب مسلمانوں کو منافقین کی اس تباہ کن سازش سے آگاہ کرنا چاہیے تاکہ وہ ہمت نہ ہاریں۔

۲۔ "سخر الله منهم" کا مفہوم: اس کا لفظی معنی ہے " خدا ان سے تمسخر کرتا ہے" لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا بھی ان جیسے کام انجام دیتا ہے بلکہ جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ استہزاء کرنے والوں کو سزا دے گا یا ان سے ایسا سلوک کرے گا کہ تمسخر اڑانے والوں کی طرح ان کی تحقیر و تذلیل ہو۔

۳۔ "سَبْعِیْنَ" سے مراد: اس میں شک نہیں کہ "سبعین" (ستر) کا عدد زیر نظر آیت میں کثرت کے لیے ہے ذکر تعداد کے لیے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے لیے جتنی بھی استغفار کریں خدا انھیں نہیں بخشے گا یہ بالکل ایسے ہے جیسے ایک شخص دوسرے سے کہے کہ اگر تم سو مرتبہ بھی اصرار کرو تو میں قبول نہیں کروں گا اس بات کا مطلب نہیں کہ اگر ایک سو ایک مرتبہ اصرار کرو تو پھر قبول کر لوں گا بلکہ مراد یہ ہے کہ بالکل قبول نہیں کروں گا۔

ایسی تعبیر فی الحقیقت تاکید مطلب کے لیے ہوتی ہے اسی لیے سورۂ منافقون آیہ ۶ میں یہی بات نفی مطلق کی صورت میں ذکر ہوئی ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے:

سوآء علیهم استغفرت لهم ام لم تستغفر لهم لن یغفر الله لهم

اس میں کوئی فرق نہیں کہ تم ان کے لیے مغفرت طلب کرو یا نہ کرو خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا۔

اس بات پر ایک اور شاہد وہ علت ہے جو آیت کے ذیل میں ذکر ہوئی ہے اور وہ یہ کہ "انھوں نے خدا اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے اور خدا فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا"۔

واضح ہے کہ ایسے افراد کے لیے جتنی بھی استغفار اور طلبِ بخشش کی جائے ان کی نجات کا سبب نہیں ہو سکتی۔

تعجب کی بات ہے کہ اہلِ سنت کے طرق سے منقول متعدد روایات میں ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ نے فرمایا:

لا زیدن فی الاستغفار لهم علی سبعین مرة ؛ رجاء منه ان یغفر الله لهم، فنزلت:
سوآء علیهم استغفرت لهم ام لم تستغفر لهم لن یغفر الله لهم۔

خدا کی قسم! میں ان کے لیے ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کروں گا اس امید پر کہ خدا انھیں بخش دے اس وقت (سورہ منافقون کی) یہ آیت نازل ہوئی (جس میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے)

کچھ فرق نہیں چاہے ان کے لیے استغفار کرو چاہے نہ کرو خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا[1]

مندرجہ بالا روایات کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے مندرجہ بالا آیت میں ستر کے عدد سے تعداد مراد لی لہٰذا فرمایا کہ "میں ان کے لیے ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کروں گا"

حالانکہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں زیر بحث آیت خصوصاً اس علت کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے جو اس کے ذیل میں آئی ہے ہمیں وضاحت سے سمجھاتی ہے کہ ستر کا عدد کثرت کے مفہوم میں آیا ہے اور یہ نفی مطلق کے لیے کنایہ ہے اور اس میں تاکید مضمر ہے لہٰذا مذکورہ بالا روایات چونکہ قرآن کے مخالف ہیں لہٰذا ہرگز قابلِ قبول نہیں ہیں خصوصاً جبکہ ہماری نظر میں ان کی اسناد بھی معتبر نہیں ہیں۔

مذکورہ بالا روایات کی واحد توجیہ یہ کی جا سکتی ہے (اگرچہ خلافِ ظاہر ہے) کہ رسول اللہؐ مندرجہ بالا آیات کے نزول سے پہلے یہ جملہ فرمایا کرتے تھے اور جب یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ نے ان کے لیے استغفار کرنے سے صرفِ نظر کر لیا۔

اس بارے میں ایک اور روایت نقل ہوئی ہے اور ممکن ہے کہ مذکورہ بالا روایات کی بنیاد یہی روایت ہو جو "نقل بالمعنیٰ" کی وجہ سے خلط ملط ہو گئی ہو۔ روایت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لو علمت انه لو زدت علی السبعین مرة غفر لهم لفعلت

اگر مجھے معلوم ہو کہ میرے ستر بار سے زیادہ استغفار کرنے سے خدا انھیں بخش دے گا تو میں ایسا کرتا۔

اس کا مفہوم (خصوصاً لفظ "لو" کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو امتناع کے لیے ہے) یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ خدا انھیں نہیں بخشے گا لیکن میرا دل بندگانِ خدا کی ہدایت اور ان کی نجات کے شوق سے اس قدر لبریز ہے کہ اگر بالفرض ستر مرتبہ سے زیادہ مرتبہ استغفار کرنے سے ان کی نجات ہو سکتی تو میں ایسا ہی کرتا۔

بہرحال مندرجہ بالا آیات کا مفہوم واضح ہے اور جو حدیث ان کے برخلاف ہو اس کی یا توجیہ و تاویل کرنا پڑے گی یا اسے پھینک دینا ہوگا۔

۸۱۔ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ۝

[1] اس مضمون کی متعدد روایات تفسیر طبری ج ۱۰ ص ۱۲۰ پر جمع کی گئی ہیں۔

۸۲۔ فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ○

۸۳۔ فَإِن رَّجَعَكَ اللَّهُ إِلَىٰ طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُل لَّن تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَن تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا ۖ إِنَّكُمْ رَضِيتُم بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخَالِفِينَ ○

ترجمہ

۸۱۔ (جنگِ تبوک سے) کنارہ کشی کرنے والے جو رسولِ خدا کی مخالفت سے خوش ہیں اور وہ راہِ خدا میں اپنے اموال اور جان سے جہاد کرنے کو ناپسند کرتے تھے (اور ایک دوسرے سے اور مومنین سے) کہتے ہیں کہ اس موسم گرما میں (میدان کی طرف) حرکت نہ کریں۔ انھیں کہہ دو جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے، اگر تم میں سمجھ ہے۔

۸۲۔ انھیں چاہیے کہ تھوڑا ہنسیں اور زیادہ روئیں یہ ان کار گزاریوں کی جزا ہے جو وہ کرتے تھے۔

۸۳۔ جب خدا تجھے ان کے کسی گروہ کی طرف پلٹائے اور وہ تجھ سے (میدان جہاد کی طرف) خروج کی اجازت چاہیں تو ان سے کہو کہ تم کبھی میرے ساتھ خروج نہیں کرو گے اور میری معیت میں کبھی دشمن کے ساتھ جنگ نہیں کرو گے جب تم نے پہلی بار پیچھے بیٹھے رہنا پسند کیا تو اب بھی پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔

تفسیر

منافقین کی ایک اور غلط حرکت

ان آیات میں بھی منافقین کے افکار و اعمال کا ذکر جاری ہے تاکہ مسلمان واضح طور پر اس گروہ کو پہچان لیں اور ان کے غلط منصوبوں اور سازشوں کا شکار نہ ہوں۔

پہلے فرمایا گیا ہے، وہ لوگ جنھوں نے (تبوک میں) جہاد میں شرکت نہیں کی اور بے ہودہ بہانے کر کے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے اور اپنے گمان میں انھوں نے میدانِ جنگ کے خطرات پر سلامتی کو ترجیح دی، وہ رسولِ خدا کے خلاف اپنے اس عمل پر خوش ہیں (فرح المخلفون بمقعدھم خلاف رسول الله)۔

اور راہِ خدا میں مال و جان سے جہاد کرنے اور مجاہدین کے عظیم اعزازات و افتخارات حاصل کرنے کو ناپسند کرتے ہیں (وکرھوا ان یجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل الله)۔

۷۹۔ اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ
وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ؕ
سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

۸۰۔ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ
سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا
بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○ ع

ترجمہ

۷۹۔ جو لوگ عبادت گذار مومنین کے صدقات کی عیب جوئی کرتے ہیں اور ان کا تمسخر اڑاتے ہیں جو (تھوڑی سی) مقدار سے زیادہ کی دسترس نہیں رکھتے خدا ان کا مذاق اڑاتا ہے (انھیں مذاق اڑانے والوں کی سزا دیتا ہے) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

۸۰۔ ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو (یہاں تک کہ) اگر ان کے لیے ستر مرتبہ بھی استغفار کرو تو خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا کیونکہ انھوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے اور خدا فاسقوں کے گروہ کو ہدایت نہیں کرے گا۔

شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول کے ضمن میں حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں روایات نقل ہوئی ہیں۔ ان تمام روایات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ارادہ کر رکھا تھا کہ دشمن کے مقابلے کے لیے (احتمالاً جنگ تبوک کے لیے) لشکرِ اسلام کو تیار کریں۔ اس لیے آپ کو لوگوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔ جب آپؐ نے اپنے نظریے کا اظہار کیا تو جو لوگ توانائی رکھتے تھے انھوں نے زکوٰۃ یا بلاعوض مدد کے طور پر لشکرِ اسلام کی قابلِ قدر خدمت کی۔

جو مسلمان مزدور پیشہ تھے ان کی آمدنی تھوڑی تھی۔ ان میں سے ابوعقیل انصاری یا سالم بن عمیر انصاری نے رات کے وقت کنوئیں سے پانی نکال کر اضافی طور پر مزدوری کی اور اس طرح دو من[1] کھجوریں جمع کیں۔ ان میں سے ایک من اپنے گھر والوں کے لیے رکھ دیں اور ایک من

[1] یہ ایران کے موجودہ وزن کے لحاظ سے ہے۔ ایرانی من ہمارے ہاں کی نسبت کم مقدار کا ہوتا ہے۔ (مترجم)

خدمت پیغمبر میں لے آئے۔ اس طرح انھوں نے ایک عظیم اسلامی مقصد کے لیے بظاہر معمولی سی خدمت انجام دی۔ اسی طرح اور مزدور پیشہ مسلمانوں نے لشکر اسلام کی خدمت کی۔

عیب جو منافقین ان دونوں گروہوں پر اعتراض کرتے تھے جن لوگوں نے زیادہ خدمت کی تھی انھیں ریاکار کہتے تھے اور جنھوں نے تھوڑی مدد کی تھی ان کا تمسخر اڑاتے تھے کہ کیا لشکر اسلام کو اس قسم کی مدد کی ضرورت ہے؟

اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انھیں سخت دھمکی دی گئی اور عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا۔

تفسیر

منافقین کی ایک اور غلط حرکت

ان آیات میں منافقین کی ایک اور عمومی صفت کی طرف اشارہ ہوا وہ یہ کہ وہ ہٹ دھرم، بہانہ جو، معترض اور کام بگاڑنے والے ہوتے ہیں۔ غیر مناسب جوڑ توڑ سے ہر مثبت کام کی تحقیر کرتے ہیں اور اسے برا کر کے پیش کرتے ہیں تاکہ ایک تو لوگوں کو نیک کام کی انجام دہی میں سست کریں اور دوسرا ان کے افکار و نظریات میں بدگمانی کے بیج بوئیں تاکہ اس طرح معاشرے میں اصلاحی اور مفید کاموں کا سلسلہ بند ہو جائے۔

قرآن مجید شدت سے ان کی اس غیر انسانی روش کی مذمت کرتا ہے اور مسلمانوں کو اس سے آگاہ کرتا ہے تاکہ لوگ ایسی بدگمانیوں کا شکار ہوں اور منافقین کو بھی معلوم ہو جائے کہ اسلامی معاشرے میں ان کی سازشیں رنگ نہیں لا سکتیں۔

ارشاد ہوتا ہے: وہ جو نیک مومنین کے صدقات اور صدق دل سے کی گئی امداد میں سے عیب ڈھونڈتے ہیں اور خصوصاً جو ان نادار اہل ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں جو تھوڑی سی مدد کے علاوہ طاقت نہیں رکھتے خدا ان کا مذاق اڑاتا ہے اور دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے

(الذین یلمزون المطوعین من المؤمنین فی الصدقات والذین لا یجدون الا جهدهم فیسخرون منهم سخر الله منهم ولهم عذاب الیم)۔ "یلمزون" "لمز" (بروزن "طنز") کے مادہ سے عیب جوئی کے معنی میں ہے اور "مطوعین" مادہ "طوع" (بروزن "موج") سے اطاعت کے معنی میں ہے لیکن عام طور پر یہ لفظ نیک لوگوں کے لیے اور ان کے لیے استعمال ہوتا ہے جو واجبات کے علاوہ مستحبات بھی بجا لاتے ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق کچھ لوگوں کی عیب جوئی کرتے تھے اور کچھ کا مذاق اڑاتے تھے۔ واضح ہے مذاق ان افراد کا اڑاتے تھے کہ جو لشکر اسلام کی صرف تھوڑی سی امداد کی طاقت رکھتے تھے اور یقیناً عیب جوئی ان افراد کی کرتے تھے جو ان کے برعکس بہت زیادہ امداد کرتے تھے۔ زیادہ امداد کرنے والوں کو ریاکاری کا الزام دیتے تھے اور کم امداد کر سکنے والوں کی تحقیر کرتے تھے۔

بعد والی آیت میں ان منافقین کی سزا کے بارے میں بہت تاکید آئی ہے اور انھیں آخری وارننگ دی گئی ہے۔ روئے سخن پیغمبر کی طرف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے:

ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو یہاں تک کہ ستر مرتبہ بھی ان کے لیے استغفار اور طلب بخشش کرو تو بھی خدا انھیں ہرگز نہیں

بخشے گا (استغفر لھم او لا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم)۔
کیونکہ انھوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا ہے اور کفر کی راہ اختیار کی ہے اور اسی کفر نے انھیں نفاق کی پستی اور بُرے انجام سے دوچار کیا ہے (ذالک بانھم کفروا باللہ و رسولہ)۔ اور واضح ہے کہ خدا کی ہدایت ایسے لوگوں کو میسر آنے گی جو حق طلبی کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں اور حقیقت کے متلاشی ہیں۔ لیکن خدا فاسق، گنہگار اور منافق افراد کو ہدایت نہیں کرتا (و اللہ لا یھدی القوم الفسقین)۔

چند اہم نکات

ا۔ کام کی اہمیت کیفیت سے ہے کمیت سے نہیں:۔ آیاتِ قرآنی کو دیکھتے ہوئے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اسلام کسی مقام پر بھی "کثرتِ عمل" پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ اس نے ہر جگہ "کیفیتِ عمل" کو اہمیت دی ہے۔ اسلام کی نظر میں خلوص اور پاک نیت کی بہت زیادہ قیمت ہے۔ مندرجہ بالا آیات قرآن کی اس منطق کا ایک نمونہ ہیں۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ایک مسلمان کارکن ایک چھوٹے سے کام کے لیے رات بھر نہیں سویا۔ اس کا دل عشقِ خدا، اخلاص اور احساسِ مسئولیت سے معمور تھا۔ اسی لیے وہ اسلامی معاشرے کی مشکلات کے حل کے لیے کام میں لگا رہا اور اس طرح اس نے اسلامی فوج کے لیے ایک من کھجور مہیا کی۔ اس نے حساس لمحات میں اسلام کی جو خدمت کی قرآن نے اسے بہت زیادہ اہمیت دی ہے اور جو لوگ ایسے بظاہر چھوٹے اور درحقیقت بڑے اعمال کی تحقیر کرتے ہیں ان کی سخت مذمت کی ہے قرآن کہتا ہے:

"دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔"

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ ایک صحیح اسلامی معاشرے میں مشکلات کے وقت سب لوگوں کو احساس ذمہ داری کا ثبوت دینا چاہیے۔ ان مواقع پر صرف اہلِ اقتدار و ثروت کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے کیونکہ اسلام کا تعلق سب سے ہے اور سب کو چاہیے کہ اس کی حفاظت کے لیے دل و جان سے کوشش کریں۔

اہم بات یہ ہے کہ ہر شخص اپنی طاقت کے حساب سے دریغ نہ کرے مسئلہ زیادہ اور کم کا نہیں بلکہ احساسِ ذمہ داری اور اخلاص کا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے سوال ہوا:

ای الصدقۃ افضل

کون سا صدقہ اور مدد افضل ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

جھد المقل

کم آمدنی والے اشخاص کی توانائی کی مقدار

۲۔ منافقین کی صفات ہر دور میں ایک جیسی ہیں: مندرجہ بالا آیات میں زمانہ پیغمبر کے منافقین کے بارے میں ہم نے جو صفت

پڑتی ہے دیگر صفات کی طرح اسی زمانہ کے منافقین سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ صفت بیہودہ کے منافقین کی پست صفات میں سے ایک ہے وہ اپنی بدنیتی کے مخصوص مزاج کے ساتھ کوشش کرتے ہیں کہ ہر مثبت کو غلط انداز میں پیش کر کے بے اثر کر دیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ہر نیک شخص کی کسی نہ کسی طرح حوصلہ شکنی کریں اور اسے کار خیر کی انجام دہی میں سست کر دیں۔ یہاں تک کہ وہ کم آمدنی والے افراد کی خدمات کی اہمیت کو کم کر کے پیش کرتے ہیں اور ان کی شخصیت کو مجروح کرنے اور ان کی توہین کرنے کے لیے ان کے کام کا تمسخر اڑاتے ہیں وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں تاکہ تمام مثبت کارکردگیاں ختم ہو جائیں اور وہ اپنے بُرے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔

آگاہ اور بیدار مغز مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر زمانے میں ان کی گھٹیا سازش کی طرف متوجہ رہیں۔ ان کے بالکل برعکس قدم اٹھائیں معاشرے کی خدمت کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں اور ایسی خدمات جو ظاہراً چھوٹی ہوں لیکن خلوص دل سے انجام پائی ہوں ان کی زیادہ قدر دانی کریں تاکہ کام کرنے والا اپنے کام میں شوق و ذوق اور دلچسپی سے مگن رہے۔ نیز سب مسلمانوں کو منافقین کی اس تباہ کن سازش سے آگاہ کرنا چاہیے تاکہ وہ ہمت نہ ہاریں۔

۲۔ "سخر اللہ منھم" کا مفہوم: اس کا لفظی معنی ہے "خدا ان سے تمسخر کرتا ہے" لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خدا بھی ان جیسے کام انجام دیتا ہے بلکہ جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ وہ استہزاء کرنے والوں کو سزا دے گا یا ان سے ایسا سلوک کرے گا کہ تمسخر اڑانے والوں کی طرح ان کی تحقیر و تذلیل ہو۔

۳۔ "سَبْعِيْنَ" سے مراد: اس میں شک نہیں کہ "سبعین" (ستر) کا عدد زیر نظر آیت میں کثرت کے لیے ہے نہ کہ تعداد کے لیے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے لیے جتنی بھی استغفار کریں خدا انہیں نہیں بخشے گا یہ بالکل ایسے ہے جیسے ایک شخص دوسرے سے کہے کہ اگر تم سو مرتبہ بھی اصرار کرو تو میں قبول نہیں کروں گا اس بات کا مطلب نہیں کہ اگر ایک سو ایک مرتبہ اصرار کرو تو پھر قبول کر لوں گا بلکہ مراد یہ ہے کہ بالکل قبول نہیں کروں گا۔

ایسی تعبیر فی الحقیقت تاکید مطلب کے لیے ہوتی ہے اسی لیے سورہ منافقون آیہ ۶ میں یہی بات نفی مطلق کی صورت میں ذکر ہوئی ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے:

سوآء علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم لن یغفر اللہ لھم

اس میں کوئی فرق نہیں کہ تم ان کے لیے مغفرت طلب کرو یا نہ کرو خدا انہیں ہرگز نہیں بخشے گا۔

اس بات پر ایک اور شاہد وہ علت ہے جو آیت کے ذیل میں ذکر ہوئی ہے اور وہ یہ کہ "انہوں نے خدا اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے اور خدا فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا۔"

واضح ہے کہ ایسے افراد کے لیے جتنی بھی استغفار اور طلب بخشش کی جائے ان کی نجات کا سبب نہیں ہو سکتی۔

تعجب کی بات ہے کہ اہل سنت کے طرق سے منقول متعدد روایات میں ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ نے فرمایا:

لا زیدن فی الاستغفار لھم علی سبعین مرۃ: رجاء منہم ان یغفر اللہ لھم فنزلت
سوآء علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم لن یغفر اللہ لھم۔

خدا کی قسم! میں ان کے لیے ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کروں گا اس امید پر کہ خدا انھیں بخش دے اس وقت (سورہ منافقون کی) یہ آیت نازل ہوئی (جس میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے)

کچھ فرق نہیں چاہے ان کے لیے استغفار کرو چاہے نہ کرو خدا انھیں ہرگز نہیں بخشے گا [1]

مندرجہ بالا روایات کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے مندرجہ بالا آیت میں ستر کے عدد سے تعداد مراد لی لہٰذا فرمایا کہ "میں ان کے لیے ستر سے زیادہ مرتبہ استغفار کروں گا"۔

حالانکہ جیسا ہم کہہ چکے ہیں زیر بحث آیت خصوصاً اس علت کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے جو اس کے ذیل میں آئی ہے ہمیں وضاحت سے سمجھاتی ہے کہ ستر کا عدد کثرت کے مفہوم میں آیا ہے اور نفی مطلق کے لیے کنایہ ہے اور اس میں تاکید مضمر ہے لہٰذا مذکورہ بالا روایات چونکہ قرآن کے مخالف ہیں لہٰذا ہرگز قابلِ قبول نہیں ہیں خصوصاً جبکہ ہماری نظر میں ان کی اسناد بھی معتبر نہیں ہیں۔

مذکورہ بالا روایات کی واحد توجیہ یہ کی جا سکتی ہے (اگرچہ خلافِ ظاہر ہے) کہ رسول اللہ مندرجہ بالا آیات کے نزول سے پہلے یہ جملہ فرمایا کرتے تھے اور جب یہ آیات نازل ہوئیں تو آپ نے ان کے لیے استغفار کرنے سے صرفِ نظر کر لیا۔

اس بارے میں ایک اور روایت نقل ہوئی ہے اور ممکن ہے کہ مذکورہ بالا روایات کی بنیاد یہی روایت ہو جو "نقل بالمعنی" کی وجہ سے غلط ملط ہو گئی ہو۔ روایت یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

لو علمت انه لو زدت علی السبعین غفر لهم لفعلت

اگر مجھے معلوم ہو کہ میرے ستر بار سے زیادہ استغفار کرنے سے خدا انھیں بخش دے گا تو میں ایسا کرتا۔

اس کا مفہوم (خصوصاً لفظ "لو" کی طرف توجہ کرتے ہوئے جو امتناع کے لیے ہے) یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ خدا انھیں نہیں بخشے گا لیکن میرا دل بندگانِ خدا کی ہدایت اور ان کی نجات کے شوق سے اس قدر لبریز ہے کہ اگر بالفرض ستر مرتبہ سے زیادہ مرتبہ استغفار کرنے سے ان کی نجات ہو سکتی تو میں ایسا ہی کرتا۔

بہرحال مندرجہ بالا آیات کا مفہوم واضح ہے اور جو حدیث ان کے برخلاف ہو اس کی یا توجیہ و تاویل کرنا پڑے گی یا اسے پھینک دینا ہوگا۔

۸۱۔ فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ۭ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ۭ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ○

---

[1] اس مضمون کی متعدد روایات تفسیر طبری ج ۱۰ ص ۱۴۰ پر جمع کی گئی ہیں۔

۸۲۔ فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝

۸۳۔ فَإِن رَّجَعَكَ اللَّهُ إِلَىٰ طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُل لَّن تَخْرُجُوا مَعِيَ أَبَدًا وَلَن تُقَاتِلُوا مَعِيَ عَدُوًّا ۖ إِنَّكُمْ رَضِيتُم بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوا مَعَ الْخَالِفِينَ ۝

ترجمہ

۸۱۔ (جنگ تبوک سے) کنارہ کشی کرنے والے جو رسولِ خدا کی مخالفت سے خوش ہیں اور وہ راہِ خدا میں اپنے اموال و جان سے جہاد کرنے کو ناپسند کرتے تھے (اور ایک دوسرے سے اور مومنین سے) کہتے ہیں کہ اس موسم گرما میں (میدان کی طرف) حرکت نہ کریں۔ انھیں کہہ دو جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے، اگر تم میں سمجھ ہے۔

۸۲۔ انھیں چاہیے کہ تھوڑا ہنسیں اور زیادہ روئیں یہ ان کارگزاریوں کی جزا ہے جو وہ کرتے تھے۔

۸۳۔ جب خدا تجھے ان کے کسی گروہ کی طرف پلٹائے اور وہ تجھ سے (میدان جہاد کی طرف) خروج کی اجازت چاہیں تو ان سے کہو کہ تم کبھی میرے ساتھ خروج نہیں کرو گے اور میری معیت میں کبھی دشمن کے ساتھ جنگ نہیں کرو گے جب تم نے پہلی بار پیچھے بیٹھے رہنا پسند کیا تو اب بھی پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ بیٹھ رہو۔

تفسیر

منافقین کی ایک اور غلط حرکت

ان آیات میں بھی منافقین کے افکار و اعمال کا ذکر جاری ہے تاکہ مسلمان واضح طور پر اس گروہ کو پہچان لیں اور ان کے غلط منصوبوں اور سازشوں کا شکار نہ ہوں۔

پہلے فرمایا گیا ہے، وہ لوگ جنھوں نے (تبوک میں) جہاد میں شرکت نہیں کی اور بے ہودہ بہانے کرکے اپنے گھروں میں بیٹھے رہے اور اپنے گمان میں انھوں نے میدانِ جنگ کے خطرات پر سلامتی کو ترجیح دی، وہ رسولِ خدا کے خلاف اپنے اس عمل پر خوش ہیں (فرح المخلفون بمقعدھم خلاف رسول اللہ)۔

اور راہِ خدا میں مال و جان سے جہاد کرنے اور مجاہدین کے عظیم اعزازات و افتخارات حاصل کرنے کو ناپسند کرتے ہیں (وکرھوا ان یجاھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ)۔

انھوں نے میدانِ جہاد میں شرکت نہ کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ وہ شیطانی وسوسوں سے دوسروں کو بھی بددل کرنے کا پھیرنے کی کوشش میں تھے ۔ انھوں نے دوسروں سے کہا: موسم گرما کی اس جلا دینے والی گرمی میں میدان جنگ کی طرف نہ جاؤ (وقالوا لا تنفروا فی الحر)۔

درحقیقت وہ ایک تو مسلمانوں کے ارادوں کو کمزور کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا اپنے جرم میں بہت سے افراد کو شریک کرنا چاہتے تھے ۔

اس کے بعد قرآن پیغمبر اکرم کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہتا ہے کہ انھیں دوٹوک الفاظ میں اور تنبیہ کرتے ہوئے" کہہ دو کہ دوزخ کی جلا دینے والی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے اگر تم سمجھو (قل نار جہنم اشد حرًا لو کانوا یفقھون)۔ لیکن وہ کمزور ایمان اور نا سمجھی کی وجہ سے توجہ نہیں کرتے کہ کیسی جلانے والی آگ ان کے انتظار میں ہے، ایسی آگ کہ جس کی چھوٹی سی چنگاری دنیا کی ہر قسم کی آگ سے زیادہ جلا دینے والی ہے۔

بعد کی دو آیتیں اس طرف اشارہ کرتی ہیں کہ وہ اس گمان میں ہیں کہ انھیں کامیابی حاصل ہو گئی ہے۔ جہاد سے دور رہنے اور مجاہدین کے حوصلے پست کرنے سے وہ اپنے ہدف کو پہنچ گئے ہیں لہٰذا وہ قہقہے لگاتے ہیں جیسا کہ ہر دور کے منافقین کرتے رہے ہیں لیکن قرآن انھیں خطرے سے ڈراتے ہوئے کہتا ہے: انھیں تھوڑا ہنسنا چاہیے اور زیادہ رونا چاہیے (فلیضحکوا قلیلا ولیبکوا کثیرًا)۔

ہاں انھیں رونا چاہیے اپنے تاریک مستقبل پر اور ان دردناک سزاؤں پر جو ان کے انتظار میں ہیں انھیں رونا چاہیے اس بناء پر کہ وہ واپسی کے راستے کے تمام پلوں کو برباد کر چکے ہیں۔ انھیں رونا چاہیے کہ وہ اپنی تمام تر استعداد اور زندگانی کا سرمایہ دے کر اپنے لیے رسوائی اور بدبختی خرید چکے ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے یہ ان اعمال کی سزا ہے جو وہ انجام دیتے تھے (جزآء بما کانوا یکسبون)۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ اس جہان میں ہنسیں کم اور روئیں زیادہ۔ کیونکہ آگے ان کے لیے ایسی دردناک سزا ہے کہ اگر اس سے آگاہ ہو جائیں تو بہت روئیں اور ہنسیں بہت کم۔

لیکن بعض مفسرین نے اس جملے کے معنی کے متعلق ایک اور احتمال بھی ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ وہ جتنا بھی ہنسیں دنیا کی عمر اتنی تھوڑی ہے کہ وہ پھر بھی کم ہے اور آخرت میں وہ اتنا روئیں گے کہ دنیاوی گریہ وزاری اس کے مقابلے میں بہت حقیر ہے۔

لیکن پہلی تفسیر ظاہرِ آیت سے اور تقریر و تحریر میں استعمال ہونے والی اس سے مشابہ تعبیرات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے خصوصاً جبکہ دوسری تفسیر کا لازمہ یہ ہے کہ صیغہ امر اخبار کے معنی میں ہو اور یہ خلاف ظاہر ہے۔

ایک مشہور حدیث میں کہ جسے بہت سے مفسرین نے پیغمبر اکرم سے نقل کیا ہے، آپ فرماتے ہیں:

لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلا ولبکیتم کثیرًا

اگر اسے جو میں (قیامت کی ہولناک سزاؤں کے متعلق) جانتا ہوں تم بھی جانتے تو ہنستے کم اور روتے زیادہ۔

یہ حدیث بھی پہلے معنی پر ایک شاہد ہے (غور کیجیے گا)۔

زیر بحث آخری آیت میں منافقین کی ایک اور سوچی بھی خطرناک روش کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ جب وہ کسی غلط کام کو ظاہر بظاہر انجام دیتے ہیں تو اپنی برأت کے لیے تلافی کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں اور اس طرح اپنی بدعات اور خلافِ اسلام حرکات کو چھپانے کی

کوشش کرتے ہیں۔ آیت کہتی ہے: جس وقت خدا تجھے ان کے کسی گروہ کی طرف پلٹائے اور وہ تجھ سے جہاد کے دوسرے میدان میں شرکت کی اجازت چاہیں تو ان سے کہہ دو کہ تم میرے ساتھ کبھی میدان جہاد میں شرکت نہ کرسکو گے اور میری معیت میں کبھی کسی دشمن سے نہیں لڑو گے (فان رجعک اللہ الیٰ طآئفۃ منھم فاستاذنوک للخروج فقل لن تخرجوا معی ابداً ولن تقاتلوا معی عدوًا)۔

یعنی رسول اللہؐ انہیں ہمیشہ کے لیے مایوس کردیں اور واضح کردیں کہ ان کی منافقت نہیں لائے گی اور کبھی کوئی ان کے فریب میں نہیں آئے گا اور کیا ہی اچھا ہو کہ وہ مکر و فریب کا یہ جال کہیں اور لے جائیں کیونکہ یہاں اب کوئی ان کے دام فریب میں نہیں آئے گا۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "طآئفۃ منھم" (ان میں سے ایک گروہ) کے الفاظ نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ سب ایسا کرنے کو تیار نہ تھے اور دوسرے جہاد میں شرکت پر آمادگی کا اظہار سب نے نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بعض اس قدر رسوا اور شرمندہ تھے کہ وہ اس رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش ہو کر اپنی یہ تجویز ہی پیش نہیں کرسکتے تھے۔

اس کے بعد ان کی پیش کش قبول نہ کرنے کی دلیل یوں بیان کی گئی ہے: میدان جہاد سے کنارہ کشی کرنے اور گھروں میں بیٹھ رہنے پر تم پہلے ہی راضی ہو چکے ہو پھر اب بھی منہ موڑنے والوں کے ساتھ مل جاؤ اور ان کے ساتھ گھروں میں بیٹھ جاؤ (انکم رضیتم بالقعود اول مرۃ فاقعدوا مع الخالفین)۔

چند توجہ طلب نکات

۱۔ دوسرے جہاد میں شرکت کی پیش کش کی حقیقت: اس میں شک نہیں کہ اگر یہ منافقین جہاد سے ایک مرتبہ منہ موڑنے کے بعد پشیمان ہوتے، توبہ کرلیتے اور اپنے سابقہ گناہوں کی تلافی کے لیے دوسرے جہاد میں شرکت کی پیش کش کرتے تو خدا تعالیٰ ان کی پیشکش قبول کرلیتا اور رسول اللہؐ ان کی درخواست رد نہ کرتے۔ اس بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ پیش کش بھی ایک طرح کی شیطنت اور منافقت تھی۔ دراصل یہ اپنے مکروہ چہرے کو چھپانے اور سابقہ اعمال جاری رکھنے کی ایک تکنیک تھی۔

۲۔ لفظ "خالف" کا مفہوم: یہ لفظ "متخلف" کے معنی میں ہے جو کہ ایسے اشخاص کی طرف اشارہ ہے جو عذر و معذرت کے ساتھ یا بغیر کسی عذر کے میدانِ جہاد میں شرکت نہیں کرتے تھے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "خالف" "مخالف" کے معنی میں ہے جو اس طرف اشارہ ہے کہ تم بھی چلے جاؤ اور مخالفوں کے ہم آواز بن جاؤ
اس لفظ کا ایک مفہوم "فاسد" بھی بیان کیا گیا ہے کیونکہ "خلوف" "فساد" کے معنی میں ہے اور "خالف" لغت میں "فاسد" کے معنی میں آیا ہے۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں اس لفظ سے تمام مذکورہ معانی مراد ہوں کیونکہ منافقین اور ان کے ساتھی ان تمام صفات رذیلہ کے حامل تھے۔

۳۔ دورِ حاضر میں ہماری ذمہ داری اور منافقین کی روش: اس امر کی ہم دوبارہ یاددہانی ضروری سمجھتے ہیں کہ دورِ حاضر کے مسلمان بھی اپنے معاشرے کے منافقین جو گزشتہ ادوار کے منافقین کی روش پر گامزن ہیں کے بارے میں رسول اللہؐ کے اسی محکم طریقے کی پیروی کریں اور ایک دفعہ ان کے دام فریب میں آنے کے بعد دوسری مرتبہ ان سے دھوکا نہ کھائیں اور ان کے مگرمچھ کے آنسوؤں کو کوئی اہمیت نہ دیں کیونکہ،

"ایک مسلمان ایک ہی جال میں دو مرتبہ نہیں پھنستا"۔

۸۴۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَمَاتُوۡا وَهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ○

۸۵۔ وَلَا تُعۡجِبۡكَ اَمۡوَالُهُمۡ وَاَوۡلَادُهُمۡ ؕ اِنَّمَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّعَذِّبَهُمۡ بِهَا فِى الدُّنۡيَا وَتَزۡهَقَ اَنۡفُسُهُمۡ وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ ○

ترجمہ

۸۴۔ ان میں سے جو بھی مر جائے اس کی نماز جنازہ نہ پڑھ اور اس کی قبر پر (دعا اور طلب بخشش کے لیے) کھڑا نہ ہو کیونکہ انھوں نے خدا اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور جب وہ دنیا سے گئے ہیں تو فاسق تھے۔

۸۵۔ ان کے اموال اور اولاد تیرے لیے باعث تعجب نہ ہوں (کیونکہ یہ ان کے لیے نعمت نہیں بلکہ) خدا چاہتا ہے کہ ان کے ذریعے انھیں دنیا میں عذاب کرے اور ان کی روحیں اس حالت میں نکلیں کہ وہ کافر ہوں۔

تفسیر

منافقین کے بارے میں زیادہ سخت اقدام

جب منافقین نے کھلے بندوں جہاد سے منہ موڑ کر خود پردے چاک کر دیئے اور ان کا معاملہ واضح ہو گیا تو خدا تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ وہ زیادہ صریح اور زیادہ مستحکم طریقے سے اقدام کریں تاکہ دوسروں کے دماغ سے ہمیشہ کے لیے نفاق اور منافق سازی کی فکر نکل چکے اور منافقین بھی جان لیں کہ اسلامی معاشرے میں ان کے لیے کوئی جگہ اور مقام باقی نہیں رہا۔

لہٰذا قرآن فرماتا ہے: (منافقین میں سے) جو کوئی بھی مر جائے تُو اس کی نماز کبھی نہ پڑھ (و لا تصل علی احد منھم مات ابدا)۔ اور کبھی بھی اس کی قبر کے پاس طلب بخشش کے لیے کھڑا نہ ہو (و لا تقم علی قبرہ)۔

فی الحقیقت یہ منافقین سے ایک قسم کی منفی اور مؤثر جنگ ہے کیونکہ ان وجوہ کی بنا پر جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں رسول اللہ قانونی طور پر ان کے قتل اور اسلامی معاشرے کو اس طریقے سے ان کے وجود سے پاک کرنے کا حکم نہیں دے سکتے تھے لیکن انھیں کافی حد تک بے اعتنا کرنے، کنارہ کش کرنے اور اسلامی معاشرے سے نکال باہر پھینکنے کے لیے مقابلے کے ایسے منفی طریقے بہت مؤثر تھے۔

ہم جانتے ہیں کہ ایک سچا مومن زندگی میں بھی محترم ہے اور موت کے بعد بھی۔ اس لیے اسلام نے اس کے غسل کفن اور دفن کا

حکم دیا ہے بلکہ اسے زیادہ سے زیادہ اور خاص احترامات کے ساتھ سپردِ خاک کیا جائے یہاں تک کہ اسے دفن کرنے کے بعد اس کی قبر کے پاس اکر اس کے احتمالی گناہوں اور لغزشوں کی خدا سے بخشش طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اب یہ مراسم اگر کسی شخص کے لیے انجام نہ دیئے جائیں تو یہ گویا اسے اسلامی معاشرے سے باہر نکال پھینکنے کے مترادف ہے اور اگر اس شخص کو مسترد کر دینے والی شخصیت پیغمبر اکرمؐ کی ہو تو اس مسترد شدہ شخص کے مقام پر یہ ایک سخت ضرب ہوگی۔ درحقیقت یہ سرد جنگ اور مقابلے کا ایک بجا طریقہ ہے۔ دورِ حاضر میں بھی منافقین کے بارے میں مسلمانوں کو ایسے طریقوں سے کام لینا چاہیے یعنی جب تک کچھ افراد اظہارِ اسلام کرتے ہیں اور ظاہراً اسلام کے پابند ہیں تو ان سے ایک مسلمان جیسا سلوک کیا جائے اگرچہ ان کا باطن کچھ اور ہو۔ لیکن اگر وہ خود پردے چاک کر دیں اور اپنا نفاق ظاہر کر دیں تو پھر ان سے اسلام سے بیگانہ افراد کا سا سلوک کرنا چاہیے۔

آیت کے آخر میں ایک بار پھر اس حکم کی دلیل واضح کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے: "یہ حکم اس بنا پر ہے کہ انھوں نے خدا اور اس کے رسول سے کفر اختیار کیا ہے" (انھم کفروا باللہ و رسولہ) اور جب یہ لوگ دنیا سے گئے ہیں تو فاسق اور فرمانِ خدا کے مخالف تھے" نہ وہ اپنے کیے پر پشیمان ہوئے ہیں اور نہ ہی توبہ کے پانی سے انھوں نے اپنا گناہ آلود دامن دھویا ہے (وماتوا وھم فاسقون)۔

ممکن ہے اس مقام پر مسلمانوں سے یہ سوال کیا جائے کہ اگر منافقین سچ مچ رحمتِ الٰہی سے اس قدر دور ہیں اور مسلمانوں کو چاہیے کہ ان سے محبت اور لگاؤ نہ رکھیں تو پھر خدا نے ان سے اس قدر اظہارِ محبت کیوں کیا ہے اور یہ سب مال اور اولاد (اقتصادی اور افرادی قوت) انھیں کیوں دی ہے۔

اگلی آیت میں روئے سخن پیغمبرؐ کی طرف کرتے ہوئے خدا تعالیٰ نے اسی سوال کا جواب دیا ہے اور فرمایا ہے: ان کے اموال و اولاد تمھیں کبھی بھی بھلے معلوم نہ ہوں (ولا تعجبک اموالھم و اولادھم)۔ کیونکہ ظاہر بین لوگ انھیں خوش بختی کی علامت سمجھتے ہیں لیکن" خدا چاہتا ہے کہ انھیں ان کے ذریعے دنیا میں سزا دے اور وہ حالتِ کفر میں مریں (انما یرید اللہ ان یعذبھم بھا فی الدنیا و تزھق انفسھم وھم کافرون)۔

اس آیت کی نظیر اسی سورہ کی آیہ ۵۵ بھی ہے یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اقتصادی اور افرادی وسائل غیر صالح افراد کے ہاتھ میں ہوں تو نہ صرف سعادت بخش نہیں ہیں بلکہ اکثر اوقات دردسر، مصیبت اور بدبختی کا سبب بھی ہیں کیونکہ ایسے افراد نہ اپنے مال کو برمحل صرف کرتے ہیں کہ ان سے مفید اور اصلاحی نفع حاصل کر سکیں اور نہ ہی ان کی اولاد صحیح راہ پر چلنے والی، صاحبِ ایمان اور تربیت یافتہ ہوتی ہے کہ جو ان کی آنکھوں کا نور بن سکے اور ان کی زندگی کی مشکلات حل کر سکے ان کے اموال زیادہ تر ہلاک کر دینے والی سرکش ہوا و ہوس کے لیے فتنہ و فساد پیدا کرنے کے لیے اور ظلم کے ستونوں کو مستحکم کرنے کے لیے صرف ہوتے ہیں۔ یہ دراصل خدا فراموشی اور زندگی کے بنیادی مسائل سے غفلت کے سبب سے ہے ان کی اولاد بھی ظالموں اور فاسد لوگوں کی خدمت میں لگ جاتی ہے اور طرح طرح کے انحرافی اخلاق میں مبتلا ہوتی ہے اور آخر کار مصیبت ہی کا باعث ہوتی ہے۔

البتہ جو لوگ دولت اور افرادی قوت کو بنیادی چیز خیال کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ اسے کس طرح صرف کرنا چاہیے دور سے تو ان کی زندگی بڑی دلفریب معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ان کی اصل زندگی کو ہم قریب سے دیکھیں اور اس

حقیقت کی طرف بھی توجہ رکھیں کہ ان وسائل سے کس طرح استفادہ کیا جانا مقصود ہے تو ہم تصدیق کریں گے کہ وہ خوش بخت لوگ نہیں ہیں۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ **شانِ نزول کی اختلافی روایات:** پہلی آیت کی شانِ نزول کے بارے میں متعدد روایات وارد ہوئی ہیں جو باہم اختلاف رکھتی ہیں۔

ان میں سے کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مشہور منافق عبداللہ بن ابی مرگیا تو پیغمبر اکرمؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر دعا کی۔ یہاں تک کہ اپنا پیراہن کفن کے طور پر اسے پہنایا تو یہ آیت نازل ہوئی اور پیغمبر اکرمؐ کو ایسے عمل کی تکرار سے روکا گیا۔

جبکہ دوسری روایات سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ رسول اللہؐ اس کی نماز پڑھنا چاہتے تھے کہ جبرئیل نازل ہوئے اور آپؐ کے سامنے اس آیت کی تلاوت کی اور آپؐ کو اس کام سے منع کیا۔

کچھ اور روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو رسول اللہؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور نہ ہی آپ ایسا کوئی ارادہ رکھتے تھے بلکہ عبداللہ کے خاندان کی تشویق کے لیے صرف اپنا پیراہن کفن کے طور پر بھیجا جب لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ کام کیوں کیا ہے جبکہ وہ بے ایمان شخص ہے تو آپؐ نے فرمایا: میرا پیراہن اس کے لیے عذابِ الٰہی سے نجات کا باعث نہیں ہوگا لیکن مجھے امید ہے کہ اس عمل کی وجہ سے بہت سے لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔

اور ایسا ہی ہوا کہ اس واقعہ کے بعد قبیلہ خزرج کے بہت سے افراد مسلمان ہوگئے۔

یہ روایات چونکہ آپس میں بہت اختلاف رکھتی ہیں اس لیے ہم ان سے شانِ نزول کی حیثیت سے صرف نظر کرتے ہیں خصوصاً جبکہ بعض مفسرین کے بقول عبداللہ بن ابی کی موت ۹ ہجری میں واقع ہوئی اور زیر نظر آیات تقریباً ۸ ہجری میں نازل ہوئیں[۱]

لیکن جو بات قابلِ انکار نہیں ہے وہ یہ ہے کہ آیت کے لب و لہجہ سے یوں لگتا ہے کہ رسول اللہؐ اس کے نزول سے پہلے منافقین کی نماز جنازہ پڑھتے تھے اور ان کی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تھے کیونکہ وہ ظاہراً مسلمان تھے[۲] مگر اس آیت کے نزول کے بعد یہ طریقہ بالکل متروک ہوگیا۔

۱۔ المیزان جلد ۹ ص ۳۸۵

۲۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد بھی رسول اللہ منافقین کی نماز جنازہ پڑھتے تھے مگر صرف چار تکبیریں کہتے تھے یعنی آخری تکبیر جو میت پر دعا کرنے سے مربوط ہے اسی سے صرف نظر کر لیتے تھے۔

یہ روایت اس صورت میں قابلِ قبول ہو سکتی ہے کہ محل بحث آیت میں "لا تصل" کا معنی "دعا نہ کرو" لیا جائے۔ لیکن اگر اس کا مطلب ہے "نماز نہ پڑھو" تو پھر یہ روایت مخالفِ قرآن ہے اس لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔

اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "ولا تصل" کا ظاہری معنی "نماز نہ پڑھو" ہی ہے لہٰذا ہم اسلامی حکم کی رو سے ایسے افراد کی نماز جنازہ نہیں پڑھ سکتے جن کا نفاق ظاہر ہو اور ایک مبہم روایت کی وجہ سے ہم مندرجہ بالا آیت سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔

۲۔ مومنین کی قبروں کے پاس کھڑے ہونا اور دعا کرنا : زیر بحث آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مومنین کی قبروں کے پاس کھڑا ہونا اور ان کے لیے دعا کرنا جائز ہے آیت میں نہی منافقین کے ساتھ مخصوص ہے

اس بناء پر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ مومنین کی قبور کی زیارت کرنا یعنی ان کی قبروں کے پاس کھڑا ہونا اور دعا کرنا جائز ہے۔

البتہ زیر بحث آیت مومنین کی قبور سے متوسل ہونے اور ان کی برکت سے خدا سے کسی حاجت کا تقاضا کرنے کے مسئلے میں خاموش ہے اگرچہ اس امر کا جائز ہونا روایاتِ اسلامی کی نظر سے مسلّم ہے۔

۸۶۔ وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ○

۸۷۔ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ○

۸۸۔ لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

۸۹۔ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

ترجمہ

۸۶۔ اور جب کوئی سورت نازل ہو کہ خدا پر ایمان لے آؤ اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو ان (منافقین) میں سے جو توانائی رکھتے ہیں تجھ سے اجازت چاہتے ہیں اور کہتے ہیں ہمیں بیٹھ رہنے والوں (جن پر جہاد معاف ہے) کے ساتھ چھوڑ دیجیے۔

۸۷۔ وہ اس بات پر راضی ہیں کہ پیچھے رہ جانے والوں میں سے ہوں اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی ہے لہٰذا وہ نہیں سمجھتے۔

۸۸۔ لیکن رسول اور وہ افراد جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں انھوں نے اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کیا ہے اور سب نیکیاں ان کے لیے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

۸۹۔ اللہ نے ان کے لیے جنت کے باغات تیار کر رکھے ہیں جن کے درختوں کے نیچے سے نہریں جاری ہیں وہ اس میں ہمیشہ کے لیے رہیں گے اور یہ بہت بڑی اور عظیم کامیابی ہے۔

تفسیر

پست ہمت افراد اور سچے مومنین

ان آیات میں بھی منافقین کے بارے میں گفتگو ہے البتہ یہاں ان کی بدکاریوں کا سچے مومنین کے نیک کاموں سے موازنہ کیا گیا ہے اور اس سے ان کا انحراف اور بے چارگی زیادہ واضح ہوتی ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: جس وقت کوئی سورت جہاد کے بارے میں نازل ہوتی ہے اور لوگوں کو خدا پر ایمان لانے کی دعوت دیتی ہے (یعنی کہتی ہے کہ اپنے ایمان پر ثابت قدم رہو اور اسے مستحکم کرو) اور پیغمبر کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو ایسے موقع پر صاحب ثروت منافقین کہ جو جسمانی اور مالی طور پر میدان جنگ میں شرکت کی استعداد رکھتے ہیں تجھ سے اجازت چاہتے ہیں کہ میدان جہاد میں شرکت نہ کریں اور کہتے ہیں کہ ہمیں بیٹھ رہنے والوں (کہ جو جہاد میں شرکت سے معذور ہیں) کے ساتھ رہنے دیجیے (واذا انزلت سورة ان اٰمنوا باللہ وجاھدوا مع رسولہ استاذنک اولوا الطول منھم وقالوا ذرنا نکن مع القٰعدین)۔

"طول" (بروزن "قول") مالی وسائل کے معنی میں آیا ہے اس بنا پر "اولوا الطول" سے مراد وہ افراد ہیں جو میدان جنگ میں شرکت کے لیے کافی مادی طاقت رکھتے تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ چاہتے تھے کہ ان ناتواں افراد کے ساتھ رہ جائیں جو جنگ میں شرکت کے لیے مالی اور جسمانی طور پر کافی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

اس لفظ کی اصل "طول" (بروزن "پُول") ہے جو کہ "عرض" کی ضد ہے اور ان دونوں معانی کی آپس میں مناسبت واضح ہے۔ کیونکہ مالی اور جسمانی توانائی ایک طرح سے طاقت اور قدرت کی کشش عام اور طول کو ظاہر کرتی ہے۔

اگلی آیت میں قرآن ان کی اس جملے کے ذریعے مذمت و ملامت کرتا ہے وہ چاہتے ہیں کہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہیں (رضوا بان یکونوا مع الخوالف)۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے "خوالف" "خالفۃ" کی جمع ہے اس کا مادہ "خلف" ہے جس کا معنی ہے پشت سر۔ اسی بنا پر عورتوں کو جو مردوں کے گھر سے باہر چلے جانے کے بعد گھر میں باقی رہ جاتی ہیں "خالفۃ" کہا جاتا ہے۔ زیر بحث آیت میں "خوالف" سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو کسی وجہ سے میدان جنگ میں شرکت کرنے سے معذور ہیں چاہے وہ عورتیں ہوں یا بوڑھے مرد، بیمار ہوں یا بچے۔

بعض احادیث جو اس آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں وہ بھی اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: گناہ اور نفاق کے زیر اثر وہ اس مرحلہ تک پہنچ گئے ہیں کہ ان کے دلوں پر مہر لگ ہوئی ہے اسی بنا پر وہ کچھ نہیں سمجھتے (وطبع علی قلوبہم فھم لا یفقھون)۔

سورۂ بقرہ کی ابتداء میں ہم نے دل پر مُہر لگنے کے مفہوم پر بحث کی ہے۔[1]

اگلی آیت میں اس کے مقابل گروہ کی صفات و خصوصیات کا ذکر ہے جو بالکل منافقین کی صفات و خصوصیات کے برعکس ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: لیکن رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں انھوں نے اپنی جان و مال سے راہِ خدا میں جہاد کیا ہے (لکن الرسول والذین اٰمنوا معہ جاھدوا باموالھم و انفسھم)۔

اور ان کا انجام کار یہ ہوا کہ طرح طرح کی سعادتیں، کامیابیاں اور دونوں جہانوں کی مادی و روحانی خیرات انہیں نصیب ہوئیں (واولئک لھم الخیرات) اور یہی لوگ کامیاب ہیں (و اولئک ھم المفلحون)۔

لفظ "الخیرات" جمع کا صیغہ ہے جس پر "الف لام" بھی ہے اور اس سے عمومیت کا استفادہ ہوتا ہے یہ ایک ایسی جامع تعبیر ہے کہ جو ہر قسم کی کامیابی، نعمت اور خیر کا مفہوم لیے ہوئے ہے چاہے وہ مادی ہو یا روحانی۔

علم معانی بیان میں جو قواعد بیان ہوئے ہیں ان کے مطابق ان دونوں جملوں کی تعبیرات گواہی دیتی ہیں کہ کامیاب صرف یہی لوگ ہیں اور اسی طرح جو ہر قسم کی خیر و سعادت کا استحقاق رکھتے ہیں صرف یہی لوگ ہیں، وہی جو اپنے پورے وجود اور وسائل کے ساتھ جہاد کرتے ہیں

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایمان اور جہاد اکٹھے ہو جائیں تو پھر ہر طرح کی خیر و برکت ان کے ساتھ ہوگی اور ان دونوں کے بغیر نہ کوئی راستہ فلاح کی طرف جاتا ہے نہ ہی مادی و معنوی نعمات میں کوئی حصہ ملتا ہے۔

یہ نکتہ بھی لائق توجہ ہے کہ ان دونوں گروہوں کی صفات کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ منافق فقدانِ ایمان اور گناہ میں بہت زیادہ آلودگی کی وجہ سے نادان اور جاہل ہیں اور اسی بنا پر عالی ہمتی سے محروم ہیں جو کہ فہم، شعور اور آگہی کی پیداوار ہے وہ اس بات پر راضی ہیں کہ بیماروں اور بچوں کے ساتھ رہ جائیں اور میدانِ جہاد میں شرکت کے فضائل اور افتخارات کے باوجود اس کا انکار کر دیں۔ جبکہ ان کے مقابلے میں اہلِ ایمان ایسی روشن نگاہی، فہم و ادراک اور عالی ہمتی رکھتے ہیں کہ مشکلات سے نجات کی راہ تمام تر وسائل کیساتھ جہاد میں شرکت میں سمجھتے ہیں۔

یہ وہی عظیم درس ہے جو قرآن نے اپنی بہت سی آیات میں ہمیں دیا ہے اور پھر بھی ہم اس سے غافل ہیں۔

زیر بحث آخری آیت میں دوسرے گروہ کی کچھ اخروی جزاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا نے ان کے لیے باغاتِ بہشت تیار کر رکھے ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری کی گئی ہیں (اعد اللہ لھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھٰر) تاکید فرمایا گیا ہے کہ یہ نعمت اور عنایت عاریتاً اور فنا پذیر نہیں ہے بلکہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے (خٰلدین فیھا) اور یہ عظیم کامیابی ہے (ذٰلک الفوز العظیم)۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد اول صفحہ ۹۶ (اردو ترجمہ)

"اعد الله لھم" (خدا نے ان کے لیے تیار کیا ہے) یہ تعبیر موضوع کی اہمیت کی دلیل ہے اور اس احترام کی نشانی ہے جو اس گروہ کو خدا کے نزدیک حاصل ہے یعنی اس نے پہلے سے یہ نعمات و عنایات ان کے لیے تیار کر رکھی ہیں۔

۹۰۔ وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِیُؤْذَنَ لَھُمْ وَقَعَدَ الَّذِیْنَ
كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ سَیُصِیْبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْھُمْ عَذَابٌ
اَلِیْمٌ ○

ترجمہ

۹۰۔ اور اعراب میں سے معذور لوگ (تیرے پاس) آئے ہیں کہ انھیں جہاد سے تخلف کی اجازت دی جائے لیکن وہ لوگ جنھوں نے خدا اور اس کے پیغمبر کے ساتھ جھوٹ بولا ہے (بغیر کسی عذر کے اپنے گھر میں) بیٹھ گئے ہیں، عنقریب ان لوگوں کو جو کافر ہو گئے ہیں (اور معذور نہیں تھے) دردناک عذاب پہنچے گا۔

تفسیر

گزشتہ مباحث بہانہ جو اور عذر تراش منافقین کے بارے میں تھیں اسی مناسبت سے اس آیت میں جہاد میں پیچھے رہ جانے والے دو گروہوں کی کیفیت کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

پہلا گروہ وہ ہے جو واقعتاً معذور تھا۔

دوسرا گروہ وہ ہے جس نے بغیر کسی عذر کے سرکشی کے طور پر اس عظیم ذمہ داری سے روگردانی کی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: بادیہ نشین اعراب کا ایک گروہ جو میدانِ جہاد میں شرکت سے معذور تھا تیرے پاس آیا ہے تاکہ اسے اجازت دی جائے اور معاف رکھا جائے (وجآء المعذرون من الاعراب لیؤذن لھم)۔

ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے خدا اور اس کے رسول کے سامنے جھوٹ بولا ہے اور بغیر کسی عذر کے اپنے گھر میں بیٹھ گئے ہیں اور میدان میں نہیں گئے (وقعد الذین کذبوا اللہ و رسولہ)۔

آیت کے آخر میں دوسرے گروہ کو شدت کے ساتھ تہدید کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: ان میں سے جو کافر ہوا ہے عنقریب وہ دردناک عذاب میں گرفتار ہوگا (سیصیب الذین کفروا منھم عذاب الیم)۔

جو کچھ ہم نے آیت کی تفسیر میں بیان کیا ہے یہی مفہوم آیت میں موجود الفاظ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ ایک طرف تو دیکھیے

تمام کے تمام کافر نہیں تھے ان دو قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ "معذرون" حقیقی معذور تھے۔
لیکن اس تفسیر کے مقابلے میں اس آیت کی دو اور تفسیریں بھی کی گئی ہیں،
پہلی یہ کہ "معذرون" سے مراد وہ لوگ ہیں جو جہاد سے فرار کے لیے فضول، بے ہودہ اور جھوٹے بہانے تراشتے تھے، اور دوسرے گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو عذر تراشی کی زحمت بھی نہیں دیتے تھے اور جہاد کے بارے میں کھل کے حکم خدا کی نافرمانی کرتے تھے۔
دوسری تفسیر یہ ہے کہ "معذرون" کے مفہوم میں تمام گروہ شامل ہیں کہ جو اظہار عذر سے جہاد میں شرکت سے احتراز کرتے تھے چاہے وہ سچے ہوں یا جھوٹے۔
مگر قرائن نشاندہی کرتے ہیں کہ "معذرون" سے مراد حقیقی معذور ہی ہیں۔

۹۱۔ لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاۗءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ مَا عَلَي الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

۹۲۔ وَّلَا عَلَي الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۠ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ۝

۹۳۔ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَي الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَاۗءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

ترجمہ

۹۱۔ ضعفاء، بیمار اور وہ جو (جہاد کی راہ میں) خرچ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رکھتے ان پر کوئی اعتراض نہیں (کہ انھوں نے میدان جہاد میں شرکت نہیں کی) جب کہ وہ خدا اور اس کے رسول سے خیر خواہی کریں (اور جو کچھ طاقت رکھتے ہیں اس سے

دریغ نہ کریں کیونکہ) نیکو کار لوگوں سے مؤاخذہ نہیں ہو سکتا اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۹۲۔ نیز ان پر بھی اعتراض نہیں جو جب تیرے پاس آئے کہ تو انھیں (میدانِ جہاد کے لیے) مرکب پر سوار کرے تو تُو نے کہا کہ میرے پاس سواری نہیں ہے کہ جس پر تمہیں سوار کروں تو وہ (تیرے پاس سے) اس حالت میں لوٹے کہ انکی آنکھیں اشک بار تھیں کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے وہ راہِ خدا میں خرچ کرتے۔

۹۳۔ مواخذہ کی راہ ان کے لیے کھلی ہے جو تجھ سے اجازت چاہتے ہیں جبکہ وہ بے نیاز ہیں (اور کافی وسائل رکھتے ہیں) وہ پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ رہ جانے پر راضی ہو گئے ہیں اور خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے لہٰذا وہ کچھ نہیں جانتے۔

شانِ نزول

پہلی آیت کے بارے میں منقول ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے مخلص اصحاب میں سے ایک نے آپؐ سے عرض کیا:

میں ایک بوڑھا، نابینا اور عاجز شخص ہوں یہاں تک کہ میرے پاس کوئی ایسا شخص بھی نہیں جو میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے میدانِ جہاد میں لے جائے تو کیا اگر میں جہاد میں شرکت کروں تو معذور ہوں؟

پیغمبر اکرمؐ خاموش رہے تو پھر پہلی آیت نازل ہوئی جس میں ایسے افراد کو اجازت دی گئی ہے

اس شانِ نزول سے معلوم ہوتا ہے کہ نابینا افراد تک پیغمبر اکرمؐ کو اطلاع دیئے بغیر جہاد میں شرکت سے پہلو تہی نہیں کرتے تھے اور اس احتمال کی بناء پر کہ شاید ان کا وجود اس حالت میں بھی مجاہدین کی تشویق یا کثرتِ لشکر کے لیے مفید ہو وہ رسول اللہؐ سے اپنی ذمہ داری کے بارے میں پوچھتے تھے۔

دوسری آیت کے بارے میں بھی روایات میں ہے کہ غریب انصار میں سے سات افراد رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تقاضا کیا کہ انھیں جہاد میں شرکت کے لیے وسائل مہیا کیے جائیں لیکن چونکہ پیغمبر اکرمؐ کے پاس انھیں مہیا کرنے کے لیے وسائل نہ تھے تو آپؐ نے انھیں نفی میں جواب دیا۔ وہ اشک آلود نگاہوں سے آپؐ کی بارگاہ سے گئے اور بعد میں "بکاؤن" (رونے والے) کے نام سے مشہور ہوئے۔

تفسیر

وہ معذور جو عشقِ جہاد میں آنسو بہاتے تھے

تمام گروہوں کی کیفیت واضح کرنے کے لیے ان آیات میں جہاد میں شرکت کے لحاظ سے ان کے معذور ہونے یا نہ ہونے کے

بارے میں ایک واضح تقسیم بندی کی گئی ہے۔ ان میں پانچ گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے چار تو واقعاً معذور ہیں اور ایک گروہ منافق اور غیر معذور ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: وہ لوگ جو ضعیف و ناتواں ہیں (بڑھاپے کے سبب نابینائی ہونے کے باعث یا ایسی کسی اور وجہ سے) اسی طرح بیمار اور وہ لوگ جن کے پاس میدانِ جہاد میں شرکت کے لیے ضروری وسائل نہیں ہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں کہ وہ اس واجب اسلامی پروگرام میں شرکت نہ کریں (لیس علی الضعفاء ولا علی المرضیٰ ولا علی الذین لا یجدون ما ینفقون حرج)۔

ان تین گروہوں کے لیے ہر قانون میں معافی ہے اور عقل و منطق بھی اس کی تائید کرتی ہے اور مسلّم ہے کہ اسلامی قوانین کسی مقام پر بھی عقل و منطق سے جدا نہیں ہیں۔

لفظ "حرج" اصل میں کسی چیز کے مرکز اجتماع کے معنی میں ہے اور چونکہ اجتماع اور جمعیت کا تنگی ضیقِ مکاں اور جگہ کی تنگی سے تعلق ہے لہٰذا یہ لفظ تنگی، ناراضی اور مسئولیت کے معنی میں آیا ہے۔ زیر بحث آیت میں یہ لفظ آخری معنی یعنی مسئولیت، جوابدہی اور ذمہ داری کے معنی میں آیا ہے۔

اس کے بعد ان کی معافی کے حکم کے لیے ایک اہم شرط بیان کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: یہ اس صورت میں ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے لیے کسی مخلصانہ خیر خواہی سے دریغ نہ کریں (اذا نصحوا للہ ورسولہ)۔ یعنی اگر چہ وہ ہتھیار ہاتھ میں لیکر میدانِ جنگ میں نہیں جا سکتے۔ لیکن وہ یہ تو کر سکتے ہیں کہ اپنی گفتار و عمل سے مجاہدین کے شوق کو ابھاریں اور جہاد کے ثمرات و نتائج شمار کرکے ان کے جذبات کو تقویت پہنچائیں اور اس کے برعکس جتنا ہو سکے دشمن کے دلوں کو کمزور کریں اور ان کی شکست کے مقدمات کی فراہمی میں کوتاہی نہ کریں۔ یہ مفہوم اس لیے ہے کیونکہ لفظ "نصح" جو اصل میں اخلاص کے معنی میں ہے ایک جامع لفظ ہے۔ اس میں ہر قسم کی خیر خواہی اور مخلصانہ اقدام کا مفہوم پنہاں ہے اور چونکہ یہاں جہاد کا معاملہ درپیش ہے لہٰذا یہاں اس سے مراد ایسی کوششیں ہیں جو اس سلسلے میں درکار ہیں۔

بعد میں اس امر کی دلیل بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے ایسے افراد نیک لوگ ہیں اور نیکوکاروں کے لیے ملامت، سرزنش، سزا اور مؤاخذہ کا کوئی راستہ نہیں ہے (ما علی المحسنین من سبیل)۔

آیت کے آخر میں خدا تعالیٰ کی دو عظیم صفات بیان کی گئی ہیں یہ بھی درحقیقت ان تین گروہوں کی معافی کی ایک دلیل کے طور پر بیان ہوئی ہیں ارشاد ہوتا ہے: خدا غفور اور رحیم ہے (واللہ غفور رحیم)۔

"غفور" "غفران" کے مادہ سے ستر اور پوشیدہ کرنے کے معنی میں ہے یعنی خدا اس صفت کے تقاضا کی بنا پر معذور اور ناتواں افراد کے کام پر پردہ ڈال دیتا ہے اور ان کے عذر قبول کر لیتا ہے۔

اور خدا کا "رحیم" ہونا مقتضی ہے کہ وہ شاق اور مشکل ذمہ داری کسی پر نہ ڈالے اور اسے معاف رکھے یہ لوگ اگر میدانِ جہاد میں حاضر ہونے پر مجبور ہوتے تو یہ امر خدا کی غفوریت اور رحیمیت سے مناسبت نہ رکھتا۔ لیکن غفور و رحیم خدا انھیں یقیناً معاف رکھے گا۔

چند ایک روایات جو مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں نقل کی ہیں۔ ان سے اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ معذور لوگوں کو نہ صرف یہ کہ اس ذمہ داری سے رخصت دی گئی ہے اور ان سے سزا برطرف کر دی گئی ہے بلکہ میدان جہاد میں شرکت کے لیے انھیں جس قدر اشتیاق ہے اس کے حساب سے وہ جزا و ثواب اور اعزازات میں بھی مجاہدین کے ساتھ شریک ہیں جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ایک حدیث میں بھی ہے کہ جس وقت آپؐ جنگ تبوک سے واپس آئے اور مدینہ کے قریب پہنچے تو فرمایا:

اس شہر میں تم کچھ ایسے افراد کو چھوڑ گئے تھے جو تمام راستے میں تمہارے ساتھ ساتھ تھے جو قدم تم نے اٹھایا اور جو مال تم نے اس راہ میں خرچ کیا اور جس زمین سے تم گذرے وہ تمہارے ہمراہ تھے۔

صحابہ نے عرض کیا:

یا رسول اللہ! وہ کس طرح ہمارے ساتھ تھے جبکہ وہ مدینہ میں تھے۔

رسول اللہؐ نے فرمایا:

اس بنا پر کہ وہ کسی عذر کی وجہ سے جہاد میں شرکت نہیں کر سکے (لیکن ان کے دل ہمارے ساتھ تھے)[1]

اس کے بعد چوتھے گروہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جسے جہاد میں شرکت سے معافی دی گئی ہے فرمایا گیا ہے: اسی طرح اس گروہ پر بھی کوئی اعتراض نہیں جو تیرے پاس آیا کہ تو انھیں میدان جہاد میں شرکت کے لیے سواری فراہم کر دے اور تو نے کہا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں کہ جس پر تمہیں سوار کروں تو مجبوراً وہ تیرے پاس سے اس حالت میں گئے کہ ان کی آنکھیں اشکبار تھیں اور دریا آنسو اس غم میں تھے کہ ان کے پاس راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے کچھ نہ تھا (ولا على الذين اذا ما اتوك لتحملهم قلت لا اجد ما احملكم عليه تولوا واعينهم تفيض من الدمع حزناً الا يجدوا ما ينفقون)۔

"تفیض" "فیضان" کے مادہ سے ہے اس کا معنی ہے پُر ہونے کے تیجہ میں گرنا۔ جب انسان کو تکلیف ہوتی ہے اگر اس کی تکلیف اور دکھ زیادہ شدید نہ ہو تو آنکھیں آنسوؤں سے پُر ہو جاتی ہیں لیکن آنسو جاری نہیں ہوتے لیکن اگر دکھ اور تکلیف شدید ہو جائے تو اشک رواں ہو جاتے ہیں۔

یہ صورت نشان دہی کرتی ہے کہ یہ اصحاب پیغمبرؐ جہاد کے اس قدر مشتاق اور عاشق تھے کہ نہ صرف معافی مل جانے پر خوش نہ تھے بلکہ اس طرح آنسو بہا رہے تھے جیسے ان کا کوئی بہترین عزیز اور دوست کھو گیا ہو۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ یہ چوتھا گروہ تیسرے سے علیحدہ نہیں جس کا ذکر گذشتہ آیت میں ہوا ہے لیکن اس کا ایک خاص امتیاز ہے اور اس گروہ کی قدردانی کے لیے مستقل ایک آیت میں ان کی کیفیت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

---

[1] المیزان جلد ۹ صفحہ ۳۸۶ بحوالہ در المنثور۔

ان کا اعتقاد یہ تھا کہ ــــــــــ،

۱۔ انھوں نے اس پر قناعت نہیں کی کہ ان کے پاس جہاد میں شرکت کے وسائل نہیں تو بیٹھ رہیں بلکہ وہ رسول اللہ کے پاس گئے اور سواری کے لیے ان سے اصرار کیا۔

۲۔ جب رسول اللہ نے انھیں نفی میں جواب دیا تو نہ صرف یہ کہ معافی ملنے پر وہ خوش نہیں ہوئے بلکہ بہت دکھی اور پریشان ہوئے۔

ان وجوہ کی بناء پر خدا تعالیٰ نے ان کا خاص طور پر الگ سے ذکر کیا ہے۔

آخری آیت میں پانچویں گروہ کی حالت بیان کی گئی ہے یعنی وہ کہ جن کے پاس بارگاہِ الٰہی کے لیے کوئی عذر نہیں تھا، فرمایا گیا ہے: مواخذہ اور سزا کی راہ صرف ان لوگوں کے سامنے کھلی ہے جو تجھ سے اجازت چاہتے ہیں کہ جہاد میں شرکت نہ کریں جبکہ اس کام کے لیے ان کے پاس کافی اور ضروری وسائل موجود ہیں اور وہ بالکل بے نیاز ہیں (انما السبیل علی الذین یستأذنونک وھم اغنیاء)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ان کے لیے یہ ننگ وعار کافی ہے کہ وہ اس بات پر راضی ہیں کہ ناتواں، بیمار اور معذور افراد کے ساتھ مدینہ میں رہ جائیں اور جہاد میں شرکت کے اعزاز سے محروم رہیں۔ (رضوا بان یکونوا مع الخوالف)۔

اور یہ سزا بھی ان کے لیے کافی ہے کہ خدا نے ان کے برے اعمال کی وجہ سے فکر و ادراک کی قدرت ان سے چھین لی اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی اور اس بناء پر وہ کچھ نہیں جانتے (وطبع اللہ علیٰ قلوبھم فھم لا یعلمون)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ مجاہدین کا جذبہ جہاد و شہادت: ان آیات سے مجاہدینِ اسلام کے قوی اور عالی جذبے کا اظہار ہوتا ہے کہ کس طرح ان کے دلوں میں جہاد و شہادت کا عشق موجزن تھا وہ اس اعزاز کو ہر اعزاز پر مقدم سمجھتے تھے۔ یہی سے اس وقت اسلام کی تیز رفتار پیش رفت اور اس وقت ہماری پس ماندگی کے اہم عوامل سامنے آتے ہیں۔

ہم کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ جہاد میں شرکت سے معافی ملنے پر جن کی آنکھوں میں برسات کی جھڑیاں لگ جاتی ہیں ان لوگوں کے برابر ہو جائیں جو جہاد میں شرکت نہ کرنے کے لیے بہانے تراشتے ہیں۔

اگر ایمان کی وہی روح آج بھی زندہ ہو جائے، عشقِ جہاد اور جذبہ شہادت دلوں میں پھر سے موجزن ہو جائے تو آج بھی کامیابی اور پیش رفت اسی طرح سے ہو جیسے آغازِ اسلام میں تھی بدبختی یہی ہے کہ ہم نے فقط اسلام کا ظاہری لباس پہن رکھا ہے۔ اور اسلام ہمارے وجود کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔ پھر بھی ہم اپنے آپ کو آغازِ اسلام کے مسلمانوں کی طرح کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔

۲۔ جہاد کے کئی مراحل ہیں: زیر بحث آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو مجاہدین کی ہمکاری سے مکمل طور پر معافی نہیں مل سکتی۔ یہاں تک کہ جو افراد بیمار ہیں یا نابینا ہیں یا فطری طور پر ہتھیار اٹھانے اور میدانِ جہاد میں شرکت کی طاقت نہیں رکھتے

انہیں بھی چاہیے کہ وہ زبان سے یا کسی اور طرح سے تبلیغ کے ذریعے مجاہدین کو شوق دلائیں اور ان کی معاونت کریں۔ ایسے لوگوں کو بھی اپنی ذمہ داری کو فراموش نہیں کرنا چاہیے اور بالکل ایسے امور سے کنارہ کش نہیں ہو جانا چاہیے۔

درحقیقت جہاد کے کئی مرحلے ہیں اور اس کے ایک مرحلے سے معذور ہونا دوسرے مراحل سے معذور ہونے کی دلیل نہیں ہے۔

۲۔ ایک وسیع قانون کا سرچشمہ: "ما علی المحسنین من سبیل" (نیکوکاروں سے مواخذہ کی کوئی راہ نہیں) یہ جملہ فقہی مباحث میں ایک وسیع قانون کا سرچشمہ ہے اس قانون سے علماء نے بہت سے احکام اخذ کیے ہیں۔

مثلاً اگر کسی امین شخص کے ہاتھ سے کوئی امانت بغیر کسی افراط و تفریط کے تلف ہو جائے تو ایسا شخص نقصان کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں دیگر دلائل کے علاوہ اس آیت کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔

البتہ اس میں شک نہیں کہ یہ آیت مجاہدین کے بارے میں ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ آیت کا کسی ایک واقعہ کے بارے میں ہونا اس کی عمومیت کو ختم نہیں کرتا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی ایک مسئلہ کے بارے میں ہونا آیت کو اسی میں محدود نہیں کرتا۔

یہاں
دسویں پارے
کی تفسیر کا اختتام ہوتا ہے

۹۴ يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا لَنْ
نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۭ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ
وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

۹۵۔ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا
عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ رِجْسٌ ۡ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ
جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○

۹۶۔ يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ
لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ○

ترجمہ

۹۴۔ جس وقت تم ان کی طرف (جنھوں نے جہاد سے تخلف کیا ہے) لوٹ کر آئے تو تم سے عذر خواہی کریں گے کہہ دو کہ معذرت نہ کرو ہم ہرگز تم پر ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ اللہ نے ہمیں تمھاری خبروں سے آگاہ کیا ہے اور خدا اور اس کا رسول تمھارے اعمال دیکھتا ہے پھر تم اس کی طرف پلٹ جاؤ گے جو پنہاں اور آشکار سے آگاہ ہے اور وہ تمھیں اس سے آگاہ کرے گا (اور اس کی جزا دیگا) جو کچھ تم انجام دیتے تھے۔

۹۵۔ جب تم ان کی طرف لوٹ کر گئے تو وہ تمھارے لیے قسم کھائیں گے کہ ان سے اعراض (اور صرف نظر) کرو۔ تم ان سے اعراض کرو (اور منہ پھیر لو) کیونکہ وہ پلید ہیں اور ان کے رہنے کی جگہ جہنم ہے، ان اعمال کی سزا میں جو وہ انجام دیتے تھے۔

۹۶۔ قسم کھا کے تم سے چاہتے ہیں کہ ان سے راضی ہوجاؤ اگر تم ان سے راضی ہوجاؤ تو خدا فاسقین کے گروہ سے راضی نہیں ہوگا۔

شانِ نزول

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیات ان منافقین کے بارے میں نازل ہوئیں جن کی تعداد اسی سے زیادہ تھی کیونکہ جب آپؐ جنگ تبوک سے واپس ہوئے تو آپؐ نے حکم دیا کہ کوئی شخص ان کے ساتھ نہ بیٹھے اور نہ ان سے گفتگو کرے اور جب انھوں نے اپنے آپکو معاشرے کے شدید دباؤ میں دیکھا تو معذرتیں کرنے لگے۔ اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں ان کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔

تفسیر

جھوٹی معذرتوں اور قسموں پر اعتبار نہ کرو

یہ آیات بھی منافقین کے شیطانی اعمال کے بارے میں ہیں یکے بعد دیگرے ان کے مختلف کاموں سے پردہ اٹھایا جارہا ہے اور مسلمانوں کو خبردار کیا جارہا ہے کہ وہ ان کے ریاکارانہ اعمال اور ظاہری دل پذیر باتوں سے دھوکا نہ کھائیں۔

زیر نظر پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے، جب تم (جنگ تبوک سے) مدینہ کی طرف لوٹ کر جاؤ گے تو منافقین تمھارے پیچھے آئیں گے اور معذرت کریں گے (یعتذرون الیکم اذا رجعتم الیھم)۔

"یعتذرون" فعل مضارع ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کو پہلے ہی سے اس بات سے آگاہ کر رکھا تھا کہ بہت جلد منافقین جھوٹ موٹ عذر خواہی کرتے ہوئے ان کے پاس آئیں گے لہٰذا جواب دینے کا طریقہ بھی مسلمانوں کو بتا دیا گیا۔

پھر پیغمبر اکرمؐ کی طرف مسلمانوں کے رہبر کی حیثیت سے روئے سخن کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: منافقین سے کہہ دو کہ معذرت نہ کرو ہم ہرگز تمھاری باتوں پر ایمان نہیں لائیں گے (قل لا تعتذروا لن نؤمن لکم)۔ "کیونکہ خدا نے ہمیں تمھاری خبروں سے آگاہ کر دیا ہے"۔ لہٰذا ہم تمھاری شیطانی سازشوں سے اچھی طرح باخبر ہیں (قد نبّأنا اللہ من اخبارکم)۔ لیکن اس کے باوجود تمھارے لیے بازگشت اور توبہ کی راہ کھلی ہے۔ اور منقریب خدا اور اس کا رسول تمھارے اعمال دیکھے گا (وسیری اللہ عملکم ورسولہ)۔

آیت کی تفسیر کے ضمن میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس جملے سے تو یہ مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ آئندہ بھی خدا اور اس کا رسول (وحی الٰہی کے مطابق) تمھارے اعمال اور سازشوں سے آگاہ ہوں گے اور انہیں نقش بر آب کر دیں گے لہٰذا نہ تم آج کچھ کر سکتے ہو اور نہ کل۔

لیکن پہلی تفسیر ظاہر آیت کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

ضمنی طور پر آپ متوجہ رہیں کہ اس جملے کے بارے میں اور امت کے تمام اعمال اس کے پیغمبرؐ کے سامنے پیش ہونے کے مسئلے کے متعلق ہم اسی سورہ کی آیہ ۱۰۵ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کریں گے۔

بعد میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے تمام اعمال اور تمہاری نیتیں ثبت اور محفوظ ہو جائیں گی "پھر تم اس کی طرف پلٹ جاؤ گے جو تمہارے پنہاں اور آشکار امور کو جانتا ہے اور وہ تمہیں تمہارے اعمال سے آگاہ کرے گا" اور تمہیں ان کی جزا دے گا (ثم تردون الی عالم الغیب والشهادة فینبئكم بما كنتم تعملون)۔

بعد والی آیت میں دوبارہ منافقین کی جھوٹی قسموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، وہ تمہیں فریب دینے کے لیے عنقریب قسم کا سہارا لیں گے اور جب تم ان کی طرف لوٹو گے تو خدا کی قسمیں کھائیں گے کہ ان سے صرف نظر کر لو اور اگر ان سے کوئی خطا ہوئی ہے تو انہیں معاف کر دو (سيحلفون بالله لكم اذا انقلبتم اليهم لتعرضوا عنهم)۔

درحقیقت وہ ہر دروازے سے داخل ہونے کی کوشش کریں گے کبھی بہانوں سے اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کبھی اعتراف گناہ کریں گے اور عفو و درگزر کا تقاضا کریں گے۔ وہ سوچتے ہیں کہ شاید کسی طریقے سے تمہارے دلوں میں جگہ پیدا کر لیں۔

لیکن تم کسی طرح سے بھی ان سے اثر نہ لینا اور "ان سے منہ پھیر لو" البتہ ناراضی کے اظہار کے طور پر نہ کہ عفو و بخشش کے طور پر (فاعرضوا عنهم)۔

وہ اعراض کا تقاضا کرتے ہیں لیکن درگزر کے معنی میں۔ تم بھی اعراض کرو مگر انکار کے معنی میں۔ یہ دونوں تعبیریں مشابہ ہیں اور بالکل متضاد معانی پیش کرتی ہیں۔ اس انداز کی لطافت اور خوبصورتی اہلِ ذوق سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اس کے بعد تاکید، توضیح اور دلیل کے طور پر فرمایا گیا ہے: کیونکہ وہ پلید لوگ ہیں اور ایسی نجس موجودات سے منہ پھیرنا ہی چاہیے (انهم رجس)۔ اور چونکہ ایسے ہیں لہٰذا ان کے لیے جہنم کے علاوہ کوئی ٹھکانا نہیں ہو سکتا (وماوٰهم جهنم)۔ کیونکہ جنت میں نیک پاک لوگوں کی جگہ ہے نہ کہ پلید اور گندے لوگوں کی۔

لیکن "یہ سب کچھ ان اعمال کا نتیجہ ہے جو انہوں نے خود انجام دیئے ہیں (جزاء بما كانوا يكسبون)۔

زیر بحث آخری آیت میں ان کی ایک اور قسم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ "وہ اصرار کر کے اور قسم کھا کے چاہتے ہیں کہ تم ان سے راضی اور خوش ہو جاؤ (يحلفون لكم لترضوا عنهم)۔

پہلی آیت میں جس قسم کا ذکر ہے وہ اس بناء پر تھی کہ مومنین عملاً انہیں ملامت نہ کریں۔ لیکن اس آیت میں جس قسم کا تذکرہ ہے وہ اس طرف اشارہ ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ عملی پہلو کے علاوہ مومنین دلی طور پر بھی ان سے خوش ہو جائیں۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ خدا تعالیٰ اس مقام پر یہ نہیں فرماتا کہ "تم ان سے راضی نہ ہونا" بلکہ یہاں موجود تعبیر سے تہدید کی بو آتی ہے۔ فرمایا گیا ہے: اگر تم ان سے راضی ہو جاؤ تو خدا فاسقین کی قوم سے کبھی راضی نہیں ہوگا (فان ترضوا عنهم فان الله لا يرضى عن القوم الفسقين)۔

اس میں شک نہیں کہ دینی اور اخلاقی طور پر وہ مسلمانوں کو خوش نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ اس طرح مسلمانوں کے دل کی ناراضی دور کرنا چاہتے تھے تاکہ آئندہ ان کے کام چل سکیں

لیکن "لا یرضیٰ عن القوم الفٰسقین" کہہ کر خدا تعالیٰ مسلمانوں کو خبردار کرتا ہے کہ یہ فاسق ہیں لہٰذا مسلمانوں کو ان سے ہرگز راضی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ فقط ان کی پُر فریب چالیں ہیں۔ لہٰذا بیدار ہو تاکہ ان کے جال میں نہ پھنس جاؤ۔

کیا ہی اچھا ہو کہ ہر زمانے میں مسلمان منافقین کی شیطانی اور جانی پہچانی سازشوں پر نظر رکھیں تاکہ وہ ان کے سامنے اپنے پرانے پُر فریب طریقے استعمال نہ کر سکیں اور اس طرح کہیں وہ اپنے بُرے مقاصد میں کامیاب نہ ہونے پائیں۔

۹۷۔ اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ کُفۡرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجۡدَرُ اَلَّا یَعۡلَمُوۡا حُدُوۡدَ مَاۤ
اَنۡزَلَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ○

۹۸۔ وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ مَغۡرَمًا وَّیَتَرَبَّصُ بِکُمُ
الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَیۡہِمۡ دَآئِرَۃُ السَّوۡءِ ؕ وَاللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ○

۹۹۔ وَمِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَیَتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ
قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰہِ وَصَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّہَا قُرۡبَۃٌ لَّہُمۡ ؕ سَیُدۡخِلُہُمُ
اللّٰہُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ○

ترجمہ

۹۷۔ بادیہ نشین عربوں کا کفر اور نفاق شدید تر ہے اور جو کچھ خدا نے اپنے پیغمبر پر نازل کیا ہے اس کی حدود (اور سرحدوں) کی جہالت کے وہ زیادہ حق دار ہیں اور خدا دانا اور حکیم ہے۔

۹۸۔ (ان) بادیہ نشین عربوں میں سے (کچھ لوگ) جو کچھ (راہِ خدا میں) خرچ کرتے ہیں اسے تاوان شمار کرتے ہیں اور تمہارے بارے میں دردناک حوادث کی توقع رکھتے ہیں (حالانکہ) دردناک حوادث ان کے لیے ہیں اور خدا سننے والا اور دانا ہے۔

۹۹۔ بادیہ نشین عربوں میں سے (کچھ اور لوگ) خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اسے خدا کے ہاں قُرب اور پیغمبر کی دعاؤں کا باعث سمجھتے ہیں۔ آگاہ رہو کہ یہ ان کے تقرب کا باعث ہیں۔ خدا بہت جلد

انھیں اپنی رحمت میں داخل کر دے گا کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر

سنگدل اور صاحب ایمان بادیہ نشین

گزشتہ آیات میں منافقین مدینہ کے بارے میں گفتگو تھی۔ ان آیات میں اسی مناسبت سے بادیہ نشین منافقین کی نشانیوں اور افکار کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اس کے ساتھ ساتھ مخلص اور سچے بادیہ نشین مومنین کے بارے میں بھی بات کی گئی ہے۔

شاید اس وجہ سے کہ مسلمانوں کو خبردار کیا جائے کہ وہ کہیں یہ خیال نہ کریں کہ منافقین صرف شہر میں رہتے ہیں، بتایا گیا ہے کہ بادیہ نشین منافقین ان سے بھی سخت تر ہیں۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ مسلمانوں پر ان منافقین کی طرف سے بارہا حملے ہوئے ہیں۔ لشکر اسلام کی پے در پے فتوحات کے سبب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس خطرہ کو نظر انداز کر دے۔ بہرحال پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: بادیہ نشین اعراب (تعلیم و تربیت سے دوری اور آیات الٰہی اور پیغمبر کے ارشادات نہ سننے کی وجہ سے) کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں (الاعراب اشد کفرا و نفاقا)۔ اسی وجہ سے وہ ان فرامین و احکام کی حدود کی جہالت کے زیادہ حق دار ہیں جو خدا نے اپنے رسول پر نازل کیے ہیں (واجدر ان لا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ)۔

"اعراب" جمع کا معنی رکھنے والے لفظوں میں سے ہے لیکن لغت عرب کے لحاظ سے اس کا مفرد نہیں ہے جیسا کہ علماء لغت مثلاً قاموس، صحاح اور تاج العروس کے مؤلف اور دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ یہ لفظ صرف بادیہ نشین عربوں پر بولا جاتا ہے اور اس کے مفرد کے لیے یائے نسبت کے ساتھ "اعرابی" کی صورت میں بولتے ہیں۔ اس بناء پر بہت سے لوگوں کے تصور کے برخلاف "اعراب" "عرب" کی جمع نہیں ہے۔

"اجدر" "جدار" کے مادہ سے دیوار کے معنی میں ہے بعد از اں یہ لفظ ہر مرتفع اور مناسب چیز کے لیے بولا جانے لگا اسی وجہ سے عام طور پر "اجدر" زیادہ شائستہ اور مناسب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، خدا دانا اور حکیم ہے یعنی اگر بادیہ نشین عربوں کے بارے میں اس قسم کا فیصلہ کرتا ہے تو خاص مناسبت کے سبب ہے کیونکہ ان کا ماحول ایسی صفات رکھتا ہے (واللہ علیم حکیم)۔ لیکن اس بنا پر کہ کہیں یہ وہم پیدا نہ ہو کہ تمام بادیہ نشین عرب یا دنیا کے سب بادیہ نشین ان صفات کے حامل ہوتے ہیں، بعد والی آیت میں ان میں سے دو مختلف گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: "ان بادیہ نشین عربوں میں سے ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو جب کوئی چیز راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو نفاق یا کمزور ایمان کی وجہ سے اسے نقصان اور خسارہ شمار کرتے ہیں" نہ کہ ایک کامیابی اور سودمند تجارت (ومن الاعراب من یتخذ ما ینفق مغرما)۔[1]

---

[1] "مغرم" جیسا کہ مجمع البیان میں آیا ہے "غرم" (بروزن "جرم") کے مادہ سے ہے۔ در اصل یہ کسی چیز کے لازم ہونے کے معنی میں ہے۔ بعد ازاں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ان کی ایک صفت یہ ہے کہ "ہمیشہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تمھیں مشکلات گھیر لیں اور بدبختی اور ناکامی تمھیں آلے (ویتربص بکم الدوآئر)۔

"دوآئر" "دآئرہ" کی جمع ہے اور اس کا معنی مشہور ہے لیکن وہ سخت اور دردناک حوادث انسان کا احاطہ کر لیتے ہیں عرب انہیں دائرہ کہتے ہیں اور جمع کی حالت میں "دوآئر" کہتے ہیں۔

درحقیقت وہ لوگ تنگ نظر، بخیل اور بہت حاسد ہیں اپنے بخل ہی کی وجہ سے وہ راہ خدا میں ہر طرح کی مالی خدمت کو نقصان شمار کرتے ہیں اور اپنے حسد کی وجہ سے وہ دوسروں کے لیے مشکلات اور مصائب کے انتظار میں رہتے ہیں۔

مزید فرمایا گیا ہے کہ وہ تمھارے لیے ظہور مشکلات اور نزولِ بلا کا انتظار نہ کریں اور تمھارے لیے ان کی توقع نہ رکھیں۔ کیونکہ یہ مشکلات، ناکامیاں اور بدبختیاں صرف اس منافق، بے ایمان، جاہل، نادان، تنگ نظر اور حاسد گروہ کی تلاش میں ہیں (علیہم دائرۃ السوء) [1]

آخر میں آیت کو اس جملے پر ختم کیا گیا ہے کہ "خدا سننے والا اور جاننے والا ہے (واللہ سمیع علیم) ان کی باتوں کو بھی سنتا ہے اور ان کی نیتوں اور مافی الضمیر سے بھی آگاہ ہے۔

آخری آیت میں دوسرے گروہ یعنی بادیہ نشینوں میں سے مخلص مومنین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان بادیہ نشین عربوں میں سے ایک گروہ ان کا ہے جو خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں (ومن الاعراب من یؤمن باللہ والیوم الاٰخر)۔

اسی بنا پر وہ راہ خدا میں خرچ کرنے کو کبھی نقصان اور زیاں نہیں سمجھتے بلکہ اس جہان میں اور دوسرے جہان میں خدا کی وسیع جزا اور ثواب کی طرف توجہ کرتے ہوئے اس کام کو قربِ الٰہی کا ذریعہ، پیغمبر کی توجہ اور دعا کا باعث سمجھتے ہیں جو کہ افتخار اور عظیم برکت ہے (ویتخذ ما ینفق قربات عند اللہ وصلوات الرسول)۔

یہاں خدا تعالیٰ ان کی طرزِ فکر کی بڑی تاکید سے تصدیق کرتا ہے اور کہتا ہے: آگاہ رہو کہ یقیناً ان کا یہ انفاق اور خرچ بارگاہِ خدا میں قرب کا باعث ہیں (الا انھا قربۃ لھم) اور اسی بنا پر "خدا انھیں بہت جلد اپنی رحمت میں داخل کرے گا (سیدخلھم اللہ فی رحمتہ)۔ اگر ان سے کچھ لغزشیں ہوں تو ان کے ایمان اور پاک اعمال کی وجہ سے انھیں بخش دیگا "خدا بخشنے والا مہربان ہے (ان اللہ غفور رحیم)۔

اس آیت میں جو پے در پے تاکیدیں نظر آتی ہیں بہت جالبِ توجہ ہیں۔ لفظ "الا" اور "ان" دونوں تاکید کے لیے ہیں اس کے بعد "سیدخلھم اللہ فی رحمتہ" کا جملہ اور خاص طور پر اس میں لفظ "فی" رحمتِ خدا میں غوطہ زن ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ بعد میں

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) قرض خواہ اور مقروض کو "غریم" کہا جانے لگا جو ایک دوسرے کو نہیں چھوڑتے اور اتفاق طور پر ایک دوسرے کو چمٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ "غرامت" بھی اسی مناسبت سے استعمال ہوتا ہے کہ نقصان ایک مقروض ہوتا ہے جب تک ادا کر لے وہ اس سے جدا نہیں ہوتی۔ عشق شدید کو بھی "غرام" کہتے ہیں کیونکہ وہ انسان کی روح میں اس طرح اُترتا ہے کہ جدا نہیں ہوتا اور "مغرم" اور "غرامت" کا ایک ہی معنی ہے۔

[1] یہ جملہ حصر کا معنی دیتا ہے یعنی بُرے حوادث بس انہیں دامن گیر ہوتے ہیں اور یہ حصر اس بنا پر ہے کہ "علیہم" جو خبر ہے مبتدا سے مقدم ہے۔

آخری جملہ بھی " ان " سے شروع ہوتا ہے اور خدا کی شفقت و مہربانی کی صفات " غفور رحیم " کا ذکر کرتا ہے یہ سب اس گروہ کے لیے خدا تعالیٰ کے انتہائی لطف و رحمت کا بیان ہے انھوں نے تعلیم و تربیت سے محروم ہونے اور آیات الٰہی اور ارشادات پیغمبر تک کافی رسائی نہ ہونے کے باوجود جان و دل سے اسلام قبول کیا ہے اور مالی وسائل نہ رکھنے کے باوجود (کہ جو ان کی بادیہ نشینی کا لازمہ ہے) وہ راہِ خدا میں خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ شاید اس بناء پر یہ لوگ شہروں میں رہنے والے اور ہر طرح کے وسائل رکھنے والے افراد کی نسبت قدردانی کے زیادہ حق دار ہیں۔

اس نکتہ کی جانب خصوصیت سے توجہ درکار ہے کہ منافق اعراب کے بارے میں " علیہم دائرۃ السوء " استعمال ہوا ہے جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ بدبختیاں ان پر محیط ہیں۔ لیکن باایمان اور فداکار اعراب کے لیے " فی رحمتہ " استعمال ہوا ہے جو ان پر رحمتِ الٰہی کے محیط ہونے کو بیان کرتا ہے ایک گروہ کو بدبختی نے گھیر رکھا ہے اور دوسرے پر رحمتِ الٰہی احاطہ کیے ہوئے ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ آبادی کے بڑے مراکز: عظیم معاشروں اور آبادی کے بڑے مراکز کو اسلام جو اہمیت دیتا ہے وہ مندرجہ بالا آیت سے واضح ہو جاتی ہے یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اسلام ایسے پسماندہ ماحول سے اٹھا ہے کہ جس سے تمدن کی بو بھی نہ آتی تھی اس کے باوجود وہ تمدن کے اصلاحی عوامل کی خاص اہمیت کا قائل ہے اور اس کی اس بات پر نظر ہے کہ جو لوگ شہر سے دور افتادہ علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں وہ ایمان اور مذہبی معلومات میں اس لیے پیچھے ہیں کہ ان کے پاس تعلیم و تربیت کے لیے کافی وسائل اور مواقع نہیں ہیں۔ لہٰذا نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

والزموا السواد الاعظم فان ید اللہ مع الجماعۃ

بڑے مراکز سے لازماً وابستہ رہو کیونکہ خدا کا ہاتھ جماعت کے ساتھ ہے[1]

لیکن اس بات کا یہ مفہوم نہیں کہ سب لوگ شہروں کا رُخ کر لیں اور دیہات جو شہروں کی آبادی کا باعث ہیں انھیں ویران کر دیں بلکہ اس کے برعکس چاہیے کہ شہروں سے علم و دانش دیہات کی طرف لائی جائے اور دیہات میں تعلیم و تربیت، دین و ایمان اور بیداری و آگاہی کے فروغ اور تقویت کی کوشش کی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ اگر دیہی عوام کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور انھیں شہری علوم و آداب، کتبِ آسمانی کی آیات اور پیغمبر خدا اور ہادیانِ برحق کی تعلیمات سے محروم رکھا جائے تو کفر و نفاق انھیں تیزی سے گھیر لے گا۔

دیہاتی لوگ صحیح تعلیم و تربیت زیادہ قبول کرتے ہیں کیونکہ ان میں صاف دل اور پاک فکر افراد زیادہ ہوتے ہیں جنھیں کسی کا ہاتھ نہیں لگا ہوتا اور ان میں شہری شیطنتیں اور سازشیں کم ہوتی ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۷۔

۲۔ بادیہ نشین اور شہری: "اعرابی" اگرچہ "بادیہ نشین" کے معنی میں ہے لیکن اسلامی روایات میں اس کا ایک وسیع تر مفہوم لیا گیا ہے بالفاظ دیگر اس کا اسلامی مفہوم کسی علاقے سے وابستہ نہیں ہے بلکہ طرزِ فکر اور سطحِ فکری سے مربوط ہے جو لوگ اسلامی آداب سنن اور تعلیم و تربیت سے دور ہیں، اگرچہ شہر میں رہتے ہوں اعرابی ہیں اور اسلامی آداب و سنن سے آگاہ بادیہ نشین بھی اعراب نہیں ہیں۔

امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک مشہور حدیث میں ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

من لم یتفقه منکم فی الدین فهو اعرابی

تم میں سے جو شخص اپنے دین سے آگاہ نہیں، اعرابی ہے [1]

یہ فرمان ہماری مندرجہ بالا گفتگو پر ایک واضح گواہ ہے۔

ایک اور روایت میں ہے:

من الکفر التعرب بعد الهجرة

ہجرت کے بعد بادیہ نشینی اور تعرب کفر ہے۔

نیز نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے اپنے اصحاب میں سے معصیت کار لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

واعلموا انکم صرتم بعد الهجرة اعرابا

جان لو کہ تم ہجرت کے بعد اعرابی ہو گئے ہو [2]

مندرجہ بالا دو احادیث میں اعرابی ہونے کو ہجرت کے بالمقابل بیان کیا گیا ہے۔ اگر ہم اس طرف توجہ کریں کہ ہجرت کا وسیع مفہوم بھی مکانی اور علاقائی پہلو نہیں رکھتا بلکہ اس کی بنیاد محور کفر سے فکر کو محور ایمان کی طرف منتقل کرنا ہے تو اس حصے اعرابی ہونے کا معنی بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اسلامی آداب و سنن سے جاہلیت کے آداب و رسوم کی طرف پھر جانا۔

۳۔ قربِ الٰہی کا مفہوم: مندرجہ بالا آیات میں باایمان بادیہ نشین عرب کے بارے میں ہے کہ وہ اپنے انفاق اور راہ خدا میں خرچ کرنے کو قرب خدا کا سبب سمجھتے ہیں خصوصاً جبکہ لفظ "قربات" آیا ہے جو کہ جمع ہے اور نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ایک نہیں بلکہ اس میں کئی قرب تلاش کرتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ قرب خدا سے مراد قربت مکان اور مکانی نزدیکی نہیں ہے بلکہ مقام و مرتبہ اور قدر و منزلت کی نزدیکی ہے یعنی اس کی طرف جانا جو کمال مطلق ہے اور اس کی صفات جمال و جلال کا سایہ اپنی روح و فکر پر ڈالنا۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۲ صفحہ ۲۵۴

[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۲ ص

۱۰۰۔ وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ○

ترجمہ

۱۰۰۔ مہاجرین و انصار میں سے پیش قدمی کرنے والوں اور ان کی پیروی کرنے والوں سے خدا خوش ہے اور وہ (بھی) خدا سے راضی ہیں اور اس نے ان کے لیے باغاتِ بہشت فراہم کیے ہیں کہ جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ عظیم کامیابی ہے۔

تفسیر

سابقینِ اسلام

مندرجہ بالا آیت کی شانِ نزول کے بارے میں اگرچہ کئی ایک روایات نقل ہوئی ہیں لیکن جیسا کہ ہم دیکھیں گے ان میں سے کوئی بھی آیت کی شانِ نزول نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت اس کے مصداق کا بیان ہے۔

بہرحال گزشتہ آیات میں کفار اور منافقین کی حالت بیان ہوئی ہے ان کے بعد زیرِ نظر آیت میں سچے مسلمانوں کے مختلف گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ان کے تین گروہ بیان کیے گئے ہیں اول وہ جو اسلام اور ہجرت میں سبقت کرنے والے تھے (والسابقون الاولون من المهاجرين)۔

دوسرے وہ جو رسول اللہ کی نصرت اور مدد کرنے والوں میں پہل کرنے والے اور انصار مدینہ سے تھے (والانصار)۔

تیسرے وہ جو دونوں گروہوں کے بعد آئے اور انھوں نے ان کے طریقوں کی پیروی کی، نیک اعمال بجا لانے میں، اسلام قبول کرنے میں، ہجرت کرنے میں اور رسول اللہ کے دین کی مدد کرنے میں انھوں نے پہلے دو گروہوں کا ساتھ دیا (والذين اتبعوهم باحسان)[1]

---

[1] بعض مفسرین نے لفظ "من" کو "والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار" میں من تبعیضیہ سمجھا ہے اور ظاہر آیت بھی یہی ہے۔ کیونکہ آیت میں مہاجرین و انصار میں سے سبقت کرنے والوں کے بارے میں بات کی گئی ہے نہ کہ سب مہاجرین و انصار کے بارے میں۔ در حقیقت باقی مہاجرین و انصار "تابعین" میں داخل ہیں۔

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ "باحسان" سے مراد اصل اعمال و عقائد کا بیان مقصود ہے کہ جن میں وہ سابقین اسلام کی پیروی کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں "احسان" ان اعمال کا وصف ہے کہ جن کی اتباع ہوتی ہے لیکن آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے۔ کہ احسان صفت اتباع کی کیفیت ہے یعنی وہ اچھے طریقے سے پیروی کرتے ہیں۔ پہلی صورت میں "با" "فی" کے معنی میں ہے جبکہ دوسری صورت میں "مع" کے معنی میں ہے البتہ ظاہراً آیت پہلی تفسیر سے مناسبت رکھتی ہے۔

ان تین گروہوں کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے: خدا بھی ان سے راضی ہے اور وہ بھی خدا سے راضی ہیں (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ)۔

خدا کا ان سے راضی ہونا ان کے ایمان اور ان کے انجام کردہ نیک اعمال کی بناء پر ہے اور ان کا خدا سے راضی ہونا خدا کی طرف سے عطا کردہ اچھی جزاؤں اور نہایت اہم عنایات کے باعث ہے۔ دوسرے لفظوں میں جو کچھ خدا ان سے چاہتا تھا انھوں نے انجام دیا ہے اور جو کچھ وہ خدا سے چاہتے تھے خدا نے انھیں عطا فرمایا ہے اس بنا پر خدا ان سے راضی ہے اور وہ خدا سے راضی ہیں۔

گزشتہ جملہ اگرچہ تمام طرح کی مادی و معنوی نعمات پر محیط ہے لیکن تاکید کے طور پر اور اجمال کے بعد تفصیل کے لیے مزید فرمایا گیا ہے خدا نے ان کے لیے باغات بہشت تیار کیے ہیں جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہیں (و اعد لھم جنّٰت تجری تحتھا الانھٰر)۔ اور اس نعمت کی خصوصیات میں سے ہے کہ یہ دائمی اور جاودانی ہے" اور وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے"۔ (خٰلدین فیھا ابداً)۔ اور یہ تمام مادی و معنوی نعمتیں ان کے لیے عظیم کامیابی شمار ہوں گی (ذٰلک الفوز العظیم)۔

اس سے بڑھ کر کیا کامیابی ہوگی کہ انسان محسوس کرے کہ اسے پیدا کرنے والا معبود و مولا اس سے خوش اور راضی ہے اور اس کے کام کی اس نے تائید کی ہے اور اسے پسند کیا ہے اور اس سے بڑھ کر کیا کامیابی ہوگی کہ انسان چند روزہ زندگی میں کیے ہوئے محدود اعمال سے غیر متناہی ابدی نعمات حاصل کرے۔

چند اہم نکات

۱۔ سابقین کا مرتبہ اور اہمیت: ہر وسیع اجتماعی انقلاب میں جو معاشرے کی ناگفتہ بہ کیفیت کے خلاف آیا ہو کچھ سبقت کرنے والے ہوتے ہیں۔ انقلاب کی بنیادیں اساس کی اٹھان انھی کے کندھوں پر ہوتی ہے۔ درحقیقت انقلاب کے سب سے زیادہ وفادار وہی ہوتے ہیں کیونکہ ان کا رہبر جب ہر لحاظ سے تنہا ہوتا ہے وہ اس کے گرد جمع ہوتے ہیں اور اگرچہ وہ مختلف حالوں سے مشکلات کا شکار ہوتے ہیں اور طرح طرح کے خطروں سے دوچار ہوتے ہیں نصرت اور وفاداری سے دست بردار نہیں ہوتے خاص طور پر آغاز اسلام کی تاریخ نشاندہی کرتی ہے کہ سبقت کرنے والے اور پہلے ایمان لانے والے افراد کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا انھیں کیسے شکنجوں میں جکڑا گیا، تکلیفیں پہنچائی گئیں، برا بھلا کہا گیا، تہمتیں لگائی گئیں، زنجیریں پہنائی گئیں اور ان میں سے کئی ایک کو قتل کر دیا گیا لیکن ان تمام امور کے باوجود کچھ ایسے افراد تھے جو آہنی ارادہ، عشق سوزاں، عزم راسخ اور ایمان عمیق کے ساتھ اس راہ پر گامزن سب ہے اور ہر طرح کے خطرات کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔

اس سلسلے میں مہاجرین سابقین کا حصّہ سب سے زیادہ تھا اور ان کے بعد انصار تھے کہ جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ کے لیے اپنا دامنِ محبت پھیلا دیا اور انھیں مدینہ آنے کی دعوت دی اور آپ کے مہاجر اصحاب کو بھائیوں کی طرح سکونت فراہم کی اور اپنے پورے وجود سے ان کی حمایت کی اور ان کا دفاع کیا یہاں تک کہ انھیں اپنے اوپر بھی ترجیح دی۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ زیرِ نظر آیت میں ان دونوں گروہوں کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے تو وہ اسی وجہ سے ہے لیکن اس کے باوجود جیسا کہ قرآن مجید کی روش ہے اس نے دوسروں کے حصّے کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ اور "تابعین باحسان" کہہ کر زمانہ پیغمبرؐ اور آپ کے بعد کے دور میں بھی اسلام سے وابستہ ہو کر ہجرت کرنے والوں یا مہاجرین کو پناہ دینے والوں اور ان کی حمایت کرنے والوں کو یاد کیا ہے اور سب کو عظیم اجر و ثواب کی نوید دی ہے۔

۲۔ تابعین کون لوگ تھے ؟ : بعض علماء کے مطابق "تابعین" اصطلاح ہے جو صرف صحابہ کے شاگردوں کے لیے استعمال ہوتی ہے یعنی وہ افراد جنھوں نے رسول اللہؐ کو نہیں دیکھا اور وہ آپ کے بعد آئے ہیں اور انھوں نے اسلامی علوم کو وسعت دی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے اپنی اسلامی معلومات بغیر کسی واسطے کے اصحابِ پیغمبرؐ سے حاصل کی ہیں۔

لیکن جیسا کہ ہم سطورِ بالا میں کہہ چکے ہیں لغت کے لحاظ سے آیت کا مفہوم اس گروہ میں محدود نہیں ہو سکتا بلکہ "تابعین باحسان" کی تعبیر ان سب کے لیے ہے جنھوں نے کسی بھی زمانے میں سابقینِ اسلام کے اہداف و مقاصد کی پیروی کی ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ بعض لوگوں کی سوچ کے برعکس "ہجرت" اور "نصرت" دونوں اسلام کے اصلاحی اور تعمیری مفاہیم ہیں جو زمانہ پیغمبرؐ میں محدود نہیں ہیں بلکہ آج بھی یہ دونوں مفاہیم دوسری صورت میں موجود ہیں اور کل بھی ان کا وجود ہوگا اس بنا پر وہ تمام افراد جو کسی نہ کسی طرح ان دونوں پروگراموں پر عمل پیرا ہوں "تابعین باحسان" کے مفہوم میں داخل ہیں۔

البتہ اہم بات یہ ہے کہ ہمیں توجہ رکھنا چاہیے کہ قرآن لفظ "احسان" ذکر کر کے تاکید کرتا ہے کہ اسلام کے سابقین کی پیروی فقط لفظی اور بغیر عمل کے ایمان کی صورت میں نہیں ہونا چاہیے بلکہ ضروری ہے کہ یہ پیروی ایک فکری و عملی اور تمام پہلوؤں سے ہونا چاہیے۔

۳۔ پہلا مسلمان کون تھا ؟ : یہاں بہت سے مفسرین نے زیرِ بحث آیت کی مناسبت سے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اسلام قبول کرنے والا پہلا شخص کون تھا اور یہ عظیم افتخار کس نے حاصل کیا ؟

اس سوال کے جواب میں سب نے متفقہ طور پر کہا ہے کہ عورتوں میں سے جو خاتون سب سے پہلے مسلمان ہوئیں وہ جناب خدیجہؑ تھیں جو پیغمبر اکرمؐ کی وفادار اور فداکار زوجہ تھیں باقی رہا مردوں میں سے تو تمام شیعہ علماء و مفسرین اور اہلِ سنت علماء کے ایک بہت بڑے گروہ نے کہا ہے کہ حضرت علیؑ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مردوں میں سے دعوتِ پیغمبرؐ پر لبیک کہی علماء اہلِ سنت میں اس امر کی اتنی شہرت ہے کہ ان میں سے ایک جماعت نے اس پر اجماع و اتفاق کا دعویٰ کیا ہے۔ ان میں سے حاکم نیشاپوری نے مستدرک علی الصحیحین کتاب معرفت ص ۲۲ پر کہا ہے،

لا نعلم خلافاً بین اصحاب التواریخ ان علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اولہم اسلاماً وانما اختلفوا فی بلوغہ

مورخین میں اس امر پر کوئی اختلاف نہیں کہ علیؑ ابن ابی طالب اسلام لانے والے

پہلے شخص ہیں۔ اختلاف اسلام قبول کرتے وقت ان کے بلوغ کے بارے میں ہے[1]۔

ابنِ عبدالبر۔ استیعاب (ج ۲ ص ۴۵۰) میں لکھتے ہیں:

اتفقوا علی ان خدیجۃ اول من اٰمن باللہ و رسولہ و صدقہ فیما جاء بہ ثم علی بعدھا

اس مسئلہ پر اتفاق ہے کہ خدیجہ وہ پہلی خاتون ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور جو کچھ وہ لائے تھے اس کی تصدیق کی۔ پھر حضرت علی نے ان کے بعد یہی کام انجام دیا[2]

ابو جعفر اسکافی معتزلی لکھتا ہے:

قد روی الناس کافۃ افتخار علی بالسبق الی الاسلام

تمام لوگوں نے یہی نقل کیا ہے کہ سبقتِ اسلام کا افتخار علی سے مخصوص ہے[3]

قطع نظر اس کے کہ پیغمبر اکرمؐ سے، خود حضرت علیؑ سے اور صحابہ سے اس بارے میں بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جو حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں، ذیل میں چند روایات ہم نمونے کے طور پر نقل کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

اولکم واردا علی الحوض اولکم اسلاما علی بن ابی طالب

پہلا شخص جو حوضِ کوثر کے کنارے میرے پاس پہنچے گا وہ شخص ہے جو سب سے پہلے اسلام لایا اور وہ علی بن ابی طالب ہے[4]

۲۔ علماءِ اہلِ سنت کے ایک گروہ نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا:

ان ھذا اول من اٰمن بی وھذا اول من یصافحنی وھذا الصدیق الاکبر

یہ پہلا شخص ہے جو مجھ پر ایمان لایا اور پہلا شخص ہے جو قیامت میں مجھ سے مصافحہ کرے گا اور یہ صدیقِ اکبر ہے[5]

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۵ صفحہ ۳۰۷۵

[2] الغدیر جلد ۳ صفحہ ۲۳۷، ۲۳۸

[3] الغدیر جلد ۳ صفحہ ۲۳۷، ۲۳۸

[4] الغدیر میں یہ حدیث مستدرک حاکم ج ۳ ص ۱۳۶، استیعاب ج ۲ ص ۴۶۰ اور شرح ابن ابی الحدید ج ۳ ص ۲۵۸ سے نقل کی گئی ہے۔

[5] الغدیر ہی میں یہ حدیث طبرانی اور بیہقی سے نقل کی گئی ہے نیز بیہقی نے سنن میں، حافظ گنجی نے کفایۃ الطالب میں اور کنز العمال میں نقل کی ہے۔

۳۔ ابوسعید خدری رسولِ اکرمؐ سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت نے حضرت علیؑ کے دونوں شانوں کے درمیان ہاتھ مار کر فرمایا:

یا علی لک سبع خصال لا یحاجک فیھن احد یوم القیٰمۃ: انت اول المؤمنین باللہ ایماناً و اوفاھم بعھد اللہ و اقومھم بامر اللہ......

اے علی! تم سات ممتاز صفات کے حامل ہو کہ جن کے بارے میں روزِ قیامت کوئی تم سے حجت بازی نہیں کر سکتا۔ تم وہ پہلے شخص ہو جو خدا پر ایمان لائے اور خدائی پیمانوں کے زیادہ وفادار ہو اور فرمانِ خدا کی اطاعت میں تم زیادہ قیام کرنے والے ہو........ [1]

جیسا کہ ہم نے کہا ہے تاریخ، تفسیر اور حدیث کی کتب میں اس سلسلے میں بہت سی روایات پیغمبر اکرمؐ سے اور دوسروں سے نقل ہوئی ہیں۔ شائقین مزید توضیح کے لیے الغدیر (عربی) ج ۳ ص ۲۲۰ تا ص ۲۴۰ اور کتاب احقاق الحق ج ۴ ص ۴ تا ص ۱۷ ملاحظہ فرمائیں۔

یہ امر لائقِ توجہ ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ایمان اور اسلام میں حضرت علیؑ کی سبقت کا سیدھے طریقے سے تو انکار نہیں کر سکے لیکن کچھ واضح البطلان علل کی بنیاد پر ایک اور طریقے سے انکار کی کوشش کی ہے یا اسے کم اہم بنا کر پیش کیا ہے۔ بعض نے کوشش کی ہے ان کی جگہ حضرت ابوبکر کو پہلا مسلمان قرار دیں یہ لوگ کبھی کہتے ہیں کہ علیؑ اس وقت دس سال کے تھے لہٰذا طبعاً نابالغ تھے اس بناء پر ان کا اسلام ایک بچے کے اسلام کی حیثیت سے دشمن کے مقابلے میں مسلمانوں کے محاذ کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا (یہ بات فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں زیرِ نظر آیت کے ذیل میں ذکر کی ہے)۔

یہ بات واقعاً عجیب ہے اور حقیقت میں خود پیغمبرِ خدا پر اعتراض ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ یوم الدار (دعوت ذی العشیرہ کے موقع پر) رسول اللہؐ نے اسلام اپنے قبیلے کے سامنے پیش کیا اور کسی نے حضرت علیؑ کے سوا اسے قبول نہ کیا۔ اس وقت حضرت علیؑ کھڑے ہو گئے اور اسلام کا اعلان کیا تو آپؐ نے ان کے اسلام کو قبول کیا۔ بلکہ یہاں تک اعلان کیا کہ تو میرا بھائی، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔

یہ وہ حدیث ہے جو شیعہ سنی حافظانِ حدیث نے کتبِ صحاح اور مسانید میں نقل کی ہے۔ اسی طرح کئی مورخینِ اسلام نے اسے نقل کیا ہے یہ نشاندہی کرتی ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ کی اس کم سنی میں نہ صرف ان کا اسلام قبول کیا ہے بلکہ ان کا اپنے بھائی، وصی اور جانشین کی حیثیت سے تعارف بھی کروایا ہے [2]

کبھی کہتے ہیں کہ عورتوں میں پہلی مسلمان خدیجہ تھیں، مردوں میں پہلے مسلمان ابوبکر تھے اور بچوں میں پہلے مسلمان علی تھے۔ یوں دراصل وہ اس امر کی اہمیت کم کرنا چاہتے ہیں (یہ تعبیر مشہور اور متعصب مفسر مؤلف المنار نے زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ذکر کی ہے)

---

[1] الغدیر میں یہ حدیث حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۶۶ کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔

[2] یہ حدیث مختلف عبارات میں نقل ہوئی ہے اور جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اسے ابوجعفر اسکافی نے کتاب نقض العثمانیہ میں، برہان الدین نے نجباء الانباء میں، ابن اثیر نے کامل میں اور بعض دیگر افراد نے نقل کیا ہے (مزید وضاحت کے لیے الغدیر عربی کی جلد دوم ص ۲۰۰ تا ۲۰۶ کی طرف رجوع کریں۔

حالانکہ اولاً تو جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں حضرت علی علیہ السلام کی اس وقت کی کم سنی سے اس امر کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی خصوصاً جبکہ قرآن حضرت یحییٰ کے بارے میں کہتا ہے:

وآتیناہ الحکم صبیاً

ہم نے اسے بچپن کے عالم میں حکم دیا (مریم — ۱۲)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے کہ وہ بچپن کے عالم میں ہی بول اٹھے اور جو افراد ان کے بارے میں شک کرتے تھے ان سے کہا:

إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ ، آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا

میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے اس نے آسمانی کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے۔

(مریم — ۳۰)

ایسی آیات کو اگر ہم مذکورہ حدیث سے ملا کر دیکھیں کہ جس میں آپ نے حضرت علیؑ کو اپنا وصی، خلیفہ اور جانشین قرار دیا ہے تو واضح ہو جاتا ہے کہ صاحب المنار کی متعصبانہ گفتگو کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ امر تاریخی لحاظ سے مسلم نہیں ہے کہ حضرت ابوبکر اسلام لانے والے تیسرے شخص تھے بلکہ تاریخ و حدیث کی بہت سی کتب میں ان سے پہلے بہت سے افراد کے اسلام قبول کرنے کا ذکر ہے۔

یہ بحث ہم اس نکتے پر ختم کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے خود اپنے ارشادات میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میں پہلا مومن، پہلا مسلمان اور رسول اللہؐ کے ساتھ پہلا نماز گزار ہوں اور اس سے آپ نے اپنے مقام و حیثیت کو واضح کیا ہے۔ یہ بات آپ سے بہت سی کتب میں منقول ہے۔

علاوہ ازیں ابن ابی الحدید مشہور عالم ابو جعفر اسکافی معتزلی سے نقل کرتا ہے کہ جو بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابوبکر اسلام میں سبقت رکھتے تھے اگر یہ امر صحیح ہے تو پھر خود انھوں نے اس سے کسی مقام پر اپنی فضیلت کے لیے استدلال کیوں نہیں کیا اور نہ ہی ان کے حامی کسی صحابی نے ایسا دعویٰ کیا ہے۔[1]

۴۔ کیا تمام صحابہ نیک اور صالح تھے؟ اس امر کی طرف ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ علماء اہل سنت عام طور پر یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے تمام اصحاب پاک، نیکوکار، صالح، شائستہ اور اہل جنت تھے۔ زیر بحث آیت کو بعض لوگ اس دعویٰ کی قطعی دلیل قرار دیتے ہیں اسی مناسبت سے ہم دوبارہ اس اہم بات کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں کہ جو اسلامی مسائل میں بہت سی خرابیوں اور اختلافات کا سرچشمہ ہے۔

بہت سے اہل سنت مفسرین زیر نظر آیت کے ذیل میں یہ روایت نقل کرتے ہیں:

حمید بن زیاد کہتا ہے کہ میں محمد بن کعب قرظی کے پاس گیا میں نے اس سے کہا کہ رسول اللہؐ

---

[1] الغدیر ج ۳ ص ۲۴۰

اصحاب کے بارے میں تم کیا کہتے ہو تو اس نے کہا:

جمیع اصحاب رسول اللہ (ص) فی الجنۃ محسنہم و مسیئہم

یعنی رسول اللہؐ کے تمام اصحاب جنتی ہیں چاہے وہ نیکوکار ہوں یا گناہ گار

میں نے کہا: "یہ بات تم کہاں سے کہہ رہے ہو؟"

اس نے کہا: "اس آیت کو پڑھو" والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار

وہاں تک جہاں فرماتا ہے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اس نے مزید کہا: لیکن تابعین کے بارے میں ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ تابعین صحابہ کی صرف نیک کاموں میں پیروی کریں (تابعین صرف اسی صورت میں اہلِ نجات ہیں لیکن صحابہ کے لیے ایسی کوئی شرط نہیں)[1]

لیکن یہ دعویٰ بہت سے دلائل کی بناء پر ناقابلِ قبول ہے کیونکہ ______

اوّل تو زیرِ نظر آیت میں مذکورہ حکم تابعین کے بارے میں بھی ہے اور تابعین سے مراد جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں وہ تمام لوگ ہیں جو سابقینِ مہاجرین و انصار کی روش اور طریقے کی پیروی کرتے ہیں اس بناء پر تو تمام امت بغیر کسی استثناء کے اہلِ نجات ہونا چاہیے۔

باقی رہا یہ کہ محمد بن کعب والی روایت میں اس بات کا جواب دیا گیا ہے کہ خدا نے تابعین کے لیے "احسان" کی شرط عائد کی ہے یعنی وہ صحابہ کے صرف اچھے طور طریقوں کی پیروی کریں نہ کہ ان کے گناہوں کی ______ یہ بات نہایت عجیب مباحث میں سے ہے کیونکہ اس کا مطلب تو یہ ہے فرع کو اصل سے بڑھا دیا جائے صحابہ کے تابعین کے لیے جب اعمالِ صالح میں پیروی شرطِ نجات ہے تو بطریقِ اولیٰ یہ شرط خود صحابہ کے لیے بھی ہونی چاہیے۔

بالفاظِ دیگر خدا تعالیٰ زیرِ نظر آیت میں کہتا ہے کہ اس کی رضا اور خوشنودی ان تمام پہلے مہاجرین و انصار اور ان کے تابعین کے لیے ہے جن کی زندگی کا لائحہ عمل صحیح ہو نہ یہ کہ سب مہاجرین و انصار سے وہ راضی ہے چاہے وہ اچھے ہوں یا بُرے لیکن تابعین کے لیے اس کی رضا مشروط ہے۔

دوسرا یہ کہ یہ بات عقل سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ عقل اصحابِ پیغمبر کے لیے دوسروں کی نسبت کسی امتیاز کی قائل نہیں ہوئی۔ ابوجہل میں اور ان افراد میں جو آنحضرتؐ کے دین پر ایمان لا کر منحرف ہو گئے ہیں کیا فرق ہے؟ وہ اشخاص جو رسول اللہؐ کے صدیوں بعد دنیا میں آئے اور داوِ اسلام میں ان کی فداکاری اور جانبازی پہلے اصحابِ رسولؐ سے کمتر نہیں بلکہ ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے پیغمبر اکرمؐ کو دیکھے بغیر پہچانا اور ان پر ایمان لائے کیسے اللہ کی رحمت اور خوشنودی انھیں حاصل نہ ہوگی۔ وہ قرآن جو کہتا ہے کہ تم میں سے زیادہ صاحبِ شرف اور صاحبِ تکریم خدا کے نزدیک وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے

---

[1] تحفۃ الابرار اور تفسیر کبیر از فخر رازی زیر بحث آیت کے ذیل میں

وہ اس غیر منطقی تبعیض اور ترجیح کو کیسے پسند کر سکتا ہے وہ قرآن جو اپنی مختلف آیات میں ظالموں اور فاسقوں پر لعنت کرتا ہے اور انھیں عذابِ الٰہی کا مستحق شمار کرتا ہے وہ کس طرح عذابِ الٰہی سے صحابہ کی غیر منطقی معصونیت اور تحفظ کی تائید کر سکتا ہے کیا قرآن کی ایسی سنتیں اور دھمکیاں قابلِ استثناء ہیں اور ایک گروہ ان سے خارج ہے ؟ آخر کیوں اور کس لیے ؟

تمام چیزوں سے قطع نظر کیا ایسا فیصلہ صحابہ کو ہر قسم کے گناہ اور نافرمانی کی اجازت دینے کے مترادف نہیں ہے ؟

تیسرا یہ کہ ایسا فیصلہ اسلامی تاریخ سے کسی طرح بھی مناسبت نہیں رکھتا کیونکہ بہت سے لوگ ایسے تھے جو ایک دن مہاجرین و انصار کے ساتھ تھے بعد ازاں اس راستے سے منحرف ہوگئے اور رسولؐ اللہ ان سے خفا اور ناراض ہوئے اور ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کی ناراضگی غضبِ خدا کا باعث ہے کیا گذشتہ آیات میں ہم نے ثعلبہ بن حاطب انصاری کی داستان نہیں پڑھی کہ وہ کس طرح منحرف ہوگیا اور مغضوبِ پیغمبر ہوگیا۔ زیادہ وضاحت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ان لوگوں کی مراد یہ ہے کہ اصحابِ رسول سب کے سب کسی قسم کے گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے تھے اور ہر معصیت سے معصوم اور پاک تھے تو یہ واضحات کے انکار کے مترادف ہے۔ اگر مراد یہ ہے کہ انھوں نے گناہ تو کیے ہیں اور غلط اعمال بھی انجام دیئے لیکن پھر بھی خدا ان سے راضی ہے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے گناہ پر رعایت دی ہے۔

طلحہ و زبیر جو ابتداء میں رسولؐ اللہ کے اصحابِ خاص میں سے تھے اور اسی طرح عائشہ جو رسول اللہؐ کی زوجہ تھیں انھیں جنگِ جمل کے سترہ ہزار مقتول مسلمانوں کے خون سے کون بری الذمہ قرار دے سکتا ہے ؟ کیا خدا ان خونریزیوں پر راضی تھا ؟

علیؑ کی مخالفت جو خلیفۂ رسولؐ تھے ———— فرض کریں کہ ان کی خلافت منصوص نہ تھی۔ مگر کم از کم وہ امت کے اجماع و اتفاق سے تو چنے گئے تھے ، ان کے خلاف اور ان کے اصحابِ باوفا کے خلاف تلوار کھینچنا کیا ایسا عمل تھا جس پر خدا راضی تھا ؟

حقیقت یہ ہے کہ "تنزیہ صحابہ" ایک مفروضہ ہے جس کے طرفداروں نے اس بات پر اصرار کر کے اور دباؤ ڈال کر اسلام کے پاکیزہ چہرے کو بگاڑ دیا ہے جو ہر مقام پر شخصیت کی میزان ایمان اور عملِ صالح کو قرار دیتا ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ خدا کی رضا اور خوشنودی جس کا ذکر زیرِ نظر آیت میں ہے چند امور کے ضمن میں ہے اور وہ ہیں ہجرت نصرت، ایمان اور عملِ صالح۔ تمام صحابہ اور تابعین جب تک ان کے مطابق رہے خدا کی رضا ان کے شاملِ حال رہی اور جس دن کوئی ان سے دُور ہوگیا اس دن وہ رضائے الٰہی سے بھی دور ہوگیا۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ مذکورہ متعصب مفسر یعنی مؤلف المنار نے شیعوں کی اس بات پر جو سرزنش کی ہے کہ وہ تمام صحابہ کی پاکیزگی اور درستی کا اعتقاد نہیں رکھتے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ شیعوں نے اس کے سوا کوئی گناہ نہیں کیا کہ انھوں نے حکمِ عقل، شہادتِ تاریخ اور قرآن کی گواہی کو قبول کیا ہے اور متعصب افراد کے فضول اور نادرست امتیازات پر کان نہیں دھرا۔

۱۰۱۔ وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُمْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ ۝

ترجمہ

۱۰۱۔ بادیہ نشین اعراب جو تمھارے اطراف میں ہیں ان میں ایک جماعت منافقین کی ہے اور (خود) اہلِ مدینہ میں سے (بھی) ایک گروہ نفاق کا سخت پابند ہے انھیں تم نہیں پہچانتے اور ہم انھیں پہچانتے ہیں عنقریب ہم انھیں دو مرتبہ عذاب دیں گے (ایک اجتماعی رسوائی کا عذاب اور دوسرا موت کے وقت کا عذاب) اس کے بعد وہ (قیامت میں) عذابِ عظیم کی طرف بھیجے جائیں گے۔

تفسیر

قرآن مجید بحث کا رُخ دوبارہ منافقین کی طرف موڑ رہا ہے فرمایا گیا ہے: ان لوگوں کے درمیان جو تمھارے شہر (مدینہ) کے اطراف میں ہیں ایک گروہ منافقین کا موجود ہے (ومن حولکم من الاعراب منافقون)۔

یعنی صرف داخلی منافقین پر توجہ نہ رکھو بلکہ ہوشیار رہ کر باہر کے منافقین پر بھی نگاہ رکھو۔ ان کی خطرناک کارگذاریوں پر نظر رکھو اور ان پر بھی۔

لفظ "اعراب" جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے عام طور پر بادیہ نشین عربوں کے لیے بولا جاتا ہے۔

پھر مزید فرمایا گیا ہے: خود مدینہ میں اور اس شہر کے رہنے والوں میں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے کہ جن کا نفاق سرکشی کی حد تک پہنچا ہوا ہے اور وہ اس کے سخت پابند ہیں اور اس میں تجربہ کار ہیں (ومن اہل المدینۃ مردوا علی النفاق)۔

"مردوا" مادہ "مرد" (بروزن "سرد") سے ہے اس کا مطلب ہے مطلق طغیان سرکشی اور بے گانگی۔ اصل میں یہ "برہنگی" اور "تجرد" کے معنی میں آیا ہے۔ اسی بنا پر جن لڑکوں کے چہروں پر بال نہ اُگے ہوں انھیں "امرد" کہتے ہیں شجر مردا ایسے درخت کو کہتے ہیں جس پر بالکل پتے نہ ہوں اور "مارد" ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اطاعت حکم سے بالکل نکل گیا ہو۔

بعض مفسرین اور اہلِ لغت نے اس مادہ کا ایک معنی "تمرین" بھی بیان کیا ہے "تاج العروس" اور "قاموس" میں بھی اس کا ایک معنی "تمرین" ذکر ہوا ہے، یہ شاید اس بناء پر ہو کہ کسی چیز سے مطلق تجرد اور مکمل خروج بغیر تمرین کے ممکن ہی نہیں۔

بہرحال یہ منافقین حق و حقیقت سے اس قدر عاری اور اپنے کام میں اتنے ماہر ہیں کہ وہ اپنے آپ کو سچے مسلمانوں میں اس طرح سے شامل رکھتے ہیں کہ کسی کو ان کے منافق ہونے کا پتہ نہیں۔ داخلی اور خارجی منافقین کے بارے میں تعبیر کا یہ فرق جو زیر نظر آیت میں دکھائی دیتا ہے گویا اس نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ داخلی منافق اپنے کام میں زیادہ ماہر ہیں لہٰذا وہ طبعاً زیادہ خطرناک ہیں اور مسلمانوں کو چاہیے کہ ان پر کڑی نظر رکھیں اگرچہ خارجی منافقین سے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔

اسی لیے اس کے بعد بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے: تم انھیں نہیں پہچانتے لیکن ہم انھیں پہچانتے ہیں (لا تعلمهم نحن نعلمهم)۔ البتہ یہ پیغمبرؐ کے عمومی علم کی طرف اشارہ ہے مگر یہ اس بات کے منافی نہیں کہ وحی اور تعلیم الٰہی کے ذریعے آپؐ ان کے اسرار سے پوری طرح واقف تھے۔

آیت کے آخر میں اس گروہ کے لیے سزا اور سخت عذاب کو یوں بیان کیا گیا ہے: ہم عنقریب انھیں دو مرتبہ عذاب دیں گے اور اس کے بعد وہ ایک اور عذاب عظیم کی طرف بھیجے جائیں گے (سنعذبهم مرتين ثم يردون الى عذاب عظيم)۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "عذاب عظیم" روز قیامت کے عذاب اور سزاؤں کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ کہ اس سے پہلے دو عذابوں کا جو ذکر ہے اس سے کیا مراد ہے اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے اور انھوں نے بہت سے احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن زیادہ تر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک عذاب وہی اجتماعی سزا جو ان کی رسوائی اور ان کے اسرار منکشف ہو جانے کے بعد تمام معاشرتی وقار اور اہمیت کھو جانے کی صورت میں ہوگا اس کا ذکر شاید گزشتہ آیات میں موجود ہے اور بعض احادیث میں بھی آیا ہے کہ جب ان لوگوں کا معاملہ خطرناک مراحل تک پہنچ جاتا تو رسول اللہؐ ان کا تعارف کروا دیتے یہاں تک کہ انھیں مسجد سے بھی نکال دیتے۔

ان کے لیے دوسری سزا اور عذاب وہی ہے جس کی طرف سورہ انفال کی آیہ ۵۰ میں اشارہ ہو چکا ہے۔ جہاں فرمایا گیا ہے:

ولو ترى اذ يتوفى الذين كفروا الملآئكة يضربون وجوههم وادبارهم ... الخ

اگر تو کافروں کو اس وقت دیکھے جب موت کے فرشتے ان کی جان لے رہے ہوں کہ کس طرح فرشتے ان کے چہروں اور پشتوں پر مار رہے ہیں اور انھیں سزا دے رہے ہیں تو تجھے ان کی حالت پر افسوس ہوگا .....

یہ احتمال بھی ہے کہ دوسرا عذاب اندرونی اذیت اور روحانی سزا اور تکلیف کی طرف اشارہ ہو کہ جو مسلمانوں کی ہر طرف سے کامیابی کے زیر اثر انھیں پہنچتی ہے۔

۱۰۲۔ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا

وَاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ترجمہ

۱۰۲۔ اور دوسرے گروہ نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہے اور صالح اور غیر صالح اعمال کو آپس میں ملا دیا ہے امید ہے خدا ان کی توبہ قبول کر لے۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔

شانِ نزول

زیر نظر آیت کی شانِ نزول کے بارے میں کئی ایک روایات نقل ہوئی ہیں ان میں سے اکثر میں ابولبابہ انصاری کا نام ملتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس نے دو یا کچھ اور اصحاب پیغمبر کے ساتھ مل کر جنگِ تبوک میں شرکت نہ کی لیکن جب ان افراد نے وہ آیات سنیں جو متخلفین کی مذمت میں نازل ہوئی تھیں تو بہت پریشان اور پشیمان ہوئے اور اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں کے ساتھ باندھ دیا۔ رسول اللہؐ لوٹے تو آپ نے ان کے بارے میں استفسار کیا۔ آپ کو بتایا گیا کہ انھوں نے قسم کھائی ہے کہ اپنے آپ کو ستونوں سے نہیں چھڑائیں گے جب تک خود رسول اللہؐ آکر انھیں نہ چھوڑ دیں۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ یہ کام نہیں کروں گا مگر یہ کہ خدا مجھے اس کی اجازت دے۔

اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور خدا نے ان کی توبہ قبول کی۔ اس پر رسول اللہؐ نے آکر انھیں مسجد کے ستونوں سے کھول دیا۔

اس کے شکرانے کے طور پر انھوں نے اپنا سارا مال رسول اللہؐ کی خدمت میں پیش کر دیا اور عرض کیا یہ وہی مال و اسباب ہے جس سے دل بستگی کی خاطر ہم نے شریک جہاد ہونے سے گریز کیا تھا۔ یہ سب کچھ ہم سے قبول کر کے راہِ خدا میں خرچ کیجیے۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: ابھی تک اس کے بارے میں مجھ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ بعد والی آیت نازل ہوئی اور آپؐ کو حکم دیا گیا کہ ان کے اموال میں سے کچھ حصہ لے لیں اور بعض روایات کے مطابق تیسرا حصہ قبول کرنے کا حکم ہوا۔

کچھ اور روایات میں ہے کہ مندرجہ بالا آیت ابولبابہ کے بارے میں بنی قریظہ کے واقعہ کے سلسلہ میں ہے بنی قریظہ یہودی تھے انھوں نے ابولبابہ سے مشورہ کیا کہ کیا ہم پیغمبر کا فیصلہ مان لیں یا نہ۔ اس نے کہا اگر تم نے ان کا فیصلہ مان لیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم سب کے سر اڑا دیں گے۔ اس کے بعد ابولبابہ اپنی اس بات پر پشیمان ہوا اور توبہ کی اور اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ دیا۔ اس کے بعد مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور خدا تعالیٰ نے اس کی

توبہ قبول فرمالی ہے[1]

تفسیر

توبہ کرنے والے

گزشتہ آیت میں مدینہ کے داخلی اور خارجی منافقین کی کیفیت بتائی گئی تھی اب یہاں ایک گناہگار مسلمان گروہ کیطرف اشارہ کیا گیا ہے انھوں نے توبہ کی اور اپنے بُرے اعمال کی تلافی کے لیے اقدام کیا۔ ارشاد ہوتا ہے: ان میں سے ایک اور گروہ نے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلیا ہے (واٰخرون اعترفوا بذنوبهم) اور انھوں نے اچھے اور بُرے اعمال کو آپس میں ملا دیا ہے (خلطوا عملاً صالحاً واٰخر سیئاً)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: امید ہے خدا ان کی توبہ قبول کرلے اور اپنی رحمت ان کی طرف پلٹا دے (عسی الله ان یتوب علیهم)۔ "کیونکہ خدا بخشنے والا اور مہربان ہے" اور وسیع و عریض رحمت کا مالک ہے (ان الله غفور رحیم)۔

مندرجہ بالا آیت میں "عسیٰ" کی تعبیر آئی ہے یہ عموماً کامیابی اور ناکامی کے اکٹھے احتمال کے مواقع پر آتی ہے یہ شاید اس بناء پر ہے کہ انھیں امید و بیم اور خوف و رجاء کے درمیان رکھا جائے کیونکہ یہ دونوں کیفیتیں تکامل وارتقاء اور تربیت کا ذریعہ ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ "عسیٰ" کی تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ توبہ، ندامت اور پشیمانی کے علاوہ انھیں دیگر شرائط کو بھی پورا کرنا چاہیے اور اپنے نیک اعمال کے ذریعے گزشتہ کی تلافی کرنی چاہیے۔ لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیت کو اللہ کے غفران و رحمت کے ذکر سے مکمل کیا گیا ہے، اس میں امید کا پہلو غالب ہے۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ آیت اگرچہ ابولبابہ کے بارے میں یا جنگ تبوک کے دیگر متخلفین کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس سے آیت کا وسیع معنی محدود نہیں ہوجاتا بلکہ آیت ان تمام افراد کا احاطہ کیے ہوئے ہے جو نیک و بد اعمال کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور پھر اپنے بُرے اعمال پر پریشان ہوتے ہیں اسی لیے بعض علماء سے منقول ہے انھوں نے کہا ہے کہ مندرجہ بالا آیت نہایت امید بخش آیاتِ قرآن میں سے ہے کہ جس نے گنہگاروں کے لیے کئی دروازے کھول دیئے ہیں اور توبہ کرنے والوں کو اپنی طرف دعوت دی ہے۔

۱۰۳۔ خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا
وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ

[1] مجمع البیان اور دیگر تفاسیر۔ زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

عَلِيمٌ ۝

۱۰۴۔ أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ وَ
يَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

۱۰۵۔ وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ
وَسَتُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ

۱۰۲۔ ان کے اموال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) لے لو تاکہ انھیں اس کے ذریعے پاک کرو اور ان کی تربیت کرو اور (زکوٰۃ لیتے وقت) انھیں دعا دو کیونکہ تمھاری دعا ان کے سکون کا باعث ہے اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے۔

۱۰۴۔ کیا وہ جانتے نہیں کہ صرف خدا ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور صدقات لیتا ہے اور خدا ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

۱۰۵۔ کہہ دو: عمل کرو خدا، اس کا رسول اور مومنین تمھارے عمل کو دیکھتے ہیں اور عنقریب اس کی طرف لوٹ کر جاؤ گے کہ جو پنہاں اور آشکار کو جانتا ہے اور تمھیں اس چیز کی خبر دے گا جو کچھ تم کرتے ہو۔

تفسیر

زکوٰۃ فرد اور معاشرے کو پاک کرتی ہے

پہلی زیر نظر آیت میں ایک اہم اسلامی حکم یعنی زکوٰۃ کی طرف اشارہ ہوا ہے اور رسول اللہ کو ایک عمومی قانون کے طور پر حکم دیا گیا ہے کہ ان کے اموال سے صدقہ یعنی زکوٰۃ وصول کرو (خذ من اموالهم صدقة)۔

لفظ "من" جو تبعیض کے لیے ہے نشاندہی کرتا ہے کہ زکوٰۃ مال کا ایک حصہ ہوتا ہے پورا مال نہیں اور نہ ہی اس کا بڑا حصہ زکوٰۃ قرار پاتا ہے۔

اس کے بعد زکوٰۃ کے اخلاقی، نفسیاتی اور اجتماعی فلسفہ کے دو پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، اس طرح سے تو انھیں پاک کرتا ہے اور نشوونما دیتا ہے (تطھرھم وتزکیھم بھا) انھیں اخلاقی رذائل، دنیا پرستی اور بخل سے پاک کرتا ہے اور انسان دوستی، سخاوت اور دوسروں کے حقوق کی پاسداری کے لیے نشوونما دیتا ہے۔

اس سے قطع نظر معاشرے کے ایک طبقے کی محرومیت سے جو خرابیاں، افلاس، گناہ اور طبقاتی تفاوت جنم لیتی ہے۔ لسے الٰہی فریضہ انجام دے کر ختم کرو اور معاشرے کو ان آلودگیوں سے پاک کر دو۔ علاوہ بریں اجتماعی وابستگی، نمو، اقتصادی پیش رفت ایسے ہی کاموں سے ہوتی ہے اس بناء پر زکوٰۃ کا حکم ایک طرف سے معاشرے اور فرد کو پاک کرتا ہے اور دوسری طرف انسانوں میں فضیلت کے بیج کی نشوونما کرتا ہے۔ نیز معاشرے کی پیش رفت کا سبب بھی ہے اور زکوٰۃ کے بارے میں پیش کی جاسکنے والی یہ بہترین تعبیر ہے یعنی ایک طرف سے یہ آلودگیوں کو دھو ڈالتی ہے دوسری طرف ارتقاء و تکامل کا ذریعہ ہے۔ آیت کے معنی میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ "تطھرھم" کا فاعل زکوٰۃ ہو اور "تزکیھم" کا فاعل پیغمبر اکرمؐ ہوں۔ اس بناء پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ زکوٰۃ انھیں پاک کرتی ہے اور اس کے ذریعے تو ان کی نشوونما کرتا ہے لیکن زیادہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کا فاعل ذاتِ پیغمبر ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابتداء میں معنی کیا ہے۔ اگرچہ نتیجہ کے لحاظ سے ان دونوں تعبیروں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: جس وقت وہ زکوٰۃ ادا کریں تو ان کے لیے دعا کرو اور ان پر درود بھیجو (وصل علیھم)۔ یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ واجب ذمہ داریاں ادا کرنے پر بھی لوگوں کی قدردانی کی جانا چاہیے اور خصوصیت سے معنوی اور نفسیاتی طریقے سے انھیں تشویق دلانی چاہیے لہٰذا روایات میں ہے کہ جب لوگ رسول اللہ کی خدمت میں زکوٰۃ لے کر آتے تھے تو آپ اللھم صل علیھم کہہ کر ان کے لیے دعا کرتے تھے۔

بعد میں مزید فرمایا گیا ہے: تمھارا یہ دعا کرنا اور درود بھیجنا ان کے قلبی سکون کا سرمایہ ہے (ان صلوتک سکن لھم)۔ کیونکہ اس دعا سے ان کے قلب و روح پر رحمتِ الٰہی کا نزول ہوتا ہے اور وہ اسے محسوس بھی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں رسول اللہ یا ان کے جانشین لوگوں کی جو قدردانی کرتے ہیں اور ان کے مال کی زکوٰۃ لیتے ہیں تو انھیں ایک قسم کا روحانی اور فکری سکون پہنچاتے ہیں یعنی اگر ظاہراً وہ ایک چیز دے بیٹھے ہیں تو اس سے بہتر چیز انھوں نے حاصل کی ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ہم نے آج تک نہیں سنا کہ مالیات پر مامور افراد کی ذمہ داری ہو کہ وہ لوگوں کا شکریہ ادا کریں لیکن یہ ایک مستحب حکم اسلامی لائحہ عمل میں موجود انسانی اقدار کے گہرے احترام کو واضح کرتا ہے۔

آیت کے آخر میں گزشتہ بحث کی مناسبت سے ارشاد ہوتا ہے: خدا سننے والا اور جاننے والا ہے (واللہ سمیع علیم)۔ وہ پیغمبر کی دعا بھی سنتا ہے اور زکوٰۃ دینے والوں کی نیت کو بھی جانتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ قبول کی گئی زکوٰۃ: گزشتہ آیات کے بارے میں جو شانِ نزول ہم نے ذکر کی ہے اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے

کہ یہ آیت ان آیات سے قریبی تعلق رکھتی ہے جن کا ربط ابولبابہ اور اس کے ساتھیوں کی توبہ کے واقعہ سے ہے کیونکہ وہ اپنی توبہ قبول ہونے کے شکرانے پر اپنا سب مال رسول اللہ کی خدمت میں لے آئے اور آپ نے ان کے مال میں سے کچھ حصہ لے لیا لیکن یہ شان نزول اس کے منافی نہیں کہ آیت زکوٰۃ کے بارے میں ایک عمومی حکم رکھتی ہو اور یہ جو بعض مفسرین نے ان دونوں کے درمیان تضاد خیال کیا ہے درست نہیں ہے جیسا کہ ہم نے باقی آیات اور ان کی شانِ نزول کے بارے میں کئی مرتبہ کہا ہے۔

ایک ہی سوال باقی رہ جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس روایت کے مطابق رسول اللہؐ نے ابولبابہ اور اس کے ساتھیوں کے مال میں سے ایک تہائی حصہ قبول کیا تھا جبکہ زکوٰۃ کی مقدار کسی مقام پر بھی یہ نہیں ہے۔ گندم، جو، خرما اور کشمش میں دسواں حصہ ہوتا ہے اور کبھی بیسواں۔ سونا اور چاندی میں ڈھائی (۲½) فیصد زکوٰۃ ہوتی ہے اور گائے، گوسفند اور اونٹ میں بھی زکوٰۃ کی مقدار ایک تہائی نہیں بنتی۔

لیکن اس سوال کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہؐ نے ان کے اموال میں سے ایک حصہ زکوٰۃ کے طور پر اور باقی ان کے گناہوں کے کفارہ کے طور پر وصول کیا اس بناء پر آپ نے ان سے واجب زکوٰۃ لی اور کچھ مقدار انھیں گناہوں سے پاک کرنے کے لیے قبول کی جس کی کل مقدار ان کے اموال کا ⅓ حصہ بنتی ہے۔

۲۔ "خُذ" کا مفہوم: اس کا معنی ہے "لے لو" یہ حکم اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اسلامی حکومت کا سربراہ لوگوں سے زکوٰۃ لے سکتا ہے نہ یہ کہ وہ منتظر رہے کہ اگر لوگ چاہیں تو ادا کریں اور اگر نہ چاہیں تو نہ کریں۔

۳۔ "صلّ علیہم" کے حکم کی عمومیت: "صلّ علیہم" اگرچہ رسول اللہؐ سے خطاب ہے مگر واضح ہے کہ یہ ایک کلی اور عمومی حکم ہے (کیونکہ کلی قانون یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور دوسروں کے لیے اسلام کے احکام فرق نہیں رکھتے اور احکام کے لحاظ سے پیغمبرؐ کی خصوصیات کو دلیل خاص کا ذریعہ ہونا چاہیئے)۔

لہٰذا بیت المال کے ذمہ دار اور نگران ہر زمانے میں زکوٰۃ دینے والوں کو "اللّٰھم صلّ علیہم" کہہ کر دعا دے سکتے ہیں۔

اس کے باوجود اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ اہلِ سنت میں سے کچھ متعصب افراد آلِ نبیؐ پر درود و صلوٰۃ کو بالکل جائز نہیں سمجھتے یعنی اگر کوئی کہے "اللّٰھم صلّ علیٰ علیّ امیر المؤمنین" یا "صلّ علیٰ فاطمۃ الزہراؑ" تو اسے ممنوع شمار کرتے ہیں[1] حالانکہ ایسی دعا کے ممنوع ہونے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے نہ کہ جواز کے لیے دلیل کی احتیاج ہے۔

علاوہ ازیں جیسا کہ سطور بالا میں ہے قرآن صراحت سے اجازت دیتا ہے کہ عام افراد کے بارے میں ایسی دعا کی جائے، چہ جائیکہ اہلِ بیتِ رسولؐ، جانشینانِ پیغمبر اور اولیاءِ الٰہی کے لیے۔ لیکن کیا کیا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات تعصبات قرآنی آیات

---

[1] ان لوگوں کی اہلِ بیت رسالتؑ سے دشمنی اس حد تک ہے کہ آنحضرتؐ کے لیے بھی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں اور "صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" نہیں کہتے۔ جب کہ رسول اللہؐ نے خود آل کے ذکر کے بغیر صلوات کو "دم کٹی صلوات" قرار دیا ہے۔ خداوند عالم مسلمانوں کو عظمتِ اہلِ بیتؑ کا اقرار کرنے کی توفیق عطا فرمائے (مترجم)۔

بھی سمجھنے نہیں دیتے۔

بعض گنہ گار مثلاً جنگ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے رسول اللہؐ سے اصرار کرتے تھے کہ آپ ان کی توبہ قبول کریں۔ اس سلسلے میں زیر بحث دوسری آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ توبہ قبول کرنا رسولؐ کا کام نہیں، ہے "کیا وہ جانتے نہیں کہ خدا ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے" (الم یعلموا ان اللہ ھو یقبل التوبۃ عن عبادہ)۔ نہ صرف توبہ قبول کرتا ہے بلکہ زکوٰۃ یا دوسرے صدقات جو گناہ کے کفارہ کے طور پر یا پروردگار کے تقرب کے لیے دیئے جاتے ہیں وہ بھی خدا ہی لیتا ہے (ویأخذ الصدقات)۔

اس میں شک نہیں کہ زکوٰۃ و صدقات پیغمبرؐ، امامؑ اور مسلمانوں کے پیشوا وصول کرتے ہیں یا مستحق افراد لیتے ہیں۔ بہر صورت بظاہر ان سے یہ چیزیں خدا نہیں لیتا، لیکن چونکہ پیغمبرؐ اور ہادیانِ برحق کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے (اس لیے کہ وہ خدا کے نمائندے ہیں) تو گویا خدا ہی ان صدقات کو وصول کرتا ہے اس طرح ضرورت مند بندے جو خدا کی اجازت اور فرمان سے ایسی مدد قبول کرتے ہیں درحقیقت اسی کے نمائندے ہیں اس طرح ان کا ہاتھ بھی خدا ہی کا ہاتھ ہے یہ ایک انتہائی لطیف چیز ہے جو زکوٰۃ کے اس اسلامی حکم کی عظمت و شکوہ کی تصویر کشی کرتی ہے۔

اس عظیم خدائی فریضہ کی ادائیگی کے لیے مسلمانوں کو شوق دلانے کے علاوہ اس طرح سے انھیں خبردار کیا گیا ہے کہ وہ زکوٰۃ و صدقات ادا کرنے میں انتہائی ادب و احترام ملحوظ نظر رکھیں کیونکہ لینے والا خدا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کوتاہ فکری سے یہ تصور کر لیا جائے کہ ضرورت مند شخص کی تحقیر و تذلیل میں کوئی حرج نہیں یا ایسے طرح زکوٰۃ دی جائے کہ اس کی شخصیت مجروح ہو بلکہ اس کے برعکس چاہیے کہ یہ انکساری کے ساتھ اپنے ولی نعمت کے سامنے ادب کے اظہار کے ساتھ زکوٰۃ اس کے مستحق تک پہنچائی جائے۔

رسول اکرمؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

ان الصدقۃ تقع فی ید اللہ قبل ان تصل الی ید السائل

صدقہ حاجت مند کے ہاتھ میں جانے سے پہلے خدا کے ہاتھ میں پہنچتا ہے[1]

دوسری حدیث میں امام سجادؑ سے منقول ہے:

ان الصدقۃ لا تقع فی ید العبد حتی تقع فی ید الرب

صدقہ بندے کے ہاتھ میں اس وقت تک نہیں پہنچتا جب تک کہ پہلے پروردگار کے ہاتھ میں نہ جائے (پہلے خدا کے ہاتھ میں جاتا ہے پھر بندے کے ہاتھ میں جاتا ہے)۔[2]

یہاں تک کہ ایک روایت میں ہے:

اس بندے کے تمام اعمال فرشتے اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں سوائے صدقے کے کہ جو براہِ راست خدا کے ہاتھ میں جاتا ہے[3]

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں

[2] تفسیر صافی زیر بحث آیت کے ذیل میں بحوالہ تفسیر عیاشی

[3] تفسیر برہان زیر بحث آیت کے ذیل میں بحوالہ تفسیر عیاشی

یہی مضمون جو مختلف تعبیروں کے ساتھ ہم نے روایات اہل بیتؑ میں پڑھا ہے اہل سنت کے طرق سے بھی ایک اور تعبیر کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

ما تصدق احدکم بصدقة من کسب حلال طیب — ولا یقبل الله الا الطیب — الا اخذها الرحمن بیمینه وان کانت تمرة فتربوا فی کف الرحمن حتی تکون اعظم من الجبل.

تم میں سے کوئی شخص حلال کمائی میں سے صدقہ نہیں دے گا ——— اور البتہ خدا حلال کے علاوہ قبول بھی نہیں کرتا ——— مگر یہ کہ خدا اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لے گا۔ اگرچہ خرمے کا ایک دانہ ہو۔ پھر وہ خدا کے دستِ قدرت میں بڑھنا شروع ہوگا یہاں تک کہ وہ پہاڑ سے بھی بڑا ہو جائے گا۔[1]

یہ حدیث معنی خیز تشبیہات اور کنایات سے معمور ہے۔ اس سے اسلامی تعلیمات میں انسانی خدمت اور حاجت مندوں کی مدد کی بہت زیادہ اہمیت واضح ہوتی ہے۔

احادیث میں اس ضمن میں کئی ایک اور تعبیرات بھی آئی ہیں جو بڑی جاذبِ نظر اور اہم ہیں۔ ان میں مکتبِ اسلام کے پرورش یافتہ افراد کو حاجت مندوں کو مدد دیتے ہوئے ایسا منکسر بنا کر پیش کیا گیا ہے گویا حاجت مندوں نے مدد قبول کر کے ان پر احسان کیا ہے اور انھیں اعزاز و افتخار سے نوازا ہے مثلاً بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آئمہ معصومؑ بعض اوقات حاجت مند کو صدقہ دینے سے پہلے احترام اور تعظیم کی علامت کے طور پر اپنے ہاتھ کا بوسہ لیتے یا یہ کہ پہلے وہ مال حاجت مند کو دے دیتے پھر اسے لے کر بوسہ لیتے اور سونگھتے پھر اسے واپس کر دیتے چونکہ وہ دستِ خدا کے روبرو ہوتے تھے لیکن وہ لوگ ان تعلیمات سے کس قدر دور ہیں جو اپنے ضرورت مند بھائیوں یا بہنوں کی تھوڑی سی مدد کرتے ہوئے ان کی تذلیل کرتے ہیں یا ان سے سختی یا بے اعتنائی سے پیش آتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات بے ادبی سے ان کی طرف پھینکتے ہیں۔

البتہ جیسا کہ اپنے مقام پر ہم نے کہا ہے کہ اسلام اپنی پوری کوشش کرتا ہے کہ پورے اسلامی معاشرے میں کوئی فقیر اور حاجت مند نہ رہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ہر معاشرے میں کچھ آبرومند و ناتواں، ننھے یتیم اور بیمار وغیرہ ہوتے ہیں جو کمانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ضروری ہے کہ بیت المال اور متمکن افراد کے ذریعے انتہائی ادب و احترام سے ان کی ضروریات کو پورا کیا جائے۔

آیت کے آخر میں زیادہ تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے (وان الله هو التواب الرحیم)۔

۱۔ تفسیر المنار ج ۱۱ ص ۲۲ (یہ حدیث طرقِ اہل بیتؑ سے امام صادق علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے۔ بحار الانوار ج ۹۶ ص ۱۲۴ طبع جدید کی طرف رجوع فرمائیں)

توبہ اور تلافی

جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ گناہ پر صرف ندامت اور پشیمانی کا نام نہیں بلکہ ضروری ہے کہ ندامت کے ساتھ ساتھ اصلاح اور تلافی بھی شامل ہو۔ ممکن ہے یہ تلافی ضرورتمندوں کی بلا عوض امداد کی صورت میں ہو جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں اور ابولبابہ کے واقعہ میں ہم نے پڑھا ہے اس میں کوئی فرق نہیں کہ گناہ مالی امور سے متعلق ہو یا کسی اور سے متعلق۔ جیسا کہ ہم جنگ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کے مسئلہ میں پڑھ چکے ہیں در حقیقت مقصد یہ ہے کہ گناہ سے آلودہ روح کو نیک، صالح اور شائستہ عمل سے دھویا جائے اور اسے پاک کیا جائے اور پہلی اور فطری پاکیزگی کو لوٹایا جائے۔

بعد والی آیت میں گزشتہ مباحث کے بارے میں نئی شکل میں تاکید کی گئی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے کہ تمام لوگوں کو اس امر کی تبلیغ کریں اور کہیں کہ اپنے اعمال اور ذمہ داریاں انجام دو اور جان لو کہ خدا، اس کا رسول اور مومنین تمہارے اعمال کو دیکھیں گے (وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم ورسولہ والمؤمنون)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ کوئی یہ تصور نہ کرے کہ اگر وہ کسی خلوت کے مقام پر یا کسی جماعت کے اندر کوئی عمل انجام دیتا ہے تو وہ علم خدا کی نگاہ سے اوجھل رہ جاتا ہے بلکہ خدا کے علاوہ پیغمبر اور مومنین بھی اس سے آگاہ ہیں۔

اس حقیقت کی طرف توجہ اور اس پر ایمان اعمال اور نیتوں کے پاک رہنے کے لیے بہت مؤثر ہے۔ عام طور پر اگر انسان یہ احساس کرے کہ اسے ایک آدمی دیکھ رہا ہے تو وہ اپنی کیفیت ایسی بنا لے گا جو قابلِ اعتراض نہ ہو چہ جائیکہ اسے یہ احساس ہو کہ خدا، رسول اور مومنین اس کے اعمال سے باخبر ہیں۔ یہ آگاہی جزا یا سزا کا مقدمہ ہے جو دوسرے جہان میں اس کے انتظار میں ہے لہٰذا اس کے بعد اس جملے کا اضافہ کیا گیا ہے، عنقریب تم ایسی ہستی کی طرف لوٹ جاؤ گے جو مخفی و آشکار سے آگاہ ہے اور وہ تمہیں تمہارے کیے ہوئے عمل کی خبر دے گا اور اس کے مطابق جزا دے گا (وستردون الی علم الغیب والشھادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون)۔

چند اہم نکات

۱۔ اعمال پیش ہونے کا مسئلہ: بہت سی روایات اور خبریں جو آئمہ سے پہنچی ہیں ان کے پیش نظر مکتب اہل بیتؑ کے پیروکاروں کا یہ مشہور و معروف عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور آئمہ ہدیٰؑ تمام امت کے اعمال سے آگاہ ہو جاتے ہیں یعنی خدا تعالیٰ مخصوص طریقوں سے امت کے اعمال ان کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

اس سلسلے میں منقول روایات بہت زیادہ ہیں اور شاید حد تواتر تک ہوں۔ ہم نمونے کے طور پر ان میں سے مختلف قسم کی چند روایات ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۱۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

تعرض الاعمال علی رسول اللہ اعمال العباد کل صباح، ابرارھا

و فجارها ، فاحذروها ، و هو قول الله عز وجل و قل اعملوا فسیری الله عملکم ورسوله ، وسکت .

لوگوں کے تمام اعمال ہر روز صبح کے وقت رسولِ خدا کے سامنے پیش ہوتے ہیں، چاہے وہ نیک لوگوں کے اعمال ہوں یا بُرے لوگوں کے لہٰذا متوجہ رہو (اور ان سے ڈرو) اور خدا تعالیٰ کے ارشاد "وقل اعملوا فسیری الله عملکم ورسوله" کا یہی مفہوم ہے یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے۔[1]

۲۔ امام محمد باقرؑ سے ایک اور حدیث منقول ہے جس میں آپ فرماتے ہیں:

ان الاعمال تعرض علی نبیکم کل عشیة الخمیس فلیستح احدکم ان تعرض علی نبیه العمل القبیح .

تمہارے تمام اعمال ہر جمعرات کو عصر کے وقت رسولِ خدا کے پاس پیش ہوتے ہیں لہٰذا اس بات پر شرم کرو کہ تمہاری طرف سے کوئی بُرا عمل خدمتِ پیغمبر میں پیش ہو۔[2]

۳۔ نیز ایک اور روایت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ ایک شخص نے آپؑ کی خدمت میں عرض کیا میرے لیے اور میرے گھر والوں کے لیے دعا کیجیے۔

تو آپؑ نے فرمایا:

تو کیا میں دعا نہیں کرتا، والله ان اعمالکم لتعرض علی فی کل یوم و لیلة (خدا کی قسم تمہارے اعمال ہر روز و شب میرے سامنے پیش ہوتے ہیں)

راوی کہتا ہے کہ یہ بات مجھ پر گراں گذری، امام متوجہ ہوئے اور مجھ سے فرمایا:

اما تقرء کتاب الله عز وجل " وقل اعملوا فسیری الله عملکم ورسوله والمؤمنون" هو والله علی بن ابی طالب .

کیا تو نے اللہ کی کتاب نہیں پڑھی جو کہتی ہے "عمل کرو، خدا، اس کا رسولؐ اور مومنین تمہارے عمل کو دیکھتے ہیں۔ خدا کی قسم مومنین سے مراد علی ابن ابی طالب (اور ان کی اولاد میں سے دوسرے امام) ہیں۔[3]

البتہ بعض روایات میں صرف رسول اللہ کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ کچھ میں حضرت علیؑ کے بارے میں اور بعض میں

---

[1] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۷۱ (باب عرض الاعمال)

[2] تفسیر برہان جلد ۲ صفحہ ۱۵۸

[3] اصول کافی جلد ۱ صفحہ ۱۷۱ (باب عرض الاعمال)

پیغمبر اکرمؐ اور تمام آئمہ کا ذکر ہے اسی طرح کچھ روایات صرف جمعرات کو عصر کے وقت اعمال پیش ہونے کے بارے میں ہیں، بعض میں ہر روز اعمال پیش ہونے کا تذکرہ ہے، کچھ میں ہفتے میں دو مرتبہ، بعض میں ہر ماہ کے شروع میں اور بعض میں موت کے وقت اور قبر میں رکھے جانے کے وقت کا ذکر ہے۔

واضح ہے کہ یہ روایات آپس میں ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ہوسکتا ہے کہ سب صحیح ہوں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے بہت سے اداروں میں ہر روز کی کارگزاری روزانہ، ہفتہ کی کارگزاری ہفتے کے آخر میں اور مہینے یا سال کی کارگزاری مہینے یا سال کے آخر میں اعلیٰ افسروں کو پیش کی جاتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ کیا خود زیر نظر آیت اور اس کی تفسیر میں وارد روایات سے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے یا جیسا کہ اہل سنت کے مفسرین نے کہا ہے کہ آیت ایک عام مسئلے کی طرف اشارہ کر رہی ہے وہ یہ کہ انسان جو بھی عمل کرتا ہے چاہے نہ چاہے ظاہر ہو ہی جاتا ہے اور خدا کے علاوہ پیغمبرؐ اور تمام مومنین عام طریقوں ہی سے اس سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔

اس سوال کے جواب میں کہنا چاہیے کہ انصاف یہ ہے کہ خود آیت میں اس بارے میں کچھ شواہد موجود ہیں۔

پہلا یہ کہ آیت مطلق ہے اور اس میں تمام اعمال شامل ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ تمام اعمال معمول کے طریقوں سے رسول اللہ اور مومنین پر آشکار نہیں ہوتے تھے کیونکہ بہت سے غلط اعمال مخفی طور پر انجام پاتے تھے اور اکثر اوقات پوشیدہ رہ جاتے تھے یہاں تک کہ بہت سے اچھے اعمال بھی اسی طرح چھپے رہتے تھے۔

اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ تمام نیک اور بد اعمال میں سے اکثر سب پر واضح ہو جاتے تھے تو یہ ایک بے ہودہ بات ہوگی۔ لہٰذا لوگوں کے اعمال سے رسول اللہ کی اور لوگوں کی آگاہی غیر معمولی طریقوں اور خدائی تعلیم ہی سے ہوسکتی ہے۔

دوسرا یہ کہ آیت کے آخر میں ہے: "فینبئکم بما کنتم تعملون" (خدا تمہیں قیامت میں اس سے آگاہ کرے گا جو تم عمل کرتے تھے) اس میں شک نہیں کہ اس جملے کے مفہوم میں انسان کے تمام اعمال شامل ہیں چاہے وہ مخفی ہوں یا آشکار اور آیت کا ظاہر یہ ہے کہ آیت کی ابتدا اور آخر میں "تعلق" کا ایک ہی مفہوم ہے لہٰذا آیت کی ابتدا میں آشکار و مخفی تمام اعمال کے بارے میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان تمام سے آگاہی معمول کے طرق سے ممکن نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کا آخری حصہ تمام اعمال کی جزا کے بارے میں ہے۔ اس لیے آغاز بھی خدا، رسول اور مومنین کی تمام اعمال سے آگاہی سے متعلق ہے۔ ایک آگاہی کا مرحلہ ہے اور دوسرا اجزاء کا اور بات دونوں میں ایک ہی موضوع سے متعلق ہے۔

تیسرا یہ کہ "مومنین" کا ذکر اسی صورت میں صحیح ہے کہ مراد سب اعمال ہوں اور غیر معمولی طریقوں سے معلوم ہوں۔ ورنہ جو اعمال آشکار اور واضح ہیں وہ تو مومنین اور غیر مومنین سب دیکھتے ہیں۔

یہاں سے ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں مومنین سے مراد سب صاحب ایمان افراد نہیں ہیں بلکہ ان میں سے کچھ مخصوص افراد ہیں جو بحکم خدا اسرار غیبی سے آگاہ ہیں یعنی رسول اللہ کے حقیقی جانشین۔

ایک اہم نکتہ جس کی طرف یہاں توجہ کرنا چاہیے یہ ہے کہ جس طرح پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اعمال کے پیش ہونے کا مسئلہ اس کے معتقدین کے لیے بہت زیادہ تربیتی اثر رکھتا ہے کیونکہ جب ہمیں یہ معلوم ہو کہ خدا کے علاوہ ہر جگہ میرے حاضر ہونے کے

علاوہ پیغمبر اکرمؐ اور ہمارے محبوب پیشوا ہر روز یا ہر ہفتے میرے ہر عمل سے چاہے وہ اچھا ہو یا بُرا آگاہ ہو جاتے ہیں تو بلا شبہ ہم زیادہ احتیاط کریں گے اور اپنے اعمال کی طرف متوجہ رہیں گے بالکل اسی طرح جیسے کسی ادارے میں کام کرنے والوں کو معلوم ہو کہ ہر روز یا ہر ہفتے ان کے تمام اعمال پوری تفصیل سے اعلیٰ افسروں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں اور وہ ان سب سے باخبر ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے کاموں کو بڑی توجہ سے سرانجام دیں گے۔

۲۔ کیا رؤیت یہاں دیکھنے کے معنی میں ہے؟ بعض مفسرین میں مشہور ہے کہ "فسیری اللّٰہ عملکم..." میں رؤیت معرفت کے معنی میں ہے نہ کہ علم کے معنی میں کیونکہ اس کا ایک سے زیادہ مفعول نہیں ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ اگر رؤیت علم کے معنی میں ہو تو اس کے لیے دو مفعول چاہییں ہوں گے۔

لیکن اس میں کوئی حرج نہیں کہ رؤیت کو اس کے اصل معنی میں لیا جائے یعنی محسوسات کا مشاہدہ نہ کہ علم یا معرفت۔ یہ بات خدا کے بارے میں تو جو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور تمام محسوسات پر احاطہ رکھتا ہے قابلِ بحث نہیں لیکن پیغمبرؐ اور آئمہؑ کے متعلق بھی کوئی مانع نہیں کہ وہ خود اعمال کو دیکھیں کہ جب ان کے سامنے پیش ہوں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ انسانی اعمال فانی نہیں ہیں بلکہ قیامت تک باقی رہیں گے۔

۳۔ "عنقریب خدا اعمال دیکھے گا" سے کیا مراد ہے: اس میں شک نہیں کہ خدا اعمال سے پہلے ہی ان سے آگاہ ہے اور یہ جو آیت میں "فسیری اللّٰہ ...." یعنی خدا عنقریب تمہارے اعمال دیکھے گا" آیا ہے، یہ اعمال کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے جو ان کے وجود اور تحقق کے بعد ہو گی۔

۱۰۶۔ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

ترجمہ

۱۰۶۔ ایک اور گروہ فرمانِ خدا سے نکل گیا۔ وہ یا تو انھیں سزا دے گا اور یا ان کی توبہ قبول کرے گا (جس کے وہ لائق ہوں گے) خدا دانا اور حکیم ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ مندرجہ بالا آیت جنگ تبوک سے واپس رہ جانے والے تین اشخاص ہلال بن امیہ، مرارہ بن ربیع اور کعب بن مالک کے بارے میں ہے۔ کہ جن کی پشیمانی کی تشریح اور توبہ کی کیفیت اسی سورہ کی آیہ ۱۱۸ کے ذیل میں آئے گی۔

کچھ اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت بعض کفار کے بارے میں ہے جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف مختلف جنگوں میں عظیم شخصیتوں مثلاً سید الشہداء حضرت حمزہ اور ایسے دیگر افراد کو شہید کیا تھا۔ اس کے بعد وہ شرک سے دستبردار ہو گئے اور دین اسلام کی طرف آ گئے۔

تفسیر

اس آیت میں ایک اور گنہ گار گروہ کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ان لوگوں کا انجام صحیح طور پر واضح نہیں ہے نہ تو وہ ایسے ہیں کہ رحمت الٰہی کے مستحق سمجھے جائیں اور نہ ایسے ہیں کہ ان کی بخشش سے بالکل مایوس ہو جایا جائے لہٰذا قرآن ان کے بارے میں کہتا ہے: ایک اور گروہ کا معاملہ فرمان خدا پر موقوف ہے یا وہ انھیں سزا دے گا اور یا ان کی توبہ قبول کرے گا (و اٰخرون مرجون لامر اللہ اما یعذبھم و اما یتوب علیھم)۔

"مرجون" کا مادہ "ارجاء" ہے۔ یہ تاخیر اور توقیف کے معنی میں ہے۔ اصل میں یہ "رجاء" سے لیا گیا ہے۔ جس کا معنی امید ہے اس لحاظ سے کہ بعض اوقات انسان کسی کام کو کسی ہدف کے ماتحت تاخیر میں ڈال دیتا ہے یہ لفظ تاخیر کے معنی میں آیا ہے لیکن ایسی تاخیر جس میں امید شامل ہو۔

حقیقت میں یہ لوگ نہ تو ایسے پاک مضبوط ایمان اور نیک اعمال کے مالک ہیں کہ انھیں سعادت مند اور اہل نجات سمجھا جا سکے اور نہ ہی ایسے آلودہ اور منحرف ہیں کہ ان کے رخ پر سرخ خط کھینچ دیا جائے اور انھیں بدبخت سمجھ لیا جائے یہاں تک کہ (ان کے روحانی مقام و مرتبہ کے مطابق) لطف الٰہی ان کے بارے میں فیصلہ کرے گا۔

آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے کہ خدا ان کے ساتھ حساب کتاب کے بغیر کوئی سلوک نہیں کرے گا۔ بلکہ اپنے علم و حکمت کے تقاضے کے مطابق ہی ان سے سلوک کرے گا کیونکہ "خدا علیم و حکیم ہے" (و اللہ علیم حکیم)۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے اس کے بارے میں مفسرین نے بہت کم ہی کہیں جامع بحث کی ہے سوال یہ ہے کہ اس گروہ میں اور اس گروہ میں جس کی حالت اسی سورہ کی آیہ ۱۰۲ میں گذر چکی ہے کیا فرق ہے دونوں گروہ گنہ گار تھے اور دونوں نے اپنے گناہ سے توبہ کی۔ پہلے گروہ نے اپنے گناہ کا اعتراف کر کے پشیمانی کا اظہار کیا اور دوسرے گروہ کے بارے میں "اما یتوب علیھم" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بھی توبہ کی۔ اسی طرح دونوں گروہ رحمت الٰہی کی توقع رکھتے تھے۔ اور دونوں خوف و رجاء کے درمیان تھے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم دو طریقوں سے ان دونوں گروہوں میں فرق کر سکتے ہیں۔

۱۔ پہلے گروہ نے فوراً توبہ کی اور کھلے بندوں پشیمانی کی علامت کے طور پر اپنے آپ کو مسجد کے ستون کے ساتھ باندھ دیا جیسے ابولبابہ کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ مختصر یہ کہ انھوں نے اپنی ندامت کا اظہار صراحت کے ساتھ کیا اور بدنی اور

مالی طور پر ہر قسم کی تلافی کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کر دی۔

جبکہ دوسرے گروہ کے افراد ایسے تھے جنھوں نے اپنی پشیمانی کی ابتداء میں اپنی کیفیت ظاہر نہیں کی اگرچہ وہ دل میں پشیمان ہوئے تھے اور انھوں نے گذشتہ کی تلافی کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار نہیں کیا۔ حقیقت میں وہ چاہتے تھے کہ سادگی اور آسانی سے اپنے گناہوں سے گذر جائیں۔ ان کی واضح مثال وہ تین افراد تھے جن کی طرف سطور بالا میں اشارہ ہوا ہے۔ ان کی حالت کی وضاحت عنقریب آئے گی یہ لوگ خوف و رجا کے درمیان تھے لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ نے حکم دیا کہ لوگ ان سے علیحدہ رہیں اور ان سے روابط منقطع رکھیں۔ اس طرح وہ معاشرے کے شدید دباؤ کا شکار تھے اور آخرکار وہ مجبور ہوئے کہ پہلے گروہ کا سا راستہ اختیار کریں۔ ایسے اشخاص کی توبہ کی قبولیت کا اعلان چونکہ آیت نازل ہونے کی صورت میں ہوا لہٰذا پیغمبر اکرمؐ اس مدت تک وحی کے انتظار میں تھے یہاں تک کہ پچاس دنوں میں یا اس سے کم مدت میں ان کی توبہ قبول ہوئی اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے گروہ سے متعلق آیت میں "ان اللہ غفور رحیم" کا جملہ آیا ہے جو توبہ قبول ہونے کی دلیل ہے۔ لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں جبتک انھوں نے اپنی روش کو تبدیل نہیں کیا" واللہ علیم حکیم" کا جملہ آیا ہے۔ کہ جس میں توبہ قبول ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔

البتہ باعثِ تعجب نہیں کہ بڑے بڑے گناہوں کے بارے میں خصوصاً نزولِ آیات کے زمانے میں صرف ندامت و پشیمانی توبہ قبول ہونے کے لیے کافی نہ ہو۔ بلکہ تلافی کے لیے اقدام، واضح طور پر گناہ کا اعتراف اور اس کے بعد آیت کا نزول توبہ قبول ہونے کے لیے شرط ہو۔

۲۔ دوسرا فرق جو ممکن ہے دونوں گروہوں کے درمیان ہو یہ ہے کہ پہلے گروہ نے اگرچہ ایک عظیم اسلامی فریضہ یعنی جہاد سے تخلف کیا تھا یا بعض جنگی اسرار دشمن کو بتائے تھے تاہم ان کے ہاتھ سید الشہداء حمزہ کے قتل جیسے عظیم گناہوں سے آلودہ نہ تھے اسی لیے ان کی توبہ اور تلافی کے لیے آمادگی کے بعد خدا تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی لیکن جناب حمزہ کا قتل ایسا گناہ نہ تھا جس کی تلافی ہو سکے۔ اس لیے اس گروہ کی نجات حکمِ خدا سے وابستہ تھی کہ کیا وہ انھیں اپنی عفو و بخشش سے نوازتا ہے یا انھیں سزا اور عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔

بہر حال پہلا جواب آیت کی شانِ نزول کے بارے میں مروی ان روایات سے مطابقت رکھتا ہے جو محلِ بحث آیت کو جنگ تبوک سے متخلف تین افراد کے ساتھ مربوط رکھتی ہیں جبکہ دوسرا جواب ان روایات سے موافقت رکھتا ہے جو طرق اہلِ بیت سے پہنچی ہیں اور جن میں ہے کہ یہ آیت حمزہ، جعفر اور اس قسم کے دیگر افراد کے بارے میں ہے[1]

اگر صحیح طور پر غور و فکر کیا جائے تو یہ دونوں جوابات ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں اور ممکن ہے کہ آیت کی تفسیر میں دونوں ہی مراد ہوں۔

---

[1] ان روایات کو جاننے کے لیے تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۲۶۵ اور تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۰۷ کی طرف رجوع فرمائیں۔

۱۰۷۔ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا
بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ
اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ○

۱۰۸۔ لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَي التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ
يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○

۱۰۹۔ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰي تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ
خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰي شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ
بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○

۱۱۰۔ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ
تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۰۷۔ (مزید برآں) وہ لوگ ہیں جنھوں نے (مسلمانوں کو) نقصان پہنچانے اور کفر (کو تقویت دینے) کے لیے اور مومنین میں تفرقہ ڈالنے کی خاطر اور ایسے افراد کے لیے کمین گاہ مہیا کرنے کے لیے جنھوں نے پہلے ہی اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کی ہے، مسجد بنائی ہے وہ قسم کھاتے ہیں کہ ہمارا مقصد سوائے نیکی (اور خدمت) کے اور کچھ نہیں لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔

۱۰۸۔ اس میں ہرگز قیام (اور عبادت) نہ کرنا۔ وہ مسجد جو روز اول سے تقویٰ کی بنیاد پر بنی ہے زیادہ حق رکھتی ہے کہ

تم اس میں قیام (اور عبادت) کرو۔ اس میں ایسے مرد ہیں جو پاک و پاکیزہ رہنا پسند کرتے ہیں اور خدا پاک رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

۱۰۹۔ کیا وہ شخص جس نے اس کی بنیاد تقویٰ الٰہی اور اس کی خوشنودی پر رکھی ہے بہتر ہے یا وہ شخص جس نے اس کی بنیاد گرنے والی اور کمزور جگہ پر رکھی ہے کہ جو اچانک جہنم کی آگ میں گر جائے گی اور خدا ظالم گروہ کو ہدایت نہیں کرتا۔

۱۱۰۔ (لیکن) یہ بنیاد جو انھوں نے رکھی ہے، ان کے دلوں میں ہمیشہ شک اور تردد کے ذریعے کے طور پر باقی رہے گی۔ مگر یہ کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں (اور وہ مر جائیں ورنہ یہ چیز ان کے دلوں سے نہیں نکلے گی) اور خدا دانا و حکیم ہے۔

شان نزول

زیر نظر آیات منافقین کے ایک گروہ کے بارے میں ہیں جنھوں نے اپنی منحوس سازشوں کی تکمیل کے لیے مدینہ میں ایک مسجد قائم کی تھی جو بعد میں "مسجد ضرار" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ بات تمام اسلامی مفسرین اور بہت سی کتب حدیث و تاریخ نے ذکر کی ہے اگرچہ اس کی تفصیلات میں کچھ فرق نظر آتا ہے۔ مختلف تفاسیر اور احادیث سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے اس کے پیش نظر اس واقعہ کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے:

> کچھ منافقین رسول اللہؐ کے پاس آئے اور عرض کیا: ہمیں اجازت دیجیے کہ ہم قبیلہ بنی سالم کے درمیان، مسجد قبا کے قریب ایک مسجد بنالیں تاکہ ناتوان، بیمار اور بوڑھے جو کوئی کام نہیں کر سکتے اس میں نماز پڑھ لیا کریں۔ اسی طرح جن راتوں میں بارش ہوتی ہے ان میں جو لوگ آپ کی مسجد میں نہیں آسکتے اپنے اسلامی فریضہ کو اس میں انجام دے لیا کریں۔
>
> یہ اس وقت کی بات ہے جب پیغمبر خدا جنگ تبوک کا عزم کر چکے تھے آنحضرتؐ نے انھیں اجازت دے دی۔
>
> انھوں نے مزید کہا: کیا یہ بھی ممکن ہے کہ آپ خود آکر اس میں نماز پڑھیں؟
>
> نبی اکرمؐ نے فرمایا: اس وقت تو میں سفر کا ارادہ کر چکا ہوں البتہ واپسی پر خدا نے چاہا تو اس مسجد میں آکر نماز پڑھوں گا۔
>
> جب آپؐ جنگ تبوک سے لوٹے تو یہ لوگ آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے

ہماری درخواست ہے کہ آپ ہماری مسجد میں آکر اس میں نماز پڑھائیں اور خدا سے دعا کریں کہ ہمیں برکت دے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی آنحضرتؐ مدینہ کے دروازے میں داخل نہیں ہوئے تھے اس وقت وحی خدا کا حامل فرشتہ نازل ہوا اور مندرجہ بالا آیات لایا اور ان کے کرتوت سے پردہ اٹھایا۔

اس کے فوراً بعد رسول اللہؐ نے حکم دیا کہ مذکورہ مسجد کو جلا دیا جائے اور اسکے باقی حصے کو مسمار کر دیا جائے اور اس کی جگہ کوڑا کرکٹ ڈالا جایا کرے۔

ان لوگوں کے ظاہراً کام کو دیکھا جائے تو ہمیں شروع میں تو اس حکم پر حیرت ہوتی کہ کیا بیماروں اور بوڑھوں کی سہولت کے لیے اور اضطراری مواقع کے لیے مسجد بنانا بُرا کام ہے جبکہ یہ ایک دینی اور انسانی خدمت معلوم ہوتی ہے کیا ایسے کام کے بارے میں یہ حکم صادر ہوا ہے؟ لیکن اگر ہم اس معاملہ کی حقیقت پر نظر کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ حکم کس قدر برمحل اور جچا تلا تھا۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ ابو عامر نامی ایک شخص نے عیسائیت قبول کرلی تھی اور راہبوں کے مسلک سے منسلک ہوگیا تھا۔ اس کا شمار عابدوں اور زاہدوں میں ہوتا تھا۔ قبیلہ خزرج میں اس کا گہرا اثر و رسوخ تھا۔ رسول اللہؐ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت کی اور مسلمان آپؐ کے گرد جمع ہوگئے تو ابو عامر جو خود بھی پیغمبرؐ کے ظہور کی خبر دینے والوں میں سے تھا نے دیکھا کہ اس کے گرد اگرد سے لوگ چھٹ گئے ہیں اس پر وہ اسلام کے مقابلے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مدینہ سے نکلا اور کفارِ مکہ کے پاس پہنچا اس نے ان سے پیغمبر اکرمؐ کے خلاف جنگ کے لیے مدد چاہی اور قبائل عرب کو بھی تعاون کی دعوت دی۔ وہ خود مسلمانوں کے خلاف جنگِ اُحد کی منصوبہ بندی میں شریک رہا تھا اور راہنمائی کرنے والوں میں سے تھا۔ اس نے حکم دیا کہ لشکر کی دو صفوں کے درمیان گڑھے کھود دے جائیں۔ اتفاقاً پیغمبرِ اسلامؐ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ آپؐ کی پیشانی پر زخم آئے اور دندانِ مبارک ٹوٹ گئے۔

جنگ احد ختم ہوئی۔ مسلمانوں کو اس میدان میں آنے والی مشکلات کے باوجود اسلام کی آواز بلند تر ہوئی اور ہر طرف صدائے اسلام گونجنے لگی۔ تو وہ مدینہ سے بھاگ گیا اور بادشاہِ روم ہرقل کے پاس پہنچا تاکہ اس سے مدد طلب اور مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر مہیا کرے۔

اس نکتے کا بھی ذکر ضروری ہے کہ اس کی ان کارستانیوں کی وجہ سے پیغمبر اسلامؐ نے اسے "فاسق" کا لقب دے رکھا تھا۔

بعض کہتے ہیں کہ موت نے اسے مہلت نہ دی کہ وہ اپنی آرزو ہرقل سے کہتا لیکن بعض دوسری کتب میں ہے کہ وہ ہرقل سے جا کر ملا اور اس کے وعدوں سے مطمئن اور خوش ہوا۔

بہر حال اس نے مرنے سے پہلے مدینہ کے منافقین کو ایک خط لکھا اور انھیں خوشخبری دی کہ روم کے ایک لشکر کے ساتھ وہ ان کی مدد کو آئے گا۔ اس نے انھیں خصوصی تاکید کی کہ مدینہ میں وہ اس کے لیے ایک مرکز بنائیں تاکہ اس کی آئندہ کی

کارگذاریوں کے لیے وہ کام دے سکے لیکن ایسا مرکز چونکہ مدینہ میں اسلام دشمنوں کی طرف سے اپنے نام پر قائم کرنا عملی طور پر ممکن نہ تھا۔ لہٰذا منافقین نے مناسب یہ سمجھا کہ مسجد کے نام پر بیماروں اور معذوروں کی مدد کی صورت میں اپنے پروگرام کو عملی شکل دیں۔

آخر کار مسجد تعمیر ہو گئی یہاں تک کہ مسلمانوں میں سے مجمع بن حارثہ (یا مجمع بن جاریہ) نامی ایک قرآن فہم نوجوان کو مسجد کی امامت کے لیے بھی چن لیا گیا لیکن وحیِ الٰہی نے ان کے کام سے پردہ اٹھا دیا۔

یہ جو پیغمبر اکرمؐ نے جنگِ تبوک کی طرف جانے سے قبل ان کے خلاف سخت کاروائی کا حکم نہیں دیا اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ایک تو ان کی حقیقت زیادہ واضح ہو جائے اور دوسرا یہ کہ تبوک کے سفر میں اس طرف سے کوئی اور ذہنی پریشانی نہ ہو۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا رسول اللہؐ نے نہ صرف یہ کہ مسجد میں نماز نہیں پڑھی بلکہ بعض مسلمانوں (مالک بن دخشم، معنی بن عدی اور عامر بن سکر یا عاصم بن عدی) کو حکم دیا کہ مسجد کو جلا دیں اور پھر اس کی دیواروں کو مسمار کروا دیا۔ اور آخر کار اسے کوڑا کرکٹ پھینکنے کی جگہ قرار دے دیا[1]

تفسیر

مسجد کے رُوپ میں بُت خانہ

گزشتہ آیات میں مختلف مخالف گروہوں کی کیفیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ زیرِ بحث آیات ایک اور گروہ کا تعارف کرواتی ہیں۔ یہ لوگ بڑے ماہرانہ منصوبے اور سازش کے تحت میدان میں داخل ہوئے اور کی رحمت مسلمانوں کے شاملِ حال ہوئی اور ان کا یہ منصوبہ اور سازش نقش بر آب ہو گئی۔

پہلی آیت میں قرآن کہتا ہے: ان میں سے ایک اور گروہ نے مدینہ میں ایک مسجد بنائی مسجد کے مقدس کے نام کے پیچھے انہوں نے اپنے منحوس مقاصد چھپا رکھے تھے (والذین اتخذوا مسجدًا)[2]

اس کے بعد ان کے چار طرح کے مقاصد کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے:

۱۔ ایک مقصد ان کا یہ تھا کہ اس طرح سے مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں (ضرارًا)۔ "ضرار" کا معنی ہے "جان بوجھ کر نقصان پہنچانا" دعویٰ تو وہ یہ کرتے تھے کہ ان کا مقصد مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ ہے اور وہ بیمار اور ناتواں لوگوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اس کے برعکس اپنے ان کاموں سے پیغمبر اسلامؐ کا خاتمہ اور مسلمانوں کی سرکوبی چاہتے تھے یہاں تک کہ

---

[1] مجمع البیان، تفسیر ابوالفتوح رازی، تفسیر المنار، تفسیر المیزان، تفسیر نور الثقلین اور دیگر کتب۔

[2] مفسرین نے اس جملے کی ترکیب کے سلسلے میں اگرچہ ادبی لحاظ سے مختلف نظریات پیش کیے ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ جملہ گزشتہ جملوں پر عطف ہے جو منافقین کے بارے میں تھا اور اس کی تقدیر یہ ہے "ومنھم الذین اتخذوا مسجدًا"

اگران کے بس میں ہوتا تو اسلام ہی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے تھے۔

۲۔ دوسرا مقصد ان کا کفر کی بنیادوں کو تقویت پہنچانا تھا۔ وہ لوگوں کو اسلام سے پہلے کی سی حالت پر پلٹا دینا چاہتے تھے (وکفرًا)۔

۳۔ وہ مسلمانوں کی صفوں میں تفرقہ ڈالنا چاہتے تھے کیونکہ اس مسجد میں کچھ لوگ جمع ہونے لگتے تو اس سے مسجد قبا جو اس کے نزدیک تھی یا مسجد نبوی جو اس سے کچھ فاصلے پر تھی، کی رونق ختم ہو جاتی (وتفریقًا بین المؤمنین)۔

جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے، اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کے درمیان فاصلہ اتنا کم نہیں ہونا چاہیے کہ دوسری مسجد کے اجتماع پر اثر انداز ہو۔ اس بناء پر وہ لوگ جو قومی تعصب یا ذاتی اغراض کی بنیاد پر مسجد کے پاس ایک مسجد بنا لیتے ہیں، اور یوں مسلمانوں کے اجتماعات کو منتشر کرتے ہیں اور ان کے اس اقدام سے دوسری مساجد کی صفیں خالی، بے رونق اور بے روح ہو جاتی ہیں وہ اہداف اسلامی کے خلاف عمل کرتے ہیں۔

۴۔ ان کا آخری مقصد یہ تھا کہ ایسے شخص کے لیے ایک مرکز قائم کریں جو پہلے سے خدا اور اس کے رسول کے خلاف برسرپیکار تھا اور اس کے سابقہ بُرے کارنامے لوگوں پر واضح تھے اور وہ اس مرکز سے اپنے منصوبوں کی تکمیل چاہتا تھا (وارصادًا لمن حارب اللہ ورسولہ من قبل)۔

لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان تمام بُرے اغراض اور منحوس مقاصد کو انھوں نے ایک خوب صورت اور پُرفریب لباس میں چھپا رکھا تھا۔ یہاں تک کہ وہ قسم کھاتے تھے کہ ہمارا نیکی کرنے کے علاوہ اور کوئی مقصد اور ارادہ نہیں (ولیحلفن ان اردنا الا الحسنٰی)۔

منافقین کا ہر دور اور زمانے میں یہی دستور رہا ہے وہ اپنے مقاصد کو خوشنما پردوں میں چھپائے رکھتے ہیں اور عام لوگوں کو منحرف کرنے کے لیے طرح طرح کی قسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن قرآن مزید کہتا ہے: وہ خدا جو سب کے اندرونی رازوں سے واقف ہے اور جس کے لیے غیب و شہود یکساں ہے، گواہی دیتا ہے کہ یقیناً وہ جھوٹے ہیں (واللہ یشھد انھم لکذبون)۔

اس جملے میں ان کی تکذیب کے لیے مختلف تاکیدیں نظر آتی ہیں،

پہلی یہ کہ یہ جملہ اسمیہ ہے

دوسری یہ کہ لفظ "ان" تاکید کے لیے

تیسری یہ کہ "لکذبون" میں لام ابتداء اور تاکید کے لیے ہے۔

چوتھی یہ کہ فعل ماضی کی جگہ "کذبون" کا آنا ان کے جھوٹ بولنے کے استمرار اور دوام کی دلیل ہے۔

اس طرح سے خدا تعالیٰ ان کی بڑی بڑی قسموں کی شدید ترین طریقے سے تکذیب کرتا ہے۔

بعد والی آیت میں اس حیات بخش حکم کی مزید تاکید کے لیے خدا تعالیٰ فرماتا ہے: اس مسجد میں ہرگز قیام نہ کرو اور اس میں نماز نہ پڑھو (لا تقم فیہ ابدًا)۔

بلکہ اس مسجد کی بجائے زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس مسجد میں عبادت قائم کرو جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے (لمسجد اسس علی التقوٰی من اول یوم احق ان تقوم فیہ) نہ یہ کہ یہ مسجد جس کی بنیاد روزِ اوّل ہی سے کفر، نفاق، بے دینی اور تفرقہ پر رکھی گئی ہے۔

لفظ "احق" (یعنی زیادہ مناسب اور سزاوار) اگرچہ افعل التفضیل ہے لیکن یہاں لیاقت اور اہمیت کے لیے دو چیزوں کے درمیان موازنہ کے معنی میں نہیں آیا بلکہ مناسب و غیر مناسب، لیاقت اور عدم لیاقت کے موازنہ کے لیے آیا ہے۔ قرآنی آیات، احادیث اور روزمرہ میں ایسی گفتگوؤں کے بہت سے نمونے موجود ہیں، مثلاً بعض اوقات ناپاک اور بُرے آدمی سے ہم کہتے ہیں کہ پاکیزگی اور اچھا کام کرنا تیرے لیے بہتر ہے اس بات کا یہ معنی نہیں کہ ناپاک رہنا اور بُرے کام کرنا اچھا ہے لیکن اس سے بہتر پاک رہنا اور نیک کام کرنا ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ پاکیزگی اور نیکی اچھی چیز ہے اور ناپاکی اور برائی بُری چیز ہے۔

مفسرین نے کہا ہے کہ جس مسجد کے بارے میں مندرجہ بالا جملے میں کہا گیا ہے کہ زیادہ مناسب یہ ہے کہ پیغمبرؐ اس میں نماز پڑھیں اس سے مراد مسجد قبا ہے کہ جس کے قریب منافقین نے مسجد ضرار بنائی تھی۔

البتہ یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے مراد مسجد نبوی یا وہ تمام مساجد ہوں کہ جن کی بنیاد تقویٰ پر ہو لیکن "اوّل یوم" (روزِ اوّل) کی تعبیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ مسجد قبا پہلی مسجد تھی جو مدینہ میں بنائی گئی[1] پہلا احتمال ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اگرچہ دوسری مساجد مثلاً مسجد نبوی کے لیے بھی یہ لفظ مناسب ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے کہ علاوہ اس کے کہ اس مسجد کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے، مردوں کا ایک گروہ اس میں مشغولِ عبادت ہے جو پسند کرتا ہے کہ اپنے آپ کو پاک و پاکیزہ رکھے اور خدا پاکباز لوگوں کو دوست رکھتا ہے (فیہ رجال یحبون ان یتطھروا و اللہ یحب المطھرین)۔

اس سلسلے میں کہ اس پاکیزگی سے مراد ظاہری اور جسمانی پاکیزگی ہے یا معنوی اور باطنی پاکیزگی، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ تفسیر تبیان اور مجمع البیان میں اس آیت کے ذیل میں رسول اللہؐ سے ایک روایت نقل ہوئی ہے جس میں ہے کہ آپؐ نے مسجد قبا والوں سے فرمایا:

ماذا تفعلون فی طھرکم فان اللہ تعالٰی قد احسن علیکم الثناء،

قالوا نغسل اثر الغائط۔

تم اپنے آپ کو پاک کرتے وقت کیا کام انجام دیتے ہو کہ خدا نے تمہاری اسطرح سے مدح و ثنا کی ہے۔

انھوں نے کہا، ہم اپنے پائخانہ کے اثر کو پانی سے دھوتے ہیں۔

اسی مضمون کی روایات امام باقر علیہ السلام اور امام صادق علیہ السلام سے نقل ہوئی ہیں لیکن جیسا کہ ہم نے بارہا اشارہ کیا ہے

---

[1] کامل ابن اثیر جلد ۲ ص ۱۰۷

ایسے مصداق کے لیے اس قسم کی روایات مفہومِ آیت کو منحصر کرنے کے لیے نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ آیت کا ظہور مطلق ہے اور یہ گواہی دیتا ہے کہ طہارت یہاں ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے اس میں شرک و گناہ کے آثار سے روح کی پاکیزگی اور جسمانی کثافتوں کے آثار سے جسم کی پاکیزگی سب شامل ہیں۔

زیرِ بحث تیسری آیت میں دو گروہوں کے مابین موازنہ کیا گیا ہے ایک گروہ مومنین کا ہے جو مسجد قبا کی طرح مساجد کو تقویٰ کی بنیاد پر بناتے ہیں اور دوسرا گروہ منافقین کا ہے جو مسجد کو کفر و نفاق اور تفرقہ و فساد کی اساس پر تعمیر کرتے ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے، کیا وہ شخص جس نے مسجد کی بنیاد تقویٰ، حکمِ الٰہی کی مخالفت سے پرہیز اور اس کی رضا طلب کرتے ہوئے رکھی ہے بہتر ہے یا وہ شخص جس نے اس کی بنیاد کمزور اور گر جانے والی جگہ پر جہنم کے کنارے رکھی ہے جو عنقریب جہنم میں گر جائے گی (افمن اسس بنیانه علی تقوی من الله و رضوان خیر ام من اسس بنیانه علی شفا جرف هار فانهار به فی نار جهنم)۔

"بنیان" مصدر ہے اور اسمِ مفعول کے معنی میں ہے یعنی بنیاد اور عمارت۔

"شفا" کسی چیز کے کنارہ یا کنگرہ کو کہتے ہیں۔

"جرف" نہر یا کنوئیں کا وہ حاشیہ اور کنارہ ہے جس کے نچلے حصے کو پانی نے خالی کر دیا ہو۔

"ہار" اس کمزور شخص یا کمزور عمارت کو کہتے ہیں جو گر رہی ہو۔

مندرجہ بالا تشبیہ منافقین کے کام کی بے ثباتی اور کمزوری کو اور اہلِ ایمان کے کام اور لائحہ عمل کے استحکام اور بقا کو روشن اور واضح کر رہی ہے۔

مومن کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک عمارت بنانے کے لیے بڑی مضبوط زمین منتخب کرے اور اس کی بنیاد بھی مضبوط اور قابلِ اطمینان مصالح سے رکھے۔

دوسری طرف منافق کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنی عمارت دریا کے کنارے ایسی جگہ پر بنائے جس کے نچلے حصہ کی مٹی سیلاب بہالے گیا ہو اور جو ہر وقت گرنے کو تیار ہو۔ نفاق کی بھی یہی صورت ہے اس کا بھی ظاہر ہے اور باطن کچھ نہیں اسی طرح اس عمارت کا بھی ظاہر ہے لیکن جس کی کوئی اساس نہیں یہ عمارت کسی بھی وقت گر سکتی ہے اہلِ نفاق کا مکتب و مذہب بھی اپنے کھوکھلے باطن کے باعث کسی بھی وقت تباہی اور رسوائی کے انجام کو پہنچ سکتا ہے۔

پرہیزگاری اور رضائے الٰہی کو طلب کرنا یعنی حقیقت سے ہم آہنگ ہونا، جہانِ خلقت اور اسرارِ حیات سے ہم قدم ہونا بلاشبہ بقاء اور ثبات کا عامل ہے۔ لیکن نفاق یعنی حقائق سے بے گانگی اور قوانینِ فطرت سے بغاوت بلاشبہ زوال اور فنا کا عامل ہے۔

منافقین چونکہ اپنے آپ سے بھی ظلم کرتے ہیں اور معاشرے سے بھی لہٰذا آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے، خدا ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا (والله لا یهدی القوم الظلمین)۔

جیسا کہ ہم نے بارہا کہا ہے، ہدایتِ خداوندی یعنی مقصد تک پہنچنے کے لیے مقدمات کی فراہمی صرف ان کے لیے ہے۔

جو اس کا استحقاق اور اہلیت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ ظالم جن میں یہ اہلیت نہیں ہے یہ لطف و کرم ہرگز ان کے شامل حال نہیں ہوتا کیونکہ خدا حکیم ہے اور اس کی مشیت حساب و کتاب پر مبنی ہے۔

زیرِ نظر آخری آیت میں منافقین کی ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ اس طرح اپنے کام میں ہٹ دھرم ہیں اور نفاق و کفر کی تاریکی میں اس طرح سے سرگرداں ہیں کہ جو عمارت وہ خود کھڑی کرتے ہیں وہ شک و تردد کے عامل کے طور پر یا شک و تردد کے نتیجہ کے طور پر ان کے دلوں میں باقی رہ جاتی ہے مگر یہ کہ ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور وہ موت کی آغوش میں چلے جائیں (لا یزال بنیانهم الذی بنوا ریبة فی قلوبهم الا ان تقطع قلوبهم)۔

وہ ہمیشہ حیرت و سرگردانی کے عالم میں زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ مرکز نفاق اور مسجد ضرار جو انھوں نے بنائی تھی ایک ہٹ دھرمی اور تردد کے عامل کی صورت میں ان کی روح میں اسی طرح باقی تھی۔ اگرچہ رسول اللہؐ نے اس عمارت کو جلوا دیا تھا اور مسمار کروا دیا تھا لیکن ایسے تھا جیسے اس کا نقش ان کے شک زدہ دل سے کبھی زائل نہ ہوگا۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اور خدا دانا و حکیم ہے (و الله علیم حکیم)۔

خدا تعالیٰ نے اگر اپنے رسول کو ان کے خلاف اقدام کا حکم دیا اور ان کی ایسی عمارت کو مسمار کرنے کے لیے کہا کہ جو ظاہراً حق کے لیے بھی تو یہ اس لیے تھا کہ وہ بنانے والوں کی بُری نیتوں سے، بدباطنی اور اس عمارت کی حقیقت سے آگاہ تھا۔ یہ حکم عین حکمت و مصلحت کے مطابق تھا اس کا مقصد اسلامی معاشرے کی بھلائی اور درستی تھا۔ یہ نہیں کہ یہ کوئی جلد بازی کا فیصلہ تھا اور نہ ہی یہ غیض و غضب کا نتیجہ تھا۔

چند اہم نکات

۱۔ عظیم درس: مسجد ضرار کا واقعہ تمام مسلمانوں کے لیے ان کی پوری زندگی میں ایک درس ہے۔ کلام خدا اور عمل رسولؐ واضح طور پر نشاندہی کرتا ہے کہ مسلمانوں کو کبھی بھی ایسا ظاہر بین نہیں ہونا چاہیے کہ وہ صرف ظاہری طور پر کاموں کے حق بجانب ہونے پر نظر رکھیں اور ان کے اصلی اغراض و مقاصد سے بے خبر اور لاتعلق رہیں۔ مسلمان وہ ہے جو نفاق اور منافق کو ہر وقت، ہر جگہ، ہر لباس میں اور ہر چہرے میں پہچان لے۔ اگرچہ وہ دین و مذہب کے چہرے میں اور قرآن اور مسجد کی حمایت کے لباس ہی میں کیوں نہ ہو۔

مذہب سے مذہب کے خلاف فائدہ اٹھانا کوئی نئی چیز نہیں۔ استعمار گروں، جابر حکمرانوں اور منافقوں کے طور طریقے ہمیشہ ہر معاشرے میں یہی رہے ہیں۔ اگر لوگ کسی خاص مطلب کی طرف جھکاؤ رکھتے ہیں تو وہ پہلے انھیں اسی جھکاؤ سے غافل کرتے ہیں اور پھر اپنے استعماری مقاصد بروئے کار لاتے ہیں یہاں تک کہ وہ مذہب کے خلاف مذہب ہی کی قوت سے مدد لیتے ہیں۔

اصولی طور پر جعلی پیغمبروں اور باطل مذاہب گھڑنے کا یہی فلسفہ تھا کہ اس راستے سے لوگوں کے مذہبی جھکاؤ اور میلان کو

اپنی پسند کی راہ پر ڈال دیا جائے۔

واضح ہے کہ مدینہ کے ماحول میں، وہ بھی رسول اللہ کے زمانے میں جب اسلام اور قرآن لوگوں میں بہت زیادہ نفوذ کرچکا تھا، اسلام کے خلاف کھلے بندوں جنگ ممکن نہ تھی بلکہ ضروری تھا کہ بے دینی کو دین کے پیکٹ میں پیش کیا جائے اور باطل کو حق کا لباس پہنا کر لایا جائے تاکہ سادہ دل لوگوں کو کھینچا جاسکے اور یوں بُرے مقاصد کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔

لیکن سچا مسلمان وہ نہیں جو ایسا سطحی اور سادہ ہو کہ ایسے ظواہر سے دھوکا کھا لے۔ اسے چاہیے کہ ایسے کاموں کے عوامل، ان کے پیچھے کارفرما ہاتھوں اور دوسرے قرآئن کو سامنے رکھ کر ان کی حقیقت معلوم کرے اور ظاہری چہرے کے پیچھے لوگوں کے باطنی چہرے کو بھی دیکھے۔

مسلمان وہ نہیں جو ہر پکار کو صرف یہ دیکھ کر قبول کرلے کہ یہ حق کی آواز ہے چاہے وہ کسی گلے سے بھی نکل رہی ہو اور نہ وہ مسلمان ہے جو اپنی طرف بڑھنے والے ہر ہاتھ کو پکڑ لے۔ ہر کام جو ظاہراً دینی ہو اسے دیکھتے ہی اس کے ہم قدم ہو جائے، اسلام کے نام پر لہرانے والے ہر جھنڈے کے نیچے ماتم کناں ہو جائے اور مذہب کے نام پر بننے والی ہر عمارت کی طرف مائل ہو جائے۔ مسلمان کو ہوشیار، آگاہ، حقیقت شناس، مستقبل پر نظر رکھنے والا اور تمام معاشرتی مسائل کا تجزیہ و تحلیل کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔ چاہیے کہ وہ فرشتوں کے لباس میں جنوں کو پہچان لے۔ چرواہے کے لباس میں بھیڑیے کو پہچان لے اور اپنے آپ کو دوست نما دشمنوں سے مقابلے کے لیے تیار کرے۔

اسلام میں ایک بنیادی چیز یہ ہے کہ ہر چیز سے پہلے نیتوں اور ارادوں کو دیکھا جائے۔ اسلام کی نظر میں ہر عمل کی قدر و قیمت اسکی نیت کے ساتھ وابستہ ہے نہ کہ اس کے ظاہر کے ساتھ۔ نیت اگرچہ ایک باطنی چیز ہے تاہم ممکن نہیں کہ کوئی شخص اپنی نیت صرف دل میں رکھے رہے اور اس کا اثر اس کے عمل میں ظاہر نہ ہو اگرچہ وہ راز داری میں بڑا ماہر اور استاد ہی کیوں نہ ہو۔

یہاں سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ اتنا باعظمت مقام یعنی مسجد اور خانۂ خدا ہونے کے باوجود اسے جلانے کا حکم کیوں دیا؟ وہ مسجد جس کی ریت کا ایک ذرہ باہر نہیں جا سکتا اسے کیوں تباہ کر دیا اور وہ مقام کہ اگر نجس ہو جائے تو فوراً پاک کرنا چاہیے اسے شہر کی گندگی پھینکنے کا مقام کیوں قرار دیا؟

ان سب سوالات کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ مسجد ضرار مسجد ہی نہ تھی، درحقیقت وہ بت خانہ تھا۔ مقدس جگہ نہ تھی افتراق اور نفاق کا مرکز تھا خدا کا گھر نہ تھا بلکہ شیطان کا گھر تھا۔ ظاہر نام اور نقاب کسی چیز کی حقیقت کو نہیں بدل سکتے۔

یہ ہے وہ عظیم درس جو مسجد ضرار کی داستان نے ہر دور کے تمام مسلمانوں کو دیا ہے

اس بحث سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد و اتفاق، اسلام کی نظر اس قدر اہمیت ہے کہ اگر ایک مسجد کا دوسری مسجد کے قریب بنانا مسلمانوں کی صفوں کے درمیان تفرقہ بازی، اختلاف اور شگاف پیدا ہونے کا باعث ہو تو وہ تفرقہ انداز مسجد غیر مقدس ہے۔

۲۔ صرف نفی کافی نہیں: دوسرا درس جو ہمیں مندرجہ بالا آیات سے ملتا ہے یہ ہے کہ خدا اپنے پیغمبر کو حکم دیتا ہے کہ مسجد ضرار میں نماز نہ پڑھو بلکہ اس مسجد میں نماز پڑھو کہ جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔

یہ "نفی" اور "اثبات" اسلام کے اصلی شعار "لا الٰہ الا اللہ" سے لے کر اس کے ہر چھوٹے بڑے پروگرام میں جلوہ گر ہے یہ امر اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ ہمیشہ ہر نفی کے ساتھ ایک اثبات ہونا چاہیے تاکہ وہ مرحلہ عمل پہنچے۔ اگر ہم لوگوں کو برائی کے مراکز میں جانے سے منع کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ ان کے مقابلے میں پاک و پاکیزہ مراکز قائم کریں جو معاشرے اور جمعیت کی روح کی تسکین کا باعث ہوں۔ اگر ہم غلط تفریح سے لوگوں کو روکتے ہیں تو ہمیں صحیح تفریح کے مواقع فراہم کرنا چاہییں۔ اگر ہم سامراجی مدارس اور تعلیمی اداروں میں جانے سے منع کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ صحیح مراکز تعلیم و تربیت مہیا کریں۔ اگر ہم بے حیائی اور بے عفتی کی مذمت کرتے ہیں تو ہمیں نوجوانوں کے لیے شادی کے آسان وسائل بھی فراہم کرنا چاہییں۔

• وہ لوگ جو اپنی تمام تر قوت "نفی" میں استعمال کرتے ہیں اور ان کے لائحہ عمل میں اثبات کا کوئی نام و نشان نہیں، انھیں یقین کر لینا چاہیے کہ ان کی نفی کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے کیونکہ سنتِ خلقت ہے کہ تمام غرائز اور جذبات کو صحیح راستے سے سیراب کیا جائے۔ کیونکہ اسلام کا یہ طریقہ ہے کہ "لا" کو "الّا" کے ساتھ باہم ہونا چاہیے تاکہ اس سے حیات بخش توحید پیدا ہو سکے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ وہ درس ہے جسے بہت سے مسلمان فراموش کر چکے ہیں اور پھر بھی شکایت کرتے ہیں کہ اسلامی پروگراموں میں پیش رفت کیوں نہیں ہوتی حالانکہ ان کے خیالات کے برعکس اسلام کا پروگرام نفی میں منحصر نہیں ہے اگر وہ نفی اور اثبات کو ساتھ ساتھ رکھتے تو اسلامی پیش رفت حتمی اور یقینی ہوتی۔

۲۔ دو بنیادی شرطیں: تیسرا اہم درس جو ہمیں مسجد ضرار کے واقعے سے اور زیر بحث آیت سے ملتا ہے یہ ہے کہ ایک فعال اور مثبت دینی اور اجتماعی مرکز وہ ہے جو دو مثبت عناصر سے تشکیل پائے۔

پہلا یہ کہ اس کی بنیاد اور مقصد پاک ہو (اسس علی التقوٰی من اول یوم)۔

دوسرا یہ کہ اس کے حامی اور نگہبان پاک، صالح، صاحبِ ایمان، مضبوط دل اور مخلص ہوں (فیہ رجال یحبون ان یتطھروا)۔

ان دو بنیادی ارکان کے بغیر نتیجہ اور مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

۱۱۱۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ ۫ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَ الْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ

الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِهٖ ؕ وَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝

۱۱۲۔ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ
السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

ترجمہ

۱۱۱۔ خدا مومنین سے ان کی جانیں اور مال خریدتا ہے تاکہ (ان کے بدلے) ان کے لیے جنت ہو (اس طرح سے کہ) وہ راہِ خدا میں جنگ کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں یہ سچا وعدہ اس کے ذمہ ہے جو اس نے تورات، انجیل اور قرآن میں ذکر فرمایا ہے اور خدا سے بڑھ کر اپنا وعدہ وفا کرنے والا کون ہے، اب تمہارے لیے خوش خبری ہے اس خرید و فروخت کے بارے میں جو تم نے خدا سے کی ہے اور یہ (تمہارے لیے) عظیم کامیابی ہے۔

۱۱۲۔ (مومن وہ ہیں جو) توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد و ثنا کرنے والے، سیاحت کرنے والے، رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور خدائی حدود (اور سرحدوں) کی حفاظت کرنے والے ہیں اور (ایسے) مومنین کو خوشخبری دو۔

تفسیر

ایک بے مثال تجارت

گزشتہ آیات میں چونکہ جہاد سے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے لہٰذا ان دو آیات میں ایک عمدہ مثال کے ساتھ صاحبِ ایمان مجاہدین کے بلند مقام کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس مثال میں خدا نے اپنا خریدار کی حیثیت سے اور مومنین کا فروخت کرنے والے کی حیثیت سے تعارف کروایا ہے ارشاد ہوتا ہے: خدا نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خریدے ہیں اور اس مال و متاع کے بدلے انھیں جنت دے گا (ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم و اموالھم بان لھم الجنۃ)۔

ہر خرید و فروخت کے معاملے میں پانچ بنیادی ارکین ہوتے ہیں جو یہ ہیں:۔

۱۔ خریدار

۲۔ بیچنے والا

۳۔ مال و متاع

۴۔ قیمت اور ۵۔ معاملہ کی سند۔

اس آیت میں خدا تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اپنے آپ کو خریدار، مومنین کو بیچنے والا، مومنین کی جانوں اور مالوں کو مال و متاع اور جنت کو اس معاملے کی قیمت قرار دیا ہے البتہ اس مال و متاع کو ادا کرنے کی طرز کے لیے ایک لطیف تعبیر استعمال کی گئی ہے یعنی "وہ راہِ خدا میں جنگ کرتے ہیں اور دشمنانِ حق کو قتل کرتے ہیں یا اس راہ میں قتل ہو جاتے ہیں اور جامِ شہادت نوش کرتے ہیں" (یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون و یقتلون)۔

درحقیقت خدا کا ہاتھ میدانِ جہاد میں صرف ہونے والے متاعِ جان و مال کو لینے کے لیے کھلا ہے۔

اس کے بعد پانچویں رکن کی طرف اشارہ ہے جو کہ معاملے کی محکم سند ہے فرمایا گیا ہے: یہ خدا کے ذمہ سچا وعدہ ہے جو تین آسمانی کتابوں تورات، انجیل اور قرآن میں آیا ہے (وعدا علیہ حقا فی التوراۃ والانجیل والقرآن)۔

البتہ "فی سبیل اللہ" کی تعبیر کی طرف توجہ کرتے ہوئے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ خدا ان جانوں، مساعی اور مجاہدات کا خریدار ہے جو اس کی راہ میں صرف ہوتی ہیں یعنی خدا ہر اس کوشش کا خریدار ہے جو حق و عدالت کے لیے ہو اور جو انسانوں کو کفر ظلم اور فساد کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے ہو۔

اس کے بعد قرآن اس عظیم معاملے کے لیے تاکید کرتے ہوئے مزید کہتا ہے: خدا سے زیادہ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا کون ہے (و من اوفی بعھدہ من اللہ)۔ یعنی اگرچہ اس معاملے کی قیمت فوراً ادا نہیں کی جائے گی تاہم بیع نسیہ[1] کے خطرات اس میں نہیں ہیں کیونکہ خدا اپنی قدرت اور بے نیازی کے سبب ہر شخص کی نسبت اپنے عہد و پیمان کو زیادہ پورا کرنے والا ہے۔ نہ وہ بھولتا ہے اور نہ ادا کرنے سے عاجز ہے اور نہ ہی وہ کوئی کام حکمت و مصلحت کے خلاف کرتا ہے کہ اس پر پشیمان ہو اور نہ ہی نعوذ باللہ وہ کوئی غلط بات کہتا ہے لہٰذا وعدہ پورا کرنے کے بارے میں اور وعدہ کے مطابق قیمت ادا کرنے سے متعلق کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔

سب سے زیادہ جالبِ نظر امر یہ ہے کہ اس معاملے کے مراسم کی انجام دہی کے بعد جیسا کہ تجارت کرنے والوں کا معمول ہے کہ دوسرے کو مبارکباد دی جاتی ہے، خدا تعالیٰ معاملے کو سود مند قرار دیتے ہوئے کہتا ہے، تمہیں خوشخبری ہو اس معاملہ پر، جو تم نے انجام دیا ہے (فاستبشروا ببیعکم الذی بایعتم بہ)[2]

---

[1] بیع نسیہ یہ ہے کہ جو چیز بیچی جائے وہ تو خریدنے والے کو دے دی جائے لیکن اس کی قیمت بعد میں ادا کرنا ہو۔ (مترجم)

[2] "فاستبشروا" مادہ "بشارت" و اصل "بشر" یعنی چہرہ کے معنی سے لیا گیا ہے اور خوشی کی طرف اشارہ ہے جس کے آثار چہرے پر ظاہر ہوتے ہیں۔

اور یہ تم سب کے لیے عظیم کامیابی ہے (و ذالک ھو الفوز العظیم)۔

ایسی نظیر دوسری عبارتوں میں بھی آئی ہے۔ مثلاً سورہ صف کی آیات ۱۰، ۱۱، ۱۲ میں فرمایا گیا ہے۔

یا ایها الذین اٰمنوا هل ادلکم علی تجارة تنجیکم من عذاب الیم ٥

تؤمنون بالله و رسوله و تجاهدون فی سبیل الله باموالکم و انفسکم

ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون ٥ یغفر لکم ذنوبکم و یدخلکم

جنّٰت تجری من تحتها الانهٰر و مسٰکن طیبة فی جنّٰت عدن ذالک الفوز العظیم ٥

یعنی ـــــــ اے ایمان والو! کیا تمھیں ایسی تجارت کی رہبری کروں جو تمھیں دردناک عذاب سے نجات دے۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ وہ تمھارے گناہوں کو بخش دے گا اور تمھیں ایسی بہشتوں میں داخل کرے گا جن کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور جنات عدن میں رہنے کی پاکیزہ جگہیں ہوں گی۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

یہاں انسان پروردگار کے اس لطف پر حیرت میں ڈوب جاتا ہے وہ خدا جو تمام عالمِ ہستی کا مالک ہے اور تمام جہانِ آفرینش پر حاکمِ مطلق ہے اور ہر شخص کے پاس جو کچھ ہے اسی کی طرف سے ہے جب وہ اپنی ہی عطا کردہ نعمتیں اپنے بندوں سے خریدنے پر آتا ہی ہے تو انھیں ہزارہا گنا قیمت پر خریدتا ہے۔

زیادہ عجیب تو یہ بات ہے کہ جہاد جو انسان کی اپنی سربلندی اور ہر قوم وملت کی کامیابی و افتخار کا ذریعہ ہے اور اس کے ثمرات آخرکار خود انسان ہی کو حاصل ہوتے ہیں اسے اس متاع کی ادائیگی کا ذریعہ شمار کیا گیا ہے۔ نیز اگرچہ ضروری ہے مال و متاع اور قیمت کے درمیان کچھ توازن ہونا چاہیے لیکن اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ ایک ناپائیدار متاع جو بہرحال فنا ہونے والی ہے (چاہے وہ بیماری کے بستر پر ختم ہو جائے یا میدانِ جنگ میں) اس کے بدلے سعادت ابدی عطا کرتا ہے۔

اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ اگرچہ خدا تمام سچوں سے زیادہ سچا ہے اور اسے کسی سند و ضمانت کی احتیاج نہیں اس کے باوجود وہ اپنے بندوں کے لیے اہم ترین اسناد اور ضمانتیں پیش کرتا ہے۔ پھر اس عظیم معاملے کے آخر میں انھیں مبارک دیتا ہے اور بشارت دیتا ہے ــــــــــ کیا اس سے بالاتر کسی لطف و کرم اور محبت و رحمت کا تصور ہو سکتا ہے اور کیا کوئی معاملہ اس سے بڑھ کر سودمند ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ایک حدیث میں جابر بن عبداللہ انصاری سے مروی ہے کہ جب زیرِ نظر آیت نازل ہوئی تو پیغمبر اکرمؐ مسجد میں تھے آپؐ نے اس آیت کو بلند آواز میں تلاوت کیا اور لوگوں نے تکبیر کہی۔ انصار میں سے ایک شخص سامنے آیا۔ اس نے بڑے تعجب سے پیغمبرؐ سے پوچھا: کیا واقعاً یہ آیت ابھی جو نازل ہوئی ہے۔

پیغمبرؐ نے فرمایا: ہاں

وہ انصاری کہنے لگا، بیع ربیح لا نقیل و لا نستقیل

یعنی ہم اس معاملے کو نہیں لوٹائیں گے اور اگر ہم سے چاہا گیا کہ اس سودے کو واپس
کردیں تو ہم قبول نہیں کریں گے۔[1]

جیسا کہ قرآن کی روش ہے کہ ایک آیت میں ایک بات کو اجمال کے ساتھ پیش کرتا ہے اور بعد والی آیت میں اس کی تشریح و توضیح کرتا ہے۔ دوسری محلِ بحث آیت میں مومنین جو خدا کے پاس اپنی جان اور مال بیچنے والے ہیں، کا واضح صفات کے ساتھ تعارف کرواتا ہے:

۱۔ وہ توبہ کرنے والے ہیں اپنے قلب و روح کی آلودگی کو توبہ کے پانی سے دھوتے ہیں (التائبون)۔

۲۔ وہ عبادت کرنے والے ہیں۔ خدا سے راز و نیاز کے ذریعے اور اس کی پاک ذات کی پرستش سے خود سازی کرتے ہیں اور اپنی اصلاح کرتے ہیں (العابدون)۔

۳۔ وہ پروردگار کی مادی اور معنوی نعمتوں پر اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں (الحامدون)۔

۴۔ وہ ایک مرکز عبادت سے دوسرے مرکز کی طرف آتے جاتے ہیں (السائحون) اسی طرح ان کا عبادت کے ذریعے خودسازی کا لائحہ عمل محدود ماحول میں منحصر نہیں رہتا اور کسی خاص علاقے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ ان کے لیے ہر جگہ پروردگار کی عبادت، خودسازی اور تربیت کا مرکز موجود ہے اور جہاں کہیں بھی اس سلسلے میں کوئی درس مل سکتا ہو وہ اس کے طالب ہیں۔

"سائح" اصل میں "سیح" اور "سیاحت" کے مادہ سے جاری رہنے اور استمرار کے معنی میں لیا گیا ہے۔

یہ کہ زیرِ نظر آیت میں "سائح" سے مراد کس قسم کی سیاحت اور استمرار ہے اس ضمن میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے بعض نے مراکز عبادت کے درمیان سیر مراد لی ہے۔ رسول اللہؐ کی ایک حدیث میں ہے:

سیاحة امتی فی المساجد

میری امت کی سیر و سیاحت مساجد میں ہے[2]

بعض نے "سائح" کو "صائم" (یعنی روزہ دار) کے معنی میں لیا ہے کیونکہ روزہ پورے دن میں ایک مسلسل کام ہے۔ ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے:

ان السائحین ھم الصائمون

سائحون روزہ دار ہی ہیں[3]

بعض دوسرے مفسرین نے سیاحت کو روئے زمین میں سیر و گردش عظمتِ خدا کے آثار کا مشاہدہ، انسانی معاشروں کی

---

[1] تفسیر المیزان بحوالہ درالمنثور

[2] تفسیر المیزان، زیر بحث آیت کے ذیل میں

[3] تفسیر نورالثقلین اور دیگر تفاسیر

پہچان اور مختلف اقوام کی عادات ورسوم اور علوم ودانش سے آشنائی جو کہ انسانی افکار کو زندہ اور پختہ کرتی ہے، سمجھا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین سیاحت کو میدانِ جہاد اور دشمن سے مقابلے کے لیے سیر وحرکت کے معنی میں سمجھتے ہیں اس سلسلے میں وہ اس مشہور حدیثِ رسولؐ کو شاہد قرار دیتے ہیں، کہ:

ان سیاحۃ امتی الجھاد فی سبیل اللّٰہ

میری امت کی سیر وسیاحت اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے[1]

کچھ نے اسے جہانِ ہستی، عواملِ سعادت اور اسبابِ شکست سے مربوط عقل وفکر کی سیر کے معنی میں سمجھا ہے۔

لیکن قبل اور بعد کے جو اوصاف شمار کیے گئے ہیں ان کی طرف توجہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام معانی میں پہلا معنی زیادہ مناسب نظر آتا ہے اگرچہ تمام معانی بھی اس لفظ سے مراد لیے جاسکتے ہیں کیونکہ یہ تمام مفاہیم سیر وسیاحت کے مفہوم میں جمع ہیں۔

۵۔ وہ عظمت الٰہی کے سامنے رکوع کرتے ہیں (الراکعون)۔

۶۔ وہ اس کے آستان پر جبہ سائی کرتے ہیں اور سجدہ ریز ہوتے ہیں (الساجدون)۔

۷۔ وہ لوگوں کو نیکیوں کی دعوت دیتے ہیں (الاٰمرون بالمعروف)۔

۸۔ وہ صرف نیکی کی دعوت دینے کا فریضہ ادا نہیں کرتے بلکہ ہر قسم کی برائی اور منکر سے بھی جنگ کرتے ہیں (والناھون عن المنکر)۔

۹۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پیغام کی ادائیگی کے بعد وہ اپنی آخری اور زیادہ اہم اجتماعی ذمہ داری یعنی حدود اللہ کی حفاظت اس کے قوانین کا اجراء اور حق وعدالت کے قیام کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں (والحافظون لحدود اللّٰہ)۔

یہ نو صفات بیان کرنے کے بعد خدا تعالیٰ دوبارہ ایسے سچے اور مکتبِ ایمان وعمل کے تربیت یافتہ مومنین کو تشویق دلاتا ہے اور پیغمبر اکرمؐ سے کہتا ہے: ان مومنین کو بشارت دو (وبشر المؤمنین)۔

یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ کس چیز کی بشارت ہے یا دوسرے لفظوں میں بشارت بطور مطلق آئی ہے لہٰذا وہ ایک وسیع مفہوم رکھتی ہے جس میں ہر طرح کی خیر وسعادت شامل ہے یعنی انہیں ہر خیر، ہر سعادت، ہر افتخار اور ہر اعزاز کی بشارت دو۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ ان نو قسم کی صفات میں سے بعض (چھ پہلی صفات) خود سازی اور افراد کی تربیت کے ساتھ مربوط ہیں اور ان کا دوسرا حصہ (ساتویں اور آٹھویں صفت) اجتماعی فرائض سے متعلق ہے اور معاشرے کو پاک رکھنے کی طرف اشارہ ہے اور آخری صفت سب لوگوں کی ذمہ داری بیان کر رہی ہے اور وہ ہے صالح حکومت کا قیام اور مثبت سیاسی امور میں بھرپور شرکت۔

۱۱۳۔ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَنْ يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ

[1] تفسیر المیزان اور تفسیر المنار، محلِ بحث آیت کے ذیل میں۔

وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ
اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ○

۱۱۴۔ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ
وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ
اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ○

ترجمہ

۱۱۳۔ پیغمبر اور مومنین کے لیے مناسب نہیں تھا کہ مشرکین کے لیے (خدا سے) بخشش طلب کریں اگرچہ وہ ان کے قریبی کیوں نہ ہوں جبکہ ان پر روشن ہوگیا کہ یہ لوگ اصحاب دوزخ ہیں۔

۱۱۴۔ اور ابراہیم کی استغفار اپنے (بمنزلہ) باپ (چچا آزر) کے لیے صرف اس وعدہ کی وجہ سے تھی کہ جو اس سے کیا گیا تھا (تاکہ اسے ایمان کی طرف ترغیب دیں) لیکن جب اس پر واضح ہوگیا کہ وہ دشمنِ خدا ہے تو اس سے بیزاری کی۔ کیونکہ ابراہیم مہربان اور بُردبار ہے۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں مندرجہ بالا آیات کی شانِ نزول کے بارے یہ روایت نقل ہوئی ہے کہ بعض مسلمان پیغمبر اکرمؐ سے کہتے تھے کہ کیا آپ ہمارے آباؤ اجداد جو زمانہ جاہلیت میں مر گئے تھے، کے لیے طلب بخشش نہیں کرتے اس پر مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور انھیں خبردار کیا گیا کہ کوئی شخص حق نہیں رکھتا کہ مشرکین کے لیے استغفار کرے۔

ان آیات کی شانِ نزول کے بارے میں کچھ اور مطالب بھی بیان کیے گئے ہیں جو آیت کی تفسیر کے آخر میں آئیں گے۔

تفسیر

دشمنوں سے لاتعلقی ضروری ہے

پہلی آیت ایک اچھی اور قطعی تعبیر کے ساتھ پیغمبر اور مومنین کو مشرکین کے لیے استغفار کرنے سے منع کرتی ہے اور کہتی ہے

مناسب نہیں کہ پیغمبر اور صاحبِ ایمان افراد مشرکین کے لیے طلب مغفرت کریں (ما کان للنبی والذین اٰمنوا ان یستغفروا للمشرکین)۔

اس کے بعد تاکید کے طور پر اور عمومیت کے لیے مزید کہا گیا ہے، یہاں تک کہ وہ ان کے نزدیکی ہی کیوں نہ ہوں (ولو کانوا اولی قربٰی)۔

اس کے بعد اس امر کی دلیل بیان کی گئی ہے: جب مسلمانوں پر واضح ہو گیا کہ مشرکین اہل جہنم ہیں اب ان کے لیے طلب مغفرت کے کوئی معنی نہیں ہیں (من بعد ما تبین لھم انھم اصحٰب الجحیم) یہ بالکل فضول کام اور نامناسب آرزو ہے۔ کیونکہ مشرک کسی طرح بھی قابل بخشش نہیں ہے اور جو شرک کی راہ پر ہیں ان کے لیے راہِ نجات کا تصور نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں استغفار اور طلب بخشش ایک طرح سے مشرکین کے ساتھ محبت، وابستگی اور لگاؤ کا اظہار بھی ہے اور یہ وہ چیز ہے جس سے قرآن میں بارہا منع کیا گیا ہے۔

قرآن سے آگاہ اور آشنا مومنین نے چونکہ اس آسمانی کتاب میں پڑھ رکھا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے چچا آزر کے لیے استغفار کی تھی تو ممکن تھا ان کے ذہن میں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا کہ کیا آزر مشرک نہیں تھا اور اگر یہ کام ممنوع ہے تو خدا کے اس عظیم پیغمبرؑ نے کیوں انجام دیا لہٰذا زیر نظر دوسری آیت میں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ابراہیمؑ کی استغفار اپنے باپ (کے بجائے چچا) کے لیے ایک وعدہ کی بنا پر تھی جو انھوں نے اس سے کیا ہوا تھا لیکن جب ان پر واضح ہو گیا کہ وہ دشمنِ خدا ہے تو انھوں نے اس سے بیزاری اختیار کر لی اور پھر اس کے لیے استغفار نہیں کی (وما کان استغفار ابراھیم لابیہ الا عن موعدۃ وعدھا ایاہ فلما تبین لہ انہ عدو للہ تبرأ منہ)۔

آیت کے آخر میں قرآن مزید کہتا ہے: ابراہیمؑ وہ تھے جو بارگاہِ خدا میں خاشع اور غضب الٰہی سے خائف بزرگوار تھے اور حلیم و بردبار تھے (ان ابراھیم لاواہ حلیم)۔

ہو سکتا ہے یہ جملہ ابراہیمؑ کے آزر کے لیے استغفار کرنے کے وعدہ کی دلیل کے طور پر ہو کیونکہ ایک تو آپ حلیم و بردبار تھے اور دوسری صفت آپ کی "اواہ" بیان ہوئی ہے جو بعض تفاسیر کے مطابق رحیم اور مہربان کے معنی میں ہے۔ ان صفات کا تقاضا تھا کہ آپ آزر کی ہدایت کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کرتے اگرچہ وہ وعدۂ استغفار اور اس کے گذشتہ گناہوں کے لیے طلب بخشش کی صورت میں ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مندرجہ بالا جملہ اس امر کے لیے ہو کہ حضرت ابراہیمؑ میں جو خشوع و خضوع تھا اور آپ میں خدا کی مخالفت کا جو خوف تھا اس کی وجہ سے وہ حق کے دشمنوں کے لیے استغفار کرنے کو بالکل تیار نہ تھے۔ بلکہ یہ کام اس زمانے سے مخصوص تھا جب آپ کو آزر کی ہدایت کی امید تھی لہٰذا صرف اس کی دشمنی واضح ہوتے ہی آپ نے اس کام سے صرف نظر کر لیا۔

اگر سوال ہو کہ اس وقت مسلمانوں کو کیسے معلوم ہو گیا کہ ابراہیمؑ نے آزر کے لیے استغفار کی تھی تو ہم جواب میں کہیں گے سورہ توبہ کی یہ آیات، جیسا کہ ہم ابتدا میں اشارہ کر چکے ہیں پیغمبر خدا کی عمر کے آخری حصے میں نازل ہوئی تھیں جبکہ مسلمان پہلے سے سورۂ مریم کی آیت، ہم پڑھ چکے تھے۔ اس میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے "سأستغفر لک ربی" کہہ کر آزر سے

استغفار کا وعدہ کیا تھا۔ اور یہ بات مسلم ہے کہ خدا کا پیغمبر کسی سے فضول اور بلاوجہ وعدہ نہیں کرتا اور جب وہ وعدہ کرتا ہے تو اس کی وفا بھی کرتا ہے۔

نیز سورہ ممتحنہ کی آیت ۴ میں بھی وہ پڑھ چکے تھے کہ حضرت ابراہیم نے اس سے کہا:

لاستغفرن لك.

میں تیرے لیے استغفار کروں گا۔

اسی طرح سورہ شعراء میں جو مکی سورتوں میں سے ہے اس کے لیے حضرت ابراہیم کی استغفار صراحت سے آئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

واغفر لابی انه کان من الضآلین (الشعراء ۸۶)

چند اہم نکات

۱۔ ایک جعلی روایت: کئی ایک سنی مفسرین نے صحیح بخاری، مسلم اور دیگر کتب سے سعید بن مسیب کے واسطے سے اس کے باپ سے ایک جعلی روایت نقل کی ہے وہ یہ کہ جب ابوطالب کی موت کا وقت آیا تو پیغمبر اکرمؐ ان کے پاس گئے جبکہ ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ ان کے پاس بیٹھے تھے تو پیغمبر اکرمؐ نے ان سے فرمایا: اے چچا آپ لا الٰہ الا اللہ کہیں تاکہ میں اس کے ذریعے پروردگار کے ہاں آپ کی شفاعت کروں۔ اس وقت ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ نے ابوطالب کی طرف رُخ کیا اور کہا: کیا تم چاہتے ہو کہ (اپنے باپ) عبدالمطلب کے دین سے منہ پھیر لو۔ پیغمبر خدا نے ان سے وہی بات بار بار کہی مگر ابوجہل اور عبداللہ وہی کہتے ہوئے روکتے رہے۔ آخری بات جو ابوطالب نے کہی وہ یہ تھی۔ "عبدالمطلب کے دین پر" اور لا الٰہ کہنے سے اجتناب کیا۔ اس وقت پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: میں آپ کے لیے استغفار کرتا رہوں گا یہاں تک کہ مجھے اس سے روکا جائے اس وقت یہ آیت نازل ہوئی "ما کان للنبی والذین امنوا......"[1]

اس حدیث میں جعلی ہونے کی نشانیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مفسرین اور محدثین کے درمیان مشہور ہے کہ سورہ برأت ۹ھ ہجری میں نازل ہوئی بلکہ بعض کے نظریے کے مطابق یہ آخری سورت ہے جو پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوئی۔ جبکہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جناب ابوطالب کی وفات مکہ میں رسول اللہ کی ہجرت سے پہلے ہوئی ہے۔

اسی واضح تضاد کی بناء پر بعض متعصبین مثلاً صاحب المنار نے ہاتھ پاؤں مارے ہیں کبھی کہا ہے کہ یہ آیت دو مرتبہ نازل ہوئی، ایک دفعہ مکہ میں اور ایک دفعہ مدینہ میں ۹ھ ہجری میں۔ اس بے دلیل دعویٰ سے انہوں نے اپنے خیال میں اس واضح تضاد کو برطرف کرنے کی کوشش کی ہے کبھی کہا ہے کہ ہو سکتا ہے یہ آیت مکہ میں وفات ابوطالب کے وقت نازل ہوئی

۱۔ تفسیر المنار اور اہل سنت کی دیگر تفاسیر

پھر بعد میں رسول اللہ کے حکم سے سورۂ توبہ میں رکھ دی گئی ہو جبکہ یہ دعویٰ بھی بالکل دلیل سے عاری ہے۔ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ بجائے ایسی بے سند توجیہات کرنے کے مذکورہ روایت اور اس کی صحت میں تردد کیا جاتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابوطالب کی وفات سے پہلے خدا تعالیٰ قرآن کی چند آیات میں مسلمانوں کو مشرکین کی دوستی اور محبت سے منع کر چکا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ استغفار کرنا دوستی اور محبت کے اظہار کا ایک واضح ترین مصداق ہے اس کے باوجود کس طرح ممکن ہے کہ ابوطالب دنیا سے مشرک کے طور پر چلے جائیں اور پھر بھی رسول اللہ قسم کھائیں کہ میں تو اسی طرح تمہارے لیے استغفار کرتا رہوں گا جب تک خدا مجھے اس سے منع نہ کر دے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ فخر رازی اس کا تو انکار نہیں کر سکا کہ یہ آیت باقی سورہ توبہ کی آیات کی طرح مدینہ میں پیغمبر اکرمؐ کی آخری عمر میں نازل ہوئی ہے لیکن ایسے مسائل میں اپنے مشہور تعصب کی بناء پر ایک اور توجیہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ رسول اللہؐ ابوطالب کی وفات کے بعد اسی طرح مسلسل سورۂ توبہ کے نزول تک ان کے لیے استغفار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انہیں منع کیا گیا۔ اس کے بعد کہتا ہے، اس میں کیا حرج ہے کہ یہ چیز پیغمبر اور مومنین کے لیے اس وقت تک جائز ہو۔

اگر فخر الدین رازی اپنے آپ کو تعصب کی قید سے آزاد کر لیتا تو اس حقیقت کی طرف متوجہ ہو جاتا کہ یہ ممکن نہیں ہے، کہ پیغمبر اکرمؐ اتنی طویل مدت تک ایک مشرک شخص کے لیے استغفار کریں جبکہ بہت سی قرآنی آیات جو اس وقت تک نازل ہو چکی تھیں مشرکین کے ساتھ ہر قسم کی محبت اور دوستی کی مذمت کر چکی تھیں۔[1]

تیسری بات یہ ہے کہ وہ اکیلا شخص جس نے یہ روایت نقل کی ہے وہ سعید بن مسیب ہے اور اس کی امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے دشمنی مشہور ہے۔ اس بناء پر اس کی بات پر حضرت علیؑ، ان کے والد اور ان کی اولاد کے بارے میں ہرگز اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

علامہ امینی نے مذکورہ بات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد واقدی سے ایک بات نقل کی ہے جو قابلِ توجہ ہے واقدی کہتا ہے:۔

> سعید بن مسیب حضرت امام سجاد علی بن الحسین علیہ السلام کے جنازے کے قریب سے گزرا اور ان کی نماز جنازہ نہ پڑھی (اور ایک فضول عذر کے ساتھ) اس کام سے اجتناب کیا لیکن ابن حزم کے بقول جب لوگوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم حجاج کے پیچھے نماز پڑھتے ہو یا نہیں تو اس نے کہا کہ ہم حجاج سے بدتر کے پیچھے نماز پڑھ لیتے ہیں۔

---

[1] سورہ نساء مسلماً سورہ برأت سے پہلے نازل ہوئی اس کی آیت ۱۳۹ میں اور سورۂ آل عمران بھی برأت سے پہلے نازل ہوئی اس کی آیت ۲۸ میں صراحت سے کفار سے دوستی اور محبت کرنے کو منع کیا گیا ہے اور خود اسی سورہ توبہ کی زیر بحث آیت سے پہلے کی آیات میں خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر سے بصراحت کہتا ہے:۔

ان (کفار) کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو خدا انہیں نہیں بخشے گا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ جیسا کہ اسی تفسیر کی پانچویں جلد میں ہم کہہ آئے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابوطالب پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لے آئے تھے۔ اس سلسلے میں ہم نے واضح مدارک اور دلائل پیش کیے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ جو کچھ جناب ابوطالب کے ایمان نہ لانے کے بارے میں کہا گیا ہے وہ ایک بہت بڑی تہمت ہے تمام شیعہ علماء اور بہت سے سنی علماء مثلاً ابن ابی الحدید نے شرح نہج البلاغہ میں قسطلانی نے ارشاد الباری میں اور زینی دحلان نے تفسیر حلبی کے حاشیہ پر اس امر کی تصریح کی ہے۔

ایک باریک بین محقق اگر اس لہر کی طرف توجہ کرے جو بنی امیہ کے حکام کی طرف سے حضرت علیؑ کے خلاف سیاسی مقاصد کے تحت اٹھی تھی تو وہ اچھی طرح اندازہ لگا سکتا ہے کہ جو شخص بھی آپ سے رشتہ اور تعلق رکھتا تھا وہ اس سازش سے امان میں نہیں تھا۔ درحقیقت حضرت ابوطالب کا اس کے علاوہ کوئی گناہ نہ تھا کہ وہ اسلام کے عظیم پیشوا علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے باپ تھے۔ کیا ان لوگوں نے ابوذر جیسے عظیم مجاہد اسلام پر حضرت علیؑ سے عشق و محبت اور مکتب عثمان سے مقابلے کی وجہ سے ایسی تہمتیں نہیں لگائیں۔

حضرت ابوطالب جو ساری زندگی پیغمبر اسلام کے حامی اور ان کے محافظ رہے اور آپؐ کی ہر طرح سے فرمانبرداری کرتے رہے، ان کے ایمان کے سلسلے میں مزید اطلاع کے لیے اسی تفسیر کی جلد ۳ کے صفحہ ۳۱۱ تا صفحہ ۳۱۶ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے آزر سے استغفار کا وعدہ کیوں کیا؟ دوسرا سوال جو یہاں سامنے آتا ہے یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے چچا آزر سے استغفار کا وعدہ کیونکر کیا جبکہ زیر بحث آیت اور قرآن کی دیگر آیات کے مطابق آپ نے یہ وعدہ پورا بھی کیا۔ حالانکہ وہ ہرگز ایمان نہیں لایا اور وہ مشرکوں اور بت پرستوں میں سے تھا اور ایسے افراد کے لیے استغفار کرنے کی ممانعت ہے۔

اس سوال کے جواب میں اس نکتے کی طرف توجہ کرنا چاہیے کہ مندرجہ بالا آیت سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیمؑ کو توقع تھی اور انتظار تھا کہ اس طریقے سے آزر، ایمان اور توحید کی طرف مائل ہو جائے گا اور ان کی استغفار حقیقت میں یہ تھی کہ خداوندا! اسے ہدایت کر اور اس کے گذشتہ گناہوں کو بخش دے لیکن جب آزر نے حالت شرک میں اپنی آنکھیں دنیا سے بند کیں اور حضرت ابراہیمؑ کے لیے مسلّم ہوگیا کہ وہ پروردگار کی دشمنی میں مرا ہے اور اب اس کی ہدایت کی کوئی گنجائش نہیں رہی تو آپ نے اس کے لیے استغفار کو ختم کر دیا۔

اس معنی کے مطابق مسلمان بھی اپنے مشرک دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے، جب تک وہ بقید حیات ہیں اور ان کی ہدایت کی امید ہو سکتی ہے استغفار کریں یعنی خدا سے ان کے لیے ہدایت اور بخشش دونوں طلب کریں لیکن جب وہ حالت کفر میں مر جائیں تو ان کے لیے اب استغفار کا کوئی موقع نہ رہے گا۔

باقی رہا یہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ امام صادقؑ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر آزر اسلام لے آیا تو اس کے لیے استغفار کریں گے (نہ کہ اسلام لانے سے پہلے) اور جس وقت ان پر واضح ہو گیا کہ وہ دشمن خدا ہے تو آپ نے

اس سے بیزاری اختیار کی۔ اس بناء پر ابراہیم کا وعدہ مشروط تھا اور چونکہ شرط پوری نہ ہوئی اس لیے انھوں نے کبھی اس کے لیے استغفار نہیں کی۔

یہ روایت مرسل اور ضعیف ہونے کے علاوہ ظاہراً یا صریح آیاتِ قرآن کے مخالف ہے کیونکہ زیر بحث آیت کا ظہور یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے استغفار کی۔ سورۂ شعراء کی آیت ۸۶ میں صراحت سے ہے کہ ابراہیم نے خدا سے اس کی بخشش کا تقاضا کیا تھا۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

واغفر لابی انه کان من الضآلین

اس کا دوسرا شاہد وہ مشہور جملہ ہے جو ابن عباس سے نقل ہوا ہے کہ جب تک آزر زندہ تھا حضرت ابراہیم نے بارہا اس کے لیے استغفار کی لیکن جب وہ حالتِ کفر میں مر گیا اور اس کی دینِ حق سے عداوت مسلّم ہو گئی تو آپ بھی اس کام سے رک گئے۔

بعض مسلمان چونکہ اپنے بزرگ مشرکین کے لیے جو حالتِ کفر میں مر گئے تھے استغفار کرنا چاہتے تھے لہٰذا قرآن نے صراحت کے ساتھ انہیں منع کیا اور تصریح کی کہ ابراہیم کا معاملہ بالکل ان سے مختلف تھا وہ تو آزر کی زندگی میں اور اس کے ایمان کی امید پر ایسا کرتے تھے نہ کہ اس کی موت کے بعد۔

۲۔ دشمنوں سے ہر قسم کا تعلق توڑ لینا چاہیے: زیر بحث آیت کوئی واحد آیت نہیں جو مشرکین سے ہر قسم کا رابطہ منقطع کرنے کی بات کرتی ہے۔ بلکہ قرآن کی متعدد آیات سے یہ امر اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کا رابطہ، رشتہ داری، قطع تعلق اور عدم رشتہ داری مکتبی اور مذہبی بنیادوں پر ہونی چاہیے اور یہ رشتہ (خدا پر ایمان اور اس قسم کے شرک اور بت پرستی سے مقابلہ) مسلمانوں کے تمام روابط پر حاوی ہونا چاہیے کیونکہ یہ رشتہ بنیادی ہے اور یہ رابطہ تمام اجتماعی اور معاشرتی امور پر حاکم ہے۔ سطحی اور ظاہری رشتے ناتے اس کی ہرگز نفی نہیں کر سکتے۔ یہ درس کل کے لیے بھی تھا اور آج کے لیے بھی ہے۔ یہ ہر زمانے اور ہر دور کے لیے ایک سبق ہے۔

۱۱۵۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ
لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ○
۱۱۶۔ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ
مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○

ترجمہ

۱۱۵۔ ایسا نہ تھا کہ خدا کسی قوم کو ہدایت (اور ایمان) کے بعد سزا دے مگر یہ کہ جس سے انھیں بچنا چاہیے اسے

ان کے لیے بیان کردے (اور وہ اس کی مخالفت کریں) کیونکہ خدا ہر چیز سے دانا ہے۔

۱۱۶۔ آسمانوں اور زمین کی حکومت اس کے لیے ہے (وہ) زندہ کرتا اور مارتا ہے اور خدا کے علاوہ کوئی ولی اور مددگار نہیں ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ کچھ مسلمان فرائض وواجبات کے نزول سے پہلے اس دنیا سے چل بسے۔ کچھ لوگ رسول اللہ کی خدمت میں آئے اور ان کے انجام کے بارے میں پریشانی کا اظہار کیا ان کا خیال تھا کہ شاید فوت شدہ مسلمان عذاب الٰہی میں گرفتار ہوں کیونکہ انھوں نے یہ فرائض انجام نہیں دیئے تھے اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس بات کی نفی کی گئی۔[۱]

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ یہ آیت سابقہ آیات میں وارد صریح ممانعت سے پہلے مسلمانوں کے مشرکین کے لیے استغفار کرنے اور ان سے اظہارِ محبت کرنے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ بات کچھ مسلمانوں کی پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انھیں اطمینان دلایا کہ ان کی استغفار جو خدا کی ممانعت سے پہلے تھی اس پر ان کا مواخذہ نہیں ہوگا۔

تفسیر

واضح حکم کے بعد سزا

مندرجہ بالا پہلی آیت ایک عمومی قانون کی طرف اشارہ ہے کہ جس کی عقل بھی تائید کرتی ہے اور وہ یہ کہ جب تک خدا کوئی حکم بیان نہ فرمائے اور شریعت میں اس کے بارے میں وضاحت نہ آجائے کسی شخص کو اس کے سلسلے میں سزا نہیں دے گا دوسرے لفظوں میں مسئولیت اور جوابدہی ہمیشہ احکام بیان کرنے کے بعد ہے اس چیز کو علم اصول میں "قاعدہ قبح بلا بیان" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

لہٰذا ابتداء میں فرمایا گیا ہے: ایسا نہ تھا کہ خدا کسی گروہ کو ہدایت کے بعد گمراہ کردے جب تک جس چیز سے اسے پرہیز کرنا چاہیے وہ اس سے بیان نہ کردے (وما کان اللہ لیضل قوما بعد اذ ھدٰھم حتّٰی یبین لھم ما یتقون)۔

- "یضل" اصل میں گمراہ کرنے کے معنی میں ہے اس سے مراد یا گمراہی کا حکم لگانا ہے جیسا کہ بعض مفسرین کو احتمال ہے

۱۔ مجمع البیان، محل بحث آیت کے ذیل میں۔

جیسے تبدیل اور تفسیق ۔ ضلالت اور فسق کا حکم لگانے کے معنی میں ہیں[1] یا روز قیامت ثواب و جزا کے راستے سے گمراہ کرنے کے معنی میں ہے جو در اصل سزا دینے کے مفہوم میں ہوگا یا پھر "اضلال" سے مراد وہی ہے جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں اور وہ ہے نعمت توفیق سلب کرنا اور انسان کو اس کی حالت پر چھوڑ دینا ۔ اس کا نتیجہ طریق ہدایت سے گمراہی اور سرگردانی ہے ۔ یہ تعبیر اس حقیقت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ گناہوں کا تسلسل زیادہ گمراہی اور طریق ہدایت سے دور رہنے کا سرچشمہ ہے[2]

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : خدا ہر چیز کو جانتا ہے (ان اللہ بکل شیء علیم) ۔ یعنی خدا کے علم کا تقاضا ہے کہ جب تک اس نے کسی چیز کے بارے میں اپنے بندوں سے کچھ کہا نہیں اس کے بارے میں کسی کو جوابدہ نہ سمجھے اور اس سے مواخذہ نہ کرے ۔

ایک سوال اور اس کا جواب

بعض مفسرین اور محدثین کا خیال ہے کہ مندرجہ بالا آیت اس پر دلیل ہے کہ مستقلات عقلیہ جب تک شرعی طریق سے بیان نہ ہوں کوئی شخص ان کے بارے میں مسئولیت نہیں رکھتا (مستقلات عقلیہ ان چیزوں کو کہتے ہیں جن کی اچھائی یا برائی کو انسان حکم شریعت کے بغیر اپنی عقل سے سمجھ لیتا ہے ۔ مثلاً ظلم کی بدی ، عدالت کی اچھائی یا چوری ، جھوٹ ، تجاوز اور قتل نفس وغیرہ کی برائی) گویا ان کے خیال کے مطابق تمام احکام عقلی کی حکم شریعت کے ذریعہ تائید ہونا چاہیے تاکہ لوگوں کی ان کے بارے میں مسئولیت ہو ۔ اس خیال کی بناء پر شریعت کے نزول سے پہلے لوگ مستقلات عقلیہ کے بارے میں بھی کوئی جوابدہی نہیں رکھتے تھے لیکن اس خیال کا بطلان واضح ہے کیونکہ جملہ " حتی یبین لھم " (یہاں تک کہ ان سے بیان کرے) ان کا جواب دیتا ہے اور واضح کرتا ہے کہ یہ آیت اور ایسی آیات ان مسائل سے مربوط و مخصوص ہے جو پردۂ ابہام میں ہیں اور بیان و وضاحت کے محتاج ہیں اور یہ مسلم ہے کہ مستقلات عقلیہ کے بارے میں یہ بات نہیں ہو سکتی کیونکہ ظلم برا ہے اور عدالت اچھی ہے اس میں کوئی ابہام نہیں ہے جو وضاحت کا محتاج ہو ۔

• جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں وہ اس طرف متوجہ نہیں ہیں کہ اگر یہ بات صحیح ہو تو لوگوں پر ضروری نہیں رہتا کہ انبیاء کی دعوت پر لبیک کہیں اور ان کی صداقت معلوم کرنے کے لیے دعوائے نبوت کے مدعی اور اس کے معجزات کا مطالعہ کریں کیونکہ ان کیلیے تو ابھی پیغمبر کی سچائی اور حکم الٰہی واضح نہیں ہوا (لہٰذا ضروری نہیں کہ وہ ان کے دعویٰ کی تحقیق کریں اور اس کا مطالعہ کریں ۔ لہٰذا

---

[1] بعض یہ خیال کرتے ہیں کہ صرف باب تفعیل ہے جو کبھی حکم لگانے کے معنی میں بھی آتا ہے حالانکہ یہ حکم باب افعال میں دیکھا گیا ہے ۔ مثلاً کمیت شاعر کا مشہور شعر ہے جو اس نے خاندان رسالت سے اپنے عشق کے اظہار کے لیے کہا ہے ۔ اس میں ہے :۔

و طائفۃ قد اکفرونی بحبکم

یعنی ـــــ ایک گروہ نے آپ کی محبت کی وجہ سے مجھ پر کفر کا حکم لگایا ہے ۔

[2] قرآن میں ہدایت و ضلالت کے معنی کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد اول صفحہ ۱۲۰ تا صفحہ ۱۲۱ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں ۔

جیسے مدعیانِ نبوت کے دعویٰ کا مطالعہ عقل و خرد کے حکم سے واجب ہے اور اصطلاح کے مطابق مستقلاتِ عقلیہ میں سے ہے ایسے ہی دیگر مسائل جنھیں عقل و خرد وضاحت سے پہچانتی ہے، واجب الاتباع ہیں۔

اس گفتگو کی شاہد وہ تعبیر ہے جو طرقِ اہلبیت کی بعض احادیث میں نظر آتی ہے۔ کتابِ توحید میں امام صادقؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

حتی یعرفہم ما یرضیہ و ما یسخطہ

یعنی ——— خدا کسی کو عذاب نہیں کرتا جب تک اسے سمجھا نہ دے کہ کونسی چیزیں اس کی رضا کا سبب ہیں اور کون سی اس کے غضب کا موجب ہیں۔[1]

بہرحال یہ آیت اور اس قسم کی دیگر آیات ایک کلی اور اصولی قانون کی بنیاد شمار ہوتی ہیں اور وہ یہ کہ جب تک کسی چیز کے وجوب یا حرمت کے لیے ہمارے پاس دلیل نہ ہو اس کے بارے میں ہماری کوئی مسؤلیت نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے لیے تمام چیزیں جائز اور مباح ہیں مگر یہ کہ ان کے وجوب یا حرمت کے لیے کوئی دلیل موجود ہو۔ اسی بات کو "اصل برائت" کہتے ہیں۔

بعد والی آیت میں اس مسئلہ پر تاکید کے حوالے سے کہا گیا ہے، آسمانوں اور زمینوں کی حکومت خدا کے لیے ہے (ان اللہ لہ ملک السمٰوٰت و الارض)۔

موت و حیات کا نظام بھی اس کے قبضۂ قدرت میں ہے وہی ہے جو زندہ کرتا اور مارتا ہے (یحیی و یمیت)۔

اس بناء پر "تمہارا خدا کے علاوہ کوئی ولی، سرپرست، دوست اور یاور نہیں ہے (و ما لکم من دون اللہ من ولی و لا نصیر)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ عالم ہستی کی تمام قدرتیں اور تمام حکومتیں اس کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے زیرِ فرمان ہیں، تم اس کے غیر کا سہارا نہ لو۔ غیر خدا کو پناہ گاہ قرار نہ دو اور استغفار کے ذریعے خدا سے اپنی محبت کا رشتہ قائم اور محکم کرو۔

۱۱۷۔ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝

۱۱۸۔ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ۭ حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۷۶

الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ
لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ
اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۟

ترجمہ

۱۱۷۔ خدا نے اپنی رحمت پیغمبر اور (اسی طرح ان) مہاجرین و انصار کے شاملِ حال کی کہ جنھوں نے عسرت و شدّت کے وقت (جنگِ تبوک میں) ان کی پیروی کی کہ جبکہ قریب تھا کہ ان میں سے ایک گروہ کے دل حق سے منحرف ہو جائیں (اور وہ میدانِ جنگ سے پلٹ آئیں) اس کے بعد خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی وہ ان پر مہربان اور رحیم ہے۔

۱۱۸۔ (اسی طرح) ان تین افراد کو جو (مدینہ میں) رہ گئے تھے (اور انھوں نے تبوک میں شرکت نہیں کی تھی اور مسلمانوں نے ان سے قطع روابط کر لیا تھا) یہاں تک کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی تھی اور (عالم یہ تھا کہ) انھیں اپنے وجود میں بھی کوئی جگہ نہیں ملتی تھی اور انھوں نے سمجھ لیا کہ خدا کی طرف سوائے اس کے کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ اس وقت خدا نے اپنی رحمت ان کے شاملِ حال کی اور خدا نے ان کی توبہ قبول کر لی کیونکہ خدا توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

شانِ نزول

ایک عظیم درس

مفسرین نے کہا ہے کہ پہلی آیت جنگِ تبوک کے بارے میں اور اس میں مسلمانوں کو پیش آمدہ مشکلات کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہ مشکلات اس قدر تھیں کہ کچھ لوگوں نے پلٹ آنے کا ارادہ کر لیا۔ لیکن خدا کا لطف و کرم اور اس کی توفیق انکے شاملِ حال ہوئی اور وہ اسی طرح سے جمے رہے۔

جن افراد کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک ابو خیثمہ ہے جو اصحابِ پیغمبر میں سے تھا، منافقین میں سے نہ تھا لیکن سستی کی وجہ سے پیغمبر اکرم کے ساتھ میدانِ تبوک میں نہ گیا۔

اس واقعہ کو دس دن گزر گئے۔ ہوا گرم اور جلانے والی تھی، ایک دن اپنی بیویوں کے پاس آیا انھوں نے ایک سائبان

تان رکھا تھا، ٹھنڈا پانی مہیا کر رکھا تھا اور بہترین کھانا تیار کر رکھا تھا۔ وہ اچانک غور و فکر میں ڈوب گیا اور اپنے پیشوا رسول اللہ کی یاد اسے ستانے لگی۔ اس نے کہا:

رسول اللہ ــــــ کہ جنہوں نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا اور خدا ان کے گزشتہ اور آئندہ کا ذمہ دار ہے، بیابان کی جلا ڈالنے والی ہواؤں میں کندھے پر ہتھیار اٹھائے اس دشوار گزار سفر کی مشکلات اٹھا رہے ہیں اور ابو خیثمہ کو دیکھو کہ ٹھنڈے سائے میں تیار کھانے اور خوبصورت بیویوں کے پاس بیٹھا ہے، کیا یہ انصاف ہے؟

اس کے بعد اس نے اپنی بیویوں کی طرف رُخ کیا اور کہا:

خدا کی قسم تم میں سے کسی کے ساتھ میں بات نہ کروں گا اور سائبان کے نیچے نہیں بیٹھوں گا جب تک پیغمبرؐ سے نہ جا ملوں۔

یہ بات کہہ کر اس نے زادِ راہ لیا، اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور چل کھڑا ہوا۔ اس کی بیویوں نے بہت چاہا کہ اس سے بات کریں لیکن اس نے ایک لفظ نہ کہا اور اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ تبوک کے قریب جا پہنچا۔

مسلمان ایک دوسرے سے کہنے لگے: یہ کوئی سوار ہے جو سڑک سے گزر رہا ہے۔ لیکن پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا، اے سوار تم ابو خیثمہ ہو تو بہتر ہے۔

جب وہ قریب پہنچا اور لوگوں نے اسے پہچان لیا تو کہنے لگے: جی ہاں! ابو خیثمہ ہے۔

اس نے اپنا اونٹ زمین پر بٹھایا اور پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں سلام عرض کیا اور اپنا ماجرا بیان کیا۔

رسول اللہؐ نے اسے خوش آمدید کہا اور اس کے حق میں دعا فرمائی۔

اس طرح وہ ایک ایسا شخص تھا جس کا دل باطل کی طرف مائل ہو گیا تھا لیکن اس کی روحانی آمادگی کی بناء پر خدا نے اسے حق کی طرف متوجہ کیا اور اسے ثباتِ قدم بھی عطا کیا۔

دوسری آیت کے بارے میں ایک اور شانِ نزول منقول ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

مسلمانوں میں سے تین افراد کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ نے جنگ تبوک میں شرکت نہ کی اور انہوں نے پیغمبر خدا کے ہمراہ سفر نہ کیا لیکن وہ منافقین میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے بلکہ ایسا انہوں نے سستی اور کاہلی کی بنا پر کیا تھا۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ وہ اپنے کیے پر نادم اور پشیمان ہو گئے۔

جب رسول اللہؐ میدانِ تبوک سے مدینہ لوٹے تو وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معذرت کی لیکن رسول اللہ نے ان سے ایک لفظ تک نہ کہا اور مسلمانوں کو بھی حکم دیا کہ کوئی شخص ان سے بات چیت نہ کرے وہ ایک عجیب معاشرتی دباؤ کا شکار ہو گئے یہاں تک کہ ان کے چھوٹے بچے اور عورتیں رسول اللہؐ کے پاس آئیں اور اجازت چاہی کہ ان سے الگ ہو جائیں آپؐ نے انہیں علیحدگی کی اجازت تو نہ دی لیکن حکم دیا کہ ان کے قریب نہ جائیں۔ مدینہ کی فضا اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی۔ وہ

مجبور ہوگئے کہ اس اتنی بڑی ذلت اور رسوائی سے نجات حاصل کرنے کے لیے شہر چھوڑ دیں اور اطراف مدینہ کے پہاڑوں کی چوٹی پر جا کر پناہ لیں۔

جن باتوں نے ان کے جذبات پر شدید ضرب لگائی ان میں سے ایک یہ تھی کہ کعب بن مالک کہتا ہے:

میں ایک دن بازار مدینہ میں پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ ایک شامی عیسائی مجھے تلاش کرتا ہوا آیا۔ جب اس نے مجھے پہچان لیا تو بادشاہ غسان کی طرف سے ایک خط میرے ہاتھ میں دیا۔ اس میں لکھا تھا کہ اگر تیرے ساتھی نے تجھے دھتکار دیا ہے تو ہماری طرف چلے آؤ۔ میری حالت منقلب اور متغیر ہوگئی اور میں نے کہا وائے ہو مجھ پر میرا معاملہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ دشمن میرے بارے میں لالچ کرنے لگے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ان کے اعزا و اقارب ان کے پاس کھانا لے آتے مگر ان سے ایک لفظ بھی نہ کہتے۔ کچھ مدت اسی صورت میں گزر گئی اور وہ مسلسل انتظار میں تھے کہ ان کی توبہ قبول ہو اور کوئی آیت نازل ہو جو ان کی توبہ کی دلیل بنے مگر کوئی خبر نہ تھی۔

اس دوران ان میں سے ایک کے ذہن میں یہ بات آئی اور اس نے دوسروں سے کہا اب جبکہ لوگوں نے ہم سے قطع تعلق کر لیا ہے کیا ہی بہتر ہو کہ ہم بھی ایک دوسرے سے قطع تعلق کر لیں (یہ ٹھیک ہے کہ ہم گنہگار ہیں لیکن مناسب ہے کہ دوسرے گنہگار سے خوش اور راضی نہ ہوں)

انھوں نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ ایک لفظ بھی ایک دوسرے سے نہیں کہتے تھے اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ اس طرح پچاس دن انھوں نے توبہ و زاری کی اور آخرکار ان کی توبہ قبول ہوگئی۔ اس پر مندرجہ بالا آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔[1]

تفسیر

گنہ گاروں کے لیے معاشرتی دباؤ

یہ آیات بھی جنگ تبوک سے متعلق اور اس عظیم اسلامی واقعے کے بارے میں مختلف مطالب پر مشتمل ہیں۔

پہلی آیت میں پروردگار کی اس لامتناہی رحمت کی طرف اشارہ ہے جو ایسے حساس لمحات میں پیغمبر اور مہاجرین و انصار کے شاملِ حال ہوئی۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا کی رحمت پیغمبر اور ان مہاجرین و انصار کے شاملِ حال ہوئی جو شدت اور بحران کے موقع پر آنحضرتؐ کی پیروی کرتے ہیں (لقد تاب اللہ علی النبی والمھاجرین والانصار الذین اتبعوہ فی

---

[1] مجمع البیان، سفینۃ البحار اور تفسیر ابوالفتوح رازی

ساعة العسرة)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ رحمتِ الٰہی اس وقت شاملِ حال ہوئی جب شدّت حوادث اور پریشانیوں کے دباؤ کی وجہ سے قریب تھا کہ مسلمانوں کا ایک گروہ راہِ حق سے پھر جائے (اور تبوک سے واپسی کا ارادہ کرلے) (من بعد ما کاد یزیغ قلوب فریق منھم)۔

دوبارہ تاکید کی گئی ہے: اس صورتِ حال کے بعد اللہ نے اپنی رحمت ان کے شاملِ حال کردی اور ان کی توبہ قبول کرلی کیونکہ وہ مومنین پر مہربان اور رحیم ہے (ثم تاب علیھم انه بھم رءوف رحیم) اس نے نہ صرف اس عظیم گروہ پر اپنی رحمت نازل کی کہ جو جہاد میں شریک ہوا بلکہ ان تین افراد پر بھی اپنا لطف و کرم کیا جو جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے اس لیے مجاہدین انھیں پیچھے چھوڑ گئے تھے (وعلی الثلاثة الذین خلفوا)۔ لیکن یہ لطفِ الٰہی انھیں آسانی سے میسّر نہیں آیا بلکہ ایسا اس وقت ہوا جب یہ تین افراد (کعب بن مالک، مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ جن کے بارے میں شانِ نزول میں بتایا جا چکا ہے) شدید معاشرتی دباؤ میں رہ چکے تھے اور تمام لوگوں نے ان کا بائیکاٹ کر دیا تھا "یہاں تک کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی تھی" (حتی اذا ضاقت علیھم الارض بما رحبت) اور ان کے سینے اس طرح سے غم و اندوہ سے معمور تھے کہ گویا "انھیں اپنے وجود میں بھی جگہ نہ ملتی تھی" اور عالم یہ تھا کہ انھوں نے ایک دوسرے سے بھی رابطہ منقطع کر لیا تھا (وضاقت علیھم انفسھم) اس طرح ان پر تمام راستے بند ہوگئے تھے "اور انھوں نے یقین کرلیا تھا کہ اس کی طرف بازگشت کے علاوہ غضبِ خدا سے بچنے کے لیے کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے" (وظنوا ان لا ملجا من الله الا الیه)۔

دوبارہ رحمتِ خدا ان کے شاملِ حال ہوئی" اور اس رحمت نے ان کے لیے حقیقی اور مخلصانہ توبہ اور بازگشت ان کے لیے آسان کردی (ثم تاب علیھم لیتوبوا)۔ کیونکہ خدا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے (ان الله ھو التواب الرحیم)۔

چند اہم نکات

۱۔ تاب الله علی النبی سے کیا مراد ہے؟: محلِ بحث پہلی آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ خدا نے پیغمبر، مہاجرین اور انصار پر توجہ کی اور ان کی توبہ قبول کی۔

اس میں شک نہیں کہ معصوم پیغمبر کا تو گناہ ہی نہ تھا کہ خدا اس پر توبہ کرتا اور اس کی توبہ قبول کرتا، اگرچہ اہلِ سنت کے بعض مفسرین حدیث نے مندرجہ بالا تعبیر کو جنگِ تبوک کے واقعہ میں پیغمبر سے کوئی لغزش ہونے کی دلیل قرار دیا ہے لیکن خود اس آیت میں اور قرآن کی دوسری آیات میں غور و خوض کیا جائے تو یہ تفسیر غلط معلوم ہوتی ہے ــــــ کیونکہ:

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ گنہگار کی توبہ کا معنی ہے" اس کا اپنی رحمت کے ساتھ لوٹ آنا اور بندوں کی طرف توجہ کرنا اور اس کے مفہوم میں گناہ یا لغزش نہیں ہے جیسا کہ سورہ نساء میں بعض احکامِ اسلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

یرید الله لیبین لکم ویھدیکم سنن الذین من قبلکم ویتوب علیکم

واللہ علیم حکیم

خدا چاہتا ہے کہ تم سے اپنے احکام بیان کرے اور جو لوگ تم سے پہلے تھے ان کی اچھی سنت اور روش کی تمہیں ہدایت کرے اور تم پر "توبہ" کرے اور خدا عالم و حکیم ہے۔

اس آیت میں اور اس سے پہلے گناہ اور لغزش کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ بلکہ اس آیت کی تصریح کے مطابق گفتگو احکام بیان کرنے کے حوالے سے اور گذشتہ لوگوں کی اچھی سنتوں کی ہدایت کے بارے میں ہو رہی ہے یہ چیز خود نشاندہی کرتی ہے کہ یہاں توبہ کا معنی ہے بندوں کے لیے رحمتِ الٰہی شمول۔

دوسری بات یہ ہے کہ کتبِ لغت میں بھی توبہ کا ایک یہی معنی مذکور ہے۔ مشہور کتاب قاموس میں توبہ کا ایک معنی اس طرح ذکر ہوا ہے:

رجع علیہ بفضلہ وقبولہ

یعنی ـــــــ اس کی طرف لوٹنا اپنے فضل و قبول کرنے سے۔

تیسری بات یہ ہے کہ زیر بحث آیت میں صرف ایک گروہ کے انحراف حق کا ذکر ہے حالانکہ خدائی توبہ سب کے لیے قرار دی گئی ہے یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ یہاں خدائی توبہ گناہ گار بندوں کی معذرت قبول کرنے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہاں اس سے مراد خدا کی خاص رحمت ہے جو ان سخت لمحات میں پیغمبرؐ اور تمام مومنین کی مدد کے لیے آئی اس میں مہاجرین و انصار میں سے کسی کے لیے استثناء نہیں ہے اور اس رحمت نے انھیں جہاد میں ثابت قدم رکھا۔

۲۔ جنگِ تبوک کو "ساعۃ العسرۃ" کیوں کہا گیا؟: لفظ "ساعت" لغت کے اعتبار سے وقت کے ایک حصہ کو کہتے ہیں، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ البتہ زیادہ لمبے زمانے کو ساعت نہیں کہا جا سکتا اور "عسرت" مشقت اور سختی کے معنی میں ہے۔

تاریخِ اسلام نشاندہی کرتی ہے کہ مسلمان کبھی بھی جنگِ تبوک کے موقع کی طرح مشکل صورتِ حال، دباؤ اور زحمت میں مبتلا نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ ایک تو سفرِ تبوک سخت گرمی کے عالم میں تھا۔ دوسرا خشک سالی نے لوگوں کو تنگ اور بے حال کر رکھا تھا اور تیسرا اس وقت درختوں سے پھل اتارنے کے دن تھے اور اسی پر لوگوں کی سال بھر کی آمدنی کا انحصار تھا۔

ان تمام چیزوں کے علاوہ مدینہ اور تبوک کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ تھا اور مشرقی روم کی سلطنت کا انھیں سامنا تھا جو اس وقت کی سپر پاور تھی۔

مزید برآں سواریاں اور رسد مسلمانوں کے پاس اتنا کم تھا کہ بعض اوقات دو افراد مجبور ہوتے تھے کہ ایک ہی سواری پر باری باری سفر کریں بعض پیدل چلنے والوں کے پاس جوتا تک نہیں تھا اور وہ مجبور تھے کہ وہ بیابان کی جلانے والی ریت پر پابرہنہ چلیں۔ اب و غذا کی کمی کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات خرمہ کا ایک دانہ چند آدمی یکے بعد دیگرے منہ میں رکھ کر چوستے تھے یہاں تک کہ اس کی صرف گٹھلی رہ جاتی پانی کا ایک گھونٹ کبھی چند آدمیوں کو مل کر پینا پڑتا۔

ان تمام باتوں کے باوجود اکثر مسلمان قوی اور مستحکم جذبہ رکھتے تھے اور تمام مشکلات کے باوجود رسول خداؐ کے ہمراہ دشمن کی طرف چل پڑے اور ایک عجیب استقامت اور پامردی کا مظاہرہ کرنے کے بعد تمام مسلمانوں کے لیے انھوں نے ایک عظیم درس یادگار کے طور پر چھوڑا

ایسا درس جو تمام نسلوں کے لیے کافی ہے یہ درس عظیم اور خطرناک دشمنوں پر کامیابی کا وسیلہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں ایسے افراد تھے جن کے دل کمزور تھے اور یہی کمزور دل واپس لوٹ جانے کی فکر میں تھے ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے۔

من بعد ما کاد یزیغ قلوب فریق منھم

"یزیغ" "زیغ" کے مادہ سے ہے اس کا مطلب ہے حق سے باطل کی طرف انحراف۔

لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے اکثریت کے عالی جذبات نے اور لطف پروردگار نے انہیں بھی اس فکر سے پلٹا دیا اور وہ بھی راہ حق کے مجاہدین میں شامل ہو گئے۔

۳۔ تین افراد کیلئے "خلفوا" کی تعبیر: مندرجہ بالا آیات میں سست اور سہل انگار تین افراد کے بارے میں "خلفوا" کی تعبیر آئی ہے یعنی "انہیں پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا"۔

یہ تعبیر یا تو اس بناء پر ہے کہ جب ایسے افراد سستی کرتے تو مسلمان انہیں پیچھے چھوڑ جاتے اور ان کی پرواہ کیے بغیر میدان جہاد کی طرف پیش قدمی کر جاتے تھے اور یا اس بناء پر ہے کہ جس وقت وہ عذر خواہی کے لیے پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے تو آپ نے ان کا عذر قبول نہ کیا اور ان کی توبہ قبول کرنے کو پس پشت ڈال دیا۔

۴۔ ایک اہم اور عظیم سبق: زیر نظر آیات سے جو اہم مسائل معلوم ہوتے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ مجرموں اور فاسدوں کی معاشرتی دباؤ اور بائیکاٹ کے ذریعے سزا دینے سے متعلق ہے۔

ہم اچھی طرح سے دیکھ رہے ہیں کہ جنگ تبوک سے پیچھے رہ جانے والے تین افراد سے بائیکاٹ سے وہ کیسی سختی، تنگی اور دباؤ میں مبتلا ہوئے یہ بائیکاٹ ان کے لیے ہر قسم کے قید خانے سے سخت تر تھا یہاں تک کہ اس اجتماعی بائیکاٹ کی وجہ سے ان کی جان لبوں تک آپہنچی اور وہ ہر طرف سے ناامید ہو گئے اس طریقے سے اس وقت کے مسلمانوں کے معاشرے پر اس کا ایسا وسیع اثر ہوا کہ اس کے بعد بہت کم افراد ایسی جرأت کرتے تھے کہ وہ ایسے گناہ کے مرتکب ہوں۔

ایسی سزا سے نہ تو قید خانوں کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے نہ ایسی سزاؤں پر کوئی خرچ اٹھتا ہے نہ ایسی سزا سستی و کاہلی کو جنم دیتی ہے اور نہ ہی بُرے اخلاق کو پنپنے دیتی ہے لیکن اس کی تاثیر ہر قید خانے سے زیادہ اور بہت ہی دردناک ہے۔

درحقیقت یہ ایک بائیکاٹ اور معاشرے کی طرف سے ایسے بُرے اور فاسد افراد کے خلاف منفی جنگ ہے جو حساس ذمہ داریوں کی ادائیگی سے منہ موڑ لیتے ہیں اگر مسلمان ہر دور اور ہر زمانے میں ایسے لوگوں کے خلاف اس طرح کا اقدام کریں تو انھیں کامیابی حاصل ہونا یقینی ہو جائے اس طرح سے مسلمان اپنے معاشرے کو پاک کر سکتے ہیں لیکن بدقسمتی سے آج کے اسلامی معاشروں میں ایسے جرائم سے چشم پوشی اور سازش کاری تقریباً ایک ہمہ گیر بیماری کی شکل اختیار کر چکی ہے یہ صورت حال نہ صرف یہ کہ ایسے افراد کو روک نہیں سکتی بلکہ انھیں ان کے بُرے اعمال میں مزید دلیر اور لاپرواہ کر دیتی ہے۔

۵۔ جنگ تبوک سے مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی: "تبوک" کا مقام ان تمام مقامات سے دُور تھا جہاں پیغمبر اکرمؐ نے اپنی جنگوں میں پیش قدمی کی۔ "تبوک" اصل میں ایک محکم اور بلند قلعہ کا نام تھا۔ جو حجاز اور شام کی سرحد پر واقع تھا۔ اسی وجہ سے اس علاقے کو

سرزمین تبوک کہتے تھے۔

جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے تیز رفتار نفوذ کی وجہ سے رسول اللہؐ کی شہرت اطراف کے تمام ممالک میں گونجنے لگی۔ باوجودیکہ وہ اس وقت حجاز کی اہمیت کے قائل نہیں تھے لیکن طلوعِ اسلام اور لشکرِ اسلام کی طاقت کہ جس نے حجاز کو ایک پرچم تلے جمع کردیا نے انھیں اپنے مستقبل کے بارے میں تشویش میں ڈال دیا۔

مشرقی روم کی سرحد حجاز سے ملتی تھی اس حکومت کو خیال ہوا کہ کہیں اسلام کی تیز رفتار ترقی کی وہ پہلی قربانی نہ بن جائے لہٰذا اس نے چالیس ہزار کی زبردست مسلح فوج جو اس وقت کی روم جیسی طاقتور حکومت کے شایانِ شان تھی۔ اکٹھی کی اور اسے حجاز کی سرحد پر لا کھڑا کیا یہ خبر مسافروں کے ذریعے پیغمبر اکرمؐ کے کانوں تک پہنچی۔ رسول اللہؐ نے روم اور دیگر ہمسایوں کو درسِ عبرت دینے کے لیے توقف کیے بغیر تیاری کا حکم صادر فرمایا۔ آپؐ کے منادیوں نے مدینہ اور دور سے علاقوں تک آپؐ کا پیغام پہنچایا۔ تھوڑے ہی عرصے میں تیس ہزار افراد رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان میں دس ہزار سوار اور بیس ہزار پیادہ تھے۔

موسم بہت گرم تھا۔ غلے کے گودام خالی تھے اس سال کی فصل ابھی اٹھائی نہیں گئی تھی۔ ان حالات میں سفر کرنا مسلمانوں کے لیے بہت ہی مشکل تھا۔ لیکن چونکہ خدا اور رسولؐ کا فرمان تھا لہٰذا ہر حالت میں سفر کرنا تھا اور مدینہ اور تبوک کے درمیان پرخطر، طویل صحرا کو عبور کرنا تھا۔

اس لشکر کو چونکہ اقتصادی طور پر بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس کا راستہ بھی طولانی تھا راستے میں جلانے والی زہریلی ہوائیں چلتی تھیں سنگریزے اڑتے تھے اور جھکڑ چلتے تھے سواریاں بھی کافی نہ تھیں اس لیے یہ "جیش العسرۃ" (یعنی سختیوں والا لشکر) کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے تمام سختیوں کو جھیلا اور ماہِ شعبان کی ابتداء میں ہجرت کے نویں سال سرزمین تبوک میں پہنچا جبکہ رسول اللہؐ حضرت علیؑ کو اپنی جگہ پر مدینہ میں چھوڑ آئے تھے یہ واحد غزوہ ہے جس میں حضرت علی علیہ السلام شریک نہیں ہوئے۔

رسول اللہؐ کا یہ اقدام بہت ہی مناسب اور ضروری تھا کیونکہ بہت احتمال تھا کہ بعض پیچھے رہنے والے مشرکین یا منافقین جو حیلوں بہانوں سے میدانِ تبوک میں شریک نہ ہوئے تھے رسول اللہؐ اور ان کی فوج کی طویل غیبت سے فائدہ اٹھائیں اور مدینہ پر حملہ کردیں۔ عورتوں اور بچوں کو قتل کردیں اور مدینہ کو تاخت و تاراج کردیں لیکن حضرت علیؑ کا مدینہ میں رہ جانا ان کی سازشوں کے مقابلے میں ایک طاقتور بند تھا۔

بہرحال جب رسول اللہؐ تبوک میں پہنچے تو وہاں آپؐ کو رومی فوج کا کوئی نام و نشان نظر نہ آیا۔ عظیم سپاہِ اسلام چونکہ کئی جنگوں میں اپنی عجیب و غریب جرأت و شجاعت کا مظاہرہ کرچکی تھی جب ان کے آنے کی کچھ خبر رومیوں کے کانوں تک پہنچی تو انھوں نے اسی کو بہتر سمجھا کہ اپنے ملک کے اندر چلے جائیں اور اس طرح سے ظاہر کریں کہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے لشکرِ روم کی سرحدوں پر جمع ہونے کی خبر ایک بے بنیاد افواہ سے زیادہ کچھ نہ تھی کیونکہ وہ ایک ایسی خطرناک جنگ شروع کرنے سے ڈرتے تھے جس کا جواز بھی ان کے پاس کوئی نہ تھا لیکن لشکرِ اسلام نے اس طرح سے تیز رفتاری سے میدانِ تبوک میں پہنچنے نے دشمنانِ اسلام کو کئی درس سکھائے: مثلاً

۱۔ یہ بات ثابت ہوگئی کہ مجاہدینِ اسلام کا جذبۂ جہاد اس قدر قوی ہے کہ وہ اس زمانے کی نہایت طاقتور فوج سے بھی نہیں ڈرتے۔

۲۔ بہت سے قبائل اور اطرافِ تبوک کے امراء پیغمبرِ اسلامؐ کی خدمت میں آئے اور آپؐ سے تعرض اور جنگ نہ کرنے کے

عہد و پیمان پر دستخط کیے اس طرح مسلمان ان کی طرف سے آسودہ خاطر ہو گئے ۔

۳۔ اسلام کی لہریں سلطنتِ روم کی سرحدوں کے اندر تک چلی گئیں اور اس وقت کے ایک اہم واقعے کے طور پر اس کی آواز ہر جگہ گونجی اور رومیوں کے اسلام کی طرف متوجہ ہونے کے لیے زمین ہموار ہو گئی ۔

۴۔ یہ راستہ طے کرنے اور زحمتوں کو برداشت کرنے سے آیندہ شام کا علاقہ فتح کرنے کے لیے راہ ہموار ہو گئی اور معلوم ہو گیا کہ آخر کار یہ راستہ طے کرنا ہی ہے ۔

یہ عظیم فوائد ایسے تھے کہ جن کے لیے لشکر کشی کی زحمت برداشت کی جا سکتی تھی ۔

بہر حال پیغمبر اکرمؐ نے اپنی سنت کے مطابق اپنی فوج سے مشورہ کیا کہ کیا پیش قدمی جاری رکھی جائے یا واپس پلٹ جایا جائے ۔ اکثریت کی رائے یہ تھی کہ پلٹ جانا بہتر ہے اور یہی اسلامی اصولوں کی روح سے زیادہ مناسبت رکھتا تھا خصوصاً جبکہ اس وقت طاقت فرسا سفر اور راستے کی مشقت و زحمت کے باعث اسلامی فوج کے سپاہی تھکے ہوئے تھے اور ان کی جسمانی قوت مزاحمت کمزور پڑ چکی تھی ۔

رسول اللہؐ نے اس رائے کو صحیح قرار دیا اور لشکر اسلام مدینہ کی طرف لوٹ آیا ۔

۱۱۹۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ○

ترجمہ

۱۱۹۔ اے ایمان والو! خدا (کے ہر حکم کی مخالفت) سے ڈرو اور سچوں کا ساتھ دو۔

تفسیر

سچوں کا ساتھ دو

گزشتہ آیات میں متخلفین اور جنگ سے منہ موڑنے والوں کے بارے میں گفتگو تھی۔ متخلفین وہ لوگ تھے جنھوں نے خدا اور رسول سے کیے ہوئے عہد کو توڑ ڈالا وہ لوگ عملی طور پر خدا اور قیامت پر اپنے اظہار ایمان کی تکذیب کر چکے تھے اور ہم نے دیکھا کہ مسلمانوں نے قطع روابط کر کے انھیں کس طرح سے تنبیہ کی۔

زیر بحث آیت میں ان کے مد مقابل دوسرے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنا رابطہ سچے لوگوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ جو اپنے عہد پر قائم ہیں، مستحکم رکھو۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اے ایمان لانے والو! حکم خدا کی مخالفت سے بچو (یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللّٰہ) اور اس بناء پر کہ اہلِ ایمان تقویٰ کی پُر پیچ و خم راہ کو غلطی اور انحراف کے بغیر طے کر سکیں، مزید فرمایا گیا ہے: سچوں کا ساتھ دو (وکونوا مع الصّادقین)۔

اس بارے میں کہ "صادقین" کون ہیں، مفسّرین نے مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں لیکن اگر ہم راستے کو مختصر کرنا چاہیں تو ہمیں خود قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ جس نے متعدد آیات میں "صادقین" کی تفسیر کی ہے۔

سورہ بقرہ میں ہے:

لیس البرّ ان تولّوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولٰکن البرّ من اٰمن
باللّٰہ والیوم الاٰخر والملٰٓئکۃ والکتاب والنبیّین واٰتی المال علٰی حبّہ
ذوی القربٰی والیتٰمٰی والمسٰکین وابن السّبیل والسّآئلین وفی
الرّقاب واقام الصّلٰوۃ واٰتی الزّکٰوۃ والموفون بعھدھم اذا عٰھدوا
والصّابرین فی البأسآء والضّرّآء وحین البأس اُولٰٓئک الّذین صدقوا
واُولٰٓئک ھم المتّقون ○ (بقرہ ـ ۱۷۷)

اس آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ قبلہ کی تبدیلی کے مسئلے میں مسلمانوں کو زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا گیا ہے اور پھر اس کے بعد نیکی کی حقیقت کی اس طرح سے وضاحت کی گئی ہے۔

خدا، روزِ قیامت، ملائکہ، آسمانی کتب اور انبیاء پر ایمان لانا۔

اس کے بعد فرمایا:

راہِ خدا میں حاجت مندوں اور محروم لوگوں پر خرچ کرنا، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، عہد و پیمان پورا کرنا اور جہاد کے وقت مشکلات کے سامنے صبر و استقامت دکھانا۔

ان سب چیزوں کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے:

جو لوگ ان صفات کے حامل ہوں وہ صادق اور پرہیزگار ہیں۔

اسی طرح صادق وہ ہے جو تمام مقدسات پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ہر میدان میں عمل بھی کرتا ہو۔

سورۂ حجرات آیہ ۱۵ میں ہے:

انما المؤمنون الذین اٰمنوا باللہ و رسولہ ثم لم یرتابوا وجٰھدوا باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ اولٰئک ھم الصٰدقون

یعنی ـــــــ مومن صرف وہ لوگ ہیں جو خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لائیں اس کے بعد شک نہ کریں (اور اس کے علاوہ) اپنے مالوں اور جانوں سے راہِ خدا میں جہاد کریں، یہی لوگ سچے ہیں۔

اس آیت میں بھی صدق اور سچائی کو ایمان اور عمل کا ایسا مجموعہ قرار دیا گیا ہے جس میں کسی قسم کا تردّد اور تخلف نہ ہو۔

سورۂ حشر کی آیہ ۸ میں ہے:

للفقرآء المھاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلًا من اللہ ورضوانًا وینصرون اللہ ورسولہ اولٰئک ھم الصٰدقون

یعنی ـــــــ (اس مال میں) ان مفلس مہاجروں کا (حصّہ) ہے جو اپنے گھروں سے اور مالوں سے دور کر دیے گئے (اور جو) خدا کے فضل اور خوشنودی کے طلب گار ہیں اور خدا کی اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے ہیں۔

اس آیت میں وہ محروم مومنین کہ جنھوں نے تمام مشکلات کے باوجود پامردی اور استقامت دکھائی اور اپنے گھر بار اور مال و منال سے زبردستی الگ کر دیے گئے اور جن کا ہدف رضائے الٰہی اور نصرتِ پیغمبرؐ کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ انھیں "صادقین" قرار دیا گیا ہے۔

ان تمام آیات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صادقین وہ ہیں جو پروردگار پر ایمان لانے کے نتیجے میں اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سے انجام دیتے ہیں نہ شک و تردّد کا شکار ہوتے ہیں، نہ پاؤں پیچھے ہٹاتے ہیں، نہ ہی ہجوم مشکلات سے گھبراتے ہیں بلکہ مختلف طرح سے فداکاری کر کے اپنے ایمان کی سچائی کا ثبوت دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ان صفات کے کئی مدارج اور مراتب ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ سب سے بالا درجے پر فائز ہوں۔ جنھیں ہم "معصوم" کہتے ہیں اور بعض نچلے مراحل میں ہوں۔

کیا صادقین سے مراد صرف معصومین ہیں ؟

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے "صادقین" کا مفہوم اگرچہ وسیع ہے مگر بہت سی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے یہاں مراد صرف معصومین ہیں ۔

سلیم بن قیس ہلالی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن امیرالمومنین علیہ السلام کچھ مسلمانوں سے محو گفتگو تھے ۔ آپ نے ان سے دیگر باتوں کے علاوہ فرمایا :

میں تمھیں خدا کی قسم دیتا ہوں ، کیا تمھیں معلوم ہے کہ جب خدا نے یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللہ وکونوا مع الصدقین کا حکم نازل کیا تو سلمان نے عرض کیا : اے خدا کے رسول ! کیا اس سے مراد عام ہے یا خاص ؟ تو رسول اللہؐ نے فرمایا : اس حکم کے مامور اور ذمہ دار تو تمام مومنین ہیں لیکن "صادقین" کا مفہوم مخصوص ہے میرے بھائی علی کے لیے اور روز قیامت تک اس کے بعد کے اوصیاء کے لیے ۔

جب حضرت علیؑ نے یہ سوال کیا تو حاضرین نے کہا :

جی ہاں : یہ بات ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی تھی [۱]

نافع نے عبداللہ بن عمر سے اس آیت کی تفسیر میں یوں نقل کیا ہے :

خدا نے پہلے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ خدا سے ڈریں ۔ اس کے بعد فرمایا ہے کونوا مع الصدقین " یعنی مع محمد واھل بیتہ (محمد اور ان کے اہلبیت کا ساتھ دو) [۲]

اہل سنت کے بعض مفسرین مثلاً صاحب المنار نے مندرجہ بالا روایت کے ذیل میں اس طرح نقل کیا ہے کہ " مع محمد و اصحابہ" (محمد اور ان کے اصحاب کے ساتھ) لیکن مفہوم آیت کی طرف توجہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام ہے اور ہر زمانے کیلیے ہے اور ہم جانتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے صحابہ ایک محدود زمانے میں تھے لہٰذا عبداللہ بن عمرؓ سے جو روایت شیعہ کتب میں آئی ہے یہ صحیح تر دکھائی دیتی ہے ۔

تفسیر برہان کے مصنف نے اسی طرح کا مضمون اہل تسنن کے طرق سے نقل کیا ہے اور کہا ہے :

موفق بن احمد نے اپنی اسناد سے ابن عباس سے مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں اس طرح سے نقل کیا ہے :

ھو علی بن ابی طالب

یعنی ———— وہ علی بن ابی طالب ہیں ۔

---

[۱] و [۲] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۱۷۰

اس کے بعد کہتا ہے:

یہی مطلب عبدالرزاق نے کتاب رموز الکنوز میں درج کیا ہے۔[1]

زیادہ اہم مسئلہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں پہلا حکم یہ دیا گیا ہے کہ "تقویٰ اختیار کرو" اور اس کے بعد سچوں کا ساتھ دینے کا حکم دیا گیا ہے اگر "صادقین" کا مفہوم آیت میں عام ہوتا اور تمام سچے اور با استقامت مومنین اس میں شامل ہوتے تو کہا جاتا "وکونوا من الصادقین" یعنی سچوں میں سے رہنا نہ یہ کہ "سچوں کا ساتھ دو" (غور کیجیے گا)۔

یہ امر خود اس بات کا قرینہ ہے کہ "صادقین" آیت میں ایک خاص گروہ کے لیے آیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ساتھ دینے سے مراد ساتھ رہنا نہیں بلکہ بلاشبہ اس سے مراد ان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔

ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کیا کسی غیر معصوم کی پیروی اور نقش قدم پر چلنے کا حکم بغیر کسی قید اور شرط کے دیا جا سکتا ہے کیا یہ خود اس امر پر دلیل نہیں کہ صادقین سے مراد صرف "معصومین" ہیں۔

لہٰذا جو کچھ روایات سے معلوم ہوتا ہے اگر غور و خوض کریں تو وہی مفہوم خود آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ معروف مفسر فخر رازی نے جو تعصب اور شک پیدا کرنے میں مشہور ہے یہ حقیقت قبول کی ہے (اگرچہ زیادہ تر اہلِ سنت مفسرین اس مسئلہ سے خاموشی سے گزر گئے ہیں) وہ کہتا ہے:

> خدا نے مومنین کو سچوں کا ساتھ دینے کا حکم دیا ہے لہٰذا آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جو لوگ جائز الخطاء ہیں وہ کسی معصوم کی پیروی کریں تا کہ اس پیروی کے ذریعے خطاء سے محفوظ رہیں اور یہ مفہوم ہر دور کے لیے ہونا چاہیے اور زمانہ پیغمبرؐ سے اسے مخصوص کرنے کے لیے کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں ہے۔

لیکن بعد میں مزید کہتا ہے:

> ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آیت کا مفہوم یہی ہے اور ہر زمانے میں معصوم ہونا چاہیے، لیکن ہم اس معصوم کو مجموعِ اُمت سمجھتے ہیں نہ کہ کوئی ایک فرد۔ بالفاظ دیگر یہ آیت اجماعِ مومنین کی حجیت اور مجموعِ اُمت کے خطا نہ کرنے کی دلیل ہے۔[2]

یوں فخر رازی نے آدھا راستہ تو ٹھیک طرح سے طے کر لیا لیکن باقی نصف راہ میں اشتباہ کا شکار ہو گیا اگر وہ ایک نکتے کی طرف توجہ کرتا جو متن آیت میں موجود ہے تو باقی نصف راستہ بھی صحیح طرح سے طے کر لیتا اور وہ نکتہ یہ ہے کہ اگر صادقین سے مراد ساری امت ہے تو خود یہ پیرو بھی اس مجموع کا جز ہو گا اور یوں دراصل پیروکار پیشوا کا حصہ ہو جائے گا اور تابع و متبوع کا اتحاد اور ایک ہونا لازم آئے گا حالانکہ ظاہرِ آیت یہ ہے کہ پیروکار اور ہیں اور پیشوا اور ہیں یعنی تابعین اور متبوعین جدا جدا اور علیحدہ علیحدہ ہیں (غور کیجیے گا)۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ...

[2] تفسیر فخر الدین رازی ج ۱۶ ص ۲۲۰، ص ۲۲۱

خلاصہ یہ کہ مندرجہ بالا آیت ان آیات میں سے ایک ہے جو ہر زمانے میں وجود معصوم پر دلالت کرتی ہیں۔

ایک سوال باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ "صادقین" جمع ہے لہٰذا ضروری ہے کہ ہر زمانے میں متعدد معصوم ہوں۔

اس سوال کا جواب بھی واضح ہے اور وہ یہ کہ مخاطب صرف ایک زمانے کے لوگ نہیں ہیں بلکہ آیت تمام زمانوں کے لیے ہے لہٰذا گفتگو متعدد معصومین کے بارے میں ہوگی نہ کہ ایک فرد کے بارے میں۔

اس امر کا بولتا ہوا گواہ یہ ہے کہ زمانۂ رسولؐ میں سوائے آنحضرتؐ کے کوئی اور واجب الاطاعت نہ تھا۔ جبکہ آیت مسلّم طور پر اس زمانے کے مومنین کے لیے بھی تھی۔ لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ جمع سے مراد ایک زمانے کے افراد نہیں بلکہ جمع زمانوں کے مجموعہ کے لیے ہے۔

۱۲۰۔ مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا يَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَــــُٔـوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

۱۲۱۔ وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۲۰۔ مناسب نہیں کہ اہل مدینہ اور بادیہ نشین جو اس کے اطراف میں ہیں، رسول اللہ سے اختلاف کریں اور اپنی جان بچانے کے لیے ان کی جان سے لاپرواہی کریں یہ اس لیے ہے کہ انھیں کوئی پیاس نہیں لگے گی، نہ خستگی ہوگی، نہ راہِ خدا میں بھوک لگے گی، نہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھاتے ہیں جو کافروں کے غضب کا موجب ہو اور نہ وہ دشمن سے کوئی ضرب کھاتے ہیں مگر یہ کہ اس کی وجہ سے ان کے لیے اچھا عمل لکھا جاتا ہے کیونکہ خدا نیک لوگوں کی اجرت (اور جزا) ضائع نہیں کرتا۔

۱۲۱۔ اور وہ کسی چھوٹے یا بڑے مال کو (راہِ خدا میں) خرچ نہیں کرتے اور کسی زمین کو (میدان جہاد کی طرف جاتے ہوئے یا اس سے پلٹتے ہوئے) عبور نہیں کرتے مگر یہ کہ ان کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ خدا ان کی بہترین اعمال کے لحاظ سے انہیں جزا دے۔

تفسیر

مجاہدین کو مشکلات پر جزا ضرور ملے گی

گزشتہ آیات میں جنگِ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں سرزنش آئی تھی۔ زیرِ نظر دو آیات اس سلسلے میں ایک کلی قانون کے طور پر آخری اور بنیادی بحث کرتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: مدینہ کے لوگ اور بادیہ نشین جو اس مرکزِ اسلام شہر کے اطراف میں زندگی بسر کرتے ہیں انھیں حق نہیں پہنچتا کہ رسول اللہ سے اختلاف کریں اور انھیں چھوڑ کر بیٹھ جائیں (ماکان لاھل المدینة ومن حولھم من الاعراب ان یتخلفوا عن رسول اللہ) اور نہ انھیں یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی جان کی حفاظت کو رسول کی جان کی حفاظت پر مقدم رکھیں (ولا یرغبوا بانفسھم عن نفسہ) کیونکہ وہ اُمت کے رہبر، اللہ کے رسولؐ اور ملتِ اسلام کی بقا اور حیات کی علامت ہیں انھیں اکیلا چھوڑ دینا نہ صرف پیغمبرؐ کو خطرے میں ڈالے گا بلکہ دینِ خدا اور خود مومنین کا وجود اور حیات بھی حقیقتاً خطرے میں پڑ جائے گی۔

درحقیقت قرآن ایک جذباتی بیان کے ذریعے تمام اہلِ ایمان کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کرنے پر ابھارتا ہے اور مشکلات و مصائب میں ان کی حمایت اور دفاع کی ترغیب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمھاری جان اس کی جان سے عزیز تر نہیں ہے اور نہ تمھاری زندگی اس کی حیات سے زیادہ قیمتی ہے کیا تمھارا ایمان اس کی اجازت دیتا ہے کہ وہ ہستی جو بہت ہی زیادہ پر اُرزش ہے اور جس کا وجود تمھاری نجات اور رہبری کے لیے ہے وہ خطرے میں پڑ جائے اور تم سلامت طلبی اپنی جان بچانے کے لیے اس کی راہ میں قربانی سے دریغ کرو۔

مسلّم ہے کہ مدینہ اور اطرافِ مدینہ کے لیے تاکید اس بنا پر ہے کہ اس زمانے میں مرکزِ اسلام مدینہ تھا ورنہ یہ حکم نہ مدینہ اور اس کے اطراف کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ ہی پیغمبرِ خدا کے ساتھ مخصوص ہے تمام مسلمانوں کی ہر دور میں ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے رہبروں کو اپنی جان کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ گرامی اور عزیز سمجھیں اور ان کی حفاظت کی کوشش کریں اور مشکلات میں انھیں اکیلا نہ چھوڑیں کیونکہ ان کے لیے خطرہ پوری اُمت کے لیے خطرہ ہے۔

اس کے بعد اس اجر و جزاء کی طرف اشارہ ہے جو ہر قسم کی مشکلات کا مجاہدانہ مقابلہ کرنے سے مجاہدین کو نصیب ہوتی ہے ان مشکلات میں سے سات اقسام کی نشاندہی کی گئی ہے:

۱۔ "یہ اس بنا پر ہے کہ انھیں کوئی پیاس نہیں لگتی" (ذٰلک بانھم لا یصیبھم ظمأ)۔

۲۔ "نہ انھیں کوئی خستگی اور تکان ہوتی ہے" (ولا نصب)۔

۳۔ "نہ راہِ خدا میں انھیں کوئی بھوک دامن گیر ہوتی ہے" (ولا مخمصة فی سبیل اللہ)۔

۴۔ "نہ کفار کے غیظ و غضب کی وجہ سے وہ کسی خطرے سے دوچار ہوتے ہیں" (ولا یطئون موطئاً یغیظ الکفار)۔

۵۔ اور نہ انھیں دشمن کی طرف سے کوئی ضرب لگتی ہے" (ولا ینالون من عدو نیلاً)۔

مگر یہ کہ اس کے ساتھ ان کے لیے عملِ صالح لکھا جاتا ہے (الا کتب لھم بہ عمل صالح)۔ اور مسلّم ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے انھیں ایک ایک کرکے جزا اور اجر ملے گا، "کیونکہ خدا نیک لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتا (ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین)۔

۶۔ اسی طرح " وہ تھوڑا یا زیادہ مال راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے (ولا ینفقون نفقۃ صغیرۃ ولا کبیرۃ)۔

۷۔ اور میدانِ جہاد میں جاتے ہوئے یا لوٹتے ہوئے وہ کسی سرزمین کو عبور نہیں کرتے مگر یہ کہ یہ تمام قدم اور یہ اخراجات ان کے لیے ثبت ہو جاتے ہیں اور لکھ لیے جاتے ہیں" (ولا یقطعون وادیا الا کتب لھم)۔

تاکہ آخر کار خدا ان اعمال کا بہترین اعمال کے لحاظ سے انھیں بدلہ اور جزا دے (لیجزیھم اللہ احسن ما کانوا یعملون)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ " لا ینالون من عدو نیلا" کا مفہوم :

جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہوا ہے اس جملے سے اکثر مفسرین نے یہ مراد لیا ہے کہ مجاہدین راہِ خدا میں دشمن سے جو بھی تکلیف اٹھائیں چاہے وہ زخم کی صورت میں ہو یا قید و بند کی صورت میں یا پھر قتل ہونے کی صورت میں ہو خدائی جزا کے لیے ان کے نامۂ اعمال میں لکھی جاتی ہے اور ہر ایک کی مناسبت سے انھیں اجر ملے گا ۔ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیت مجاہدین کی مشکلات شمار کر رہی ہے یہی معنی مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن اگر خود اس جملے کی ترکیب بندی کا سہارا لیں اور اس کے الفاظ کی مناسبت سے اس کی تفسیر کریں تو پھر اس کا معنی یہ ہوگا کہ وہ بلکہ دشمن پر جو بھی ضرب لگاتے ہیں ان کے نامۂ عمل میں لکھی جائے گی کیونکہ " نال من عدوہ " لغت میں دشمن پر ضرب لگانے کے معنی میں ہے لیکن پوری آیت کے لیے توجہ گزشتہ تفسیر کے لیے قرینہ ہے ۔

۲۔ " احسن ما کانوا یعملون " سے کیا مراد ہے ؟

اس جملے کی دو تفسیریں ذکر کی گئی ہیں ایک یہ کہ لفظ " احسن " ان کے افعال کی صفت ہے اور دوسرا یہ کہ ان کی جزا کی صفت ہے ۔

پہلی صفت ہم نے اوپر انتخاب کی ہے یہی ظاہر آیت سے بھی زیادہ موافق ہے ۔ اس تفسیر کے مطابق ایسے مجاہدین کے اعمال ان کی زندگی کے بہترین اعمال قرار دیے گئے ہیں اور خدا ان کی جزا ان کے تناسب کے لحاظ سے دے گا ۔

دوسری تفسیر لفظ " احسن " کے بعد لفظ " من " کی تقدیر کی محتاج ہے اس کے مطابق خدائی جزا ان کے اعمال سے بہتر اور بالاتر قرار دی گئی ہے ۔ اس کے مطابق جملے کی تقدیر اس طرح ہوگی : لیجزیھم اللہ احسن مما کانوا یعملون ۔ یعنی جو کچھ وہ انجام دے چکے ہیں خدا انھیں اس سے بہتر جزا دے گا ۔

۳۔ یہ آیت ہر دور کے مسلمانوں کے لیے ہے :

مندرجہ بالا آیات صرف گزشتہ مسلمانوں کے لیے نہ تھیں بلکہ آج کے بھی اور ہر دور کے مسلمانوں کے لیے بھی ساحیں

شک نہیں کہ ہر جہاد میں چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیاں ہوتی ہیں لیکن جب مجاہدین قلب وروح کو خدا پر ایمان اور اس کے عظیم وعدوں سے روشن کریں اور جان لیں کہ ہر سانس، ہر بات اور ہر قدم جو اس کے راستے میں اٹھائیں گے وہ ضائع نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کا حساب بغیر کسی کم و کاست کے انتہائی باریک بینی سے محفوظ ہے اور خدا انھیں ان کے بدلے میں انھیں بہترین اعمال شمار کرتے ہوئے اپنے لطف کے بحر بیکراں سے مناسب ترین جزائیں دے گا تو ان حالات میں وہ مشکلات برداشت کرنے سے کبھی نہیں گھبرائیں گے اور ان مشکلات کی کثرت سے نہیں ڈریں گے اور جہاد کتنا ہی طولانی، کٹھن اور حادثات سے معمور ہو وہ کسی قسم کی ضعف اور سستی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔

۱۲۲۔ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝

ترجمہ

۱۲۲۔ مناسب نہیں کہ سب مومنین (میدانِ جہاد کی طرف) کوچ کریں۔ ہر گروہ میں سے ایک طائفہ کیوں کوچ نہیں کرتا (اور ایک حصّہ باقی نہیں رہتا) تاکہ دین (اور اسلام کے معارف و احکام) سے آگاہی حاصل کریں اور اپنی قوم کی طرف بازگشت کیوقت انھیں ڈرائیں تاکہ وہ (حکمِ خدا کی مخالفت سے) ڈریں اور رُک جائیں۔

شانِ نزول

مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرمؐ میدانِ جہاد کی طرف روانہ ہوتے تو سب مسلمان آپؐ کے ساتھ نکل پڑتے۔ پیچھے معذور افراد اور منافقین رہ جاتے لیکن جب کچھ آیات منافقین کی مذمت میں نازل ہوئیں اور خصوصاً جنگِ تبوک سے منہ موڑنے والوں کو جس طرح سے وعید و ملامت نے آگھیرا اس سے مومنین جہاد کے میدانوں میں شرکت کے لیے اور زیادہ پختہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ وہ جنگیں جن میں پیغمبرؐ ذاتی طور پر شرکت نہیں کرتے تھے ان میں شرکت کے لیے بھی سب نکل پڑتے تھے اور رسول اللہؐ کو تنہا چھوڑ دیتے تھے۔

اس صورت حال کے پیشِ نظر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انھیں بتایا گیا کہ ضرورت کے علاوہ مناسب نہیں کہ سب مسلمان میدان جنگ کی طرف جائیں بلکہ ایک گروہ مدینہ کی طرف جائے اور مدینہ میں جانے والے رسول اللہؐ سے اسلامی معارف و احکام کی تعلیم حاصل کریں اور اپنے مجاہد دوستوں کو واپس آنے کے بعد تعلیم دیں۔

اس عظیم مفسر نے اس مضمون کی ایک اور شانِ نزول نقل کی ہے: اصحابِ پیغمبرؐ میں سے کچھ افراد تبلیغ اسلام کے لیے بادیہ نشین قبائل کے پاس گئے۔ بادیہ نشینوں نے ان کی آمد کو پسند کیا اور ان سے اچھا سلوک کیا لیکن بعض نے ان پر اعتراض کیا کہ تم لوگ کیوں رسول اللہؐ کو چھوڑ کر ہمارے پاس آگئے ہو یہ بات سن کر وہ پریشان اور افسردہ ہوئے اور پیغمبرؐ خدا کی خدمت میں پلٹ آئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور ان کے تبلیغی کام کی تائید کی اور ان کی پریشانی کو دور کیا۔

تفسیر تبیان میں اس آیت کی ایک اور شانِ نزول بھی نقل ہوئی ہے اور وہ یہ کہ جب بادیہ نشین لوگ مسلمان ہوگئے تو احکامِ اسلام معلوم کرنے کے لیے سب کے سب مدینہ کی طرف چل پڑے اس سے مدینہ میں اجناس کی قیمتیں چڑھ گئیں اور کئی اور مشکلات پیدا ہوگئیں۔

اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں حکم دیا گیا کہ ضروری نہیں کہ تم سب کے سب اپنے شہر اور گھروں کو خالی چھوڑ کر معارف اسلام سیکھنے کے لیے مدینہ آجاؤ بلکہ اگر کچھ لوگ آجائیں تو کافی ہے۔

تفسیر

جہالت اور دشمن کے خلاف جہاد

زیر نظر آیت، جہاد کے سلسلے میں گزشتہ آیات سے تعلق رکھتی ہے یہ ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے جو مسلمان کے لیے حیات آفرین حیثیت رکھتی ہے اور وہ یہ کہ اگرچہ جہاد بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس سے پیچھے رہ جانا ننگ و عار اور گناہ ہے لیکن بعض مواقع پر جہاں ضرورت تقاضا نہیں کرتی کہ تمام مسلمان میدانِ جہاد میں شرکت کریں خصوصاً ان مواقع پر جب پیغمبر خود مدینہ میں رہ جائیں تو "مناسب نہیں کہ سب جہاد کے لیے چل پڑیں بلکہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی ہر جماعت کے دو حصے ہوں۔ ایک حصہ فریضۂ جہاد کو انجام دے اور دوسرا حصہ مدینہ میں رہ کر اسلام کے معارف و احکام کی تعلیم حاصل کرے" (وما کان المؤمنون لینفروا کافۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین)۔ "اور جب ان کے دوست مجاہدین میدان سے پلٹ آئیں تو خدا کے احکام و فرامین کی انھیں تعلیم دیں اور انھیں ان کی مخالفت سے ڈرائیں" (ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم)۔ "ہو سکتا ہے اس طرح سے وہ فرمانِ خدا کی مخالفت سے پرہیز کریں اور اپنے فرائض انجام دیں" (لعلھم یحذرون)۔

چند قابلِ توجہ امور

۱۔ آیت کی تفسیر میں مختلف احتمالات: آیت کی تفسیر میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ مشہور شانِ نزول سے مطابقت رکھنے کے علاوہ آیت کے ظاہری مفہوم سے بھی دیگر ہر تفسیر کی نسبت زیادہ موافق ہے ایک چیز البتہ یہاں قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ "من کل فرقۃ طائفۃ" کے بعد "لتبقی طائفۃ" (ایک گروہ باقی رہے) مقدر سمجھا جائے یعنی ہر جماعت میں سے ایک گروہ چلا جائے اور ایک گروہ رہ جائے آیت میں موجود قرائن کی طرف توجہ کی جائے تو اس سے کوئی مشکل پیدا نہیں ہوتی (غور کیجیے گا)۔

لیکن بعض مفسرین نے یہ احتمال پیش کیا ہے کہ آیت میں کسی قسم کی تقدیر نہیں ہے اور مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ واجب کفائی کے طور پر میدانِ جہاد میں جائے اور وہاں اسلامی تعلیمات سے آگاہی حاصل کرے دشمن پر مسلمانوں کی کامیابی کو اپنی آنکھوں سے دیکھے جو کہ اس دین کی عظمت و حقانیت کا نمونہ ہے اور واپسی پر یہ آگاہی اپنے دوستوں کو منتقل کرے[1]

تیسرا احتمال بعض دوسرے مفسرین نے ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ مباحث جہاد سے الگ یہ آیت ایک مستقل حکم بیان کر رہی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں پر فرض ہے کہ واجب کفائی کے طور پر ان کی ہر جمعیت میں سے ایک گروہ اُٹھ کھڑا ہو جو اسلامی تعلیمات و معارف حاصل

---

[1] قرطبی کے مطابق یہ تفسیر طبری نے اپنی تفسیر میں انتخاب کی ہے۔ بعض مفسرین نے بھی احتمال کے طور پر آیت کے ذیل میں اسے ذکر کیا ہے۔

کرنے کے لیے اسلام کے عظیم مراکز کی طرف جاتے اور علوم حاصل کرنے کے بعد اپنے شہروں اور گھروں کو پلٹ آتے اور دوسروں کو ان کی تعلیم دیے[1]

البتہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے پہلی تفسیر آیت کے مفہوم سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے اور اگرچہ تمام معانی مراد لینا بھی زیادہ بعید نہیں ہے[2]

۲۔ **ایک اشکال اور اس کا جواب:** بعض نے خیال کیا ہے کہ اس آیت اور گزشتہ آیات کے درمیان ایک طرح کا اختلاف ہے کیونکہ گزشتہ آیات میں سب کو میدانِ جہاد میں شرکت کا حکم دیا گیا ہے اور پیچھے رہ جانے والوں کی سخت سرزنش کی گئی ہے لیکن زیرِ بحث آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ سب لوگ میدانِ جہاد کی طرف نہ چل پڑیں۔

لیکن واضح ہے کہ یہ دونوں حکم مختلف حالات کے پیشِ نظر دیئے گئے ہیں مثلاً تبوک کے موقع پر جبکہ روم کی شاہی حکومت کی طاقتور فوج کا سامنا تھا وہاں اس کے علاوہ چارہ ہی نہ تھا کہ تمام مسلمان جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں لیکن چھوٹے چھوٹے گروہوں سے مقابلے کے لیے ضرورت نہیں کہ سب مسلمان چل پڑیں خصوصاً ایسے مواقع پر جبکہ رسول اللہ خود مدینہ میں رہ جائیں تو مدینہ کو خالی نہیں چھوڑنا چاہیے اور اس صورت میں احتمالی خطرات کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے نیز اسلامی احکام و معارف کے حصول سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔ لہٰذا مندرجہ بالا آیات میں کوئی نسخ نہیں ہے اور بعض نے جو یہ خیال کیا ہے وہ اشتباہ ہے۔

۳۔ **تفقہ فی الدین" کا وسیع مفہوم:** اس میں شک نہیں کہ "تفقہ فی الدین" سے مراد تمام اسلامی معارف و احکام کا حصول ہے چاہے ان کا تعلق اصولِ دین سے ہو یا فروعِ دین سے کیونکہ تفقہ کے مفہوم میں یہ تمام امور جمع ہیں۔ لہٰذا مندرجہ بالا آیت اس بات پر واضح دلیل ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ ہمیشہ واجب کفائی انجام دینے کے لیے تمام اسلامی مسائل میں تحصیل علم کرے اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد اسلامی احکام کی تبلیغ کے لیے مختلف علاقوں کی طرف جائے، خصوصاً اپنی قوم اور جمعیت کی طرف لوٹے اور اسے اسلامی مسائل سے آشنا کرے۔

لہٰذا مندرجہ بالا آیت اسلامی مسائل کے تعلیم و تعلّم کے وجوب پر ایک واضح دلیل ہے دوسرے لفظوں میں تعلیم حاصل کرنا بھی واجب ہے اور تعلیم دینا بھی۔ آج کی دنیا اگر جبری تعلیم پر فخر کرتی ہے تو قرآن نے چودہ سو سال پہلے اس سے بھی بڑھ کر معلمین پر بھی یہ کام فرض کیا ہے۔

۴۔ **اجتہاد اور تقلید کے جواز پر استدلال:** بعض علماءِ اسلام نے زیرِ نظر آیت سے مسئلہ جوازِ تقلید پر استدلال کیا ہے۔ کیونکہ تعلیمات دین حاصل کرنا اور مسائل فروع کو دوسروں تک پہنچانا اور سننے والوں کے لیے ان کی لازمی طور پر پیروی کرنا یہی تقلید ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم نے کہا ہے زیرِ بحث آیت صرف فروعِ دین سے بحث نہیں کرتی اور اس کے مفہوم میں مسائلِ اصول بھی

---

[1] یہ تفسیر تبیان میں شیخ کی بیان کی گئی شانِ نزول سے مطابقت رکھتی ہے۔

[2] توجہ رہے کہ ہمارے نزدیک کسی لفظ کا ایک سے زیادہ معانی میں استعمال صحیح ہے۔

شامل ہیں لیکن بہرحال فروعِ دین اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔

واحد اعتراض جو یہاں نظر آتا ہے یہ ہے کہ اس وقت اجتہاد اور تقلید کی بات نہیں تھی اس زمانے میں جو لوگ مسائل دین سیکھتے اور اسے دوسروں تک پہنچاتے ان کی کیفیت ہمارے زمانے کے مسائل بیان کرنے والے حضرات کی سی تھی نہ وہ مجتہدین کی سی حیثیت رکھتے تھے یعنی پیغمبر اکرمؐ سے مسائل معلوم کرکے بعینہ بغیر کسی قسم کے اظہارِ نظر کے دوسروں کے سامنے نقل کر دیتے تھے۔

اگر ہم اس طرف توجہ دیں کہ اجتہاد اور تقلید کا ایک وسیع مفہوم ہے تو مندرجہ بالا اعتراض کا جواب مل سکتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ علم فقہ کو جو موجودہ وسعت حاصل ہے یہ اس زمانے میں نہ تھی اور مسلمان آسانی سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسائل معلوم کر لیتے تھے لیکن اس کے باوجود ایسا نہ تھا کہ تمام بزرگانِ اسلام ہمارے زمانے کے مسائل بیان کرنے والے حضرات کی طرح ہوں۔ ان میں سے بہت سے افراد قضاوت یا امارت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے دوسری جگہوں کی طرف جایا کرتے تھے۔ فطرتاً انھیں کچھ ایسے مسائل پیش آتے تھے جو بعینہ انھوں نے پیغمبر اکرمؐ سے نہ سنے تھے۔ لیکن وہ آیات قرآن کے عمومات اور اطلاق سے استفادہ کرتے تھے۔ یا وہ کلیات کی تطبیق جزئیات پر کرتے تھے۔ علمی اصطلاح میں "ردِ فروع بر اصول" اور "رد اصول بر فروع" سے ان مسائل کے احکام سمجھتے تھے اور یہ ایک قسم کا سادہ اور آسان اجتہاد تھا (غور کیجیے گا)۔

مسلّم ہے کہ یہ کام اور ایسے معاملات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تھے۔ اس طرح سے اجتہاد کی بنیاد صحابہ میں موجود تھی اگرچہ تمام اصحاب اس مد میں نہیں آتے تھے۔

زیرِ نظر آیت چونکہ عمومی مفہوم رکھتی ہے لہٰذا مسائل بیان کرنے والے افراد کی بات قبول کرنے اور مجتہدین کا قول قبول کرنے کے دونوں مفہوم اپنے دامن میں لیے ہوئے۔ اس طرح آیت کی عمومیت سے جوازِ تقلید پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ **تعلیم اور تعلّم کی اہمیت:** ایک اور اہم مسئلہ جو آیت سے معلوم کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں تعلیم و تعلّم کا ایک خاص احترام اور اہمیت ہے یہاں تک کہ اسلام مسلمانوں پر لازم قرار دیتا ہے کہ سب کے سب میدانِ جنگ میں شرکت نہ کریں بلکہ ایک گروہ ٹھہر جائے اور معارفِ اسلام حاصل کرے یعنی جہالت کے خلاف جہاد کرنا دشمن کے خلاف جہاد کرنے کی طرح فرض ہے اور ایک کی دوسرے سے کم اہمیت نہیں ہے بلکہ جب تک مسلمان جہالت کے خلاف جہاد کرنے میں کامیاب نہ ہوں دشمن سے جہاد میں کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ جاہل قوم ہمیشہ شکست خوردہ ہوتی ہے۔ ایک معاصر مفسر نے اس آیت کے ذیل میں ایک جالبِ نظر بات بیان کی ہے۔

وہ کہتا ہے:

> "میں طرابلس میں تحصیل علم میں مشغول تھا ایک دن وہاں کا ڈپٹی کمشنر جو معارفِ اسلامی کے بارے میں خود بھی اچھی آگاہی رکھتا تھا۔ مجھ سے کہنے لگا:۔
>
> "حکومت کس بناء پر علماء اور علوم دینی کے طلباء کو فوجی خدمات سے مستثنیٰ قرار دیتی ہے جبکہ یہ مقدس خدمت شرعی طور پر سب پر واجب ہے اور علوم دین کے طلبہ اس دینی فریضہ کی انجام دہی کے لیے دیگر لوگوں کی نسبت زیادہ حق رکھتے ہیں، کیا یہ

کام غلط نہیں ہے؟"

فوراً زیر نظر آیت مجھے یاد آئی اور میں نے بغیر کسی تمہید کے کہا:

"اس معاملے کی بنیاد قرآن میں موجود ہے اور اس سلسلے میں وہ کہتا ہے کہ ایک گروہ جہاد کرے اور ایک گروہ علم حاصل کرے"۔

اسے اس جواب سے بہت لطف آیا، خصوصاً جبکہ اس نے مجھ جیسے ابتدائی طالبعلم سے یہ جواب سنا جب کہ میں نے ابھی تازہ تازہ ہی تحصیلِ علم کا سلسلہ شروع کیا تھا۔[1]

[1] تفسیر المنار ج ۱۱ ص ۸۰

۱۲۳۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ○

ترجمہ

۱۲۳۔ اے ایمان والو! ان کفّار کے ساتھ جنگ کرو جو تمھارے زیادہ قریب ہیں (اور دُور کا دشمن تمھیں نزدیک کے دشمن سے غافل نہ کردے) اور وہ تم میں شدت اور سختی محسوس کریں اور جان لو خدا پرہیز گاروں کے ساتھ ہے۔

تفسیر

قریب کے دشمن کی خبر

جہاد کے بارے میں جاری مباحث کے ضمن میں زیرِ نظر آیت میں دو مزید احکام بیان کیے گئے ہیں۔

پہلے روئے سخن مومنین کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اے ایمان والو! ان کفار سے جنگ کرو جو تمھارے آس پاس ہیں (یا ایہا الذین اٰمنوا قاتلوا الذین یلونکم من الکفار)۔

یہ درست ہے کہ تمام دشمنوں کے خلاف جنگ کرنا چاہیے اور اس سلسلے میں کوئی امتیاز نہیں لیکن جنگی تکنیک کے لحاظ سے بلاشبہ پہلے قریب ترین دشمنوں کے خلاف جنگ کرنا چاہیے۔ کیونکہ قریب کے دشمن کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے یہ اسی طرح ہے جیسا اسلام کی طرف دعوت دینے اور دینِ حق کی طرف ہدایت کرنے کے وقت بھی جو زیادہ نزدیک ہیں ان سے آغاز کیا جانا چاہیے۔

رسول اللہؐ نے حکمِ خدا سے اپنی دعوت کا آغاز اپنے رشتہ داروں سے کیا تھا اس کے بعد مکہ کے لوگوں کو تبلیغ کی۔ اس کے بعد سارے جزیرۂ عرب کی طرف مبلغ بھیجے اور پھر ساری دنیا کے بادشاہوں کو خطوط لکھے اور بلاشبہ یہ طریقہ کامیابی کے زیادہ قریب ہے۔

البتہ ہر قانون میں کچھ استثنائی پہلو ضرور ہوتے ہیں ممکن ہے کچھ ایسے امور خلافِ معمول پیش آجائیں کہ دور کا دشمن بہت زیادہ خطرناک ہو لہٰذا پہلے اس کی سرکوبی کے لیے جانا پڑے لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ ایک استثناء ہے نہ کہ ایک کلی قانون۔

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ قریب کے دشمن سے نپٹنا زیادہ ضروری ہے اس کے دلائل واضح ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ قریب کے دشمن کا خطرہ دُور کے دشمنوں سے زیادہ ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہماری آگاہی اور اطلاعات قریب کے دشمن کے بارے میں زیادہ ہوتی ہیں اور یہ خود کامیابی کے لیے مدد و معاون ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ دور والے دشمن کی طرف جانا اور نزدیک والے دشمن کو آزاد چھوڑ دینا اس خطرے کا باعث بھی ہو سکتا ہے

کہ قریب والا دشمن پیچھے سے حملہ کر دے یا مرکز اسلام خالی ہونے کی صورت میں اسے درہم برہم کر دے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ نزدیک کے دشمن کے مقابلے میں وسائل اور ساز و سامان نسبتاً کم درکار ہوتا ہے اور قریبی محاذ پر قبضہ کرنا مقابلتاً آسان ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر اور ایسی دیگر وجوہ کے پیش نظر ایسے دشمن کو دفع کرنا زیادہ ضروری ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی بہت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت زیر نظر آیت نازل ہوئی اس وقت اسلام تقریباً سارے جزیرۂ عرب کو اپنے زیر نگیں کر چکا تھا۔ اس بنا پر اس وقت نزدیک ترین دشمن مشرقی روم کی حکومت ہی تھی کہ جن کے مقابلے کے لیے مسلمان تبوک کی طرف گئے تھے۔

اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ زیر نظر آیت اگرچہ مسلح جنگ اور فاصلۂ مکانی کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے لیکن بعید نہیں کہ آیت کی روح منطقی جنگوں اور معنوی فاصلوں کے بارے میں بھی حکم دیتی ہو یعنی مسلمان دشمنوں سے منطقی اور تبلیغاتی مقابلے کے لیے پہلے ایسے لوگوں کا مقابلہ کریں جن کا خطرہ اسلامی معاشرے کے لیے بہت نزدیک ہو۔ مثلاً ہمارے زمانے میں الحاد اور مادیت کا خطرہ تمام معاشروں کو دستک دے رہا ہے۔ لہٰذا باطل مذاہب سے مقابلے کی نسبت اس کے مقابلے کو مقدم رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ انہیں بھلا دیا جائے۔ بلکہ تیز حملے کا رُخ زیادہ خطرناک گروہ کی طرف ہونا چاہیے یا مثلاً فکری یا سیاسی اور اقتصادی استعمار سے مقابلے کو پہلے درجے میں رکھنا چاہیے۔

جہاد کے متعلق آیتِ بالا میں دوسرا حکم شدتِ عمل کا ہے۔ آیت کہتی ہے، دشمنوں کو تم میں ایک طرح کی سختی کا احساس ہونا چاہیے (ولیجدوا فیکم غلظۃ)۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ قیام کے لیے اور دشمن کا سختی سے مقابلہ کرنے کے لیے صرف باطنی شجاعت و شہامت اور قلبی آمادگی کافی نہیں ہے بلکہ اپنی اس آمادگی اور شدت کا دشمن کے سامنے اظہار بھی ہونا چاہیے تاکہ اسے معلوم ہو کہ تم میں ایسا جذبہ موجود ہے اور یہی چیز اس کی عقب نشینی اور شکست کا باعث بن جائے دوسرے لفظوں میں قوت اور طاقت کا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ دشمن کے مقابلے میں طاقت کا اظہار بھی ہونا چاہیے۔

اسی لیے تاریخ اسلام میں ہے کہ جس وقت مسلمان مکہ میں خانۂ خدا کی زیارت کے لیے آئے تو پیغمبر اکرم نے انہیں حکم دیا کہ طواف تیزی کے ساتھ کریں بلکہ دوڑیں اور ان دشمنوں کے سامنے جو انہیں دیکھ رہے ہیں شدت و سرعت اور اپنی قوت و طاقت کا مظاہرہ کریں۔

نیز فتح مکہ کے واقعہ میں ہے کہ رسول اللہ نے رات کے وقت حکم دیا کہ سب مسلمان بیابان میں آگ روشن کریں تاکہ مکہ کے لوگ لشکرِ اسلام کی عظمت اور کثرت سے آشنا ہوں اور ایسا ہی ہوا یہ چیز ان کے دلوں پر اثر انداز ہوئی آپ نے یہ بھی حکم دیا کہ کفارِ مکہ کے سربراہ ابوسفیان کو ایک جگہ کھڑا کر کے طاقتور اسلامی لشکر کو ایک ایک دستہ کر کے اس کے سامنے سے گزارا جائے۔

آخر میں قرآن مسلمانوں کو ان الفاظ میں فتح و کامرانی کی نوید دیتا ہے، جان لو خدا پرہیزگاروں کے ساتھ ہے (واعلموا ان اللہ مع المتقین)۔ ہو سکتا ہے یہ تعبیر مزید برآں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ شدتِ عمل کو پرہیزگاری کے ساتھ ساتھ ہونا چاہیے اور حدودِ انسانی سے کسی صورت میں بھی تجاوز نہیں کیا جانا چاہیے۔

۱۲۴۔ وَاِذَا مَآ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَةٌ فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ اَيُّكُمۡ زَادَتۡهُ
هٰذِهٖۤ اِيۡمَانًا‌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فَزَادَتۡهُمۡ اِيۡمَانًا وَّهُمۡ
يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ‏ ○
۱۲۵۔ وَاَمَّا الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ فَزَادَتۡهُمۡ رِجۡسًا اِلٰى رِجۡسِهِمۡ
وَمَاتُوۡا وَهُمۡ كٰفِرُوۡنَ‏ ○

ترجمہ

۱۲۴۔ اور جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے بعض (دوسروں سے) کہتے ہیں کہ اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ہے۔ (ان سے کہہ دو) جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، اس سے ان کا ایمان بڑھتا ہے اور وہ (خدا کے فضل و کرم سے) خوش ہیں۔

۱۲۵۔ لیکن جن کے دلوں میں بیماری ہے ان کی ناپاکی پر ناپاکی ہی کا اضافہ ہوا ہے اور وہ دنیا سے اس حالت میں گئے ہیں کہ وہ کافر تھے۔

تفسیر

آیات قرآنی کی تاثیر۔ پاک اور ناپاک دلوں پر

منافقین اور مومنین کے بارے میں گزشتہ مباحث کی مناسبت سے ان دو آیات میں ان دونوں گروہوں کی ایک واضح نشانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: جب کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو بعض منافقین ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ یہ سورت نازل ہونے سے تم میں سے کس کا ایمان بڑھا ہے (واذا ما انزلت سورة فمنهم من يقول ايكم زادته هذه ايمانا)۔[1]

---

[1] "اذا ما انزلت" میں لفظ "ما" درحقیقت "ما زائدہ" ہے اور تاکید کے لیے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ "ما صلہ" ہے جو حرف شرط یعنی "اذا" کو اس کی جزا پر مسلط کرتا ہے اور جملے کی تاکید کرتا ہے۔

ایسی باتیں کرکے وہ قرآن کی سورتوں کی عدم تاثیر اور ان کے بارے میں اپنی بے اعتنائی کا اظہار کرنا چاہتے تھے وہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ یہ آیات کسی اہم اور قابلِ توجہ مفہوم کی حامل نہیں ہیں۔ لیکن قرآن انھیں قطعی لب ولہجہ میں جواب دیتا ہے اور لوگوں کے دوگروہوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتا ہے: رہے وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، قرآن آیات کا نزول ان کے ایمان میں اضافہ کرتا ہے اور ان کے چہروں سے مسرت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں (فاما الذین اٰمنوا فزادتھم ایمانا وھم یستبشرون)۔ "لیکن جن کے دلوں میں نفاق، جہالت، عناد اور حسد کی بیماری ہے ان کی ناپاکی پر ایک اور ناپاکی کا اضافہ ہوجاتا ہے" (واما الذین فی قلوبھم مرض فزادتھم رجسا الیٰ رجسھم)۔ آخرکار وہ کفر اور بے ایمانی کی حالت میں اس دنیا سے جائیں گے (وماتوا وھم کٰفرون)۔

چند قابلِ توجہ نکات

۱۔ **قرآنی آیات کے مختلف لوگوں پر مختلف اثرات:** قرآن کی مندرجہ بالا دو آیات اس حقیقت کی تاکید کرتی ہیں کہ صرف حیات بخش تعلیمات اور اچھا لائحۂ عمل ہی کسی فرد یا گروہ کی سعادت کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کے مقدمات کی فراہمی اور بنیادوں کا مہیا ہونا بھی ایک بنیادی شرط سمجھا جانا چاہیے۔

قرآنی آیات بارش کے حیات بخش قطروں کی طرح ہیں جو باغ میں سبزہ زار اگاتے ہیں اور شور والی زمین میں خس وخاشاک۔

جو لوگ تسلیم اور ایمان کے جذبے سے اور حقیقت سے عشق کے ساتھ ان کی طرف دیکھتے ہیں وہ ہر سورت بلکہ ہر آیت سے نیا درس لیتے ہیں جو ان کے ایمان کی پرورش کرتا ہے اور ان میں انسانیت کی واضح صفات کو تقویت پہنچاتا ہے۔ لیکن جو لوگ ہٹ دھرمی، غرور اور نفاق کے تاریک شیشوں کے پیچھے سے ان آیات کی طرف دیکھتے ہیں وہ نہ صرف ان سے فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ ان کے کفر اور عناد کی شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ہر نئے فرمان کے بارے میں وہ نئی نافرمانی اور نیا گناہ کرتے ہیں، ہر حکم کے بارے میں نئی سرکشی اور ہر حقیقت کے سامنے نئی ہٹ دھرمی کرتے ہیں اس طرح ان کے وجود میں عصیان، نافرمانیاں اور ہٹ دھرمیاں تہ در تہ جمع ہوجاتی ہیں اس طرح انکی روح میں ان بُری صفات کی جڑیں مضبوط ہوجاتی ہیں آخرکار وہ حالت کفر میں مرجاتے ہیں اور واپسی کا راستہ ان کے لیے بالکل بند ہوجاتا ہے۔

ایک اور تعبیر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی تربیتی پروگرام میں فاعل کی فاعلیت کافی نہیں ہے بلکہ روح قبولیت اور قابل کی قابلیت بھی بنیادی شرط ہے۔

۲۔ **"رجس" کا مفہوم:** لغت میں "رجس" کا معنی ہے "پلید" اور "ناپاک" وجود اور راغب نے اپنی کتاب مفردات میں لکھا ہے کہ پلیدی چار قسم کی ہے ۱۔ طبیعت کے لحاظ سے ۲۔ عقل و فکر کے زاویہ سے ۳۔ شریعت کے حوالے سے اور ۴۔ کبھی تمام پہلوؤں سے

البتہ اس میں شک نہیں کہ وہ پلیدی جو نفاق، ہٹ دھرمی اور حق کے مقابلے میں شدت سے پیدا ہوتی ہے ایک قسم کی باطنی اور معنوی ناپاکی ہے جس کا اثر آخرکار انسان کے تمام وجود، گفتار اور کردار میں ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ **"وھم یستبشرون" کا مطلب:** لفظ "بشارت" کی اصل کی طرف توجہ کرتے ہوئے یہ جملہ ایسے سرور اور خوشی کے

معنی میں ہے کہ جس کے آثار انسان کے چہرے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیات قرآنی کا تربیتی اثر مومنین میں اس قدر آشکار تھا کہ اس کی علامات فوراً ان کے چہروں میں نمایاں ہو جاتی تھیں۔

۴۔ دل کی بیماری: مندرجہ بالا آیات میں نفاق اور اس کی گندی صفات کو دل کی بیماری کہا گیا ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی کہا ہے کہ "قلب" ایسے مواقع پر روح اور عقل کے معنی میں ہے اور دل کی بیماری ان مواقع پر اخلاقی رذائل اور روحانی انحرافات کے معنی میں ہے اور یہ تعلیم نشاندہی کرتی ہے کہ انسان کی روح اور عقل اگر صحیح و سالم ہو تو ان بُری صفات میں سے کوئی بھی اس کے وجود میں اپنی جڑیں پیدا نہیں کر سکتی اور ایسا اخلاق جسمانی بیماری کی طرح انسانی طبیعت کے برخلاف ہوگا۔ لہٰذا ایسی صفات سے آلودگی اصلی طبعی راستے سے انحراف اور روحانی بیماری کی دلیل ہیں۔[1]

۵۔ ایک درس: مندرجہ بالا آیت ہم سب مسلمانوں کو ایک عجیب درس دیتی ہے یہ آیات اس حقیقت کی ترجمانی کرتی ہیں کہ جب کوئی قرآنی سورت نازل ہوتی تھی تو پہلے مسلمانوں میں ایک تازہ روح پیدا ہو جاتی تھی اور انھیں نئی تربیت حاصل ہوتی تھی، اس طرح کہ اس کے آثار بہت جلد ان کے چہروں سے نمایاں ہو جاتے تھے حالانکہ آج کل ہم بظاہر مسلمان افراد کو دیکھتے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ ایک سورت پڑھ کر ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا بلکہ پورا قرآن ختم کر کے بھی ان پر تھوڑا سا اثر بھی دکھائی نہیں دیتا۔

تو کیا قرآن کی سورتیں اور آیتیں اپنا اثر کھو بیٹھی ہیں یا پھر انکار کی آلودگی، دلوں کی بیماری اور ہمارے بُرے اعمال کے حجابوں نے ہمارے دلوں کو اثر ناپذیر بنا دیا ہے ایسی حالت پر ہمیں خدا سے پناہ مانگنا چاہیے اور اس کے درگاہِ پاک سے پہلے زمانے کے مسلمانوں کے دل عطا ہونے کی دعا کرنا چاہیے۔

---

[1] دل کی بیماری اور قرآن میں اس کے مفہوم کے بارے میں ہم جلد اول ص۹۵ (اُردو ترجمہ) پر ایک اور بحث کر چکے ہیں۔

۱۲۶۔ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِىْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا
يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ○

۱۲۷۔ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ
مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا
يَفْقَهُوْنَ○

ترجمہ

۱۲۶۔ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ سال میں ایک یا دو مرتبہ ان کی آزمائش ہوتی ہے پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے اور متوجہ نہیں ہوتے۔

۱۲۷۔ اور جس وقت کوئی سورت نازل ہوتی ہے ان (منافقین) میں سے بعض ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا تمہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ؟ (اور اگر ہم بارگاہِ پیغمبر سے باہر چلے جائیں تو کوئی ہماری طرف متوجہ تو نہیں ہوگا) اس کے بعد وہ لوٹ جاتے ہیں (اور باہر چلے جاتے ہیں) خدا نے ان کے دلوں کو حق سے پھیر دیا ہے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں (اور بے علم ہیں)۔

تفسیر

ان آیات میں بھی منافقین کے بارے میں گفتگو جاری ہے اور انھیں سرزنش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہر سال ایک یا دو مرتبہ انھیں آزمایا جاتا ہے (اولا یرون انھم یفتنون فی کل عام مرۃ او مرتین)۔ تعجب کی بات ہے کہ ان پے در پے آزمائشوں کے باوجود غلط راستے پر چلنے سے باز نہیں آتے اور توبہ نہیں کرتے اور متذکر نہیں ہوتے (ثم لا یتوبون ولا ھم یذکرون)۔ اس سلسلے میں کہ اس آزمائش سے کیا مراد ہے جس کا سالانہ ایک یا دو مرتبہ تکرار ہوتا ہے، مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض انھیں بیماریاں قرار دیتے ہیں۔

بعض بھوک ننگ اور دوسری سختیاں مراد لیتے ہیں۔

بعض جہاد کے میدانوں میں عظمتِ اسلام کے آثار اور حقانیتِ پیغمبرؐ کا مشاہدہ سمجھتے ہیں کیونکہ منافقین ماحول کی مجبوری کے

باعث ان میں شریک ہوتے ہیں۔

بعض منافقین کے بھید کھل جانا مراد لیتے ہیں۔

لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ آیت کے آخر میں ہے کہ "وہ متذکر نہیں ہوتے" اس سے واضح ہوتا ہے کہ کوئی ایسی آزمائش [illegible] ہونا چاہیے جو ان لوگوں کی بیداری کا باعث ہو۔

نیز تعبیر آیت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزمائش ان عمومی آزمائشوں سے الگ ہے کہ جنکا عام لوگوں کو اپنی زندگی میں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس امر کی طرف توجہ کرتے ہوئے یوں لگتا ہے کہ چوتھی تفسیر یعنی ان کے بُرے اعمال سے پردہ اٹھنا اور ان کے باطن کا ظاہر ہونا، آیت کے مفہوم سے زیادہ قریب ہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ زیر بحث آیت میں آزمائش ایک جامع مفہوم رکھتی ہو جس میں یہ تمام امور شامل ہوں۔

اس کے بعد ان انکار آمیز حرکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو وہ آیاتِ خداوندی سُن کر کیا کرتے تھے، ارشاد ہوتا ہے: جب کوئی قرآن کی سورت نازل ہوتی ہے تو وہ اس کے بارے میں حقارت و انکار کی نظر سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے وہ آنکھوں کی حرکات سے ظاہر کرتے کہ ہمیں کس قدر پریشانی ہے (و اذا ما انزلت سورة نظر بعضهم الی بعض)۔

انھیں تکلیف اور پریشانی اس وجہ سے ہے کہ کہیں اس سورت کا نزول ان کے لیے کوئی نئی رسوائی اور ذلت فراہم نہ کرے یا اس وجہ سے ہے کہ کور باطنی کے باعث وہ اس میں سے کچھ سمجھ نہیں پاتے اور انسان اس چیز کا دشمن ہے جسے وہ نہیں جانتا۔

بہر حال وہ یہ پختہ ارادہ کر لیتے ہیں کہ مجلس سے باہر نکل جائیں تاکہ یہ آسمانی زمزمے نہ سنیں البتہ انھیں اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں نکلتے وقت کوئی انھیں دیکھ نہ لے لہٰذا آہستہ سے ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ کوئی ہماری طرف متوجہ تو نہیں ہے "کیا کوئی تمھیں دیکھ رہا ہے" (هل یراکم من احد) جب انھیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ [illegible] پیغمبر اکرم کی گفتگو سننے میں مشغول ہیں اور ان کی طرف متوجہ نہیں ہیں تو وہ مجلس سے باہر نکل جاتے ہیں (ثم انصرفوا)۔

"هل یراکم من احد" (کیا کوئی تمھیں دیکھ رہا ہے) — یہ جملہ وہ زبان سے کہتے یا آنکھوں کے اشارے سے — اشارے کی صورت میں "نظر بعضهم الی بعض" کا جملہ اس کے ساتھ مل کر ایک ہی مفہوم بیان کرتا ہے اور حقیقت میں "هل یراکم من احد" ان کے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کی تفسیر ہے۔

آیت کے آخر میں اس بات کی علت کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ کلماتِ خدا سننے پر اس لیے بے کیف اور پریشان ہوتے ہیں کہ "خدا نے ان کے دلوں کو ان کی ہٹ دھرمی، عناد اور گناہوں کی وجہ سے حق سے پھیر دیا ہے (اور وہ حق سے دشمنی اور عداوت رکھتے ہیں) کیونکہ وہ بے فکر اور ناسمجھ افراد ہیں (صرف الله قلوبهم بانهم قوم لا یفقهون)۔

"صرف الله قلوبهم" کے بارے میں مفسرین نے دو احتمالات ذکر کیے ہیں:

پہلا یہ کہ یہ جملہ خبریہ ہے جیسا کہ ہم نے اوپر تفسیر کی ہے اور

دوسرا یہ کہ یہ جملہ انشائیہ ہے اور نفرین اور بددعا کے معنی میں ہے یعنی خدا نے ان کے دل حق سے پھیر [illegible]

لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح دکھائی دیتا ہے۔

۱۲۸۔ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○

۱۲۹۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ ۖ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ○

ترجمہ

۱۲۸۔ تم میں سے تمھاری طرف رسول آیا کہ جسے تمھاری تکالیف اور رنج و الم ناگوار ہیں اور جو تمھاری ہدایت پر اصرار کرتا ہے اور مومنین پر رؤف و مہربان ہے۔

۱۲۹۔ اگر وہ (حق سے) منہ پھیر لیں (تو تم پریشان نہ ہوجانا) کہہ دو کہ خدا میری کفایت کریگا۔ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے میں نے اس پر توکّل کیا ہے اور وہ عرشِ عظیم کا پروردگار (اور مالک) ہے۔

تفسیر

نازل ہونے والی آخری آیات

بعض مفسرین کے بقول زیرِ نظر آیات رسول اللہؐ پر نازل ہونے والی آخری آیات ہیں، سورۂ برا‌ءت ان پر ختم ہو رہی ہے۔ یہ آیات فی الحقیقت ان تمام مسائل کی طرف اشارہ ہیں جو اس سورہ میں گزر چکے ہیں، کیونکہ

ایک طرف تو ان میں تمام لوگوں کو چاہے وہ مومن ہوں، کافر ہوں یا منافق کہا گیا ہے کہ پیغمبر اور قرآن کی طرف سے سخت گیریاں اور ظاہری سختیاں جن کے کچھ نمونے اس سورہ میں آئے ہیں سب اس لیے ہیں کہ پیغمبر کو ان کی ہدایت، تربیت، تکامل اور ارتقاء سے عشق ہے۔

دوسری طرف پیغمبر اکرمؐ کو بھی خبر دی گئی ہے کہ وہ لوگوں کی سرکشی اور نافرمانیوں پر جن کے بہت سے واقعے اس سورہ میں گذرے ہیں پریشان اور کبیدہ خاطر نہ ہوں اور یہ یقین رکھیں کہ خداوند عالم ہر حالت میں ان کا پشتیبان، دوست اور یاور ہے۔

لہٰذا پہلی آیت میں روئے سخن لوگوں کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: پیغمبر جو خود تمھی سے ہے تمھاری طرف آیا ہے (لقد جاءکم رسول من انفسکم)۔

آیت میں "منکم" کی بجائے "من انفسکم" یہ خصوصیت سے پیغمبر اکرمؐ کے لوگوں سے شدتِ ارتباط کی طرف اشارہ ہے

گویا وہ خود لوگوں کی جان کا ایک ٹکڑا ہے اور معاشرے کی روح کا ایک حصہ پیغمبرؐ کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے تمام دکھ درد جانتا ہے ان کی مشکلات سے آگاہ ہے اور پریشانی اور غم واندوہ میں ان کا شریک ہے ــــــــ ان حالات میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ان کے فائدے کے سوا کوئی بات کہے اور حقیقت میں یہ پیغمبرؐ کی پہلی صفت ہے جو مندرجہ بالا آیات میں پیغمبر اکرمؐ کے لیے ذکر ہوئی ہے۔

تعجب کی بات ہے کہ بعض مفسرین جو نسلی اور عربی تعصبات کے زیر اثر تھے انھوں نے کہا ہے کہ اس آیت میں مخاطب عرب نسل کے لوگ ہیں یعنی پیغمبر اس نسل میں سے تمھاری طرف آیا ہے ہمارے نظریے کے مطابق اس آیت کے لیے ذکر ہونے والی یہ بدترین تفسیر ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ چیز جس کا قرآن میں ذکر تک نہیں ہے وہ نسل پرستی ہے کیونکہ قرآن میں تمام جگہوں پر "یا ایھا الناس"، "یا ایھا الذین آمنوا" اور اس قسم کے دیگر الفاظ سے خطاب کیا گیا ہے اور کسی جگہ پر بھی "یا ایھا العرب" اور "یا قریش" وغیرہ کا وجود نہیں ہے اس کے علاوہ آخری حصے میں ارشاد ہوتا ہے: وہ مومنین پر رؤف اور مہربان ہے "بالمؤمنین رؤف رحیم" یہ جملہ بھی وضاحت سے اس تفسیر کی نفی کرتا ہے کیونکہ اس میں گفتگو تمام مومنین کے بارے میں ہے چاہے وہ کسی قوم وملت اور کسی نسل وخاندان سے ہوں۔

افسوس کا مقام ہے کہ بعض متعصب علماء قرآن کو اس کے عالمی اور انسانی مرتبے سے پیچھے لے آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسے چھوٹے نسلی دائرے میں محصور اور محدود کر دیا جائے۔

بہرحال "من انفسکم" کی صفت بیان کرنے کے بعد رسول اللہؐ کی چار ممتاز صفات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے یہ صفات لوگوں کے میلانات کی تحریک کے لیے اور ان کے احساسات وجذبات کو جذب کرنے کے لیے گہرا اثر رکھتی ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: تمھیں کوئی بھی تکلیف، ضرر اور نقصان پہنچے، پیغمبر کے لیے سخت تکلیف اور ناراضی کا باعث ہے (عزیز علیہ ما عنتم)، یعنی وہ نہ صرف تمھاری تکلیف سے خوش نہیں ہوتا بلکہ وہ اس تکلیف سے الگ نہیں رہ سکتا، وہ تمھارے رنج وغم سے رنجیدہ ہوتا ہے اور اگر تمھاری ہدایت اور طاقت فرسا، پرزحمت جنگوں پر اصرار کرتا ہے تو وہ بھی تمھاری نجات اور ظلم، گناہ اور بدبختی کے چنگل سے تمھاری رہائی کے لیے ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ "وہ تمھاری ہدایت سے سخت لگاؤ رکھتا ہے" اور تمھاری ہدایت سے عشق رکھتا ہے (حریص علیکم)۔

لغت میں "حرص" کا معنی ہے "کسی چیز سے شدید لگاؤ رکھنا"۔ یہ بات جاذب نظر ہے کہ زیر بحث آیت میں بطور اطلاق کہا گیا ہے کہ "تم پر حریص ہے"، نہ ہدایت کے بارے میں بات کی گئی ہے اور نہ ہی کسی اور چیز کے بارے میں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ اسے تمھاری ہر طرح کی سعادت، پیش رفت، ترقی اور خوش بختی سے عشق ہے (اصطلاح میں کہتے ہیں کہ "متعلق کا حذف ہونا عموم کی دلیل ہے")۔

لہٰذا اگر وہ تمھیں جہاد کے تلخیوں بھرے میدانوں کی طرف بھیجتا ہے اور اگر منافقین کو سخت دباؤ میں رکھتا ہے تو یہ سب باتیں تمھاری آزادی، شرف، عزت اور ہدایت کے لیے ہیں اور یہ کام تمھارے معاشرے کی پاکسازی سے اس کے عشق کی وجہ سے ہے۔

اس کے بعد تیسری اور چوتھی صفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: وہ مومنین کے لیے رؤف ورحیم ہے (بالمؤمنین رؤف رحیم)۔

لہٰذا اگر وہ مشکل اور طاقت فرسا حکم دیتا ہے تو یہ بھی اس کی طرف سے ایک طرح کی محبت اور لطف ہے یہاں تک کہ گرمیوں کے موسم میں

طاقتور دشمن کے مقابلے میں جنگِ تبوک کے لیے بھوک اور پیاس کے ساتھ طویل اور جلانے والے بیابانوں سے گذرنا بھی اس کے مہر و محبت کی علامت ہے۔

"رؤف" اور "رحیم" میں کیا فرق ہے ـــــــ اس سلسلے میں مفسرین میں اختلاف ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہترین تفسیر یہ ہے کہ رؤف فرمانبرداروں کے لیے مخصوص محبت و لطف کی طرف اشارہ ہے جبکہ رحیم گناہگاروں کے لیے رحمت کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ دونوں الفاظ جب الگ الگ ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک ہی معنی میں استعمال ہوں لیکن جہاں ایک دوسرے کے ساتھ استعمال ہوں تو بعض اوقات دو مختلف معانی دیتے ہیں

بعد والی آیت میں جو کہ اس سورہ کی آخری آیت ہے، پیغمبر اکرمؐ کی دلجوئی کرتے ہوئے کہ وہ لوگوں کی سرکشیوں اور نافرمانیوں سے ملول نہ ہوں فرمایا گیا ہے: اگر وہ حق سے منہ پھیر لیں تو پریشان نہ ہو اور کہہ دے کہ "خدا میرے لیے کافی ہے" کیونکہ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے (فان تولوا فقل حسبی الله)۔ "وہی خدا کہ جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے" لہٰذا وہی اکیلا پناہ گاہ ہے (لا الٰہ الا ھو)۔

جی ہاں، میں نے صرف اسی معبود پر تکیہ کیا ہے اور اس کے ساتھ ہی دل باندھا ہے اور اپنے کام اسی کے سپرد کیے ہیں (علیہ توکلت)۔

اور وہی عرشِ عظیم کا مالک و پروردگار ہے (وھو رب العرش العظیم)۔

عرش، عالمِ بالا اور عالمِ ماورائے طبیعت اپنی پوری عظمت کے ساتھ اس کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس کی حمایت و کفالت میں ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ دے اور دشمن کے مقابلے میں میری مدد نہ کرے؟ کیا کوئی قدرت اس کی قدرت کے مقابلے میں ٹھہر سکتی ہے یا کوئی رحمت و مہربانی اس کی رحمت و مہربانی سے بالاتر تصور ہو سکتی ہے؟

خدایا! اس وقت جبکہ ہم یہ سورہ ختم کر رہے ہیں اور یہ سطور لکھ رہے ہیں دشمنوں نے ہمیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے اور ہماری رشید اور بہادر قوم ظلم، برائی اور استبداد کے خاتمے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہے، تمام صفوں اور طبقوں میں ایسا بے نظیر اتحاد و اتفاق پیدا ہو گیا ہے جس کا کبھی تصور بھی نہ ہوتا تھا یہاں تک کہ ننھے ننھے بچے بھی اس جہاد میں شریک ہیں اور کوئی بھی کسی قسم کی فداکاری اور قربانی سے دریغ نہیں کرتا ہے ـــــــ

پروردگار! تو ان تمام چیزوں کو جانتا اور دیکھتا ہے، تو مہر و محبت کا مرکز ہے تو نے مجاہدین سے کامیابی اور کامرانی کا وعدہ کر رکھا ہے۔

بس اپنی نصرت و مدد قریب کر دے اور ہمیں آخری اور مکمل فتح عطا فرما اور ان پیاسوں اور عاشقوں کو ایمان، عدل اور آزادی کے شفاف پانی سے سیراب فرما ـــــ انک علی کل شیء قدیر (تو ہر چیز پر قادر ہے)۔[1]

۞ ۞ ۞

---

[1] یہ حصہ انقلاب اور اسلامی حکومت کے قیام سے پہلے شاہ کے خلاف قیام کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔



ادارہ امامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآن پاک (تفسیر نمونہ جلد ۴)
کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا ہے
تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)
مہتمم/پرنسپل
امامیہ قرأت کالج
اندرون موچی دروازہ ۔ لاہور

اشاریہ

تفسیر نمونہ ـــــــــ جلد ۴

ترتیب و تزئین ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ سید شکیل حسین موسوی
ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ سید محمد حسین زیدی الباھروی

مضامین :

اصول وعقائد

توحید

اسمائے باری تعالیٰ

عدل

نبوت

امامت

قیامت

معجزہ

احکام

صلوٰۃ و زکوٰۃ

خمس

حج

جہاد

اطاعتِ خدا و رسولؐ

میراث

اخلاقیات

اخلاقِ حسنہ

اخلاقِ سیئہ

اقوامِ سابقہ

قومِ نوحؑ

قومِ عاد

قومِ ثمود

قومِ لوطؑ

قومِ شعیبؑ

قومِ فرعون

بنی اسرائیل

اہلِ کتاب

مشرکینِ مکہ

شخصیات

حضرت آدم علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام

ابلیس

ابن کوا منافق

حضرت ابوبکرؓ

غارِ ثور کے ساتھی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا رنجیدہ نہ ہو، اللہ ہمارے ساتھ ہے — ۶۱۱

ابوخیثمہؓ (صحابی)

اللہ کی توفیق سے بعد میں جنگِ تبوک کیلیے روانہ ہوئے۔ اللہ نے توبہ قبول فرمائی — ۶۴۵، ۶۴۶

ابوذر غفاریؓ

والذین یکنزون .... کی آیت شام میں معاویہ کے سامنے صبح و شام پڑھتے — ۵۹۴

ابوذرؓ اور اشتراکیت — ۵۹۵

واپس مدینہ بھیجا گیا۔ ربذہ میں جلاوطن ہوئے۔ وہیں وفات پائی۔ — ۵۹۶ تا ۵۹۸

ابوالعاص

جنگِ بدر کا قیدی۔ زینب ربیبۂ رسولؐ کا شوہر، فدیہ میں ہار پیش ہوا جو جناب خدیجہؓ نے زینب کو جہیز میں دیا تھا۔ — ۴۹۶

ابولبابہؓ انصاری

بنی قریظہ کو اشارے سے منع کرنا۔ تبوک سے رہ جانا، پھر توبہ کے لیے اپنے آپ کو ستون سے باندھنا۔ توبہ کی قبولیت پر آنحضرتؐ کا ستون سے کھولنا — ۶۲۳، ۷۰۸

ابومحمد

کینیا سے ابومحمد نے "رابطہ عالم اسلامی" (جو سخت گیر وہابیوں پر مشتمل ہیں) سے مہدی منتظر کے متعلق سوال کیا۔ — ۵۸۰

بخت نصر

بابل کا بادشاہ، یہودیوں کو برباد کیا، مردوں کو قتل کرکے عورتوں اور بچوں کو بابل منتقل کر دیا۔ — ۵۷۱

بشیر بن مبرار

بنی سلمٰی کا سردار، سخی و کشادہ رو — ۶۲۲

بلال بن اُمیہ

دو ساتھیوں سمیت، تبوک میں شرکت نہ کی، بعد میں رسولِ پاک سے معذرت قبول نہ ہوئی۔ پچاس دن آہ و زاری کے بعد توبہ قبول ہوئی۔ — ۶۴۵ تا ۶۴۷

حذیفہؓ یمانی

حضرت امام حسنؑ (امام دوم)

ذوالخویصرہ

سراقہ بن مالک

سعدؓ بن معاذ

فخر الدین رازی

فرعون

کعب بن مالک

کورش

حضرت لوطؑ

مالک بن عوف

مجمع بن حارثہ یا مجمع بن جاریہ

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

حضرت ہارون علیہ السلام

حضرت ہود علیہ السلام

علماء و دانشور

ابن ابی الحدید

ابنِ اثیر

ابوجعفر اسکافی معتزلی

ابن کثیر

ابوبکر بغدادی

ابومحمد

ابونعیم (حافظ)

احمد بن حنبل

آلوسی

آمدی

حاکم

حاکم نیشاپوری

حمید بن زیاد

راغب

سدی

شیخ صدوقؒ

عبد البر

طبرسی

ہاکس

کتب آسمانی

انجیل

تورات

قرآن

کتب تاریخ و تفسیر و سیر

تفسیر المنار ۵۰، ۸۳، ۱۱۰، ۲۶۶، ۲۸۸، ۳۳۸
۳۹۷، ۴۱۸، ۴۳۰، ۴۴۴، ۴۴۷
۴۵۰، ۴۹۴، ۴۹۹، ۵۲۴، ۵۴۲
۵۴۸، ۵۵۹، ۵۶۸، ۵۷۱، ۵۷۷
۵۹۳، ۵۹۷، ۵۹۸، ۷۰۲، ۷۰۴
۷۱۴، ۷۲۴، ۷۳۵، ۷۳۸، ۷۵۵، ۷۶۶

تفسیر المیزان ۸۳، ۲۲۸، ۲۹۱، ۳۴۵، ۳۴۶
۴۹۷، ۵۷۱، ۷۲۴، ۷۳۳

تفسیر برہان ۳۰، ۸۸، ۱۱۵، ۱۹۳، ۱۲۱، ۲۳۶
۲۹۳، ۲۹۹، ۲۹۷، ۳۱۳، ۳۱۴
۳۴۷، ۳۵۱، ۳۷۶، ۳۷۷، ۵۲۱
۵۲۷، ۵۶۰، ۵۹۴، ۶۰۱، ۷۱۳
۷۱۶، ۷۲۰، ۷۵۵، ۷۵۶

تفسیر تبیان ۳۰، ۲۶۳، ۴۸۷، ۷۶۴

تفسیر ثعلبی ۵۴۵

تفسیر در المنثور ۴۲۸

تفسیر روح البیان ۴۴۳

تفسیر روح المعانی ۲۹۲

تفسیر صافی ۴۰۹، ۷۱۳

تفسیر طبری ۵۰، ۵۱، ۵۴۵

تفسیر علی بن ابراہیم ۱۰۰

تفسیر فخر رازی (کبیر) ۱۷۱، ۳۴۷، ۳۹۷، ۴۰۹، ۴۵۰
۴۹۵، ۵۲۷، ۵۴۵، ۷۵۷

تفسیر قرطبی ۵۰، ۱۱۲، ۴۵۰، ۴۹۹، ۶۵۸، ۷۶۳

تفسیر مجمع البیان ۴۰، ۴۲، ۵۷، ۹۲، ۱۰۶، ۱۱۵
۱۳۸، ۱۵۹، ۱۷۱، ۲۷۲، ۲۹۰
۳۱۴، ۳۲۳، ۳۳۹، ۳۴۵، ۳۷۱
۳۷۲، ۳۸۳، ۳۹۶، ۴۰۰، ۴۰۹
۴۳۰، ۴۴۳، ۴۴۸، ۴۶۶، ۵۲۴
۵۵۸، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۹۲، ۵۹۳
۷۰۹، ۷۱۳، ۷۲۴، ۷۴۲، ۷۹۲

تفسیر نور الثقلین ۳۰، ۳۹، ۴۴، ۵۰، ۵۳، ۹۲
۶۵، ۶۶، ۸۸، ۱۱۲، ۱۲۱، ۲۴۶
۲۵۹، ۲۶۵، ۲۹۲، ۲۹۷، ۳۴۵
۳۴۷، ۳۴۸، ۳۶۰، ۳۹۱، ۳۹۶
۴۰۶، ۴۲۱، ۴۲۴، ۴۶۶، ۴۷۳
۴۷۹، ۴۸۰، ۴۹۴، ۴۹۹، ۵۲۳
۵۶۰، ۵۶۱، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۳
۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۹، ۹۵۱، ۹۵۳
۶۹۷، ۷۲۰، ۷۲۴، ۷۴۴

تفسیر منہج الصادق ۱۷۶

توحید صدوقؒ ۳۴۵، ۳۴۶

جامع الاصول ۵۱۲، ۵۴۵

خصائص نسائی ۲۵۰، ۲۵۳، ۵۱۵

دین محمدؐ ۲۹۸

ذخائر العقبیٰ ۲۵۱، ۵۱۲

لُغاتِ قرآن

(ا)

متفرق موضوعات

آبائی مذہب

آدم و حوا پر تہمت بت پرستی

ارتکازِ دولت کی سزا

اسلام اور ہجرتیں

اسمائے حسنیٰ

اصحاب اعراف

اطاعتِ خدا اور رسولؐ

اعراب

اعمال

اللہ کی حرام کردہ چیزیں

الواحِ تورات

انجام

انسان کا مقام، عظمت و اہمیت

انفال کیا ہے؟

اولاد کی پیدائش کے زمانہ میں والدین کی خواہشات

اہالیانِ جنت و دوزخ کی گفتگو

اہلِ بہشت اور انعام

اہلِ کتاب کے بارے میں ہماری ذمہ داری

ایمان

ایمان ثمرِ علم ہے

باران رحمت کا فیض

بُت پرستی

بُروں کے ساتھ اچھوں کی ابتلاء

بنی آدمؑ

بے ایمان افراد کی خوشحالی

بیت المال اور زکوٰۃ

بے مثال تجارت

پاک پیغمبر پر جنون کا الزام

صحابہؓ کا احترام

صُلح پر آمادگی

صلِ علیہم کے حکم کی موجبیت

طبقاتی تفاوت

طریقِ جہاد

ظلم اور ظالم

عالمِ ذر

عالمی رسالت

عذابِ الٰہی میں تاخیر

عنقریب اللہ اعمال دیکھے گا

فاسقین

فال نیک و بد

فتح بدر پر مغرور نہ ہو جانا

فتنہ

قدرتی تقویم اور حرام مہینے

قرآن و تورات

قرآن کریم کا پاک و ناپاک دلوں پر اثر

قرب الٰہی کا مفہوم

قریبی دشمن

قوموں کی زندگی و موت کے عوامل

کافر

کفر کرنے والے بدترین جانور ہیں، ایمان نہیں لاتے، پیمان توڑ دیتے ہیں، مقابل ہوں تو ایسا حملہ کرو کہ ان کے پیچھے والے بھی منتشر نہ ہو جائیں۔ اگر ان کی خیانت کا اندیشہ ہو تو خود پیمان توڑ دو۔ اللہ خائنین کو دوست نہیں رکھتا۔ وہ یہ خیال نہ کریں کہ کامیاب ہوں گے۔ وہ ہمیں عاجز نہیں کر سکتے۔ ۴۷۵ تا ۴۷۷

کیا تمام صحابہ نیک و صالح تھے

حمید بن زیاد کی زبانی محمد بن کعب قرظی کا بیان ۷۰۲ تا ۷۰۵

مجاہدین کا جذبہ جہاد و شہادت

مجاہدین اسلام اس اعزاز کو ہر اعزاز پر مقدم جانتے تھے۔ ۶۸۸

مسجد ضرار کی تعمیر

منافقین کا آنحضرتؐ سے اجازت لے کر مسجد کے نام پر مرکز نفاق تعمیر کرنا ۷۲۲ تا ۷۲۷

مسجد ضرار سے ایک اہم سبق

نفاق و منافق کو ہر جگہ، ہر لباس میں پہچاننا چاہیے۔ ۷۲۸ تا ۷۳۰

مسلمانوں میں ایمان، اتحاد و محبت

ان کے دلوں میں محبت پیدا کی۔ ایسی محبت کے لیے وہ روئے زمین کی تمام چیزیں صرف کر دیتے تو کامیاب نہ ہوتے، لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت پیدا کر دی۔ وہ عزیز و حکیم ہے
اوس و خزرج کی مثال ۴۷۷ تا ۴۸۵

مشرکین

کیا ان کو اللہ کا شریک بناتے ہو جو کچھ پیدا نہیں کر سکتے۔ خود مخلوق ہیں، نہ کسی کی نہ اپنی ہی مدد کر سکتے ہیں، نہ ہی ہدایت کی پیروی کر سکتے ہیں۔ ۳۶۱

پیغمبر اور مومنین کے لیے مناسب نہیں کہ مشرکین کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ ۶۳۴، ۶۳۱

مشرکین مکہ کی نماز

مشرکین کعبے کے گرد سیٹیاں اور تالیاں بجاتے اسی کو اپنی نماز بتاتے بلکہ بعض برہنہ ہو کر ناچتے تھے۔ ۴۳۴

معذورانِ جہان

مقابل میں تعداد کی برتری

منافقین

مؤذن جنّت

مؤلفۃ القلوب سے کون مراد ہیں

مؤمن